اثرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

استاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی

مصباح القرآن ٹرسٹ

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔



سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان





۷۸۶
۱۱۰-۹۲
یا صاحب الزماں ادرکنیؑ

DVD Version

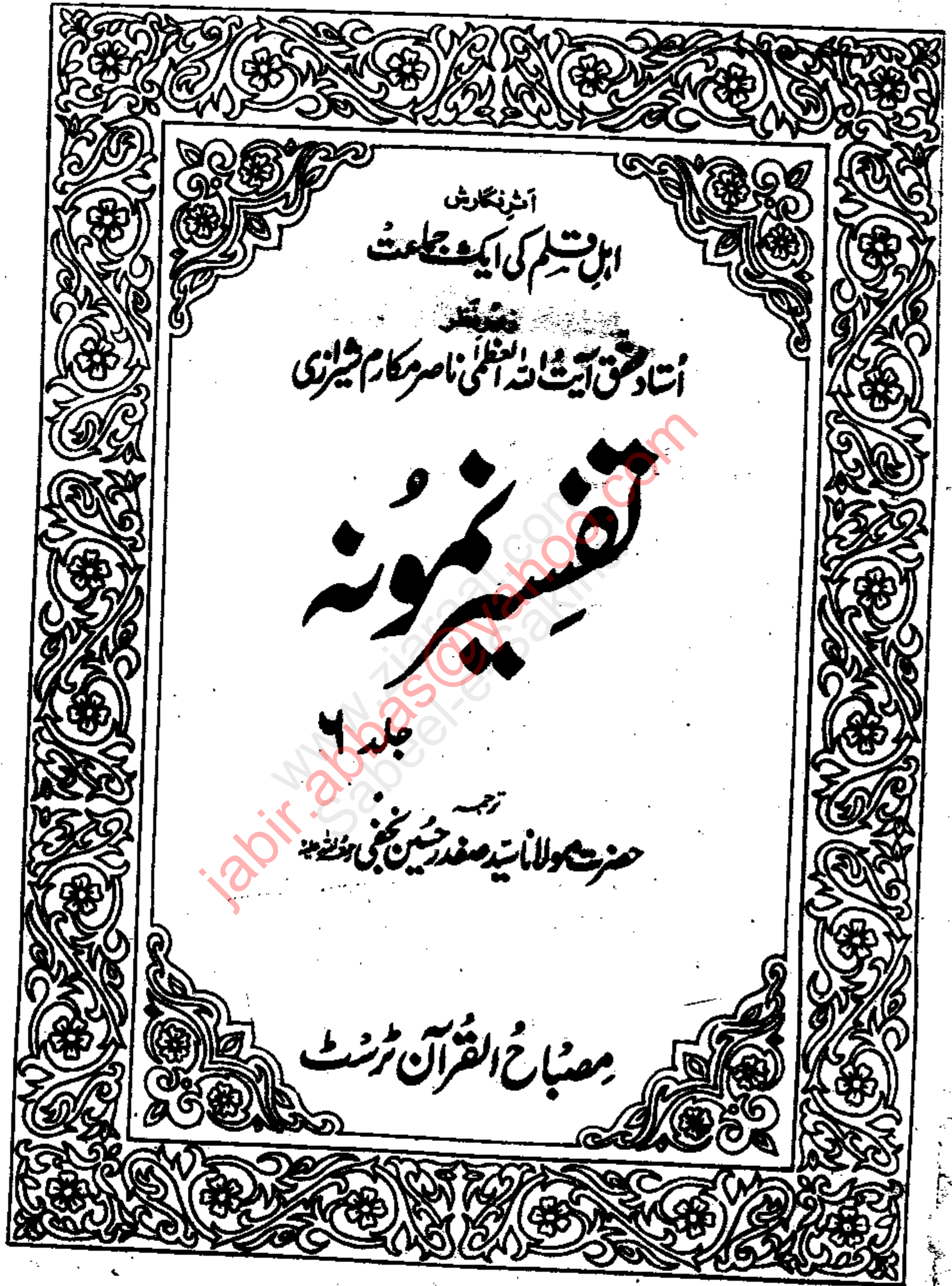
لبیک یا حسینؑ

خصوصی تعاون: نذر عباس
رضوان رضوی

اسلامی کُتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔

SABIL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.page.tl
sabeelesakina@gmail.com



اثرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد ٦

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

یہ تفسیر

حسب ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے داؤد الہامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے اسد اللہ ایمانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے عبد الرسول حسنی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ ناشر

قارئین محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ ــــ کلامِ حکیم اور عہدِ حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغازِ کار میں موجودہ دور کی شہرہ آفاق تفسیر ــــ تفسیر نمونہ ــــ کو فارسی سے اُردو زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلی اللہ مقامہ، کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونین کی فراخدلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیس جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکراً للہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اُردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی "پیامِ قرآن" از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور "قرآن کا دائمی منشور" از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل یک جلدی قرآنِ پاک عہدِ حاضر کے مقبول اُردو تراجم کے ساتھ زیرِ طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں روشن فکر اور جید عالمِ دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہ کا ترجمہ "انوار القرآن" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری اُمتِ مسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، لہٰذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی

طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہل علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ ستائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کرکے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جاسکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیب نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سورتوں کا کچھ حصہ ایک جلد میں اور بقایا حصہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سورت دو حصوں میں تقسیم نہیں ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سورت کی کامل تفسیر پر ختم ہوگئی۔ اس طرح پوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ششم اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ سابقہ جلد دہم میں سے صفحہ ۲۱۵ تا ۳۲۳، جلد ۱۱ مکمل اور جلد ۱۲ میں سے صفحہ ۳۱ تا ۲۹۸ شامل کیے گئے ہیں، چنانچہ یہ جلد سورہ ابراہیمؑ، سورہ حجر، سورہ نحل اور سورہ بنی اسرائیل کی تفسیر پر محیط ہے۔

ہم نے زیر نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی آراء ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیر مرد مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہار تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ بحق معصومینؑ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسّلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اِھداء

"مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش

تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہلِ مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا

چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم

نام کتاب ——— تفسیر نمونہ
جلد ——— ۶
زیر نظر ——— آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی
مترجم ——— حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی
ناشر ——— مصباح القرآن

مطبع ——— شوکت پریس، لاہور
تاریخ اشاعت ——— ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ
ہدیہ ——— 500/- روپے

اس کتاب کی اشاعت کے لیے سید تسلیم حیدر زیدی نے بطور قرض تعاون فرمایا ہے
خدا تعالیٰ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائیں
اور ان کے مرحومین کی مغفرت فرمائیں

ملنے کا پتہ: قرآن سنٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور
0321-4481214, 042-37314311

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

۱۔ تفسیر مجمع البیان از مشہور مفسّر علامہ طبرسی
۲۔ تفسیر تبیان از دانشمند فقیہ بزرگ شیخ طوسی
۳۔ تفسیر المیزان از علامہ طباطبائی
۴۔ تفسیر صافی از علامہ محسن فیض کاشانی
۵۔ تفسیر نور الثقلین از مرحوم عبد علی بن جمعۃ الحویزی
۶۔ تفسیر برہان از مرحوم سید ہاشم بحرینی
۷۔ تفسیر روح المعانی از علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
۸۔ تفسیر المنار از محمد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہ
۹۔ تفسیر فی ظلال القرآن از سید قطب مصری
۱۰۔ تفسیر قرطبی از محمد بن احمد انصاری قرطبی
۱۱۔ اسباب النزول از واحدی (ابو الحسن علی بن مقویہ نیشاپوری)
۱۲۔ تفسیر مراغی از احمد مصطفی مراغی
۱۳۔ تفسیر مفاتیح الغیب از فخر رازی
۱۴۔ تفسیر روح الجنان از ابو الفتوح رازی



گذارش

تفسیر نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اُردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہٗ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوندِ کریم مولانا مرحوم کو جوارِ معصومینؑ میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

اس تفسیر میں مدِ نظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان یہی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں جن میں سے ایک ۔ ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دُنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطلق ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

بالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمۂ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علما میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققین اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کر کے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر.....؟ وہ تفسیر کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوتے یا جان بوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسّرین اور عالی قدر محققین اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پرتو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیھم)

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریات زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہوگا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناقابل ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کرسکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیش نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا میں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہو سکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شامل حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقے نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوتے اور اس کی سولہ جلدیں جو اس وقت تک منظر عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی سترویں جلد ہے) بارہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیق الٰہی کا میں از حد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی[1]۔

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرض خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلاوطنی[2] کے مقام پر، حتیٰ کہ بستر بیماری پر بھی میں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیئے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

[1] بعد ازاں تعداد ۲۷ تک جا پہنچی۔ (مترجم)

[2] سابق شاہ ایران معدوم کے دور میں مؤلف کو جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

اس میں ہم آہنگی نہیں ہو گی۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا، لیکن پھر اس صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے)۔

خداوندا!

ہماری آنکھوں کو بینا، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں۔

خداوندا!

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنان اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے، اس امت اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کر دے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگائیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں۔

بار الٰہا!

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا و مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں۔

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے)۔

ناصر مکارم شیرازی

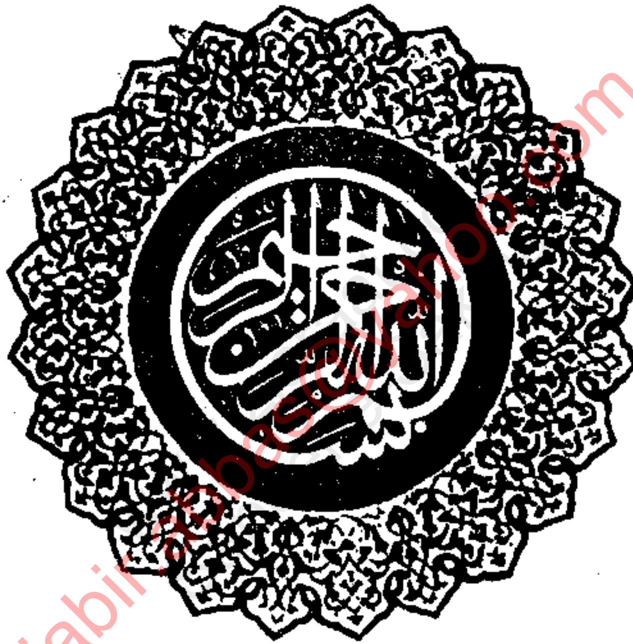
حوزہ علمیہ قم۔ ایران

فہرست جلد ۶

سورہ ابراہیمؑ

سورہ حجر

سُورہ بنی اسرائیل


بسم الله الرحمن الرحيم

اللھم صل علی محمد و آل محمد و عجل فرجھم

تفسیر نمونہ جلد ۶

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں

۱۔ سورہ ابراہیمؑ ۲۔ سورہ حجر ۳۔ سورہ نحل ۴۔ سورہ بنی اسرائیل

سورۂ ابراھیم، مکی سورت ہے اور اس کی ۵۲ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۱۳

سورۂ حجر، مکی سورت ہے اور اس کی ۹۹ آیات ہیں۔

پارہ ۱۳ ــــ ۱   پارہ ۱۴ ــــ ۲ تا ۹۹

سورۂ نحل، مکی سورت ہے اور اس کی ۱۲۸ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۱۴

سورۂ بنی اسرائیل، مکی سورت ہے اور اس کی ۱۱۱ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۱۵

سُورَۃُ اِبرٰھِیم

الکی

۵۲ آیات ہیں

یہ مکہ میں نازل ہوئی

(البتہ بہت سے مفسرین کے بقول آیات ۲۸ اور ۲۹ مدنی ہیں جو جنگ بدر میں مارے جانے والے مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں)

اس سورہ کے مضامین

جیسا کہ اس سورہ کے نام سے ظاہر ہے اس کا ایک حصّہ توحید کے بت شکن ہیرو ابراہیمؑ کے بارے میں نازل ہوا ہے۔ اس میں ان کی دعائیں شامل ہیں۔

اس کے دوسرے حصّے میں گزشتہ انبیاء حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کا ذکر ہے۔ قوم عاد و ثمود کی تاریخ کی طرف اشارہ ہے اس میں پوشیدہ عبرت آموز درسوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر یہ درس اس سورہ میں وعظ و نصیحت اور بشارت و انذار کے مباحث کی تکمیل کرتے ہیں۔

زیادہ تر مکی سورتوں کی طرح اس کا ایک اہم حصّہ مبداء و معاد کے بارے میں بحث کرتا ہے کیونکہ مبداء و معاد پر ایمان راسخ ہو جائے تو انسان کی روح میں ایک روشنی پیدا ہوتی ہے جس کا اثر اس کی گفتار اور کردار پر ہوتا ہے اور انسان راہِ حق اور صراطِ الٰہی پر گامزن ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ـــــ یہ سورت اعتقادات، پند و نصائح اور گزشتہ اقوام کی عبرت انگیز سرگزشتوں کا مجموعہ ہے اور اس میں انبیاء کی رسالت اور آسمانی کتب کے نزول کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔

اس سورہ کی فضیلت

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

من قرء سورة ابراهيم و الحجر اعطى من الاجر عشر حسنات بعدد من عبد الاصنام و بعدد من لم يعبدها

جو شخص سورہ ابراہیم اور سورہ حجر پڑھے گا خدا تعالیٰ اسے ان کی تعداد کے برابر کہ جو بتوں کی پوجا کرتے تھے اور جو پوجا نہیں کرتے تھے، دس حسنات دے گا[1]

جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ قرآن کی سورتیں پڑھنے کے سلسلے میں جس اجر و ثواب کا ذکر ہے وہ اس تلاوت کے لیے ہے جو غور و فکر سوچ بچار اور پھر عمل کے ساتھ ہو اور چونکہ اس سورہ میں نیز سورہ حجر میں توحید و شرک اور اس کی فروعات کے بارے میں بحث کی گئی ہے تو مسلمًا ان کے مضامین کی طرف توجہ اور عمل سے ایسی فضیلت بھی حاصل ہو گی یعنی یہ توجہ اور عمل انسان کو اپنے رنگ میں رنگ لے گا اور اسے ایسے مقام کا اہل بنا دے گا

✣

---

[1] مجمع البیان و نور الثقلین، اس سورہ کی تفسیر کے آغاز میں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ

۲۔ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۙ

۳۔ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۗ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ الر ۔ یہ وہ کتاب ہے جو ہم نے تجھ پر نازل کی تاکہ تو پروردگار کے فرمان سے لوگوں کو (شرک، ظلم اور طغیان کی) تاریکیوں سے نکال کر (ایمان، عدل اور صلح کی) روشنی کی طرف لے جائے، عزیز و حمید خدا کی راہ کی طرف۔

۲۔ وہی خدا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اسی کا ہے۔ کافروں کے لیے افسوس ناک ہے عذابِ شدید۔

۳۔ وہی کہ جو دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ راہِ حق کو ٹیڑھا کر دیں اور دور کی گمراہی میں ہیں۔

تفسیر

ظلمتوں سے نور کی طرف

یہ سورہ بھی قرآن کی بعض دیگر سورتوں کی طرح حروف مقطعہ (الٓرٰ) سے شروع ہوئی ہے۔ ان حروف کی تفسیر ہم سورہ بقرہ، آل عمران اور اعراف کی ابتداء میں بیان کر چکے ہیں۔ یہاں جس نکتے کا ذکر ہم ضروری سمجھتے ہیں یہ ہے کہ ۲۹ مقامات پر قرآن کی سورتوں کا آغاز حروف مقطعہ سے ہوا ہے۔ ان میں سے ۲۴ مقامات ایسے ہیں جن میں بلا فاصلہ قرآن مجید کے بارے میں گفتگو آئی ہے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ قرآن اور حروف مقطعہ کے درمیان کوئی تعلق موجود ہے اور ہو سکتا ہے یہ وہی تعلق ہو جس کا ذکر ہم سورہ بقرہ کی ابتداء میں کر چکے۔ وہ یہ کہ خدا چاہتا ہے کہ اس سے واضح کرے کہ یہ عظیم آسمانی کتاب اپنے باعظمت معانی و مفاہیم کہ جن کی بناء پر وہ تمام انسانوں کی ہدایت اپنے ذمہ لیے ہوئے ہے کے باوجود اسی سادہ سے خام مال (الف، با) سے تشکیل پائی ہے اور یہ اس اعجاز کی اہمیت کی نشانی ہے کہ وہ سادہ ترین چیز سے افضل ترین چیز کو وجود بخشتا ہے۔

بہر حال الف، لام، را ـــــ کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے: یہ وہ کتاب ہے کہ جو ہم نے تجھ پر اس لیے نازل کی کہ تو لوگوں کو گمراہیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جائے (کتاب انزلناہ الیک لتخرج الناس من الظلمٰت الی النور)۔

درحقیقت نزول قرآن کے تمام تربیتی، انسانی، روحانی اور مادی مقاصد اسی ایک جملے میں جمع ہیں "ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لے جانا" ظلم جہالت سے نورِ علم کی طرف، ظلمتِ کفر سے نورِ ایمان کی طرف، ظلمتِ ظلم سے نورِ عدالت کی طرف، ظلمت فساد سے نورِ صلاح کی طرف ظلمتِ گناہ سے نورِ تقویٰ کی طرف اور ظلمتِ افتراق سے نورِ وحدت کی طرف۔

یہ امر جاذبِ نظر ہے کہ یہاں "ظلمات" بعض دیگر قرآنی سورتوں کی طرح جمع کی شکل میں آیا ہے اور "نور" واحد کی صورت میں۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تمام نیکیاں، پاکیزگیاں، ایمان، تقویٰ اور فضیلت نورِ توحید کے سائے میں اپنے آپ میں وحدت و یگانگی کی حالت میں ہیں اور سب ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور متحد ہیں اور ان سے ایک متحد و واحد معاشرہ جو ہر لحاظ سے پاک و پاکیزہ کپڑے کی مانند ہو تیار کیا جا سکتا ہے۔

لیکن ظلمت ہر مقام پر پراگندگی اور صفوں میں تفرقہ کا سبب ہے۔ ستم گر، بدکار، آلودہ گناہ اور منحرف لوگ عموماً اپنی انحرافی راہوں میں بھی وحدت نہیں رکھتے اور آپس میں حالتِ جنگ میں ہوتے ہیں۔

تمام نیکیوں کا سرچشمہ چونکہ خدا کی ذاتِ پاک ہے اور ادراکِ توحید کی بنیادی شرط اسی حقیقت کی طرف توجہ ہے لہٰذا بلا فاصلہ مزید فرمایا گیا ہے: یہ سب کچھ ان (لوگوں) کے پروردگار کے اذن و حکم سے ہے (باذن ربھم)۔ اس نور کے بارے میں مزید توضیح کے لیے فرمایا گیا ہے: عزیز و حمید خدا کی راہ کی طرف (الی صراط العزیز الحمید)[1] وہ خدا کہ جس کی عزت اس کی قدرت کی دلیل ہے کیونکہ کسی

---

[1] الی صراط ..... درحقیقت "الی النور" کا بدل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نور کی طرف ہدایت سے مراد "عزیز و حمید" کی راہ کی طرف ہدایت ہے ضمناً "کتاب انزلناہ" مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور اصل میں "ھٰذا کتاب انزلناہ" تھا۔

کے بس میں نہیں کہ اُس پر غلبہ حاصل کرسکے اور اُس کا حمید ہونا اس کی بے پایاں نعمات کی نشانی ہے کیونکہ حمد و ستائش ہمیشہ نعمتوں عنایتوں اور زیبائیوں پر ہوتی ہے۔

اگلی آیت میں معرفتِ خدا کے لیے ایک درس توحید دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: وہی خدا کہ جو کچھ آسمان و زمین میں ہے اسی کا ہے (اللّٰہ الذی لہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض)[1]

تمام چیزیں اس کی ہیں کیونکہ وہی موجودات کا خالق ہے۔ اسی بنا پر وہ قادر و عزیز بھی ہے، تمام نعمتیں بخشنے والا اور حمید بھی۔

ذکرِ مبداء کے بعد آیت کے آخر میں مسئلہ معاد کی جانب توجہ دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وائے ہو کفار پر قیامت کے شدید عذاب سے (وویل للکافرین من عذاب شدید)۔

اگلی آیت میں بلا فاصلہ کفار کا تعارف کروایا گیا ہے۔ ان کی صفات کے تین حصوں کا ذکر کرکے ان کی کیفیت کو پوری طرح مشخص کر دیا گیا ہے اس طرح سے کہ ہر شخص ان کا سامنا کرتے ہی انہیں پہچان لے فرمایا گیا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو اس جہان کی پست زندگی کو آخرت کی زندگی پر مقدم شمار کرتے ہیں (الذین یستحبون الحیٰوۃ الدنیا علی الاٰخرۃ)[2] اسی وجہ سے وہ ایمان، حق، عدالت، شرفِ آزادگی اور سربلندی کہ جو آخرت سے لگاؤ رکھنے والوں کی خصوصیات میں سے ہیں اپنے گھٹیا مفادات، شہوات اور ہوا و ہوس پر قربان کر دیتے ہیں

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ایسے لوگ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ خود گمراہی میں پڑنے کے بعد دوسروں کو بھی بھٹکانے کی کوشش کرتے ہیں اور "وہ لوگوں کو راہ خدا سے روکتے ہیں": (ویصدون عن سبیل اللّٰہ)۔

درحقیقت وہ اللہ کی راہ کہ جو راہِ فطرت ہے اور انسان خود سے چل کر اسے عبور کر سکتا ہے اس میں طرح طرح کی دیواریں اٹھاتے ہیں اور رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔ اپنی ہوا و ہوس اور خواہشات کو بنا سنوار کر پیش کرتے ہیں، لوگوں کو گناہ کا شوق دلاتے ہیں اور راستی و پاکیزگی کے راستے سے خوفزدہ کرتے ہیں۔

ان کا کام فقط اللہ کے راستے میں رکاوٹیں اور دیواریں کھڑی کرنا نہیں بلکہ "کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے اسے بگاڑ کر پیش کریں" (ویبغونھا عوجا)۔

دراصل وہ پوری توانائیوں سے کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگ لیں اور اپنا ہم مسلک بنالیں۔ لہٰذا اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ اللہ کے سیدھے راستے کو ٹیڑھا کرکے دکھائیں۔ اسی لیے وہ اس میں طرح طرح کی خرافات اور بے ہودگیاں پیدا کرتے ہیں، مختلف تحریفات سے کام لیتے ہیں۔ قبیح بدعتوں کو رواج دیتے ہیں اور رکیک طور طریقے اختیار کرتے ہیں۔ واضح ہے کہ "ان صفات و اعمال کے حامل ہونے کی وجہ سے ایسے افراد بہت دور کی گمراہی میں ہیں" (اولٰئک فی ضلٰل بعید)۔ یہ وہی لوگ ہیں کہ راہِ حق سے زیادہ دور ہونے کی بناء پر جن کا راہِ حق کی طرف لوٹ آنا آسانی سے ممکن نہیں لیکن یہ سب کچھ خود انہی کے اعمال کا نتیجہ ہے۔

---

[1] زیر کے ساتھ لفظ "اللّٰہ" "عزیز حمید" کا بدل ہے کہ جو گزشتہ آیت میں آیا ہے۔

[2] راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "استحب الکفر علی الایمان" کا معنی یہ ہے کہ کفر کو ایمان پر مقدم شمار کریں اور استحباب کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی چیز کی محبت میں کوشش کرے اور جب یہ لفظ "علیٰ" کے ساتھ متعدی ہو تو مقدم رکھنے کا معنی دیتا ہے مثلاً: اما ثمود فھدینٰھم فاستحبوا العمیٰ علی الھدیٰ۔ (فصلت۔ ۱۷)۔

چند اہم نکات

۱۔ ایمان اور راہ خدا کو نور سے تشبیہ دینا: اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "نور" عالم مادہ کا لطیف ترین موجود ہے، اس کی رفتار نہایت تیز ہے اور جہانِ مادہ میں اس کے آثار و برکات ہر چیز سے زیادہ ہیں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام مادی نعمات و برکات کا سرچشمہ نور ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایمان اور راہِ خدا میں قدم رکھنے کو نور سے تشبیہ دینا کس قدر پُر معنی ہے۔

نور اتحاد کا سبب ہے اور ظلمت انتشار کا عامل ہے۔ نور زندگی کی علامت ہے اور ظلمت موت کی نشانی ہے۔ اسی بناء پر قرآن مجید میں بہت سے قیمتی امور کو نور سے تشبیہ دی گئی ہے۔

ان میں سے ایک عملِ صالح ہے۔

يوم ترى المؤمنين والمؤمنات يسعى نورهم بين ايديهم و بايمانهم

وہ دن کہ جب تو صاحبِ ایمان مردوں اور عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نور ان کے سامنے اور دائیں جانب رواں دواں ہوگا۔ (حدید۔ ۱۲)

ایمان و توحید کے لیے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ مثلاً:

الله ولى الذين آمنوا يخرجهم من الظلمات الى النور

اللہ ان لوگوں کا ولی و سرپرست ہے جو ایمان لائے ہیں کہ انھیں وہ ظلمتوں سے نور کی طرف ہدایت کرتا ہے (بقرہ۔ ۲۵۷)

قرآن کو بھی نور سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فالذين آمنوا به و عزروه و نصروه و اتبعوا النور الذى انزل معه اولئك هم المفلحون

اور جو پیغمبر پر ایمان لائے ہیں، اس کی عزت و توقیر کرتے ہیں، اس کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کی پیروی کرتے ہیں کہ جو اس کے ساتھ نازل ہوا ہے، وہ فلاح پانے والے ہیں۔ (اعراف۔ ۱۵۷)

نیز خدا کے آئین و دین کو اس پُر برکت وجود سے تشبیہ دی گئی ہے:

يريدون ان يطفئوا نور الله بافواههم

وہ چاہتے ہیں کہ پھونکوں سے نورِ خدا کو خاموش کر دیں۔ (توبہ۔ ۳۲)

اور سب سے بڑھ کر خدا کی ذات پاک کہ جو افضل ترین اور برترین وجود ہے بلکہ سب کی ہستی جس کے وجودِ مقدس کا پرتو ہے کو نور سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

الله نور السمٰوٰت و الارض

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (نور۔ ۳۵)

یہ تمام امور ایک ہی حقیقت کی طرف پلٹتے ہیں کیونکہ یہ سب اللہ، اس پر ایمان، اس کی گفتگو اور اس کی راہ کے پرتو ہیں۔ لہٰذا یہ

لفظ ان مواقع پر مفرد کی شکل میں آیا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس "ظلمات" چونکہ ہر جگہ انتشار و تفرقہ کا عامل ہے لہٰذا جمع کی صورت میں تعدد و تکثر کی علامت کے طور پر ذکر ہوا ہے اور خدا پر ایمان لانا، اس کی راہ میں قدم رکھنا چونکہ حرکت اور بیداری کا سبب ہے، اجتماعیت و وحدت کا عامل ہے اور ارتقاء و پیش رفت کا ذریعہ ہے لہٰذا یہ تشبیہ ہر لحاظ سے رسا، بامعنی اور باعث تربیت ہے۔

۲۔ "لتخرج" کا مفہوم: پہلی آیت میں "لتخرج" کی تعبیر درحقیقت دو نکات کی طرف اشارہ کرتی ہے:

پہلا یہ کہ قرآن مجید اگرچہ انسان کے لیے ہدایت و نجات کی کتاب ہے تاہم اسے اجراء و نفاذ کرنے والے اور عملی صورت بخشنے والے کی احتیاج ہے لہٰذا پیغمبر جیسے راہبر کی ضرورت ہے جو اس کے ذریعے راہِ حقیقت سے بھٹکے ہوؤں کو بدبختی کی ظلمات سے نورِ سعادت کی طرف ہدایت کرے۔ لہٰذا قرآن بھی اپنی اس قدر عظمت کے باوجود رہبر، راہنما، مجری اور نافذ کرنے والے کے بغیر تمام مشکلات حل نہیں کرسکتا۔

دوسرا یہ کہ خارج کرنے کی تعبیر درحقیقت تغیر و تبدل کے ساتھ حرکت دینے اور چلانے کی دلیل ہے۔ گویا بے ایمان لوگ ایک تنگ و تاریک فضا میں ہوتے ہیں اور پیغمبر و رہبران کا ہاتھ پکڑ کر انہیں وسیع اور روشن فضا میں لے جاتے ہیں۔

۳۔ سورۃ کے آغاز و اختتام پر ایک نظر: یہ امر جاذب توجہ ہے کہ اس سورۃ کا آغاز لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف ہدایت سے ہوا ہے اور اس کا اختتام بھی لوگوں کو ابلاغ و انذار پر ہوا ہے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ بہرحال اصلی ہدف خود لوگ، ان کی سرنوشت اور ان کی ہدایت ہے اور درحقیقت انبیاء و مرسلین کا بھیجا جانا اور آسمانی کتب کا نزول سب اسی مقصد کو پانے کے لیے ہے۔

۴۔ وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۖ فَيُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَآءُ وَيَهْدِي مَن يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ○

۵۔ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَآ أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَذَكِّرْهُم بِأَيَّامِ اللَّهِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ○

۶۔ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ أَنجَاكُم مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُونَ أَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَآءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُم بَلَآءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ○

۷۔ وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ۖ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ○

ترجمہ

۴۔ ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں تاکہ ان کے سامنے (حقائق) آشکار کرے پھر خدا جسے چاہے (اور مستحق سمجھے) گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے (اور مستحق سمجھے) ہدایت کرتا ہے اور وہ توانا و حکیم ہے۔

۵۔ اور ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات کے ساتھ بھیجا (اور حکم دیا) کہ اپنی قوم کو ظلمات سے نور کی طرف نکال

اور انہیں ایام اللہ یاد دلا اس میں ہر صبر کرنے والے اور شکر گزار کے لیے نشانیاں ہیں۔

۶۔ وہ وقت یاد کرو کہ جب موسٰی نے اپنی قوم سے کہا: اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد رکھو جب کہ اس نے تمہیں آلِ فرعون (کے چنگل) سے نجات بخشی۔ وہ کہ جو تمہیں بدترین طریقے سے عذاب دیتے تھے۔ تمہارے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو (خدمت گاری کے لیے) زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی۔

۷۔ (اسی طرح) اس وقت کو یاد کرو کہ جب تمہارے پروردگار نے اعلان کیا کہ اگر شکر گزاری کرو گے تو تم پر (اپنی نعمت کا) اضافہ کروں گا اور اگر کفران کرو گے تو میرا عذاب سخت ہے۔

تفسیر

زندگی کے حساس دن

گزشتہ آیات میں قرآنِ مجید اور اس کے حیات بخش اثرات کے متعلق گفتگو تھی۔ زیرِ بحث پہلی آیت میں بھی ایک خاص پہلو سے اس موضوع کے بارے میں بات کی گئی ہے اور وہ ہے انبیاء اور آسمانی کتب کی زبان کا اس پہلی قوم کی زبان سے ہم آہنگ ہونا جس کی طرف وہ مبعوث ہوئے۔

فرمایا گیا ہے: ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان میں (وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه)۔

کیونکہ ــــ پہلے پہل تو کسی پیغمبر کا تعلق اسی قوم سے پیدا ہوتا ہے جس میں سے وہ قیام کرتے ہیں، انبیاء کے ذریعے پہلی وحی کی شعاع اسی پر پڑتی ہے اور ان کے اوّلین اصحاب و انصار اسی میں سے ہوتے ہیں لہٰذا پیغمبر کو انہی کی زبان میں گفتگو کرنا چاہیے "تاکہ وہ ان کے لیے حقائق کو واضح طور پر پیش کر سکے"۔ (لیبین لهم)۔

اس جملے میں درحقیقت اس نکتے کی طرف بھی اشارہ ہے کہ عام طور پر انبیاء کی دعوت ان کے پیروکاروں پر کسی انجانے اور غیر مانوس طریقے سے منعکس نہیں ہوتی تھی بلکہ واضح و روشن طور پر اور عام مروجہ زبان میں وہ تعلیم و تربیت کرتے تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ان کے سامنے دعوتِ الٰہی کی وضاحت کے بعد "خدا جس شخص کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے" (فیضل الله من یشاء و یهدی من یشاء)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آخرکار کسی کا ہدایت یافتہ ہونا یا گمراہ ہونا انبیاء کا کام نہیں ان کا کام تو تبلیغ اور تبیین ہے۔ بندوں کی حقیقی ہدایت و رہنمائی تو خدا ہی کے ہاتھ ہے۔

اس بنا پر کہیں یہ تصور نہ ہو کہ اس کا مطلب جبر، لازمی طور پر ہونا اور انسان کی آزادی کا سلب ہونا ہے، بلا فاصلہ مزید ارشاد فرمایا گیا ہے، وہ عزیز حکیم ہے (وھو العزیز الحکیم)۔

اپنی عزت و قدرت کی وجہ سے وہ ہر چیز پر قادر و توانا ہے اور کوئی شخص اس کے ارادے کے سامنے کھڑا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اپنی حکمت کے تقاضے کے مطابق وہ کسی شخص کو بلا سبب ہدایت نہیں کرتا اور نہ کسی کو بلا وجہ گمراہ کرتا ہے بلکہ بندے اپنے ارادے کی انتہائی آزادی کے ساتھ "سیر الی اللہ" کے لیے قدم اٹھاتے ہیں اور اس کے بعد ان کے دل پر نور ہدایت اور فیض حق کی کرنیں پڑتی ہیں۔ جیسا کہ سورہ عنکبوت کی آیہ ۶۹ میں ہے:

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

جو لوگ ہماری راہ میں جہاد اور جدوجہد کرتے ہیں ہم یقینی طور پر انہیں اپنے راستوں کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔

اسی طرح جن لوگوں نے تعصب، ہٹ دھرمی، حق دشمنی، شہوات میں غوطہ زنی اور ظلم میں آلودگی کے باعث ہدایت کے لیے اپنی قابلیت گنوا دی ہے وہ فیض ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں اور ضلالت و گمراہی کی وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

کذٰلک یضل اللہ من ھو مسرف مرتاب

اسی طرح خدا ہر اسراف کرنے والے اور وہ شک شخص کو گمراہ کرتا ہے۔ (مومن - ۳۴)

یہ بھی فرمایا گیا ہے:

وما یضل بہ الا الفاسقین

اس کے ذریعے خدا صرف فاسقوں کو گمراہ کرتا ہے (بقرہ - ۲۶)

نیز یہ بھی ارشاد ہوتا ہے:

ویضل اللہ الظالمین

خدا ستمگروں کو گمراہ کرتا ہے۔ (ابراہیم - ۲۷)

گویا ہدایت و گمراہی کا سرچشمہ خود ہمارے ہاتھ میں ہے۔

اگلی آیت میں اپنے ہم عصر طاغوتوں کے مقابلے میں انبیاء کے قیام کا ایک نمونہ ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ ظلمتوں سے نکال کر وادی نور میں لے جانے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات (مختلف معجزات) کے ساتھ بھیجا اور ہم نے اسے حکم دیا کہ اپنی قوم کو ظلمات سے نور کی طرف ہدایت کرو (ولقد ارسلنا موسیٰ بآیاتنا ان اخرج قومک من الظلمات الی النور)[1]

جیسا کہ ہم نے اس سورہ کی پہلی آیت میں پڑھا ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پروگرام کا خلاصہ بھی لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف نکال لے جانا تھا۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ یہ سب خدا کے انبیاء و رسل ہیں بلکہ سب کے سب انسانوں کے معنوی و روحانی راہنما

---

[1] حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام سے ظاہر ہونے والے معجزات کی طرف زیر نظر آیت میں لفظ "آیات" کے ذریعے اشارہ کیا گیا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۱ کے مطابق وہ نو اہم معجزات تھے جن کی تفصیل اس آیت کے ضمن میں آئے گی (انشاء اللہ)۔

ہیں۔ کیا برائیاں، گمراہیاں، کجرویاں، ظلم وستم، استثمار، ذلتیں، زبوں حالیاں، فتنہ وفساد اور گناہ وظلمت وتاریکی کے علاوہ کچھ اور ہیں اور کیا ایمان وتوحید، تقویٰ وپاکیزگی، آزادی واستقلال اور سربلندی وعزت نور وضیا کے سوا کچھ اور ہے۔ اس بناء پر تمام رہبروں کی دعوت کے درمیان بالکل یہی قدر مشترک اور قدر جامع ہے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایک عظیم ذمہ داری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تیری ذمہ داری ہے کہ تو اپنی قوم کو "ایام اللہ" یاد دلائے (وذکرھم بایام اللہ)۔

مسلّم ہے کہ تمام دن ایام الٰہی ہیں جیسے تمام جگہیں اور مقامات خدا سے تعلق رکھتے ہیں اب اگر کسی خاص مقام کو "بیت اللہ" سے موسوم کیا جائے تو یہ اس کی خصوصیت کی دلیل ہے۔ اسی طرح مسلّم ہے کہ "ایام اللہ" کا عنوان مخصوص دنوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو بہت زیادہ امتیاز ودرخشندگی رکھتے ہیں۔

اسی بناء پر مفسرین نے اس کی تفسیر میں مختلف احتمالات پیش کیے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ گزشتہ انبیاء اور ان کی سچی اور اچھی امتوں کی کامیابی کے دنوں کی طرف اشارہ ہے اور اسی طرح وہ ایام بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں کہ جن میں انہیں ان کی اہلیت کی بناء پر انواع واقسام کی نعمتوں سے نوازا گیا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ ان دنوں کی طرف اشارہ ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے سرکش قوموں کو عذاب کی زنجیر میں جکڑا اور طاغوت وسرکش افراد کو ایک ہی فرمان سے تباہ وبرباد کر دیا۔

بعض نے ان دونوں حصوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

لیکن اصولی طور پر اس کو یا عمدہ اور رسا تعبیر کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تمام دن "ایام اللہ" ہیں کہ جو نوعِ بشر کی زندگی کی تاریخ میں حامل عظمت ہیں۔ ہر وہ دن کہ جس میں کوئی فرمانِ الٰہی اس طرح سے درخشندہ ہوا کہ باقی امور کو اپنے تحت الشعاع لے آیا وہ ایام اللہ میں سے ہے۔

جس روز انسانوں کی زندگی کا کوئی نیا باب کھلا، انہیں درس عبرت دیا گیا، ان میں کسی پیغمبر نے ظہور یا قیام فرمایا یا جس دن کوئی سرکش طاغوت اور فرعون ظلمت کے گڑھے میں پھینکا گیا۔۔۔ خلاصہ یہ کہ وہ دن کہ جس میں حق وعدالت برپا ہوئی اور ظلم وبدعت خاموش ہوئی وہ ایام اللہ میں سے ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ ائمہ معصومین علیہم السلام کی اس تفسیر کے ذیل میں منقول روایات میں بھی ایسے دنوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: اس گفتگو میں اور تمام ایام اللہ میں ہر صابر وبا استقامت اور شکر گزار انسان کے لیے نشانیاں ہیں (ان فی ذٰلک لاٰیٰت لکل صبار شکور)۔

"صبار" اور "شکور" دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں ان میں سے ایک صبر واستقامت زیادہ ہونے اور دوسرا نعمت واحسان پر شکر گزاری زیادہ ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ صاحبِ ایمان افراد نہ تو سختیوں اور مشکلوں کے دنوں میں حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں اور اپنے آپ کو حوادث کے حوالے کر دیتے ہیں اور نہ ہی کامیابی اور نعمت کے دنوں میں غرور وغفلت میں گرفتار ہوتے ہیں اور "ایام اللہ" کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ان دونوں کا تذکرہ گویا اسی مقصد کی نشاندہی کر رہا ہے۔

بعد والی آیت میں تاریخ بنی اسرائیل میں ایام اللہ اور درخشاں و پُربار دنوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس کا ذکر مسلمانوں کے لیے بھی تذکر تھا۔ ارشاد ہوتا ہے: اس وقت کو یاد کرو کہ جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اس نعمت خدا کا تذکرہ کرو کہ جب اس نے تمہیں آلِ فرعون سے نجات بخشی (واذ قال موسٰی لقومہ اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ انجاکم من اٰل فرعون) وہی فرعونی کہ جنہوں نے تم پر بدترین عذاب مسلط کر رکھا تھا، تمہارے بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے اور تمہاری عورتوں کو خدمت اور کنیزی کے لیے زندہ رکھتے تھے (یسومونکم سوء العذاب و یذبحون ابناءکم و یستحیون نساءکم) اور یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری بہت بڑی آزمائش تھی (وفی ذٰلکم بلاء من ربکم عظیم)

اس دن سے زیادہ بابرکت کونسا دن ہوگا کہ جس دن تمہارے سروں سے خود غرض، سنگدل اور استعمارگر لوگوں کو دور کیا گیا وہی لوگ کہ جو تمہارے ساتھ ایک بہت بڑا ستم روا رکھے ہوئے تھے۔ اس ظلم سے بڑھ کر کیا ہو سکتا تھا کہ وہ تمہارے بیٹوں کے سر جانوروں کی طرح کاٹ دیتے تھے (توجہ رہے کہ قرآن نے ذبح کہا ہے قتل نہیں) اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تمہاری عزت و ناموس بے شرم دشمن کے چنگل میں کنیزوں کی طرح گرفتار تھی۔

نہ صرف بنی اسرائیل کے لیے بلکہ تمام اقوام و ملل کے لیے آزادی و استقلال کے حصول اور طاغوت کی دست برد سے نجات کا دن ایام اللہ میں سے ہے کہ جسے انہیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ ایسی یاد کہ جس کے سبب وہ گزشتہ حالت کی طرف لوٹنے سے محفوظ رہیں۔

"یسومونکم" "سوم" (بروزن "صوم") کے مادہ سے ہے۔ دراصل یہ کسی چیز کے پیچھے جانے اور اس کی جستجو کے معنی میں ہے نیز یہ لفظ کسی پر کسی کام کو زبردستی ٹھونسنے کے معنی میں بھی آیا ہے[1]

لہٰذا "یسومونکم سوء العذاب" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تم پر بدترین سختیاں اور عذاب مسلط کرتے تھے۔ کیا یہ کم مصیبت ہے کہ ایک گروہ کی فعال قوت کو فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے اور اس کی عورتوں کو کسی سرپرست کے بغیر چند ظالموں کے چنگل میں کنیزوں کی طرح باقی رہنے دیا جائے۔

ضمناً "یسومون" کا فعل مضارع کی صورت میں ہونا اس طرف اشارہ ہے کہ یہ کام مدتوں جاری رہا[2]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ بیٹوں کے سر کاٹنے اور عورتوں کی کنیزی کے ذکر کے بعد ان کا واؤ کے ذریعے "سوء العذاب" پر عطف کیا گیا ہے حالانکہ یہ خود "سوء العذاب" کا مصداق ہیں۔ ایسا ان دونوں عذابوں کی اہمیت کی بنا پر ہوا ہے۔ نیز یہ نشاندہی کرتا ہے کہ فرعون کی جابر اور ستمگر قوم بنی اسرائیل پر اور مظالم بھی روا رکھتی تھی لیکن ان میں سے یہ دو ظلم بہت شدید اور نہایت سخت تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہ بات بھی یاد رکھو کہ تمہارے پروردگار نے اعلان کیا کہ اگر میری نعمتوں کا شکر بجالاؤ تو یقیناً میں تمہاری نعمتوں میں اضافہ کروں گا اور اگر کفران کرو تو میرا عذاب اور سزا شدید ہے (واذ تأذن ربکم لئن شکرتم لازیدنکم و لئن کفرتم ان عذابی لشدید)[3]

---

[1] مفردات راغب، تفسیر المنار (جلد ۱ صفحہ ۳۰۴) اور تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۱ صفحہ ۷ کی طرف رجوع کریں۔

[2] توجہ رہے کہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس آیت کی نظیر سورہ بقرہ کی آیت ۴۹ میں بھی ہے۔

[3] "تأذن" باب تفعل سے ہے اور تاکید سے اعلان کرنے کے معنی میں ہے کیونکہ اس سے افعال کا مادہ "ایذان" اعلان کے معنی میں ہے اور جب تفعل کے معنی میں گئے تو اس سے اضافہ اور تاکید کا استفادہ ہوتا ہے۔

ہو سکتا ہے یہ آیت بنی اسرائیل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو کا تسلسل ہو۔ آپ نے انہیں اس نجات، کامیابی اور نعمات فراواں پر شکرگزاری کی دعوت دی اور ان سے نعمت میں اضافے کا وعدہ کیا اور کفران کی صورت میں عذاب کی تہدید کی اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایک مستقل جملہ ہو اور مسلمانوں سے خطاب ہو لیکن بہرحال نتیجے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اگر بنی اسرائیل کو خطاب ہو پھر بھی قرآن مجید میں ہمارے لیے ایک اصلاحی درس کے طور پر آیا ہے۔

یہ امر جاذبِ نظر ہے کہ شکر کے بارے میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے: "لازیدنکم" (یقیناً میں اپنی نعمت تم پر زیادہ کر دوں گا) جب کہ کفرانِ نعمت کے بارے میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ تمہیں عذاب کروں گا بلکہ ارشاد ہوتا ہے: "میرا عذاب شدید ہے" یہ تعبیر کا یہ فرق پروردگار کا انتہائی لطف و کرم ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ ایام اللہ کی یاد آوری: جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ "اللہ" کی طرف "ایام" کی اضافت انسانوں کی زندگی کے اہم اور تقدیر ساز دنوں کی طرف اشارہ ہے اور ان دنوں کی عظمت کی بناء پر انہیں خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ نیز اس بناء پر کہ اگر ایک عظیم نعمتِ الٰہی کسی لائق قوم کے شاملِ حال ہو۔ یا عظیم عذابِ الٰہی کسی سرکش و طغیان گر قوم کو دامن گیر ہو تو دونوں صورتوں میں تذکرہ یاد آوری کے لائق ہے۔

آئمہ معصومین علیہم السلام سے منقول روایات میں "ایام اللہ" کی تفسیر مختلف دنوں سے کی گئی ہے۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

ایام اللہ، یوم یقوم القائم (ع) و یوم الکرۃ و یوم القیامۃ

ایام اللہ مہدی موعود کے قیام کا دن، روزِ رجعت اور قیامت ہیں[1]

تفسیر علی بن ابراہیم میں ہے:

"ایام اللہ تین دن ہیں قیام مہدیؑ کا دن، موت کا دن اور قیامت کا دن"[2]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

ایام اللہ نعمائہ و بلائہ و بلائہ سبحانہ

ایام اللہ اس کی نعمتوں اور اس کی طرف سے مصائب کے ذریعے آزمائشوں کے دن ہیں[3]

جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے اس قسم کی احادیث کبھی بھی اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ مفہوم انہی میں منحصر ہے بلکہ ان میں بعض مصادیق کے بعض حصوں کا بیان ہے۔

بہرحال عظیم دنوں کی یاد آوری (چاہے وہ کامیابی کے دن ہوں یا سختی کے) ملتوں کی بیداری اور ہوشیاری میں بہت مؤثر ہوتی ہے۔

---

[1]، [2] و [3] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۵۲۳۔

اسی آسمانی پیام سے ہدایت لیتے ہوئے ہم تاریخ اسلام کے عظیم دنوں کی یاد کو زندہ و جاوداں رکھتے ہیں اور ان یادوں کو تازہ کرنے کے لیے ہر سال ہم نے کچھ دنوں کو مخصوص کیا ہوا ہے۔ ان دنوں میں ہم اپنے ماضی کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور اس سے ہم درس لیتے ہیں، ایسے درس کہ جو ہمارے آج کے لیے بہت زیادہ موثر ہیں۔

نیز ہماری موجودہ تاریخ میں خصوصاً انقلاب اسلامی ایران کی پُرشکوہ تاریخ میں بہت سے دن ایسے ہیں جو "ایام اللہ" کے مصداق ہیں۔ ہر سال ہمیں ان کی یاد زندہ رکھنا چاہیے ایسی یاد کہ جس میں شہیدوں، غازیوں، مجاہدوں اور عظیم دلاوروں کی یاد رچی بسی ہو اور پھر ان سے ہدایت لینا چاہیے اور ان کی عظیم میراث کی پاسداری کرنا چاہیے۔

لہٰذا ان عظیم دنوں کا ذکر ہمارے مدارس کی درسی کتب میں ہونا چاہیے اور ان کی یاد ہماری اولاد کی تعلیم و تربیت کا حصہ ہونا چاہیے اور ہمیں آئندہ نسلوں کے بارے میں "ذکرھم" (انہیں یاد دلاؤ) کی ذمہ داری پوری کرنا چاہیے۔

قرآن مجید میں بھی بار ہا "ایام اللہ" کی یاد دہانی کروائی گئی ہے۔ بنی اسرائیل کے بارے میں بھی اور مسلمانوں کے بارے میں بھی نعمتوں اور سختیوں کے دنوں کو یاد رکھا گیا ہے۔

۲۔ جابروں کے طور طریقے: ہم نے بار ہا قرآنی آیات میں پڑھا ہے کہ فرعونی بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کر دیتے تھے اور لڑکیوں کو زندہ رکھتے تھے۔ یہ کام صرف فرعون اور فرعونی نہیں کرتے تھے بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ ہر استعمارگر کا یہی شیوہ اور طریقہ تھا کہ وہ فعال، جنگجو اور پرعزم قوتوں کا ایک حصہ نابود کر دیتے اور دوسرے کو کمزور کرکے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے استعماری اور استثماری کام جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔

لیکن اہم بات یہ کہ ہم سمجھیں کہ ایسی قوتیں کبھی تو فرعونیوں کی طرح لڑکوں کو نابود ہی کر دیتی ہیں اور کبھی منشیات، شراب اور بدکاری جیسی بری عادتوں میں غرق کرکے فعال قوتوں کو ناکارہ بنا دیتی ہیں اور انہیں زندہ نما مردہ بنا دیتی ہیں۔ یہی وہ چیز ہے کہ جس پر مسلمانوں کو گہری فکر کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر ان کی نسلِ نو ایسے کاموں میں پڑ گئی اور اپنی ایمانی و جسمانی قوت گنوا بیٹھی تو پھر انہیں جان لینا چاہیے کہ ان کے لیے غلامی یقینی ہے۔

۳۔ سب سے بڑی نعمت آزادی ہے: یہ امر جاذب نظر ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں "ایام اللہ" کے ذکر کے بعد صرف ایک دن کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ دن کہ جو فرعونیوں کے چنگل سے بنی اسرائیل کی نجات کا دن ہے (اذ انجٰکم من اٰل فرعون) حالانکہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں اور بھی بہت سے عظیم دن تھے کہ جن میں حضرت موسیٰ کی ہدایت کے زیر سایہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عظیم نعمتیں بخشی تھیں لیکن زیر بحث آیات میں "یوم نجات" کا ذکر قوموں کی سرنوشت میں آزادی اور استقلال کی انتہائی اہمیت کی دلیل ہے۔

جی ہاں! جب تک کوئی قوم وابستگی سے نجات حاصل نہ کرے، غلامی اور استعمار کے چنگل سے آزاد نہ ہو اس کی صلاحیتیں، استعداد اور کمال ظاہر نہیں ہو سکتا اور وہ اللہ کی راہ میں قدم نہیں رکھ سکتی وہ راہ کہ شرک، ظلم اور بیداد کے خلاف قیام کا راستہ ہے۔

اسی بنا پر عظیم الٰہی رہبروں کا پہلا کام یہی تھا کہ وہ قوموں کو فکری، ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی غلامی سے آزاد کروائیں اور اس کے بعد کوئی اور کام کریں اور توحید و انسانیت کے پروگراموں کو عملی شکل دیں۔

۴۔ شکرِ نعمت اور کفرانِ نعمت کا نتیجہ: اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی عطا کردہ نعمتوں پر ہمارے شکر کا محتا

اور اگر وہ شکرگزاری کا حکم دیتا ہے تو وہ بھی ہم پر ایک اور نعمت کا موجب ہے اور ایک اعلیٰ درجے کا تربیتی انداز ہے۔

اہم یہ بات ہے کہ ہم دیکھیں کہ شکر کی حقیقت کیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اس کا نعمت کی زیادتی سے کیا تعلق ہے اور کس طرح وہ خود ایک عامل تربیت ہو سکتا ہے۔

شکر کا مطلب یہ نہیں کہ صرف زبانی شکر کیا جائے یا "الحمد للّٰہ" وغیرہ کہا جائے بلکہ شکر کے تین مراحل ہیں:

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ سنجیدگی سے غور کیا جائے کہ نعمت عطا کرنے والا کون ہے۔ یہ توجہ، ایمان اور آگاہی شکر کا پہلا ستون ہے۔

دوسرا مرحلہ اس سے آگے زبان کا مرحلہ ہے۔ لیکن

تیسرا مرحلہ اس سے بھی بالاتر ہے اور وہ عمل کا مرحلہ ہے یعنی عملی شکر یہ ہے یعنی ہم پوری طرح سے غور کریں کہ ہر نعمت ہمیں کس مقصد کے لیے دی گئی ہے اور اسے ہم اس کے اپنے مقام پر صرف کریں اور اگر ایسا نہ کیا تو پھر ہم نے کفران نعمت کیا۔ جیسا کہ بزرگوں نے فرمایا ہے:

الشکر صرف العبد جمیع ما انعمہ اللہ تعالیٰ فیما خلق لاجلہ

شکر یہ ہے کہ بندہ ہر نعمت کو اس کے مصرف ہی میں صرف کرے۔

واقعاً خدا نے ہمیں آنکھیں کیوں دی ہیں، اس نے ہمیں دیکھنے اور سننے کی نعمت کیوں بخشی ہے۔ کیا اس کے علاوہ کوئی مقصد تھا کہ ہم جہان میں اس کی عظمت کو دیکھیں، راہ حیات کو پہچانیں اور ان وسائل کے ذریعے تکامل و ارتقاء کی طرف قدم بڑھائیں، اور اِحقاقِ حق کریں، حمایتِ حق کریں، اس کا دفاع کریں اور باطل کے خلاف جنگ کریں۔ اگر خدا کی ان عظیم نعمتوں کو ہم نے ان کے راستے میں صرف کیا تو ان کا عملی شکر ہے اور اگر یہ نعمتیں طغیان، خود پرستی، غرور، غفلت اور خدا سے دوری کا ذریعہ بن گئیں تو یہ عین کفران ہے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ادنی الشکر، رؤیۃ النعمۃ من اللہ من غیر علۃ یتعلق القلب بھا دون اللہ، والرضا بما اعطاہ، وان لا تعصیہ بنعمۃ وتخالفہ بشیء من امرہ ونھیہ بسبب من نعمتہ

کمترین شکر یہ ہے کہ تو نعمت کو خدا کی طرف سے سمجھے بغیر اس کے کہ تیرا دل اس نعمت میں مشغول رہے اور تو خدا کو بھول جائے اور (شکر) اس کی عطا پر راضی ہونا ہے اور یہ کہ تو اُس کی نعمت کو اس کی نافرمانی کا ذریعہ نہ بنائے اور اس کی نعمتوں سے استفادہ کرنے کے باوجود تو اس کے اوامر و نواہی کو روند نہ ڈالے۔[1]

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ طاقت، علم، قوتِ فکر و نظر، معاشرتی حیثیت، مال و ثروت اور تندرستی و سلامتی میں سے ہر ایک کے شکر کا راستہ کیا ہے اور کفران کی راہ کونسی ہے۔

تفسیر نور الثقلین میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ایک حدیث بھی اس تفسیر کے لیے ایک واضح دلیل ہے۔ آپ نے فرمایا:

شکر النعمۃ اجتناب المحارم

شکرِ نعمت گناہوں سے بچنے کا نام ہے۔[2]

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۷۱۰۔

[2] نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۵۲۹۔

یہیں سے شکر اور نعمت میں اضافے کے درمیان تعلق واضح ہو جاتا ہے کیونکہ جب بھی انسانوں نے نعماتِ الٰہی کو بالکل مقاصدِ نعمت کے تحت صرف کیا تو انہوں نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ وہ اہل ہیں اور یہ اہلیت زیادہ سے زیادہ فیض اور رفزوں تر نعمت کا سبب بنی۔

اصولی طور پر شکر دو طرح کا ہے:

۱۔ شکرِ تکوینی اور

۲۔ شکرِ تشریعی

شکرِ تکوینی یہ ہے کہ ایک موجود خود کو حاصل نعمات کو اپنے رشد و نمو کے لیے استعمال کرے۔ مثلاً باغباں دیکھتا ہے کہ باغ کے فلاں حصے یں درخت خوب پھل پھول رہے ہیں اور ان کی جتنی زیادہ خدمت کی جائے اتنے ہی زیادہ شگوفے پھوٹتے ہیں۔ یہی امر سبب بنتا ہے کہ باغبان باغ کے درختوں کے اس حصے کی خدمت پر زیادہ توجہ دیتا ہے اور اپنے کارکنوں کو ان کی نگہبانی کی نصیحت کرتا ہے کیونکہ درخت زبانِ حال سے پکار رہے ہوتے ہیں کہ اے باغبان: ہم اس بات کے اہل ہیں کہ تو اپنی نعمت و احسان ہم پر زیادہ کرے۔

وہ بھی اس پکار کا مثبت جواب دیتا ہے۔

بسوزند چوب درختان بی بر

سزا خود ہمین است مر بی بری را

بے ثمر درختوں کی لکڑیاں جلیں کیونکہ بے ثمری کی یہی سزا ہے۔

جہانِ بشری کی بھی یہی حالت ہے۔ فرق یہ ہے کہ درخت میں خود اختیاری نہیں ہے اور وہ فقط تکوینی قوانین کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں لیکن انسان اپنے ارادہ و اختیار کی طاقت سے اور تشریعی تعلیم و تربیت سے استفادہ کرتے ہوئے اس راہ پر آگاہی سے قدم رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ شخص کہ جو طاقت کی نعمت کو ظلم و سرکشی کا وسیلہ بناتا ہے گویا زبانِ حال سے پکار رہا ہوتا ہے کہ خداوندا! میں اس نعمت کے لائق نہیں اور جو شخص اپنی صلاحیت کو حق و عدالت کی راہ میں کام میں لاتا ہے وہ گویا زبانِ حال سے کہہ رہا ہوتا ہے کہ پروردگارا! میں اس لائق ہوں، لہٰذا اضافہ فرما۔

یہ حقیقت بھی ناقابلِ تردید ہے کہ جس وقت ہم شکرِ الٰہی بجا لاتے ہیں، چاہے وہ فکر و نظر سے ہو، چاہے زبان سے اور چاہے عمل سے شکر کی یہ توانائی خود ہر مرحلے میں ایک نئی نعمت ہے اور اس طرح سے شکر کرنا ہمیں اس کی نئی نعمتوں کا مرہونِ منت قرار دیتا ہے اور یوں یہ ہرگز ہمارے بس میں نہیں کہ اس کے شکر کا حق ادا کر سکیں۔ جیسا کہ امام سجاد علیہ السلام کی پندرہ مناجاتوں میں سے مناجاتِ شاکرین میں ہے:

کیف لی بتحصیل الشکر و شکری ایاک یفتقر الی شکر، فکلما قلت لک الحمد وجب علی لذلک ان اقول لک الحمد

میں تیرے شکر کا حق کیسے ادا کر سکتا ہوں جب کہ میرا یہ شکر ایک اور شکر کا محتاج ہے اور جب میں "لک الحمد" کہتا ہوں تو مجھ پر لازم ہے کہ اس شکر گزاری کی توفیق پر کہوں: "لک الحمد"

لہٰذا انسان کے لیے مرحلۂ شکر کا افضل ترین مقام یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی نعمتوں پر شکر سے عاجزی کا اظہار کرے جیسا کہ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

فیما اوحی اللہ عزوجل الی موسٰی اشکرنی حق شکری فقال یارب و کیف اشکرک حق شکرک و لیس من شکر اشکرک بہ الا و انت انعمت بہ علی قال یا موسٰی الان شکرتنی حین علمت ان ذٰلک منی

خدا نے موسٰی کی طرف وحی کی کہ میرا حقِ شکر ادا کرو تو انہوں نے عرض کیا، پروردگارا! میں تیرا حقِ شکر کس طرح ادا کروں جب کہ میں جب بھی تیرا شکر بجالاؤں تو یہ توفیق بھی خود میرے لیے ایک نعمت ہوگی۔

اللہ نے فرمایا: اب تو نے میرا حقِ شکر ادا کیا جب کہ تو نے جانا کہ حتّٰی یہ توفیق بھی میری طرف سے ہے[1]

بندہ ہمان بہ کہ ز تقصیر خویش
عذر بہ درگاہ خدا آورد
ورنہ سزاوار خداوندیش
کس نتواند کہ بجا آورد

اچھا بندہ وہی ہے کہ جو اپنی کوتاہیوں کا عذر بارگاہِ الٰہی میں پیش کردے ورنہ اس کی خداوندی کا حق کوئی بجا نہیں لاسکتا۔

شکرِ نعمت کے بارے میں چند اہم نکات

۱۔ حضرت علیؑ نہج البلاغہ میں اپنے حکمت آمیز کلمات میں فرماتے ہیں:

اذا وصلت الیکم اطراف النعم فلا تنفروا اقصاہا بقلۃ الشکر

جس وقت نعماتِ الٰہی کا پہلا حصہ تم تک پہنچ جائے تو کوشش کرو شکر کے ذریعے باقی حصے کو بھی اپنی طرف جذب کرو نہ یہ کہ شکر گزاری میں کمی کرکے اسے اپنے آپ سے دُور بھگا دو[2]

۲۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے نعمتوں پر صرف خدا کی سپاس گزاری اور شکر کافی نہیں بلکہ ان لوگوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ جو اس نعمت کا ذریعہ بنے ہیں اور ان کی زحمات و مشقات کا حق بھی اس طریقے سے ادا کرنا چاہیے اور اس طرح انہیں اس راہ میں مزید خدمات کی تشویق دلانا چاہیے۔ ایک حدیث میں امام علی بن الحسین علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

جب روزِ قیامت ہوگا تو خدا اپنے بعض بندوں سے فرمائے گا: کیا تم نے فلاں شخص کا شکریہ ادا کیا ہے۔

تو وہ عرض کرے گا: پروردگارا! میں نے تیرا شکر ادا کیا ہے۔

اللہ فرمائے گا: چونکہ تو اس کا شکر بجا نہیں لایا تو گویا تو نے میرا شکر بھی ادا نہیں کیا۔

پھر امامؑ نے فرمایا:

---

[1] اصولِ کافی جلد ۲ صفحہ ۹۸ (باب الشکر)۔

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار شمارہ ۱۳۔

اشکرکم اللہ اشکرکم للناس

تم میں سے خدا کا زیادہ شکر کرنے والے وہ ہیں جو لوگوں کا زیادہ شکریہ ادا کرتے ہیں[1]

۳۔ خدا کی نعمتوں کی افزائش کہ جس کا شکرگزاروں سے وعدہ کیا گیا ہے صرف اس لیے نہیں ہے کہ انہیں نئی مادی نعمتیں بخشی جائیں بلکہ خود شکرگزاری کہ جو خدا کی طرف خاص توجہ اور اس کی ساحتِ مقدس سے نئے عشق کے ساتھ ہو ایک عظیم روحانی نعمت ہے کہ جو انسانی نفوس کی تربیت اور انہیں فرامینِ الٰہی کی اطاعت کی طرف رغبت دلانے کے لیے بہت مؤثر ہے۔ بلکہ شکر ذاتی طور پر زیادہ سے زیادہ معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اسی بناء پر علماء عقائد علم کلام میں "وجوب معرفت الٰہی" کو ثابت کرنے کے لیے "وجوب شکرِ منعم" کی دلیل پیش کرتے ہیں۔

۴۔ معاشرے میں تحریک پیدا کرنے اور پیش رفت کے لیے روحِ شکرگزاری کا احیاء بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ لوگ کہ جنہوں نے اپنے علم و دانش سے یا فداکاری اور شہادت سے یا کسی دوسرے طریقے سے اجتماعی اہداف کی پیش رفت کے لیے خدمت کی، ان کی قدردانی اور ان کا تشکر معاشرے کو آگے بڑھانے کا بہت اہم عامل ہے۔ جس معاشرے میں تشکر اور قدردانی کی روح سردہ ہو اس میں خدمت کے لیے لگاؤ اور گرم جوشی بہت کم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جس معاشرے میں لوگوں کی زحمتوں اور خدمتوں کی زیادہ قدردانی کی جاتی ہو وہاں نشاط و مسرت زیادہ محسوس کی جا سکتی ہے اور ایسی قومیں زیادہ ترقی کرتی ہیں۔

اسی حقیقت کی طرف توجہ کے سبب ہمارے ہاں گزشتہ بزرگوں کی زحمتوں کی قدردانی کے اظہار کے لیے ان کے سو سالہ، ہزار سالہ روز ولادت وغیرہ کے موقع پر اور دیگر مناسب مواقع پر پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں اور ان کی خدمات کے تشکر اور سپاس گزاری سے لوگوں میں زیادہ سے زیادہ حرکت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مثلاً ہمارے ملک میں برپا ہونے والے اسلامی انقلاب کہ جو اڑھائی ہزار سالہ تاریک دور کا اختتام ہے اور ایک دورِ نو کا آغاز ہے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر سال اور ہر ماہ بلکہ ہر روز شہدائے انقلاب کی یاد تازہ کی جاتی ہے، انہیں ہدیۂ عقیدت و سلام پیش کیا جاتا ہے ان تمام لوگوں کا احترام کیا جاتا ہے جو ان کی طرف منسوب ہے اور ان کی خدمات کو سراہا جاتا ہے تو یہ امر سبب بنتا ہے کہ دوسروں میں فداکاری اور قربانی کا عشق پیدا ہو اور لوگوں میں فداکاری کی سطح بلند تر ہو اور قرآن کی تعبیر کے مطابق اس نعمت کا تشکر اس میں اضافے کا باعث ہو اور ایک شہید کے خون سے ہزاروں شہدار پیدا ہوں اور "لازیدنکم" کا زندہ مصداق بن جائیں۔

---

[1] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۸۱ حدیث ۳۰۔

۸۔ وَقَالَ مُوسَىٰ إِن تَكْفُرُوا أَنتُمْ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ ۝

۹۔ أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ ۛ وَالَّذِينَ مِن بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ ۚ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ۝

۱۰۔ قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ قَالُوا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيدُونَ أَن تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ۝

ترجمہ

۸۔ موسیٰ نے (بنی اسرائیل سے) کہا: اگر تم اور روئے زمین کے تمام لوگ کافر ہو جائیں تو (خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ) خدا بے نیاز اور لائق ستائش ہے۔

۹۔ کیا تمہیں ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی کہ جو تم سے پہلے تھے۔ قوم نوح، عاد، ثمود اور وہ جو ان کے بعد تھے وہی کہ جن سے خدا کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں ہے۔ ان کے پیغمبران کے پاس واضح دلائل لے کر آئے لیکن انہوں نے (تعجب اور استہزاء سے) اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ ہم اس چیز کے کافر ہیں جس کے لیے تم مامور ہو اور جس

کی طرف تم بلاتے ہو اس کے بارے میں ہمیں شک ہے۔

۱۰۔ ان کے رسولوں نے کہا: کیا اللہ کے بارے میں شک ہے؟ وہ اللہ کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، وہ کہ جو تمہیں دعوت دیتا ہے تاکہ تمہارے گناہ بخش دے اور تمہیں مقرر وعدہ گاہ تک باقی رکھے۔ انہوں نے کہا: (ہم یہ باتیں نہیں سمجھتے ہم تو اتنی بات جانتے ہیں کہ) تم تو ہمارے جیسے انسان ہو اور تم چاہتے ہو کہ ہمارے آباؤ اجداد جن کی پوجا کرتے تھے اس سے باز رکھو تم ہمارے لیے کوئی واضح دلیل لاؤ۔

تفسیر

کیا خدا کے بارے میں شک ہے؟

زیر نظر پہلی آیت شکرگزاری اور کفران نعمت کی بحث کی تائید و تکمیل ہے اور یہ آیت حضرت موسیٰ بن عمران کی زبانی گفتگو کے ضمن میں نقل ہوئی۔ فرمایا گیا ہے، موسیٰ نے بنی اسرائیل کو یاد دہانی کروائی کہ اگر تم اور روئے زمین کے تمام لوگ کافر ہو جائیں (اور خدا کی نعمت کا کفران کریں) تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ وہ بے نیاز اور لائق ستائش ہے (و قال موسٰی ان تکفروا انتم و من فی الارض جمیعًا فان اللہ لغنی حمید)[1]۔

درحقیقت شکر نعمت اور خدا پر ایمان تمہارے لیے نعمت میں اضافے، تمہارے تکامل، عار تقاء اور تمہاری عزت و افتخار کا سبب ہے ورنہ خدا تو ایسا بے نیاز ہے کہ اگر پوری کائنات کافر ہو جائے تو اس کے دامن کبریائی پر کوئی گرد نہیں پڑ سکتی کیونکہ وہ سب سے بے نیاز ہے۔ یہاں تک کہ وہ تشکر و ستائش کا محتاج بھی نہیں کیونکہ وہ ذاتی طور پر لائق حمد ہے (حمید)۔

اگر اس کی ذاتِ پاک میں نیاز و احتیاج ہوتی تو وہ واجب الوجود نہ ہوتا۔ لہٰذا اس کے غنی ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ تمام کمالات اس میں جمع ہیں اور جو ایسا ہے وہ ذاتی طور پر تعریف کے لائق ہے کیونکہ "حمید" کا معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ لائق حمد ہے۔

اس کے بعد چند آیات میں بعض گزشتہ اقوام کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ وہی اقوام کہ جنہوں نے نعماتِ الٰہی پر کفرانِ نعمت کا راستہ اختیار کیا اور ہادیانِ الٰہی کی دعوت پہان کی مخالفت کی اور کفر کی راہ اپنائی۔ ان آیات میں ان کی منطق اور ان کے انجام کی تشریح کی گئی ہے تاکہ گزشتہ آیت کے مضمون پر تاکید ہو جائے ارشاد ہوتا ہے: کیا تم تک ان لوگوں کی خبر پہنچی ہے کہ جو تم سے پہلے تھے (الم یأتکم نبؤا الذین من قبلکم)۔

ہو سکتا ہے یہ جملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو کا آخری حصہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ قرآن کی طرف سے مسلمانوں کو خطاب کی صورت

---

[1] واضح ہے کہ "ان تکفروا" جملہ شرطیہ ہے اور اس کی جزا محذوف ہے اور "ان اللہ لغنی حمید" اس پر دلالت کرتا ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا: ان تکفروا ---- لا تضروا اللہ شیئًا ----

میں ایک مستقل بیان ہو۔ بہرحال نتیجے کے لحاظ سے دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: قوم نوح، عاد اور ثمود جیسی قومیں اور وہ کہ جو ان کے بعد تھیں (قوم نوح و عاد و ثمود والذین من بعدھم)۔

وہی کہ جنہیں خدا کے علاوہ کوئی نہیں پہچانتا اور اس کے علاوہ کوئی ان کے حالات سے آگاہ نہیں ہے (لا یعلمھم الا اللہ)[1]

اس میں شک نہیں کہ قوم نوح، عاد، ثمود اور ان کے بعد آنے والی قوموں کے کچھ حالات ہم تک پہنچے ہیں لیکن مسلّم ہے کہ بیشتر حصہ ہم تک نہیں پہنچا کہ جس سے صرف خدا ہی آگاہ ہے۔ گذشتہ اقوام کی تاریخ میں اس قدر اسرار، خصوصیات اور جزئیات تھیں کہ شاید وہ کچھ کہ جو ہم تک پہنچا ہے اس کے مقابلے میں کہ جو نہیں پہنچا بہت ہی کم اور ناچیز ہے۔

اس کے بعد ان کی سرگزشت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کے پیغمبر واضح دلائل کے ساتھ ان کی طرف آئے لیکن انہوں نے تعجب و انکار کی بنا پر اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ جن چیزوں کے لیے تم بھیجے گئے ہو ہم ان سے کفر کرتے ہیں (جاءتھم رسلھم بالبینات فردوا ایدیھم فی افواھھم و قالوا انا کفرنا بما ارسلتم بہ) کیونکہ "ہم ہر اس چیز کے بارے میں شک رکھتے ہیں کہ جس کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو" اور اس شک کے ہوتے ہوئے کس طرح ممکن ہے کہ ہم تمہاری دعوت قبول کریں (و انا لفی شک مما تدعوننا الیہ مریب)۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انہوں نے پہلے انبیاء کے بارے میں کفر اور بے ایمانی کا اظہار کیا لیکن اس کے بعد انہوں نے کہا کہ ہمیں شک ہے اور لفظ "مریب" کے ساتھ اپنی بات مکمل کی، تو یہ دونوں چیزیں آپس میں کیا مناسبت رکھتی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تردد و شک کا اظہار در حقیقت عدم ایمان کی علت ہے کیونکہ ایمان کے لیے یقین کی ضرورت ہے اور شک اس میں رکاوٹ ہے۔

گزشتہ آیت میں چونکہ مشرکین اور کفار نے شک کو بنیاد قرار دیتے ہوئے عدم ایمان کا اظہار کیا لہٰذا بعد والی آیت میں بلافاصلہ مختصر سی عبارت میں واضح دلیل پیش کر کے ان کے شک کی نفی کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان کے پیغمبروں نے ان سے کہا کہ کیا اس خدا کے وجود میں شک کرتے ہو کہ جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے (قالت رسلھم افی اللہ شک فاطر السمٰوٰت والارض)۔

"فاطر" دراصل شگاف کرنے والے کے معنی میں ہے لیکن یہاں پیدا کرنے والے کے لیے کنایہ کے طور پر استعمال ہوا ہے کہ جو ایک حساب شدہ پروگرام کے تحت کسی چیز کو پیدا کرتا ہے اور پھر اس کی حفاظت کرتا ہے کیونکہ اس کے وجود کی برکت اور نورِ ہستی سے ظلمتِ عدم پھٹ جاتی ہے اور شگافتہ ہو جاتی ہے جیسے سپیدۂ سحر ظلمتِ شب کا پردہ چاک کر دیتا ہے اور جیسے کھجور کا خوشہ اپنے غلاف کو شگافتہ کر دیتا ہے اسی لیے عرب اسے "فطر" (بروزنِ "شتر") کہتے ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "فاطر" جہان کے ابتدائی مادہ کے ٹکڑے میں شگاف کرنے کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ جدید سائنس کہتی ہے کہ مادۂ عالم مجموعی طور پر باہم پیوستہ چیز تھی کہ جو بعد میں شگافتہ ہو کر مختلف کروں کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

بہرحال قرآن دیگر اکثر مواقع کی طرح خدا کے وجود اور صفات کو ثابت کرنے کے لیے یہاں نظامِ عالمِ ہستی اور آسمانوں اور زمین کی

---

[1] جملہ لا یعلمھم الا اللہ ممکن ہے پہلے جملے پر معطوف ہو اور واؤ حذف ہو گئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے جملے کے لیے جملۂ وصفیہ کی شبیہ ہو۔

خلقت کا ذکر کرتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خدا شناسی کے سلسلے میں اس سے زیادہ زندہ اور زیادہ روشن کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ اس عجیب و غریب نظام کا ہر گوشہ اسرار سے معمور ہے کہ جو زبانِ حال سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ سوائے ایک قادرِ حکیم اور عالمِ مطلق کے کوئی بھی ایسی قدرت پیش نہیں کر سکتا۔ اسی بناء پر جس قدر انسانی علم ترقی کر رہا ہے اتنے ہی اس نظام کے دلائل آشکار ہو رہے ہیں اور یہ امر ہمیں ہر لحظہ خدا سے نزدیک کرتا ہے۔

واقعاً قرآن کس قدر عجائب و غرائب کا حامل ہے کہ جس نے خدا شناسی اور توحید کی بحث کو اسی ایک جملے میں استفہام انکاری کی صورت میں ذکر کیا ہے — "افی اللہ شک فاطر السمٰوٰت و الارض" وہ جملہ کہ جس کے تجزیہ و تحلیل اور وسیع بحث کے لیے ہزار ہا کتابیں بھی کافی نہیں ہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اسرارِ ہستی اور نظامِ آفرینش ہمیں صرف وجودِ خدا کی طرف ہدایت نہیں کرتا بلکہ اس کی صفات مثلاً علم و قدرت، حکمت و دانائی اور ازلیت و ابدیت بھی اس مطالعہ سے واضح ہوتی ہیں۔

اس کے بعد منکرین کے دوسرے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ اعتراض پیغمبرانِ الٰہی کی رسالت کے بارے میں ہے (کیونکہ انہیں توحید کے بارے میں بھی شک تھا اور دعوتِ پیغمبر کے بارے میں بھی)۔

یہ مسلّم ہے کہ دانا و حکیم پروردگار اپنے بندوں کو ہرگز راہبر کے بغیر نہیں رہنے دیتا بلکہ "وہ انبیاء بھیج کر تمہیں دعوت دیتا ہے تاکہ تمہیں گناہوں اور آلودگیوں سے پاک کرے اور تمہارے گناہ بخش دے" (یدعوکم لیغفر لکم من ذنوبکم)[1] اور اس کے علاوہ "تمہیں معین زمانے تک باقی رکھے"، "تاکہ تم اپنے کمال و ارتقاء کی راہ طے کر سکو اور اس زندگی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکو" (و یؤخرکم الی اجل مسمّی)۔

درحقیقت دعوتِ انبیاء کے دو اہداف تھے۔ ایک گناہوں کی بخشش یعنی انسان کے جسم و روح اور زندگی کی پاکیزگی اور دوسرا مقررہ مدت تک زندگی کی بقاء۔ اور یہ دونوں دراصل ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں کیونکہ وہی معاشرہ باقی رہ سکتا ہے جو گناہ و ظلم سے پاک ہو۔

تاریخ میں بہت سے ایسے معاشرے تھے جو ظلم و ستم، ہوس بازی اور طرح طرح کے گناہوں کی بناء پر "مرگِ ناگہاں" کا شکار ہو گئے اور قرآنی اصطلاح میں وہ "اجلِ مسمّی" تک نہ پہنچ سکے۔

امام صادق علیہ السلام سے اس سلسلے میں ایک جامع اور جاذبِ نظر حدیث منقول ہے۔ آپ نے فرمایا:

من یموت بالذنوب اکثر ممن یموت بالاجال، و من یعیش بالاحسان اکثر ممن

---

[1] اس بارے میں کہ "لیغفر لکم من ذنوبکم" میں "من" کا کیا مفہوم ہے، مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض اسے تبعیض کے معنی میں لیتے ہیں یعنی "تمہارے بعض گناہوں کو بخش دے گا" لیکن اگر اس امر کی طرف توجہ کی جائے کہ ایمان لانا تمام گناہوں کی بخشش کا باعث ہے تو یہ احتمال بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔ (الاسلام یجب ما قبلہ — اسلام ماقبل کے گناہ ساقط کر دیتا ہے) بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ "من" بدلیت کے معنی میں ہے۔ اس کے مطابق اس جملے کا معنی یہ ہوگا، "خدا تمہیں دعوت دیتا ہے کہ ایمان لانے کے بدلے تمہارے گناہ بخش دے" بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں "من" زائدہ ہے اور تاکید کے لیے آیا ہے یعنی "خدا تمہیں ایمان کی طرف دعوت دیتا ہے تاکہ تمہارے تمام گناہ بخش دے" یہ آخری تفسیر گزشتہ تمام تفاسیر سے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

یعیش بالاعمال

جو لوگ گناہوں کی وجہ سے مر جاتے ہیں ان کی تعداد طبعی موت مرنے والوں سے زیادہ ہوتی ہے اور جو نیکی کے باعث زندہ رہتے ہیں (اور طویل عمر پاتے ہیں) ان کی تعداد عام عمر کے ساتھ زندہ رہنے والوں سے زیادہ ہوتی ہے[1]

امام صادق علیہ السلام ہی سے منقول ہے:

ان الرجل یذنب الذنب فیحرم صلوٰۃ اللیل و ان العمل السیئ اسرع فی صاحبہ من السکین فی اللحم۔

بعض اوقات انسان گناہ کرتا ہے اور نیک اعمال سے مثلاً نمازِ تہجد سے محروم ہو جاتا ہے۔ (جان لو کہ) بُرا کام انسان کی تباہی و بربادی میں گوشت کے لیے چھری سے زیادہ تیز ہوتا ہے[2]

ضمناً اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ دعوتِ انبیاء پر ایمان لانا اور ان کے پروگراموں پر عمل کرنا "اجل معلق" کو روکتا ہے اور حیاتِ انسانی کو "اجل مسمّیٰ" تک جاری و ساری رکھتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کی اجل دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ انسان اپنے بدن کی توانائی کے مطابق اختتامِ عمر تک پہنچے اور دوسری "اجل معلق" ہے مختلف عوامل یا رکاوٹوں کی وجہ سے انسانی عمر کا راستے ہی میں ختم ہو جانا اور ایسا عام طور پر خود اس کے بغیر سوچے سمجھے کیے گئے اعمال کی وجہ سے اور طرح طرح کے گناہوں کے باعث ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں ہم سورۂ انعام کی آیہ ۲ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود ہٹ دھرم کفار نے ان حیات بخش دعوت کو قبول نہ کیا کہ جس میں واضح طور پر منطقِ توحید موجود تھی۔ اور اپنے انبیاء کو ایسا جواب دیا کہ جس سے ان کی ہٹ دھرمی اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنے کے آثار جھلکتے تھے۔ کہنے لگے تم تو ہم جیسے بشر ہو، اس کے علاوہ کچھ نہیں (قالوا ان انتم الا بشر مثلنا) علاوہ ازیں تم چاہتے ہو کہ ہمیں اس سے روکو کہ جس کی ہمارے آباؤ اجداد پوجا کرتے تھے (تریدون ان تصدونا عما کان یعبد اٰباؤنا)۔ بہرحال ان سب امور سے قطع نظر تم ہمارے لیے کوئی واضح دلیل لاؤ (فأتونا بسلطٰن مبین)۔

لیکن ہم نے بارہا کہا ہے (اور قرآن نے بھی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے) کہ انبیاء و رسل کا بشر ہونا نہ صرف ان کی نبوت میں مانع نہیں بلکہ ان کی نبوت کی تکمیل کرنے والا امر ہے اور جو لوگ اس امر کو انبیاء کی نبوت کے انکار کی دلیل سمجھتے تھے ان کا مقصد زیادہ تر بہانہ سازی تھا۔

اسی طرح اس حقیقت کو جاننے کے باوجود کہ عام طور پر آنے والی نسل کا علم گزشتگان سے زیادہ ہوتا ہے ان کا آباؤ اجداد کی راہ و رسم کا سہارا لینا ایک اندھے تعصب، بے وقعت بے ہودگی اور خرافات کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا یہ تقاضا کہ کوئی واضح دلیل پیش کریں، اس بناء پر نہ تھا کہ انبیاء کے پاس کوئی واضح دلیل نہ تھی بلکہ ہم بارہا آیاتِ قرآنی میں پڑھتے ہیں کہ بہانہ جو لوگ واضح دلائل اور "سلطان مبین" کا انکار کرتے تھے اور ہر وقت نئی دلیل اور کسی نئے معجزے کی فرمائش کرتے رہتے تھے تاکہ اپنے لیے فرار کی راہ پیدا کر سکیں۔

بہرحال آئندہ آیات میں ہم پڑھیں گے کہ انبیاء ان کا جواب کس طرح دیتے تھے۔

---

[1] و [2] سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۴۸۸۔

۱۱۔ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِن نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَمَا كَانَ لَنَا أَن نَّأْتِيَكُم بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ○

۱۲۔ وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللَّهِ وَقَدْ هَدَانَا سُبُلَنَا ۚ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَا آذَيْتُمُونَا ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ○

ترجمہ

۱۱۔ ان کے رسولوں نے ان سے کہا: یہ ٹھیک ہے کہ ہم تم جیسے بشر ہیں لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے (اور اسے اہل پاتا ہے) نعمت عطا کرتا ہے (اور اسے مقام رسالت پر فائز فرماتا ہے) اور ہم حکم خدا کے بغیر ہرگز معجزہ نہیں لا سکتے (اور ہم تمہاری دھمکیوں سے نہیں ڈرتے) اور باایمان افراد کی طرح صرف اللہ پر توکل کرنا چاہتے ہیں۔

۱۲۔ ہم اللہ پر کیوں توکل نہ کریں جب کہ اس نے ہمیں ہماری (سعادت کی) راہوں کی طرف رہبری کی ہے اور ہم تمہاری ایذا رسانیوں پر یقیناً صبر کریں گے (اور اپنی رسالت کی انجام دہی سے دستبردار نہیں ہوں گے) اور توکل کرنے والوں کو صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیے۔

تفسیر

صرف اللہ پر توکل کرو

ان دو آیات میں انبیاء کے ہٹ دھرم دشمنوں کی بہانہ سازیوں کا جواب دیا گیا ہے کہ جن کا ذکر گزشتہ آیات میں کیا گیا تھا۔ وہ کہ جو کہتے تھے کہ تم نوعِ بشر میں سے کیوں ہو، ان کے جواب میں پیغمبرانِ گرامی نے کہا یقیناً ہم تم ہی جیسے بشر ہیں لیکن خدا اپنے بندوں میں

سے جسے چاہتا ہے اس پر احسان کرتا ہے اور اسے نعمت عطا کرتا ہے (قالت لھم رسلھم ان نحن الا بشر مثلکم و لکن اللہ یمن علی من یشاء من عبادہ)۔

یعنی یہ امر فراموش نہ کرو کہ اگر بشر کی بجائے فرشتے کا انتخاب ہوتا تو اس کے پاس بھی اپنی طرف سے کچھ نہ ہوتا۔ تمام نعمات کہ جن میں سے ایک رسالت و رہبری ہے، خدا کی طرف سے ہیں۔ جو ایسا مقام فرشتے کو دے سکتا ہے وہ انسان کو بھی دے سکتا ہے۔

واضح ہے کہ اللہ کی طرف سے ایسی نعمت کی عطا بلا وجہ نہیں ہے اور ہم نے بارہا کہا ہے کہ خدا کی مشیت اس کی حکمت سے ہم آہنگ ہے یعنی ہم جہاں بھی پڑھیں کہ "خدا جسے چاہتا ہے ......" تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ "خدا جسے چاہتا ہے اور اہل پاتا ہے ......" یہ ٹھیک ہے کہ مقام رسالت بالآخر خدائی نعمت ہے لیکن اہلیت بھی ذات پیغمبر میں حتماً موجود ہوتی ہے۔

اس کے بعد دوسرے سوال کا جواب دیئے بغیر تیسرے سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ گویا کہ آباؤ اجداد کی سنت کو بطور دلیل پیش کرنا اس قدر کمزور اور بے بنیاد تھا کہ ہر عاقل انسان تھوڑے سے غور و فکر سے اس کی کمزوری کو جان لیتا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کی دیگر آیات میں اس کا جواب دیا جا چکا ہے۔

بہرحال تیسرے سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے: "معجزات لانا ہمارا کام نہیں۔ ہم کوئی جادوگر نہیں کہ ایک طرف بیٹھ جائیں اور جو شخص بھی من پسند کے معجزے کی فرمائش کرے اسے پیش کرتے رہیں اور معجزہ بے ارزش کھیل کود ہو کر رہ جائے بلکہ ہم کوئی معجزہ حکم الٰہی کے بغیر نہیں لا سکتے" (و ما کان لنا ان نأتیکم بسلطن الا باذن اللہ)۔

علاوہ ازیں ہر پیغمبر لوگوں کے تقاضا کے بغیر بھی اس قدر معجزہ پیش کر دیتا ہے جو کافی ہو تا کہ وہ اس کی حقانیت کے اثبات کی سند ہو۔ اگرچہ ان کی دعوت کے مضامین اور ان کا مکتب خود تنہا عظیم ترین معجزہ ہے لیکن ہٹ دھرم افراد عام طور پر ان باتوں پر کان نہیں دھرتے اور ہر روز ایک نئی فرمائش کرتے ہیں اور پیغمبر اسے قبول نہ کریں تو پھر شور و غوغا بپا کر دیتے ہیں۔

اس کے بعد اس بناء پر کہ ان کی دھمکیوں کا بھی قاطع جواب دیا جائے انبیاء اپنا موقف بیان کرتے ہوئے کہتے: "تمام باایمان افراد کو صرف خدا پر بھروسہ کرنا چاہیے" وہی خدا کہ جس کی قدرت کے مقابلے میں تمام قدرتیں ناچیز اور حقیر ہیں (و علی اللہ فلیتوکل المؤمنون)۔

پھر اسی مسئلہ توکل کو ایک واضح استدلال کے ساتھ بیان کرتے: ہم اللہ پر توکل کیوں نہ کریں اور تمام مشکلات میں اس کی پناہ کیوں نہ لیں، ہم ناچیز طاقتوں اور دھمکیوں سے کیوں ڈریں جب کہ اس نے ہماری ہدایت سعادت کی راہوں کی طرف کی ہے (و ما لنا الا نتوکل علی اللہ و قد ھدانا سبلنا)۔

اس نے جب کہ ہمیں سعادت کی راہوں کی طرف ہدایت کی افضل ترین نعمت عطا کی ہے تو یقیناً وہ ہر قسم کی جارحیت کے مقابلہ میں اور مشکل میں ہمیں اپنی حمایت کے زیر سایہ رکھے گا۔

پھر وہ اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہتے: اب جب کہ ہمارا سہارا خدا ہے ـــ ایسا سہارا کہ جو ناقابل شکست ہے اور سب سے بلند ہے تو ہم یقینی طور پر تمہاری سب اذیتوں کے مقابلے میں پامردی اور صبر و شکیبائی دکھائیں گے" (و لنصبرن علی ما اٰذیتمونا)۔

اور وہ اپنی بات یوں ختم کرتے ہیں: تمام توکل کرنے والوں کو صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیے (و علی اللہ فلیتوکل المتوکلون)۔

چند اہم نکات

۱۔ **مومنین اور متوکلین:** زیر بحث پہلی آیت میں ہے کہ مومنین کو اللہ پر توکل کرنا چاہیے اور دوسری آیت میں ہے کہ متوکلین کو اللہ پر توکل کرنا چاہیے۔ گویا دوسرا جملہ پہلے کی نسبت زیادہ وسعت کا حامل ہے یعنی مومنین کے لیے تو آسان ہے کیونکہ خدا پر ایمان ہو تو یہ ایمان اُس کی قدرت، حمایت اور اس پر توکل کے ایمان سے جدا نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ غیر مومنین اور سب لوگوں کے پاس خدا کے علاوہ کوئی سہارا نہیں ہے۔ کیونکہ جس کی طرف بھی نگاہ کریں اُس کے پاس خود اپنی طرف سے تو کچھ بھی نہیں تمام نعمتیں، طاقتیں اور عنایتیں اس کی پاک ذات کی طرف لوٹتی ہیں پس انہیں بھی اس کے آستان پر سر جھکانا چاہیے اور اس سے طلب کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ توکل انہیں اللہ پر ایمان کی دعوت بھی دے گا۔

۲۔ **انبیاء اور معجزات:** زیر بحث آیات ایسے لوگوں کے لیے واضح جواب ہیں کہ جو انبیاء سے معجزہ کی نفی کرتے ہیں یا قرآن حکیم کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دوسرے معجزات کا انکار کرتے ہیں۔ یہ آیات ہمیں سمجھاتی ہیں کہ انبیاء یہ ہرگز نہیں کہتے تھے کہ ہم معجزہ نہیں لائیں گے بلکہ وہ کہتے تھے کہ ہم حکم خدا اور اذن الٰہی کے بغیر یہ کام نہیں کریں گے کیونکہ معجزہ اُس کا کام ہے، اُس کے اختیار میں ہے اور جب وہ قرین مصلحت سمجھتا ہے ہمیں معجزہ دیتا ہے۔

۳۔ **توکل کی حقیقت اور فلسفہ:** "توکل" دراصل "وکالت" کے مادہ سے وکیل انتخاب کرنے کے معنی میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ایک اچھا وکیل وہی ہے جو کم از کم چار صفات کا حامل ہو:

(۱) کافی علم و آگاہی

(۲) امانت داری

(۳) طاقت و قدرت

(۴) ہمدردی

شاید یہ امر بھی یاد دلانے کی ضرورت نہ ہو کہ مختلف کاموں کے لیے ایک مدافع وکیل کا انتخاب اس موقع پر ہوتا ہے جہاں انسان ذاتی طور پر دفاع پر قادر نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس موقع پر دوسری قوت سے استفادہ کرتا ہے اور اس کی طاقت و صلاحیت سے اپنی مشکل حل کرتا ہے۔

لہٰذا خدا پر توکل کرنے کا اس کے علاوہ کوئی مفہوم نہیں کہ انسان زندگی کی مشکلات و حوادث، مخالفین کی دشمنیوں اور سختیوں، پیچیدگیوں اور کبھی اہداف کے راستے میں حائل رکاوٹوں میں جب خود انہیں دور کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے اپنا وکیل قرار دے اور اس پر بھروسہ کرے اور خود بھی ہمت اور کوشش سے باز نہ رہے بلکہ جہاں کسی کام کو خود انجام دینے کی طاقت رکھتا ہو وہاں بھی مؤثر حقیقی خدا ہی کو جانے کیونکہ ایک موحد کی چشم بصیرت کے دریچے سے دیکھا جائے تو تمام قدرتوں اور قوتوں کا سرچشمہ وہی ہے۔

"توکل علی اللہ" کا نقطہ مقابل یہ ہے کہ کسی کے غیر پر بھروسہ کیا جائے۔ یعنی کسی غیر پر تکیہ کر کے جینا، دوسرے سے وابستہ ہونا اور اپنی ذات میں استقلال و اعتماد سے عاری ہونا۔

علماء اخلاق کہتے ہیں کہ خدا کی توحید افعالی کا ثمرہ مستقیم توکل ہے کیونکہ جیسے ہم نے کہا ہے کہ ایک موحد کی نظر میں ہر حرکت، ہر کوشش، ہر جنبش اور عالم میں صورت پذیر ہونے والی ہر چیز آخرکار اس جہان کی پہلی علت یعنی ذاتِ خدا سے ارتباط رکھتی ہے۔ لہٰذا ایک موحد کی نگاہ میں تمام طاقتیں اور کامیابیاں اسی کی طرف سے ہیں۔

توکل کا فلسفہ

جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ،

اولاً متوکل علی اللہ ـــ زندگی کے سخت حوادث و مشکلات میں اس ناقابلِ فنا منبعِ قدرت پر توکل انسان کی استقامت و متانت کا سبب بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں نے میدانِ احد میں سخت ضرب کھائی اور دشمن میدان چھوڑنے کے بعد راستے میں سے پلٹ آئے تا کہ مسلمانوں پر آخری ضرب لگائیں اور یہ خبر مسلمانوں کو پہنچی تو

قرآن کہتا ہے کہ صاحبِ ایمان افراد اس خطرناک لمحے میں وحشت زدہ نہ ہوئے جب کہ وہ اپنی فعال قوت کا ایک اہم حصہ کھو چکے تھے بلکہ "توکل" اور قوتِ ایمانی نے ان کی استقامت میں اضافہ کر دیا اور فاتح دشمن اس آمادگی کی خبر سنتے ہی تیزی سے پیچھے ہٹ گیا (آلِ عمران ۱۷۳)

توکل کے سائے میں اس استقامت کے نمونے متعدد آیات میں نظر آتے ہیں۔ ان میں سے آلِ عمران کی آیت ۱۲۲ میں قرآن کہتا ہے توکل علی اللہ نے مجاہدین کے دو گروہوں کو میدانِ جہاد میں سستی سے بچایا۔

سورہ ابراہیم کی آیہ ۱۲ میں دشمن کے حملوں اور نقصانات کے مقابلے میں توکل اور صبر کا باہم ذکر ہوا ہے۔

آلِ عمران کی آیہ ۱۵۹ میں اہم کاموں کی انجام دہی کے لیے پہلے مشورے کا، پھر پختہ ارادے کا اور پھر توکل علی اللہ کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ قرآن کہتا ہے،

انہ لیس لہ سلطان علی الذین اٰمنوا وعلٰی ربھم یتوکلون ۝

شیطانی وسوسوں کا صرف وہ لوگ مقابلہ کر سکتے ہیں اور اس کے نفوذ سے بچ سکتے ہیں کہ جو ایمان اور توکل کے حامل ہوں۔

(نحل ـ ۹۹)

ان آیات سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شدید مشکلات میں انسان ضعف اور کمزوری محسوس نہ کرے بلکہ اللہ کی بے پایاں قدرت پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو کامیاب اور فاتح سمجھے۔ گویا توکل امید آفریں، قوت بخش، تقویت پہنچانے والا اور استقامت میں اضافے کا سبب ہے۔ توکل کا مفہوم اگر گوشہ نشینی اختیار کرنا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا ہوتا تو مجاہدین اور اس قسم کے لوگوں میں تحرک پیدا کرنے کا باعث نہ بنتا۔

اگر کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ عالمِ اسباب اور طبیعی عوامل کی طرف توجہ روحِ توکل سے مناسبت نہیں رکھتی تو وہ انتہائی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ طبیعی عوامل کے اثرات کو ارادۂ الٰہی سے جدا کرنا ایک طرح کا شرک ہے۔ کیا ایسا نہیں کہ عوامل طبیعی کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے اور سب کچھ اسی کے ارادے اور فرمان کے تحت ہے۔ البتہ اگر عوامل کو ایک مستقل طاقت سمجھا جائے اور انہیں اس کے ارادے کے مدمقابل قرار دیا جائے تو یہ وہ مقام ہے جو روحِ توکل سے مطابقت نہیں رکھتا۔

کیسے ممکن ہے کہ توکل کی ایسی تفسیر کی جائے حالانکہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو متوکلین کے سید و سردار ہیں اپنے اہداف کی پیش رفت کے لیے کسی موقع ، صحیح منصوبہ ، مثبت تکنیک اور مختلف ظاہری وسائل سے غفلت نہیں برتتے تھے۔

یہ سب چیزیں ثابت کرتی ہیں کہ توکل کا وہ منفی مفہوم نہیں ہے۔

ثانیاً : توکل علی اللہ انسان کو ان وابستگیوں سے نجات دیتا ہے کہ جو ذلت و غلامی کا سرچشمہ ہیں اور اسے آزادی اور خود اعتمادی بخشتا ہے۔

"توکل" اور "قناعت" ہم ریشہ ہیں اور فطرتاً ان دونوں کا فلسفہ بھی کئی پہلوؤں سے ایک دوسرے سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود ان میں فرق بھی ہے۔ یہاں ہم چند ایک اسلامی روایات پیش کرتے ہیں جن سے توکل کا حقیقی مفہوم اور اصلی بنیاد واضح ہو سکے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

ان الغنی والعز یجولان فاذا ظفرا بموضع التوکل او طنا

بے نیازی اور عزت محو جستجو رہتی ہیں جہاں توکل کو پالیتی ہیں وہیں ڈیرے ڈال دیتی ہیں اور اسی مقام کو اپنا وطن بنالیتی ہیں[1]

اس حدیث میں بے نیازی اور عزت کا اصلی وطن "توکل" بیان کیا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے، آپ نے فرمایا :

میں نے وحی الٰہی کے قاصد جبرئیل سے پوچھا کہ توکل کیا ہے تو اس نے کہا :

العلم بان المخلوق لا یضر ولا ینفع ، ولا یعطی ولا یمنع ، واستعمال الیأس من الخلق فاذا کان العبد کذٰلک لم یعمل لاحد سوی اللّٰہ ولم یطمع فی احد سوی اللّٰہ فھذا ھو التوکل۔

جب بندہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ مخلوق نقصان پہنچا سکتی ہے نہ فائدہ اور عطا کر سکتی ہے نہ روک سکتی ہے اور وہ مخلوق کے ہاتھ سے آنکھ اٹھا لیتا ہے تو پھر وہ خدا کے علاوہ کسی کے لیے کام نہیں کرتا اور اس کے سوا کسی سے امید نہیں باندھتا تو یہ ہے حقیقت توکل[2]

کسی نے حضرت امام علی ابن موسیٰ رضا علیہ السلام سے پوچھا :

ما حد التوکل ؟

توکل کی حد کیا ہے ؟

تو آپ نے فرمایا :

---

[1] اصول کافی ، جلد ۲ ، باب ۵ ، حدیث ۳ ۔

[2] بحار الانوار ، جلد ۱۵ ، حصہ ۲ ، صفحہ ۱۴ چاپ قدیم ۔

ان لا تخاف مع اللہ احدًا [1]

یہ کہ تو خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے کسی سے نہ ڈرے [2]

---

[1] سفینۃ البحار، جلد ۲ صفحہ [illegible] ۔

[2] توکل کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے کتاب "انگیزہ پیدائش مذہب" کی طرف رجوع کریں۔

۱۳۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۝

۱۴۔ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ۝

۱۵۔ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝

۱۶۔ مِّنْ وَّرَاۗىِٕهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّاۗءٍ صَدِيْدٍ ۝

۱۷۔ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۭ وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ۝

ترجمہ

۱۳۔ جنہوں نے اپنے رسولوں سے کفر کیا انہوں کہا یقیناً ہم تمہیں اپنی سرزمین سے نکال باہر کریں گے مگر یہ کہ ہمارے دین کی طرف لوٹ آؤ۔ تو ایسے موقع پر ان کے پروردگار نے ان کی طرف وحی کی کہ میں ظالموں کو ہلاک کردوں گا۔

۱۴۔ اور تمہیں ان کے بعد زمین میں سکونت بخشوں گا یہ (کامیابی) اس کے لیے ہے جو میرے مقام (عدالت) سے ڈرتا ہو اور میرے عذاب کا خوف رکھتا ہو۔

۱۵۔ انہوں نے (خدا سے) فتح و کامرانی کا تقاضا کیا اور ہر جبارِ منحرف ناامید اور نابود ہوا۔

۱۶۔ اس کے پیچھے جہنم ہوگی اور اسے متعفن پانی پلایا جائے گا۔

۱۷۔ وہ اسے بڑی مشکل سے گھونٹ گھونٹ کر کے پیئے گا اور وہ اسے خوشی سے پینے کو تیار نہیں اور ہر جگہ سے موت اس کی طرف آئے گی لیکن اس کے باوجود وہ مرے گا نہیں اور اس کے پیچھے عذاب شدید ہے۔

تفسیر

منحرف جابروں کا طرزِ عمل اور ان کا انجام

بے منطق افراد کا طریقہ ہے کہ جب وہ اپنی بات اور عقیدے میں کمزوری پر آگاہ ہوتے ہیں تو پھر دلیل کا راستہ چھوڑ کر طاقت اور ظلم کا سہارا لیتے ہیں۔ اس جگہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہٹ دھرم اور بہانہ ساز کافر قوموں نے جب انبیاء کی حسین و رسا منطق کہ جو گزشتہ آیات میں گزر چکی ہے، سنی تو انہوں نے اپنے انبیاء سے کہا: ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تمہیں اپنی سرزمین سے نکال دیں گے مگر یہ کہ ہمارے دین (بت پرستی) کی طرف پلٹ آؤ (وقال الذین کفروا لرسلہم لنخرجنکم من ارضنا او لتعودن فی ملتنا)۔

یہ جاہل مغرور گویا ساری زمین کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے اور اپنے انبیاء کو ایک شہری کے حقوق ملنے کے بھی قائل نہیں تھے۔ اسی لیے کہتے تھے "ارضنا" (ہماری زمین) حالانکہ خدا نے زمین اور اس کی تمام نعتیں صالح اور نیک لوگوں کے لیے پیدا کی ہیں اور یہ خود سر، جابر اور متکبر درحقیقت اس میں کوئی حق نہیں رکھتے چہ جائیکہ سب کچھ اپنا سمجھیں۔

ہوسکتا ہے "لتعودن فی ملتنا" (ہمارے دین کی طرف لوٹ آؤ) سے یہ غلط فہمی پیدا ہو کہ انبیاء قبلِ رسالت بت پرستی کے مذہب پر تھے حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ قطع نظر اس کے کہ وہ معصوم تھے اور قبل رسالت بھی تھے ان کی عقل و درایت اس سے کہیں زیادہ تھی کہ وہ ایسا احمقانہ کام کرتے پتھر اور لکڑی کے سامنے سجدہ کرتے۔

ہوسکتا ہے یہ اس بناء پر ہو کہ اعلانِ نبوت سے قبل انبیاء پر تبلیغ کی ذمہ داری نہ تھی شاید ان کی خاموشی کے سبب یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ وہ مشرکین کے ہم عقیدہ تھے۔

اس سے قطع نظر اگر یہ خطاب خود انبیاء کو ہے لیکن درحقیقت ان کے پیروکاروں پر بھی محیط ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ان کے پیروکار پہلے مشرکین کے مذہب پر تھے اور مشرکین کی نظر صرف انہی پر ہے۔ نیز اصطلاح کے مطابق "لتعودن" عمومی تعبیر ہے اور بابِ تغلیب میں سے ہے (یعنی حکم اکثریت کو عمومیت پر محمول کرنا)[1]

---

[1] اس غلط فہمی کا ایک اور جواب بھی دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ "عود" کا مادہ اگر "الی" کے ساتھ متعدی ہو تو بازگشت اور لوٹنے کے معنی میں ہے اور اگر "فی" کے ساتھ متعدی ہو تو حالت کی تبدیلی کے معنی میں ہے اور بازگشت کا معنی نہیں دیتا۔ لہٰذا "لتعودن فی ملتنا" کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنی اس حالت کو بدل دو اور اپنا دین چھوڑ کر ہمارے دین کو قبول کر لو۔ لیکن دیگر آیات مثلاً

کلما ارادوا ان یخرجوا منھا اعیدوا فیھا (سجدہ: ۲۰)

اور بعض دوسری قرآنی آیات کی طرف رجوع کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ "عود" جب "فی" کے ساتھ متعدی ہو تو بھی بازگشت کا معنی دیتا ہے (غور کیجئے)۔

قرآن مزید کہتا ہے کہ خداوند عالم ایسے مواقع پر پیغمبروں کی دلجوئی کرتا اور انہیں اطمینان دلاتا " اور ان کی طرف وحی کرتا کہ میں یقیناً ظالموں کو ہلاک کروں گا" (فاوحی الیهم ربهم لنهلکن الظلمین) لہٰذا ان دھمکیوں سے ہرگز نہ ڈرو اور تمہارے آہنی ارادے کی راہ میں ذرہ بھر سستی بھی حائل نہیں ہونا چاہیے۔

ظالم منکرین چونکہ انبیاء کو اپنے علاقے سے جلاوطن کردینے کی دھمکی دیتے تھے تو خدا تعالیٰ اس کے مقابلے میں ان سے وعدہ کرتا ہے کہ "ہم تمہیں اس علاقے میں انکی نابودی اور تباہی کے بعد سکونت بخشیں گے" (ولنسکننکم الارض من بعدهم) لیکن یہ توفیق و کامیابی سب کو نصیب نہیں ہوتی یہ ان کے لیے ہے جو میرے مقام سے ڈریں اور احساسِ ذمہ داری کریں اور اسی طرح انحراف، ظلم اور گناہ پر ہونے والی تہدید عذاب سے ڈریں اور اسے سنجیدگی سے لیں" (ذلك لمن خاف مقامی وخاف وعید)۔

لہٰذا عنایت و نعمت اور لطف و کرم نہ حساب کتاب کے بغیر ہے اور نہ بلاوجہ بلکہ ایسے افراد کے ساتھ مخصوص ہے کہ جو احساسِ ذمہ داری کے ساتھ پروردگار کے مقامِ عدل کے مقابلے میں نہ ظلم و ستم کرتے ہیں اور نہ دعوتِ حق کے جواب میں دشمنی کرتے ہیں۔

اور ایسے موقع پر کہ جب انتہا ہو گئی تھی اور وہ اپنی قوم کے سامنے اپنی ذمہ داری انجام دے چکے تھے، جنہیں ایمان لانا تھا لا چکے تھے اور باقی اپنے کفر پر ڈٹے ہوئے تھے اور مسلسل انبیاء و رسل کو دھمکیاں دے رہے تھے" تو انہوں نے خدا سے فتح و کامرانی کا تقاضا کیا" (واستفتحوا)۔ تو خدا نے بھی ان سچے مجاہدین کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا اس طرح سے کہ "ہر منحرف جابر نا امید، زیاں کار اور نابود ہو گئے" (وخاب کل جبار عنید)۔

"خاب" "خیبة" (بروزن "غیبة") کے مادہ سے مطلوب ہاتھ سے نکل جانے کے معنی میں ہے کہ جو تقریباً نا امیدی کا مفہوم دیتا ہے۔

"جبار" یہاں متکبر اور سرکش کے معنی میں ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک عورت آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپؐ نے اسے کوئی حکم دیا۔ اس نے نافرمانی کی اور فرمانِ پیغمبرؐ پر عمل نہ کیا تو آپؐ نے فرمایا:

دعوها فانها جبارة

اسے چھوڑ دو یہ سرکش عورت ہے[1]

لیکن لفظ "جبار" کبھی کبھی خدا کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جس کا ایک اور معنی ہے اور وہ ہے "محتاج اصلاح موجود کی اصلاح کرنے والا" یا وہ کہ جو ہر چیز پر مسلط ہے[2]

لفظ "عنید" در اصل "عند" (بروزن "زند") سے سمت کے معنی میں ہے۔ یہاں انحراف اور راہِ حق کے علاوہ کی طرف جھکاؤ کے معنی میں ہے۔

اسی لیے ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

---

[1] تفسیر فخر رازی، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

[2] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۴ صفحہ ۱۱۹ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

کل جبار عنید من ابی ان یقول لا الٰہ الا اللہ

جبارِ عنید وہ ہے کہ جو لا الٰہ الا اللہ کہنے سے انکار کرے۔[1]

ایک اور حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

العنید المعرض عن الحق

عنید وہ ہے جو حق سے روگردانی کرے۔[2]

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ "جبار" صفتِ نفسانی یعنی روحِ سرکشی کی طرف اشارہ ہے اور "عنید" افعالِ انسانی میں اس صفت کے اثر کی طرف اشارہ ہے کہ جو اسے حق سے منحرف کر دیتا ہے۔

اس کے بعد دوسرے جہان میں ان جبارانِ عنید کے نتیجۂ عمل پر انہیں ملنے والی سزاؤں کے بارے میں دو آیات میں پانچ چیزوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ پانچ چیزیں یہ ہیں:

(۱) اس ناامیدی اور خسران کے پیچھے یا ایسے شخص کے پیچھے جہنم اور جلانے والی آگ ہوگی (من ورائہ جھنم)۔

لفظ "وراء" اگرچہ پس پشت کے معنی میں (لفظ "امام" کے مقابلے میں) ہے لیکن ایسے مواقع پر نتیجہ اور انجام کار کے معنی میں ہے جیسا کہ فارسی میں بھی اس معنی میں یہ لفظ بہت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ اگر فلاں غذا کھاؤ تو اس کے پیچھے بیماری ہے یا اگر فلاں شخص سے دوستی کرو تو اس کے پیچھے بدبختی اور پشیمانی ہے یعنی اس کا نتیجہ اور معلول اس طرح ہے۔

(۲) اس جلانے والی آگ میں جب وہ پیاسا ہوگا تو اسے آبِ "صدید" پلائیں گے (ویسقیٰ من ماء صدید)۔

جیسا کہ علماءِ لغت نے کہا ہے "صدید" ایک طرح کی میل کچیل کو کہتے ہیں کہ جو جلد اور گوشت کے درمیان جمع ہو جاتی ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ میل اور خون کی طرح کا بدبودار متعفن اور بدرنگ پانی اسے پلایا جائے گا۔

(۳) یہ گنہگار، مجرم اور جبارِ عنید جب دیکھے گا کہ اسے پینے کے لیے ایسا پانی ملا ہے تو بڑی تکلیف کر کے مشکل سے اسے گھونٹ گھونٹ پیے گا اگرچہ وہ اسے ہرگز پینا نہیں چاہے گا، بلکہ ہم اس کے حلق میں یہ پانی ڈالیں گے (یتجرعہ ولا یکاد یسیغہ[3])۔

(۴) اسے اس قدر عذاب، تکلیف اور ناراحتی کا سامنا ہوگا کہ "ہر طرف سے موت اس کی طرف آئے گی لیکن اس کے باوجود وہ مرے گا نہیں، تاکہ اپنے اعمال کا انجام بھگتے (و یأتیہ الموت من کل مکان وما ھو بمیت)۔ اگرچہ ظاہراً یوں لگتا ہے کہ جو کچھ عذاب بیان کیا گیا ہے اس سے بڑھ کر نہیں ہوگا لیکن قرآن مزید کہتا ہے: اس کے پیچھے عذابِ شدید ہے (ومن ورائہ عذاب غلیظ)۔

اس طرح جس قدر شدید عذاب اور بُرا انجام فکرِ انسانی میں آسکتا ہے حتیٰ کہ جو کچھ نہیں آسکتا وہ ان خود غرض ظالموں اور بے ایمان گنہگار جابروں کے انتظار میں ہے۔ ان کا بستر آگ ہے، ان کے پینے کے لیے متعفن اور نفرت آور پانی ہے اور ان کے لیے طرح طرح کا

---

[1] نورالثقلین جلد ۲ صفحہ ۵۳۵۔

[2] نورالثقلین جلد ۲ صفحہ ۵۳۵۔

[3] "یسیغہ" "اساغہ" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے مرینے کو بچیز حلق میں ڈالنا۔

عذاب ہے اس کے باوجود وہ مریں گے نہیں بلکہ زندہ رہیں گے اور اس کا مزہ چکھیں گے۔

یہ ہرگز تصور نہیں کرنا چاہیے کہ اس قسم کی سزائیں غیر عادلانہ ہیں کیونکہ جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ یہ سب کچھ انسانوں کے اعمال کا نتیجہ اور طبیعی اثر ہے بلکہ ان کے کام اس طرح دوسرے گھر میں مجسم ہوتے ہیں کہ جہاں عمل اپنی مناسب شکل میں مجسم ہوگا۔

اگر ہم اپنے زمانے کے بعض ظالموں کے اعمال اور جرائم پر نظر کریں کہ جن کا ہم نے مشاہدہ کیا ہے یا ایسے گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا صحیح طور پر مطالعہ کریں تو بعض اوقات ہم سوچتے ہیں کہ یہ سزائیں بھی ان کے لیے بہت کم ہیں[1]

چند اہم نکات

۱۔ **مقام پروردگار سے کیا مراد ہے؟** مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ ظالموں پر کامیابی اور ان کی نابودی کے بعد زمین پر حکومت ان افراد کا حصہ ہے کہ جو "مقام الٰہی" سے ڈریں۔ یہاں لفظ "مقام" سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں مختلف احتمالات پیش کیے گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تمام احتمالات صحیح ہوں اور آیت سے سب مراد ہوں۔

(الف) اس سے مراد محاسبہ کرتے وقت پروردگار کی حیثیت ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم کی بعض دوسری آیات میں بھی آیا ہے۔ مثلاً

و امامن خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوٰی۔۔۔۔

مگر جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا اور جی کو ناجائز خواہشوں سے روکتا رہا۔ (نازعات ۔۴۰)

اور

ولمن خاف مقام ربہ جنتان

اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا اس کے لیے دو باغ ہیں (رحمٰن ۔ ۴۶)

(ب) "مقام" "قیام" کے معنی میں ہے اور "قیام" "نظارت و نگرانی" کے معنی میں ہے یعنی جو شخص اللہ کی طرف سے اپنے اعمال کی شدید نظارت سے ڈرتا ہے اور احساسِ مسئولیت کرتا ہے۔

(ج) "مقام" اجرائے عدالت اور احقاقِ حق کے لیے قیام کرنے کے معنی میں ہے۔ یعنی جو پروردگار کی اس حیثیت سے ڈرتے ہیں۔

بہرحال جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ کوئی مانع نہیں کہ آیت کے مفہوم میں یہ سب معانی جمع ہوں۔ یعنی وہ لوگ کہ جو خدا کو اپنے اوپر

---

[1] اسی تباہ کن جنگ ہی کو لیجیے کہ جس کا سامنا ہمیں اس وقت یہ بحث کرتے ہوئے ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کا ماحصل ایک ستم گر حکمران کی خود خواہی یا زیادہ صحیح الفاظ میں ایک پاگل جابر عنید کی خودسری کے علاوہ کچھ نہیں اور اس کے لیے کسی عاقلانہ مقصد کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اس میں کیسے کیسے مظالم کیے گئے ہیں کہ جن کے ذکر سے زبان و قلم عاجز ہیں۔ ہم نے خود ملک کے مغربی اسپتالوں میں بروئے جنگ کو دیکھا ہے۔ معصوم بچوں سے لے کر بوڑھوں اور عورتوں تک کو زخمی حالت میں دیکھا ہے ان میں سے بہت سے اپنی آنکھیں اور ہاتھ پاؤں کھو بیٹھے ہیں اور واقعاً ان کی ایسی حالت ہے کہ ان پر ایک نظر کی جائے تو انسان ہلکا رہ جائے۔ تو خود کہیے کہ ہمیں دیکھ ایک ظالم اور ستم گر لاکھوں انسانوں کو مصائب میں اس طرح تڑپائے تو اس کے لیے کیسی سزا اور عذاب ہونا چاہیے۔

ناظر و نگران سمجھتے ہیں اور اس کے حساب اور اجرائے عدالت سے ڈرتے ہیں اور ان کا یہ خوف اصلاحی ہے کہ جو انہیں ہر کام میں احساسِ ذمہ داری کی دعوت دیتا ہے اور انہیں ہر قسم کی نا انصافی، ظلم اور گناہ سے روکتا ہے، کامیابی اور روئے زمین پر حکومت اسی کا راستہ ہے۔

۲۔ "استفتحوا" کا مفہوم: اس لفظ کی تفسیر کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض اسے فتح و کامرانی کے تقاضا کے معنی میں سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ اس کا شاہد سورہ انفال کی آیہ ۱۹ ہے:

إن تستفتحوا فقد جاءكم الفتح

اے مومنین! اگر تم فتح و کامرانی کا تقاضا کرتے ہو تو یہ فتح و کامرانی تمہارے پاس آگئی ہے۔

بعض قضاوت کا تقاضا کرنے کا معنی لیتے ہیں۔ یعنی انبیاء نے خدا سے تقاضا کیا کہ ان کے اور کافروں کے درمیان فیصلہ کرے۔ اس کا شاہد سورہ اعراف کی آیہ ۸۹ ہے:

ربنا افتح بيننا وبين قومنا بالحق وانت خير الفاتحين

خداوندا! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کا فیصلہ کر اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

۳۔ ایک جابر حکمران اور قرآن کی یہ آیت: تاریخ اور تفسیر میں آیا ہے کہ ایک دن جابر حکمران ولید بن یزید بن عبد الملک اموی نے اپنے مستقبل کے لیے قرآن سے فال نکالی۔ اتفاقاً ابتدائے صفحہ میں یہ آیت اس کے سامنے آگئی "واستفتحوا وخاب كل جبار عنيد"

وہ بہت زیادہ پریشان ہوا۔ اسے سخت غصہ آیا۔ یہاں تک کہ اس لعین نے وہ قرآن جو اس کے ہاتھ میں تھا پارہ پارہ کر دیا پھر یہ اشعار پڑھے:

اتوعد كل جبار عنيد!

فها انا ذاك جبار عنيد!

اذا ماجئت ربك يوم حشر

فقل يارب مزقني الوليد

کیا تو ہے کہ جو ہر جبار عنید کو دھمکا رہا ہے؟

تو یہ لے میں وہی جبار عنید ہوں

جب روزِ حشر اپنے پروردگار سے ملنا

تو کہہ دینا خداوندا! مجھے ولید نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا

زیادہ وقت نہ گزرا کہ یہ لعین اپنے دشمنوں کے ہاتھوں بدترین طریقے سے مارا گیا۔ انہوں نے اس کا سر کاٹ کر اسی کے محل کی چھت پر لٹکا دیا اور پھر وہاں سے ہٹا کر شہر کے دروازے پر لٹکا دیا[1]

[1] تفسیر قرطبی ص ۳۵۴۹۔

۱۸۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ○

ترجمہ

۱۸۔ جنہوں نے اپنے پروردگار سے کفر کیا ان لوگوں کے اعمال خاکستر کی مانند ہیں کہ جنہیں ایک طوفانی دن میں تیز آندھی کا سامنا کرنا پڑے تو ان میں یہ طاقت نہیں کہ جو کچھ انہوں نے انجام دیا ہے اسے اپنے ہاتھ میں لیں اور یہ بہت دور کی گمراہی ہے۔

تفسیر

تیز آندھی اور خاکستر

اس آیت میں بے ایمان افراد کے اعمال کے لیے بہت رسا اور نہایت عمدہ مثال بیان کی گئی ہے یہ آیت کفار کے انجام کے بارے میں گزشتہ آیات کی بحث کو مکمل کرتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: جنہوں نے اپنے پروردگار سے کفر کیا ان کے اعمال اس خاکستر کی مانند ہیں جسے ایک طوفانی روز تیز آندھی کا سامنا کرنا پڑے (مثل الذین کفروا بربہم اعمالہم کرماد ٍاشتدت بہ الریح فی یوم عاصف)۔

جیسے ایک طوفانی روز تیز آندھی کے سامنے راکھ اس طرح بکھر جاتی ہے کہ کوئی شخص اسے جمع نہیں کر سکتا اسی طرح منکرینِ حق کے بس میں نہیں کہ جو اعمال وہ انجام دے چکے ہیں انہیں اپنے ہاتھ میں لے سکیں۔ وہ سب تباہ و برباد ہو جائیں گے اور ان کے ہاتھ خالی رہ جائیں گے (لا یقدرون مما کسبوا علٰی شیء) اور یہ بہت دور کی گمراہی ہے (ذٰلک ھو الضلال البعید)۔

چند اہم نکات

۱۔ بکھر جانے والی راکھ: اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ان کے اعمال گرد و غبار کی مانند کوئی مفید چیز نہیں ہیں انہیں خاکستر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی باقی ماندہ تھوڑی سی آگ ہے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ ہو سکتا ہے ان کے اعمال کا ظاہر ہو اور اندر سے کچھ نہ ہو ایک چھوٹے سے برتن میں مٹی ہو تو ہو سکتا ہے اس میں ایک خوبصورت پھول اُگے لیکن اگر بہت ساری خاکستر ہو تو وہ اس قدر فضول ہے

کہ اس میں سے فضول قسم کی گھاس تک نہیں اُگتی ۔

۲ ۔ **کافروں کے اعمال خاکستر کی مانند ہیں :** کفار کے اعمال کو خاکستر سے تشبیہ دی گئی ہے ۔ تو وجہ ہے کہ خاکستر کے ذرات میں کوئی پیوند یا جوڑ نہیں ہوتا یہاں تک کہ پانی کی مدد سے بھی انہیں ایک دوسرے سے نہیں جوڑا جا سکتا اور اس کا ہر ذرہ دوسرے سے تیزی سے الگ ہو جاتا ہے ۔

گویا ایک حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ مومنین کے اعمال باہم متصل اور پیوستہ ہوتے ہیں ، ان کا ہر عمل دوسرے کی تکمیل کرتا ہے اور توحید و وحدت کی روح نہ صرف مومنین کے درمیان موجود ہے بلکہ ایک صاحب ایمان فرد کے اعمال کے درمیان بھی موجود ہے لیکن بے ایمان افراد کے کاموں میں ایسا کوئی ہم آہنگی اور اتصال نہیں ہوتا ۔

۳ ۔ **ایک طوفانی دن اور آندھی :** تیز آندھی چلے تو راکھ بکھر جاتی ہے لیکن " فی یوم عاصف " (ایک طوفانی دن) کہہ کر مزید تاکید کی گئی ہے ۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے چلنے والی تیز ہوا راکھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پر پھینک دے کہ جو زیادہ دُور نہ ہو ۔ لیکن اگر دن طوفانی ہو ، صبح سے شام تک آندھیاں چلیں اور ہر طرف سے طوفان ہی طوفان ہو تو ظاہر ہے اس قسم کی راکھ اس طرح سے منتشر ہو گی کہ اس کا ہر ذرہ کہیں بہت دور جا پڑے گا ۔ اس طرح سے کہ کسی کے بس میں نہ ہو گا کہ اسے جمع کر سکے ۔

۴ ۔ **پتوں اور راکھ کے بکھرنے میں فرق ہے :** اگر آندھی گھاس پھوس کے ڈھیر یا پتوں پر چلے اور انہیں مختلف جگہوں اور دُور دراز کے علاقوں پر بکھیر دے تو پھر بھی ایک اندازہ ہو سکتا ہے لیکن اگر راکھ کے چھوٹے چھوٹے ذرے بکھر جائیں تو وہ آنکھوں سے اس طرح محو ہوں گے کہ گویا بالکل نابود ہو گئے ہیں ۔

۵ ۔ **تیز آندھی کے اثرات :** نظامِ آفرینش میں ہوا بلکہ تیز آندھی کے بہت سے اصلاحی آثار ہیں ، اس کے تخریبی آثار استثنائی پہلو رکھتے ہیں ۔ بہر حال اس کے مندرجہ ذیل آثار قابلِ توجہ ہیں :

الف ہوا اور آندھی مختلف نباتات کے بیج مختلف جگہوں پر پھیلا دیتی ہے اور ایک باغبان اور کسان کی طرح سارے کرۂ ارض پر بیج بکھیر دیتی ہے ۔

ب پودوں کو تلقیح کرتی ہے اور نر کے بیج نباتات کے مادہ حصّوں پر چھڑکتی ہے ۔

ج بادلوں کو سمندروں کی سطح سے ہانک کر خشک زمینوں کی طرف لے جاتی ہے ۔

د بلند پہاڑوں کو آہستہ آہستہ رگڑ کر نرم اور بار آور کر دیتی ہے ۔

ر قطبی منطقوں کا موسم منطقۂ استوار کی طرف اور خطِ استوار کا موسم سرد علاقوں کی طرف منتقل کرتی ہے اور کرۂ زمین میں حرارت کو اعتدال پر رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے ۔

س سمندر کے پانی میں موجیں پیدا کرتی ہے اور اسے زیر و زبر کرتی ہے اس طرح اس میں ہوا پہنچتی ہے جب کہ سمندر کا پانی کھڑا اور جامد رہے تو متعفن ہو جائے ۔

اس طرح نباتات اور تمام زندہ موجودات ہوا کے چلنے سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی استعداد کے مطابق اس سے فائدہ اٹھاتا ہے ۔

لیکن ــــ خاکستر کم وزن، کھوکھلی اور سیاہ رو ہوتی ہے۔ اس میں کوئی زندہ موجود نہیں رہ سکتا، یہ سرسبز اور بارآور نہیں ہوتی۔ اس کے ذرات ایک دوسرے سے بالکل جدا جدا ہوتے ہیں۔ جب یہ خاکستر ہوا کا سامنا کرتی ہے تو فوراً ہی منتشر ہو جاتی ہے اور اس کا بے خاصیت ظاہر بھی نظروں سے محو ہو جاتا ہے۔

۶۔ **ان کے اعمال کیوں کھوکھلے ہیں:** یہ امر قابلِ غور ہے کہ بے ایمان افراد کے اعمال بے وقعت کیوں ہیں وہ اپنے اعمال سے کچھ حاصل کیوں نہیں کر پاتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر توحیدی نگاہ سے دیکھا جائے اور اس کے معیاروں کے مطابق تحقیق کی جائے تو یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ وہ چیز کہ جو عمل سے شکل پذیر ہوتی ہے وہ نیت، ہدف اور طرزِ عمل ہے۔ اگر پروگرام، ہدف اور مقصد صحیح ہو تو عمل بھی ایسا ہی ہوگا اور اگر کوئی اچھا عمل غلط مقصد اور بے وقعت ہدف کے لیے انجام دیا جائے تو وہ لایعنی اور بے مفہوم ہو کر رہ جائے گا اور اس کی حیثیت تیز آندھی کے سامنے خاکستر کی سی ہوگی۔

غلط نہ ہوگا اگر اس بحث کو ہم ایک زندہ مثال کے ذریعے واضح کریں۔

اس وقت حقوقِ انسانی کے نام پر مغربی دنیا میں اور بڑی طاقتوں کی طرف سے بعض کام کیے جاتے ہیں۔ انبیاء بھی حقوقِ انسانی کے تحفظ کا پروگرام لے کر آئے تھے لیکن دونوں کے ماحصل اور ثمرہ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

جہاں خوار طاقتیں جب حقوقِ انسانی کا دم بھرتی ہیں تو یقیناً ان کا مقصد انسانی اور اخلاقی نہیں ہوتا۔ ان کا مقصد اپنے جبر، ظلم اور استعماری طور طریقوں پر پردہ ڈالنا ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر ان کے کچھ جاسوس کہیں قابو آ جائیں تو وہ حقوقِ انسانی کے نام پر آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں لیکن جب خود انہی کے ہاتھوں لاکھوں ویت نامی خاک وخون میں غلطاں ہوں یا ہمارے اسلامی ممالک میں وہ اپنے جرائم اور قباحتوں میں مصروف ہوں تو حقوقِ انسانی کو فراموش کر دیتے ہیں بلکہ انہوں نے تو حقوقِ انسانی جھوٹے اور ظالم حکمرانوں سے تعاون کی نذر کر رکھے ہیں۔

لیکن ایک سچے پیغمبر یا علیؑ جیسے وصی پیغمبر کے نزدیک حقوقِ انسانی انسانوں کی حقیقی آزادی کا نام ہے۔ وہ انسانوں کی غلامی کے طوق اور زنجیریں توڑنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ جب وہ کسی مظلوم انسان کو دیکھتے ہیں تو تڑپ اٹھتے ہیں اور اس کی نجات کے لیے کوشش کرتے ہیں۔

گویا جہاں خوار طاقتوں کا عمل خاکستر کی مانند ہے جسے تیز آندھی کا سامنا ہے اور انبیاء و اوصیاء کا عمل بابرکت زمین کی طرح ہے جس سے طرح طرح کی پاکیزہ نباتات پیدا ہوتی ہیں اور پھل پھول اگتے ہیں۔

یہیں سے مفسرین کی ایک بحث واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ زیرِ نظر آیت میں اعمال سے کون سے اعمال مراد ہیں۔ کہنا چاہیے کہ ان کے سارے اعمال ہیں حتیٰ کہ ان کے وہ اعمال بھی جو ظاہراً اچھے لیکن باطناً شرک و بت پرستی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

۷۔ **مسئلہ احباط:** جیسے ہم سورہ بقرہ کی آیہ ۲۱۷ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں حبطِ اعمال یعنی برے اعمال یا کفر و بے ایمانی کی وجہ سے اچھے اعمال ختم ہو جانے کا مسئلہ علماء اسلام کے درمیان اختلافی ہے لیکن حق یہ ہے کہ بے ایمانی اور کفر پر اصرار اور ہٹ دھرمی نیز بعض اعمال مثلاً حسد، غیبت اور قتلِ نفس کی ایسی بری تاثیر ہے جو نیک اعمال اور حسنات کو برباد کر دیتی ہے۔ زیرِ نظر آیت بھی حبطِ اعمال کے امکان پر ایک اور دلیل ہے[1]

---

[1] جلد ۱ تفسیر نمونہ صفحہ ۵۰۶

۸۔ کیا ایجادات و انکشافات کرنے والوں کے لیے بھی جزاء ہے؟ مندرجہ بالا مباحث کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ اہم سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ علوم اور ایجادات و انکشافات کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے سائنسدانوں نے طاقت فرسا زحمتیں جھیلی ہیں اور بہت محرومیوں کو برداشت کیا ہے تاکہ ایجاد و انکشاف کر سکیں تاکہ اپنے ہم نوع لوگوں کے دوش سے بھاری بوجھ اتار سکیں مثلاً بجلی ایجاد کرنے والے اڈیسون نے اس قیمتی ایجاد کے لیے کیسی جانکاہ زحمتیں جھیلی ہیں۔ شاید اس نے اس راہ میں اپنی جان بھی گنوا دی ہے لیکن اس نے ساری دنیا کو روشن کر دیا ہے اور کارخانے چلا دیئے ہیں۔ اس ایجاد کی برکت سے سرسبز کھیتیوں کو ٹیوب ویلوں سے پانی ملا ہے، درخت سرسبز ہوئے ہیں اور کھیت آباد ہوئے ہیں خلاصہ یہ کہ دنیا کا چہرہ ہی بدل گیا ہے۔

اسی طرح پاسٹور ہے کہ جس نے جراثیم کو دریافت کر کے لاکھوں انسانوں کو موت کے خطرے سے نجات دلا دی ہے۔

کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ ایسے سب افراد اس فرض کی بناء پر قعر جہنم میں گرائے جائیں کہ وہ ایمان نہیں رکھتے تھے لیکن وہ افراد جنہوں نے عمر بھر انسانوں کی خدمت کا کوئی کام نہیں کیا ان کا مقام بہشت ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ:

اسلام کے معاشرتی اصولوں کے لحاظ سے فقط عمل کو دیکھنا کافی نہیں بلکہ عمل کی قدر و قیمت اس کے محرک، سبب اور مقصد کے ساتھ بنتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ ہسپتال، سکول یا کوئی اور مفید عمارت تعمیر کرتے ہیں اور اظہار بھی یہ کرتے ہیں کہ ان کا مقصد اس معاشرے کی انسانی خدمت ہے جس کے وہ مرہون منت ہیں حالانکہ اس پردے کے پیچھے کوئی اور مطلب چھپا ہوتا ہے۔ ان کا مقصد مقام و منصب یا مال و ثروت کا حصول ہوتا ہے یا وہ اپنے بچاؤ کے لیے ایسا کرتے ہیں یا وہ عوام کی توجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنے مادی مفادات کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں یا پھر وہ دوسروں کی نظروں سے بچ کر خیانت کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن اس کے برعکس ممکن ہے کوئی شخص پورے خلوص سے یا سو فی صد انسانی اور روحانی جذبے سے کوئی چھوٹا سا کام انجام دے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ ان "عظیم لوگوں" کے عمل اور کردار کے محرک کی بھی تحقیق کی جائے۔ اگر تحقیق کی جائے تو ان کا عمل یقیناً چند اشکال سے خارج نہیں ہے۔

ا۔ کبھی کسی ایجاد کا حقیقی مقصد تخریب ہوتا ہے (جیسے اٹامک انرجی کی دریافت پہلے پہل ایٹم بم بنانے کے لیے ہوئی)۔ پھر اس کے ساتھ نوع انسان کو کچھ فائدے بھی حاصل ہو جاتے ہیں کہ جو دریافت یا ایجاد کرنے والوں کا حقیقی مقصد نہیں ہوتا یا پھر اسے ثانوی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے ایجادات کرنے والوں کی ذمہ داری پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

ب۔ کبھی ایجاد و انکشاف کرنے والے کا مقصد مادی فوائد یا نام و نمود اور شہرت کا حصول ہوتا ہے۔ ایسا شخص درحقیقت ایک تاجر کی طرح ہے کہ جو زیادہ سے زیادہ آمدنی کے لیے زیادہ نفع بخش چیزیں بناتا ہے۔ اس کی بنائی ہوئی چیزیں کچھ لوگوں کے لیے مفید ہوتی ہیں اور ملک کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوتا ہے جب کہ اس کا مقصد سوائے آمدنی کے کچھ بھی نہیں ہوتا اور اگر کسی اور کام میں زیادہ آمدنی ہو تو وہ اسے شروع کر دیتا ہے۔ البتہ ایسی تجارت یا پیداوار اگر شرعی قوانین کے مطابق ہو تو غلط اور حرام کام نہیں ہوگا لیکن کوئی مقدس عمل بھی شمار نہیں ہوگا۔

ایسی ایجادیں اور دریافتیں تاریخ میں کم نہیں ہیں کہ جو اس قسم کے طرز فکر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اگر یہ لوگ دیکھیں کہ ایسے

کسی کام کی نسبت دوسرے راستے میں آمدنی زیادہ ہے اگرچہ وہ معاشرے کے لیے مضر ہو (مثلاً دوا سازی کی صنعت میں ۲۰٪ منافع ہے اور ہیروئن سازی میں ۵۰٪) تو یہ دوسرے کو ترجیح دیں گے۔

ایسے لوگ نہ خدا سے کوئی مطالبہ رکھتے ہیں نہ اپنے ہم نوع انسانوں سے۔ ان کا اجر وہی فائدہ اور شہرت ہے جو وہ چاہتے ہیں اور جو انہوں نے پایا ہے۔

ج ایک تیسرا گروہ بھی ہے جس کے محرکات اور اسباب یقیناً انسانی ہیں یا اگر وہ اللہ کے معتقد ہیں تو ان کے اہداف اور محرکات الٰہی ہیں۔ یہ لوگ کبھی کبھی سالہا سال تجربہ گاہوں کے گوشے میں عزلت و محرومی سے گزار دیتے ہیں، اس اُمید پر کہ اپنی نوع کی کچھ خدمت کر سکیں اور جہانِ انسانیت کو کوئی ہدیہ اور سوغات پیش کر سکیں، کسی تکلیف زدہ کے پاؤں کی زنجیر کھول سکیں اور کسی رنجیدہ خاطر کے چہرے سے پریشانی کی پرچھائیاں دور کر سکیں۔

ایسے افراد اگر ایمان اور الٰہی محرک رکھتے ہوں تو پھر ان کے بارے میں کوئی بحث نہیں اور اگر وہ ایمان اور الٰہی محرک نہ رکھتے ہوں لیکن ان کا محرک انسانی اور لوگوں کی خدمت ہو تو اس میں شک نہیں کہ انہیں خداوندِ عالم کی طرف سے مناسب اجر اور جزا ملے گی ممکن ہے انہیں یہ جزا دنیا میں ملے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرے جہان میں ملے۔ یقیناً خداوندِ عالم و عادل انہیں محروم نہیں کرے گا۔ لیکن کس طرح اور کس طرز پر، اس کی تفصیلات ہم پر واضح نہیں۔ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ "خدا اس قسم کے نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا" (البتہ اگر وہ ایمان قبول نہ کرنے میں جاہل قاصر ہوں تو پھر مسئلہ بہت واضح ہے)۔

اس مسئلہ کی دلیل حکمِ عقلی کے علاوہ وہ اشارات ہیں جو آیات یا روایات میں آئے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ "ان اللہ لایضیع اجر المحسنین"[1] کے مفہوم میں ایسے افراد شامل نہ ہوں۔ کیونکہ قرآن میں لفظ "محسنین" کا اطلاق صرف "مؤمنین" پر نہیں ہوا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جب ان کے پاس آئے تو انہیں پہچانے بغیر عزیز مصر سمجھتے ہوئے کہنے لگے:

انا نراك من المحسنين

ہم تجھے نیکوکاروں میں سے سمجھتے ہیں۔ (سورہ یوسف۔ ۷۸)

اس سے قطع نظر یہ بھی فرمانِ الٰہی ہے:

فمن يعمل مثقال ذرة خيرًا يره ٥ ومن يعمل مثقال ذرة شرًّا يره ٥

جو شخص ذرہ بھر اچھا کام کرے گا اُسے دیکھے گا اور جو کوئی ذرہ بھر بُرا کام کرے گا اسے دیکھا گا۔ (سورہ زلزلہ۔ ۷-۸)

ایک حدیث میں علی بن یقطین کی وساطت سے امام کاظم علیہ السلام سے مروی ہے:

بنی اسرائیل میں ایک صاحبِ ایمان تھا۔ اس کا ہمسایہ کافر تھا۔ کافر اپنے صاحبِ ایمان ہمسائے سے اچھا سلوک کرتا تھا۔ جب وہ دنیا سے گیا تو خدا نے اس کے لیے ایک گھر بنایا تا کہ جہنم کی آگ کی تپش سے رکاوٹ ہو۔۔۔ اور

---

[1] یوسف۔ ۹۰ اور بعض دیگر سورتیں۔

اس سے کہا گیا کہ یہ اپنے مومن ہمسائے سے تیرے نیک سلوک کے سبب سے ہے[1]

عبداللہ بن جدعان زمانہ جاہلیت کے مشہور مشرکین اور قریش کے سرداروں میں سے تھا۔ اس کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

اہل جہنم میں سے کمترین عذاب ابن جدعان کو ہوگا۔

لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہ! کیوں

آپؐ نے فرمایا:

انه کان یطعم الطعام

کیونکہ وہ بھوکوں کو کھانا کھلاتا تھا[2]

ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاتم طائی کے بیٹے عدی سے فرمایا:

دفع عن ابیك العذاب الشدید بسخاء نفسه

خدا نے تیرے باپ سے شدید عذاب اس کے جود و سخا کی بناء پر اٹھا لیا ہے[3]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

یمن سے کچھ لوگ رسول اللہؐ سے بحث و تمحیص کے لیے آپؐ کی خدمت میں آئے۔ ان میں سے ایک شخص تھا جو زیادہ باتیں کرتا تھا اور آپؐ سے بڑی سختی اور ہٹ دھرمی کا سلوک کرتا تھا۔ آنحضرتؐ کو اتنا برا لگا کہ ناپسندیدگی کے آثار آپؐ کے چہرہ مبارک پر پوری طرح ظاہر ہوئے۔ اس وقت جبرئیل آئے اور یہ پیام الٰہی آپ تک پہنچایا کہ خدا فرماتا ہے: یہ شخص سخی ہے۔ یہ بات سنتے ہی رسول اللہ کا غصہ ختم ہوگیا۔ اس کی طرف رخ کرکے آپ نے فرمایا کہ پروردگار نے مجھے اس قسم کا پیغام دیا ہے اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں تجھ پر اس قسم کی سختی کرتا کہ تو دوسروں کے لیے عبرت بن جاتا۔ اس شخص نے پوچھا: کیا آپ کے پروردگار کو سخاوت پسند ہے؟ فرمایا: ہاں۔ تو اس نے عرض کیا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اس کے رسول اور فرستادہ ہیں اور اسی خدا کی قسم جس نے آپ کو مبعوث کیا ہے آج تک میں نے کسی شخص کو اپنے مال سے محروم نہیں پلٹایا[4]

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ بعض آیات اور بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان یا یہاں تک کہ ولایت قبولِ اعمال یا جنت میں داخلے کی شرط ہے لہٰذا اگر بے ایمان افراد سے بہترین اعمال سرزد ہوں تو وہ بارگاہِ الٰہی میں مقبول نہیں ہوں گے۔

---

[1] بحار، جلد ۳ ص ۲۳ چاپ کمپانی۔

[2] بحار، جلد ۳ ص ۲۷۷ چاپ کمپانی۔

[3] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۶۰۷۔

[4] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۶۰۷۔

لیکن اس سوال کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ "قبولیتِ اعمال" کا ایک اور مفہوم ہے اور مناسب اجر ملنا دوسرا مسئلہ ہے لہٰذا علمائے اسلام کے درمیان مشہور ہے کہ مثلاً حضورِ قلب کے بغیر یا بعض گناہوں مثلاً غیبت سے نماز مقبولِ بارگاہِ خدا نہیں ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ایسی نماز شرعاً صحیح ہے، فرمانِ الٰہی کی اطاعت ہے اور اس سے ذمہ داری ادا ہو جاتی ہے اور مسلّم ہے کہ فرمانِ الٰہی کی اطاعت اجر و جزا کے بغیر نہیں ہوگی۔

لہٰذا عمل کی قبولیت دراصل عمل کا عالی مرتبہ ہوتا ہے۔ زیرِ بحث مسئلے میں بھی ہم یہی بات کہتے ہیں ہم کہتے ہیں کہ اگر انسانوں اور عوام کی خدمات ایمان کے ساتھ ہوں تو ان کا مفہوم عالی ہوگا لیکن ایسا نہ ہو تو بھی بالکل بے معنی اور بغیر اجر کے نہیں ہوں گی۔ جنت میں داخلے کے بارے میں بھی ہم یہی جواب دیں گے کہ عمل کا اجر ضروری نہیں کہ جنت میں داخلے پر منحصر ہو۔

(بحث کا بقیہ اور تفصیلی بحث مناسب ہے کہ اس مسئلے کی فقہی مباحث میں ہو)۔

۱۹۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝

۲۰۔ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝

ترجمہ

۱۹۔ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور نئی مخلوق لے آئے۔

۲۰۔ اور یہ کام خدا کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔

تفسیر

خلقت حق کی اساس پر ہے

گزشتہ آیت میں باطل کا ذکر ہے۔ وہ باطل کہ جو خاکستر کی طرح ہے۔ وہ خاکستر کہ جو پراگندہ ہے اور آندھی چلنے سے ادھر ادھر بکھر جاتی ہے۔ زیر نظر پہلی آیت میں حق کے بارے میں گفتگو ہے۔ یہ حق کے استقرار سے متعلق ہے۔

روئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے دنیا کے تمام طالبانِ حق کے لیے نمونے کے طور پر فرمایا گیا ہے: کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمان اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے (الم تر ان اللہ خلق السمٰوٰت والارض بالحق)۔

"حق" جیسا کہ مفردات میں راغب نے کہا ہے دراصل "مطابقت" اور "ہم آہنگی" کے معنی میں ہے لیکن اس کے استعمال کے مواقع مختلف ہیں۔

بعض اوقات حق ایسے کام کو کہا جاتا ہے جو حکمت کے موافق اور نظم و نسق کے مطابق کیا گیا ہو جیسا کہ قرآن میں ہے:

ھوالذی جعل الشمس ضیاء و القمر نورًا ..... ما خلق اللہ ذٰلک الا بالحق

وہ وہی ہے کہ جس نے خورشید کو روشنی اور چاند کو نور افشانی کا ذریعہ قرار دیا ہے ..... اس نے یہ کام حکمت اور حساب کتاب کے بغیر انجام نہیں دیا۔ (یونس ۔ ۵)

کبھی اُس ذات کو حق کہا جاتا ہے جو اس قسم کا کام انجام دے جیسے اللہ کے لیے اسی لفظ کا اطلاق ہوا ہے:

فذلکم اللہ ربکم الحق

تمہارا یہ خدا تمہارا پروردگار حق ہے۔ (یونس۔ ۳۲)

کبھی ایسے اعتقاد کو حق کہا جاتا ہے جو حقیقت کے مطابق ہو۔ مثلاً

فھدی اللہ الذین اٰمنوا لما اختلفوا فیہ من الحق

جن اعتقادات میں اختلاف کرتے ہیں، خدا نے ایمان والوں کو ان میں حق کی ہدایت کی ہے۔ (بقرہ۔ ۲۱۳)

کبھی ایسی گفتگو اور عمل کو حق کہا جاتا ہے کہ جو ضروری مقدار کے مطابق ہو اور اس وقت انجام پائے جب ضروری ہو۔ مثلاً

حق القول منی لاملئن جھنم

مجھ سے یہ قول حق صادر ہوا ہے کہ میں جہنم کو (گنہگاروں سے) بھر دوں گا۔ (سجدہ۔ ۱۳)

بہرحال "حق" کے مقابل "باطل"، "ضلال"، "لعب"، "بیہودہ" اور اس قسم کے کلمات کے لیے کام آتے ہیں لیکن زیر بحث آیت میں بلاشبہ اس پہلے معنی کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی عالم آفرینش کی عمارت اور آسمان و زمین سب نشاندہی کرتے ہیں کہ ان کی خلقت میں نظم و نسق، حساب و کتاب اور حکمت و ہدف ہے۔ خدا کو انہیں خلق کرنے کی احتیاج تھی نہ اسے تنہائی سے وحشت ہوتی تھی اور نہ ان سے وہ اپنی ذات کی کسی کمی کو دور کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے بلکہ یہ وسیع و عریض جہان مخلوقات کی پرورش اور انہیں زیادہ سے زیادہ تکامل و ارتقا بخشنے کی منزل ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اس بات کی دلیل کہ اسے تمہاری اور تمہارے ایمان لانے کی ضرورت نہیں ہے، یہ ہے کہ "اگر وہ ارادہ کرے تو تمہیں لے جائے اور تمہاری جگہ کوئی نئی مخلوق لے آئے" ایسی مخلوق کہ جو ساری کی ساری ایمان رکھتی ہو اور تمہارے غلط کاموں میں سے کسی کو انجام نہ دے (ان یشا یذھبکم ویأت بخلق جدید)۔

اور یہ کام خدا کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے (وما ذٰلک علی اللہ بعزیز)۔

اس گفتگو کی شاہد سورہ نساء کی یہ آیت ہے:

وان تکفروا فان للہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض وکان اللہ غنیا حمیدا...... ان یشأ یذھبکم ایھا الناس ویأت باٰخرین وکان اللہ علی ذٰلک قدیرا

اگر تم کافر ہو جاؤ تو اس سے خدا کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اللہ کا ہے اور خدا بے نیاز اور لائق حمد ہے..... اے لوگو! وہ جب چاہے تمہیں لے جائے اور دوسرا گروہ لے آئے اور یہ کام خدا کے لیے آسان ہے۔ (نساء ۱۳۱ تا ۱۳۳)

مذکورہ بالا آیت کے متعلق یہ تفسیر ابن عباس سے بھی نقل ہوئی ہے۔

ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ مندرجہ بالا جملہ مسئلۂ معاد کی طرف اشارہ ہے یعنی خدا کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں کہ سب انسانوں کو لے جائے اور دوسری مخلوق پیدا کرے تو کیا اس قدرت کے باوجود مسئلۂ معاد دوسرے جہان کی طرف تمہاری بازگشت میں تمہیں شک ہو سکتا ہے؟

۲۱۔ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ۭ سَوَاۗءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ۝

۲۲۔ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّىْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۭ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

۲۳۔ وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۭ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۝

ترجمہ

۲۱۔ اور (قیامت کے روز) وہ سب خدا کے سامنے ظاہر ہوں گے تو اس وقت ضعفاء (نادان پیروکار، مستکبرین سے کہیں گے، ہم تمہارے پیروکار تھے۔ تو کیا اب جب کہ تمہاری پیروی کی وجہ سے ہم عذابِ خدا میں گرفتار ہوئے ہیں) تم تیار ہو کہ عذاب الٰہی کا کچھ حصہ قبول کرو اور ہم سے اس کا بوجھ اٹھالو۔ تو وہ کہیں گے کہ اگر خدا نے (عذاب سے رہائی کی طرف) ہماری ہدایت کی ہوتی تو ہم بھی تمہیں ہدایت

کرتے (معاملہ اس سے آگے نکل گیا ہے) چاہے ہم بے قرار ہوں یا صبر کریں، ہمارے لیے کوئی فرق نہیں نجات کی راہ موجود نہیں ہے۔

۲۲۔ اور جس وقت کام تمام ہوگیا تو شیطان کہے گا کہ خدا نے تم سے حق وعدہ کیا اور میں نے تم سے (باطل) وعدہ کیا اور خلاف ورزی کی۔ میں تم پر کوئی تسلط نہیں رکھتا تھا سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے قبول کرلی۔ لہٰذا مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ کو سرزنش کرو، نہ میں تمہارا فریاد رس ہوں نہ تم میرے فریاد رس ہو۔ تم نے جو مجھے شریک بنایا (اور میری اطاعت کو اطاعت خدا کے ہم پلہ قرار دیا) اور یہ تم پہلے ہی سے کرتے تھے، میں اس سے بیزار ہوں اور میں اس کا انکار کرتا ہوں۔ یقیناً ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

۲۳۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے وہ باغات بہشت میں داخل ہوں گے۔ ایسے باغات کہ جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ اپنے پروردگار کے اذن سے ہمیشہ ان میں رہیں گے اور وہاں ان کا تحیہ سلام ہوگا۔

تفسیر

شیطان اور اس کے پیروکاروں کی صریح گفتگو

گزشتہ چند آیات میں ہٹ دھرم اور بے ایمان مخرفین کے لیے دردناک عذاب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ زیر بحث آیات اسی مفہوم کا تسلسل ہیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے، روزِ قیامت تمام جابر، ظالم اور کافر بارگاہِ خداوندی میں پیش ہوں گے چاہے وہ تابع ہوں یا متبوع اور پیرو ہوں یا پیشوا (وبرزوا للہ جمیعاً[1])۔

---

[1] توجہ رہے کہ «برزوا» فعل ماضی ہے لیکن یہاں آئندہ کے مفہوم میں آیا ہے کیونکہ قیامت سے مربوط مسائل قطعی اور نا قابل تغیر ہیں لہٰذا بہت سی قرآنی آیات میں ان کا ذکر ماضی کے صیغے کے ساتھ ہوا ہے۔ جیسے ایک ایسے بیمار شخص کے لیے کہ جس کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ وہ مر جائے گا ہم کہتے ہیں وہ تو دنیا سے چل بسا۔

اس وقت مستضعفین یعنی نادان پیروکار کہ جو اندھی تقلید کی وجہ سے اپنے آپ کو وادیٔ ضلالت میں سرگرداں کر چکے تھے مستکبرین سے کہ جو ان کی گمراہی کے عامل تھے، کہیں گے: ہم تمہارے پیروکار تھے۔ اب جب کہ ہم تمہاری رہبری کے باعث ان سب عذابوں اور بلاؤں میں گرفتار ہوئے ہیں، کیا ممکن ہے کہ تم بھی ان عذابوں کا کچھ حصہ قبول کر لو تاکہ ہمیں تخفیف مل جائے (فقال الضعفاء للذین استکبروا انا کنا لکم تبعاً فھل انتم مغنون عنا من عذاب اللہ من شیء)۔

لیکن وہ کہیں گے: اس کیفر کردار اور عذاب سے اگر خدا ہماری ہدایت نجات کی طرف کرتا تو ہم بھی تمہاری راہنمائی کرتے (قالوا لو ھدانا اللہ لھدینا کم)۔

لیکن افسوس کہ معاملہ اس سے آگے نکل چکا ہے" چاہے ہم بے قرار ہوں اور جزع فزع کریں چاہے صبر کریں ہمارے لیے کوئی راہِ نجات نہیں ہے" (سواء علینا اجزعنا ام صبرنا مالنا من محیص)۔

چند اہم نکات

۱۔ **ایک اشکال کی وضاحت:** اس آیت کے سلسلے میں جو پہلا سوال سامنے آتا ہے یہ ہے کہ کیا لوگ اس جہان میں علمِ خدا کے سامنے ظاہر نہیں ہیں کہ جو مذکورہ بالا آیت میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت میں سب کے سب بارگاہِ خدا میں ظاہر ہوں گے؟

اس سوال کے جواب میں بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اس دنیا میں لوگوں کو احساس نہیں ہے کہ وہ خود اور ان کے سب اعمال بارگاہِ خدا میں ظاہر ہیں لیکن قیامت میں یہ ظہور سب محسوس کریں گے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں مراد قبروں سے نکلنا اور حساب و کتاب کے لیے عدلِ الٰہی کی عدالت کے سامنے پیش ہونا ہے۔

یہ دونوں تفسیریں خوب ہیں اور کوئی مانع نہیں کہ دونوں ہی آیت کے مفہوم میں داخل ہوں۔

۲۔ "لو ھدانا اللہ لھدینا کم" کا مفہوم: بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس سے مراد اس جہان میں عذابِ الٰہی سے نجات کے طریقے کی ہدایت ہے کیونکہ یہ بات مستکبرین اپنے پیروکاروں کے جواب میں کہیں گے جب کہ پیروکار ان سے عذاب کا کچھ حصہ قبول کرنے کا تقاضا کریں گے۔ سوال و جواب کا تقاضا ہے کہ مراد عذاب سے رہائی کے طریقے کی ہدایت ہو۔

اتفاق سے یہی تعبیر (ھدایت) نجات بہشت تک پہنچنے کے بارے میں بھی نظر آتی ہے۔ اہلِ جنت کی زبانی ہے:

وقالوا الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ

وہ کہیں گے: شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمیں ان نعمتوں کی طرف ہدایت کی ہے اور اگر اس کی توفیق و ہدایت نہ ہوتی تو ہمیں ان کی راہ نہ ملتی۔

(اعراف ـ ۴۳)

یہ احتمال بھی ہے کہ رہبرانِ ضلالت سے جب ان کے پیروکار تقاضا کریں گے تو اپنے تئیں گن وسے بری کرنے کے لیے گمراہی کے تمام علمبرداروں کی طرح کہ جو اپنی خراب کاری دوسروں کے سر تھوپ دیتے ہیں، وہ بڑی ڈھٹائی سے کہیں گے، ہم کیا کریں اگر خدا ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت کرتا تو ہم بھی تمہیں ہدایت کرتے یعنی ہم تو مجبور تھے اور ہمارا اپنا تو کوئی ارادہ ہی نہ تھا۔

یہی شیطان کی منطق ہے کہ جس نے اپنے آپ کو بری قرار دینے کے لیے خدائے عادل کی طرف جبر کی نسبت دیتے ہوئے کہا:

فبما اغویتنی لاقعدن لهم صراطك المستقیم

اب جب کہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے تو میں بھی تیرے سیدھے راستے میں بیٹھا ان کی تاک میں رہوں گا (اور انہیں منحرف کروں گا)

(اعراف ـ ۱۶)

لیکن توجہ رہے کہ مستکبرین چاہیں نہ چاہیں صریح آیاتِ قرآن اور واضح روایات کی رو سے اپنے پیروکاروں کے گناہ کی ذمہ داری کا بوجھ بہرحال انہیں اپنے کندھوں پر اٹھانا ہوگا کیونکہ وہ انحراف کے بانی اور گمراہی کے عامل تھے البتہ پیروکاروں کی ذمہ داری اور عذاب و سزا میں بھی کچھ کمی نہ ہوگی۔

۳ ـ **اندھی تقلید کی مذمت:** مندرجہ بالا آیت سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ:

اوّلاً ـ وہ لوگ جو آنکھ کان بند کر کے اس کے اور اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں گویا ہر شخص کے ہاتھ اپنی باگ ڈور تھما دیتے ہیں وہ بے قیمت اور بے حیثیت لوگ ہیں۔ قرآن ان کے لیے "ضعفاء" کا لفظ استعمال کرتا ہے

ثانیاً ـ ان کا اور ان کے پیشواؤں کا انجام ایک ہی ہے اور وہ بے چارے سخت ترین حالات میں بھی اپنے گمراہ رہبروں کا تعاون حاصل نہیں کر سکیں گے۔ یہاں تک کہ ان کے رہبر ان کی سزا اور عذاب میں ذرہ بھر تخفیف نہیں کروا سکیں گے بلکہ شاید تمسخر سے انہیں جواب دیں گے کہ بے کار واویلا نہ کرو کیونکہ بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

۴ ـ "برزو" اور "محیص" کا مفہوم: "برزوا" دراصل "بروز" کے مادہ سے ظاہر ہونے اور پردے سے باہر آنے کے معنی میں ہے۔ نیز اس کا معنی میدانِ جنگ میں صف سے باہر نکل کر حریف کے مقابلے میں آ کھڑے ہونا بھی ہے۔ اصطلاح میں یہ لفظ مبارزہ کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

"محیص" "محص" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے عیب یا تکلیف سے نجات پانا۔

اس کے بعد جابروں، گنہگاروں اور شیطان کے پیروکاروں کی روزِ قیامت روحانی اور نفسیاتی عذاب اور سزا کا منظر پیش کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: اور جب صالح اور غیر صالح بندوں کا حساب کتاب ختم ہو جائے گا اور ہر ایک اپنے قطعی انجام کو پہنچ جائے گا تو شیطان اپنے پیروکاروں سے کہے گا کہ خدا نے تم سے حق وعدہ کیا تھا اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا (جیسا کہ تم خود جانتے ہو وہ فضول اور بے قیمت وعدہ تھا) پھر میں نے اپنے وعدے کے خلاف کیا (وقال الشیطٰن لما قضی الامر ان الله وعدکم وعد الحق ووعدتکم فاخلفتکم)۔

گویا اس طرح شیطان بھی دیگر راہِ ضلالت کے رہبر مستکبرین کا ہم آواز ہوتا ہے اور اپنے ان بدبخت پیروکاروں پر اپنی ملامت و سرزنش کے تیر چلاتا ہے۔ پھر مزید کہتا ہے، میں تم پر کوئی جبری طور پر مسلط نہ تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے اپنی مرضی سے اسے قبول کیا (وما کان لی علیکم من سلطانٍ الا ان دعوتکم فاستجبتم لی)۔ لہٰذا مجھے سرزنش نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو کہ تم نے میری شیطنت آمیز اور ظاہر الفساد دعوت کو کیوں قبول کیا (فلا تلوموني ولوموا انفسکم) تم نے خود یہ کام کیا ہے لہٰذا لعنت تم پر ہو۔

بہرحال "پروردگار کے قطعی حکم اور عذاب کے سامنے نہ میں تمہاری فریادرسی کر سکتا ہوں نہ تم میری فریادرسی کر سکتے ہو" (ما انا بمصرخکم وما انتم بمصرخی)۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ تمہاری طرف سے مجھے شریک قرار دینے اور میری اطاعت کو اطاعت الٰہی کے [illegible] قرار دینے

سے میں بیزار ہوں اور میں اس کا انکار کرتا ہوں (انی کفرت بما اشرکتمون من قبل)۔
اب میں سمجھا ہوں کہ "اسی اطاعت میں شرک کرنے نے مجھے بھی بدبخت کیا ہے اور تمہیں بھی، وہی بدبختی اور بے چارگی کہ جس کی تلافی کے لیے کوئی راستہ نہیں ہے، جان لو کہ ظالموں کے لیے یقیناً دردناک عذاب ہے" (ان الظالمین لھم عذاب الیم)

چند اہم نکات

۱۔ **شیطان کا اپنے پیروکاروں کو سخت جواب:** لفظ "شیطان" کا مفہوم اگرچہ وسیع ہے اور اس میں جنوں اور انسانوں میں سے تمام طاغوتی اور وسوسہ گر شامل ہیں لیکن اس آیت اور گزشتہ آیت میں جو قرائن موجود ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یقیناً مراد شخصی طور پر ابلیس ہے کہ جو تمام شیطانوں کا گرو شمار ہوتا ہے۔ اسی لیے تمام مفسرین نے اسی تفسیر کا انتخاب کیا ہے[1]
اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ شیطانی وسوسے انسان کے اختیار و ارادہ کو ہرگز سلب نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی حیثیت ایک دعوت دینے والے سے زیادہ نہیں اور یہ انسان ہے جو اپنے ارادے سے شیطان کی دعوت قبول کرتا ہے۔ البتہ ممکن ہے شیطانی کاموں کے لیے طبیعت ہموار ہو جائے اور انسانی مقاصد کے خلاف مسلسل کام کرنے سے انسان ایسے مقام تک جا پہنچے جس سے وسوسوں کے مقابل ایک طرح کی سلب اختیار کی حالت پیدا ہو جائے جیسے ہم بعض منشیات کے عادی لوگوں کو دیکھتے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کا اصل سبب اختیاری ہے لہٰذا نتیجہ کچھ بھی ہو اختیاری ہی شمار ہوگا۔
سورہ نحل کی آیہ ۱۰۰ میں ہے:
انما سلطانہ علی الذین یتولونہ والذین ھم بہ مشرکون
شیطان کا تسلط صرف ان لوگوں پر ہے جنہوں نے اپنے لیے اس کی سرپرستی قبول کر لی ہے اور جنہوں نے اطاعت میں اسے خدا کا شریک قرار دیا ہے۔
ضمناً شیطان ان لوگوں کو دندان شکن جواب دیتا ہے جو اپنے گناہ اس کی گردن پر ڈال دیتے ہیں، اپنے انحرافات کا عامل اسے شمار کرتے ہیں اور اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ شیطان بعض گنہگاروں کی اس عامیانہ منطق سے برائت کا اظہار کرتا ہے۔ در اصل انسان پر حقیقی تسلط اس کے ارادے اور عمل کا ہے نہ کہ کسی اور چیز کا۔
۲۔ **روزِ حشر شیطان کا اپنے پیروکاروں سے رابطہ:** اس عظیم محضر میں شیطان کس طرح اپنے تمام پیروکاروں سے رابطہ قائم کرے گا اور کس طرح انہیں ملامت کرے گا۔
اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یقیناً خدا اسے یہ طاقت دے گا۔ در اصل شیطان کے پیروکاروں کے لیے یہ ایک طرح کا روحانی اور نفسیاتی عذاب ہے۔ یہ اس جہان میں اس راستے پر چلنے والوں کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے کہ وہ ابھی سے اپنا اور اپنے رہبر کا انجام دیکھ لیں۔ بہر حال خدا کسی طرح سے شیطان اور اس کے پیرووں کے درمیان یہ ارتباط فراہم کرے گا۔

---

[1] شیطان کے معنی کے سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد اول ص۲۲ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

٣۔ **گمراہی کے دیگر پیشواؤں کا طرزِ عمل:** یہ امر جاذب نظر ہے کہ روزِ قیامت ایسی ملاقات صرف شیطان اور اس کے پیروکاروں کے درمیان نہ ہوگی بلکہ ضلالت و گمراہی کے تمام پیشوا اس جہان میں ایسا ہی کریں گے۔ وہ اپنے پیروکاروں کا ہاتھ (خود ان کی مرضی سے) پکڑیں گے۔ انہیں بلاؤں اور بدبختیوں کی موجوں کی طرف کھینچے جائیں گے اور جب دیکھیں گے کہ حالات بُرے ہیں تو انہیں چھوڑ کر چلتے بنیں گے یہاں تک کہ ان سے بیزاری کا اعلان کریں گے اور انہیں ملامت کریں گے۔ بزبانِ اصطلاح انہیں دنیا و آخرت کے خسارے میں گرفتار کریں گے۔

٤۔ **"مصرخ" کا مطلب:** "مصرخ" "اصراخ" کے مادہ سے اصل میں "صرخ" مدد کے لیے پکارنے اور فریاد کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ اس بناء پر "مصرخ" فریادرس کے معنی میں ہے اور "مستصرخ" اُس شخص کے معنی میں ہے جو فریادرسی چاہے۔

٥۔ **شیطان کو شریک قرار دینے سے مراد:** شیطان کو شریک قرار دینے سے مراد شرکِ اطاعت ہے نہ کہ شرکِ عبادت۔

٦۔ **"ان الظالمین لھم عذاب الیم" کس کا جملہ ہے:** یہ جملہ شیطان کی باتوں کا آخری حصہ ہے یا پروردگار کی طرف سے مستقل جملہ ہے، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ لیکن زیادہ تر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے مستقل جملہ ہے کہ جو شیطان کی اپنے پیروکاروں سے گفتگو کے بعد ایک اصلاحی و تربیتی درس کے طور پر آیا ہے۔

زیرِ بحث آخری آیت میں سرکش و بے ایمان جابر افراد کی حالت اور ان کا دردناک انجام بیان کرنے کے بعد مومنین کی حالت اور ان کا انجام بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور جو ایمان لائے اور اعمالِ صالح انجام دیئے وہ باغاتِ بہشت میں داخل ہوں گے، وہ باغات کہ جن کے درختوں کے نیچے پانی کی نہریں جاری ہیں (وادخل الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات جنات تجری من تحتھا الانھار) وہ اپنے پروردگار کے اذن سے ہمیشہ ان باغات میں رہیں گے (خالدین فیھا باذن ربھم) اور وہاں ان کا تحیہ سلام ہے (تحیتھم فیھا سلام)۔

"تحیت" دراصل "حیات" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ افراد کی سلامتی اور حیات کی دعا کے لیے استعمال ہونے لگا۔ ہر قسم کی سلام و دعا کہ جو ابتدائے ملاقات میں کہی جاتی ہے، اس پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ زیرِ بحث آیت میں "تحیت" وہ خوش آمدید اور درود و سلام ہے جو اللہ تعالیٰ صاحبانِ ایمان پر بھیجتا ہے اور انہیں اپنی نعمتِ سلامتی کا ہم آغوش قرار دیتا ہے۔

سلامتی — ہر قسم کی ناراحتی اور درد و غم سے سلامتی

سلامتی — ہر قسم کی جنگ و نزاع سے سلامتی

اس مفہوم کی بناء پر "تحیتھم" کی اضافت مفعول کی طرف ہے اور اس کا فاعل خدا تعالیٰ ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں مراد وہ تحیہ و سلام ہے جو مومنین ایک دوسرے سے کہیں گے یا فرشتے ان سے کہیں گے۔

بہرحال لفظ "سلام" یہ بطور مطلق آیا ہے، اس کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ جو ہر قسم کی سلامتی پر محیط ہے اور ہر قسم کی ناراحتی اور تکلیف سے سلامتی پر مشتمل ہے چاہے روحانی ہو یا جسمانی [1]

---

[1] سلام و تحیت کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ٢ سورہ نساء آیت ٨٦ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔

۲۴۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۙ﴿﴾

۲۵۔ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿﴾

۲۶۔ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِۨ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿﴾

۲۷۔ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ڐ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۧ﴿﴾

ترجمہ

۲۴۔ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ کس طرح اللہ نے کلمہ طیبہ (اور گفتار پاکیزہ) کو پاکیزہ درخت سے تشبیہ دی ہے کہ جس کی جڑ (زمین میں) ثابت ہے اور جس کی شاخ آسمان میں ہے۔

۲۵۔ وہ اپنے پروردگار کے اذن سے بروقت اپنے پھل دیتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے کہ شاید وہ نصیحت حاصل کریں۔

۲۶۔ اور (اسی طرح) کلمہ خبیثہ کو ناپاک درخت سے تشبیہ دی ہے کہ جو زمین سے اکھڑ چکا ہے اور اس کے لیے قرار و ثبات نہیں ہے۔

۲۷۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اللہ ان کی گفتار اور اعتقاد کے ثبات کی وجہ سے ثابت قدم رکھے گا، اس جہان میں بھی اور آخرت میں بھی۔ نیز اللہ ظالموں کو گمراہ کرتا ہے (اور ان سے اپنا لطف و کرم چھین لیتا ہے) اور خدا جو کام چاہے (اور قرین مصلحت سمجھے) انجام دیتا ہے۔

تفسیر

"شجرۂ طیبہ" اور "شجرہ خبیثہ"

یہاں حق و باطل، ایمان و کفر اور طیب و خبیث کو ایک نہایت عمیق اور پر معنی مثال کے ذریعے مجسم کرکے بیان کیا گیا ہے۔ یہ آیات اس سلسلے کی گزشتہ آیات کی بحث کو مکمل کرتی ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کیا تو نے دیکھا نہیں کہ خدا نے کس طرح پاکیزہ کلام کے لیے مثال دی ہے اور اسے طیب و پاکیزہ درخت سے تشبیہ دی ہے (الم تر کیف ضرب اللہ مثلاً کلمة طیبة کشجرة طیبة)۔

پھر اس شجرہ طیبہ یعنی پاکیزہ و بابرکت درخت کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور مختصر عبارت میں اس کے تمام پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم قرآن میں موجود اس شجرہ طیبہ کی خصوصیات کا مطالعہ کریں، ہمیں دیکھنا چاہیے کہ "کلمہ طیبہ" سے کیا مراد ہے۔

بعض مفسرین نے اس کو کلمۂ توحید اور جملہ "لا الٰہ الا اللہ" سے تفسیر کی ہے جب کہ بعض دوسرے اسے اوامر و فرامین الٰہی کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ بعض اسے ایمان سمجھتے ہیں کہ جو لا الٰہ الا اللہ کا معنی و مفہوم ہے۔ بعض دوسروں نے اس کی "مومن" سے تفسیر کی ہے اور بعض نے اس کا مفہوم اصلاحی و تربیتی روش اور لائحہ عمل بیان کیا ہے۔[1]

لیکن — "کلمہ طیبہ" کے مفہوم و معنی کی وسعت کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اس میں یہ تمام تفاسیر شامل ہیں کیونکہ لفظ "کلمہ" کے وسیع معنی میں تمام موجودات شامل ہیں۔ اسی بنا پر مخلوقات کو "کلمۃ اللہ" کہا جاتا ہے۔[2]

نیز "طیب" ہر قسم کی پاک و پاکیزہ چیز کو کہتے ہیں۔

نتیجۂ کلام یہ ہے کہ اس مثال کے مفہوم میں ہر پاک سنت، حکم، پروگرام، روش، عمل، انسان شامل ہے۔ مختصر یہ کہ ہر پاک و بابرکت موجود کلمہ طیبہ ہے اور یہ سب ایک پاکیزہ درخت کی طرح ہیں کہ جس کی یہ خصوصیات ہیں:

۱۔ وہ موجود کہ جو نشو و نما کا حامل ہے نہ کہ بے روح، جامد اور بے حرکت ہے۔ بڑھنے اور پھلنے پھولنے والا ہے۔ دوسروں کی اور اپنی پرورش و اصلاح کرنے والا ہے۔ لفظ "شجرہ" اس حقیقت کو بیان کرتا ہے۔

۲۔ یہ درخت پاک اور طیب ہے لیکن کس لحاظ سے، اس سلسلے میں کسی خاص پہلو کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ لہٰذا اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ ہر پہلو سے پاکیزہ ہے۔ اس کا پھل پاکیزہ ہے، اس کے شگوفے اور پھول پاکیزہ ہیں، اس کا سایہ پاکیزہ ہے اور اس سے خارج ہونے والی نسیم پاکیزہ ہے۔

---

[1] مجمع البیان، قرطبی، فی ظلال اور تفسیر کبیر از فخر رازی کی طرف رجوع کریں۔

[2] لفظ "کلمہ" اور اس کے مفہوم کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۳ میں سورہ انعام کی آیہ ۱۱۵ کے ذیل میں ہم بحث کر چکے ہیں دیکھئے۔

۳۔ یہ درخت ایک منظم نظام کا حامل ہے۔ اس کی جڑ اور اس کی شاخوں میں سے ہر ایک کی اپنی ذمہ داری ہے۔ اصولی طور پر اس میں جڑ اور شاخ کا وجود اس میں موجود منظم نظام کی دلیل ہے۔

۴۔ اس کی جڑ اور ریشہ ثابت و مستحکم ہے۔ اس طرح سے کہ طوفان اور تند و تیز آندھیاں اسے اس کی جگہ سے اکھاڑ نہیں سکتیں۔ اس میں ایسی توانائی ہے کہ اس کی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی شاخیں سورج کی کرنوں کے نیچے اور آزاد ہوا میں محفوظ ہیں کیونکہ جو شاخ جتنی اونچی ہو اسے اتنی ہی قوی تر جڑ کی ضرورت ہے (اصلها ثابت)۔

۵۔ اس شجرۂ طیبہ کی شاخیں کسی پست اور محدود ماحول میں نہیں ہیں بلکہ وہ آسمان کی بلندیوں میں ہیں۔ یہ شاخیں ہوا کا سینہ چیر کر بلندی پر جا پہنچی ہیں۔ جی ہاں "اس کی شاخیں آسمان میں ہیں" (و فرعها فی السماء)۔

واضح ہے کہ شاخیں جس قدر بلند ہوں گی، زمین کے گرد و غبار سے اتنی ہی دور ہوں گی اور ان کے پھل اتنے ہی زیادہ پاکیزہ ہوں گے اور ایسی شاخیں سورج کی کرنوں اور پاکیزہ ہوا سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گی اور ان کا اثر طیب پھلوں پر بہتر ہوگا [1]

۶۔ یہ شجرۂ طیبہ — پھلوں سے لدا ہوا ہے۔ یہ ان درختوں کی مانند نہیں کہ جو بے ثمر ہوتے ہیں۔ "یہ درخت اپنا پھل دیتا ہے" (تؤتی اکلها)۔

۷۔ اور یہ ایسا درخت ہے جو ایک یا دو فصلوں میں پھل نہیں دیتا بلکہ ہر موسم میں اس پر پھل لدے ہوتے ہیں تو جب بھی اس کی جانب ہاتھ بڑھائے محروم نہیں لوٹے گا (کل حین)۔

۸۔ اس کا یہ پھل کسی پروگرام کے بغیر نہیں بلکہ قوانین فطرت کے مطابق سنتِ الٰہی کے تحت اور "اپنے پروردگار کے اذن سے" ہے اور سب کے لیے عام ہے (باذن ربها)۔

اس "شجرۂ طیبہ" کی یہ خصوصیات آپ کے سامنے ہیں اب غور کیجئے کہ یہ برکات کس درخت کو حاصل ہیں۔ یقیناً یہ خوبیاں اور برکتیں کلمۂ طیبہ اور اس کے معنی میں موجود ہیں، ایک موحد اور صاحبِ معرفت انسان کو حاصل ہیں اور ایک اسلامی اور پاکیزہ لائحہ عمل میں موجود ہیں اور یہ سب مفاہیم محکم و ثابت جڑوں کے حامل ہیں، سب ہی ایسی فراواں شاخیں ہیں جو آسمان سے باتیں کرنے والی ہیں اور مادی آلودگیوں اور کثافتوں سے دور ہیں۔ سب ثمر آور، نور افشاں اور فیض بخش ہیں۔

جو شخص جس وقت بھی ان کے پاس آئے اور ہاتھ ان کے شاخسار وجود کی طرف پھیلائے ان کے لذیذ، معطر اور قوت بخش پھلوں سے اپنا دامنِ مراد بھر لے گا۔ حوادث کی تیز آندھیاں اور سخت طوفان انہیں ان کی جگہ سے ہٹا نہیں سکتے اور ان کا افقِ فکر چھوٹی سی دنیا میں محدود نہیں ہے وہ زمان و مکاں کے حجاب چاک کرکے ابدیت کی طرف آگے بڑھتے ہیں۔

ان کا پروگرام ہوا و ہوس کے تابع نہیں بلکہ سب کے سب اذنِ پروردگار سے اس کے فرمان کے مطابق آگے بڑھتے اور حرکت کرتے ہیں اور یہی ان کے ثمر بخش ہونے کا سرچشمہ ہے۔

---

[1] اسی تاثیر خصوصاً ایک درخت کے پھلوں پر خوب واضح ہے۔ وہ کہ جو درخت کی اوپر کی شاخوں پر لگتے ہیں نیچے کی شاخوں پر لگنے والے پھلوں کی نسبت تر اور خوب پکے ہوئے ہوتے ہیں اور زیادہ عمدہ ہوتے ہیں۔

پروردگار کے ان کلمات طیبہ ـــ عظیم و باایمان جوانمردوں ـــ کی زندگی برکت کا باعث ہے اور ان کی موت حرکت کا سبب ہے، ان کے آثار، ان کے کلمات، ان کی باتیں، ان کے شاگرد، ان کی کتابیں، ان کی پرافتخار تاریخ حتیٰ کہ ان کی خاموش قبریں سب کی سب الہام بخش سرچشمہ ہدایت، انسان ساز اور تربیت کنندہ ہیں۔

جی ہاں! "خدا اس طرح سے لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے کہ شاید وہ سمجھ جائیں" (ویضرب اللہ الامثال للناس لعلھم یتذکرون)۔

یہاں مفسرین کے درمیان ایک سوال پیدا ہوا اور وہ یہ کہ کیا کوئی درخت مذکورہ بالا صفات کا وجودِ خارجی رکھتا ہے کہ جس سے کلمہ طیبہ کو تشبیہ دی گئی ہے (ایسا درخت کہ جو سال بھر سرسبز ہے اور پھلوں سے لدا ہے)۔

بعض کا خیال ہے کہ ایسا درخت موجود ہے اور وہ کھجور کا درخت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مجبوراً "کل حین" کی تفسیر ماہ بیان کی ہے۔

لیکن کسی وجہ سے بھی ضروری نہیں کہ ہم اس قسم کے درخت کے وجود پر اصرار کریں بلکہ مختلف زبانوں میں ایسی بہت سی تشبیہیں موجود ہیں جو بالکل وجودِ خارجی نہیں رکھتیں مثلاً ہم کہتے ہیں کہ قرآن ایسے آفتاب کی مانند ہے جو کبھی غروب نہیں ہوتا (حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آفتاب ہمیشہ غروب کرتا ہے) یا کہا جاتا ہے کہ میرا ہجر ایسی رات کی طرح ہے جو ختم ہونے کو نہیں آتی (حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر شب ختم ہو جاتی ہے) بہرحال تشبیہ کا مقصد چونکہ حقائق کو مجسم کرنا ہے اور عقلی مسائل کو محسوس کے قالب میں ڈھالنا ہے لہٰذا ایسی تشبیہات میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ یہ پوری طرح دلنشیں، موثر اور جاذب ہیں۔

اس کے باوجود دنیا میں ایسے درخت موجود ہیں جن کی شاخوں پر سے سارا سال پھل ختم نہیں ہوتے یہاں تک کہ ہم نے خود گرم علاقوں میں بعض ایسے درخت دیکھے ہیں کہ ان پر پھل بھی موجود تھا اور تازہ پھول بھی اگے ہوئے تھے اور نئے پھل کے آثار بھی موجود تھے جب کہ موسم سردیوں کا تھا۔

مسائل سمجھنے اور افہام و تفہیم کا بہترین طریقہ چونکہ موازنہ کرنا ہے لہٰذا شجرہ طیبہ کے ذکر کے بعد بلا فاصلہ اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے: رہی مثال کلمہ خبیثہ کی، تو وہ خبیث، ناپاک اور بے ریشہ درخت کی مانند ہے کہ جو زمین سے اکھڑ چکا ہے اور طوفان آتے ہیں تو روزانہ کبھی ادھر کبھی ادھر لے جاتے ہیں اور کوئے میں پڑا رہتا ہے اور اسے قرار و ثبات میسر نہیں (ومثل کلمۃ خبیثۃ کشجرۃ خبیثۃ اجتثت من فوق الارض مالھا من قرار)۔

"کلمہ خبیثہ" وہی کفر و شرک کا کلمہ ہے، گھٹیا، قبیح اور بری گفتار ہے، گمراہ کن اور غلط پروگرام ہے اور ناپاک و آلودہ انسان ہیں خلاصہ یہ کہ ہر خبیث اور ناپاک چیز کلمہ خبیثہ ہے۔

واضح ہے کہ بیکار اور قبیح و منحوس درخت کہ جس کی جڑیں اکھڑ گئی ہوں اس میں نہ نشوونما ہوگی، نہ ترقی و تکامل، نہ پھل پھول، نہ سایہ و منظر اور نہ ثبات و قرار۔ وہ تو ایک لکڑی ہے جو سوائے جلانے اور آگ لگانے کے کسی کام کی نہیں بلکہ راستے کی رکاوٹ ہے ایسا درخت کبھی گزند پہنچاتا اور مجروح کرتا ہے یا لوگوں کے لیے تکلیف و آزار کا باعث بنتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ شجرہ طیبہ کی تعریف میں قرآن تفصیل سے بات کرتا ہے لیکن جب شجرہ خبیثہ کے ذکر کا موقع آتا ہے تو ایک

مختصر سا جملہ کہہ کر گزر جاتا ہے۔ صرف اتنا کہتا ہے۔

اجتثت من فوق الارض مالها من قرار

یہ زمین سے اکھڑا ہوا ہے اور اسے ثبات و قرار نہیں ہے۔

کیونکہ جس وقت یہ ثابت ہوگیا کہ یہ درخت جڑ کے بغیر ہے تو پھر شاخ و برگ اور پھل پھول کے ذکر کی ضرورت نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں یہ ایک طرح کی لطافتِ بیان ہے کہ انسان محبوب کا ذکر کرتا ہے تو اس کی تمام خصوصیات بیان کرتا ہے لیکن جب "مبغوض" کے ذکر کا موقع آتا ہے تو بس ایک نفرت انگیز جملہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

یہاں پھر ہم دیکھتے ہیں کہ مفسرین اس درخت کے متعلق کہ جو مشبہ بہ کے طور پر آیا ہے کے بارے میں سوال اٹھاتے ہیں کہ یہ کونسا درخت ہے۔ بعض نے اسے حنظل سمجھا ہے کہ جس کا پھل بہت تلخ اور برا ہوتا ہے

بعض نے اسے "کشوث" (بر وزن سقوط) کہا ہے۔ یہ ایک پیچیدہ سا پودا ہے، جو بیابانوں میں خاردار بوٹوں سے لپٹ کر اوپر چلا جاتا ہے۔ نہ اس کی جڑ ہوتی ہے نہ پتے (توجہ رہے کہ "شجر" لغت میں درخت کو بھی کہا جاتا ہے اور پودے کو بھی)۔

لیکن جیسا کہ ہم نے "شجرہ طیبہ" کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر تشبیہ میں "مشبہ بہ" ان تمام صفات کے ساتھ وجودِ خارجی رکھتا ہو بلکہ یہاں مقصد کلمۂ شرک، انحرافی طرزِ عمل اور خبیث لوگوں کے حقیقی چہرہ کو مجسم طور پر پیش کرنا ہے اور بتانا ہے کہ وہ ان درختوں کی طرح ہیں جن کی ہر چیز خبیث اور ناپاک ہے اور ان کا ثمر سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ راستے میں مزاحم ہوتے ہیں اور دردِ سر کا باعث بنتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے ناپاک درخت کم نہیں کہ جو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گئے ہوں اور بیابان میں طوفان اور تیز آندھی کی زد پر ہوں۔

مذکورہ بالا آیات میں دو ناطق مثالوں کے ذریعے ایمان و کفر، مومن و کافر اور کلی طور پر ہر پاک و ناپاک وجود کو مجسم شکل میں ذکر کیا گیا ہے لہٰذا آخری زیرِ نظر آیت میں نتیجہ کا اور ان کا انجام آخر ذکر کیا گیا ہے

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ایمان لانے والوں کو خدا ان کی ثابت و پائیدار گفتار و اعتقاد کے سبب ثابت قدم رکھتا ہے، اس جہان میں بھی اور اس جہان میں بھی (یثبت الله الذین امنوا بالقول الثابت فی الحیوة الدنیا و فی الاخرة)۔ کیونکہ ان کا ایمان سطحی اور متزلزل نہیں ہوتا نہ ان کی شخصیت کمزور اور متلون ہوتی ہے بلکہ وہ ایک شجرہ طیبہ ہیں کہ جس کی جڑیں ثابت و پائیدار ہیں اور جس کی شاخیں آسمان کی طرح بلند ہیں اور چونکہ کوئی شخص لطفِ خدا سے بے نیاز نہیں، دوسرے لفظوں میں ہر نعمت بالآخر اس کی ذاتِ پاک کی طرف لوٹتی ہے لہٰذا ایسے ثابت قدم مومنین لطفِ خدا کے بھروسہ پر ہر حادثے کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح استقامت دکھاتے ہیں۔ لغزش کہ جس سے زندگی میں بچا نہیں جا سکتا ان کے راستے میں آتی ہے تو خدا ان کی حفاظت کرتا ہے۔ شیاطین ہر طرف سے انہیں وسوسہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس دنیا کی زرق برق چیزوں کے ذریعے انہیں پھسلانے کی سعی کرتے ہیں مگر ان کا خدا انہیں محفوظ رکھتا ہے۔ جہنمی طاقتیں اور سنگدل ظالم انہیں طرح طرح کی دھمکیوں کے ذریعے جھکانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ انہیں ثباتِ قدم عطا کرتا ہے کیونکہ ان کی جڑ اور بنیاد ثابت و مستحکم ہوتی ہے۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ یہ خدائی حفاظت و ثبات ان کی ساری زندگی پر محیط ہے۔ اس جہان کی زندگی پر بھی اور اس جہان کی زندگی پر بھی۔ یہاں وہ ایمان و پاکیزگی پر باقی رہتے ہیں اور ان کا دامن آلودگیوں کے عار و ننگ سے پاک ہوتا ہے اور وہاں وہ خدا تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں

میں ہمیشہ رہیں گے۔

پھر ان کے مقابل افراد کے بارے میں فرمایا گیا ہے: اور خدا ظالموں کو گمراہ کرتا ہے اور اللہ جو کچھ چاہتا ہے انجام دیتا ہے (ویضل اللہ الظالمین ویفعل اللہ ما یشاء)۔

ہم نے بارہا کہا ہے کہ جہاں جہاں بھی ہدایت و ضلالت کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے اس کے لیے پہلے انسان خود قدم اٹھاتا ہے خدا کا کام تو تاثیر پیدا کرنا ہے جو اس نے ہر عمل میں کی ہے نیز خدا کا کام نعمتیں عطا کرنا اور انہیں سلب کرنا ہے اور ایسا وہ اہلیت اور عدم اہلیت کی بنا پر کرتا ہے (غور کیجئے گا)۔

یضل اللہ" کے بعد "ظالمین" کی تعبیر اس امر کے لیے بہترین قرینہ ہے یعنی جب تک کوئی شخص ظلم و ستم سے آلودہ نہ ہو اس سے نعمت ہدایت سلب نہیں ہوگی لیکن جب کوئی ظلم و ستم سے آلودہ ہو جاتا ہے تو گناہ کی تاریکی اس کے وجود پر چھا جاتی ہے اور ہدایت الٰہی کا نور اس کے دل سے نکل جاتا ہے اور یہ بالکل ارادہ و اختیار کی آزادی ہے۔ ایسا شخص اگر فوری طور پر اپنی سمت درست کرلے تو نجات کا راستہ اس کے سامنے کھلا ہوا ہے لیکن گناہ میں مستحکم ہو جانے کے بعد پلٹنا بہت ہی مشکل ہے

چند اہم نکات

۱۔ کیا آخرت سے مراد قبر ہے؟ بہت سی روایات میں ہے کہ جب انسان قبر میں پہنچتا ہے اور فرشتے اس سے اس کی حقیقت کے متعلق سوال کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے ایمان کے راستے پر ثابت قدم رکھتا ہے اور اس کا یہی معنی ہے:

یثبت اللہ الذین اٰمنوا بالقول الثابت فی الحیٰوۃ الدنیا و فی الاٰخرۃ

ان میں سے بعض روایات میں صراحت کے ساتھ لفظ "قبر" آیا ہے جب کہ بعض دوسری روایات میں ہے کہ شیطان موت کے وقت صاحب ایمان کے پاس آتا ہے اور کبھی داہنی طرف سے اور کبھی بائیں طرف سے اسے گمراہ کرنے کے لیے وسوسہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے لیکن خدا اسے اجازت نہیں دیتا کہ وہ مومن کو گمراہ کرے "یثبت اللہ الذین اٰمنوا ......" کا یہی مفہوم ہے۔

امام صادق علیہ السلام کی ایک روایت کا بھی یہی مفہوم ہے:

ان الشیطان لیاتی الرجل من اولیاءنا عند موتہ عن یمینہ و عن شمالہ لیضلہ عما ھو علیہ فیابی اللہ عزوجل لہ ذلک فذلک قول اللہ عزوجل یثبت اللہ الذین اٰمنوا بالقول الثابت فی الحیٰوۃ الدنیا و فی الاٰخرۃ[1]

مفسر عظیم طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے کہ اکثر مفسرین نے اس تفسیر کو قبول کیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ دار آخرت خلوص کی جگہ ہے اور نہ عمل کی بلکہ صرف نتائج اعمال کا سامنا کرنے کا مقام ہے۔ لیکن وہ لمحہ کہ جب موت آ پہنچے اور حتیٰ کہ عالم برزخ (وہ جہان کہ جو اس عالم اور عالم آخرت کے درمیان ہے) میں تھوڑا بہت لغزش کا امکان ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں لطف الٰہی انسان کی مدد کو پہنچتا ہے، اس کی

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۵۴۰ و ۵۴۱۔

حفاظت کرتا ہے اور اسے ثابت قدم رکھتا ہے۔

۲۔ **ثبات و استقامت کا اثر:** شجرۂ طیبہ اور شجرۂ خبیثہ کی تمام صفات میں سے کہ جو مندرجہ بالا آیات میں ذکر ہوئی ہیں سب سے زیادہ ثبات و عدم ثبات کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یہاں تک کہ شجرۂ طیبہ کے ثمرکے طور پر آخری زیر بحث آیت میں فرمایا گیا ہے کہ خدا صاحب ایمان افراد کو اپنے ثابت و مستحکم عقیدے کی بناء پر دنیا و آخرت میں ثابت قدم رکھتا ہے۔ اس سے ثبات اور اس کی تاثیر کے مسئلے کی انتہائی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

عظیم لوگوں کی کامیابی کے عوامل کے بارے میں بہت گفتگو ہوئی ہے لیکن ان تمام میں سے استقامت و پامردی کا درجہ پہلا ہے۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو سمجھ بوجھ اور استعداد کے لحاظ سے درمیانے درجے کے ہوتے ہیں یا عمل میں پیش قدمی کے لحاظ سے اوسط درجے کے ہوتے ہیں لیکن انہیں زندگی میں بڑی بڑی کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں۔ ان کے بارے میں تحقیق و مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان کی کامیابیوں کی وجہ ثبات و استقامت کے سوا اور کچھ نہیں۔

اجتماعی لحاظ سے ہر مؤثر پروگرام کی پیش رفت صرف ثبات و استقامت کے سائے میں ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخریب کاروں کی تمام کوشش ثبات و استقامت کو ختم کرنے پر صرف ہوتی ہے۔ اصولی طور پر حقیقی مؤمنین کو زندگی کے سخت حوادث اور طوفانوں کے مقابلے میں ان کے ثبات و استقامت کے حوالے سے پہچاننا چاہیے۔

۳۔ **روایاتِ اسلامی میں شجرۂ طیبہ اور شجرۂ خبیثہ:** جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ "طیبہ" اور "خبیثہ" کہ جنہیں دو درختوں سے تشبیہ دی گئی ہے ایک وسیع مفہوم رکھتے ہیں اور یہ ہر طرح کے شخص، پروگرام، مکتب، طرزِ فکر، سوچ بچار اور گفتار و عمل پر محیط ہے لیکن بعض اسلامی روایات میں ان کی خاص حوالوں سے تفسیر کی گئی ہے۔ واضح ہے کہ مفہوم آیت ان میں منحصر نہیں ہے۔

ان میں سے ایک روایت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے آپ "اصلها ثابت و فرعها فی السماء" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

رسول الله اصلها و امیر المؤمنین فرعها،
والائمة من ذریتهما اغصانها، وعلم الائمة ثمرها، و شیعتهم
المؤمنون ورقها، هل فیها فضل؟
قال: قلت لا و الله،
قال و الله ان المؤمن لیولد فتورق ورقة فیها و ان المؤمن لیموت فتسقط
ورقة منها.

رسول اللہ اس درخت کی جڑ ہیں، امیر المؤمنین علی اس کا تنا ہیں اور وہ امام جو ان دونوں کی ذریت میں سے ہیں اس کی ٹہنیاں ہیں، ائمہ کا علم اس درخت کا پھل ہے اور ان کے صاحبِ ایمان شیعہ اس کے پتے ہیں۔

پھر امام نے فرمایا: کیا کوئی اور چیز باقی رہ جاتی ہے؟

راوی کہتا ہے: میں نے کہا نہیں، خدا کی قسم۔

فرمایا: واللہ جس وقت ایک صاحبِ ایمان پیدا ہوتا ہے تو اس درخت پر ایک پتے کا اضافہ ہو جاتا ہے اور جس وقت کوئی حقیقی مومن مر جاتا ہے تو اس درخت کا ایک پتہ گر جاتا ہے[1]

ایک اور روایت میں یہی مضمون امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔ اس میں ہے:

راوی نے سوال کیا "تؤتی اکلھا کل حین باذن ربھا" کا کیا مفہوم ہے۔

امام نے فرمایا: ائمہ کے علم کی طرف اشارہ ہے کہ جو ہر سال اور ہر علاقے میں تم تک آپہنچتا ہے[2]

ایک اور روایت میں ہے:

"شجرۂ طیبہ" رسول اللہ، علی، فاطمہ، حسن اور حسین اور ان کے فرزندانِ گرامی ہیں اور "شجرۂ خبیثہ" بنی امیہ ہیں[3]

نیز بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ "شجرۂ طیبہ" کھجور کا درخت ہے اور "شجرۂ خبیثہ" حنظل (تمہ) کا درخت ہے[4]

بہرحال ان تفاسیر میں کوئی باہمی تضاد نہیں ہے۔ جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اور جو کچھ ہم نے آیہ کے عمومی معنی میں ذکر کیا ہے اس میں ہم آہنگی موجود ہے کیونکہ یہ تو اس عمومی مفہوم کے مصادیق میں سے ہیں

---

[1] نور الثقلین، جلد ۲ صفحہ ۵۳۵۔

[2] و [3] نور الثقلین، جلد ۲ صفحہ ۵۳۵ و صفحہ ۵۳۸۔

[4] المیزان، زیر بحث آیت کے ذیل میں، بحوالہ تفسیر در منثور۔

۲۸۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۙ

۲۹۔ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۭ وَبِئْسَ الْقَرَارُ

۳۰۔ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ

ترجمہ

۲۸۔ کیا تو نے (انہیں) نہیں دیکھا جنہوں نے خدا کی نعمت کو ناشکری میں بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گڑھے کی طرف کھینچ لے گئے۔

۲۹۔ (دارالبوار وہی) جہنم ہے کہ جس کی آگ میں وہ داخل ہوں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

۳۰۔ انہوں نے خدا کے ہمسر قرار دیئے تاکہ (لوگوں کو) اس کی راہ سے (منحرف اور) گمراہ کریں۔ ان سے کہہ دو (کہ چند دن) دنیا کی زندگی (اور اس کی لذتوں سے) فائدہ اٹھا لو مگر بالآخر تمہیں (جہنم کی) آگ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

تفسیر

کفرانِ نعمت کا انجام

ان آیات میں روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے۔ دراصل ان میں شجرۂ خبیثہ کے ایک نمونے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے نعمتِ خدا کو کفران میں تبدیل کر دیا ہے (الم تر الی الذین بدلوا نعمة الله کفرا) اور بالآخر انہوں نے اپنی قوم کو دارالبوار اور ہلاکت کے گڑھے کی طرف دھکیل دیا (واحلوا قومهم دار البوار)۔

یہ وہی شجرۂ خبیثہ کی جڑیں اور کفر و انحراف کے رہبر ہیں جن کے دامن میں نحستیں تھیں مثلاً وجودِ پیغمبرؐ کی سی نعمت کہ جس سے بڑھ کر کوئی نعمت

رہتی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ ان سے استفادہ کرتے اور شب بھر میں سو سال کی مسافت طے کر لیتے لیکن اندھے تعصب، ہٹ دھرمی، خودغرضی اور خود پسندی کے سبب وہ اس عظیم ترین نعمت سے استفادہ نہ کر سکے۔ وہ نہ فقط خود کفرانِ نعمت کے مرتکب ہوئے بلکہ اپنی قوم کو بھی وسوسہ میں مبتلا کیا اور ہلاکت و بدبختی کی انہیں سوغات دی۔

بزرگ مفسرین نے منابعِ اسلامی میں آنے والی روایات کے پیشِ نظر کبھی اس نعمت کو وجودِ پیغمبر کہا ہے، کبھی آئمہ اہلِ بیتؑ اور کفرانِ نعمت کرنے والے کبھی بنو امیہ قرار دیئے ہیں کبھی بنی مغیرہ اور کبھی زمانۂ پیغمبرؐ کے سب کفار لیکن آیت کا مفہوم یقیناً وسیع ہے اور یہ کسی معین گروہ کے لیے مختص نہیں ہے اور اس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو خدا کی کسی نعمت کا کفران کریں۔

ضمناً مندرجہ بالا آیت سے یہ حقیقت بھی ثابت ہوتی ہے کہ خدائی نعمتوں خصوصاً عظیم ہادیوں کی رہبری کی نعمت کہ جو اہم ترین نعمتوں میں سے ہے سے استفادہ کرنا خود انسان کے فائدے میں ہے۔ اب ان نعمتوں کا کفران اور الٰہی رہبری سے منہ پھیرنا سوائے ہلاکت اور دار البوار میں گرنے کے اور کچھ نہیں ہے۔

اس کے بعد قرآن "دار البوار" کی تفسیر کرتا ہے: یہ جہنم ہے کہ وہ جس کے جلا ڈالنے والے شعلوں میں جا گریں گے اور یہ بدترین ٹھکانا ہے (جھنم یصلونھا و بئس القرار)۔[1]

اگلی آیت میں کفرانِ نعمت کی ایک بدترین قسم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کہ جس کے وہ مرتکب ہوتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: انہوں نے خدا کے لیے شریک قرار دیئے تاکہ اس طریقے سے لوگوں کو اس کی راہ سے گمراہ کریں (وجعلوا للّٰہ انداداً لیضلوا عن سبیلہ)۔

شرک و کفر اختیار کرکے اور لوگوں کو دینِ و طریقِ حق سے منحرف کرکے وہ لوگوں پر چند روزہ مادی اقتدار حاصل کرتے ہیں۔

اے رسولؐ! ان سے کہو اس ناپائیدار اور بے وقعت مادی زندگی سے فائدہ اٹھا لو لیکن یہ جان لو کہ تمہارا انجام کار آگ ہے (قل تمتعوا فان مصیرکم الی النار)۔

"تمہاری یہ زندگی کوئی زندگی ہے بلکہ بدبختی ہے اور نہ تمہارا یہ اقتدار کوئی حیثیت رکھتا ہے بلکہ تباہ کاری اور مصیبت ہے لیکن اس کے باوجود اپنے انجام کے بدلے تم اس سے فائدہ اٹھا لو۔

ایک اور آیت میں فرمایا گیا ہے:

قل تمتع بکفرک قلیلاً انک من اصحاب النار

کہہ دو اپنے کفر سے تھوڑا سا فائدہ اٹھا لے آخرکار تو اصحابِ نار میں سے ہے۔ (زمر۔ ۸)

چند اہم نکات

۱۔ **نعمت کو کفر میں بدل دیا:** عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے نعمتِ الٰہی کا کفران کیا لیکن زیرِ بحث آیت میں ہے انہوں نے نعمتِ خدا کو کفر میں تبدیل کیا اور کفران کیا۔ ہو سکتا ہے یہ خاص تعبیر دو میں ایک وجہ کی بنا پر ہو:

---

[1] "یصلون" "صلی" کے مادہ سے آگ جلانے، آگ میں جلنے، آگ میں مبتلا ہونے اور آگ میں جل کر کباب ہونے کے معنی میں ہے۔

الف مراد ہے "شکرِ نعمت" کو "کفران" میں تبدیل کرنا یعنی ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ پروردگار کی نعمتوں پر شکر گزار ہوں لیکن انہوں نے اس شکر کو کفران میں تبدیل کر دیا۔ حقیقت میں لفظ شکر مقدر ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا،

الذین بدلوا شکر نعمة الله کفرًا

ب مراد یہ ہے کہ انہوں نے خود نعمت کو کفر میں تبدیل کر دیا۔ در حقیقت خدائی نعمتیں وسیلہ ہیں۔ ان سے استفادہ کا طریقہ خود انسان کے ارادہ سے وابستہ ہے۔ جیسا کہ ممکن ہے نعمتوں سے ایمان، خوش بختی اور نیکی کی راہ میں فائدہ اٹھایا جائے اسی طرح انہیں کفر، ظلم اور برائی میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے یہ نعمتیں خام مال کی طرح ہیں جن سے مختلف قسم کی چیزیں تیار کی جا سکتی ہیں اگرچہ اصل میں یہ خیر و سعادت کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔

۲۔ **نعمت سے سوئے استفادہ کفرانِ نعمت ہے:** کفرانِ نعمت صرف یہ نہیں کہ انسان خدا کی ناشکری کرے بلکہ نعمت سے ہر طرح کا انحرافی فائدہ حاصل کرنا اور سوئے استفادہ کفرانِ نعمت ہے۔ اصولی طور پر کفرانِ نعمت کی حقیقت تو یہی ہے۔ ناشکری اور شکر ادا کرنا تو دوسرے مرحلے کی بات ہے۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ نعمت کو اس مقصد کے مطابق صرف نہ کرنا جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے کفرانِ نعمت ہے اور زبانی شکر گزاری ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر آپ ہزار مرتبہ زبان سے "الحمد للہ" کہیں لیکن عملی طور پر نعمت سے سوءِ استفادہ کریں تو کفرانِ نعمت اور کیا ہے۔

دورِ حاضر میں نعمت کو کفران میں تبدیل کرنے کے انتہائی واضح نمونے دکھائی دیتے ہیں۔

فطرت کی بہت سی قوتیں انسان کی خداداد بصیرت اور پیش قدمی کی وجہ سے انسان کے ہاتھ لگی ہیں اور ان سے فائدہ حاصل کرنا اب انسان کی دسترس میں ہے۔

سائنسی انکشافات اور صنعتی ایجادات نے پوری دنیا کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ ان انکشافات و ایجادات نے انسان کے کندھوں سے بہت بھاری بوجھ اتار کر کارخانوں کے پہیوں پر ڈال دیا ہے۔ آج نعماتِ الٰہی ہر دور سے زیادہ ہیں۔ آج انسان اپنے افکار اور علم کو پوری دنیا میں پھیلا سکتا ہے۔ ساری دنیا کی خبروں سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ اس دور میں لوگ ہر زمانے سے زیادہ خوشحال ہوتے، مادی لحاظ سے بھی اور روحانی لحاظ سے بھی۔

آج خدا کی ان عظیم نعمتوں کو کفر میں تبدیل کرنے کا راستہ اپنایا گیا ہے۔ مادے کی عجیب و غریب توانائیوں کو ظلم و طغیان کی راہ میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ انکشافات و ایجادات کو برائی اور تخریبی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہر نیا صنعتی شاہکار پہلے تخریبی مقاصد کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کے تعمیری پہلو کی نوبت بعد کی بات ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ عظیم ناشکری ہے کہ انبیاء الٰہی کی اصلاحی اور تربیتی تعلیمات سے دور رہنے کا نتیجہ ہے اور ایسے لیڈر اپنی قوم کو نعماتِ الٰہی کا کفران کر کے اسے دارالبوار کی طرف کھینچے لے جا رہے ہیں۔

۳۔ **"انداد" کا مفہوم:** "انداد" جمع ہے "ندّ" کی۔ اس کا معنی ہے "مثل"، لیکن جیسا کہ راغب نے مفردات میں اور زبیدی نے تاج العروس میں (بعض اہلِ لغت سے) نقل کیا ہے "ندّ" اس چیز کو کہا جاتا ہے جو دوسری چیز سے شباہت جوہری رکھتی ہو لیکن "مثل" کا اطلاق ہر قسم کی شباہت پر ہوتا ہے۔ لہٰذا "ندّ" کا استعمال "مثل" کی نسبت زیادہ عمیق، رسا اور محدود ہے۔

اس معنی کے مطابق زیرِ نظر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ کفر کی کوشش تھی کہ خدا کے کچھ ایسے شریک بنائیں کہ جنہیں جو ہر صفات میں خدا کا شبیہ قرار دیں تاکہ مخلوق کو خدا کی پرستش سے روک سکیں اور اس طرح اپنے منحوس مقاصد پورے کر سکیں۔

بعض اوقات وہ قربانیوں کا کچھ حصہ ان کے لیے قرار دیتے اور کبھی نعمات الٰہی کا کچھ حصہ (جیسے بعض جانور) بتوں کے لیے مخصوص کر دیتے اور کبھی پرستش و عبادت کے ذریعے انہیں خدا کا ہم پلہ خیال کرتے۔ سب سے بڑھ کر وقیح و قبیح یہ بات تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں مراسم حج میں کہ جو دینِ ابراہیمی کے مطابق تھا اس میں انہوں نے بہت سی خرافات شامل کر دی تھیں یہاں تک کہ لبیک کہتے ہوئے یوں کہتے تھے:

لبیك لاشريك لك،

الاشريك هو لك،

تملكه وما ملك.

میں تیری دعوت کو قبول کرتا ہوں، اے خدا کہ جس کا کوئی شریک نہیں۔

سوائے اس شریک کے کہ جو تیرا شریک ہے۔

اس کا بھی تو مالک ہے اور جس کا وہ مالک ہے اس کا بھی[1]

[1] تفسیر فخر الدین رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۳۱۔ قُلْ لِّعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ یُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَ لَا خِلٰلٌ ○

۳۲۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ○

۳۳۔ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ ○

۳۴۔ وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ○

ترجمہ

۳۱۔ میرے ان بندوں سے کہہ دو کہ جو ایمان لائے ہیں کہ نماز قائم کریں اور ہم نے جو انہیں روزی دی ہے اس میں سے پنہاں و آشکار انفاق کریں، اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے کہ جس میں خرید و فروخت ہے نہ دوستی (نہ مال کے ذریعے عذابِ خدا سے نجات مل سکے گی اور نہ کسی اور مادی رشتے سے)۔

۳۲۔ اللہ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور آسمان سے پانی نازل کیا ہے اس کے ذریعے تمہارے رزق کے طور پر پھل اگائے ہیں اور کشتی کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ وہ اس کے حکم سے سمندر پر چلے اور نہریں بھی تمہارے لیے مسخر کی ہیں۔

۳۳۔ منظم پروگرام کے ماتحت کام کرنے والے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے اور رات اور دن کو (بھی) تمہارے لیے مسخر کیا ہے۔

۳۴۔ اور تم نے جس چیز کا اس سے تقاضا کیا تھا وہ اس نے تمہیں دے دی اور نعمات الٰہی کا شمار کرنے لگو تو ہرگز شمار نہیں کر سکو گے انسان ستمگر اور کفران کرنے والا ہے۔

تفسیر

قرآن کی نگاہ میں انسان کی عظمت

گزشتہ آیات میں مشرکین اور ان لوگوں کے طرز عمل کے بارے میں گفتگو تھی کہ جنہوں نے نعمات الٰہی کا کفران کیا اور آخر کار دارالبوار کی طرف کھینچے گئے۔ زیر نظر آیات میں خدا کے سچے بندوں کا ذکر ہے اور اللہ کی بندوں پر نازل ہونے والی غیر متناہی نعمات کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے، میرے ان بندوں کو جو ایمان لائے ہیں کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور ہم نے انہیں جو رزق دیا ہے اس میں سے پنہاں و آشکار خرچ کریں (قل لعبادی الذین اٰمنوا یقیموا الصلوٰۃ وینفقوا مما رزقنٰھم سرًا و علانیۃ) اس سے پہلے کہ وہ دن آ جائے کہ جس میں نہ خرید و فروخت ہے کہ اس طرح عذاب سے نجات کے لیے راہ سعادت خرید سکیں اور نہ وہاں کسی کی دوستی کام آئے گی (من قبل ان یأتی یوم لا بیع فیہ ولا خلٰل)۔

اس کے بعد معرفت خدا کے لیے اس کی نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے ایسی معرفت کہ جس سے دلوں میں اس کا عشق زندہ ہو جائے نیز انسان کو اس کی عظمت اور اس کے لطف کے حوالے سے اس کی تعظیم پر ابھارا گیا ہے۔ کیونکہ یہ ایک فطری امر ہے کہ مدد اور لطف و رحمت کرنے والے سے انسان کے دل میں لگاؤ اور محبت پیدا ہوتی ہے۔ یہی بات چند ایک آیات میں یہاں اس طرح بیان کی گئی ہے۔

خدا وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے (اللہ الذی خلق السمٰوٰت والارض) اور اس نے آسمان سے پانی نازل کیا جس کے ذریعے تمہاری روزی کے لیے مختلف ثمرات پیدا ہوتے ہیں (وانزل من السماء ماءً فاخرج بہ من الثمرات رزقًا لکم)۔

• اور اس نے تمہارے لیے کشتی کو مسخر کیا، اس کی ساخت کے مواد کے لحاظ سے بھی کہ جسے طبیعت مادہ سے پیدا کیا اور سمندروں پر منظم ہواؤں کی صورت میں اس کی قوت محرکہ کے لحاظ سے بھی (وسخر لکم الفلک) تاکہ یہ کشتیاں اس کے حکم سے سطح سمندر پر چلیں اور پانی کا سینہ چیر کر ساحل مقصود کی طرف بڑھیں اور انسانوں اور ان کے وسائل ایک سے دوسری جگہ کی طرف آسانی سے اٹھائے جائیں (لتجری فی البحر بامرہ)۔

اسی طرح نہریں بھی تمہارے لیے مسخر کر دی گئیں (وسخر لکم الانھٰر)۔ تاکہ ان کے حیات بخش پانی سے تم اپنی فصلوں کی

آبیاری کرو اور تم خود اور تمہارے مویشی اس سے سیراب ہوں۔ نیز اکثر اوقات کے لیے سطح آب کو ہموار رکھا گیا ہے تاکہ چھوٹی بڑی کشتیاں اس میں آمدو رفت کر سکیں۔ نیز یہ نہریں مسخر کی گئی ہیں تاکہ تم ان کی مچھلیوں بلکہ یہاں تک کہ ان کی گہرائیوں میں موجود اصداف سے استفادہ کر سکو۔

نہ صرف زمینی موجودات کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے بلکہ سورج اور چاند کو جو ہمیشہ مصروفِ کار ہیں انہیں تمہارے فرمان کے زیرِ گردش قرار دے دیا ہے (وسخر لکم الشمس والقمر دائبین[1])۔

نہ صرف اس جہان کے موجودات کو تمہارے زیرِ فرمان کر دیا گیا ہے بلکہ اُن کے عارضی حالات کو بھی تمہارے لیے مسخر کر دیا گیا ہے جیسا کہ "رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کیا گیا ہے" (وسخر لکم اللیل والنھار)۔

اور تم نے جس چیز کا اُس سے تقاضا کیا اور فرد اور معاشرے کی روح اور بدن کے لیے تمہیں جس چیز کی احتیاج ہوئی یا اپنی سعادت کے لیے تمہیں جس چیز کی ضرورت پڑی وہ سب کچھ اس نے تمہارے اختیار میں دے دیا (واٰتاکم من کل ما سألتموہ)۔

اور اس طرح سے "اگر تم خدائی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو شمار نہ کر سکو گے" (وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا)۔ کیونکہ پروردگار کی مادی و روحانی نعمتوں نے تمہارے وجود اور محیطِ زندگی کو اس طرح سے گھیر رکھا ہے کہ ان کا شمار ممکن نہیں اور جن خدائی نعمتوں کو تم جانتے ہو وہ ان کے مقابلے میں جنہیں تم نہیں جانتے دریا کے مقابلے میں قطرے کی مانند ہیں لیکن خدا کے اس تمام لطف و رحمت کے باوجود یہ انسان ظالم ہے اور کفرانِ نعمت کرنے والا ہے (ان الانسان لظلوم کفار)۔

انسان کو ایسی نعمتیں عطا کی گئی ہیں کہ اگر وہ ان سے صحیح طریقے سے استفادہ کرتا تو سارے جہاں کو گلستان بنا دیتا اور "مدینہ فاضلہ" کی تشکیل کا خواب پورا ہو جاتا لیکن سوئے استفادہ، ظلم و ستم اور کفرانِ نعمت کے سبب وہ اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ اس کی زندگی کا افق تاریک ہو گیا، شہدِ حیات اس کے دہن میں جاں گداز زہر بن چکا ہے اور طاقت فرسا مشکلات نے طوق و زنجیر بن کے اُسے جکڑ رکھا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **خالق اور مخلوق سے رشتہ:** ان آیات میں ایک مرتبہ پھر سے مومنین کے لائحہ عمل میں سے نماز اور انفاق کا ذکر کیا گیا ہے ہو سکتا ہے ابتدائی نظر سے سوال پیدا ہو کہ اسلام کے تمام عملی پروگراموں میں سے یہاں صرف دو کا تذکرہ کیوں کیا گیا ہے۔

اس کی علت یہ ہے کہ اسلام کی مختلف جہتیں ہیں۔ ان کا خلاصہ تین میں پیش کیا جا سکتا ہے:

(۱) انسان کا خدا سے رابطہ۔

(۲) انسان کا مخلوقِ خدا سے رابطہ۔

(۳) انسان کا اپنی ذات سے رابطہ۔

---

[1] "دائبین" "دؤب" کے مادہ سے ایک عادت کے مطابق یا حکم سنت کے مطابق کام جاری رکھنے کے معنی میں ہے۔ سورج اور چاند چونکہ لاکھوں سال سے ایک معین و مستحکم طریقے سے نور افشانی کرنے، زندہ موجودات کی پرورش کرنے، سمندروں میں مدوجزر پیدا کرنے اور کئی دوسری خدمات میں مصروف ہیں لہٰذا ان کے لیے "دائبین" سے بہتر تعبیر کا تصور نہیں ہو سکتا۔

درحقیقت تیسرا حصہ پہلے اور دوسرے حصے کا نتیجہ ہے۔ مذکورہ دو پروگرام (نماز اور انفاق) دراصل انہی دو حصوں میں سے ایک ایک کی طرف اشارہ ہیں۔

نماز اللہ سے ہر قسم کے رابطے کا مظہر ہے کیونکہ نماز کے دوران یہ رابطہ ہر دوسرے عمل کی نسبت زیادہ واضح ہوتا ہے۔ جب کہ انفاق خلق خدا سے رشتے کی طرف اشارہ ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر نعمتِ رزق میں سے انفاق کا وسیع مفہوم پیشِ نظر رکھا جائے جس میں ہر طرح کی مادی و روحانی نعمت شامل ہے۔

البتہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جس سورہ کی بحث جاری ہے وہ مکی ہے اور اس کے نزول کے وقت ابھی زکوٰۃ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، اس انفاق کو زکوٰۃ سے مربوط نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ یہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جس میں نزولِ حکم کے بعد زکوٰۃ بھی شامل ہے۔

بہرحال ایمان اسی صورت میں حقیقی قرار پا سکتا ہے کہ جب وہ عمل میں ظاہر ہو اور ایک طرف انسان کو اللہ کے قریب کرے اور دوسری طرف اس کے بندوں کے نزدیک کرے۔

۲۔ **انفاق پنہاں اور آشکار کیوں؟** ہم بار ہا قرآنی آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ سچے مومنین پنہاں بھی انفاق اور صدقہ کرتے ہیں اور آشکار بھی۔ اس طرح سے انفاق کا وسیع معنی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی کیفیت کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کیونکہ بعض اوقات مخفی انفاق زیادہ مؤثر اور زیادہ آبرومندانہ ہوتا ہے اور بعض اوقات آشکار ہو تو دوسروں کی تشویق کا باعث بنتا ہے، اسلامی طرزِ عمل کے لیے نمونہ مہیا کرتا ہے اور شعائرِ دین کی تعظیم و تکریم شمار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں کبھی ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ جسے کچھ دیا جا رہا ہو وہ لینے سے ناراحت ہوتا ہے۔

اس وقت جب کہ ہم خونخوار دشمن سے جنگ میں مصروف ہیں (یا کسی مسلمان قوم کو ایسی حالت کا سامنا ہو) تو اہلِ ایمان ہر روز جنگ زدگان یا مجروحین یا خود جنگجویان کی امداد کے لیے مختلف قسم کا بہت زیادہ سامان لے کر سرحدوں اور جنگی علاقوں کی طرف روانہ ہوتے ہیں اور ان کی خبریں ذرائع ابلاغ سے نشر ہوتی ہیں ایک تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پوری ملت جنگ کرنے والوں کی پشت پر ہے اور دوسرا ان لوگوں کے لیے باعثِ تشویق ہوتا ہے جو ابھی قافلے سے پیچھے رہ گئے ہیں تاکہ جتنا جلدی ہو سکے وہ قافلے سے آملیں۔ واضح ہے کہ ایسے مواقع پر اعلانیہ انفاق زیادہ مؤثر ہے۔

ان دونوں میں فرق کے سلسلے میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اعلانیہ انفاق واجبات کے ساتھ مربوط ہے کہ جس میں عام طور پر تظاہر کا پہلو نہیں ہوتا کیونکہ ذمہ داری کی ادائیگی سب پر لازم ہے اور اس میں کوئی پنہاں معاملہ نہیں لیکن مستحب انفاق چونکہ واجب سے زائد چیز ہے لہٰذا ہو سکتا ہے اس میں تظاہر یا ریا کا معاملہ ہو لہٰذا بہتر ہے کہ اسے مخفی طور پر انجام دیا جائے۔

ایسا نظر آتا ہے کہ یہ تفسیر کوئی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ درحقیقت پہلی تفسیر کی ایک شاخ ہے۔

۳۔ **اس دن بیع اور خلال نہیں ہے:** ہم جانتے ہیں کہ روزِ قیامت کی ماہیت و حقیقت یہ ہے کہ ہم اعمال کے نتائج اور ردِ عمل کا سامنا کریں گے۔ لہٰذا کوئی شخص وہاں عذاب سے نجات کے لیے کوئی فدیہ نہیں دے گا۔ یہاں تک کہ اگر بالفرض روئے زمین کی ساری دولت اس کے قبضے میں ہو اور وہ اسے خرچ کر کے ذرہ بھر اپنے اعمال کی سزا کم کروانا چاہے تو ممکن نہیں کیونکہ دارالعمل تو یہی دنیا ہے اور یہاں سے اس کا روزنامچہ مکمل ہو کر لپیٹا جا چکا ہے اور وہاں دارالحساب ہے، وہ محاسبہ کا گھر ہے۔ اسی طرح مادی دوستی کا رشتہ جس

شخص سے کسی صورت میں بھی ہو وہاں نجات بخش نہیں ہو سکتا۔ (توجہ رہے کہ "خلال" اور "خلة" دوستی کے معنی میں ہے)۔

آسان لفظوں میں ۔۔۔ لوگ اس دنیاوی زندگی میں سزا سے بچنے کے لیے عام طور پر پیسے کا سہارا لیتے ہیں یا پارٹی اور دوستی کا ذریعہ استعمال کرتے ہیں یعنی رشوتوں اور رشتوں کے ذریعے سزا سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر یہ سمجھیں کہ وہاں بھی اسی طرح کوئی صورت نکل آئے تو یہ ممکن نہیں۔ یہ ان کی بے خبری اور انتہائی نادانی کی دلیل ہے۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں جس طرح کی دوستی کی نفی کی گئی ہے وہ عالم قیامت میں مومنین کی باہمی دوستی کے منافی نہیں ہے کہ جس کے بارے میں بعض آیات میں تصریح کی گئی ہے کیونکہ یہ تو ایمان کے زیر سایہ ایک معنوی دوستی اور مودت ہے۔

باقی رہا مسئلہ شفاعت تو جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ اس کا مادی مفہوم نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں وارد ہونے والی صریح آیات کے پیش نظر یہ صرف معنوی اور روحانی شفیع کے زیر سایہ اور بعض اعمال خیر کی وجہ سے حاصل ہونے والی اہلیت کے باعث میسر آتی ہے۔ اس کی تفصیل ہم سورہ بقرہ کی آیہ ۴۸ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں[1]

۴۔ اے انسان! تمام موجودات تیرے فرمان پر سر تسلیم خم ہیں: ان آیات میں دوبارہ زمین و آسمان کی مختلف موجودات کے انسان کے لیے تسخیر ہونے کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ اس گفتگو کے چھ حصے ہیں۔

(۱) کشتیوں کی تسخیر

(۲) نہروں اور دریاؤں کی تسخیر

(۳) سورج کی تسخیر

(۴) چاند کی تسخیر

(۵) رات کی تسخیر

(۶) دن کی تسخیر

ان میں سے بعض کا تعلق آسمان سے ہے اور بعض (رات اور دن) کا دونوں سے۔

ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں اور پھر یاد دہانی ضروری ہے کہ انسان قرآن کی نگاہ میں اس قدر باعظمت ہے کہ اللہ کے حکم سے تمام موجودات اس کے لیے مسخر ہیں یعنی یا اس کے اختیار میں ہیں اور ان کی مہار اس کے ہاتھ میں ہے یا ان کی حرکت انسان کی خدمت کے لیے ہے اور یہ انسان کو ہر حالت میں اس قدر عظمت حاصل ہے کہ تمام آفرینش کا یہ ایک ہدف عالی بن گیا ہے۔

سورج اس کے لیے نور افشانی کرتا ہے، اس کا بستر حیات گرم کرتا ہے، اس کے لیے طرح طرح کی نباتات اور پودے اگاتا ہے، اس کی زندگی کے ماحول کو ضرر رساں جراثیم سے پاک کرتا ہے، اسے مسرت و شادمانی کا پیغام دیتا ہے اور اسے راہ حیات کی نشاندہی کرتا ہے۔

چاند انسان کی تاریک راتوں کا چراغ ہے یہ طبیعی، فطری اور جاوداں تقویم ہے اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والا جوار بھاٹا انسان کی بہت سی مشکلات حل کرتا ہے۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد اول صفحہ ۱۸۳ تفسیر نمونہ جلد ۱ صفحہ ۴۹۸ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

سمندروں اور دریاؤں سے جاری نہروں کا پانی اوپر آ جاتا ہے۔ یہ بہت سے درختوں کی آبیاری کرتا ہے۔ خاموش، ساکن اور رکے ہوئے سمندروں کو حرکت میں لے آتا ہے اور اسے گندا اور متعفن ہونے سے بچاتا ہے۔ اور موجوں کے اٹھنے سے دریاؤں اور سمندروں کے زندہ موجودات کے لیے ضروری آکسیجن میسر آ جاتی ہے۔

ہوائیں بحری جہاز اور کشتیاں سمندر کے سینے پر چلاتی ہیں۔ وسیع ترین شاہراہ انہی سمندروں میں میسر ہے اور عظیم ترین سواری بھی یہی جہاز ہیں۔ یہاں تک کہ بعض بحری جہاز ایک چھوٹے شہر کی مانند ہیں اور چھوٹے شہر کی آبادی کو لیے سمندروں میں رواں دواں ہوتے ہیں۔

دریا اور نہریں ــــ انسان کی خدمت گزار ہیں۔ یہ زراعت کی آبیاری، جانوروں کی سیرابی اور ماحول زندگی کو تر و تازہ رکھنے کے لیے ہیں یہاں تک کہ خود ان میں انسان کے لیے مچھلیوں کی صورت میں غذائی مواد پل رہا ہوتا ہے۔

تاریکی شب ــــ انسان کو لباس کی طرح ڈھانپ دیتی ہے، اسے سکون و راحت پہنچاتی ہے اور سورج کی جلانے والی حرارت سے اس طرح بچاتی ہے جیسے سائے میں پنکھے کی ہوا والت انسان کو حیات تازہ بخشتی ہے۔

اسی طرح دن کی روشنی ــــ انسان کو اٹھ کھڑا ہونے اور سعی و کوشش کی دعوت دیتی ہے اور اس کے اندر گرمی اور حرارت پیدا کرتی ہے اور ہر مقام پر جنبش و حرکت پیدا کرتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ تمام چیزیں انسان کی فرمانبردار ہیں۔ ان تمام نعمتوں کا بیان اور ان کی وضاحت انسان میں ایک نئی روح پھونکنے کے علاوہ اسے اس کی عظمت سے آگاہ کرتی ہے اور اس میں احساس تشکر ابھارتی ہے۔

اس گفتگو سے ضمنی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآنی لغت میں تسخیر دو معانی کے لیے آتا ہے۔

ایک انسان کے مفادات اور مصالح کے لیے مصروف خدمت ہونے (جیسے سورج اور چاند کی تسخیر) اور دوسرے انسانی اختیار میں ہونے (مثلاً کشتیوں اور دریاؤں کی تسخیر) کے معنی میں آیا ہے اور یہ جو بعض کا خیال ہے کہ یہ آیات موجودہ زمانے میں تسخیر کے اصطلاحی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں (جیسے خلائی سفر کے ذریعے تسخیر ماہتاب)، یہ خیال درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ بعض قرآنی آیات میں ہے،

وسخرلكم ما فى السمٰوٰت وما فى الارض جميعًا منه

جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب تمہارے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ (جاثیہ - ۱۳)

یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ وہ تمام چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور وہ تمام چیزیں جو زمین میں ہیں انسان کے لیے مسخر ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ فضانوردوں کا تمام آسمانی کرات تک پہنچنا قطعاً محال ہے۔

قرآن میں بعض دوسری آیات ہیں کہ جو ممکن ہے اس قسم کی تسخیر کی طرف اشارہ ہوں۔ اس کے بارے میں ہم انشاء اللہ سورہ رحمٰن کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

(موجودات کے انسان کے سامنے مسخر ہونے کے بارے میں سورہ رعد کی آیہ ۲ کے ذیل میں بھی بحث کی جائے گی)۔

۵ - دائبین : ہم کہہ چکے ہیں کہ "دائب" مادہ "دؤب" سے ہے اس کا معنی ہے ایک عادت یا حکم سنت کے مطابق کام جاری رکھنا۔ البتہ سورج زمین کے گرد حرکت نہیں کرتا بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ سورج ہمارے گرد گھومتا ہے لیکن "دائب" کے معنی میں کسی جگہ میں حرکت کرنے کا مفہوم نہیں ہے بلکہ کسی کام کو مسلسل جاری رکھنے کا مفہوم اس میں مضمر ہے اور ہم جانتے

ہیں کہ سورج اور چاند نور افشانی کرتے ہیں اور نشو و نما کا ذریعہ ہیں۔ کرۂ زمین اور انسانوں کے لیے ان کا یہ پروگرام مسلسل اور پوری طرح منظم ہے (اور اس بات کو فراموش نہ کیجئے گا کہ "دأب" کا ایک معنی عادت بھی ہے)[1]

۶۔ جو کچھ ہم خدا سے چاہتے ہیں کیا وہ دیتا ہے؟ زیر بحث آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ:

خدا نے تم پر لطف کیا اور جو کچھ تم نے اس سے طلب کیا اس کا کچھ حصہ تمہیں دیا۔

(توجہ رہے کہ "من کل ما سألتموہ" میں "من" تبعیضیہ ہے)۔

یہ اس بناء پر ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان خدا سے کوئی چیز چاہتا ہے کہ جس میں یقینی طور پر اس کا نقصان بلکہ بعض اوقات ہلاکت پنہاں ہوتی ہے لیکن وہ اس سے بے خبر ہوتا ہے لیکن عالم، حکیم اور رحیم خدا ہرگز اس قسم کا تقاضا پورا نہیں کرتا اور اس کی بجائے شاید بہت سے مواقع پر انسان اپنی زبان سے خدا سے کوئی چیز طلب نہیں کرتا لیکن زبان حال سے اور اپنی فطرت سے اس کی تمنا کرتا ہے اور خدا اسے دے دیتا ہے اور کوئی مانع نہیں کہ "ما سألتموہ" میں زبانِ قال کا تقاضا بھی شامل ہو اور زبانِ حال کی آرزو بھی۔

۷۔ اس کی نعمتیں کیوں قابلِ شمار نہیں: یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارا وجود سر تا پا اس کی نعمتوں میں مستغرق ہے۔ اگر مختلف علوم، علم عمرانیات، علم نفسیات اور علم نباتات وغیرہ کی کتب کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان نعمتوں کا دامن کس قدر وسیع ہے۔ اصولی طور پر ایک عظیم ادیب کے بقول ہر سانس میں دو نعمتیں موجود ہیں اور ہر نعمت پر شکر واجب ہے۔

اس سے قطع نظر ہم جانتے ہیں کہ ایک انسان کے بدن میں دس ہزار ارب زندہ خلیے موجود ہیں ان میں سے ہر ایک ہمارے فعال بدن کا حصہ ہے۔ یہ عدد اس قدر بڑا ہے کہ اگر ہم ان خلیوں کو گننا چاہیں تو سینکڑوں سال درکار ہیں اور پھر یہ تو ہم پر خدا کی نعمتوں کا صرف ایک حصہ ہے۔ لہٰذا اگر ہم واقعاً اس کی نعمتوں کو گننا چاہیں تو یہ ہمارے بس کی بات نہیں (وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا)۔

انسان کے خون میں دو قسم کے گلوبول (GLOBULES)[2] ہوتے ہیں۔ سرخ گلوبول کئی ملین ہیں اور اسی طرح سفید گلوبول بھی۔ سرخ گلوبول بدن کے خلیوں کی سوخت و ساز کے لیے آکسیجن پہنچاتے ہیں اور سفید گلوبول انسان کی صحت و سلامتی کی حفاظت کرتے ہیں اور جب جراثیم جسم پر حملہ آور ہوتے ہیں تو یہ اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ بغیر کسی استراحت اور آرام کے ہمیشہ خدمتِ انسان کے لیے کمربستہ رہتے ہیں۔

۸۔ افسوس کہ انسان "ظلوم" اور "کفار" ہے: گزشتہ مباحث سے ہم اس حقیقت تک پہنچے ہیں کہ خدا نے تمام موجودات کو حکمِ انسان کے سامنے مسخر کر دیا ہے اور اس قدر نعمتیں اسے عطا کر دی ہیں کہ اب کسی پہلو سے اس کے لیے کوئی کمی نہیں۔ لیکن یہ انسان نورِ ایمان سے اور تربیت سے دور رہنے کی بناء پر طغیان اور ظلم و ستم کے راستے پر قدم رکھتا ہے اور کفرانِ نعمت میں مشغول ہو جاتا ہے۔

خود غرض افراد کی کوشش ہوتی ہے کہ خدا کی وسیع و عریض نعمتوں کو اپنے لیے منحصر کر لیں اور زمین کے وسائلِ حیات پر اپنا قبضہ جما لیں

---

[1] البتہ موجودہ زمانے کے ماہرین سورج کی دوسری قسم کی گردشوں کے قائل ہیں۔ مثلاً وہ اپنے مدار کے گرد گھومتا ہے اور جس نظامِ شمسی سے اس کا تعلق ہے اس کے ساتھ اس کہکشاں کے اندر حرکت کرتا ہے جس میں وہ موجود ہے۔

[2] چھوٹے چھوٹے زندہ موجودات جو خون میں تیرتے ہیں اور زندگی کے بارے میں بھاری ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔

خود تو تھوڑی سی مقدار کے علاوہ صرف نہیں کر سکتے لیکن اس کے باوجود دوسروں کو ان تک پہنچنے سے محروم رکھتے ہیں۔

یہ مظالم جو خود غرضی، استعمار اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اس کی زندگی کے پرسکون ماحول کو طوفانوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ ان کے باعث جنگیں برپا ہوتی ہیں، خون بہتا ہے اور اموال و نفوس کی ہلاکت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

درحقیقت قرآن کہتا ہے، اے انسان! تیرے دست اختیار میں تمام چیزیں اس قدر ہیں جو کافی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ تو "ظلوم" اور "کفار" نہ بنے، اپنے حق پر قناعت کرے، دوسروں کے حقوق پر تجاوز نہ کرے اور کسی کے حق پر ڈاکہ نہ ڈالے۔

۳۵۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝

۳۶۔ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

۳۷۔ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝

۳۸۔ رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۝

۳۹۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ۝

۴۰۔ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ڰ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاۗءِ ۝

۴۱۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝ ع

ترجمہ

۳۵۔ وہ وقت (یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا، پروردگارا! اس شہر (مکہ) کو شہر امن قرار دے اور مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے دور رکھ۔

۳۶۔ پروردگارا! انہوں (بتوں) نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر رکھا ہے پس جو شخص میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔

۳۷۔ پروردگارا! میں نے اپنی کچھ اولاد کو تیرے گھر کے پاس کہ جو تیرا حرم ہے بے آب و گیاہ سرزمین میں ٹھہرایا ہے تاکہ نماز قائم کریں تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف موڑ دے اور انہیں ثمرات میں سے رزق دے، شاید وہ تیرا شکر بجا لائیں۔

۳۸۔ پروردگارا! جو کچھ ہم چھپاتے ہیں یا ظاہر کرتے ہیں تو اسے جانتا ہے اور زمین و آسمان میں کوئی چیز اللہ پر مخفی نہیں ہے۔

۳۹۔ حمد ہے اس اللہ کی جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا کیے یقیناً میرا خدا دعا سنتا ہے (اور قبول کرتا ہے)۔

۴۰۔ خدایا! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی ایسا کر۔ پروردگارا! (ہماری) دعا قبول فرما۔

۴۱۔ پروردگارا! مجھے، میرے ماں باپ کو اور تمام مومنین کو اس روز بخش دینا جب حساب قائم ہوگا۔

تفسیر

ابراہیمؑ بت شکن کی اصلاحی دعائیں

گزشتہ آیات میں سچے مومنین اور نعمات الٰہی کا شکر ادا کرنے والوں کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیات میں راہِ خدا میں استقامت دکھانے والے اور اس کے عبدِ شاکر ابراہیم علیہ السلام کی کچھ دعائیں بیان کی گئی ہیں تاکہ گزشتہ تمام بحثوں کی تکمیل ہو جائے اور یہ امر خدائی نعمتوں سے بہترین فائدہ اٹھانے کی خواہش رکھنے والوں کے لیے نمونہ بن جائے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ وقت یاد کرو جب ابراہیم نے بارگاہِ ایزدی میں عرض کیا: پروردگارا! اس شہر (مکہ) کو سرزمین امن و امان قرار دے (واذ قال ابراھیم رب اجعل ھذا البلد امنا)۔ اور مجھے اور میرے بیٹے کو اپنا لطف و عنایت فرما اور بتوں کی پرستش سے دور رکھ (واجنبنی و بنیّ ان نعبد الاصنام)۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بت پرستی کتنی بڑی مصیبت اور گھروں کو ویران کرنے والی ہے اور میں نے اپنی آنکھوں سے اس راستے میں برباد ہونے والوں کو دیکھا ہے۔

پروردگارا! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے (رب انھن اضللن کثیرا من الناس)۔ گمراہی بھی کیسی خطرناک کہ جس میں وہ اپنی عقل و خرد تک گنوا بیٹھے ہیں۔

میرے اللہ! میں تیری توحید کی دعوت دیتا ہوں اور سب کو تیری طرف پکارتا اور بلاتا ہوں۔ جو شخص میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے اگر وہ قابلِ ہدایت و بخشش ہے تو اس کے بارے میں محبت و احسان فرما کیونکہ تو بخشنے والا مہربان ہے (فمن تبعنی فانہ منی و من عصانی فانک غفور رحیم)

دراصل ان الفاظ میں حضرت ابراہیمؑ بارگاہِ خداوندی میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر میری اولاد بھی راہِ توحید سے منحرف ہو جائے اور بت پرستی کی طرف متوجہ ہو جائے تو وہ مجھ سے نہیں ہے اور اگر غیر اس راستے پر گامزن ہو جائیں تو وہ میرے بیٹوں اور بھائیوں کی مانند ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ مؤدبانہ اور انتہائی محبت آمیز تعبیر اس لحاظ سے بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہ نہیں کہتے کہ جو شخص میری نافرمانی کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے لہٰذا اسے اس طرح یا اُس طرح سزا دے بلکہ کہتے ہیں، جو شخص میری نافرمانی کرے تو بخشنے والا اور مہربان ہے۔

پھر اپنی دعا اور درخواست جاری رکھتے ہیں: پروردگارا! میں نے اپنی کچھ اولاد کو تیرے گھر کے پاس کہ جو تیرا حرم ہے بے آب و گیاہ سرزمین میں ٹھہرایا ہے تاکہ وہ نماز قائم کریں (ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوٰۃ)۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب خدا نے انہیں ان کی کنیز ہاجرہ سے فرزند عطا کیا۔ جس کا نام انہوں نے اسماعیل رکھا۔ اس پر ان کی پہلی بیوی سارہ کے دل میں حسد پیدا ہو گیا۔ وہ ہاجرہ اور ان کے بیٹے کی موجودگی برداشت نہ کر سکی۔ اس نے ابراہیمؑ سے تقاضا کیا کہ اس ماں بیٹے کو کہیں اور لے جائیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمانِ خدا پر یہ بات مان لی اور اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو لے کر سرزمین مکہ میں چلے گئے۔ ان دنوں یہ علاقہ بالکل خشک، بنجر اور ویران تھا۔ آپ نے انہیں وہاں ٹھہرایا اور خدا حافظ کہہ کر چلے آئے۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس گرم اور تپتی ہوئی زمین پر ماں اور بیٹے کو پیاس لگی۔ ہاجرہ نے اپنے ننھے سے بچے کی جان بچانے کی بہت کوشش کی۔

دوسری طرف خدا کا ارادہ تھا کہ یہ سرزمین ایک عظیم مرکزِ عبادت بنے۔ اس موقع پر زمزم کا چشمہ جاری ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ صحرا نورد قبیلہ جرہم وہاں سے گزرا۔ اُسے سارے ماجرے کا پتہ چلا۔ اس نے وہیں پڑاؤ ڈال لیا اور رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ ایک آبادی کی شکل اختیار کرنے لگا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا کو اس طرح سے جاری رکھا: اب جبکہ وہ تیرے عظیم گھر کے احترام میں اس جلا دینے والے بیابان میں سکونت پذیر ہو گئے ہیں تو تو کچھ لوگوں کا دل ان کی طرف موڑ دے اور ان کی محبت ان کے دلوں میں ڈال دے (فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم)۔ اور انہیں طرح طرح کے (مادی و معنوی) ثمرات سے بہرہ مند کر دے، شاید وہ تیری نعمتوں کا شکر ادا کریں (وارزقھم من الثمرٰت لعلھم یشکرون)۔

ایک موحد اور آگاہ انسان جانتا ہے کہ علمِ الٰہی کے مقابلے میں اس کا علم محدود ہے اور اس کے مصالح کو صرف خدا جانتا ہے، اکثر وہ خدا سے ایسی چیزوں کا تقاضا کرتا ہے جو اس کے لیے قرینِ مصلحت نہیں ہوتیں اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ جن میں اس کی مصلحت ہے لیکن وہ

ان کے لیے درخواست نہیں کرتا اور کبھی اس کے دل کی آرزو تمنا ہوتی ہیں کہ جن سب کو وہ زبان پر نہیں لا سکتا لہٰذا مذکورہ دعاؤں اور التماسوں کے بعد حضرت ابراہیمؑ یوں عرض کرتے ہیں: پروردگارا! تو ان سب چیزوں سے اچھی طرح آگاہ ہے جنہیں ہم چھپاتے ہیں یا آشکار کرتے ہیں (ربنا انك تعلم ما نخفی و ما نعلن)۔ اور زمین و آسمان میں کوئی چیز خدا سے مخفی نہیں ہے (و ما یخفی علی اللہ من شیء فی الارض و لا فی السماء)۔

اگر میں اپنے بیٹے اور بیوی کے فراق میں غمگین ہوں تو تو جانتا ہے اور اگر آشکار بھی میری آنکھ سے آنسو چھلکتے ہیں تو تو انہیں دیکھتا ہے۔

اور اگر غم فراق میرے دل پر چھایا ہوا ہے تو بھی تو جانتا ہے اور تیرے حکم کی اطاعت سے میرا دل ساتھ ساتھ مطمئن بھی ہے تو بھی تجھے خبر ہے۔

اور اگر وقتِ جدائی میری بیوی مجھ سے کہتی ہے:

الی من تکلنی؟

مجھے کس کے سہارے چھوڑے جاتے ہو؟

تو اس سے بھی تو آگاہ ہے۔

تو ان سب چیزوں سے آگاہ ہے۔ اس سرزمین اور ان کا مستقبل ایک دوسرے سے مضبوطی سے بندھا ہوا ہے، یہ سب تیری بارگاہِ علم میں روشن ہے۔

اس کے بعد نعمات پروردگار کے شکر کی طرف اشارہ ہے۔ ان میں سے اہم ترین یہ تھی کہ پروردگار نے عالم پیری میں حضرت ابراہیمؑ کو دو برومند بیٹے اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے تھے۔ بارگاہِ ایزدی میں عرض کرتے ہیں: حمد و سپاس ہے اس اللہ کے لیے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق بخشے (الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسمٰعیل و اسحاق)[1]۔

جی ہاں! یقیناً میرا خدا دعاؤں کو سنتا ہے (ان ربی لسمیع الدعاء)۔

پھر بھی درخواست اور دعا جاری رکھتے ہیں اور عرض کرتے ہیں: پروردگارا! مجھے نماز قائم کرنے والا قرار دے اور اے میرے خدا! میری اولاد میں سے بھی اسی طرح قرار دے (رب اجعلنی مقیم الصلوٰۃ و من ذریتی)۔ پروردگارا! میری دعا قبول کر لے (ربنا و تقبل دعاء)۔

اور آخری تقاضا ابراہیمؑ نے یہ کیا: پروردگارا! مجھے، میرے ماں باپ اور سب مومنین کو اس روز بخش دینا جس دن حساب قائم ہو (ربنا اغفر لی و لوالدی و للمؤمنین یوم یقوم الحساب)۔

---

[1] جب حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر کیا تھی۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے بعض نے کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام ۹۹ سال کے تھے کہ پہلے فرزند اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تھے اور ۱۱۲ سال کے تھے جب اسحاق نے آنکھ کھولی۔ بعض نے اس سے کم اور بعض نے زیادہ عمر لکھی ہے تاہم یہ مسلم ہے کہ اس وقت آپ کی عمر اتنی تھی کہ معمولاً اس عمر میں بچے کی پیدائش بہت بعید معلوم ہوتی تھی۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا مکہ اس وقت شہر تھا؟ زیرِ نظر آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام ابتداء میں عرض کرتے ہیں کہ خداوندا! میں اپنے بیٹے کو ایک ایسی سرزمین میں چھوڑ رہا ہوں جہاں پانی ہے نہ آبادی اور نہ زراعت۔

یقیناً یہ سرزمین مکہ میں ورود کا آغاز ہے کہ جب پانی تھا نہ آبادی، نہ مکان تھا نہ مکین۔ صرف خانہ خدا کے باقی ماندہ آثار تھے جو وہاں دکھائی دیتے تھے اور کچھ خشک اور بے آب و گیاہ پہاڑ تھے۔

لیکن ہم جانتے ہیں کہ ابراہیم نے اس علاقے کا بھی ایک سفر کیا تھا۔ اس کے بعد بھی آپ نے اس سرزمینِ مقدس پر بارہا قدم رکھا جب کہ تدریجاً مکہ شہر کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ قبیلہ "جرہم" وہاں سکونت اختیار کر چکا تھا۔ چشمہ زمزم پیدا ہونے پر علاقہ رہائش کے قابل ہو چکا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعائیں ان کے کسی بعد کے سفر سے تعلق رکھتی ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کہتے ہیں: خداوندا! اس شہر کو مقامِ امن و امان قرار دے۔

اور یہ جو وادی "غیر ذی زرع" کہا ہے تو یا گزشتہ زمانے کی بات کر رہے ہیں اور اپنے پہلے سفر کی یاد تازہ کر رہے ہیں اور یا اس طرف اشارہ ہے کہ سرزمینِ مکہ ایک شہر بن جانے کے بعد بھی ناقابلِ زراعت ہے لہٰذا اس کی ضروریات باہر سے آنا چاہئیں کیونکہ جغرافیائی لحاظ سے یہ علاقہ خشک پہاڑوں پر مشتمل ہے جہاں پانی بہت کم ہے۔

۲۔ مکہ سرزمینِ امن: یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سرزمین میں اللہ تعالیٰ سے جو سب سے پہلی دعا کی وہ "امن" مکہ کے لیے تھی۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ امن کی نعمت انسانی زندگی کے لیے، کسی جگہ قیام کرنے کے لیے اور ہر قسم کی تعمیر، آبادی اور ترقی کے لیے پہلی شرط ہے اور ہے بھی ایسا ہی۔ اگر کسی جگہ امن و امان نہ ہو تو وہ رہنے کے قابل نہیں اگرچہ دنیا کی تمام نعمتیں وہاں موجود ہوں۔ اصولی طور پر وہ شہر، آبادی اور ملک کہ جو امن کی نعمت سے محروم ہو گویا وہ تمام نعمتیں کھو بیٹھا ہے۔

یہاں اس نکتے کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کے امن کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا کو دو طرح سے قبول کیا ہے۔ اسے امنیتِ تکوینی بھی دی کیونکہ یہ ایسا شہر ہو گیا کہ جس نے پوری تاریخ میں امن کے لیے تباہ کن حوادث بہت کم دیکھے ہیں اور اسے امنیتِ تشریعی بھی دی۔ یعنی خدا نے حکم دیا ہے کہ تمام انسان بلکہ جانور تک اس سرزمین میں امن و امان میں رہیں۔ یہاں کے جانوروں کا شکار کرنا ممنوع ہے[1] یہاں تک کہ جو مجرم اس حرم اور خانہ خدا میں پناہ لیں ان کا تعاقب بھی جائز نہیں۔ ایسے مجرمین کا صرف کھانا پانی بند کیا

---

[1] اس وقت جب کہ ہم تفسیر کے اس حصے کو مرتب کر رہے ہیں امتِ اسلامی پر ایک نہایت دردناک سانحہ گزرا ہے۔ سرزمینِ حرم پر اطراف خانہ خدا میں سعودی پولیس نے وحشت و درندگی کی انتہا کر دی۔ اس نے ایرانی حاجیوں پر گولی چلائی۔ سینکڑوں مرد و عورتیں بچے بوڑھے شہید ہو گئے۔ یہ انتہائی ظلم پر امن اور نہتے جلوس پر ہوا ان کا جرم صرف اس قدر تھا کہ وہ عالمی طاغوتی طاقتوں امریکہ، روس اور اسرائیل کے خلاف اظہارِ نفرت کر رہے تھے۔ یہ واقعہ ان دنوں میں ہوا جب خلیج فارس میں امریکہ نے کھلم کھلا فوجی مداخلت شروع کر دی ہے تاکہ ایران کے اسلامی انقلاب سے اپنی رسوائی کا بدلہ لے سکے۔ ایسے میں

بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ

جاسکتا ہے تاکہ وہ بالکل آئیں اور سرتسلیم خم کر دیں۔

۳۔ ابراہیمؑ بت پرستی سے دوری کی دعا کیوں کرتے ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ ابراہیمؑ معصوم نبی تھے اور ان کے بلاواسطہ بیٹے بحمایت کے لفظ "بنی" کے یقینی مصداق ہیں یعنی اسماعیلؑ اور اسحاقؑ وہ بھی معصوم پیغمبر تھے اس کے باوجود وہ تقاضا کرتے ہیں: خدایا! مجھے اور انہیں بتوں کی پوجا سے دور رکھ!

یہ بات بت پرستی کے خلاف جہاد کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تاکید کے لیے دلیل ہے۔ یہاں تک کہ معصوم نبی اور بت شکن بھی اس سلسلے میں خدا سے دعا کرتے ہیں۔ یہ بعینہ پیغمبر اسلامؐ کی طرف سے اپنی وصیتوں میں حضرت علیؑ یا دوسرے آئمہؑ کو جو ان کے جانشین تھے انہیں نماز کی تاکید کرنے کے مشابہ ہے جبکہ ان کے بارے میں ترکِ نماز کے احتمال کا ہرگز کوئی مفہوم نہیں بلکہ اصولی طور پر یہ تاکید ان کی سعی و کوشش سے برپا ہوتی ہے۔

تو اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ابراہیمؑ نے کس طرح سے کہا کہ پروردگارا! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے حالانکہ وہ پتھر اور لکڑی کے سوا کچھ نہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ:

اولاً۔۔۔ بت ہمیشہ پتھر اور لکڑی کے نہیں ہوتے تھے بلکہ کبھی کبھی فرعون اور نمرود جیسے افراد لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت دیتے تھے اور اپنے آپ کو "رب اعلیٰ" "زندہ کرنے والا اور مارنے والا" کی حیثیت سے متعارف کرواتے تھے۔

ثانیاً۔۔۔ بعض اوقات پتھر اور لکڑی کے بتوں کو ان کے متولی اور کارندے اس طرح سے آراستہ و پیراستہ کرتے اور ان کے لیے ایسے احترامات بجا لاتے کہ وہ واقعاً سادہ لوح عوام کے لیے گمراہ کن ہو جاتے تھے۔

۴۔ ابراہیمؑ کے تابع کون ہیں؟ زیر بحث آیات میں ہے کہ ابراہیمؑ کہتے ہیں: خداوندا! وہ لوگ جو میری پیروی اور اتباع کرتے ہیں۔

یہاں سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار صرف وہ لوگ تھے جو ان کے زمانے میں تھے یا ان کے بعد ان کے دین پر تھے یا ساری دنیا کے توحید پرست اور خدا پرست اس میں شامل ہیں کیونکہ ابراہیمؑ توحید اور بت شکنی کی علامت اور نمونہ ہیں۔ قرآنی آیات میں ملتِ اسلامیہ اور دینِ اسلام کو ملت و دینِ ابراہیمی کی حیثیت سے متعارف کروایا گیا ہے[1] اس سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ کی دعا تمام توحید پرستوں اور راہِ توحید میں جدوجہد کرنے والوں کے لیے ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ: جب کہ مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط استعماری ایجنٹوں، نوآبادیاتی حکمرانوں اور بادشاہوں نے ایران کی اسلامی حکومت کے خلاف ایکا کر لیا جیسا کہ صاحب [illegible] سے تعاون کی پرستی۔ سعودی مفتیوں نے [illegible] کعبہ کا اسلام کے صریح احکام کے خلاف [illegible] حرم کے [illegible] قرار دیا [illegible] حاجیوں کے [illegible] قتل عام [illegible] کے خلاف استعمال ہوئے۔ [illegible] خلاف [illegible] کا دشمن قرار دیا گیا۔

[illegible] کہ یہی یزید اور حجاج کے افکار کے وارث ہیں جنہوں نے [illegible] خدا کی حرمت پامال کی تھی۔ [illegible]

[1] [illegible]

ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی روایات میں بھی اس تفسیر کی تائید کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک روایت امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

من احبنا فهو منا اهل البيت قلت: جعلت فداك منكم قال: منا والله اما سمعت قول ابراهيم: "من تبعني فانه مني"

جو شخص ہم سے محبت رکھے (اور اہل بیت کی سیرت پر چلے) وہ ہم میں سے ہے۔

راوی نے پوچھا: میں آپ پر قربان، واقعاً آپ میں سے ہے؟

فرمایا: واللہ ہم میں سے ہے۔ کیا تم نے ابراہیم کی گفتگو نہیں سنی جو کہتے ہیں من تبعنی فانہ منی (جو شخص میری اتباع کرے وہ مجھ سے ہے)[1]

یہ حدیث نشاندہی کرتی ہے کہ کسی مکتب کی پیروی اور اس کے پروگرام میں سے تعلق کسی خاندان سے نسبی طور پر تعلق ہونے کے مترادف ہے۔

ایک اور حدیث میں امام امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

نحن آل ابراهيم افترغبون عن ملة ابراهيم وقد قال الله تعالى فمن تبعني فانه مني

ہم آل ابراہیم ہیں۔ تو کیا ابراہیم کی ملت اور دین سے منہ موڑتے ہو، حالانکہ خداوند عالم (ابراہیم کا قول نقل کرتے ہوئے) فرماتا ہے: جو شخص میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے۔

۵۔ وادی "غیر ذی زرع" اور خدا کا پُرامن حرم: جو لوگ سفر کر گئے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ خانہ خدا، مسجد الحرام اور پورا مکہ کچھ چند خشک اور بے آب و گیاہ پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ گویا پتھروں کو پہلے ایک جلتے ہوئے تنور میں بھونا گیا ہے اور پھر انہیں ان کی جگہ پر نصب کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ خشک اور جلا دینے والی زمین عبادت کا عظیم ترین مرکز اور اس سے بڑھ کر روئے زمین پر توحید کا اولین مرکز ہے علاوہ ازیں خدا کا حرم امن ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے امنیتِ تکوینی کا بھی حامل ہے اور امنیتِ تشریعی کا بھی۔

بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنا مرکز ایسی سرزمین کو کیوں بنایا۔ اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام نے خطبۂ قاصعہ میں نہایت خوبصورت اور رسا الفاظ میں اس کا فلسفہ بیان فرمایا ہے۔

وضعه باوعر بقاع الارض حجرا واقل نتائق الدنيا مدرا...

......بين جبال خشنة ورمال دمثة...... ولو اراد سبحانه ان يضع بيته الحرام ومشاعره العظام بين جنات وانهار وسهل وقرار، جم الاشجار، داني الثمار، ملتف البنى، متصل القرى، بين برة سمراء وروضة خضراء، وارياف

---

[1] تفسیر نورالثقلین، جلد ۲ صفحہ ۵۵۰۔

محدقة، و عراص مغدقة، و رياض ناظرة و طرق عامرة: لكان قد صغر قدر الجزاء على حسب ضعف البلاء، و لو كان الاساس المحمول عليها و الاحجار المرفوع بها، بين زمردة خضراء، و ياقوتة حمراء، و نور و ضياء: لخفف ذلك مصارعة الشك في الصدور، و لوضع مجاهدة ابليس عن القلوب، و لنفى معتلج الريب من الناس، و لكن الله يختبر عباده بانواع الشدائد، و يتعبدهم بانواع المجاهد، و يبتليهم بضروب المكاره، اخراجاً للتكبر من قلوبهم، و اسكاناً للتذلل في نفوسهم، و ليجعل ذلك ابواباً فتحاً الى فضله، و اسباباً ذللاً لعفوه

خدا نے اپنا گھر سنگلاخ ترین علاقے، نہایت بے آب و گیاہ زمین، سخت پہاڑوں اور ریگستانی علاقے میں قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنا گھر اور حرم اور وسیع عظیم عبادت کا اہتمام کسی ایسے علاقے میں بنا سکتا تھا کہ جہاں باغات ہوتے، نہریں بہہ رہی ہوتیں، زمین ہموار ہوتی، ہر طرف درخت ہوتے جہاں پھل پھولوں کی فراوانی ہوتی، اور گرد و نواح آبادیاں ہوتیں، گندم کے کھیت ہوتے سبزہ ہی سبزہ ہوتا، خوبصورت کیاریاں ہوتیں، پانی سے سیراب چمن ہوتے، شاداب گلستاں ہوتے اور آباد شاہراہیں ہوتیں۔

لیکن عظیم حج اور عبادت کی آزمائش میں قدر سہل اور آرام دہ ہوتی اجر و جزا بھی اسی قدر کم ہوتی۔

نیز اگر خدا چاہتا تو کعبہ کے ستون اور اس کی عمارت کے پتھر سبز زمرد اور سرخ یاقوت کے ہوتے جن سے روشنی پھوٹتی لیکن یہ چیز سینوں میں شک و شبہات کا ٹکراؤ کم کر دیتی اور دلوں سے شیطان کی دوڑ دھوپ کا اثر زائل کر دیتی اور لوگوں سے شک کے خیالات دور کر دیتی مگر اللہ اپنے بندوں کو گوناگوں سختیوں سے آزماتا ہے اور ان سے ایسی عبادت کا خواہاں ہے جو طرح طرح کی مشقتوں سے بجا لائی گئی ہو اور انہیں قسم قسم کی ناگواریوں سے جانچتا ہے تاکہ ان کے دلوں سے غرور و تکبر کو نکال باہر کرے اور ان کے نفوس میں عجز و فروتنی کو جگہ دے اور یہ کہ اس آزمائش کی راہ سے اپنے فضل و احسان کے کھلے ہوئے دروازوں تک انہیں پہنچائے اور اُسے اپنی معافی و بخشش کا آسان وسیلہ قرار دے[1]

۴۔ حضرت ابراہیمؑ کی سات دعائیں: زیر نظر آیات میں توحید و معاد کے ہیرو اور بتوں، بت پرستی اور ظالموں کے خلاف قیام کرنے والے حضرت ابراہیمؑ کی بارگاہِ خدا میں سات دعائیں منعکس ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ، خطبہ نمبر ۱۹۲۔

پہلی دعا، توحیدی معاشرے کے عظیم مرکز شہر مکہ کی امنیت کے بارے میں ہے اور یہ دعا نہایت معنی خیز ہے۔

دوسری دعا، بتوں کی پرستش سے دور رہنے کے بارے میں ہے کہ جو تمام دینی حقائق اور پروگراموں کی اساس ہے۔

تیسری دعا، ان کی اولاد اور ان کے مکتب کے پیروکاروں کی طرف تمام لوگوں اور خدا پرستوں کے قلبی میلان اور فکری رجحان کے بارے میں ہے کہ جو معاشرے میں کسی انسان کا عظیم ترین سرمایہ ہو سکتا ہے۔

چوتھی دعا، شکرگزاری کے مقدمے کے طور پر اور خالق نعمات کی طرف مزید توجہ کے جذبے سے انواع و اقسام کے ثمرات سے بہرہ مند ہونے کے بارے میں ہے۔

پانچویں دعا، قیام نماز کی توفیق کے متعلق ہے اور یہ انسان کے خدا کے ساتھ عظیم ترین رشتے کی علامت ہے اور یہ دعا حضرت ابراہیم صرف اپنے لیے نہیں بلکہ اپنی اولاد کے لیے بھی کرتے ہیں۔

چھٹی دعا، قبولیت دعا کے بارے میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خدا وہ دعا قبول کرتا ہے کہ جو پاک دل اور بے آلائش روح سے نکلے یہ دعا در حقیقت ضمناً قلب و روح کی پاکیزگی کی ترغیب کے لیے ہے۔

ساتویں دعا، اور حضرت ابراہیم کا آخری تقاضا اس بارے میں ہے کہ اگر ان سے کوئی لغزش سرزد ہوئی ہے تو بخشنے والا اور مہربان خدا انہیں اپنے لطف و بخشش سے نوازے اور اسی طرح روز قیامت ان کے ماں باپ اور تمام مومنین کو اپنے لطف و رحمت سے بہرہ ور کرے۔

اس طرح حضرت ابراہیم کی سات دعائیں امنیت سے شروع ہوتی ہیں اور مغفرت و بخشش پر تمام ہوتی ہیں۔ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ ان دعاؤں میں حضرت ابراہیم صرف اپنے لیے تقاضا نہیں کرتے بلکہ دوسروں کے لیے بھی طلب کرتے ہیں کیونکہ مردانِ خدا کبھی بھی صرف اپنے لیے نہیں سوچتے۔

۷۔ کیا ابراہیم اپنے والد کے لیے دعا کر رہے ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ آزر بت پرست تھا اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے کہ اس کی ہدایت کے لیے حضرت ابراہیم کی کوششیں موثر ثابت نہ ہو سکیں اور اگر ہم یہ مان لیں کہ آزر حضرت ابراہیم کا باپ تھا تو یہ سوال سامنے آئے گا کہ ان آیات میں حضرت ابراہیم اس کی بخشش کی دعا کیوں کر رہے ہیں حالانکہ قرآن صراحت سے مومنین کو مشرکین کے لیے استغفار کرنے سے روکتا ہے (توبہ - ۱۱۴)۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ آزر کو حضرت ابراہیم کا باپ نہیں سمجھا جا سکتا اور یہ جو علماء نے کہا ہے کہ لفظ "اب" عربی زبان میں کبھی چچا کے لیے بھی بولا جاتا ہے، زیر بحث آیات کو ملحوظ نظر رکھا جائے تو یہ بات پوری طرح قابل قبول معلوم ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ عربی لغت کے اعتبار سے لفظ "اب" اور "والد" میں فرق ہے۔ لفظ "والد" کہ جو زیر بحث آیات میں بھی استعمال ہوا ہے صرف باپ کے معنی میں ہے لیکن لفظ "اب" کہ جو آزر کے متعلق آیا ہے چچا کے معنی میں استعمال ہو سکتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات اور سورہ توبہ کی آیات کہ جن میں مشرکین کے استغفار کی ممانعت کی گئی ہے کو باہم ملا کر دیکھا جائے تو ہم یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ آزر یقیناً حضرت ابراہیم کا باپ نہیں تھا۔[1]

۱۔ مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۳ صفحہ ۲۹۳ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

۴۲۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۵ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ○

۴۳۔ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ○

۴۴۔ وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۗ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ○

۴۵۔ وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ○

ترجمہ

۴۲۔ اور یہ گمان نہ کر کہ خدا ظالموں کے اعمال سے غافل ہے (ایسا نہیں ہے بلکہ اُس نے) ان کے لیے (سزا کو) اُس دن کے لیے مؤخر کیا ہے کہ جس دن (خوف و وحشت کے مارے) آنکھیں پتھرا جائیں گی۔

۴۳۔ وہ گردنیں اُوپر کیے اور سر اٹھائے ہوں گے اور ان کی آنکھیں بے حرکت ہو کر رہ جائیں گی (کیونکہ وہ جدھر دیکھیں گے عذاب کی نشانیاں نظر آئیں گی) اور ان کے (ڈوبتے ہوئے) دل بالکل ویران ہوں گے۔

۴۴۔ اور لوگوں کو اس دن سے ڈراؤ جس روز عذاب الٰہی ان کی طرف آئے گا وہ دن کہ جب ظالم کہیں گے، پروردگارا ہمیں تھوڑی سی مدت کے لیے مہلت دے دے تاکہ ہم تیری دعوت قبول کر لیں اور رسولوں کی اتباع کریں (لیکن انہیں فوراً جواب دیا جائے گا کہ) کیا پہلے تم قسم کھا کر نہ کہتے تھے کہ تمہارے لیے زوال و فنا نہیں ہے۔

۴۵۔ (کیا وہ تمہی نہ تھے کہ) جنہوں نے ان لوگوں کے گھروں (اور محلات) میں سکونت اختیار کی کہ جنہوں نے اپنے اُوپر

ظلم کیا تھا جب کہ تم پر یہ امر آشکار ہو چکا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور ہم نے تم سے (گزشتہ لوگوں کے انجام کی) مثالیں بیان کر دی تھیں (پھر بھی تم بیدار نہ ہوئے)۔

تفسیر

جس روز آنکھیں پتھرا جائیں گی

گزشتہ آیات میں یوم حساب کے بارے میں گفتگو تھی۔ اسی مناسبت سے زیر نظر آیات میں ظالموں اور ستمگروں کی کیفیت مجسم کی گئی ہے اور ان کے انجام کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے کہ جو ہلا دینے والی اور بیدار کرنے والی ہے۔ ضمناً مسائل معاد کے اس حصے کے ذکر سے گزشتہ مباحث توحید کی تکمیل بھی ہوتی ہے۔

پہلے ظالموں اور ستمگروں کو تہدید کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اے پیغمبر! کہیں یہ گمان نہ کرنا کہ خدا ظالموں اور ستمگروں کے کام سے غافل ہے (ولا تحسبن الله غافلا عما يعمل الظلمون)۔

یہ بات درحقیقت ان لوگوں کا جواب ہے کہ جو کہتے ہیں کہ اگر اس عالم کا کوئی عادل خدا ہے تو پھر اس نے ظالموں کو کیوں ان کی حالت پہ چھوڑ رکھا ہے۔ کیا وہ ان کی حالت سے غافل ہے یا پھر کیا وہ جانتا تو ہے لیکن انہیں روکنے کی قدرت نہیں رکھتا؟

اس سوال کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ خدا ہرگز غافل نہیں ہے۔ اگر وہ انہیں فوراً سزا نہیں دیتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جہان میدان عمل ہے اور یہ انسان کی آزمائش و پرورش کا مقام ہے اور یہ مقصد آزادی عمل کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ لیکن آخرکار ان کا یوم حساب آکے رہے گا۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: خدا نے ان کی سزا اور عذاب ایسے دن پر اٹھا رکھا ہے کہ جس میں خوف و دہشت کے مارے آنکھیں پتھرا جائیں گی اور ایک نقطہ پر لگی بے حس و حرکت ہو کر رہ جائیں گی (انما يؤخرهم ليوم تشخص فيه الابصار)۔

اس روز کی سزا اور عذاب، اس قدر وحشتناک ہوگا کہ شدت خوف کے باعث یہ ستمگر اپنی گردنیں اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے یہاں تک کہ ان کی پلکیں بھی حرکت نہ کریں گی اور شدت اضطراب سے ان کے دل ویران ہو جائیں گے (مهطعين مقنعي رءوسهم لا يرتد اليهم طرفهم و افئدتهم هواء)۔

"تشخص" "شخوص" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے آنکھوں کا بے حرکت ہو کر ایک ہی نقطے پر جم کر رہ جانا۔

"مهطعين" "اهطاع" کے مادہ سے گردن اونچی کرنے کے معنی میں ہے۔ بعض نے اسے تیز ہونے کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ذلت و عجز کے ساتھ دیکھنے کے معنی میں ہے لیکن آیت کے دیگر حصوں کی طرف توجہ کرنے سے پہلا معنی ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"مقنعي" "اقناع" کے مادہ سے آسمان کی طرف سر بلند کرنے کے معنی میں ہے۔

"لا يرتد اليهم طرفهم" کا مفہوم یہ ہے کہ وحشت کے مارے ان کی پلکیں ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتیں گویا ہر فعل کی

آنکھوں کی طرح بے کار ہو چکی ہیں۔

"وافئدتھم ھواء" — ان کے دلوں کے ویران ہو جانے کی طرف اشارہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے مجھے وحشت ناک خبر سنائی تو اچانک میرا دل بیٹھ گیا اور ویران ہو گیا۔ گویا وہ یوں ہواس کھو دیں گے کہ انہیں کسی چیز کی ہوش نہ رہے گی یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو جائیں گے گویا ان میں نہ دل ہے نہ جان، کوئی چیز انہیں یاد نہیں۔

یہاں ان کی پانچ صفات بیان کی گئی ہیں :-

آنکھوں کا خیرہ ہونا،

گردنوں کا اونچا ہونا،

سروں کا بلند ہونا،

پلکیں نہ جھپک سکنا اور

سب کچھ بھول جانا۔

یہ اضطراب و وحشت کے عالم کی انتہائی عمدہ اور بولتی ہوئی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس روز ظالموں کی یہ حالت ہو گی۔ وہ ظالم کہ جو غرور و نخوت سے ہر چیز کا مذاق اڑاتے اور تمسخر کرتے تھے۔ اس دن ان کی بے چارگی کا یہ عالم ہو گا کہ پلکیں بھی نہ جھپک سکیں گے۔ ان ہولناک مناظر سے آنکھیں چرانے کے لیے آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوں گے کیونکہ وہ جدھر بھی دیکھیں گے وحشت ناک مناظر ان کے سامنے ہوں گے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو عقل کل خیال کرتے تھے اور دوسروں کو بے عقل تصور کرتے تھے۔ اس روز عقل و ہوش گنوا بیٹھیں گے اور دیوانے معلوم ہوں گے بلکہ ان کی آنکھیں مُردوں کی آنکھوں کی طرح ویران اور بے حرکت ہوں گی۔

واقعاً جب قرآن کسی منظر کی تصویر کشی کرتا ہے تو نہایت مختصر عبارات میں کامل ترین تصویر پیش کر دیتا ہے۔ زیر نظر آیت بھی اس کا ایک نمونہ ہے۔

اس کے بعد اس لیے کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ خدائی عذاب کسی خاص گروہ سے مربوط ہے خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر کو ایک عمومی حکم دیتا ہے، تمام لوگوں کو اس دن سے ڈرا جس دن پروردگار کا دردناک عذاب بدکاروں کا رخ کرے گا، جس وقت ظالم اپنے اعمال کے وحشت ناک نتائج دیکھیں گے تو پریشان ہوں گے اور ان کی تلافی کے لیے سوچیں گے اور عرض کریں گے: پروردگارا! ہمیں کچھ دیر کی مہلت دے دے (وانذر الناس یوم یأتیھم العذاب فیقول الذین ظلموا ربنا اخرنا الی اجل قریب)۔ تاکہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم تیری دعوت قبول کریں اور تیرے رسولوں کی پیروی کریں۔ (نجب دعوتك و نتبع الرسل)۔

لیکن فوراً ان کی بات مسترد کر دی جائے گی اور انہیں یوں پیغام دیا جائے گا کہ ایسا ہونا اب محال ہے، عمل کا دور ختم ہو چکا ہے "کیا تم ہی نہ تھے جو قسم کھایا کرتے تھے کہ تمہاری طاقت زوال پذیر نہیں ہے" (اولم تکونوا اقسمتم من قبل مالکم من زوال)۔

تم وہی نہیں جو ان کے گھروں اور محلات میں رہتے تھے جنہوں نے ظلم کیا تھا (و سکنتم فی مساکن الذین ظلموا انفسھم) جب کہ تم پر حقیقت آشکار ہو چکی تھی کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا (وتبین لکم کیف فعلنا بھم) اور ہم نے تم سے گزشتہ امتوں کی ہلا دینے والی مثالیں بیان کیں (وضربنا لکم الامثال)۔ لیکن ان عبرت انگیز درسوں میں سے کوئی بھی تم پر اثر انداز نہ ہوا اور تم نے اسی طرح اپنے شرمناک اعمال اور ظلم و ستم کا سلسلہ جاری رکھا اور اب جبکہ تم الٰہی کیفر کردار کو پہنچے ہو تو مہلت دیے جانے کا تقاضا کر رہے ہو۔

کیسی مہلت؟ اب موقع ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ پیغمبر اکرمؐ سے خطاب کیوں ہے؟ اس میں شک نہیں کہ پیغمبر کبھی تصور بھی نہیں کرتے کہ خدا ظالموں کے کام سے غافل ہے لیکن اس کے باوجود زیر نظر آیات میں رسول اللہؐ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کہیں یہ گمان نہ کرنا کہ خدا ظالموں کے اعمال سے غافل ہے۔

یہ درحقیقت بالواسطہ طور پر دوسروں کو پیغام دیا گیا ہے اور یہ بھی فصاحت کا ایک فن ہے کہ کبھی کسی ایک شخص کو مخاطب کیا جاتا ہے لیکن مراد دوسرا شخص یا دیگر اشخاص ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ تعبیر دراصل تہدید کے لیے کنایہ ہے۔ مثلاً کبھی ہم کسی قصوروار سے کہتے ہیں: فکر نہ کرو ہم تیری تقصیریں بھول چکے ہیں عین موقع پر ہم تیرا حساب چکائیں گے۔

بہرحال اس دنیا کی اساس اس پر ہے کہ تمام افراد کو کافی حد تک مہلت دی جائے تاکہ جو کچھ ان کے اندر ہے ظاہر ہو جائے اور آزمائش اور تکامل کا میدان وسیع ہو۔ نیز اس لیے ہے کہ کسی کے لیے عذر و بہانہ باقی نہ رہے اور سب کو بازگشت، اصلاح اور تلافی کا موقع دیا جائے۔ اسی لیے گنہگاروں کو مہلت دی جاتی ہے۔

۲۔ ﴿یوم یأتیھم العذاب﴾ سے کونسا دن مراد ہے؟ زیر نظر آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ رسول اللہؐ کو اس بات پر مامور کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو اس دن سے ڈرائیں جس دن عذاب ان کی طرف آئے گا۔ اس دن سے کونسا دن مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین نے تین احتمالات ذکر کیے ہیں:

پہلا یہ کہ یہ قیامت کا دن ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ موت آنے کا دن ہے کہ جس دن عذاب الٰہی کا مقدمہ ظالموں کا رُخ کرے گا۔

تیسرا یہ کہ کچھ دنیاوی سزاؤں کے نزول کا دن ہے۔ مثلاً جس روز قوم لوط، قوم عاد و ثمود، قوم نوح اور فرعونیوں پر عذاب ہوا۔ یہ لوگ دریا کی دھاڑتی ہوئی موجوں کا شکار ہوئے، یا غرقِ طوفان ہوئے، یا زلزلوں سے تباہ ہوئے، یا شدید ویران گر آندھیوں سے برباد ہوئے۔

اگرچہ بہت سے مفسرین نے پہلا احتمال کو ترجیح دی ہے لیکن بعد میں آنے والے جملے واضح طور پر تیسرے احتمال کو تقویت دیتے ہیں اور نشاندہی کرتے ہیں کہ مراد دنیاوی نابود کرنے والے عذاب ہیں ـــ اور ان کا شکار ہونے والے کہتے ہیں کہ پروردگارا! ہمیں تلافی کے لیے تھوڑی سی مہلت دے دے۔

"اخرنا" (ہمیں تاخیر میں ڈال دے) ـــ یہ تعبیر دنیاوی زندگی جاری رکھنے کی درخواست کے لیے واضح قرینہ ہے۔ اگر وہ یہ بات روزِ قیامت آثارِ عذاب دیکھ کر کہتے تو انہیں کہنا چاہیے تھا: خداوندا! ہمیں دنیا کی طرف لوٹا دے، جیسا کہ سورہ انعام کی آیہ ۲۷ میں ہے:

ولو تری اذ وقفوا علی النار فقالوا یالیتنا نرد ولا نکذب بأیات ربنا ونکون من المؤمنین

اگر تو انہیں اس عالم میں دیکھے کہ جب وہ آگ کے سامنے کھڑے ہوں گے تو تو دیکھے گا کہ وہ کہتے ہیں: کاش! ہم دنیا کی طرف پلٹ جاتے اور اپنے پروردگار کی آیات کی تکذیب نہ کرتے اور ہم مومنین میں سے ہو جاتے (تو تجھے ان کی حالت پر افسوس ہوگا)۔

کیونکہ فوراً بعد والی آیت میں ان کا جواب اس طرح دیا گیا ہے:

ولو ردوا لعادوا لما نھوا عنہ و انھم لکاذبون

یہ جھوٹ کہتے ہیں اگر لوٹ بھی جائیں تو انہی اعمال میں مشغول ہو جائیں گے جن سے انہیں روکا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ اگر یہ آیت عذاب دنیا سے ڈرانے کے لیے ہے جب کہ اس سے پہلی آیت "ولا تحسبن اللہ غافلا" میں تو عذاب آخرت سے ڈرایا گیا ہے تو یہ امر ایک دوسرے سے کس طرح سے مناسبت رکھتا ہے؟ نیز لفظ "انما" اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں صرف قیامت میں سزا دی جائے گی اور وہاں ان پر عذاب ہوگا نہ کہ اس دنیا میں۔

لیکن اس نکتے کی طرف توجہ سے جواب واضح ہو جاتا ہے کہ وہ سزا اور عذاب کہ جس میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہے عذاب قیامت ہے جو سب قانون کو لاحق ہوگا لیکن دنیاوی سزائیں ایک تو عمومیت نہیں رکھتیں اور دوسرا بازگشت کے بھی قابل ہیں۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ تباہ کن دنیاوی عذاب — مثلاً وہ المناک عذاب جو قوم نوح یا آل فرعون اور ان جیسے لوگوں کو دامن گیر ہوا۔ ایسا عذاب شروع ہو جائے تو توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور لوٹ آنے کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب گنہگار لوگ ایسی سزاؤں کا سامنا کرتے ہیں تو اظہار پشیمانی کرتے ہیں لیکن یہ درحقیقت ایک اضطراری ندامت ہوتی ہے جس کا کوئی وزن نہیں۔ لہٰذا ایسا عذاب شروع ہونے سے پہلے تلافی کے درپے ہونا چاہیے[1]

۲۔ مہلت کا تقاضا کیوں قبول نہیں کیا جاتا؟ قرآن مجید کی مختلف آیات میں ہے کہ برے عمل کرنے والے اور ظالم مختلف مواقع پر تقاضا کریں گے کہ انہیں اپنے گزشتہ کی تلافی کے لیے پھر سے دنیاوی زندگی مل جائے۔ ان میں سے بعض آیات روز قیامت سے مربوط ہیں مثلاً سورۂ انعام کی آیہ ۲۷ جس کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے۔ بعض دیگر آیات وقت موت آپہنچنے سے مربوط ہیں مثلاً سورہ مومنون کی آیہ ۹۹، ۱۰۰ اس میں فرمایا گیا ہے:

حتّٰی اذا جاء احدھم الموت قال رب ارجعون ○ لعلی اعمل صالحًا فیما ترکت ○

یہی حالت رہتی ہے یہاں تک کہ جب کسی کی موت کا وقت آپہنچتا ہے تو وہ عرض کرتا ہے: خداوندا! مجھے پلٹا دے۔ شاید میں اپنے کیے کی تلافی کر سکوں اور عمل صالح انجام دوں۔

کچھ آیات تباہ کن عذاب کے نزول کے موقع سے مربوط ہیں۔ مثلاً زیر بحث آیات میں ہے کہ نزول عذاب کے وقت ظالم مہلت کا تقاضا کریں گے۔

یہ امر توجہ طلب ہے کہ ان تمام مواقع پر جواب نفی میں ہے۔ اس کی دلیل واضح ہے کیونکہ ان میں سے کوئی تقاضا بھی حقیقی نہیں ہے یہ سب اس اضطراری حالت اور انتہائی پریشانی کا ردعمل ہیں جو ان بدترین افراد کو لاحق ہوگی۔ ان کے یہ تقاضے کسی داخلی انقلاب اور زندگی میں تغیر کے لیے

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۲ سورہ نساء آیہ ۱۸ کی تفسیر کی طرف رجوع فرمائیں۔

عزم حقیقی کی دلیل نہیں ہیں۔

یہ تو بالکل ان مشرکین کی سی حالت ہے جو دریاؤں کے ہولناک گرداب میں پھنس جائیں تو بڑے خلوص سے خدا کو پکارتے ہیں لیکن طوفان کے تھمتے ہی اور ساحل نجات تک پہنچتے ہی سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

اسی لیے قرآن مذکورہ آیات میں صراحت سے کہتا ہے۔

ولو ردوا لعادوا لما نهوا عنه

اگر یہ معمول کی زندگی کی طرف لوٹ جائیں تو پھر وہی طرزِ عمل جاری رکھیں گے ان کی روش میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوگی۔

یعنی — وہی ہے چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔

۴۶۔ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ○

۴۷۔ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ○

۴۸۔ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ○

۴۹۔ وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِى الْاَصْفَادِ ○

۵۰۔ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ○

۵۱۔ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○

۵۲۔ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○

ترجمہ

۴۶۔ انھوں نے اپنا پورا مکر کیا اور ان کے سارے مکر (اور سازشیں) خدا کے سامنے آشکار ہیں اگرچہ ان کے مکر سے پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں۔

۴۷۔ اور یہ گمان نہ کرنا کہ خدا ان وعدوں کی خلاف ورزی کرے گا کہ جو اس نے اپنے رسولوں سے کیے ہیں کیونکہ خدا قادر و منتقم ہے۔

۴۸۔ وہ دن کہ جب یہ زمین دوسری زمین میں بدل جائے گی اور آسمان (دوسرے آسمانوں میں) تبدیل ہو جائیں گے اور خدائے واحد و قہار کی بارگاہ میں ظاہر ہوں گے۔

۴۹۔ اور تو اُس دن مجرموں کو اکٹھا طوق و زنجیر میں دیکھے گا (ایسے طوق و زنجیر جن سے ان کے ہاتھ اور گردنیں اکٹھے بندھی ہوں گی)۔

۵۰۔ اور ان کا لباس قطران (جلانے والا چپکا ہوا بدبودار مادہ) کا ہوگا اور ان کے چہروں کو آگ ڈھانپ لے گی۔

۵۱۔ تاکہ خدا ہر شخص کو جو کچھ اس نے انجام دیا ہے اس کی جزا دے کیونکہ خدا سریع الحساب ہے۔

۵۲۔ یہ (قرآن) (سب) لوگوں کے لیے اعلان ہے تاکہ سب کو تہدید ہو جائے اور (سب) جان لیں کہ وہ اکیلا معبود ہے نیز اس لیے کہ صاحبانِ عقل (اور غور و فکر کرنے والے) نصیحت حاصل کریں۔

تفسیر

ظالموں کی کمزور سازشیں

گزشتہ آیات میں ظالموں کی کچھ سزاؤں کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ ان آیات میں بھی پہلے ان کے بعض کاموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور پھر ان کے لیے بعض سخت اور دردناک سزاؤں کا ذکر ہے۔

پہلی آیت میں ہے: انہوں نے مکر کیا اور جس قدر ان سے بن پڑتا تھا سازش اور شیطنت کی (وقد مکروا مکرھم)۔

خلاصہ یہ کہ تیرے دشمنوں نے اسلام کو مٹانے اور نابود کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ ڈرانے دھمکانے سے لے کر اذیت و آزار اور قتل تک کی سازش کی۔ نیز وہ پراپیگنڈا کرتے رہے اور طرح طرح کی تہمتیں لگاتے رہے۔

لیکن ان سب کے باوجود اللہ ان کی تمام سازشوں سے آگاہ ہے اور ان کے تمام کام اس کے ریکارڈ میں ہیں (وعند اللہ مکرھم)۔

بہرحال پریشان نہ ہو۔ یہ نیرنگیاں، منصوبے اور سازشیں تجھ پر اثر نہیں ڈالیں گی، اگرچہ وہ اپنے مکر سے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹا دیں۔

(وان کان مکرھم لتزول منہ الجبال)۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں "مکر" ہر قسم کی چارہ جوئی اور چارہ اندیشی کے معنی میں ہے۔ یہ کام کبھی برائی کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی اس کے بغیر۔ اگرچہ موجودہ فارسی زبان میں یہ لفظ پہلے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن عربی ادب کے لحاظ سے اس کا معنی عام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی یہ لفظ خدا کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

"عند اللہ مکرھم" کی تفسیر کے بارے میں دو احتمالات ذکر کیے گئے ہیں۔

بعض مفسرین مثلاً علامہ طباطبائی نے المیزان میں کہا ہے کہ اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ خدا ان کے تمام منصوبوں، چالبازیوں اور سازشوں پر پورا احاطہ رکھتا ہے۔

بعض دیگر مثلاً مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان کے مکر کی سزا خدا کے ہاں ثابت ہے لہٰذا یہ جملہ "عند اللہ جزاء مکرھم" کی تقدیر میں ہے اور لفظ "جزاء" جو مضاف ہے محذوف ہے۔

البتہ پہلا معنی بلاشبہ زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہ آیت کے ظاہری مفہوم سے بھی مطابقت رکھتا ہے اور کسی قسم کے حذف و تقدیر کا بھی محتاج نہیں ہے۔

پہلا جملہ کہ جس میں ہے "اگرچہ ان کا مکر پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا دے"، یہ بھی اسی تفسیر کو تقویت دیتا ہے۔ یعنی اگرچہ وہ منصوبہ بندی اور سازشوں میں بڑے طاق ہوں، خدا ان سے زیادہ آگاہ اور زیادہ قدرت والا ہے اور ان کی سازشوں کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

دوبارہ روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے اور ظالموں اور بدکاروں کو دھمکی دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تم یہ گمان نہ کرنا کہ خدا نے انبیاء سے جو وعدہ کیا ہے اس کی خلاف ورزی کرے گا (فلا تحسبن اللہ مخلف وعدہ رسلہ)۔ کیونکہ وعدہ خلافی تو وہ کرتا ہے جو قادر و توانا نہ ہو یا سزا و انتقام اس کی لغت میں نہ ہو لیکن "خدا توانا بھی ہے اور صاحبِ انتقام بھی" (ان اللہ عزیز ذوانتقام)۔

یہ آیت درحقیقت ایک گزشتہ آیت "ولا تحسبن اللہ غافلاً عما یعمل الظالمون" کی تکمیل کرتی ہے۔ یعنی اگر تم دیکھتے ہو کہ ظالموں کو مہلت ملی ہوئی ہے تو وہ اس لیے نہیں کہ پروردگار ان کے اعمال سے غافل ہے اور نہ اس لیے کہ وہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرے گا بلکہ ان کا تمام حساب ایک ہی دن چکا دے گا اور انہیں عادلانہ طور پر سزا دے گا۔

لفظ "انتقام"، موجودہ فارسی میں تلافی کرنا، کینہ رکھنا اور معاف نہ کرنا کا مفہوم بھی لیے ہوئے ہے۔ دراصل اس کا یہ معنی نہیں۔ بلکہ "انتقام" کا مفہوم سزا دینا اور عذاب کرنا ہی ہے۔ ایسی سزا کہ جو خدا استحقاق اور عدالت کی بناء پر دے گا بلکہ انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر خدا کی طرف سے ایسا انتقام نہ ہو تو یہ اس کی حکمت و عدالت کے خلاف ہوگا۔

مزید فرمایا گیا ہے: یہ سزا ایسے دن دی جائے گی جب یہ زمین دوسری زمین میں تبدیل ہو جائے گی اور یہ آسمان دوسرے آسمانوں میں تبدیل ہو جائے گا (یوم تبدل الارض غیر الارض والسمٰوٰت)۔

اس روز ہر چیز تباہی کے بعد نئے سرے سے صورت پذیر ہوگی اور انسان نئے حالات کے ساتھ نئے عالم میں قدم رکھے گا۔ ایسا عالم کہ جس کی تمام چیزیں اس عالم سے مختلف ہوں گی "اس کی وسعت، اس کی نعمتیں اور اس کی سزائیں سب مختلف ہوں گی" اور اس روز جو کچھ بھی کسی کے پاس ہے وہ سب پوری طرح واحد و قہار خدا کے سامنے ظاہر ہو جائے گا (وبرزوا للہ الواحد القہار)۔

"برزوا" اصل میں "براز" (بروزنِ "فراز") کے مادہ سے فضا اور وسیع جگہ کے معنی میں لیا گیا ہے۔ "بروز" کا معنی ایسی اور وسیع علاقہ میں ہونا ہے کہ جس کا لازمی نتیجہ ظاہر اور آشکار ہونا ہے۔ اسی وجہ سے "بروز" عام طور پر "ظہور" کے معنی میں آتا ہے (غور کیجئے گا)۔

روزِ قیامت انسان کے خدا کے سامنے ظاہر ہونے کا کیا معنی ہے، اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں۔

بہت سوں نے اسے قبروں سے نکلنے کے معنی میں لیا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ بروز کا مطلب انسان کے اندر اور باہر کا سب کچھ ظاہر ہو جانا ہو جیسا کہ سورہ مومن کی آیہ ۱۶ میں فرمایا گیا ہے:

یوم ھم بارزون لا یخفیٰ علی اللہ منھم شیء

وہ دن کہ جب ان کا سب کچھ آشکار ہو جائے گا اور ان کی کوئی چیز مخفی نہیں رہے گی۔

نیز سورہ طارق کی آیہ ۹ میں ہے:

یوم تبلی السرائر

وہ دن کہ جب ہر شخص کے اندرونی اسرار آشکار ہو جائیں گے۔

بہرحال اس حالت میں خدا کی قہاریت کا ذکر ہر چیز پر اس کے تسلط اور سب کے اندر اور باہر پر اس کے غلبے کی دلیل ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا دنیا میں کوئی چیز خدا پر مخفی ہے کہ جو وہاں آشکار ہو جائے گی؟ کیا خدا قبروں میں مردوں کے وجود سے بے خبر ہے؟ یا کیا وہ یہاں انسان کے اندرونی اسرار کو نہیں جانتا؟

ایک نکتے کی طرف توجہ سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اس جہاں میں ایک ہمارا ظاہر ہے اور ایک باطن۔ بعض اوقات ہمارے علم کے محدود ہونے کی بنا پر یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ خدا ہمارے باطن کو نہیں جانتا لیکن دوسرے جہان میں ہر چیز اس طرح آشکار ہو جائے گی کہ ظاہر و باطن کا فرق نہیں ہوگا۔ سب کچھ آشکار ہوگا۔ یہاں تک کہ کسی کے دل میں یہ احتمال بھی پیدا نہیں ہوگا کہ ہو سکتا ہے کوئی چیز خدا سے مخفی رہ گئی ہے۔

دوسرے لفظوں میں بروز و ظہور ہماری فکر و نظر کے اعتبار سے ہے نہ کہ علم خدا کے اعتبار سے۔

اگلی آیت میں مجرمین کی حالت کی ایک اور پہلو سے تصویر کشی کی گئی ہے: اس روز تو مجرموں کو دیکھے گا کہ وہ طوق و زنجیر میں جکڑے ہوں گے۔ ان کے ہاتھ گردنوں سے بندھے ہوں گے اور وہ ایک دوسرے سے بھی بندھے ہوں گے (وترى المجرمين يومئذ مقرنين في الاصفاد)۔

"اصفاد" جمع ہے "صفد" (بروزن "نمد") کی اور "صفاد" (بروزن "معاد") طوق کے معنی میں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ "صفاد" خاص طور پر اس طوق و زنجیر کو کہتے ہیں جو ہاتھ اور گردن کو ایک دوسرے سے باندھ دے۔

"مقرنین" "قرن" اور "اقتران" کے مادہ سے اسی معنی میں ہے۔ البتہ جب اسے باب تفعیل میں منتقل کیا جائے تو اس سے "تکثیر" کا مفہوم حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا "مقرنین" کا معنی ہے، "وہ لوگ جو ایک دوسرے کے بہت قریب ہوں"۔

اس لفظ سے زیر نظر آیت میں کون لوگ مراد ہیں۔ اس سلسلے میں مفسرین نے تین تفسیریں ذکر کی ہیں۔

پہلی: یہ کہ اس روز مجرمین کو طوق و زنجیر کے ایک لمبے سلسلے میں ایک دوسرے سے باندھا جائے گا وہ لوگ اسی حالت میں میدان حشر میں پیش ہوں گے۔ طوق و زنجیر کا یہ سلسلہ ان گنہگاروں کے عملی و فکری رشتے اور تعلق کا مظہر ہے۔ اس تعلق کی بنا پر وہ اس جہان میں باہم ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے، ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے اور ظلم و فساد کی راہ میں ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ ان کا یہ باہمی ربط وہاں طوق و زنجیر کے اس سلسلے میں مجسم ہوگا۔

دوسری: تفسیر یہ ہے کہ اس روز مجرم زنجیروں کے ذریعے شیطانوں کے ساتھی ہو جائیں گے اور اس دنیا میں ان کا باطنی تعلق اس جہان میں ایک زنجیر کے ذریعے آشکار ہو جائے گا۔

تیسری: تفسیر یہ ہے کہ زنجیروں کے ذریعے ان کے ہاتھوں کو ان کی گردن کا قرین بنا دیا جائے گا۔

کوئی مضائقہ نہیں کہ مجرموں کے بارے میں یہ سب معانی صحیح ہوں اگرچہ آیت کا ظاہری مفہوم زیادہ تر پہلے معنی کی تائید کرتا ہے۔

اس کے بعد ان کے لباس کے بارے میں بتایا گیا ہے اور یہ بھی ان کے لیے ایک عذاب عظیم ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان کے لباس قطران کے مادہ سے بنے ہوئے ہوں گے اور ان کے چہروں کو آگ کے شعلے ڈھانپ لیں گے (سرابیلھم من قطران وتغشی وجوھھم النار)۔

"سرابیل" "سربال" (بروزنِ "مشعال") کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے "قمیص" چاہے وہ کسی بھی چیز سے بنی ہو۔ نیز بعض نے کہا ہے کہ یہ ہر قسم کے لباس کے معنی میں ہے لیکن پہلا معنی زیادہ مشہور ہے۔

"قطران" لغت میں کبھی قاف پر زبر اور طاء پر سکون اور کبھی قاف کے نیچے زیر اور طاء پر سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اس کا معنی ہے ایسا مادہ جو ابہل نامی درخت سے لیا جاتا ہے۔ پھر اسے سخت کرنے کے لیے جوش دیا جاتا ہے اور پھر اسے "جرب" نامی بیماری کے موقع پر اونٹ کے بدن پر ملا جاتا ہے تاکہ اس بیماری کے باعث ہونے والی سوزش کو ختم کیا جا سکے اور اس کے مادہ کو جڑ سے ختم کیا جا سکے۔ بہرحال یہ ایک ایسا بدبودار سیاہ رنگ مادہ ہے جو شعلہ ور ہو سکتا ہے۔[1][2]

بہرکیف "سرابیلھم من قطران" کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے بدن لباس کی بجائے ایک طرح کے سیاہ رنگ بدبودار جل اٹھنے والے مادے سے ڈھانپے جائیں گے۔ گویا یہ لباس ہوگا جو ویسے بھی برا ہوگا اور دیکھنے میں بھی بہت قبیح ہوگا، بدبو بھی دے گا اور خود بخود جل اٹھنے والا بھی ہوگا۔ جب لباس میں یہ چار عیب ہوں گے تو گویا وہ بدترین لباس ہوگا۔ کیونکہ لباس زینت کے لیے بھی ہوتا ہے اور گرمی سردی سے بچنے کے لیے بھی جبکہ یہ لباس برا اور قبیح صورت بھی ہوگا اور جلانے والا بھی۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہ گناہ گار جو اس جہان میں بارگاہِ الٰہی میں بھی اپنے تئیں روسیاہ کرتے ہیں اور ان کے گناہ کا تعفن اس معاشرے کو بھی آلودہ کرتا ہے۔ نیز ان کے اعمال اس معاشرے میں فساد و گناہ کی آگ بھڑکانے کا باعث بنتے ہیں۔ یہ "قطران" کہ جس کا لباس انہیں اس جہان میں پہنایا جائے گا گویا ان کے اس جہان کے اعمال کی تجسیم ہے۔

یہ جو آیت میں ہے کہ آگ کے شعلے ان کے چہروں کو ڈھانپ لیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس حصے پر "قطران" نہیں ہوگا وہ اس کے شعلوں میں جلے گا۔

یہ اس لیے ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ ہر شخص کو اس کے کیے کے مطابق جزا دے (لیجزی اللہ کل نفس ما کسبت)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ "انہیں ان کے اعمال کی جزا دے گا" بلکہ کہتا ہے کہ جو کچھ انہوں نے انجام دیا ہے، انہیں جزا کے طور پر دے گا۔ دوسرے لفظوں میں ان کی جزا ان کے اعمال مجسم ہوتا ہے۔ اس خاص تعبیر کے باعث یہ آیت تجسیم اعمال کی ایک اور دلیل ہے۔

آخر میں فرمایا گیا ہے: اللہ سریع الحساب ہے (ان اللہ سریع الحساب)۔

بالکل واضح ہے کہ جب انسان کے اعمال ختم نہ ہوں اور چہرہ بدل کر انسان کے پاس آ جائیں تو اس سے زیادہ جلدی حساب اور کیا ہوگا اور در اصل انسان کا حساب اس کے ساتھ ساتھ ہی ہے۔

---

1. تفسیر کبیر فخرالدین رازی جلد ۱۹ صفحہ [illegible]۔
2. فرید وجدی دائرۃ المعارف میں قطران کے مادہ میں کہتا ہے: یہ ایسا مائع ہے جو پتھر کے کوئلے کی تقطیر کے وقت ہاتھ آتا ہے جبکہ ایک خاص گیس حاصل کرنے کے لیے عمل تقطیر کیا جاتا ہے اور نباتی قطران بعض درختوں سے لیا جاتا ہے۔

بعض روایات میں ہے۔

ان اللہ تعالیٰ یحاسب الخلائق کلھم فی مقدار لمح البصر

اللہ تعالیٰ چشم زدن میں تمام مخلوقات کا حساب کرے گا۔

اصولی طور پر پروردگار کی طرف سے محاسبہ مدت کا محتاج نہیں۔ مذکورہ بالا روایت نے دراصل مختصر ترین زمانے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۱ ص ۴۹۵ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

یہ سورہ اور تمام قرآن چونکہ لوگوں کو دعوت توحید دیتا ہے، احکام الٰہی کی تبلیغ کرتا ہے اور احکام الٰہی کی خلاف ورزیوں سے ڈراتا ہے لہٰذا اس سورہ کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے، قرآن کا ابلاغ سب لوگوں کے لیے عمومی ہے (ھٰذا ابلاغ للناس) - اور انہیں ڈرانے والا ہے (ولینذروا بہ)۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ جان لیں کہ ان کا معبود بس وہی ایک ہے (ولیعلموا انما ھو الٰہ واحد)۔ نیز ہدف یہ ہے کہ صاحبان عقل و فکر متوجہ ہوں (ولیذکر اولوا الالباب)۔

چند اہم نکات

۱۔ زمین اور آسمان بدل جائیں گے: زیر نظر آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ قیامت میں یہ زمین کسی دوسری زمین میں اور اسی طرح آسمان دوسرے آسمانوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔

کیا اس تبدیلی سے مراد ذاتی وجود کی تبدیلی ہے یعنی کیا یہ زمین بالکل نابود ہو جائے گی اور کوئی دوسری زمین خلق کردی جائے گی اور قیامت اس زمین میں برپا ہو گی یا مراد صفات کی تبدیلی ہے یعنی یہ کرۂ خاکی اور یہ آسمان ویران ہو جائیں گے اور ان کے ویرانوں پر نئے زمین و آسمان پیدا ہوں گے جو اس زمین و آسمان کی نسبت تکامل وارتقاء میں زیادہ ہوں گے۔!

قرآن مجید کی بہت سی آیات کا ظاہری مفہوم دوسرے معنی کی تائید کرتا ہے۔

سورہ فجر کی آیہ ۲۱ میں ہے:

کلا اذا دکت الارض دکا دکا

ایک ایسا وقت آئے گا کہ زمین درہم برہم ہو جائے گی۔

سورہ زلزال میں اس جہان کے اختتام اور قیامت کے آغاز کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اذا زلزلت الارض زلزالھا ۝ واخرجت الارض اثقالھا ۝

جب زمین میں زلزلہ آئے گا اور وہ اپنے مخفی بوجھ اگل دے گی۔

سورہ حاقہ کی آیت ۱۴ اور ۱۵ میں ہے:

وحملت الارض والجبال فدکتا دکۃ واحدۃ ۝ فیومئذ وقعت الواقعۃ ۝

زمین اور پہاڑ اپنی جگہ سے اٹھا لیے جائیں گے اور وہ درہم برہم ہو جائیں گے اور اس روز وہ عظیم واقعہ رونما ہو گا۔

سورۂ طٰہٰ کی آیات ۱۰۵ تا ۱۰۸ میں -

ويسئلونك عن الجبال فقل ينسفها ربي نسفا ○ فيذرها قاعا صفصفا ○ لا ترى فيها عوجا ولا امتا ○ يومئذ يتبعون الداعي لا عوج له وخشعت الاصوات للرحمٰن فلا تسمع الا همسا ○

تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو میرا پروردگار انہیں سرگرداں اور ریزہ ریزہ کردے گا اور پھر انہیں ہموار زمین کی صورت دے گا اس طرح کہ تجھے اس میں کوئی ٹیڑھ پن اور پستی و بلندی نظر نہیں آئے گی۔ اس روز لوگ اس پکارنے والے کی پیروی کریں گے کہ جس سے انحراف نہیں ہو سکے گا اور مہربان خدا کے سامنے آوازیں جھکی ہوں گی اور تجھے دھیمی دھیمی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دے گا۔

سورہ تکویر کی ابتداء میں بھی چراغ آفتاب گل ہو جانے، ستاروں کے تاریک ہو جانے اور پہاڑوں کے چلنے کا تذکرہ ہے۔
نیز سورہ انفطار کے آغاز میں بھی آسمانوں کے پھٹ جانے، ستاروں کے بکھر جانے اور مردوں کے قبروں سے اُٹھنے (غور کیجئے گا) کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

یہ آیات اور ایسی بہت سی آیات کو مجموعی طور پر دیکھا جائے اور اسی طرح انسان کے قبروں سے اٹھنے کے متعلق آیات کو نظر رکھا جائے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کا موجودہ نظام اس صورت میں باقی نہیں رہے گا لیکن یہ بالکل نابود بھی نہیں ہو گا بلکہ زمین درہم برہم ہو کر ہموار اور صاف ہو جائے گی اور لوگ گویا ایک نئی زمین پر قدم رکھیں گے۔ البتہ واضح ہے کہ وہ زمین کامل تر اور عالی تر ہو گی کیونکہ اس عالم کی تمام چیزیں اس جہان کی نسبت زیادہ وسیع اور زیادہ کامل ہوں گی۔

فطری امر ہے کہ ہمارا آج کا جہان قیامت کے مناظر قبول کرنے کی استعداد نہیں رکھتا اور قیامت اور دوسرے جہان میں ہماری زندگی کے لیے تنگ اور محدود ہے اور جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے شاید اس جہان کی نسبت اس جہان سے اسی طرح ہے جیسے رحم مادر کی زندگی کی نسبت ہماری اس زندگی سے۔

بعض آیات میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن اس دنیا کے دنوں کی نسبت بہت طویل ہوں گے۔[2] یہ امر بھی اس حقیقت پر ایک اچھا شاہد ہے۔

البتہ ہم اس جہان کی تفصیلات کی تصویر کشی اس جہان میں نہیں کر سکتے جیسے شکم مادر میں بچہ سب کچھ بھی رکھتا ہو تو بھی باہر کی دنیا کی خصوصیات نہیں سمجھ سکتا۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں اس جہان میں ایک عظیم تغیر ہو گا۔ یہ جہان بالکل ویران ہو کر بالکل ایک نئے جہان میں بدل جائے گا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مصادر اسلامی میں موجود متعدد روایات میں ہے کہ اس وقت زمین اور مرحلہ محشر طیب و پاک اور سفید روٹی میں بدل جائے گا کہ انسان جسے کھا سکیں گے تا کہ ان کا حساب واضح ہو جائے اور ہر کوئی اپنے انجام کی طرف چل پڑے۔
تفسیر نور الثقلین میں یہ روایات مختلف حوالوں سے درج کی گئی ہیں[3]

---

[1] یٰسین ۔ ۵۱ ، قمر ۔ ۷ ، معارج ۔ ۴۳ ، حج ۔ ۷ ، وغیرہ ۔

[2] معارج ۔ ۴ ۔

[3] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۵۵۵ تا ص ۵۵۶ ۔

اہلِ سنت کے بعض مفسرین مثلاً قرطبی نے بھی اسی آیت کے ذیل میں ایسی روایات کی نشاندہی کی ہے[1]

بعید نہیں کہ ان روایات سے مراد یہ ہو کہ اس جہان میں زمین بجائے اس کے کہ مٹی نے اسے ڈھانپ رکھا ہو ایک ایسا غذائی مادہ اس پر محیط ہو کہ جو بدن انسانی کا حصہ بن سکتا ہو۔ کیونکہ مٹی ایسی چیز نہیں جو بدن انسانی کا حصہ بن سکے بلکہ اس میں موجود غذائی مواد نباتات کے ذریعے باہر نکلتا ہے تاکہ بدن انسانی کا حصہ بننے کے قابل ہو سکے لیکن اس روز سطح زمین پر مٹی کی بجائے ایسا مادہ محیط ہو گا جو آسانی سے جزوِ بدن بن سکے اسے روٹی سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ انسان کی غذا کا زیادہ تر حصہ روٹی پر ہی مشتمل ہوتا ہے (غور کیجئے گا)۔

۲۔ **سورہ ابراہیم کا آغاز اور اختتام**: جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے سورہ ابراہیم قرآن کے ایک حساس موضوع سے شروع ہوتی ہے اور یہ موضوع ہے انسان کو جہالت و شرک کے اندھیروں سے علم و توحید کے اجالوں کی طرف نکال لے جانا۔ اس سورت کا اختتام تمام لوگوں کو جہالت و شرک کے نتائج سے ڈرانے، تعلیم توحید اور اولوا الالباب کو متوجہ کرنے پر ہوتا ہے۔

اس ابتداء اور انتہا سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جو کچھ بھی ہم چاہتے ہیں وہ اسی قرآن میں موجود ہے۔ حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

فیہ ربیع القلب و ینابیع العلم

دلوں کی بہار اور علوم و دانش کے سوتے اسی قرآن سے پھوٹتے ہیں[2]

اسی طرح تمام فکری، اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی بیماریوں کا علاج اسی قرآن میں تلاش کرنا چاہیے۔ بقول امیرالمومنین:

فاستشفوہ من ادوائکم

اسی قرآن سے اپنی بیماریوں کی دوا حاصل کرو[3]

یہ بیان اس امر کی دلیل ہے کہ آج کے مسلمان جو سمجھتے ہیں کہ قرآن صرف ایک اخلاقی مقدس کتاب ہے جو پڑھنے اور ثواب حاصل کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے اس کے برعکس یہ ایک ایسی کتاب ہے جو انسانوں کی ساری زندگی کے دستور العمل کے طور پر نازل ہوتی ہے۔ یہ آگہی عطا کرنے والی اور بیدار کرنے والی کتاب ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ ایسی کتاب ہے جو عالم اور دانشور کو متوجہ کرتی ہے اور عامۃ الناس اس سے ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ چاہیے کہ یہ کتاب مسلمانوں کی زندگی میں جگہ پائے اور ان کی زندگی کا آئین بن جائے۔ نیز ضروری ہے کہ یہ کتاب ہمیشہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر عمل کرنے کے لیے تحقیق، مطالعہ اور غور و خوض کا موضوع بنی رہے۔ مسلمانوں کے زوال اور پسماندگی کا موثر عامل اور سبب یہ ہے کہ انہوں نے اس عظیم آسمانی کتاب کو فراموش کر دیا ہے اور شرق و مغرب کے انحرافی مکاتبِ فکر کی طرف رُخ کر لیا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے کیا عمدہ ارشاد فرمایا ہے:

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۵ صفحہ ۳۶۹۳

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶۔

[3] نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶۔

واعلموا انه ليس على احد بعد القرآن من فاقة ولا لاحد قبل القرآن من غنى

یقین جانیے کہ آپ میں سے کوئی شخص بھی حامل قرآن ہو جائے تو اسے ذرہ بھر فقر و احتیاج نہیں رہے گی اور حامل قرآن ہونے سے پہلے بے نیازی اور تونگری ممکن نہیں۔[1]

کس قدر دردناک ہے ـــ قرآن سے ہماری بے گانگی اور بیگانوں کی قرآن سے آشنائی۔

کس قدر تکلیف دہ ہے ـــ کہ بہترین وسیلۂ سعادت ہمارے گھر میں موجود ہے اور ہم اس سعادت کے لیے دنیا کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔

کس قدر اندوہناک ہے ـــ کہ آبِ حیات کا چشمہ ہمارے پاس ہو اور ہم تشنہ کام جان دے دیں یا تپتے ہوئے بے آب بیابانوں میں سراب کے پیچھے بھاگتے رہیں۔

خداوندا! ہمیں وہ عقل و ایمان عطا فرما کہ جس کے ذریعے ہم سعادت کا یہ عظیم وسیلہ کھو نہ بیٹھیں جو تیری راہ کے شہداء نے ہم تک پہنچایا ہے۔

اور ہمیں وہ شعور مرحمت فرما کہ ہم جان لیں کہ ہماری گمشدہ متاعیں اسی عظیم کتاب میں ہیں ـــ

تاکہ ہم کبھی اس کے سامنے اور کبھی اُس کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاتے پھریں۔

۳۔ اوّل و آخر ـــ توحید: زیر نظر آیات کا ایک اور پہلو توحید پر تاکید ہے۔ یہاں آخری ذکر بھی توحید کا ہے اور اسی کی طرف اولوا الالباب کو متوجہ کیا گیا ہے۔

جی ہاں ـــ توحید اسلام کی عمیق بنیاد ہے۔ عقیدۂ توحید اسلام کا وہ شجرہ ہے جس کی جڑیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ اسلامی تعلیم و تربیت کے سب راستے اسی پر اختتام پذیر ہوتے ہیں ـــ اسلام کی ابتداء بھی توحید ہے اور انتہا بھی توحید۔ اسلام کا تانا بانا توحید ہی سے بنا گیا ہے۔ توحید کا تعلق فقط معبود اور اللہ کے عقیدے ہی سے نہیں بلکہ اس کے ہر نظریے، عقیدے اور پروگرام کا ہدف بھی توحید ہے ـــ ہر ایک کی بنیاد توحید پر ہے۔

آج مسلمانوں کی عظیم ابتلا کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے توحید کو عملی طور پر اسلام سے حذف کر دیا ہے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عرب ممالک ـــ کہ جہاں اسلام پروان چڑھا ـــ آج شرک آلود نعروں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ آج وہ نسل پرستی، عرب تفاخر، احیاء عربیت اور عظمتِ عرب کے بھنور میں گرفتار ہیں۔ اسی طرح دوسرے ممالک میں سے بھی ہر کسی نے اپنے لیے اسی قسم کا کوئی بت تراش لیا ہے۔ انہوں نے اسلامی توحید کو اپنے سے بالکل الگ کر دیا ہے کہ جس نے کسی وقت مشرق و مغرب کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا تھا۔ اس طرح یہ سب ممالک اپنے آپ میں ڈوب کر خود اپنے آپ سے بے گانہ ہو گئے ہیں۔ حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ان کی آپس میں جنگ خون کے پیاسے دشمنوں سے کہیں زیادہ ہے۔

یہ بات کتنی شرمناک ہے کہ ہم دیکھیں کہ عرب ممالک کی باہمی جنگوں میں مرنے والوں کی تعداد اسرائیلی یہودیوں کے مقابلے میں مرنے والوں

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶۔

سے کہیں زیادہ ہے۔ اس وقت جب کہ ان کا ایک مشترک خطرناک دشمن ہے تو ان کے انتشار کا یہ عالم ہے اگر ایسا دشمن نہ ہوتا تو ان کی کیا حالت ہوتی۔

اس وقت جب کہ ہم تفسیر کا یہ حصہ لکھ رہے ہیں حکومت عراق نے بڑی بے رحمی سے اسلامی جمہوریہ ایران پر حملہ کر دیا ہے اور بہانہ بھی اس کے پاس سرحد کا معمولی سا تنازعہ ہے جو یقیناً مذاکرات سے حل ہو سکتا تھا۔ یہ وہی حکومت عراق ہے جس نے اسرائیلی سپاہیوں پر آج تک ایک گولی بھی نہیں چلائی۔ آج اس نے اس سفاکی سے حملہ کیا ہے کہ جیسے ان دو قوموں کا آپس میں کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ جیسے یہ نہ آپس میں ہمسایہ ہیں، نہ ان میں تہذیب و ثقافت کا کوئی رشتہ ہے اور نہ گہرا دینی تعلق ہے۔

ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ مشترک دشمن ـــــ یہودی ـــــ خوش ہو کر کہتا ہے:

اس سے بہتر منصوبے کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ عراق ایران پر حملہ کر دے اور دونوں میں شدید تباہ کن طولانی جنگ شروع ہو جائے ـــــ اور ہمیں ایک مدت کے لیے آسودگی مل جائے۔

یہ وہ مقام ہے کہ ایک موحد، متعہد اور صاحب ایمان مسلمان پر لازم ہے کہ ان ماجوزوں کا شر ختم کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو ـــــ ایسے شرک آلود، نفاق ڈالنے والوں، تباہیاں پھیلانے والوں اور دشمن کو خوش کرنے والوں کو قعر جہنم میں پہنچائے۔

سورہ ابراہیم کی تفسیر اختتام کو پہنچی

بت شکن پیغمبر

ابراہیم علیہ السلام

کی زندگی پر ایک نظر

حضرت ابراہیمؑ

یہی وہ سورت ہے جو قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے موسوم ہے اگرچہ ان کے حالاتِ زندگی صرف اسی سورت میں نہیں ہیں بلکہ مختلف مناسبتوں سے دیگر سورتوں میں بھی خدا کے اس عظیم پیغمبر کا ذکر موجود ہے۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ مکتبِ توحید کے اس ہیرو کی پُر افتخار زندگی کے مختصر حالاتِ زندگی اس سورہ کے آخر میں بیان کردیں تاکہ اس سلسلے میں بعد میں آنے والی مختلف آیات کی تفسیر میں قارئین محترم کے لیے مددگار ثابت ہو سکیں کیونکہ ان میں حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل کی ضرورت پیش آئے گی۔

زندگی کے تین دَور

حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کو واضح طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ قبلِ بعثت کا دَور۔

۲۔ دورِ نبوت اور بابل کے بت پرستوں سے مقابلہ۔

۳۔ بابل سے ہجرت اور مصر، فلسطین اور مکہ میں مساعی کا دَور۔

بچپن

حضرت ابراہیمؑ بابل میں پیدا ہوئے۔[1] یہ دنیا کا حیرت انگیز اور عمدہ خطہ تھا۔ اس پر ایک ظالم و جابر اور طاقتور حکومت مسلط تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے آنکھ کھولی تو بابل پر نمرود جیسا جابر و ظالم بادشاہ حکمران تھا۔ وہ اپنے آپ کو بابل کا بڑا خدا سمجھتا تھا۔

البتہ بابل کے لوگوں کے لیے یہی ایک بت نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں مختلف مواد کے بنے ہوئے مختلف شکلوں کے کئی ایک بت تھے۔ وہ ان کے سامنے جھکتے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔

حکومت وقت سادہ لوح افراد کو بیوقوف بنانے اور انہیں افیون زدہ رکھنے کے لیے بت پرستی کو ایک مؤثر ذریعہ سمجھتی تھی لہٰذا وہ بت پرستی کی سخت حامی تھی۔ وہ کسی بھی بت کی اہانت کو بہت بڑا ناقابلِ معافی جرم قرار دیتی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ کی ولادت کے سلسلے میں مؤرخین نے عجیب و غریب داستان نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

بابل کے نجومیوں نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک ایسا بچہ پیدا ہوگا جو نمرود کی غیر محدود طاقت سے مقابلہ کرے گا۔ لہٰذا اس نے اپنی تمام قوتیں اس بات پر صرف کردیں کہ ایسا بچہ پیدا نہ ہو۔ اس کی کوشش تھی کہ ایسا بچہ پیدا ہو بھی جائے تو اسے قتل کردیا جائے۔ لیکن اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور یہ بچہ آخرکار پیدا ہوگیا۔

اس بچے کی جائے ولادت کے قریب ہی ایک غار تھی۔ اس کی ماں اس کی حفاظت کے لیے اسے اس میں لے گئی اور اس کی پرورش

---

[1] بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ آپ ملک بابل کے شہر اُور میں پیدا ہوئے۔

ہونے لگی ۔ یہاں تک کہ اُس کی عمر کے تیرہ برس وہیں گزر گئے ۔

اب بچہ نمرود کے جاسوسوں سے بچ بچا کر نوجوانی میں قدم رکھ چکا تھا ۔ اُس نے ارادہ کیا کہ اس عالم تنہائی کو چھوڑ دیا جائے اور لوگوں تک وہ درس توحید پہنچائے جو اُس نے باطنی الہام اور فکری مطالعے سے حاصل کیا تھا ۔

بت پرستوں سے مقابلہ

بابل کے لوگ اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بتوں کے علاوہ سورج ، چاند اور ستاروں جیسے آسمانی موجودات کی پرستش کرتے تھے ۔

حضرت ابراہیمؑ نے عزم صمیم کر لیا کہ واضح منطق اور استدلال کے ذریعے ان کے خوابیدہ وجدان کو بیدار کیا جائے اور ان کی پاک فطرت کے چہرے سے غلط تعلیمات کے تاریک پردے ہٹا دیئے جائیں تاکہ نورِ فطرت چمک اٹھے اور وہ توحید پرستی کے راستے پر گامزن ہو سکیں ۔

انہوں نے مدتوں آسمان و زمین کی خلقت پر غور کیا تھا ، ان پر حکمران قدرت کا مطالعہ کیا تھا اور آسمان و زمین کے شگفت انگیز اور تعجب خیز نظام کے بارے میں فکر کی تھی ۔ نورِ یقین ان کے دل میں چمک رہا تھا (انعام ـ ۷۵) ۔

منطق و استدلال کے سہارے

پہلے انہیں ستارہ پرستوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ "زہرہ" ، ستارہ کو جو غروب آفتاب کے ساتھ ہی افق مغرب پر چمک اٹھتا ہے ، یہ لوگ اس کی پرستش و تعظیم میں مشغول تھے ۔

حضرت ابراہیمؑ نے استفہام انکاری کے طور پر یا ان کے نظریے کو غلط ثابت کرنے کے لیے ہم آہنگی کے اظہار کے طور پر پہلے کہا : یہ میرا خدا ہے ۔

لیکن جس وقت وہ غروب ہو گیا تو کہا : مجھے غروب ہو جانے والے اچھے نہیں لگتے ۔

جس وقت چاند افق کا سینہ چاک کر کے اُبھرا اور چاند کی پرستش کرنے والوں نے مراسم عبادت شروع کیے تو ان کے ساتھ ہم صدا ہو کر کہنے لگے : یہ میرا خدا ہے ۔

اور جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا : اگر میرا پروردگار میری راہنمائی نہ کرے تو میں تو گمراہوں میں سے ہو جاؤں ۔

آفتاب نے شب تیرہ کا پردہ ہٹایا اور کوہ و صحرا پر اپنی طلائی شعاعیں چھڑکیں تو سورج پرست عبادت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ۔

اس پر ابراہیمؑ نے کہا : یہ میرا خدا ہے ، یہ تو ان سب سے بڑا ہے ۔

مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو گویا ہوئے : اے قوم ! میں ان شریکوں سے بیزار ہوں کہ جو تم نے خدا کے لیے بنا رکھے ہیں ۔ یہ تو سب غروب ہو جاتے ہیں ، یہ تو سب خوبصورت تغیر و تبدل کا شکار اور قوانین آفرینش کے اسیر ہیں ۔ ان کے تو اپنے بس میں کوئی ارادہ و اختیار نہیں چہ جائیکہ یہ خود اس جہان کے خالق اور اسے گردش دینے والے ہوں ۔ میں تو اپنا رُخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اس کے لیے میں اپنے ایمان میں خالص اور ثابت قدم ہوں اور میں ہرگز مشرکین میں شامل نہ ہوں گا (انعام ـ ۷۵ تا ۷۹) ۔

ابراہیمؑ نے بت پرستوں سے مقابلہ نہایت خوبصورتی سے جیت لیا ۔ کچھ لوگ بیدار ہو گئے اور باقی کم از کم اپنے عقائد کے بارے میں

شک و شبہ میں پڑ گئے۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ملاتے میں اس بات کی دھوم ہو گئی کہ کوئی سوچتا کہ یہ جوان کون ہے، اس کی باتیں کتنی منطقی ہیں، اس کا پیغام کتنا دلنشین ہے، اس کی آواز تو عوام کے دلوں میں اترتی جاتی ہے۔

آزر سے گفتگو

ایک اور مرحلا آیا۔ ابراہیم کی اپنے چچا آزر سے بحث ہونے لگی۔ کبھی بہت مضبوط انداز سے، محبت کے سلیقے سے اور کبھی تنبیہ و سرزنش کے لہجے میں، آپ نے اسے بت پرستی کے بارے میں خبردار کیا اور اس سے کہا، تو ایسی چیز کی پرستش کیوں کرتا ہے جو نہ سن سکتی ہے، نہ دیکھ سکتی ہے اور نہ ہی تیری کوئی مشکل حل کر سکتی ہے؟

آپ نے چچا سے کہا: اگر تو میری پیروی کرے تو میں تجھے سیدھی راہ کی طرف ہدایت کروں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر تو شیطان کی پیروی کرتا ہے تو کہیں تجھے عذاب الٰہی دامن گیر نہ ہو جائے۔

یہاں تک کہ ان کا چچا ان نصیحتوں کے جواب میں انہیں سنگسار کرنے کی دھمکی دیتا۔ آپ "سلام علیک" کہتے ہوئے اسے جواب دیتے: میں تمہارے لیے استغفار کروں گا۔

اس طرح آپ کوشش کرتے کہ اس سنگدل کے دل میں کوئی گنجائش نکل آئے۔ (مریم - ۴۷)

دورِ نبوت

حضرت ابراہیم کب مبعوث بنبوت ہوئے، اس سلسلے میں ہمارے پاس کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے۔ البتہ سورہ مریم سے بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ نے اپنے چچا آزر سے بحث چھیڑی تو آپ مقام نبوت پر فائز ہو چکے تھے کیونکہ سورہ کہتی ہے:

واذکر فی الکتاب ابراھیم انه کان صدیقًا نبیًاه اذ قال لابیه یا ابت لم تعبد ما لا یسمع و لا یبصر و لا یغنی عنك شیئًاه (مریم - ۴۱، ۴۲)

ہم جانتے ہیں کہ یہ واقعہ بت پرستوں کے ساتھ شدید معرکہ آرائی اور آپ کو آگ میں ڈالے جانے سے پہلے کا ہے۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ آگ میں ڈالے جانے کے وقت حضرت ابراہیم کی عمر ۱۶ سال تھی۔ ہم اس کے ساتھ یہ اضافہ کرتے ہیں کہ یہ عظیم کار رسالت آغاز جوانی ہی میں آپ کے دوش پر آن پڑا تھا۔

عملی مقابلے کا آغاز

بہرحال بت پرستوں کے ساتھ حضرت ابراہیم کی معرکہ آرائی روز بروز شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ایک مناسب موقع پا کر آپ نے بابل کے بت خانے کے بڑے بت کے علاوہ تمام بت توڑ دیئے۔ یہاں سے زبانی محاذ آرائی عملی مقابلے کی شکل اختیار کر گئی۔

سلطانِ جابر کے سامنے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مخالفت اور محاذ آرائی کا ماجرا آخر کار نمرود کے کان تک پہنچ گیا۔ آپ کو دربار میں حاضر کیا گیا تاکہ وہ بزعم خویش پند و نصیحت کے ذریعے، یا ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے یا پھر دھمکی سے کام لے کر انہیں خاموش کر دے۔

نمرود بہت چالاک تھا۔ اس نے حضرت ابراہیمؑ سے پوچھا: اگر تو ان بتوں کی پوجا نہیں کرتا تو پھر تیرا پروردگار کون ہے؟

آپؑ نے کہا: وہی ___ جس کے قبضے میں موت و حیات ہے۔

وہ چالاک کہنے لگا: اے بے خبر! یہ تو میرے ہاتھ میں ہے۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ میں مجرم کو قتل کی سزا ملی ہو میں اسے آزاد کر دیتا ہوں اور ایسے قیدی کو بے قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، میں چاہوں تو اسے قتل کر دیتا ہوں۔

حضرت ابراہیمؑ دندان شکن جواب میں بہت ماہر تھے۔ نبوت کی طاقت سے مدد لیتے ہوئے آپؑ نے اس سے کہا: خدا کے ہاتھ میں صرف موت و حیات ہی نہیں بلکہ تمام عالم ہستی اس کے تابع فرمان ہے۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ ہر صبح سورج اس کے حکم سے افق مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور وقتِ شام اس کے حکم سے مغرب میں ڈوب جاتا ہے۔ اگر تو عالم ہستی کی اس وسعت کا فرماں روا ہے تو کل معاملہ اس کے برعکس کر دے تاکہ سورج مغرب سے نکلے اور مشرق میں ڈوب جائے۔

نمرود مبہوت ہو گیا۔ ایسا چکرایا کہ اس کی زبان میں جواب کی سکت نہ رہی (بقرہ ـ ۲۵۸)

اس میں شک نہیں کہ ابراہیمؑ خوب جانتے تھے کہ موت و حیات پر قدرت کے بارے میں نمرود کا دعویٰ بس چکر بازی اور تیز طراری ہے لیکن استدلال پر آپ کی عبارت اجازت نہ دیتی تھی کہ اسی موضوع پر بات کرتے رہیں کہ جسے مکار دشمن نے دستاویز بنالیا ہے لہٰذا اسے چھوڑ کر فوراً ایسے موضوع پر بات شروع کی کہ جس پر وہ ہاتھ پاؤں مارنے کی طاقت بھی نہ رکھتا تھا۔

ہجرت

آخر کار نمرود کی ظالم حکومت کی مشینری کو اس بات کا احساس ہوا کہ یہ جوان آہستہ آہستہ حکومت کے لیے خطرے کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ انہوں نے سوچا کہ اس کی زبانِ گویا، فکرِ توانا اور منطق رسا کہیں پسے ہوئے محروم عوام کی بیداری اور آگاہی کا باعث نہ بن جائے کہیں لوگ استعمار کی زنجیر توڑ کر ان کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں لہٰذا حکومت نے فیصلہ کر لیا کہ بت پرستوں کے جاہلانہ تعصب کا سہارا لے کر ابراہیمؑ کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ انہیں ایک خاص انداز اور حالات پیدا کر کے لوگوں کے سامنے آگ کے دریا میں پھینکنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ سورہ انبیاء میں اس واقعے کی تفصیلات آئیں گی۔ یہ آگ درحقیقت لوگوں کی جہالت اور حکمران نظام کے ظلم کے ایندھن سے جلائی گئی تھی۔ حکومت اس طرح اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے آسودہ فکر کرنا چاہتی تھی۔

لیکن ___ جب آگ حکم خدا سے خاموش ہو گئی اور ابراہیمؑ اس سے صحیح و سالم نکل آئے تو نمرود کے نظام حکومت میں لرزہ پیدا ہو گیا۔ اب ابراہیمؑ ایک اور حیثیت سے سامنے آئے۔ وہ ایک عام تفرقہ پرواز انسان نہ تھے کہ جسے وہ قتل کرنا چاہتے تھے۔ وہ تو ایک خدائی رہبر تھے وہ ایک ایسے بہادر ہیرو تھے جو تن تنہا خالی ہاتھ طاقتور ظالم حکمرانوں پر حملہ کر سکتے تھے۔

لہٰذا عوام کا خون چوسنے والے نمرود اور اس کے درباریوں نے فیصلہ کیا کہ وہ پوری قوت سے ابراہیمؑ کا مقابلہ کریں گے اور جب تک انہیں ختم نہ کرلیں آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔

دوسری طرف ابراہیمؑ یہاں اپنا کردار ادا کر چکے تھے۔ آمادہ دل لوگ اُن پر ایمان لا چکے تھے۔ انہوں نے مناسب سمجھا کہ مومنین اور اپنے حامیوں کو ساتھ لے کر بابل سے نکل جائیں اور اپنی دعوت حق کو دُور دُور تک پھیلانے کے لیے شام، فلسطین اور فرعون کی سرزمین مصر کی طرف سفر کریں۔ آپ نے ان علاقوں میں حقیقت توحید کی تبلیغ کی اور بہت سے لوگ خدائے واحد پر ایمان لائے۔

رسالت کا آخری مرحلہ

حضرت ابراہیمؑ نے تمام عمر ہر طرح کی بت پرستی خصوصاً انسان پرستی کے خلاف جہاد کرتے گزاری۔ آپ نے آمادہ دلوں کو نورِ توحید سے روشن کیا۔ آپ نے انسانی جسموں میں نئی روح پھونک دی اور بہت سے لوگوں کو خود غرضوں اور خود سروں کی قید سے رہائی دلائی۔ اب ضروری تھا کہ آپ بندگی و رضائے خدا کے آخری مرحلے میں قدم رکھیں اور اپنی متاعِ حیات کو طبق اخلاص میں رکھ کر بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دیں تاکہ خدا کی عظیم آزمائشوں سے گزر کر ایک عظیم روحانی انقلاب کے ذریعے انسانوں کی امامت کے مرحلے میں داخل ہوں۔

اس کے ساتھ ساتھ اب انہیں خانہ توحید یعنی خانہ کعبہ کی بنیادوں کو بھی بلند کرنا تھا اور اسے خدا پرستی کے ایک بے نظیر مرکز میں تبدیل کرنا تھا اور تمام آمادہ دل مومنین کو اس عظیم مرکزِ توحید کے پاس ایک عظیم کانفرنس کی دعوت دینا تھا۔

آپؑ نے اپنی کنیز ہاجرہ کو اپنی بیوی بنا لیا تھا۔ اس سے انہیں اسماعیل جیسا بیٹا نصیب ہوا۔ آپ کی پہلی بیوی سارہ نے اُن سے حسد کیا۔ یہی حسد سبب بنا کہ آپ ہاجرہ اور اپنے شیر خوار بچے کو حکم خدا سے فلسطین سے مکہ کی جلتی ہوئی سنگلاخ پہاڑوں کی سرزمین میں لے گئے یہ وہ علاقہ تھا جہاں پانی کی ایک بوند بھی دستیاب نہ تھی۔ آپ حکم خدا سے ایک عظیم امتحان سے گزرتے ہوئے انہیں وہاں چھوڑ کر واپس فلسطین آ گئے۔

وہاں چشمۂ زمزم پیدا ہوا۔ اس اثنا میں جرہم قبیلا ادھر سے گزرا۔ اُس نے جناب ہاجرہ سے وہاں قیام کی اجازت چاہی ــــــ گویا واقعات کا ایک طولانی سلسلہ ہے کہ جو اس علاقے کی آبادی کا باعث بنا۔

حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے دعا کی تھی کہ اس جگہ کو آباد اور پُر برکت شہر بنا دے اور لوگوں کے دل میری اولاد کی طرف مائل کر دے۔ ان کی اولاد وہاں پھلنے پھولنے لگی تھی۔[1]

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ بعض مورخین نے نقل کیا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ ہاجرہ اور شیر خوار اسماعیل کو مکہ میں چھوڑ کر واپس جانا چاہتے تھے تو جناب ہاجرہ نے فریاد کی: اے ابراہیم آپ کو کس نے حکم دیا ہے کہ ہمیں ایسی جگہ پر چھوڑ جائیں کہ جہاں نہ کوئی سبزہ ہے، نہ دودھ دینے والا کوئی جانور، یہاں تک کہ جہاں پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں ہے۔ آپ پھر بھی ہمیں بغیر زادِ راہ، توشہ اور مونس و مددگار کے چھوڑے جا رہے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے مختصر سا جواب دیا: میرے پروردگار نے مجھے یہی حکم دیا ہے۔

---

[1] سورہ ابراہیم ۳۷ تا ۴۱۔

ہاجرہ نے یہ سنا تو کہنے لگیں: اگر ایسا ہے تو پھر خدا ہرگز ہمیں یونہی نہیں چھوڑے گا[1]

حضرت ابراہیمؑ بارہا فلسطین سے اسماعیلؑ کو ملنے کے لیے مکہ آئے۔ ایک سفر کے موقع پر آپ مراسم حج بجا لائے اور حکم خدا سے اپنے آبرومند اور نہایت پاکیزہ صاحب ایمان نوجوان بیٹے اسماعیل کو لے کر قربان گاہ میں آئے۔ اسماعیلؑ آپ کی زندگی کا بہترین ثمر تھے۔ آپ بالکل تیار تھے کہ انہیں راہِ خدا میں قربان کردیں۔

اس اہم ترین آزمائش سے جب آپ نہایت عالی طریقے سے عہدہ برآ ہو چکے اور آخری مرحلے تک اپنی آمادگی کا اظہار کرچکے تو اللہ تعالےٰ نے ان کی قربانی کو قبول کرلیا اور اسماعیلؑ کو بچا لیا اور قربانی کے لیے ایک دُنبے کو بھیج دیا[2]

حضرت ابراہیمؑ ان سب امتحانات سے کامیابی سے گزر چکے اور آزمائشوں کی اس کٹھالی سے کامیاب نکل آئے تو آپ کو ایک ایسا مقام حاصل ہوا جو وہ بلند ترین مقام ہے جو ایک انسان ترقی کرکے حاصل کرسکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

> اللہ نے کچھ کلمات کے ذریعے ابراہیم کا امتحان لیا۔ وہ ان سب سے کامیاب گزرے تو اس پر اللہ نے اُن سے کہا: میں تجھے لوگوں کا امام اور پیشوا قرار دیتا ہوں۔ (ابراہیم اس خوشخبری پر وجد میں آگئے) کہنے لگے: یہ مقام میری کچھ اولاد کو بھی عطا کردے۔ (ان کی دعا قبول ہوگئی لیکن ایک شرط کے ساتھ) اللہ نے کہا: یہ مقام ہرگز کسی ایسے شخص کو نصیب نہ ہوگا جس سے ظلم و ستم اور انحراف سرزد ہوا ہو[3]

قرآن اور ابراہیمؑ کا مقام بلند

آیات قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو بہت بلند مقام عطا فرمایا تھا۔ ایسا بلند مقام اللہ تعالےٰ نے کسی اور کو شاذ ہی عطا نہیں فرمایا۔

اس پیغمبر خدا کی عظمت ان تعبیرات سے واضح طور پر معلوم کی جاسکتی ہے:

١۔ خدا نے ابراہیمؑ کی ایک "امت" قرار دیا ہے اور ان کی شخصیت کو ایک امت کی مانند گردانا ہے (نحل - ١٢٠)۔

٢۔ اللہ نے آپ کو خلیل اللہ کا مرتبہ عطا فرمایا ہے:

واتخذ اللّٰہ ابراھیم خلیلاً (نساء - ١٢٥)

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ بعض روایات میں ہے:

> یہ مقام انہیں اس بناء پر حاصل ہوا کہ ابراہیمؑ نے خود کبھی کسی چیز کے لیے کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کیا اور کبھی کسی سائل کو محروم نہیں لوٹایا[4]

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ١ ص ١٠٣۔

[2] صٰفٰت ١٠٣ تا ١٠٧۔

[3] بقرہ - ١٢٤۔

[4] سفینۃ البحار جلد ١ ص ٢٩٧۔

۳۔ قرآن کے مطابق وہ نیک[1]، صالح[2]، قانتین میں سے[3]، صدیقین میں سے[4]، صابرین میں سے[5] اور ایفائے عہد کرنے والوں میں سے تھے[6]

۴۔ ابراہیمؑ بہت زیادہ مہمان نواز تھے[7] یہاں تک کہ بعض روایات میں انہیں ابوا ضیاف (مہمانوں کا باپ یا مہمانوں کا ساتھی) کا لقب دیا گیا ہے[8]

۵۔ ان کا توکل بے مثال تھا۔ یہاں تک کہ کسی کام اور کسی مشکل میں خدا کے علاوہ کسی پر نظر نہیں رکھتے تھے۔ جو کچھ بھی مانگتے خدا ہی سے مانگتے اور اُس کے علاوہ کسی کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے تھے[9]

جب ہٹ دھرم قوم آپ کو آگ کے سمندر میں پھینک رہی تھی۔ فرشتوں نے خواہش کی کہ ہم آپ کو بچالیں۔ ابراہیمؑ نے اُن کے اس تقاضے کو قبول نہ کیا۔ تاریخ میں اس بات کا تذکرہ موجود ہے۔ آپؑ نے کہا: میں سرتاپا نیاز و احتیاج ہوں لیکن مخلوق سے نہیں صرف خالق سے[10]

۶۔ شجاعت و بہادری میں بے مثال تھے۔ بت پرستوں کے دھاڑتے ہوئے سیلاب کے سامنے تنہا کھڑے ہو گئے۔ ان کا دل لمحہ بھر کے لیے بھی ان سے وحشت زدہ نہ ہوا۔ آپ نے ان کے بتوں کا مذاق اڑایا اور ان کے بت کدے کو ڈھا کر پتھروں کا ڈھیر بنا دیا نیز نمرود اور اس کے جلادوں کے سامنے بڑی جرأت سے بات کی جو قرآنی آیات میں موجود ہے۔

۷۔ ابراہیمؑ بڑی قوی منطق سے بات کرتے تھے۔ آپ نے گمراہوں کو بہت مختصر، محکم، دندان شکن استدلال سے جواب دیئے اور اپنے منطقی استدلال سے مخالفین کو رسوا کر دیا۔

آپ کبھی سختی و خشونت سے پیش نہیں آتے تھے بلکہ بڑے اطمینان سے بات کرتے۔ آپ کا یہ انداز آپ کی عظیم روحانی قوت کا ترجمان تھا۔ آپ نے گفتار و کردار سے مخالفین کو شکست دی۔ نمرود کے سامنے آپ کی بات جیت اور اپنے چچا آزر سے آپ کی گفتگو بابل کے قائدین

---

[1] ص ۔ ۴۷

[2] نحل ۔ ۱۲۲

[3] نحل ۔ ۱۲۰

[4] مریم ۔ ۴۱

[5] توبہ ۔ ۱۱۴

[6] نجم ۔ ۳۷

[7] ذاریات ۲۴ تا ۲۷

[8] سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۹

[9] شعراء ۔ ۷۸ تا ۸۲

[10] کامل ابن اثیر جلد ۱ صفحہ ۹۹

سے آپ کا مناظرہ بڑی وضاحت سے مرقوم ہے۔ بابل کے قاضی آپ کو خدا پرستی اور بت شکنی کے جرم میں سزا دینا چاہتے تھے آپ نے بڑے اعتماد اور اطمینان سے مدلل جوابات دیئے۔ اس سلسلے میں سورہ انبیاء کی مندرجہ ذیل آیات کو غور سے پڑھنا چاہیے:

قاضیوں نے آپ سے پوچھا: کیا وہ تمہی ہو جس نے ہمارے خداؤں کے سر پر یہ مصیبت ڈھائی ہے اور ان سب چھوٹے بڑے بتوں کو توڑ پھوڑ دیا ہے۔

قالوا ءانت فعلت هٰذا بالهتنا یا ابراهیم

(کہنے لگے: اے ابراہیم کیا وہ تمہی ہو جس نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے؟) ۔ (انبیاء - ۶۲)

آپ نے انہیں ایسا جواب دیا کہ ان کے لیے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہ رہی۔ قرآن کے الفاظ میں:

قال بل فعله کبیرهم هٰذا فاسئلوهم ان کانوا ینطقون

بولے، ہو سکتا ان کے بڑے نے یہ کام کیا ہو اگر یہ بات کر سکتے ہیں تو انہی سے پوچھو۔ (انبیاء - ۶۳)

اس ایک ہی جملے سے آپ نے اپنے دشمنوں کے لیے تمام راستے بند کر دیئے۔ اب اگر وہ کہیں کہ بت گونگے ہیں، لب بستہ ہیں اور بات کرنے کی سکت نہیں رکھتے، تو ان گونگے اور بے حرکت خداؤں کی کتنی رسوائی ہے اور اگر کہیں کہ یہ بات کر سکتے ہیں تو پھر ان سے پوچھنا پڑتا اور انہیں جواب دینا پڑتا۔

اس پر ان کا خوابیدہ وجدان جاگ اٹھا۔ ان کے اندر سے آواز آئی: تم ظالم اور خود پرست ہو، نہ اپنے اوپر رحم کرتے ہو اور نہ اپنے معاشرے پر۔

قرآن کے الفاظ میں:

فرجعوا الی انفسهم فقالوا انکم انتم الظالمون

بہر حال جواب تو انہیں دینا ہی تھا۔ (انبیاء - ۶۴)

ثم نکسوا علی رءوسهم لقد علمت ما هٰؤلاء ینطقون

بڑی بے دلی سے سرشکستہ ہو کر کہنے لگے، تم تو جانتے ہو بت بات نہیں کر سکتے۔ (انبیاء - ۶۵)

یہاں حضرت ابراہیم کی بات ان کے سر پر بجلی بن کر گری۔ آپ نے پکار کر کہا:

افلکم ولما تعبدون من دون الله افلا تعقلون

حیف ہے تم پر اور ان پر کہ خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہاری عقلوں کو؟ (انبیاء - ۶۶)

آخر کار جب انہوں نے دیکھا کہ وہ ابراہیم کی قوی منطق کے مقابلے کی سکت نہیں رکھتے تو انہوں نے پھر تمام جھوٹے سرکشوں کی طرح طاقت کا سہارا لیا اور کہنے لگے، تمہیں چاہیے کہ اسے جلا دو۔

اس کام کے لیے انہوں نے بت پرستوں کے جاہلانہ تعصبات سے مدد لی اور پکار کر کہا، اگر تم میں طاقت ہے تو اسے جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کے لیے تیار ہو جاؤ۔ (قالوا حرقوه وانصروا الهتکم ان کنتم فاعلین)[1] (انبیاء - ۶۷)

---

[1] انبیاء - ۶۲ تا ۶۷ -

یہ ابراہیم کی رسا، استدلالی اور قاطع منطق کا ایک نمونہ تھا۔

۸ - یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ایک اعزاز یہ شمار کرتا ہے کہ وہ دینِ ابراہیم پر ہیں[1] اور قرآن کہتا ہے کہ انہی نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے[2] یہاں تک کہ مسلمانوں کو شوق دلانے کے لیے ان کے چند احکام پر عمل درآمد کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہیں ابراہیم اور ان کے انصار کی اقتداء کرنا چاہیے[3]

۹ - اس عظمت و شکوہ سے مراسمِ حج کی بنیاد حکمِ الٰہی سے حضرت ابراہیمؑ نے رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مراسمِ حج میں ابراہیم کا نام اُن کی یاد اور ان کا ذکر موجود ہے[4]

۱۰ - ابراہیمؑ کی شخصیت اس قدر بلند ہے کہ ہر گروہ کی کوشش تھی کہ انہیں اپنے میں سے قرار دے۔ یہودی اور عیسائی ابراہیمؑ کے ساتھ اپنے تعلق پر بہت زور دیتے تھے یہاں تک کہ قرآن ان کے جواب میں یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ وہ ایک مسلمان اور سچے مؤحد تھے یعنی وہ ہر امر میں بحکمِ خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم تھے۔ اس کے علاوہ انہیں کوئی سوچ نہ تھی اور بس اسی کی راہ میں قدم اٹھاتے تھے[5]

تفسیر نمونہ دسویں جلد اختتام کو پہنچی

تفسیر نمونہ جلد ۱۰ کا ــــــ ترجمہ

اس حقیر پر تقصیر ــــــ سید صفدر حسین نجفی ولد سید غلام سرور نقوی (مرحوم)
کے قلم سے ــــــ
۱۵ صفر المظفر ۱۴۰۶ھ ــــــ ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۵ء بروز بدھ
ساڑھے نو بجے صبح ــــــ حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر پرسٹن لنکا شائر ــــــ برطانیہ
کے دفتر میں اختتام پذیر ہوا۔

الحمد للہ اولاً و آخراً وصلوٰۃ اللہ علی نبیہ
و آلہ ابداً سرمداً

سید صفدر حسین نجفی

---

۱ و ۲ ملة ابیکم ابراهیم ..... (حج - ۷۸)۔
۳ ممتحنہ - ۴۔ سورۂ حج ۲۷ - ۵ آل عمران ۶۷ -



سُورَۂ حجر

مکّہ میں نازل ہوئی

اور

اس کی ۹۹ آیات ہیں

سورۂ حجر کے مضامین

مفسرین میں مشہور قول کی بناء پر سورہ حجر مکی سورتوں میں سے ہے۔ تاریخ القرآن میں فہرست ابن ندیم سے منقول ہے کہ یہ پیغمبر اکرمؐ پر مکہ میں نازل ہونے والی باونویں (۵۲ ویں) سورت ہے۔ تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس کی ۹۹ آیات ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس سورت سے بالکل وہی پہلی سورتوں والا آہنگ وروش اور لب ولہجہ منعکس ہوتا ہے کیونکہ جیسے ہم کہہ چکے ہیں مکی سورتیں زیادہ تر معارف اسلام میں سے بالخصوص توحید، معاد اور مشرکوں، گنہگاروں اور ظالموں کو ڈرانے جیسے موضوعات پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان کے لیے تاریخ کے عبرت آمیز درس سے استفادہ کیا گیا ہے۔

اس لحاظ سے اس سورہ کے مضامین کو ان سات حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:۔

۱۔ وہ آیات کہ جو مبداء وعالم ہستی کے بارے میں ہیں اور اسرار خلقت کے مطالعہ کے ذریعے اس پر ایمان لانے سے مربوط ہیں۔

۲۔ وہ آیات کہ جن میں معاد وقیامت کا تذکرہ ہے اور جو بدکاروں کے لیے عذاب وسزا سے مربوط ہیں۔

۳۔ وہ آیات جو قرآن کی اہمیت اور اس آسمانی کتاب کی عظمت کے بارے میں ہیں۔

۴۔ وہ آیات کہ جو آدم کی پیدائش، شیطان کی سرکشی اور اس کے انجام کے بارے میں ہیں۔ تمام انسانوں کے لیے ایک تنبیہ اور صدائے بیدار باش کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۵۔ وہ آیات کہ جو اس مذکورہ تنبیہ کی تکمیل کے لیے حضرت لوطؑ، حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ کی قوموں کی سرگذشت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

۶۔ وہ آیات کہ جن میں انذار وبشارت ہے، مؤثر پند ونصائح ہیں، سرکوب کر دینے والی تہدیدیں ہیں، اور جاذب نظر تشویقیں ہیں۔

۷۔ وہ آیات کہ جن میں پیغمبر اسلامؐ کو قیام ومقابلہ کے لیے کہا گیا ہے۔ مخالفین کی شدید کے مقابلے میں آپ کی دلجوئی کی گئی ہے خصوصاً جبکہ یہ سازشیں ماحول مکہ میں بہت زیادہ اور خطرناک تھیں۔

اس سورہ کا نام اس کی آیت نمبر ۸۰ سے لیا گیا ہے کہ جو اصحاب حجر (قوم صالح) کے بارے میں ہے کیونکہ اس سورہ میں پانچ آیات اصحاب حجر کے بارے میں ہیں اور یہی وہ سورت ہے کہ جو قوم صالح کا تعارف "اصحاب حجر" کے عنوان سے کرواتی ہے۔ اس کی تشریح انشاء اللہ آیات ۸۰ تا ۸۴ میں آئے گی۔

سورۂ حجر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ الٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ وَ قُرۡاٰنٍ مُّبِیۡنٍ ○

۲۔ رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡ کَانُوۡا مُسۡلِمِیۡنَ ○

۳۔ ذَرۡہُمۡ یَاۡکُلُوۡا وَ یَتَمَتَّعُوۡا وَ یُلۡہِہِمُ الۡاَمَلُ فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ ○

۴۔ وَ مَاۤ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَرۡیَۃٍ اِلَّا وَ لَہَا کِتَابٌ مَّعۡلُوۡمٌ ○

۵۔ مَا تَسۡبِقُ مِنۡ اُمَّۃٍ اَجَلَہَا وَ مَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان ورحیم ہے

۱۔ آلرا۔ یہ کتاب اور قرآن مبین کی آیات ہیں۔

۲۔ (جس وقت) کافر (اپنے اعمال کے برے آثار دیکھیں گے) کس قدر آرزو کریں گے ، کہ وہ مسلمان ہوتے۔

۳۔ چھوڑو انھیں ، وہ کھالیں ، فائدہ اٹھالیں اور آرزوئیں انھیں غافل کردیں ، لیکن وہ بہت جلد سمجھ لیں گے۔

۴۔ ہم نے کسی شہر و دیار (کے باسیوں) کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ وہ اجل معین (اور تغیر ناپذیر زمانہ) رکھتے تھے۔

۵۔ کوئی گروہ اپنی اجل سے آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے۔

تفسیر

بے بنیاد آرزوئیں

اس سورہ کی ابتداء میں پھر ہمیں حروفِ مقطعات (الف ۔ لام ۔ راء) کا سامنا ہے ۔ یہ حروف واضح کرتے ہیں کہ آسمانی کتاب کہ جو ساری نوعِ انسانی کے لیے سعادت کا راستہ کھولنے والی ہے انھی سادہ سے حروف الف ، باء سے ترتیب پاتی ہے اس کا خام مال وہی ہے جو تمام افرادِ بشر بیان تک کہ دو تین سالہ بچے کے اختیار میں بھی ہے یہ انتہائی اعجاز ہے کہ ایسے مصالحہ سے اس قسم کا بے نظیر محصول بنایا جائے ۔

لہٰذا بلا فاصلہ فرمایا گیا ہے : یہ آسمانی کتاب اور واضح قرآن کی آیات ہیں (تلك اٰيٰت الكتٰب وقراٰن مبين) ۔

ہم جانتے ہیں کہ "تلک" دور کا اسمِ اشارہ ہے حالانکہ قاعدتاً یہاں ھٰذہ ہونا چاہیے تھا کہ جو نزدیک کے لیے اسمِ اشارہ ہے) لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ عربی ادب میں (بلکہ فارسی ادب میں بھی) بعض اوقات کسی کی عظمت بیان کرنے کے لیے دور کے اسمِ اشارہ سے استفادہ کیا جاتا ہے ———— یعنی اس کی وہ عظمت ہے کہ گویا ہم سے بہت دور آسمانوں کے فاصلے پر ہے ۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے بعض اوقات ایک بزرگ شخص کی موجودگی میں ہم کہتے ہیں کہ اگر آنجناب اجازت دیں تو ہم فلاں اقدام کریں ۔ یہاں "آں" (وہ) کا لفظ اس کے مقام کی عظمت بیان کرنے کے لیے ہے جیسا کہ "نکرہ" کی صورت میں قرآن کا ذکر بھی بیانِ عظمت کے لیے ہے ۔

بہرحال "کتاب" کے بعد لفظ "قرآن" کا آنا درحقیقت تاکید کے عنوان سے ہے اور لفظ "مبین" کے ذریعے اس کی توصیف اس لیے کی گئی ہے کیونکہ یہ حقائق بیان کرنے والا اور حق کو باطل سے جدا کر کے واضح طور پر پیش کرنے والا ہے ۔

یہ جو بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ لفظ "کتاب" یہاں تورات اور انجیل کی طرف اشارہ ہے ۔ بہت بعید معلوم ہوتا ہے ۔

اس کے بعد ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جو ان واضح خدائی آیات کے بارے میں ہٹ دھرمی اور مخالفت میں اصرار کرتے ہیں ۔ فرمایا گیا ہے : ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ لوگ اپنے منحوس کفر ، اندھے تعصب اور ہٹ دھرمی پر پشیمان ہوں گے اور "کبھی یہ کافر آرزو کریں گے کہ اے کاش ہم مسلمان ہوتے" (ربما يود الذين كفروا لو كانوا مسلمين) ۔

جیسا کہ تفسیر المیزان میں ہے "یود" (دوست رکھتا ہے) سے مراد پسند کرنا ، تمنا کرنا اور آرزو کرنا ہے اور لفظ "لو" کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اسلام کی آرزو ایسے زمانے میں کریں گے جب وہ اس کی طرف نہیں آسکتے ہوں گے اور یہ خود اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ اس کی تمنا اور آرزو دوسرے جہان میں اپنے اعمال کے نتائج دیکھنے کے بعد کریں گے ۔

حضرت صادق علیہ السلام سے اس سلسلے میں منقول حدیث بھی بالکل اسی معنی کی تائید کرتی ہے ۔ آپ فرماتے ہیں :

ينادى مناد يوم القيٰمة يسمع الخلائق انه لا يدخل الجنة الا مسلم فثم يود سائر الخلائق انهم كانوا مسلمين

جب قیامت کا دن ہوگا تو کوئی اس طرح پکارے گا کہ تمام مخلوق اس کی آواز سنے گی، وہ کہے گا: (آج) جنت میں ان لوگوں کے علاوہ کوئی داخل نہیں ہوگا کہ جو اسلام لا چکے ہیں اس وقت سب لوگ آرزو اور تمنا کریں گے کہ اے کاش ہم مسلمان ہوتے۔[1]

نیز عظیم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

جس وقت دوزخی جہنم میں جمع ہوں گے اور مسلمانوں کے ایک گنہ گار گروہ کو ان کے ساتھ رکھا جائے گا تو کفار مسلمانوں سے کہیں گے کہ کیا تم مسلمان نہیں تھے۔ وہ جواب دیں گے کہ تھے تو سہی تو وہ کہیں گے کہ پھر تمہارا اسلام بھی تمہارے لیے فائدہ مند نہ ہوا۔ کیونکہ تم بھی ہمارے ساتھ ایک ہی جگہ پر ہو۔ وہ جواب دیں گے کہ ہم نے (بہت بڑے) گناہ کیے تھے کہ جن کے باعث ہم اس انجام کو پہنچے ہیں (گناہ اور تقصیر کا یہ اعتراف اور دشمن کی وہ سرزنش سبب بنے گی کہ) خداوند عالم حکم دے گا کہ ہر وہ باایمان فرد (مسلمان) کہ جو جہنم میں ہے اسے باہر نکالو۔ تو اس وقت کفار کہیں گے کہ اے کاش، ہم بھی اسلام لائے ہوتے۔[2]

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ کافروں میں ایسے افراد بھی ہیں کہ جن کا ضمیر ابھی بیدار ہے اور جب وہ پیغمبر اسلامؐ کی دعوت کو سنتے ہیں اور کتاب مبین کی آیات کے ان پیارے مضامین کو دیکھتے ہیں تو دل کی گہرائیوں سے ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں اور آرزو کرتے ہیں کہ اے کاش ہم بھی اسلام لائے ہوتے لیکن تعصب، ہٹ دھرمی یا مادی مفادات انھیں اجازت نہیں دیتے کہ اس عظیم حقیقت کو قبول کرلیں لہٰذا وہ اسی طرح کفر اور بے ایمانی کے قید خانے میں محصور رہ جاتے ہیں۔

ہمارا ایک صاحب ایمان اور مجاہد دوست یورپ گیا تھا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے اسلام کی خوبیاں ایک عیسائی کے سامنے شمار کیں وہ ایک منصف مزاج آدمی تھا اس نے جواب میں کہا: میں صحیح تمھیں مبارک باد دیتا ہوں کہ تم اس قسم کے مذہب کے پیروکار ہو۔ لیکن میں کیا کروں، میری زندگی کے حالات اجازت نہیں دیتے کہ میں اپنے مذہب سے دست بردار ہو جاؤں۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ بعض اسلامی روایات میں ہے کہ جس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قاصد آنحضرتؐ کا خط لے کر قیصر روم کے پاس پہنچا تو اس نے خصوصیت کے ساتھ آپ کے قاصد کے سامنے اظہار ایمان کیا یہاں تک کہ وہ رومیوں کو اس دین توحید و اسلام کی دعوت دینا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ پہلے ان کی آزمائش کی جائے جب اس کی فوج نے محسوس کیا کہ وہ عیسائیت کو ترک کر دینا چاہتا ہے تو اس نے اس کے قصر کا محاصرہ کر لیا۔ قیصر نے ان سے فوراً کہا کہ میں تو تمھیں آزمانا چاہتا تھا اپنی جگہ واپس چلے جاؤ۔

---

[1] مجمع البیان اور نور الثقلین میں یہ روایت محل بحث آیت کے ذیل میں عیاشی کے حوالے سے درج کی گئی ہے۔

[2] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔ نیز فخر رازی نے اپنی تفسیر میں اسی سے ملتی جلتی ایک حدیث نقل کی ہے (البتہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ)۔
تفسیر طبری میں بھی اسی مضمون کی چند احادیث زیر بحث آیت کے ذیل میں نقل ہوئی ہیں۔

اس کے بعد اُس نے رسول اللہؐ کے قاصد سے کہا: میں جانتا ہوں کہ تمھارا پیغمبر خدا کی طرف سے ہے اور وہی ہے جس کے ہم منتظر تھے لیکن میں کیا کروں کہ میں ڈرتا ہوں کہ میری حکومت میرے ہاتھ سے نکل جائے گی اور میری جان بھی خطرے میں ہے۔[1]

توجہ رہے کہ ان دونوں تفسیروں میں آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اور ممکن ہے آیت کا اشارہ اس جہان میں بھی کفار کے بعض گروہوں کی پشیمانی کی طرف ہو اور اُس جہان میں بھی۔ جب کہ وہ مختلف حوالوں سے اُس جہان میں لوٹ آنے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ اس جہان میں (غور کیجیے گا)۔

اس کے بعد قرآن بہت سرزنش کے لہجے میں کہتا ہے: اے پیغمبرؐ! انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دے (تاکہ چوپایوں کی طرح کھاتے پھریں، اس ناپائیدار زندگی کی لذتیں حاصل کریں اور آرزوئیں انھیں اس عظیم حقیقت سے غافل کردیں لیکن یہ بہت جلدی سمجھ جائیں گے (ذرھم یاکلوا و یتمتعوا ویلھھم الامل فسوف یعلمون) چونکہ یہ تو جانور ہیں جو اپنے اصطبل، گھاس پھوس اور مادی لذات کے سوا کچھ نہیں سمجھتے اور ان کی حرکتیں بس انھی چیزوں کے لیے ہیں۔

غرور، غفلت اور لمبی آرزوں نے ان کے دلوں پر اس طرح سے پردہ ڈال رکھا ہے اور انھیں اپنے میں ایسا گم کررکھا ہے کہ اب وہ ادراکِ حقیقت کی قدرت نہیں رکھتے۔

لیکن جب اجل کا طمانچہ ان کے منہ پر لگا، غرور و غفلت کے پردے ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹے اور انھوں نے اپنے آپ کو آستانۂ موت پر یا عرصۂ قیامت میں پایا تو اس وقت سمجھیں گے کہ کس قدر غفلت میں تھے، کس قدر زیاں کار اور بدبخت تھے اور کس طرح انھوں نے اپنا قیمتی ترین سرمایہ خود اپنے ہاتھوں گنوا دیا ہے۔

بعد والی آیت میں، اس بناء پر کہ کہیں وہ یہ گمان نہ کریں کہ یہ مہلت اور لذائذ دنیا سے بہرہ وری کا سلسلہ ختم ہونے والا نہیں، مزید ارشاد ہوتا ہے: ہم نے کسی گروہ کو کسی شہر میں نابود نہیں کیا مگر یہ کہ وہ اجل معین اور تغیر ناپذیر ددر رکھتے تھے۔ (وما اھلکنا من قریۃ الا و لھا کتاب معلوم)۔

اور "کوئی اُمت اور جمعیت اپنی اجل معین سے تجاوز نہیں کرسکتی اور نہ کوئی پیچھے رہ سکتی ہے" (ما تسبق من امۃ اجلھا و ما یستأخرون)۔

ہر جگہ یہی سنت الٰہی کارفرما ہی ہے کہ اس نے تجدید نظر، بیداری اور آگاہی کے لیے کافی مہلت دی۔ اس نے دردناک حوادث سے بھی دوچار کیا اور وسائل رحمت سے بھی نوازا۔ اس نے ڈرایا بھی اور شوق بھی دلایا وہ خطرے سے خبردار کرتا ہے تاکہ سب پر حجت تمام ہو جائے۔

مگر جب یہ مہلت تمام ہوتی ہے تو حتمی انجام انھیں آلیتا ہے۔ دیر اور جلدی کا ترتیبی مصالح کی خاطر ممکن ہے لیکن ....

کیا اسی حقیقت کی طرف توجہ کافی نہیں ہے تاکہ سب کے سب گذشتہ لوگوں کی سرنوشت سے عبرت حاصل کریں، اور

---

[1] مکاتیب الرسول جلد ۲ صفحہ ۱۱۲۔

خدائی مہلت سے بازگشت اور اصلاح کے لیے استفادہ کریں کیا اب بھی ہمیں بیٹھا رہنا چاہیے تاکہ گذشتہ گمراہ اور ظالم قوموں کا سا بُرا انجام ہمارے لیے بھی دہرایا جائے۔ اور بجائے اس کے کہ ہم گذشتہ لوگوں سے عبرت حاصل کریں، آنے والوں کے لیے عبرت بن جائیں۔

ضمنی طور پر آخری دو آیات سے آیاتِ قرآن میں اور خود زیرِ بحث سورت میں گذشتہ لوگوں کی تاریخ بیان کرنے کا مقصد واضح ہو جاتا ہے۔

ایک اہم نکتہ:

لمبی آرزوئیں غفلت کا سبب ہیں:۔ اس میں شک نہیں کہ امید و آرزو یا عربوں کی تعبیر میں "امل" انسانوں کے چرخِ حیات کی حرکت کا عامل ہے یہاں تک کہ اگر اسے اہلِ دنیا کے دلوں سے صرف ایک دن کے لیے اٹھا لیں تو نظامِ زندگی درہم برہم ہو جائے اور بہت کم افراد میں فعالیت، سعی و کوشش اور جوشِ عمل پیدا ہو۔

اس سلسلے میں پیغمبر اکرمؐ سے یہ مشہور حدیث منقول ہے:

الامل رحمة لامتی و لو لا الامل ما رضعت والدة ولدها ولا غرس غارس شجرًا۔

امید میری امت کے لیے سایۂ رحمت ہے اگر امید نہ ہو تو کوئی ماں اپنے بچے کو دودھ نہ پلائے، اور کوئی باغبان پودا نہ لگائے۔[1]

یہ حدیث بھی اسی عمل کی طرف اشارہ ہے لیکن حیات و حرکت کا یہی عامل جب حد سے گزر جائے اور دور دراز کی آرزو کی شکل اختیار کرلے تو انحراف و بدبختی کا بدترین عامل ہے یہ بالکل آبِ باراں کی طرح ہے کہ جو سببِ حیات ہے لیکن، ر حد سے بڑھ جائے تو غرقابی اور نابودی کا باعث ہو جائے۔

یہی وہ ہلاکت خیز آرزو ہے جس کا ذکر زیرِ بحث آیات میں آیا ہے اور اسے خدا و حق و حقیقت سے بے خبری کا باعث شمار کیا گیا ہے۔ یہ دور دراز کی آرزوئیں اور لمبی چوڑی امیدیں ہی ہیں جو انسان کو اس طرح اپنے میں مشغول رکھتی ہیں اور عالمِ تخیل میں مستغرق کر دیتی ہیں کہ انسان زندگی اور اس کے اصلی اہداف و مقاصد سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہے۔

ایک مشہور حدیث کہ جو نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ سے منقول ہے وہ بھی اس حقیقت کو وضاحت سے بیان کرتی ہے:

ایها الناس ان اخوف ما اخاف علیکم اثنان: اتباع الهوی و طول الامل، اما اتباع الهوی فیصد عن الحق، واما طول الامل فینسی الأخرة۔

اے لوگو! خوفناک ترین چیزیں کہ جن کا مجھے تمہارے بارے میں اندیشہ ہے وہ دو ہیں۔ ہوا و ہوس کی

---

[1] سفینة البحار ج ۱ ص ۳۰ (مادہ "امل")۔

پیروی اور دور دراز کی آرزو میں ۔ کیونکہ ہوا و ہوس کی پیروی تمھیں حق سے باز رکھے گی اور دور دراز کی آرزو آخرت کو بھلا دے گی ۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ کتنے ہی باصلاحیت اور لائق افراد ہیں کہ جو آرزوئے دراز کے دام میں گرفتاری کے زیر اثر ضعیف اور مسخ شدہ وجود بن چکے ہیں کہ جس کی وجہ سے نہ صرف وہ اپنے معاشرے کے لیے مفید نہیں رہے بلکہ اپنے ذاتی مفادات بھی پامال کر چکے ہیں اور ہر قسم کی ترقی اور کمال سے محروم ہو گئے ہیں ۔ جیسا کہ دعائے کمیل میں ہے ۔

وحبسنی عن نفعی بعد املی

طولِ آرزو نے مجھے اپنے حقیقتِ منافع سے محروم کر دیا ہے ۔

اصولی طور پر آرزو جب حد سے گزر جاتی ہے تو ہمیشہ انسانوں کو رنج و تعب میں مبتلا کر دیتی ہے پھر وہ رات دن کوشش کرتا ہے اور اپنے گمان میں سعادت و خوشحالی کی طرف جا رہا ہوتا ہے حالانکہ اسے بدبختی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ایسے افراد اکثر اوقات اس حالت میں جان دے دیتے ہیں ان کی دردناک اور غم انگیز زندگی ان کے لیے باعثِ عبرت ہے کہ جو دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان رکھتے ہیں ۔

---

[1] نہج البلاغہ ، خطبہ ۴۲

۶۔ وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ○

۷۔ لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَائِكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ○

۸۔ مَا نُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُنْظَرِينَ ○

ترجمہ

۶۔ اور انھوں نے کہا: اے وہ شخص کہ جس پر ذکر (قرآن) نازل ہوا ہے، بے شک تو دیوانہ ہے۔

۷۔ اگر تو سچ کہتا ہے تو ہمارے لیے فرشتے کیوں نہیں لے آتا۔

۸۔ (لیکن انھیں جان لینا چاہیے کہ) ہم فرشتوں کو حق کے بغیر نازل نہیں کرتے اور جس وقت نازل ہوئے تو پھر انھیں مہلت نہیں دی جائے گی (اور انکار کی صورت میں عذابِ الٰہی میں نابود ہو جائیں گے)۔

تفسیر

فرشتوں کے نزول کا تقاضا۔

ان آیات میں پہلے تو قرآن اور پیغمبرؐ کے خلاف دشمنی پر مبنی کفار کے اعتراض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انھوں نے کہا: اے وہ شخص جس پر قرآن نازل ہوا ہے ہم یقینی قسم کھاتے ہیں کہ تو دیوانہ ہے (و قالوا یا ایھا الذی نزل علیه الذکر انك لمجنون)۔

پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں ان کے یہ الفاظ انتہائی گستاخی اور جسارت کو مجسم کرتے ہیں۔

ایک طرف تو "یا ایھا الذی" (اے وہ شخص) کہا گیا ہے دوسری طرف "نزل علیه الذکر" کے الفاظ ہیں کہ جو انھوں نے قرآن کے استہزاء اور انکار کے طور پر کہے ہیں اور تیسری طرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مجنون قرار دینے کے لفظ "ان" اور "لام قسم" کے ذریعے اس کی تاکید ہے۔

جی ہاں! جس وقت ہٹ دھرم اور بے مایہ افراد ایک عظیم اور بے مثل عقل کا سامنا کرتے ہیں تو وہ اس کے ساتھ "مجنون" کا پیوند لگانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ ان کے لیے تو ان کی اپنی ناتواں عقل ہی میزان ہوتی ہے اور جو کچھ ان کی میزان میں نہ سما سکے وہ ان کی نگاہ میں بے عقلی اور دیوانگی ہے۔

ایسے افراد اپنے ماحول کے مسائل کے بارے میں خاص قسم کے تعصب کا مظاہرہ کرتے ہیں چاہے وہ گمراہی میں ہی کیوں نہ ہوں

اسی لیے وہ ہر تازہ دعوت کو غیر عاقلانہ دعوت قرار دے کر مقابلے کی کوشش کرتے ہیں وہ نئی پیش آمدہ چیزوں سے وحشت زدہ ہوتے ہیں اور غلط روشوں کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں وہ دنیا پرست کہ جو تمام چیزوں کو مادی معیاروں پر پرکھتے ہیں اگر ان کا کسی ایسے انسان سے سامنا ہو کہ جو اپنے تمام مادی مفادات حتیٰ کہ اپنی جان بھی ایک روحانی مقصد کے لیے قربان کر دے تو انھیں یقین نہیں آتا کہ وہ عاقل ہے کیونکہ ان کے نزدیک عقل کا کام زیادہ مال و دولت، خوبصورت بیوی، پر تعیش زندگی اور ظاہری مقام و منصب کا حصول ہے۔

بالکل واضح سی بات ہے کہ اگر کسی کی فکر بس مال و دولت، عورتوں اور مقام و منصب تک محدود ہے جو اس کے سامنے کہا جاتا ہے کہ: اگر آسمانی سورج میرے ایک ہاتھ پر اور چاند دوسرے ہاتھ پر رکھ دو اور تمھارے چھوٹے سے ماحول کی بجائے تمام نظام شمسی پر میری حکومت ہو تو بھی میں اپنی دعوت سے دستبردار نہیں ہوں گا، تو وہ یہ بات کرنے والے کو دیوانہ ہی قرار دے گا۔

تعجب تو اس بات پر ہے کہ یہ بے عقل افراد خدائی رہبروں کے ساتھ ایسے ایسے بیہودہ چسپاں کرتے تھے کہ جو بعض اوقات بالکل ایک دوسرے کی ضد ہوتے تھے کبھی انھیں "دیوانہ" کہتے اور کبھی "جادوگر"۔ حالانکہ جادوگر تو ایک خاص زیرکی اور ہوشیاری کا حامل ہوتا ہے اور عین "دیوانہ" کا مدمقابل ہے۔

یہ لوگ نہ صرف پیغمبر کی طرف ایسی غیر عاقلانہ نسبتیں دیتے تھے بلکہ بہانہ جوئی کے طور پر کہتے تھے۔ "اگر سچ کہتے ہو تو پھر ہمارے لیے فرشتے کیوں نہیں لاتے"؛ تاکہ وہ تیری گفتگو کی تصدیق کریں اور ہم ایمان لے آئیں (لو ما تأتینا بالملئکة ان کنت من الصٰدقین)۔

خدا تعالیٰ انھیں جواب دیتا ہے: ہم ملائکہ کو سوائے حق کے نہیں بھیجتے (ما ننزل الملائکة الا بالحق) اور اگر فرشتے نازل ہوں (اور حقیقت ان کے لیے حسی پہلو اختیار کر لے) اور اس کے بعد وہ ایمان نہ لائیں تو پھر انھیں مہلت نہیں دی جائے گی اور وہ عذاب الٰہی کے ذریعے نابود ہو جائیں گے (و ما کانوا اذا منظرین)

"ما ننزل الملئکة الا بالحق" کی تفسیر کے سلسلے میں مفسرین کے مختلف بیانات ہیں:۔

۱۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم فرشتوں کو صرف بطور اعجاز حق واضح کرنے کے لیے نازل کریں گے نہ کہ ان کی بہانہ جوئی کے لیے کہ وہ دیکھ لیں اور پھر بھی ایمان نہ لائیں۔ دوسرے لفظوں میں معجزہ کوئی بازیچۂ اطفال نہیں کہ لوگوں کی من پسند سے رونما ہوتا ہے۔ بلکہ یہ تو اثبات حق کے لیے اور جو لوگ حق کے خواہاں ہیں ان کے لیے یہ امر بقدر کافی ثابت ہو چکا ہے کیونکہ پیغمبر اسلام نے قرآن جیسا معجزہ ہاتھ میں ہونے کے باوجود دوسرے معجزات بھی دکھا کر اپنی رسالت کو ثابت کیا تھا۔

۲۔ ایک احتمال یہ ذکر کیا گیا ہے کہ "حق" یہاں "موت" کے معنی میں ہے یعنی فرشتے صرف موت اور قبض روح کے وقت نازل ہوں گے کسی اور وقت نہیں۔

لیکن یہ تفسیر بہت بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ قرآن حکیم میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کے واقعات میں، یہاں تک کہ مسلمانوں کے بارے میں بعض سے متعلق ہے کہ ان پر فرشتے نازل ہوئے۔

۳۔ بعض نے کہا ہے کہ "حق" سے مراد یہاں وہی آخری دنیاوی عذاب اور نابود کرنے والی مصیبت ہے۔ دوسرے لفظوں میں "عذاب استیصال" ہے یعنی اگر فرشتے نازل ہوں اور پھر یہ ایمان نہ لائیں کیونکہ ان میں موجود ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ ایمان نہیں لائیں گے تو ان کی نابودی بھی ساتھ ہو گی۔

آیت کا دوسرا جملہ "وما کانوا اذا منظرین" بھی اس معنی کی تاکید کرتا ہے۔ لیکن پہلی تفسیر کے مطابق اس کا الگ نیا مفہوم ہے۔

۴۔ یہ احتمال بھی ہے کہ "حق" یہاں شہود کے معنی میں ہے یعنی جب تک یہ افراد اس دنیا میں ہیں ان کی آنکھوں کے سامنے پردے پڑے ہیں اور یہ ایسے حقائق نہیں دیکھ سکتے کہ جو ماورائے مادہ سے مربوط ہیں صرف دوسرے جہان میں عالمِ شہود ہو گا کہ جہاں پردے ہٹ جائیں گے تو پھر یہ فرشتگانِ الٰہی کو دیکھ سکیں گے۔

اس میں بھی دوسری تفسیر والا اشکال موجود ہے کیونکہ قوم لوط کے بے ایمان اور گمراہ افراد تک نے عذاب پر مامور فرشتوں کو اسی دنیا میں دیکھا تھا[1]

اس بناء پر صرف پہلی اور تیسری تفسیر ظاہر آیت سے مناسبت رکھتی ہے۔

باقی رہا یہ مسئلہ کہ آیت میں ہے کہ اگر ان تمام واضح دلائل کے بعد بھی ان کے تقاضا کے مطابق حسی معجزہ پیش کیا جائے تو پھر انھیں مہلت نہیں دی جائے گی یہ اس بناء پر ہے کہ ایسی حالت میں ان کے لیے بھرپور معنی کے لحاظ سے اتمامِ حجت ہو جائے گا، اور تمام بہانے ختم ہو جائیں گے اور چونکہ زندگی کی مہلت، اتمامِ حجت، احتمالِ تجدیدِ نظر اور حق کی طرف بازگشت کے لیے ہے اور جن پر پوری طرح اتمامِ حجت ہو جائے ان کے لیے مہلت کوئی معنی نہیں رکھتی لہٰذا ان کی عمر کے اختتام کا اعلان ہو جاتا ہے اور وہ اس سزا اور عذاب تک جا پہنچتے ہیں جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں (غور کیجیے گا)۔

---

[1] سورۂ ہود، آیہ ۸۱۔

۹۔ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ○

ترجمہ

۹۔ ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم قطعی طور پر اس کی حفاظت کریں گے۔

تفسیر

قرآن کی حفاظت

کفار نے بہت بہانہ سازیاں کیں ۔ یہاں تک کہ پیغمبرؐ اور قرآن کے بارے میں استہزاء کیا۔ گزشتہ آیات میں اس کا ذکر موجود ہے اس کے بعد زیر بحث آیت میں ایک عظیم اور نہایت اہم حقیقت بیان کی گئی ہے یہ بیان حقیقت ایک طرف تو پیغمبر اکرمؐ کی دلجوئی کے لیے ہے۔ اور دوسری طرف تمام سچے مومنین کے اطمینان کی خاطر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس قرآن کو کہ جو مایہ پند کر ہے ہم نے نازل کیا ہے اور ہم یقینی طور پر اس کی حفاظت کریں گے (انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون)۔

ایسا نہیں ہے کہ یہ قرآن کسی یاور و مددگار کے بغیر ہے اور وہ اس کے آفتاب وجود کو کیچڑ سے چھپا دیں گے یا اس کے نور کو پھونکوں سے بجھا دیں گے ــــــــ یہ تو وہ چراغ ہے جسے حق تعالیٰ نے روشن کیا ہے اور یہ وہ آفتاب ہے جس کے لیے غروب ہونا نہیں ہے۔

یہ چند ایک افراد اور ناتواں گروہ تو معمولی سی چیز ہے اگر دنیا بھر کے جابر، اہل اقتدار، سیاستدان، ظالم، منحرف اہل فکر اور جنگ آزما جمع ہو جائیں اور اس کے نور کو بجھانا چاہیں تو وہ بھی ایسا نہیں کر سکیں گے کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔

یہ کہ قرآن کی حفاظت سے مراد کن امور کی حفاظت ہے ــــــــ اس سلسلے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں:

۱۔ بعض نے کہا ہے کہ تحریف و تغیر اور کمی بیشی سے حفاظت مراد ہے۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ آخر دنیا تک فنا و نابودی سے حفاظت مقصود ہے۔

۳۔ بعض دیگر نے کہا ہے کہ قرآن کے خلاف گمراہ کرنے والی منطق کے مقابلے میں حفاظت مراد ہے۔

لیکن یہ تفاسیر نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے تضاد نہیں رکھتیں بلکہ "انا لہ لحافظون" کے عام مفہوم میں شامل ہیں تو پھر کیوں ہم اس محافظت کو ایک گوشے میں محصور کر دیں جبکہ یہ مطلق طور پر اور اصطلاح کے مطابق حذف متعلق کے ساتھ آئی ہے حق یہ ہے کہ اس آیت کے ذریعے خدا تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ قرآن کی ہر لحاظ سے حفاظت و نگہداری کرے گا اسے ہر قسم کی تحریف سے بچائیگا اسے فنا و نابودی سے محفوظ رکھے گا اور وسوسے پیدا کرنے والے سوفسطائیوں اور بدیہات کے منکرین سے اس کی محافظت کرے گا۔

باقی رہا بعض قدماء مفسرین کا یہ احتمال کہ یہاں ذاتِ پیغمبر کی حفاظت مراد ہے اور "لہ" کی ضمیر پیغمبر کی طرف لوٹتی ہے، کیونکہ قرآن کی بعض آیات (مثلاً طلاق ۱۰) میں لفظ "ذکر" کا اطلاق ذاتِ پیغمبر پر ہوا ہے ——— یہ بہت بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ زیرِ بحث آیت سے قبل کی آیت میں لفظ "ذکر" صراحت کے ساتھ قرآن کے معنی میں آیا ہے۔ اور مسلّم ہے کہ یہ بعد والی آیت اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

عدمِ تحریفِ قرآن

تمام شیعہ سنی علماء میں مشہور و معروف یہ ہے کہ قرآن میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہوئی اور جو قرآن آج ہمارے ہاتھ میں ہے، بالکل وہی قرآن ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا، یہاں تک کہ اس میں کوئی لفظ اور کوئی حرف بھی کم یا زیادہ نہیں ہوا۔

قدماء و متاخرین میں سے وہ عظیم شیعہ علماء کہ جنھوں نے اس حقیقت کی تصریح کی ہے ان میں سے حسبِ ذیل علماء کے نام لیے جا سکتے ہیں:

۱۔ مرحوم شیخ طوسی ——— جو شیخ الطائفہ کے نام سے مشہور ہیں انھوں نے اپنی مشہور کتاب "تفسیر تبیان" کے آغاز میں اس سلسلے میں روشن واضح اور قطعی بحث کی ہے۔

۲۔ سید مرتضیٰ ——— جو چوتھی صدی ہجری کے اعاظم علماء امامیہ میں سے ہیں۔

۳۔ رئیس المحدثین مرحوم صدوق محمد بن علی بن بابویہ ——— وہ عقائدِ امامیہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن میں کسی قسم کی کوئی تحریف نہیں ہوئی۔"

۴۔ عظیم مفسر مرحوم طبرسی نے بھی اپنی تفسیر کے مقدمہ میں اس سلسلے میں ایک واضح بحث کی ہے۔

۵۔ مرحوم کاشف الغطاء ——— جو بزرگ علماء متاخرین میں سے ہیں۔

۶۔ مرحوم محقق یزدی نے کتاب عروۃ الوثقیٰ میں جمہور مجتہدین شیعہ سے عدمِ تحریفِ قرآن نقل کیا ہے۔

۷۔ بہت سے دوسرے بزرگواروں مثلاً شیخ مفید، شیخ بہائی، قاضی نور اللہ اور دیگر شیعہ محققین نے یہی عقیدہ نقل کیا ہے۔

اہل سنت کے بزرگ اور محققین بھی زیادہ تر یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔

اگرچہ بعض شیعہ اور سنی محدثین کہ جن کی اطلاعات قرآن کے بارے میں ناقص تھیں انھوں نے قرآن میں وقوعِ تحریف کا ذکر کیا ہے لیکن دونوں مذاہب کے بزرگ علماء کی وضاحت سے یہ عقیدہ باطل قرار پا کر فراموش ہو چکا ہے۔

یہاں تک کہ مرحوم سید مرتضیٰ "المسائل الطرابلسیات" کے جواب میں کہتے ہیں:

"صحتِ نقلِ قرآن دنیا کے مشہور شہروں، تاریخ کے عظیم واقعات اور مشہور و معروف کتب کے بارے میں ہماری اطلاعات کی طرح واضح اور روشن ہے۔

کیا کوئی شخص مکہ اور مدینہ یا لندن اور پیرس جیسے شہروں کے ہونے میں کوئی شک و شبہ کر سکتا ہے اگرچہ اس نے کبھی بھی ان شہروں کی طرف سفر نہ کیا ہو۔

کیا کوئی شخص ایران پر مغلوں کے حملے۔ فرانس کے عظیم انقلاب یا پہلی اور دوسری عالمی جنگ کا منکر ہو سکتا ہے۔

ایسا کیوں نہیں ہو سکتا ـــــــ اس لیے یہ تمام چیزیں تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں۔

قرآن کی آیات بھی اسی طرح ہیں ـــــــ اس تشریح کے ساتھ کہ جو ہم بعد میں بیان کریں گے۔

اگر بعض افراد نے اپنے مفادات کی غرض سے شیعہ و سنی میں تفرقہ ڈالنے کے لیے شیعوں کی طرف تحریف کے اعتقاد کی نسبت دی ہے تو ان کے دعوی کے بطلان کی دلیل علماء شیعہ کی بڑی اور عظیم کتب ہیں۔

یہ بات عجیب نہیں ہے کہ فخر رازی جیسا شخص کہ جو شیعوں سے مربوط مسائل میں خاص حساسیت اور تعصب رکھتا ہے محل بحث آیت کے ذیل میں کہتا ہے کہ یہ آیت "انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحفظون" مذہب شیعہ کے بطلان کی دلیل ہے کیونکہ وہ قرآن میں تغیر اور کمی بیشی کے قائل ہوتے ہیں۔

ہم صراحت سے کہتے ہیں کہ اگر اس کی مراد بزرگان اور محققین شیعہ ہیں تو ان میں سے کوئی بھی اس قسم کا عقیدہ نہ رکھتا تھا اور نہ رکھتا ہے اور اگر اس کی مراد یہ ہے کہ اس سلسلے میں شیعوں کے درمیان ایک ضعیف قول موجود ہے تو اس کی نظیر اہل سنت میں بھی موجود ہے کہ جس کی نہ وہ اعتناء کرتے ہیں نہ ہم۔

معروف محقق کاشف الغطاء اپنی کتاب "کشف الغطاء" میں کہتے ہیں:۔

لاریب انہ "ای القرآن" محفوظ من النقصان بحفظ الملک الدیان کما دل علیہ صریح القرآن واجماع العلماء فی کل زمان ولا عبرۃ بنادر۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن خدا کی حفاظت کے سایے میں ہر قسم کی کمی اور تحریف سے محفوظ رہا ہے جیسا کہ صریح قرآن اس پر دلالت کرتا ہے اور ہر زمانے کے علماء کا اس پر اجماع رہا ہے اور شاذ و نادر افراد کی مخالفت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ (تفسیر آلاء الرحمن ص ۲۵)

تاریخ اسلام نے اس قسم کی ناروا نسبتیں کہ جن کا سرچشمہ تعصب کے سوا کچھ نہیں، بہت دیکھی ہیں ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے بعض دشمنوں کی طرف سے پیدا کردہ غلط فہمیاں تھیں کہ جو اس قسم کے مسائل کھڑے کرتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد و وحدت ہرگز برقرار نہ رہے۔

معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ مشہور حجازی مؤلف عبداللہ علی القصیمی اپنی کتاب الصراع میں شیعوں کی مذمت کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

شیعہ ہمیشہ سے مساجد کے دشمن تھے یہی وجہ ہے کہ جو شخص شیعوں کے شہروں میں جائے، شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک اسے بہت کم مساجد دکھائی دیں گی۔[1]

---

[1] اس کی عبارت اس طرح ہے۔

والشیعۃ ھم ابدا اعداء المساجد ولھذا یقل ان یشاھد الضارب فی طول بلادھم وعرضھا مسجدًا

(الصراع جلد ۲ ص ۲۴، جیسا کہ علامہ امینی نے الغدیر ج ۳ ص ۳۰۰ پر نقل کیا ہے)

خوب غور کریں کہ ———— ہم ان تمام مساجد کو شمار کرتے کرتے تھک جاتے ہیں کہ جو شاہراہوں، بازاروں، کوچوں بلکہ شیعہ محلوں میں موجود ہیں ۔ بعض مقامات پر تو ایک ہی علاقے میں اتنی زیادہ مسجدیں ہیں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بس کرو، آؤ کوئی اور کام بھی کرو۔

لیکن اس کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک مشہور مؤلف اس صراحت سے ایسی بات کرتا ہے کہ جو ہم جیسے لوگوں کے نزدیک تو محض مضحکہ خیز ہے کہ جو ان مناطق اور شیعہ علاقوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان حالات میں اگر فخر رازی کوئی ایسی نسبت دیتا ہے تو زیادہ تعجب نہیں کرنا چاہیے۔

عدم تحریف قرآن ———— کے دلائل

۱۔ **حافظانِ قرآن :** عدم تحریف قرآن کے بارے میں ہمارے پاس بہت زیادہ دلائل و براہین موجود ہیں ان میں زیادہ واضح اور روشن زیر بحث آیت اور قرآن کی کچھ اور آیات کے علاوہ اس عظیم آسمانی کتاب کی تاریخ بھی ہے ۔

مقدمہ کے طور پر اس نکتے کی یاد دہانی ضروری ہے کہ وہ ضعیف اقلیت کہ جس نے تحریف قرآن کا احتمال ذکر کیا ہے، وہ صرف قرآن میں کمی کے سلسلے میں ہے ۔ ورنہ کسی نے بھی یہ احتمال پیش نہیں کیا کہ موجودہ قرآن میں کسی چیز کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ (غور کیجیے گا)

یہاں سے گذر کر اگر ہم اس موضوع پر غور و فکر کریں کہ قرآن مسلمانوں کے لیے سب کچھ تھا ———— قانونِ اساسی، زندگی کا دستور العمل، حکومت کا پروگرام، مقدس آسمانی کتاب اور رمز عبادت ———— سب کچھ تو قرآن تھا ———— تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اصولی طور پر اس میں کمی بیشی کا امکان ہی نہیں ۔

قرآن ایک ایسی کتاب تھی کہ پہلے دور کے مسلمان ہمیشہ نمازوں میں، مسجدوں میں، گھروں میں، میدان جنگ میں دشمن کا سامنا کرتے ہوئے اپنے مکتب کی حقانیت پر استدلال کرنے کے لیے اسی سے استفادہ کرتے تھے ———— یہاں تک کہ تاریخ اسلام سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم قرآن عورتوں کا حق مہر قرار دیتے تھے ———— اور اصولی طور پر ———— تنہا وہ کتاب کہ جو تمام محافل کا موضوع تھی اور ہر بچے کو ابتدائے عمر سے جس سے آشنا کیا جاتا تھا اور جو شخص بھی اسلام کا کوئی درس پڑھنا چاہتا اسے اس کی تعلیم دی جاتی تھی ———— جی ہاں وہ قرآن ———— یہی قرآن مجید ہے ۔

کیا اس کیفیت کے ہوتے ہوئے کسی شخص کو یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اس آسمانی کتاب میں تغیر و تبدل ہو گیا ہو ———— خصوصاً جبکہ ہم نے اسی تفسیر کی جلد اول کی ابتداء میں ثابت کیا ہے کہ قرآن ایک مجموعہ کی صورت میں، اسی موجودہ صورت میں خود زمانہ پیغمبر میں جمع ہو چکا تھا اور مسلمان سختی سے اسے یاد کرنے اور حفظ کرنے کو اہمیت دیتے تھے ۔ اصولی طور پر اس زمانے میں افراد کی شخصیت زیادہ تر اس بات سے پہچانی جاتی تھی کہ انھیں قرآن کی آیات کس حد تک یاد ہیں ۔

قرآن کے حافظوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ تواریخ میں ہے کہ حضرت ابوبکر کے زمانے میں ایک جنگ میں قرآن کے

چار سو قاری مارے گئے تھے [1]

"بئر معونہ" مدینہ کی نزدیکی آبادیوں میں سے تھی۔ یہاں ایک واقعہ رونما ہوا جس کے نتیجے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہی میں اس علاقے میں ایک جنگ رونما ہو گئی۔ اس جنگ میں اصحاب پیغمبرؐ میں سے قاریانِ قرآن کی ایک کثیر جماعت نے شربتِ شہادت نوش کیا یہ تقریباً ستر افراد تھے [2]

ان سے اور ان جیسے دیگر واقعات سے واضح ہو جاتا ہے کہ حافظ و قاری اور معلمین قرآن اس قدر زیادہ تھے کہ صرف ایک میدانِ جنگ میں ان میں سے اتنی تعداد نے جامِ شہادت نوش کیا ——— اور تعداد ایسی ہونا ہی چاہیے تھی کیونکہ ہم نے کہا ہے کہ قرآن مسلمانوں کے لیے صرف قانونِ اساسی نہیں ہے بلکہ ان کا سب کچھ اسی سے تشکیل پاتا ہے۔ خصوصاً ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی کتاب نہ تھی اور تلاوت و قرأت اور حفظ و تعلیم و تعلّم قرآن کے ساتھ مخصوص تھا قرآن ایک متروک کتاب نہ یہ گھر یا مسجد کے کسی کونے میں فراموشی کے گرد و غبار کے نیچے پڑی ہوئی نہ تھی کہ کوئی اس میں کمی یا زیادتی کر دیتا۔

حفظِ قرآن کا مسئلہ ایک سنت اور ایک عظیم عبادت کے عنوان سے ہمیشہ مسلمانوں کے درمیان تھا اور ہے یہاں تک کہ قرآن ایک کتاب کی صورت میں بہت زیادہ پھیل گیا اور تمام جگہوں پر پہنچ گیا ——— بلکہ آج بھی چھاپہ خانے کی صنعت کے وجود میں آنے کے بعد جبکہ اسلامی ممالک میں سب سے زیادہ قرآن ہی چھپتا اور نشر ہوتا ہے پھر بھی حفظِ قرآن کے مسئلے نے ایک قدیم سنت اور عظیم افتخار کے طور پر اپنی اہمیت و حیثیت کو محفوظ رکھا ہے اور ہر شہر و دیار میں ہمیشہ ایک جماعت حافظِ قرآن تھی اور آج بھی ہے۔

اس وقت بھی حجاز اور کئی دیگر اسلامی ممالک میں "تحفیظ القرآن الکریم" یا دوسرے ناموں سے ایسے مدارس موجود ہیں، جہاں طالب علموں کو پہلے مرحلے میں قرآن حفظ کرایا جاتا ہے۔ سفرِ مکہ کے دوران اس شہرِ مقدس میں ان مدارس کے سربراہوں سے جو ملاقات ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ ان مدارس میں بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مشغول تحصیل ہیں۔ جاننے والوں میں سے ایک شخص نے بتایا کہ اس وقت پاکستان میں تقریباً پندرہ لاکھ حافظانِ قرآن موجود ہیں۔

جیسا کہ دائرۃ المعارف فرید وجدی نے نقل کیا ہے جامعۃ الازہر مصر کی اسلامی یونیورسٹی میں داخلے کی ایک شرط پورے قرآن کا حفظ ہونا ہے اس کے لیے چالیس میں سے کم از کم بیس نمبر رکھے گئے ہیں۔

مختصر یہ کہ خود آنحضرتؐ کے حکم و تاکید سے کہ جو بہت زیادہ روایات میں آئی ہے حفظِ قرآن کی سنت زمانہ پیغمبرؐ سے لے کر آج تک ہر دور میں جاری و ساری ہے۔ کیا ایسی حالت میں تحریفِ قرآن کے بارے میں کسی احتمال کا امکان ہے؟

۲۔ کاتبانِ وحی: ان تمام امور کے علاوہ کاتبانِ وحی کا معاملہ بھی غور طلب ہے یہ وہ افراد تھے جو آنحضرتؐ کے حکم اور تاکید سے آپ پر قرآن کی آیات نازل ہونے کے بعد انھیں لکھ لیتے تھے ان کی تعداد چودہ سے لے کر تینتالیس تک بیان کی گئی ہے۔

---

[1] البیان فی تفسیر القرآن ص ۲۶۰ بحوالہ منتخب کنز العمال۔

[2] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۵۰۔

ابوعبداللہ زنجانی اپنی نہایت قیمتی کتاب "تاریخ قرآن" میں لکھتے ہیں۔

کان للنبی کتابا یکتبون الوحی وهم ثلاثة و اربعون اشهرهم الخلفاء الاربعة وکان الزمهم للنبی زید بن ثابت وعلی بن ابی طالب علیه السلام۔

پیغمبرؐ کے مختلف کاتب اور لکھنے والے کہ جو وحی لکھا کرتے تھے اور وہ تینتالیس افراد تھے کہ جن میں زیادہ مشہور خلفاء اربعہ تھے۔ لیکن اس سلسلے میں پیغمبرؐ کے سب سے بڑھ کر ساتھی زید بن ثابت اور علی ابن ابی طالب علیہ السلام تھے[1]

وہ کتاب کہ جسے اس قدر لکھنے والے تھے کیسے ممکن ہے کہ تحریف کرنے والے اس کی طرف ہاتھ بڑھا سکتے۔

۳۔ تمام رہبران اسلام نے اسی قرآن کی دعوت دی ہے: یہ امر قابل توجہ ہے کہ اسلام کے عظیم پیشواؤں کے کلمات کا مطالعہ نشاندہی کرتا ہے کہ ابتدائے اسلام سے باہم یک زبان لوگوں کو اسی موجودہ قرآن کی تلاوت، مطالعہ اور اس پر عمل کرنے کی دعوت دیتے تھے اور یہ امر خود نشاندہی کرتا ہے کہ یہ آسمانی کتاب اسلام کے ابتدائی دور سے لے کر بعد تک تحریف ناپذیر مجموعہ کی صورت میں موجود رہی ہے۔

نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کے کلمات اس دعویٰ کے زندہ گواہ ہیں۔

خطبہ ۱۳۳ میں آپ فرماتے ہیں:

وکتاب الله بین اظهرکم، ناطق لا یعیا لسانه، وبیت لا تهدم ارکانه، وعز لا تهزم اعوانه۔

اور کتاب اللہ تمہارے درمیان ایسا ناطق ہے جس کی زبان کبھی گنگ نہیں ہوتی۔ یہ ایسا گھر ہے جس کے ستون کبھی منہدم نہیں ہوتے اور یہ ایسا سرمایۂ عزت ہے جس کے انصار کبھی مغلوب نہیں ہوتے۔

خطبہ ۱۷۶ میں فرماتے ہیں:

واعلموا ان هذا القرآن هو الناصح الذی لا یغش والهادی الذی لا یضل۔

جان لو کہ یہ قرآن ایسا ناصح ہے جو اپنی نصیحت میں کبھی خیانت نہیں کرتا اور ایسا ہادی ہے جو کبھی گمراہ نہیں کرتا۔

نیز اسی خطبے میں ہے:

وما جالس هذا القرآن احد الا قام عنه بزیادة او نقصان، زیادة من هدی، او نقصان من عمی۔

---

[1] تاریخ القرآن ص ۲۴۔

کوئی شخص اس قرآن کا ہم نشین نہیں ہوتا مگر یہ کہ اس کے پاس سے زیادتی یا نقصان کیساتھ اٹھتا ہے۔ ہدایت کی زیادتی یا گمراہی کی کمی۔

اسی خطبے کے آخر میں ہے:

ان اللہ سبحانہ لم یعظ احداً بمثل ھذا القرآن، فانہ حبل اللہ المتین وسببہ الامین

خدا نے کسی کو اس قرآن جیسی وعظ و نصیحت نہیں کی۔ کیونکہ یہ خدا کی محکم رسی اور اس کا قابلِ اطمینان وسیلہ ہے۔

خطبہ ۱۹۸ میں ہے:

ثم انزل علیہ الکتاب نوراً لا تطفأ مصابیحہ، وسراجاً لا یخبو توقدہ،.....

ومنہاجاً لا یضل نہجہ.........وفرقاناً لا یخمد برہانہ

اس کتاب کے بعد خدا نے اپنے نبی پر ایک کتاب نازل کی ــــــ وہ کتاب جو خاموش نہ ہونے والا نور ہے اور جو ایسا چراغ پر فروغ ہے کہ جس میں تاریکی آہی نہیں سکتی اور یہ ایسا راستہ ہے جس پر چلنے والے گمراہ نہیں ہوسکتے اور یہ حق کی باطل سے جدائی کا ایسا سبب ہے جس کی برہان خاموش نہیں ہوتی۔

ایسی تعبیرات حضرت علی علیہ السلام اور دیگر پیشوایان دین کے کلمات و ارشادات میں بہت زیادہ ہیں۔

فرض کریں کہ اگر دستِ تحریف اس آسمانی کتاب کی طرف بڑھا ہوتا تو کیا پھر بھی ممکن تھا کہ اس کی طرف دعوت دی جاتی اور اسے رہ کشا، حق کی باطل سے جدائی کا ذریعہ، نہ بجھنے والا نور، خاموش نہ ہونے والا چراغ، خدا کی محکم رسی اور اس کا امین و قابلِ اطمینان وسیلہ قرار دے کر تعارف کروایا جاتا۔

۴۔ **آخری دین اور ختم نبوت کا تقاضا:** اصولی طور پر پیغمبر اسلام کی خاتمیت قبول کر لینے کے بعد اور یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ دینِ اسلام آخری خدائی دین ہے اور قرآن کا پیغام دنیا کے خاتمے تک برقرار رہے گا کس طرح یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ خدا اسلام اور پیغمبر خاتم کی اس واحد سند کی حفاظت نہیں کرے گا۔

اسلام کے ہزاروں سال تک باقی رہنے، جاودان ہونے اور آخری دنیا تک رہنے کے ساتھ کیا تحریفِ قرآن کا کوئی مفہوم ہوسکتا ہے؟

۵۔ **روایاتِ ثقلین:** روایات ثقلین کہ جو طرق معتبرہ و متعددہ سے پیغمبر اسلام سے نقل ہوئی ہیں قرآن کی اصالت اور ہر قسم کے تغیر و تبدل سے محفوظ رہنے پر ایک اور دلیل ہیں کیونکہ ان روایات کے مطابق پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

میں تمھارے درمیان میں سے جارہا ہوں اور دو گرانمایہ چیزیں تمھارے لیے بطور یادگار چھوڑے جارہا ہوں، پہلی قرآن اور دوسری میری اہل بیت۔ اگر تم نے ان کا دامن نہ چھوڑا، تو ہرگز

گمراہ نہیں ہوگے[1]

کیا ایسی بات کسی ایسی کتاب کے لیے صحیح ہے جو تحریف کا شکار ہو گئی ہو۔

۶۔ قرآن جھوٹی اور سچی روایات کے لیے کسوٹی ہے : ان سب پہلوؤں سے قطع نظر قرآن کا تعارف سچی اور جھوٹی روایات واحادیث کو پرکھنے کے لیے معیار کے طور پر کروایا گیا ہے بہت سی روایات کہ جو منابع اسلام میں آئی ہیں ان میں ہے کہ جس حدیث کے سچے یا جھوٹے ہونے کے بارے میں شک کرو اسے قرآن کے سامنے پیش کرو، جو حدیث قرآن کے موافق ہے وہ حق ہے اور جو حدیث اس کے مخالف ہے وہ باطل اور غلط ہے۔

فرض کریں کہ قرآن میں کمی کے لحاظ سے ہی تحریف ہوئی ہوتی تب بھی ہرگز ممکن نہ تھا کہ اس کا تعارف حق و باطل کو پرکھنے کی کسوٹی کے طور پر کروایا جاتا۔

روایاتِ تحریف

مسئلہ تحریف کے بارے میں جو بعض لوگوں کے ہاتھ اہم ترین دستاویز ہے وہ ایسی مختلف روایات ہیں جن کا حقیقی مفہوم نہیں سمجھا گیا یا پھر ان کی سند کے بارے میں تحقیق نہیں کی گئی جس کی وجہ سے اس قسم کی بری تعبیر وجود میں آئی ہے۔

ایسی روایات مختلف قسم کی ہیں :

۱۔ ایسی روایات جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علیؑ نے قرآن جمع کرنا شروع کیا جب اسے جمع کر چکے تو اسے صحابہ کے ایک گروہ کے پاس لے آئے انھوں نے مقام خلافت کے ارد گرد کو گھیر رکھا تھا۔ آپ نے پیش فرمایا تو انھوں نے اسے قبول نہ کیا۔ اس پر حضرت علیؑ نے کہا : پھر تم اسے کبھی نہ دیکھو گے۔

لیکن ان روایات میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے پاس جو قرآن تھا وہ دوسرے قرآنوں سے مختلف نہیں تھا۔ البتہ تین چیزوں کا فرق تھا۔

پہلا یہ کہ اس کی آیات اور سورتیں ترتیب نزولی کے مطابق منظم کی گئی تھیں۔

دوسرا یہ کہ ہر آیت اور سورہ کی شانِ نزول اس کے ساتھ لکھی ہوئی تھی۔

تیسرا یہ کہ جو تفاسیر آپ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی تھیں وہ اس میں درج تھیں۔ نیز اس میں آیات ناسخ و منسوخ کی نشاندہی بھی کی گئی تھی۔

---

[1] حدیث ثقلین متواتر احادیث میں سے ہے یہ حدیث اہل سنت کی بہت سی کتب میں صحابہ کی ایک جماعت کی وساطت سے پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہے ان صحابہ میں ابوسعید خدری، زید بن ارقم، زید بن ثابت، ابوہریرہ، حذیفہ بن اسید، جابر بن عبداللہ انصاری، عبداللہ حنطب، عبد بن حمید، جبیر بن مطعم، ضمرہ اسلمی، ابوذر غفاری، ابورافع اور ام سلمہ وغیرہ شامل ہیں۔

لہٰذا وہ قرآن جو حضرت علی علیہ السلام نے جمع کیا تھا اس میں اس قرآن سے ہٹ کر کوئی نئی چیز نہ تھی اور جو چیز زیادہ تھی وہ تفسیر تاویل، شانِ نزول اور ناسخ و منسوخ کی تمیز وغیرہ تھی ——— دوسرے لفظوں میں وہ قرآن بھی تھا اور قرآن کی اصلی تفسیر بھی تھی۔

کتاب سلیم بن قیس میں ہے:

ان امیر المؤمنین (ع) لما رای غدر الصحابة وقلة وفائهم لزم بیته، واقبل علی القرآن، فلما جمعه کله، وکتابه بیده، وتأویله الناسخ والمنسوخ، بعث الیه ان اخرج فبایع، فبعث الیه انی مشغول فقد آلیت علی نفسی لا ارتدی برداء الا لصلاة حتی اؤلف القرآن واجمعه۔[1]

جس وقت امیر المومنینؑ نے صحابہ کی بے وفائی اور دوستوں کی کمی دیکھی تو گھر نہ چھوڑا اور قرآن کی طرف متوجہ ہوئے آپ قرآن جمع کرنے اور اسے اپنے ہاتھ سے لکھنے میں مشغول ہو گئے یہاں تک کہ تاویل اور ناسخ و منسوخ سب کو جمع کر لیا اس دوران میں انہوں نے آپ کے پاس کسی کو بھیجا کہ گھر سے باہر نکلیں اور بیعت کریں آپ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں مشغول ہوں میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ جب تک قرآن جمع نہ کر لوں سوائے نماز کے عبا کندھے پر نہیں ڈالوں گا۔

۲۔ ان روایات کی دوسری قسم وہ ہے جو تحریف معنوی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تحریف تین طرح کی ہے:۔

۱۔ تحریف لفظی

۲۔ تحریف معنوی

۳۔ تحریف عملی

۱۔ تحریف لفظی یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ اور عبارت میں کمی بیشی اور تغیر کیا جائے اور یہ وہ تحریف ہے جس کا ہم اور تمام محققینِ اسلام شدت سے انکار کرتے ہیں۔

۲۔ تحریف معنوی یہ ہے کہ آیت کا معنی اور تفسیر اس طرح سے کی جائے کہ وہ اس کے حقیقی مفہوم کے برخلاف ہو۔

۳۔ تحریف عملی یہ ہے کہ اس کے خلاف عمل کیا جائے۔

مثلاً تفسیر علی بن ابراہیم میں ابوذر سے منقول ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی:۔

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ

جس دن کچھ لوگوں کے چہرے تو سفید ہوں گے اور کچھ کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ (آلِ عمران ـ ۱۰۶)

[1] بحار الانوار ج ۱۹ ص ۱۱۔

تو پیغمبرؐ نے فرمایا :-

روز قیامت لوگوں سے سوال کیا جائے گا کہ تم نے ثقلین (قرآن اور عترت پیغمبرؐ) کے ساتھ کیا سلوک کیا تو لوگ کہیں گے :

اما الاکبر فحرفناہ ، و نبذناہ وراء ظھورنا ....

ہم نے ثقل اکبر (قرآن) کی تحریف کی اور اسے پس پشت ڈال دیا ....

واضح ہے کہ یہاں تحریف سے مراد وہی مفہوم قرآن کو دگرگوں کرنا اور اسے پس پشت ڈال دینا ہے۔

۳۔ تیسری قسم ان روایات کی ایسی روایات ہیں جو جعلی ہیں۔ یہ روایات دشمنوں، منحرفوں یا نادانوں نے قرآن کو بے اعتبار کرنے کے لیے گھڑی ہیں مثلاً وہ متعدد روایات جو احمد بن محمد بن سیاری سے نقل ہوئی ہیں کہ جن کی تعداد ایک سو اٹھاسی تک جا پہنچی ہے۔ مرحوم حاجی نوری نے کتاب "فصل الخطاب" میں انھیں فراوانی سے نقل کیا ہے۔

ان احادیث کا راوی سیاری بہت سے بزرگ علماء رجال کے بقول فاسد المذہب، ناقابل اعتماد اور ضعیف الحدیث تھا اور بعض کے بقول صاحب غلو، منحرف، تناسخ کے ساتھ مشہور اور کذاب تھا مشہور صاحب کتاب رجال کشی کے بقول امام جواد علیہ السلام نے اپنے خط میں سیاری کے دعووں کو باطل اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔

البتہ روایات تحریف سیاری میں منحصر نہیں ہیں لیکن ان کا زیادہ تر حصہ اسی کی طرف سے ہے۔

ان جعلی روایات میں کچھ مضحکہ خیز روایات بھی نظر آتی ہیں جو شخص تھوڑا بہت بھی مطالعہ رکھتا ہے وہ فوراً ان روایات کی خرابی کو سمجھ لیتا ہے مثلاً ایک روایت کہتی ہے کہ سورۂ نساء کی آیہ ۳ میں "وان خفتم الا تقسطوا فی الیتامی فانکحوا ما طاب لکم من النساء" (اور اگر تمھیں ڈر ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کرسکو گے تو ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمھیں اچھی لگتی ہیں) شرط اور جزاء کے درمیان میں سے ایک تہائی سے زیادہ قرآن ساقط ہوگیا ہے۔

حالانکہ ہم سورۂ نساء کی تفسیر میں کہہ چکے ہیں کہ اس آیت میں شرط اور جزا پوری طرح ایک دوسرے سے مربوط ہیں یہاں تک کہ اس میں سے ایک لفظ بھی ساقط نہیں ہوا۔

علاوہ ازیں ایک تہائی سے زیادہ تو پھر اس حساب سے کم از کم چودہ پاروں کے برابر بنتا ہے۔

یہ بات انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ ان سب کاتبانِ وحی اور زمانہ پیغمبرؐ سے لے کر آج تک قرآن کے حافظوں اور قاریوں کے ہوتے ہوئے اس کے چودہ پارے ضائع ہوگئے اور کوئی آگاہ بھی نہ ہوا۔

ان جھوٹوں اور جعل سازوں نے اس تاریخی حقیقت کی طرف توجہ نہیں کی کہ قرآن کہ جو اسلام کا قانون اساسی ہے اور شروع سے مسلمانوں کا سب کچھ اسی سے تشکیل پاتا ہے رات دن گھروں اور مسجدوں میں اس کی تلاوت ہوتی رہتی ہے کیا اس عالم میں اس کا ایک لفظ بھی ساقط کیا جاسکتا تھا چہ جائیکہ اس کے چودہ پارے غائب کردیئے جائیں۔ یہ اتنا بڑا جھوٹ ایسی احادیث گھڑنے والوں کے بے بنیاد ہونے کی واضح دلیل ہے۔

لہ یہ تعداد کتاب "برہان روشن" کے مؤلف نے لکھی ہے۔

بہت سے بہانہ تراش کتاب فصل الخطاب کا سہارا لیتے ہیں۔ اس کتاب کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے یہ مرحوم حاجی نوری کی تالیف ہے اور تحریف کے سلسلے میں لکھی گئی ہے اس کے بارے میں ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے اس کے علاوہ اس بات سے اس کی کیفیت واضح ہو جاتی ہے کہ مرحوم حاج شیخ آقا بزرگ تہرانی کہ جو مرحوم حاجی نوری کے شاگرد مبرز ہیں، اپنے استاد کے حالات کے ذیل میں "مستدرک الوسائل" کی پہلی جلد میں لکھتے ہیں :۔

باقی رہا کتاب "فصل الخطاب" کے بارے میں تو میں نے بارہا اپنے استاد سے سنا کہ فرماتے تھے کہ وہ مطالب جو فصل الخطاب میں ہیں وہ میرا ذاتی عقیدہ نہیں ہے۔ یہ کتاب تو میں نے بحث و اشکال کے لیے لکھی ہے اور اشارتاً عدم تحریف کے بارے میں اپنا عقیدہ بھی بیان کر دیا ہے اور بہتر تھا کہ میں کتاب کا نام "فصل الخطاب فی عدم تحریف الکتاب" رکھتا۔

اس کے بعد مرحوم محدث تہرانی کہتے ہیں :

عملی لحاظ سے ہم اپنے استاد کی روش اچھی طرح دیکھتے تھے کہ وہ روایات تحریف کو کچھ بھی وزن دینے کے قائل نہ تھے بلکہ انھیں ایسی روایات سمجھتے تھے جنھیں دیوار پر دے مارنا چاہیے۔ ہمارے استاد کی طرف تحریف کی نسبت وہی شخص دے سکتا ہے جو ان کے عقیدے سے آشنائی نہ رکھتا ہو۔

آخری بات یہ ہے کہ بعض ایسے لوگ جو مسلمانوں کے لیے اس آسمانی کتاب کی عظمت کو محسوس نہیں کرتے تھے انھوں نے کوشش کی کہ اس قسم کے خرافات اور اباطیل سے قرآن کو اس کی اصالت اور بنیاد سے گرادیں۔ گذشتہ اور موجودہ زمانے میں بہت سے ہاتھوں نے اس سلسلے میں کام کیا ہے اور کر رہے ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا ہم نے اخبارات میں پڑھا تھا کہ ابادی اسرائیل اور صیہونزم کی طرف سے قرآن شائع کیا گیا اور اس میں بہت سی آیات تبدیل کر دیں لیکن یہ ان کا اندھا پن تھا۔ علماء اسلام فوراً دشمن کی اس سازش سے آگاہ ہوئے اور ان نسخوں کو اکٹھا کر لیا۔ یہ سیاہ دل دشمن نہیں جانتے تھے کہ قرآن میں سے اگر ایک نقطہ بھی تبدیل ہو جائے تو قرآن کے مفسرین، حفاظ اور قارئین فوراً اس سے آگاہ ہو جائیں گے۔ وہ چاہتے ہیں کہ نور خدا کو بجھادیں لیکن وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔

یریدون ان یطفئوا نور الله بافواههم ویأبی الله الا ان یتم نوره ولو کره الکافرون

(توبہ — ۳۲)

۱۰۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ۝
۱۱۔ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝
۱۲۔ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝
۱۳۔ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ۝
۱۴۔ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۝
۱۵۔ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۰۔ ہم نے تجھ سے پہلے (بھی) گذشتہ امتوں کے درمیان پیغمبر بھیجے ہیں۔
۱۱۔ کوئی پیغمبران کے پاس نہیں آتا تھا مگر یہ کہ وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔
۱۲۔ ہم اسی طرح (اور تمام وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے) قرآن کو مجرموں کے دلوں کے اندر راستہ دیتے ہیں۔
۱۳۔ (لیکن اس کے باوجود) وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور گذشتہ امتوں کی روش بھی اسی طرح تھی۔
۱۴۔ اور اگر ہم آسمان سے ان کے لیے کوئی دروازہ کھول دیں اور وہ مسلسل اس میں اوپر کی طرف جائیں
۱۵۔ تو کہیں گے کہ ہماری چشم بندی کی گئی ہے بلکہ ہیں (سرتاپا) مسحور کر دیا گیا ہے۔

تفسیر

ہٹ دھرمی اور محسوسات کا انکار

ان آیات میں پیغمبر اکرمؐ اور مومنین کو اپنی دعوت میں درپیش مشکلات کے مقابلے میں تسلّی و تشفّی کے لیے گذشتہ انبیاء کی زندگی اور گمراہ و متعصب قوموں کے مقابلے میں ان کی مصیبتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: تجھ سے پہلے ہم نے گذشتہ امتوں کے درمیان بھی نبی بھیجے تھے (و لقد ارسلنا من قبلك فی شیع الاولین)۔

لیکن وہ لوگ ایسے ہٹ دھرم اور سخت مزاج تھے کہ "جو پیغمبر بھی ان کے پاس آیا وہ اس کا تمسخر اڑاتے (وما یأتیھم من رسول الا کانوا بہ یستھزءون)۔

یہ استہزاء چند امور کی وجہ سے ہوتا تھا

ــــ انبیاء کی شان و شوکت کو کم کرنے اور حق کے متلاشی اور حق طلب افراد کو اُن سے دُور کرنے کے لیے۔

ــــ خدائی رسولوں کی منطق کے مقابلے میں ان کی اپنی ناتوانی کی وجہ سے چونکہ وہ لوگ ان کے دندان شکن دلائل کا جواب نہیں دے سکتے تھے لہٰذا تمسخر کا سہارا لیتے یعنی بے منطق ناتوانوں کا حربہ استعمال کرتے تھے۔

ــــ اس بناء پر کہ انبیاء بدعت شکن تھے اور غیر مناسب رسوم و رواج کے خلاف قیام کرتے تھے لیکن جاہل متعصب کہ جو ان غلط رسوم و رواج کو ابدی سمجھتے تھے انھیں اس کام پر تعجب ہوتا تھا اور وہ استہزاء کرنے لگتے تھے۔

ــــ یہ لوگ اس لیے بھی استہزاء کرتے تھے کہ اپنے خوابیدہ ضمیر کو سلائے رکھیں اور کہیں کوئی ذمہ داری اور مسئولیت ان کے سر نہ آجائے۔

ــــ اس لیے کہ بہت سے انبیاء کے ہاتھ مالِ دنیا سے تہی ہوتے تھے اور ان کی زندگی سادہ ہوتی تھی جو لوگ اپنے دل کے اندھے پن کی وجہ سے شخصیت کو نئے لباس، اعلیٰ سواری اور رنگین زندگی میں منحصر سمجھتے تھے انھیں تعجب ہوتا تھا کہ کیا ایک فقیر اور تہی دست انسان ان دولت مندوں اور خوشحال لوگوں کا رہبر و رہنما ہو سکتا ہے؟ لہٰذا وہ اس کا تمسخر اڑانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔

ــــ آخر کار یہ بھی تھا کہ وہ دیکھتے تھے کہ انبیاء کی دعوت قبول کرنے سے ان کی شہوات و خواہشات محدود ہو جائیں گی اور ان کی حیوانی آزادی چھن جائے گی۔ اور ان کے لیے فرائض اور ذمہ داریاں پیدا ہو جائیں گی لہٰذا وہ استہزاء سے کام لیتے تاکہ اپنے آپ کو ان فرائض اور ذمہ داریوں سے بچا سکیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا: اسی طرح ہم آیاتِ قرآن ان مجرموں کے دلوں میں بھیجتے ہیں (کذٰلک نسلکہ فی قلوب المجرمین)۔

لیکن ان تمام تبلیغ، تاکید، منطقی بیان اور معجزات دکھلانے کے باوجود یہ متعصب "تمسخر اڑانے والے" اس پر ایمان نہیں لاتے (لا یؤمنون بہ)۔

البتہ یہ انھی پر منحصر نہیں ہے" ان سے پہلے گزشتہ اقوام کی بھی یہی روش تھی (وقد خلت سنۃ الاولین)۔

[illegible] غوطہ زنی اور باطل پر ہٹ دھرمی کے باعث ان کا معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ اگر ہم ان کے لیے آسمان میں کوئی [illegible] آسمان کی طرف چڑھیں اور اتریں (ولو فتحنا علیھم باباً من السماء فظلوا فیہ یعرجون) تو کہیں گے [illegible] ہے (لقالوا انما سکرت ابصارنا) بلکہ ہمیں جادو کر دیا گیا ہے اور جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں، اس میں قطعاً کوئی حقیقت نہیں ہے (بل نحن قوم مسحورون)۔

یہ جائے تعجب نہیں کہ انسان عناد اور ہٹ دھرمی کے اس درجے پر پہنچ جائے کیونکہ انسان کی پاک روح اور خرابی سے بچی ہوئی فطرت کہ جو ادراک حقائق اور واقعیات کے اصلی چہرے کے مشاہدہ پر قدرت رکھتی ہے، گناہ جہالت اور حق سے دشمنی رکھنے کے زیر اثر آہستہ آہستہ تاریکی میں جا گرتی ہے۔ البتہ ابتدائی مراحل میں اسے پاک کرنا پوری طرح ممکن ہے لیکن اگر خدانخواستہ یہ حالت انسان میں راسخ ہو جائے اور "ملکہ" کی شکل اختیار کرلے تو پھر اسے آسانی سے ختم نہیں کیا جاسکتا اور یہ وہ مقام ہے کہ حق کا چہرہ انسان کی نظر میں دگرگوں ہوجاتا ہے یہاں تک کہ محکم ترین عقلی دلائل اور واضح ترین حسی براہین اس کے دل پر اثر نہیں کرتے اور اس کا معاملہ معقولات اور محسوسات دونوں کے انکار تک جا پہنچتا ہے۔

چند اہم نکات:

۱۔ "شیعہ کا مفہوم": "شیع" "شیعہ" کی جمع ہے۔ "شیعہ" ایسی جمعیت اور گروہ کو کہا جاتا ہے جس کے افراد خطِ مشترک کے حامل ہوں مفردات میں راغب نے کہا ہے:

"شیع" "شیاع" کے مادہ سے پھیلاؤ اور تقویت کے معنی میں ہے "شاع الخبر" اس وقت کہا جاتا ہے جب خبر متعدد اور قوی ہوجائے "شاع القوم" اس وقت کہا جاتا ہے جب جمعیت پھیل جائے اور زیادہ تعداد میں ہو اور "شیعہ" ان لوگوں کو کہتے ہیں کہ انسان جن کی وجہ سے قوی ہو۔

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں اس کی اصل "مشایعت" بمعنی متابعت سمجھے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیعہ پیروکار اور تابع کے معنی میں ہے اور شیعہ علیؑ انھیں کہا جاتا ہے جو حضرت علیؑ کے پیروکار ہوں اور ان کی امامت کا اعتقاد رکھتے ہوں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ مشہور حدیث حضرت ام سلمہ سے مروی ہے۔

شیعۃ علی ھم الفائزون یوم القیٰمۃ

(قیامت کے دن نجات پانے والے علیؑ کے پیرو ہیں)

یہ حدیث بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔

بہرحال اس لفظ کی اصل "شیاع" بمعنی پھیلاؤ اور تقویت سمجھیں یا مشایعت بمعنی متابعت جانیں ——— شیعہ اور تشیع کے مفہوم میں ایک طرح کی فکری ومکتبی ہم بستگی موجود ہونے کی دلیل ہے۔

ضمنی طور پر گذشتہ اقوام کے لیے "شیع" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ وہ انبیاء کے خلاف پراگندہ صورت میں عمل نہیں کرتے تھے بلکہ وہ خط مشترک اور ایک ہی پروگرام کے حامل تھے کہ جو ہم آہنگ اقدامات سے تقویت پاتا ہے۔

اگر گمراہ لوگ اس طرح باہم مل کر اقدامات کرتے ہوں تو کیا راہ حق کے سچے پیروکاروں کو اپنے راستے میں ہم آہنگی اور مشترکہ منصوبہ بندی اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ "نسلکہ" کی ضمیر کا مرجع: یہ لفظ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ مجرموں اور مخالفوں کو اپنی آیات اس طرح سے سمجھاتا ہے کہ گویا وہ ان کے دلوں میں داخل ہوگئی ہوں۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ عدم قابلیت اور عدم آمادگی کے سبب وہ باہر نکل آتی ہیں جیسے مقوی اور مفید غذا خراب اور غیر صحیح معدہ میں جذب نہیں ہوتی ۔ بالکل یہی حقیقت "نسلکہ" کہ جس کا مادۂ اصلی "سلوک" سے ہے سمجھی جا سکتی ہے ۔

لہٰذا "نسلکہ" کی ضمیر "ذکر" (قرآن) کی طرف لوٹتی ہے کہ جو گزشتہ آیات میں آیا ہے اسی طرح بعد والے جملے "لا یؤمنون بہ" میں "بہ" کی ضمیر اسی معنی کی طرف لوٹتی ہے یعنی ان تمام چیزوں کے باوجود وہ لوگ ان آیات پر ایمان نہیں لائیں گے اس بناء پر دو ضمیروں کے درمیان پوری طرح ہم آہنگی موجود ہے ۔

یہی معنی میں اس تعبیر کی نظیر سورۂ شعراء کی آیہ ۲۰۰ اور ۲۰۱ میں نظر آتی ہے ۔

بعض نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ "نسلکہ" کی ضمیر استہزاء کی طرف لوٹتی ہے کہ جو گزشتہ آیت سے مستفاد ہوتا ہے لہٰذا جملے کا معنی یہ ہوگا : ہم نے اس استہزاء کرنے کو (ان کے گناہوں اور ہٹ دھرمیوں کی وجہ سے) ان کے دل میں داخل کر دیا ہے ۔

لیکن یہ تفسیر کوئی اور اشکال نہ بھی رکھتی ہو تاہم دو ضمیروں کے درمیان سے ہم آہنگی ختم کر دیتی ہے اور اس کی کمزوری کے لیے یہی کافی ہے (غور کیجیے گا) ۔

ضمنی طور پر مندرجہ بالا جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ مبلغین کا فریضہ صرف یہ نہیں کہ مسائل لوگوں کے کانوں کو سنا دیں بلکہ انھیں تمام وسائل سے استفادہ کرنا چاہیے تا کہ حق بات ان کے دل میں اتار دیں اس طرح سے کہ وہ دلنشین ہو جائے یوں حق طلب لوگوں کو ارشاد و ہدایت ہو جائے گی اور ہٹ دھرم افراد پر اتمام حجت ہو جائے گی ۔

یعنی ——— تمام سمعی بصری اور عملی ذرائع سے استفادہ کرنا چاہیے ۔ واقعات اور داستانوں سے کام لینا چاہیے ۔ شعر و ادب اور ہنر و فن سے حقیقی اور اصلاحی معنی میں استفادہ کرنا چاہیے تا کہ کلمات حق لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو جائیں ۔

۳۔ **گزشتہ لوگوں کی روش :** انبیاء پر طرفدار باطل کی نکتہ چینی اور مردان خدا سے لوگوں کو دور کرنے کی سازشیں کوئی نئی چیز نہیں اور کسی خاص زمانے یا علاقے میں منحصر نہیں بلکہ جیسا کہ مذکورہ بالا تفسیر سے معلوم ہوتا ہے قدیم زمانے سے گمراہ قوموں میں ایسی سازشیں موجود ہیں ۔

لہٰذا ان سے ہرگز دہشت زدہ نہیں ہونا چاہیے اور اپنے اندر مایوسی اور ناامیدی کو جگہ نہیں دینا چاہیے ۔ یا دشمنوں کی طرف سے پیدا کردہ کثیر مشکلات سے نہیں ڈرنا چاہیے ۔

یہ بات تمام راہیان حق کے لیے ایک مؤثر دلجوئی اور تسلی ہے ۔

اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کسی دور اور کسی علاقے میں ہم دعوت حق نشر کریں اور پرچم عدل لہرائیں لیکن ہٹ دھرم اور سخت مخالفت کرنے والے دشمن کی طرف سے ہمیں ردعمل کا سامنا نہ کرنا پڑے تو ہم بہت ہی زیادہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں ۔ انبیاء الٰہی اور ان کے سچے پیروکار ان مخالفتوں کی وجہ سے کبھی مایوس نہیں ہوئے ۔ بلکہ ان کے لیے ضروری ہوتا تھا کہ ہر روز اپنی دعوت کی گہرائی اور گیرائی میں اضافہ کریں ۔

۴۔ **"فظلوا فیہ یعرجون" کا مفہوم :** یہ جملہ اور مندرجہ بالا آیات میں آنے والے بعد کے جملے اچھی طرح نشاندہی کرتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ آسمان سے کوئی دروازہ ان کے لیے کھول دیا جائے (ظاہراً آسمان یہاں اس تہ بہ تہ فضا کی

طرف اشارہ ہے جو زمین کے اطراف میں ہے کہ جس سے آسانی سے نکلنا ممکن نہیں ہے) اور مسلسل روز روشن میں اس میں آئیں جائیں پھر بھی وہ شدید ہٹ دھرمی سے کہیں گے کہ ہماری چشم بندی کر دی گئی ہے اور ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔

توجہ رہے کہ "ظلوا" دن میں کسی کام کو جاری رکھنے کی دلیل ہے عرب یا لفظ رات کے موقع کے لیے استعمال نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ "باتوا" کہتے ہیں جو مادہ "بیتوتہ" (رات گزارنا) سے ہے۔

زیادہ تر مفسرین نے یہی تفسیر انتخاب کی ہے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ "ظلوا" میں ضمیر فرشتوں کی طرف لوٹتی ہے یعنی اگر وہ فرشتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ وہ آسمان کی طرف جا رہے ہیں اور پلٹ رہے ہیں تو پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

علاوہ اس کے کہ یہ تفسیر قبل اور بعد کی آیات سے کہ جو عموماً مشرکین کے بارے میں ہیں سے مناسبت نہیں رکھتی (کیونکہ ملائکہ کا ذکر صرف پہلی چھ آیات میں آیا ہے اور ان کی طرف ضمیر کا لوٹنا بہت بعید ہے) بلاغت کلام میں بھی نقص کا باعث ہے کیونکہ قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ ——— یہاں تک کہ اگر یہ لوگ خود بصورت اعجاز روز روشن میں آسمان کی طرف جائیں اور پلٹ آئیں تو بھی حق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کریں گے (غور کیجیے گا)۔

۵۔ "سکرت ابصارنا" کا مطلب: "سکرت" "سکر" کے مادہ سے چھپانے کے معنی میں ہے یعنی ہٹ دھرم کافر کہتے ہیں کہ ہماری حقیقت بین آنکھ پر گویا پردہ ڈال دیا گیا ہے اور اگر ہم اپنے تئیں آسمان کی طرف محو پرواز دیکھیں تو یہ ایک خیالی بات ہے یہ بالکل وہی چیز ہے جسے فارسی زبان میں "چشم بندی" اور "نظر بندی" سے تعبیر کرتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ دوسرے کے ہاتھ کی صفائی کی وجہ سے انسان حقیقت کو صحیح طور پر نہیں دیکھ سکتا بلکہ اس کے خلاف محسوس کرتا ہے۔[1]

یہ جو اس کے بعد جملہ "بل نحن قوم مسحورون" (بلکہ ہم تو جادو زدہ ہیں) آیا ہے ——— اگرچہ فریب نظر بھی ایک قسم کا جادو ہے لیکن شاید یہ اس طرف اشارہ ہو کہ معاملہ چشم بندی سے بھی بالا ہو گیا ہے اور ہمیں سر تا پا جادو کر دیا گیا ہے نہ صرف ہماری آنکھ جادو کے زیر اثر ہے بلکہ ہمارا سارا وجود جادو کے سبب اپنا حقیقی احساس گنوا بیٹھا ہے اور جو کچھ یہ محسوس کرتا ہے، خلاف حقیقت ہے۔

دوسرے لفظوں میں ——— جب ہم کسی انسان کو کسی ذریعے سے اوپر لے جائیں اور نیچے لے آئیں تو وہ اس حالت کو نہ صرف اپنی آنکھ سے بلکہ پورے وجود کے ساتھ محسوس کرتا ہے لہٰذا اگر کسی کی پوری طرح چشم بندی کر دی جائے تو وہ پھر بھی اپنے اوپر نیچے آنے جانے کو محسوس کرے گا۔ یعنی فرض کریں کہ ان مشرکین کو ہم آسمان کی طرف لے جائیں تو پہلے کہیں گے کہ ہماری نظر کو فریب دیا گیا ہے اور بعد میں متوجہ ہوں گے کہ یہ حالت تو بدون چشم قابل احساس ہے تو کہیں گے کہ اصولی طور پر تو سر سے لے کر پاؤں تک ہمارا پورا وجود سحر زدہ ہے اور اس پر جادو کیا گیا ہے۔

---

[1] اُردو میں اسے "فریب نظر" کہتے ہیں (مترجم)

۱۶۔ وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ○

۱۷۔ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ○

۱۸۔ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ○

ترجمہ

۱۶۔ ہم نے آسمان میں برج قرار دیئے ہیں اور انھیں ناظرین کے لیے زینت عطا کی ہے۔

۱۷۔ اور اس کی ہر شیطان مردود سے حفاظت کی ہے۔

۱۸۔ مگر استراقِ سمع کرنے والے کہ شہابِ مبین جن کا تعاقب کرتے ہیں (اور انھیں ہانکتے ہیں)۔

تفسیر

شیطان شہاب کے ذریعے ہانکے جاتے ہیں:

ان آیات میں توحید اور شناخت خدا کی دلیل کے طور پر نظامِ آفرینش کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان آیات کے ذریعے قرآن و نبوت کے بارے میں گزشتہ آیات کی بحث مکمل کی گئی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے آسمان میں برج قرار دیئے ہیں (ولقد جعلنا فی السماء بروجا)۔

"بروج" "برج" کی جمع ہے اس کا اصلی معنی "ظہور" ہے اسی بنا پر اطرافِ شہر کی دیوار یا اجتماعِ لشکر کے اس مخصوص حصے کو برج کہا جاتا ہے جو خاص ظہور رکھتا ہو۔ نیز اسی بناء پر جب عورت اپنی زینت ظاہر و آشکارا کرے تو "تبرجت المرئۃ" کہتے ہیں۔

بہرحال آسمانی برج سورج اور چاند کی منازل کی طرف اشارہ ہیں زیادہ دقیق تعبیر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب ہم کرۂ زمین سے چاند اور سورج کی طرف نگاہ کریں تو سال کے مختلف مواقع پر انھیں ہم ایک خاص صورتِ فلکی میں دیکھتے ہیں (ستاروں کے مختلف مجموعے ہیں ان میں سے ہر ایک نے ایک خاص شکل اختیار کی ہوتی ہے، اسے صورتِ فلکی کہتے ہیں) اور کہا جاتا ہے کہ سورج برج حمل، ثور، میزان، عقرب یا قوس میں ہے[1]

---

[1] "حمل" بھیڑ کے بچے کو کہتے ہیں "ثور" بیل کے معنی میں ہے "میزان" ترازو کو کہا جاتا ہے۔ "عقرب" بچھو کو کہتے ہیں اور "قوس" کمان کے معنی میں ہے۔ ستاروں کے مختلف مجموعے ہیں جو تقریباً ان شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔

ان آسمانی برجوں کا وجود، آفتاب و ماہتاب کی منزلیں اور وہ خاص نظام جو ان کی حرکت کے لیے ان برجوں میں موجود ہے کہ جس سے ہماری دنیائے ہستی کی تقویم بنتی ہے ــــــــ آفریدگار اور خالق کے علم و قدرت پر یہ ایک واضح دلیل ہے یہ عجیب و غریب نظام جو دقیق بھی ہے اور باریک حساب کا حامل ہے مسلسل اور رواں دواں ہے ظاہر کرتا ہے کہ جہان کی خلقت ایک منصوبے اور ہدف کے تحت ہے اور اس میں ہم جتنا زیادہ غور و فکر کریں ہم اس جہان کے خالق کے اتنا ہی قریب ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے آسمان کو اور ان فلکی صورتوں کو ناظرین کی زینت عطا کی ہے (وزیناھا للناظرین)۔[1]

ایک تاریک ستاروں بھری رات میں آسمان کی طرف نظر اٹھائیں تو ہم دیکھیں گے کہ مختلف گوشوں میں ستاروں کے مختلف گروہ موجود ہیں گویا ہر گروہ کی اپنی ایک انجمن ہے۔ اور وہ آپس میں آہستہ آہستہ راز و نیاز کی باتیں کر رہے ہیں۔ بعض خیرہ خیرہ ہماری طرف دیکھتے ہیں مگر آنکھ سے اشارہ بھی نہیں کرتے اور بعض ہیں کہ مسلسل اشارہ کر رہے ہیں گویا ہمیں اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ بعض چمکتے ہوئے یوں لگتے ہیں کہ جیسے ہمارے قریب ہوتے جا رہے ہیں کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنے کم رنگ نور کے ساتھ گویا آسمانوں کی ان پہنائیوں سے بغیر آواز کے صدا دے رہے ہیں کہ ہم بھی یہاں ہیں ــــــــ یہ خوبصورت شاعرانہ منظر جو شاید بعض کے لیے تکرار مشاہدہ کے باعث معمول کا جلوہ ہو لیکن اس پر جتنا بھی غور و فکر کریں ــــــــ یہ قابل دید، جاذب نظر اور شوق انگیز ہے اور جب چاند اپنی مختلف شکلوں میں ان گروہ در گروہ ستاروں کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے تو یہ منظر اور بھی تازہ اور اعجاب انگیز ہو جاتا ہے۔

غروب آفتاب کے بعد ستارے یکے بعد دیگرے نمودار ہوتے ہیں گویا کسی پردے کی اوٹ سے باہر کی طرف دوڑ رہے ہوں۔ یہی تارے وم صبح غیرہ کن آفتاب کی قوت کے سامنے ٹھہر نہیں پاتے، بھاگ جاتے ہیں اور اپنے آپ کو چھپا لیتے ہیں۔

اس سے قطع نظر علمی زیبائیوں اور فراواں اسرار کی نگاہ سے آسمان کا چہرہ اس قدر خوبصورت ہے کہ ہزاروں سال سے تمام علماء اور دانش مندوں کی آنکھ اسی کی طرف لگی ہوئی ہے۔ خصوصاً آج کی دنیا میں نہایت طاقتور ٹیلی سکوپس اور ستارے دیکھنے والی عظیم دور بینوں کے ذریعے اس کی طرف دیکھا جاتا ہے اور ہر وقت اس ظاہراً خاموش مگر پُر غوغا عالم کے تازہ اسرار اہل دنیا کے لیے منکشف ہو رہے ہیں، سچ ہے کہ:

چرخ با ایں اختران نغز و خوش و زیباستی

آسمان ان عمدہ، اچھے اور زیبا ستاروں کے ساتھ ہے

بعد والی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے اس آسمان کو ہر مردود، شوم اور ملعون شیطان سے محفوظ رکھا ہے۔ (وحفظناھا من کل شیطٰن رجیم)۔

مگر وہ شیطان جو "استراق سمع" (خبریں چرانا) کی ہوس کرتے ہیں ان کا تعاقب شہاب مبین کرتے ہیں اور انھیں پیچھے کی

---

[1] "زیناھا" کی ضمیر "سماء" کی طرف لوٹتی ہے کیونکہ "سماء" مؤنث مجازی ہے۔

طرف ہانکتے ہیں (الامن استرق السمع فاتبعه شهاب مبین)۔

شیطان شہاب کے ذریعے کیسے ہانکے جاتے ہیں؟

زیر نظر آخری آیت ان آیات میں سے ہے جس کے متعلق مفسرین نے بہت کچھ کہا ہے اور ہر ایک نے ایک خاص راستہ طے کیا ہے اور اس سے ایک معین نتیجہ نکالا ہے۔

چونکہ بعینہ یہی مضمون سورۂ صافات (آیہ ۶، ۷) اور سورۂ جن (آیہ ۹) میں آیا ہے اور یہ ایسے مسائل میں سے ہے کہ جس کے بارے میں ممکن ہے بے خبر افراد کچھ ایسے سوالات اٹھائیں جو جواب کے بغیر رہ جائیں لہٰذا ضروری ہے کہ پہلے بزرگ عظیم اسلامی مفسرین کی آراء پر ایک نگاہ ڈال لیں اور پھر جس رائے کو ہم ترجیح دیں اسے بیان کیا جائے۔

۱۔ بعض مفسرین مثلاً تفسیر فی ظلال کا مؤلف ——— ان آیات اور اس قسم کی دیگر آیات سے بڑے آرام سے یہ کہہ کر گزر گئے ہیں کہ یہ ایسے حقائق ہیں جن کا ادراک ہمارے لیے ممکن نہیں ہے اور ضروری ہے کہ جو کچھ ہمارے حقیقی اعمال میں سے ہماری زندگی میں مؤثر ہے اسے اہمیت دیں۔ لہٰذا انھوں نے ان آیات کی اجمالی سی تفسیر پر قناعت کرتے ہوئے اس مسئلے کی توضیح سے صرف نظر کیا ہے۔

تفسیر فی ظلال کا مؤلف لکھتا ہے،

> شیطان کیا ہے؟ وہ کس طرح استراق سمع کرنا چاہتا ہے اور وہ کیا چرانا چاہتا ہے؟ یہ سب چیزیں خدائی غیوب میں سے ہیں کہ نصوص کے ذریعے جن کی دست یابی نہیں ہو سکتی اور ان کے بارے میں تحقیق و جستجو کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اس سے ہمارے عقیدے میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اس کا اس کے سوا کوئی فائدہ نہیں کہ فکر انسانی ایسی چیزوں میں مشغول ہو جاتی ہے جو اس کے ساتھ کوئی خاص ربط نہیں رکھتی اور اس سے انسان اپنی زندگی میں حقیقی عمل انجام دینے سے رُک جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے بارے میں تحقیق سے کسی جدید حقیقت کے بارے میں ہمیں کوئی نیا ادراک نہیں ملتا[1]

لیکن اس میں شک نہیں کہ قرآن ایک ایسی عظیم انسان ساز، تربیت کنندہ اور حیات بخش کتاب ہے کہ اگر کوئی چیز حیاتِ انسانی کے ساتھ ربط نہ رکھتی ہو تو وہ اس میں ہرگز نہ ہوگی۔

یہ کتاب ساری کی ساری درس ہے ——— درسِ زندگی ہے علاوہ ازیں کوئی شخص اس بات کو قبول نہیں کر سکتا کہ قرآن میں ایسے حقائق ہوں کہ جنھیں معلوم نہ کیا جا سکتا ہو، کیا قرآن نور اور کتاب مبین نہیں ہے اور کیا یہ لوگوں کے فہم و تدبر اور ہدایت کے لیے نازل نہیں ہوا۔ تو کیسے ان آیات کو سمجھنا ہم سے ربط نہیں رکھتا؟

---

[1] تفسیر فی ظلال ج ۵ ص ۳۹۶۔

بہر حال ان آیات اور ان جیسی آیات کے بارے میں یہ طرز اعتراض ہمیں پسند نہیں ہے۔

۲۔ مفسرین کی ایک اہم جماعت خصوصاً متقدمین مفسرین کا اصرار ہے کہ آیت کے ظاہری معنیٰ کو پوری طرح محفوظ رکھا جائے۔ ان کے نزدیک "سماء" اسی آسمان کی طرف اشارہ ہے اور "شہاب" اسی "شہاب" کی طرف اشارہ ہے یعنی وہی سرگرداں سنگریزے جو اس فضائے بیکراں میں گردش کر رہے ہیں اور کبھی کبھار وہ زمین کی قوتِ ثقل کی زد میں آجاتے ہیں تو زمین کی طرف کھنچ آتے ہیں۔ ہوا کی لہروں سے تیزی سے ٹکرانے کی بنا پر وہ سرخ اور شعلہ ور ہو جاتے ہیں اور خاکستر بن جاتے ہیں۔

نیز "شیطان" وہی خبیث، راندہ اور سرکش موجودات ہیں جو آسمانوں کی طرف جانا چاہتے ہیں اور ہمارے اس جہان کی کچھ خبریں کہ جو آسمانوں میں منعکس ہوتی ہیں انھیں استراق سمع سے (مخفی طور پر کان لگا کر) معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن شہاب تیروں کی طرح ان کی طرف آتے ہیں اور انھیں ایسا کرنے سے باز رکھتے ہیں[1]

۳۔ مفسرین کی ایک اور جماعت نے ان آیات کی تعبیرات کو تشبیہ، کنایہ اور امثال کے طور پر لیا ہے۔ یعنی اصطلاحاً انھیں سمبالک (SYMBOLIC) سمجھا ہے ان مفسرین میں المیزان کے عالی قدر مفسر اور صاحب تفسیر الجواہر طنطاوی شامل ہیں۔ ان مفسرین نے اس تشبیہ و کنایہ کو مختلف صورتوں میں بیان کیا ہے۔

الف۔ تفسیر المیزان میں ہے:

> مفسرین نے شیاطین کے استراق سمع اور شہاب کے ذریعے ان کے ہانکے جانے کے بارے میں جو مختلف توجیہات کی ہیں ایسی چیز پر مبنی ہیں جو کبھی ظاہر آیات و روایات سے ذہن میں آتی ہیں وہ یہ کہ افلاک زمین پر محیط ہیں ان میں فرشتوں کے مختلف گروہ موجود ہیں ہر گروہ کے لیے ان افلاک میں کئی دروازے ہیں کہ جن میں سے ان فرشتوں کے علاوہ کوئی نہیں جا سکتا۔ ان فرشتوں میں سے کچھ اپنے ہاتھ میں شہاب لیے ہوئے ہیں اور وہ استراق سمع کرنے والے شیاطین کی تاک میں ہیں کہ ان کے ذریعے ان کی سرکوبی کریں اور انھیں ہانکیں۔
>
> حالانکہ آج کی دنیا میں واضح ہو چکا ہے کہ ایسے نظریات بے بنیاد ہیں ایسے کوئی افلاک ہیں نہ دروازے اور نہ ہی ایسی اور چیزیں۔
>
> جو کچھ یہاں بطور احتمال کہا جا سکتا ہے یہ ہے کہ ایسے بیانات کلام الٰہی میں امثال کی طرح ہیں کہ جو غیر حسی حقائق واضح کرنے کے لیے حسی لباس میں ذکر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ خدا فرماتا ہے:
>
> وتلك الامثال نضربها للناس وما يعقلها الا العالمون

---

[1] فخر رازی نے اپنی تفسیر کبیر اور آلوسی نے روح المعانی میں اس تفسیر کا ذکر کرنے کے بعد ہیئت قدیمہ کے حوالے سے پیدا ہونے والے مختلف اشکالات کے جواب بھی دیئے ہیں اور کہا ہے کہ آج کی ہیئت کی طرف توجہ کرتے ہوئے افلاک کا پیاز کے چھلکوں کی طرح ہونے کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(یہ امثال ہیں کہ جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور صاحبانِ علم کے علاوہ انھیں کوئی نہیں سمجھ سکتا۔
(عنکبوت ـــــ ۴۳)

ایسی مثالیں قرآن میں بہت زیادہ ہیں مثلاً عرش، کرسی، لوح اور کتاب۔

لہٰذا آسمان کہ جو فرشتوں کا مسکن ہے سے مراد ایک عالمِ ملکوتی ہے جو عالمِ طبیعت سے ماوراء ہے کہ جو اس جہانِ محسوس سے برتر و بالاتر ہے اور اس آسمان کی باتیں چوری چھپے سننے کے لیے شیطانوں کے قریب ہونے اور ان کی طرف شہاب پھینکے جانے سے مراد یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ عالم ملائکہ سے قریب ہوں تاکہ اسرارِ خلقت اور حوادثِ آیندہ کے بارے میں آگاہی حاصل کریں لیکن وہ ملائکہ معنوی و ملکوتی انوار سے ان شیطانوں کو ہانکتے ہیں۔ کیونکہ ان انوار کو برداشت کرنے کی وہ تاب نہیں رکھتے۔[1]

ب۔ طنطاوی اپنی مشہور تفسیر میں بھی کہتا ہے:

ایسے علماء جو حیلہ گر اور ریاکار ہیں اور عام لوگ جو ان کی پیروی کرتے ہیں یہ اہلیت نہیں رکھتے کہ آسمانوں کے عجائبات، عالمِ بالا کی شگفتگیاں، اس کے بے کراں برکات اور ان پر محکم و منظم ڈھب سے آگاہ ہوں ـــــ خدا نے انھیں اس علم و دانش سے محروم رکھا ہے اور ستاروں بھرے خوبصورت اور مزین آسمان کے تمام اسرار ان افراد کے اختیار میں دیئے ہیں جو عقل و ہوش اور اخلاص و ایمان رکھتے ہیں۔

فطری اور طبیعی ہے کہ پہلا گروہ اس آسمان کے اسرار میں نفوذ سے روک دیا جاتا ہے اور درگاہِ الٰہی سے دھتکارا ہوا شیطان چاہے نوع البشر سے ہو یا غیر بشر سے ان حقائق تک رسائی کا حق نہیں رکھتا اور جس وقت وہ ان کے نزدیک ہوتا ہے تو دھتکار دیا جاتا ہے۔

ایسے افراد ممکن ہے بہت سال جئیں اور پھر مر جائیں مگر ان اسرار تک ہرگز نہیں پہنچ پاتے۔ ان کی آنکھیں کھلی تو ہوتی ہیں لیکن حقائق دیکھنے کی تاب نہیں رکھتیں ـــــ

کیا ایسا نہیں ہے کہ اس کا علم اس کے عاشقوں کے سوا کسی کو نہیں ملتا اور اس کے جمال کا نظارہ اس کے عارفوں کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔[2]

طنطاوی ایک اور جگہ کہتا ہے:

اس میں کیا مانع ہے کہ یہ تعبیرات کنایہ ہوں۔ منع حسی منع عقلی کی طرف اشارہ ہو جبکہ کنایہ

---

[1] المیزان ج ۱۷ ص ۱۳۰ سورۂ صافات کی آیات کے ذیل میں۔
[2] تفسیر طنطاوی ج ۸ ص ۱۱

بلاغت کی بہترین انواع میں سے ہے۔

کیا ہم دیکھتے نہیں کہ بہت سے لوگ جو ہمارے آس پاس زندگی گذارتے ہیں وہ اس زمین کے حدود دار لعب میں محبوس اور قید ہیں ان کی آنکھ کبھی جہانِ بالا کی طرف نہیں اٹھتی اور وہ صدائے بالا پر کان نہیں دھرتے اور اس جہان کے امور اور عجائبات کی انھیں کوئی خبر نہیں وہ خود خواہی، شہوت، کینہ وری، طمع، حرص اور خانماں ساز شہاب کے ذریعے ان اعلیٰ معانی کے ادراک سے ہانکے گئے ہیں (اور اگر کسی روز وہ ایسی خواہش کریں تو اپنے قلب وروح کی ان آلودگیوں کے باعث وہ ہانکے جائیں گے)[1]

ج:۔ ایک اور مقام پر اس نے جو گفتگو کی ہے اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:

جس وقت انسانوں کی ارواح اس دنیا سے جہانِ برزخ کی طرف منتقل ہوتی ہیں ان کا زندوں کی روحوں کے ساتھ تعلق اور ارتباط ہوتا ہے اور جہاں ان کے درمیان مناسبت اور میلان ہو اور وہ احضارِ ارواح وغیرہ کے ذریعے ان سے ارتباط اور تفاہم برقرار رکھ سکیں تو کچھ مسائل ان کے اختیار میں دے دیئے جاتے ہیں جو بعض اوقات حق اور بعض اوقات باطل ہوتے ہیں کیونکہ وہ عوالم اعلیٰ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے بلکہ ان کی رسائی صرف نچلے عوالم تک ہو سکتی ہے۔ مثلاً جیسے مچھلی اپنے محیط سے باہر نکل کر ہوا میں پرواز نہیں کر سکتی، وہ بھی طاقت نہیں رکھتے کہ اپنے جہان کے حدود ار لعب سے نکل کر بالاتر چلے جائیں۔

د:۔ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ جدید سائنسی انکشافات نشاندہی کرتے ہیں کہ بہت دور کی فضا سے طاقتور ریڈیائی لہروں کا ایک سلسلہ مسلسل جاری ہے انھیں کرۂ زمین میں ریڈیائی پیغامات وصول کرنے والے مخصوص مرکز کے ذریعے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کسی شخص کو معلوم نہیں کہ ان انتہائی طاقتور لہروں کا سرچشمہ کہاں ہے۔ بعض سائنس دان کہتے ہیں کہ قوی احتمال ہے کہ دور کے آسمانی کُروں میں بہت سی زندہ موجودات موجود ہیں کہ جو تمدن کے لحاظ سے ہم سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ لہٰذا وہ چاہتی ہیں کہ اپنی خبریں ہماری اس دنیا تک پہنچائیں ان خبروں میں ایسے مسائل بھی ہیں جو ہمارے لیے نئے ہیں وہ موجودات کہ جنھیں دیو اور پری کہتے ہیں کوشش کرتے ہیں کہ ان لہروں سے فائدہ اٹھائیں لیکن طاقتور شعائیں انھیں دور پھینک دیتی ہیں[2]

یہ تھے علماء اور مفسرینؒ کے مختلف نظریات۔

نتیجہ بحث:

ان آیات کی تفسیر کے سلسلے میں مباحث بہت طویل ہو گئے ہیں اب مکمل نتیجہ حاصل کرنے کے لیے ہمیں چند نکات کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔

۱۔ لفظ "سماء" (آسمان) بہت سی آیات قرآن میں اسی مادی آسمان کے معنی میں ہے مثلاً سورۂ اعراف کی آیہ ۴۰ میں ہے۔

---

[1] تفسیر طنطاوی ج ۱۸ ص ۱۰۔

[2] ترجمہ قرآن برفراز اعصار ۔ مؤلف ع ۔ نوفل صفحہ ۲۵۸۔

ان الذین کذبوا بآیاتنا واستکبروا عنها لا تفتح لهم ابواب السماء

وہ لوگ کہ جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے اور ان کے سامنے تکبر اختیار کیا ہے آسمان کے دروازے ان کے رُخ پر نہیں کھلیں گے۔

ہوسکتا ہے یہاں آسمان مقام قرب خدا کے لیے کنایہ ہو جیسا کہ سورۂ فاطر کی آیہ ۱۰ میں ہے۔

الیه یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعه

پاکیزہ باتیں اس کی طرف اوپر جاتی ہیں اور وہ عمل صالح کو بلند کرتا ہے۔

واضح ہے کہ اعمال صالح اور پاکیزہ باتیں کوئی ایسی چیز نہیں کہ خود اس آسمان کی طرف اوپر جائیں بلکہ ان کی پیش رفت مقام قربِ خدا کی طرف ہوتی ہے اور وہ روحانی عظمت و رفعت حاصل کرتے ہیں۔

اصولی طور پر آیاتِ قرآن کے بارے میں "انزل" اور "نزل" کی تعبیر واضح طور پر بتاتی ہے کہ مقام قدس پروردگار سے قلبِ پیغمبرؐ پر نزول مراد ہے۔

سورہ ابراہیم کی آیہ ۲۴ میں ہے:

الم ترکیف ضرب الله مثلاً کلمة طیبة کشجرة طیبة اصلها ثابت وفرعها فی السماء

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے اچھی بات کی کیا اچھی مثال پیش کی ہے کہ گویا ایک پاکیزہ درخت ہے اس کی جڑ مضبوط ہے اور اس کی ٹہنیاں آسمان میں ہیں۔

اس کی تفسیر میں ہم نے پڑھا ہے کہ یہ پاکیزہ درخت جسے خدا نے مثال کے طور پر بیان کیا ہے اس کی جڑ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اور علیؑ اس کی جڑ اور شاخ (وہی شاخ کہ جو آسمان تک پہنچی ہوئی ہے) اور دیگر ائمہ اس کی چھوٹی چھوٹی شاخیں ہیں[1]

ایک حدیث میں ہے:

کذلك الکافرون لاتصعد اعمالهم الی السماء

اسی طرح ہیں کفار کہ جن کے اعمال آسمان کی طرف اوپر نہیں جاتے۔

واضح ہے کہ ایسی احادیث میں آسمان اس حسی آسمان کی طرف اشارہ نہیں ہے یہاں سے ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ آسمان مادی مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے اور معنوی مفہوم میں بھی۔

۲۔ نجوم و ستارے بھی ایک مادی مفہوم رکھتے ہیں کہ جو یہی ستارے ہیں جو آسمان میں نظر آتے ہیں اور ایک اس لفظ کا معنوی مفہوم ہے کہ جو علماء اور بڑی شخصیت کی طرف اشارہ ہے کہ جو انسانی معاشروں کو روشنی بخشتے ہیں اور جیسے لوگ ستاروں کے ذریعے تاریک راتوں میں بیابانوں اور سمندروں میں اپنا راستہ ڈھونڈتے ہیں، انسانی معاشروں میں عام لوگ بھی زندگی اور سعادت کی راہ ان علماء آگاہ اور صاحبِ ایمان رہبروں کی مدد سے پاتے ہیں۔

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ ص ۳۱۰۔

مشہور حدیث جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے:

مثل اصحابی فیکم کمثل النجوم بایھا اخذ اھتدی

میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں جس کسی کی اقتداء ہو جائے باعث ہدایت ہے[1]

یہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

سورۂ انعام کی آیہ ۹۷ اس طرح ہے:

وھو الذی جعل لکم النجوم لتھتدوا بھا فی ظلمات البر والبحر

اور وہ ذات کہ جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ خشکی اور دریا کی تاریکیوں میں ان کے ذریعے

تمہاری ہدایت ہو۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں اس آیت کے ذیل میں منقول ہے کہ امامؑ نے فرمایا:

النجوم آل محمد

ستاروں سے مراد خاندانِ پیغمبر ہے[2]

۲۔ زیرِ بحث آیات کی تفسیر میں وارد ہونے والی متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں کی طرف شیاطین کے صعود کی ممانعت اور ستاروں کے ذریعے ان کا مار بھگایا جانا پیغمبر اکرم کی ولادت کے وقت سے ہوا اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے وقت سے شیاطین ایک حد تک ممنوع ہوئے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے بعد مکمل طور پر ممنوع ہو گئے[3]

ان تمام باتوں سے جو ہم نے بیان کی ہیں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ "سماء" کا یہاں معنوی مفہوم ہے اور یہ حق، ایمان اور روحانیت کے آسمان کی طرف اشارہ ہے اور ہر وقت شیطانوں کی کوشش ہے کہ وہ اس چار دیواری میں داخل ہونے کے لیے راہ پالیں اور سچے مومنین اور حامیانِ حق کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسوں کے ذریعے نفوذ پیدا کرلیں...... لیکن مردانِ الٰہی اور رہبرانِ راہِ حق...... انبیاء و آئمہ سے لے کر مجتہد علماء تک اپنے علم و تقویٰ کی طاقتور موجوں کے ساتھ ان پر حملہ کرتے ہیں اور انہیں اس آسمان کے قریب ہونے سے ہانکتے ہیں۔

اسی مقام پر حضرت مسیح کے تولد اور اس سے بالاتر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تولد اور شیطان کو دھتکارنے کے درمیان

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۹۔ یہ روایت سنی روایات سے ملتی جلتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا اطلاق اور عموم قابلِ عمل نہیں ہے کیونکہ صحابہ میں ہر قسم کے لوگ حتی کہ منافقین بھی داخل ہیں اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس سے یا تو سلمان و ابوذر جیسے خاص اصحاب مراد ہیں یا اصحاب کساء اور اہل بیت مراد ہیں۔ ہمارے اس نظریئے کی تائید سورۂ انعام کی آیہ ۹۷ کے ذیل میں آنے والی مذکورہ بالا روایت بھی کرتی ہے۔

[2] نور الثقلین جلد ۱ ص ۷۵۰۔

[3] نور الثقلین جلد ۳، ص ۵، تفسیر قرطبی ج ۵، ص ۳۶۲۹۔

ربط معلوم کیا جاسکتا ہے۔

نیز ہمیں پر آسمان کی طرف صعود اور اسرار سے آگاہی کے درمیان ارتباط معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس مادی آسمان میں کوئی خاص خبریں نہیں ہیں سوائے خلقت کی عجیب و غریب چیزوں کے کہ جو روئے زمین سے بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ نیز آج کی دنیا میں یہ مسئلہ یقینی ہو چکا ہے کہ اس بیکراں فضا میں پھیلے ہوئے ان آسمانی کرات میں سے بعض مُردہ ہیں اور بعض زندہ ہیں اور ان کے ساکنان بھی ہیں لیکن شاید ان کی زندگی ہم سے بہت زیادہ مختلف ہو۔

یہ موضوع بھی بہت قابلِ ملاحظہ ہے کہ شہاب صرف زمین کی فضا سے پیدا ہوتے ہیں۔ اطراف زمین کی ہوا سے پتھر کے ٹکڑے اٹھتے ہیں اور شعلہ ور ہوتے ہیں انھی سے شہاب پیدا ہوتے ہیں ورنہ زمین کی فضا سے باہر کوئی شہاب نہیں ہوتا البتہ زمینی فضا سے باہر کچھ پتھر سرگرداں ہیں لیکن انھیں شہاب نہیں کہا جاتا لیکن جب وہ زمینی فضا میں داخل ہوتے ہیں تو گرم ہو کر شعلہ ور ہو جاتے ہیں اور انسان کی نظروں کے سامنے آگ کی ایک لکیر کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے یہ حرکت کرتے ہوئے ستارے ہیں۔

نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آج کے انسان نے کئی مرتبہ زمین کی فضا سے باہر کی طرف عبور کیا ہے اور اس سے بہت بلند یہاں تک کہ چاند تک پہنچا ہے (توجہ رہے کہ زمین کی فضا ایک سو سے لے کر دو سو کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے جبکہ چاند ہم سے تین لاکھ کلومیٹر سے بھی زیادہ فاصلے پر ہے)۔

لہٰذا اگر مراد یہی مادی شہاب اور مادی آسمان ہو تو یہ مان لینا چاہیے کہ یہ علاقہ انسانی سائنسدانوں پر ظاہر ہو چکا ہے اور اس میں کوئی اسرار کی بات نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ بہت سے قرآنی شواہد جو ہم نے ذکر کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے مراد حق و حقیقت کا آسمان ہے، اور شیاطین وہی وسوسہ پیدا کرنے والے ہیں کہ جو کوشش کرتے ہیں کہ اس آسمان تک رسائی حاصل کر سکیں اور مخفی طور پر کان لگا کر باتیں سنیں اور لوگوں کو گمراہ کریں۔ ستارے اور شہاب یعنی رہبرانِ الٰہی اور علماء اپنے قلم کی طاقتور لہروں اور موجوں سے انھیں پیچھے کی طرف ہانکتے ہیں اور دھتکار دیتے ہیں۔

لیکن ـــــــ قرآن بحرِ بیکراں ہے اور ہو سکتا ہے کہ آنے والے علماء ان آیات کے سلسلے میں نئے حقائق تک دسترس حاصل کر لیں کہ آج جن تک ہم رسائی حاصل نہیں کر سکے۔

۱۹۔ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ○

۲۰۔ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ○

۲۱۔ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ○

ترجمہ

۱۹۔ اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس میں ثابت پہاڑ ڈالے اور تمام موزوں نباتات میں سے اس میں اگایا۔

۲۰۔ اور ہم نے تمھارے لیے طرح طرح کے وسائل زندگی فراہم کیے اور اسی طرح ان کے لیے بھی جنھیں تم روزی نہیں دے سکتے۔

۲۱۔ تمام چیزوں کے خزانے ہمارے پاس ہیں لیکن ہم معین اندازے سوا اسے نازل نہیں کرتے۔

تفسیر

ہر چیز کا خزانہ ہمارے پاس ہے:

یہاں آیات آفرینش کا ایک حصہ اور زمین میں عظمتِ خدا کی نشانیاں بیان کی گئی ہیں تاکہ گذشتہ بحث تکمیل کو پہنچے۔

پہلے بات زمین سے شروع کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے زمین کو پھیلایا (والارض مددنٰھا)۔

"مد"، دراصل وسعت دینے اور پھیلانے کے معنی میں ہے اور احتمال قوی یہ ہے کہ یہاں زمین کی خشکیوں کے پانی سے باہر نکلنے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ابتداء میں کرۂ زمین کی ساری سطح سیلابی بارشوں کے زیرِ اثر پانی کے نیچے ڈوبی ہوئی تھی سالہا سال اسی حال میں گذر گئے۔ سیلابی بارشیں کم ہوئیں۔ پانی زمین کے گڑھوں میں جاگزیں ہوا۔ آہستہ آہستہ خشکیاں پانی کے نیچے سے نمودار ہونے لگیں۔ یہی وہ چیز ہے جو روایاتِ اسلامی میں "دحو الارض" کے نام سے مشہور ہے۔ پہاڑوں کی خلقت چونکہ ان کے زیادہ فوائد کی وجہ سے توحید کی ایک نشانی ہے، اس لیے ان کا ذکر کرتے ہوئے مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے زمین مستقر اور ثابت پہاڑ ڈالے ہیں (والقینا فیھا رواسی)۔

پہاڑوں کے لیے "القاء" (پھینکنا) کی تعبیر استعمال کی گئی ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ پہاڑ زمین کی وہ سلوٹیں ہیں جو زمین کے عظیم کے

تدریجاً سرد ہونے کی بناء پر یا آتش فشانی مواد کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ تعبیر اس لحاظ سے ہو کہ "القاء" "ایجاد" کے معنی میں بھی آیا ہے۔ ہم اپنی روزمرہ زبان میں بھی کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں زمین کے لیے ایک پلان بنایا ہے اور اس میں چند کمرے ڈالے ہیں یعنی بنائے اور ایجاد کیے ہیں۔

بہرحال یہ پہاڑ علاوہ اس کے کہ جڑ سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہیں اور زرہ کی طرح زمین کے اندرونی خلفشار اور دباؤ کے مقابلے میں لرزتے نہیں، طوفانوں کی طاقت کو بھی درہم برہم کر دیتے ہیں اور ہوا کی رفتار کو پوری طرح کنٹرول کرتے ہیں یہ پہاڑ، پانی کے ذخیروں کے لیے بہت اچھی جگہیں ہیں جو یہاں برف کی صورت میں یا چشموں کی صورت میں موجود ہوتا ہے۔

خصوصاً لفظ "رواسی" استعمال کیا گیا ہے کہ جو "راسیہ" کی جمع ہے اور یہ ثابت اور مضبوط کے معنی میں ہے جو کچھ ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے اس کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ وہ خود بھی ثابت اور مستقر ہیں اور زمین کے نازک چھلکے اور انسانوں کی زندگی کے ثبات و قرار کا باعث ہیں۔

انسانی زندگی اور تمام جانداروں کی زندگی کے لیے بہترین عامل یعنی نباتات کی طرف بات کا رُخ رکھتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے زمین پر موزوں نباتات میں سے اگایا ہے (وانبتنا فیھا من کل شیء موزون)۔

"موزون" کس قدر خوبصورت اور رسا تعبیر ہے۔ یہ لفظ دراصل "وزن" کے مادہ سے ہر چیز کے اندازشناسائی کے معنی میں لیا گیا ہے[1]۔ یہ دقیق حساب، عجیب نظم و ضبط اور نباتات کے تمام اجزاء کے متناسب اندازوں کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک بلکہ ہر ایک کا ہر جز تنا، شاخ، پتہ، پھول، پھل اور گٹھلی سب کچھ معین حساب کتاب کا حامل ہے۔

کرہ زمین میں شاید لاکھوں قسم کے نباتات ہیں کہ جو مختلف خواص اور طرح طرح کے آثار رکھتے ہیں ان میں سے ہر ایک اللہ کی پہچان کا دریچہ ہے ان میں سے ہر ایک کا پتہ پتہ معرفتِ کردگار کی ایک کتاب ہے۔

اس جملے کے معنی میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے مراد مختلف معدنیات کا پہاڑوں میں پیدا ہونا ہے کیونکہ عرب لفظ "انبات" معدن اور کان کے بارے میں استعمال کرتے ہیں۔

بعض روایات میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ سے اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی تو فرمایا:۔

> مراد یہ ہے کہ خدا نے پہاڑوں میں سونے، چاندی، جواہرات اور باقی دھاتوں کی کانیں اور معدنیات پیدا کی ہیں[2]

یہ احتمال بھی ہے کہ "انبات" (اگانا) یہاں وسیع معنی میں ہو کہ جس میں تمام مخلوقات جنھیں خدا نے زمین میں پیدا کیا ہے، شامل ہوں۔ بخصوص نوح میں اس عظیم پیغمبر کی زبانی ہے کہ آپ لوگوں سے کہتے تھے،

---

[1] "الوزن معرفة قدر الشیء" (مفردات راغب)

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۹ (توجہ رہے کہ اس تفسیر کے مطابق "فیھا" کی ضمیر پہاڑوں کی طرف لوٹے گی۔)

واللہ انبتکم من الارض نباتا

اور خدا نے تمھیں نباتات کی طرح زمین سے اگایا ہے (نوح ــــــــ ۱۷)

بہرحال کوئی مانع نہیں کہ آیت وسیع مفہوم رکھتی ہو اور اس میں انسان، نباتات اور معدنیات وغیرہ سبھی شامل ہوں۔

انسان کے وسائل حیات چونکہ نباتات و معدنیات میں منحصر نہیں ہیں لہٰذا بعد والی آیت میں ان تمام نعمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے زمین میں تمھارے لیے انواع واقسام کے وسائل زندگی بنائے ہیں (وجعلنا لکم فیھا معایش)۔

نہ صرف تمھارے لیے بلکہ تمام زندہ موجودات کے لیے اور وہ کہ جنھیں تم روزی نہیں دیتے اور تمھاری دسترس سے باہر ہیں (ومن لستم لہ برازقین)۔ جی ہاں! ہم نے ان سب کو ان کی ضروریات فراہم کی ہیں۔

"معایش" "معیشۃ" کی جمع ہے اور یہ وسیلہ، ذریعہ، انسانی زندگی کی ضروریات کو کہتے ہیں کہ بعض اوقات جن کے پیچھے خود انسان جاتا ہے اور بعض اوقات وہ اس کے پیچھے آتی ہیں اگرچہ بعض مفسرین نے لفظ "معایش" کی تفسیر صرف زراعت، نباتات اور کھانے پینے کی چیزوں سے کی ہے لیکن واضح ہے کہ مفہوم لغت پوری طرح وسیع ہے اور تمام وسائل حیات پر محیط ہے۔

مفسرین نے من لستم لہ برازقین کی دو تفسیریں کی ہیں۔

پہلی یہ کہ خدا چاہتا ہے کہ انسانوں، حیوانوں اور زندہ موجودات سب کے لیے اپنی نعمات بیان کرے کہ انسان جنھیں غذا دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔

دوسری یہ کہ خدا چاہتا ہے کہ انسانوں کو متوجہ کرے کہ ہم نے بھی تمھارے لیے اس زمین میں وسیلہ زندگی قرار دیا ہے اور زندہ موجودات بھی تمھارے اختیار میں دیے ہیں (مثلاً چوپائے) کہ جنھیں تم روزی دینے کی توانائی نہیں رکھتے۔ خدا انھیں روزی دیتا ہے اگرچہ یہ کام تمھارے ہاتھوں انجام پاتا ہے[1] لیکن ہماری نظر میں پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے اور اس کی ادبی دلیل بھی ہم نے فٹ نوٹ میں بیان کردی ہے۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں موجود ایک حدیث بھی ہم اس تفسیر کی تائید میں پاتے ہیں جہاں من لستم لہ برازقین کے بارے میں ہے

لکل ضرب من الحیوان قدرنا شیئا مقدرا

---

[1] تفسیر اول کی بنا پر "من" (من لستم لہ برازقین) کا عطف "لکم" کی ضمیر پر ہوتا ہے اور دوسری تفسیر کی بنا پر "معایش" پر۔ بعض نے پہلی تفسیر پر اعتراض کیا ہے کہ مجرور کا اسم ظاہر ضمیر مجرور پر عطف نہیں ہوتا مگر یہ کہ حرف جر کی تکرار ہو یعنی یہاں ضروری تھا کہ لام "من" کے سر پر بھی آتی۔ دوسرا یہ کہ "من" کا اطلاق انسان کے علاوہ دیگر زندہ موجودات پر کس طرح ہوا ہے۔ لیکن یہ دونوں اعتراض صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ عبارات عرب میں حرف جر کی تکرار نہ ہونے پر شواہد موجود ہیں اور اسی طرح غیر ذوی العقول موجودات پر "من" کے اطلاق کی بھی مثالیں ہیں۔ دوسری تفسیر پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ لفظ "معایش" اتنا وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ تمام وسائل زندگی یہاں تک کہ چوپائے وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں۔ لہٰذا "معایش" کے ذکر کے بعد اس کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔ اسی بنا پر ہم نے پہلی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

تمام جانوروں کے لیے ہم نے کوئی نہ کوئی چیز مقدر کی ہے[1]

زیر بحث آخری آیت میں درحقیقت ایک سوال کا جواب دیا جارہا ہے کہ جو بہت سے لوگوں کی طرف سے کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ خدا اس قدر ارزاق و نعمات انسانوں کے قبضے میں کیوں نہیں دیتا کہ وہ ہر قسم کی سعی و کوشش سے بے نیاز ہو جاتے۔

ارشاد ہوتا ہے: تمام چیزوں کے خزانے ہمارے پاس ہیں لیکن ہم ان کی معیّن مقدار کے علاوہ نازل نہیں کرتے (وان من شیئٍ الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم)۔

لہٰذا ایسا نہیں ہے کہ ہماری قدرت محدود ہے اور اپنی نعمات کے ختم ہونے پر ہم وحشت زدہ ہیں بلکہ ہر چیز کا منبع، خزن اور سرچشمہ ہمارے پاس ہے اور ہم ہر زمانے میں ہر مقدار ایجاد کرنے کی قدرت رکھتے ہیں لیکن اس عالم کی تمام چیزیں کسی حساب کے ماتحت ہیں اور ارزاق بھی خدا کی طرف سے بمقدار حساب نازل ہوتی ہیں ـــــــ ایک اور جگہ قرآن کہتا ہے:۔

ولو بسط اللّٰہ الرزق لعبادہ لبغوا فی الارض ولکن ینزل بقدر ما یشاء (شوریٰ - ۲۷)

اگر خدا اپنے بندوں کے لیے بے حساب روزی پھیلا دیتا تو وہ جادۂ حق سے منحرف ہو جاتے، لیکن جتنی مقدار وہ چاہتا ہے نازل کرتا ہے (شوریٰ ـــــــ ۲۷)

پوری طرح واضح ہے کہ سعی و کوشش، انسانی زندگی سے سستی، کاہلی اور دل مردگی دور کرنے کے علاوہ حرکت و نشاط پیدا کرتی ہے اور یہ انسانوں کی صحیح و سالم فکری و جسمانی مشغولیت کے لیے بہت ہی اچھا وسیلہ ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو تمام چیزیں بے حساب انسان کے اختیار میں ہوتیں۔ اور نہ معلوم پھر دنیا کا کیا منظر ہوتا۔

کچھ بیکار انسان سیر شکم کے ساتھ بغیر کسی کنٹرول کے شور و غل مچاتے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس جہان کے لوگ اہل جنت کی طرح نہیں ہیں کہ جن کے قلب و روح سے ہر طرح کی شہوت، خواہش نفسانی، خود خواہی غرور اور کج روی دھل چکی ہو بلکہ یہ ایسے انسان ہیں کہ تمام نیک و بد صفات کے حامل ہیں انہیں اس جہان کی بھٹی سے کندن بن کر نکلنا چاہیے۔ سعی و کوشش اور صحیح حرکت و اشتغال سے بہتر کندن بنانے کے لیے کون سی چیز ہو سکتی ہے لہٰذا جس طرح فقر و فاقہ اور احتیاج و نیاز انسان کو انحراف اور بدبختی کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں اسی طرح حد سے زیادہ بے نیازی بھی فساد اور تباہی کا باعث ہے۔

چند اہم نکات:

۱۔ خدا کے خزانے کیا ہیں؟ قرآن حکیم کی متعدد آیات میں ہے کہ خدا کے خزانے رکھتا ہے۔ آسمان و زمین کے خزانے خدا کی ملکیت میں یا ہر چیز کے خزانے اس کے پاس ہیں۔

"خزائن" جمع ہے "خزانہ" کی جس کا معنی ہے وہ جگہ جہاں انسان اپنے اموال حفاظت کے لیے جمع کرتا ہے یہ اصل میں مادہ

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۹۔

"خزن" (بروزن "وزن") سے کسی چیز کے حفظ و نگہداری کے معنی میں ہے واضح ہے کہ جمع آوری اور ذخیرہ کرنے اور کسی چیز کو محفوظ کرنے کے لیے وہی شخص اقدام کرتا ہے جس کی قدرت محدود ہو اور جو ہر زمانے میں جو کچھ چاہے فراہم نہ کر سکے لہٰذا وہ قدرت کے موقع پر جس چیز کو ضروری سمجھتا ہے اسے ضرورت کے موقع کے لیے ذخیرہ کر لیتا ہے اور خزانہ میں جمع کر لیتا ہے۔

لیکن ــــــــ کیا یہ امور خدا کے بارے میں تصور کیے جا سکتے ہیں؟ یقیناً نہیں یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں، فخر رازی نے تفسیر کبیر میں اور راغب نے مفردات میں "خزائن اللہ" کی "مقدرات الٰہی" کے ساتھ تفسیر کی ہے یعنی تمام چیزیں قدرتِ خدا کے خزانے میں جمع ہیں اس میں سے جتنی مقدار وہ ضروری اور قرینِ مصلحت سمجھتا ہے ایجاد کرتا ہے۔

جبکہ بعض دیگر عظیم مفسرین نے کہا ہے کہ "خزائن اللہ" سے مراد امور کا وہ مجموعہ ہے کہ جو عالمِ ہستی اور جہانِ مادہ میں موجود ہیں لیکن اس عالم کی اعلیٰ اور مخصوص موجودات محدود مقدار میں پیدا ہوتی ہیں بغیر اس کے کہ امکانِ وجود انہی میں منحصر ہو۔[1]

یہ تفسیر اگرچہ اصولی طور پر قابلِ قبول مسئلہ ہے لیکن "عندنا" (ہمارے پاس) کی تعبیر پہلی تفسیر کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔ بہرحال خزائن اللہ جیسی تعبیرات کا انتخاب عام مفہوم میں خدا کے بارے میں صادق نہیں آتا۔ لیکن خدا چاہتا ہے کہ خود لوگوں کی زبان میں اُن سے بات کرے۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے ضمنی طور پر یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ بعض مفسرین کی طرف سے "خزائن" کے مفہوم کو پانی اور بارش میں معین و محدود کرنے پر نہ صرف کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ یہ مفہوم آیت کی وسعت کے ساتھ بھی مناسبت نہیں رکھتا۔

۲۔ نزولِ مقامی اور نزولِ مکانی، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے نزول ہمیشہ نزولِ مکانی یعنی اوپر سے نیچے آنے کے معنی میں نہیں ہوتا بلکہ کبھی نزولِ مقامی کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ مثلاً جس وقت کوئی نعمت کسی بڑے شخص کی طرف سے زیر دست لوگوں کو ملے تو اسے نزول سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی بناء پر قرآن مجید میں یہ لفظ خدا کی نعمتوں کے بارے میں استعمال ہوا ہے چاہے وہ آسمان سے نازل ہوں مثلاً بارش یا زمین میں پرورش پاتی ہوں مثلاً حیوانات، جیسا کہ سورۂ زمر کی آیت ۶ میں ہے:

وانزل لکم من الانعام ثمانیة ازواج

(اور اس نے تمہارے لیے آٹھ قسم کے چوپائے نازل کیے۔)

نیز لوہے کے بارے میں سورۂ حدید کی آیہ ۲۵ میں ہے۔

وانزلنا الحدید

اور ہم نے لوہا نازل کیا۔

اسی طرح دیگر مثالیں بھی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ "نزول" اور "انزال" یہاں وجود، ایجاد اور خلقت کے معنی میں ہے البتہ چونکہ خدا کی طرف سے بندوں کے لیے ہے لہٰذا اس قسم کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔

---

[1] المیزان جلد ۱۲ ص ۱۴۰۔

۲۲۔ وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ○

۲۳۔ وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ○

۲۴۔ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ○

۲۵۔ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۲۲۔ ہم نے ہوائیں (بادلوں کے ایک دوسرے سے ملنے، ان کے بارآور ہونے اور) تلقیح کے لیے بھیجیں، اور آسمان سے ہم نے پانی نازل کیا اور اس سے سیراب کیا جبکہ تم ان کی حفاظت اور نگہداری کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔

۲۳۔ اور ہم ہیں جو زندہ کرتے ہیں اور مارتے ہیں اور ہم (سارے عالم کے) وارث ہیں۔

۲۴۔ ہم تمہارے متقدمین کو بھی جانتے تھے اور متاخرین کو بھی۔

۲۵۔ تیرا پروردگار یقینی طور پر (قیامت میں) سب کو جمع اور محشور کرے گا کیونکہ وہ حکیم اور دانا ہے۔

تفسیر

ہوا اور بارش:

گزشتہ آیات میں بعض اسرار آفرینش کا تذکرہ تھا اور خدا کی نعمتوں کا بیان تھا۔ مثلاً زمین، پہاڑ، نباتات اور وسائل زندگی کی خلقت۔

زیر نظر پہلی آیت میں ہواؤں کے چلنے اور بارشوں کے نزول میں ان اسرار آفرینش کے نقش مؤثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ہم نے ہوائیں بھیجیں جبکہ وہ بارآور کرنے والی ہیں (بادلوں کے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہیں اور انھیں بارآور کرتی ہیں) (وارسلنا الریاح لواقح) اور ان کے پیچھے ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا (فانزلنا من السماء ماء)۔ اور اس ذریعے سے ہم نے سب کو سیراب (فاسقینٰکموہ) حالانکہ تم اس کی حفاظت اور نگہداری کی طاقت نہ رکھتے تھے (وما انتم لہ بخازنین)۔

"لواقح" "لاقح" کی جمع ہے جس کا معنی ہے بار آور کرنے والا۔ یہاں ان ہواؤں کی طرف اشارہ ہے جو بادلوں کے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہیں اور باہم پیوند کرتی ہیں اور انھیں بارش کے لیے تیار کرتی ہیں۔

بعض معاصرین نے اس آیت کو ہواؤں کے ذریعے نباتات کی تلقیح اور گردافشانی کے لیے اشارہ قرار دیا ہے اور اس طرح ایک سائنسی مسئلے کے حوالے سے اس کی تفسیر کی ہے کہ جو نزولِ قرآن کے زمانے میں انسانی معاشرے میں محلِ توجہ نہ تھا اس طرح انھوں نے اسے قرآن کے اعجازِ علمی کے دلائل میں سے شمار کیا ہے لیکن اس حقیقت کو قبول کرنے کے باوجود کہ ہواؤں کا چلنا نر نباتات کے نطفے کو مادہ نباتات تک پہنچانے اور انھیں بار آور کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے، مندرجہ بالا آیت کو اس طرف اشارہ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس لفظ کے فوراً بعد آسمان سے نزولِ باراں کا ذکر (وہ بھی فاءِ تفریع کے ساتھ) آیا ہے جو نشاندہی کرتا ہے کہ ہواؤں کا تلقیح کرنا بارش برسنے کی تمہید ہے۔

بہرحال مذکورہ بالا تعبیر بادلوں اور ان سے بارش پیدا ہونے کے لیے خوبصورت ترین تعبیر ہے ہو سکتا ہے کہ کہا جائے کہ بادلوں کو ماں باپ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جو ہواؤں کی مدد سے ملاپ کرتے ہیں اور بار آور ہوتے ہیں۔ اور اپنی اولاد یعنی بارش کے دانوں کو زمین پر سکتے ہیں۔

وما انتم له بخازنین (تم ان پانیوں کی حفاظت اور ذخیرہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے) ـــــــ ممکن ہے یہ جملہ آبِ باراں کو نزول سے پہلے ذخیرہ کرنے کی طرف اشارہ ہو ـــــــ یعنی ان بادلوں پر تمھارا کوئی بس نہیں کہ جو بارش کے اصلی منبع ہیں۔ نیز ممکن ہے نزولِ باراں کے بعد ذخیرہ کرنے کی طرف اشارہ ہو ـــــــ یعنی تم میں یہ طاقت نہیں کہ نزولِ باراں کے بعد زیادہ مقدار میں پانی جمع اور محفوظ رکھ سکو۔ یہ خدا ہے جو اسے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کی صورت میں منجمد کرکے یا زمین کی گہرائیوں میں بھیج کر محفوظ کر لیتا ہے جو بعد میں چشموں، ندیوں اور کنوؤں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

مباحثِ توحید کے بعد معاد و قیامت اور اس کے مقدمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے ہم ہیں جو زندہ کرتے ہیں اور ہم ہیں جو مارتے ہیں (وانا لنحن نحیٖ و نمیت)۔ اور تمام روئے زمین کے اور اس سارے عالم کے وارث ہم ہیں (ونحن الوارثون)۔

یہ حیات و موت کے مسئلے کی طرف اشارہ ہے جو درحقیقت اہم ترین اور قطعی ترین مسائل میں سے ہے یہ مسئلہ معاد کی بحث کے لیے تمہید بھی بن سکتا ہے اور توحید کی بحث کا نقطۂ تکمیل بھی۔ کیونکہ ظہورِ حیات عالمِ ہستی کے عجیب ترین مسائل میں سے ہے اور اس مظہر کی تحقیق اور اس کا مطالعہ ہمیں خالقِ حیات سے اچھی طرح آشنا کر سکتا ہے۔ اصولی طور پر موت و حیات کا نظام علیم و توانا قدرت و علم کے بغیر ممکن نہیں۔ دوسری طرف موت و حیات کا وجود خود اس امر کی طرف دلیل ہے کہ اس عالم کے موجودات خود سے کچھ نہیں رکھتے اور جو کچھ رکھتے ہیں وہ کسی اور کی طرف سے ہے اور آخر کار ان سب کا وارث اللہ ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ہم ان کے گذشتگان اور آنے والوں کو جانتے ہیں (ولقد علمنا المستقدمین منکم ولقد علمنا المستاخرین)۔

لہٰذا وہ خود بھی اور ان کے اعمال بھی ہمارے علم کے سامنے واضح اور آشکار ہیں اور اس لحاظ سے معاد و قیامت اور ان

سب کے اعمال کا حساب و کتاب پوری طرح ہمارے سامنے ہے۔

اس بناء پر اس گفتگو کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے: یقیناً تیرا پروردگار ان سب کو قیامت میں ایک نئی زندگی کی طرف پلٹائے گا اور انھیں جمع و محشور کریگا (وان ربك هو يحشرهم) کیونکہ وہ حکیم بھی ہے اور علیم بھی (انه حكيم عليم)۔

اس کی "حکمت" کا تقاضا ہے کہ موت تمام چیزوں کا اختتام نہ بنے کیونکہ اگر زندگی اس جہاں کی انہی چار دن کی حیات میں منحصر ہو تو آفرینشِ جہاں لغو اور بے معنی ہو جائے اور خداوند حکیم سے بعید ہے کہ اس کی خلقت ایسی بے نتیجہ ہو لیکن اگر یہ آفرینش ایک لامتناہی حیات اور دائمی سیر و سلوک کی تیاری کے لیے مقدمہ ہے یا دو لفظوں میں ابدی اور جاوداں زندگی کے لیے تمہید ہو تو ایک مکمل مفہوم و معنی کی حامل ہوگی اور اس کی حکمت سے ہم آہنگ ہوگی اس لیے کہ حکیم کوئی کام بے حساب و کتاب نہیں کرتا اور اس کا علیم ہونا سبب بنتا ہے کہ معاد و حشر کے معاملے میں کوئی مشکل پیدا نہ ہو ہر ذرہ خاکی جو کسی بھی انسان کا کسی گوشے میں جا پڑا ہے وہ اسے جمع کرے گا اور اسے نئی حیات بخشے گا۔ دوسری طرف سب کے اعمال کا دفتر اس جہانِ طبیعت کے دل میں بھی ثبت ہے اور انسانوں کے قلب و روح میں بھی اور وہ ان سب سے آگاہ ہے۔

اس بناء پر خدا کا حکیم و علیم ہونا حشر و نشر اور معاد و قیامت پر پختگی اور پُر مغز دلیل شمار ہوتا ہے۔

متقدمین اور متاخرین کون ہیں؟

"ولقد علمنا المستقدمين منكم ولقد علمنا المستأخرين" ———— اس آیت کے بارے میں مفسرین نے بہت سے احتمالات کا ذکر کیا ہے۔

- ——— مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں چھ تفسیریں بیان کی ہیں۔
- ——— قرطبی نے آٹھ احتمال ذکر کیے ہیں
- ——— ابو الفتح رازی نے تقریباً دس احتمال پیش کیے ہیں۔

لیکن ———— ان سب کا گہرا مطالعہ اور تحقیق کی جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ان سب کو ایک ہی تفسیر میں جمع کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ:۔

لفظ "متقدمین" اور "متاخرین" وسیع معنی رکھتے ہیں۔ ان میں زمانے کے لحاظ سے پہلے اور بعد میں آنے والے اعمالِ خیر میں آگے بڑھ جانے والے، جہاد اور دشمنانِ حق سے مبارزہ کرنے والے یہاں تک کہ نمازِ جماعت کی صفوں میں آگے اور پیچھے رہنے والے اور اسی قسم کے دیگر لوگ شامل ہیں۔

اس جامع معنی کی طرف توجہ رکھتے ہوئے وہ تمام احتمالات جمع کر کے قبول کیے جا سکتے ہیں اور اس آیت میں تقدم و تاخر کے بارے میں ذکر کیے گئے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمازِ جماعت پہلی صف میں شرکت کی بہت زیادہ تاکید فرمائی ہے۔

آپ نے فرمایا:۔

"خدا اور اس کے فرشتے ان صفوں میں پیش قدمی کرنے والوں پر درود بھیجتے ہیں"

اس تاکید کے بعد لوگوں نے پہلی صف میں شرکت کے لیے بہت ہجوم کیا۔ ایک قبیلہ "بنی عذرہ" تھا۔ ان لوگوں کے گھر مسجد سے دور تھے انھوں نے کہا کہ ہم اپنے گھر بیچ کر مسجد نبوی کے قریب ہی گھر خرید لیتے ہیں تاکہ صفِ اوّل میں پہنچ سکیں۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انھیں بتایا گیا کہ خدا تمھاری نیتوں کو جانتا ہے یہاں تک کہ تم اگر آخری صف میں بھی کھڑے ہوئے تو بھی تمھاری نیت چونکہ پہلی صف میں کھڑا ہونے کی ہے تمھیں اپنی نیت کی جزا ملے گی۔[1]

مسلّم ہے کہ اس شانِ نزول کا محدود ہونا آیت کے وسیع مفہوم کے محدود ہونے کا ہرگز سبب نہیں ہو سکتا۔

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۶۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۚ

۲۷۔ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ

۲۸۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ

۲۹۔ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ

۳۰۔ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۙ

۳۱۔ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ

۳۲۔ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ

۳۳۔ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ

۳۴۔ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۙ

۳۵۔ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ

۳۶۔ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ

۳۷۔ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۙ

۳۸۔ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ

۳۹۔ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ

۴۰۔ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ

۴۱۔ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ ○

۴۲۔ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ ○

۴۳۔ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ ○

۴۴۔ لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَقْسُومٌ ○

ترجمہ

۲۶۔ ہم نے انسان کو خشک شدہ مٹی سے پیدا کیا کہ جو بدبودار (سیاہ رنگ) کیچڑ سے لی گئی تھی۔

۲۷۔ اور اس سے پہلے ہم جن کو گرم اور جلانے والی آگ سے خلق کیا تھا۔

۲۸۔ اور یاد کرو وہ وقت کہ جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں بشر کو خشک شدہ مٹی جو بدبودار کیچڑ سے لی گئی ہے، سے خلق کروں گا۔

۲۹۔ جب ہم اس کام کو انجام دے چکیں اور اس میں اپنی (ایک شائستہ اور عظیم) روح پھونکیں تو سب کے سب اسے سجدہ کرنا۔

۳۰۔ تمام فرشتوں نے بلا استثناء سجدہ کیا۔

۳۱۔ سوائے ابلیس کے کہ جس نے سجدہ کرنے والوں میں سے ہونے سے انکار کر دیا۔

۳۲۔ (اللہ نے) فرمایا اے ابلیس! تو ساجدین کے ساتھ کیوں شامل نہیں ہوا؟

۳۳۔ اس نے کہا: میں ہرگز ایسے بشر کو سجدہ نہیں کروں گا جسے تو نے بدبودار کیچڑ سے لی گئی خشک شدہ مٹی سے بنایا ہے۔

۳۴۔ فرمایا: ان (فرشتوں) کی صف سے نکل جا کہ تو ہماری درگاہ سے راندہ گیا ہے۔

۳۵۔ اور تجھ پر روزِ قیامت تک لعنت (اور رحمتِ حق سے دوری) ہوگی۔

۳۶۔ اس نے کہا: پروردگارا! مجھے روزِ قیامت تک مہلت دے (اور زندہ رکھ)۔

۳۷۔ فرمایا: تو مہلت حاصل کرنے والوں میں سے ہے۔

٣٨۔ (لیکن روز قیامت تک نہیں بلکہ) معیّن دن اور وقت تک۔

٣٩۔ اس نے کہا: پروردگارا! چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں مادّی نعمتوں کو زمین میں ان کی نگاہ میں مزیّن کروں گا اور سب کو گمراہ کروں گا۔

٤٠۔ مگر تیرے مخلص بندے۔

٤١۔ (اللہ نے) فرمایا: یہ میری مستقیم اور سیدھی راہ ہے (اور ہمیشہ کی سنت ہے)

٤٢۔ (کہ) تو میرے بندوں پر تسلط حاصل نہیں کر سکے گا مگر وہ گمراہ جو تیری پیروی کریں گے۔

٤٣۔ اور جہنم ان سب کی وعدہ گاہ ہے۔

٤٤۔ اس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے کے لیے ان میں سے ایک معیّن گروہ تقسیم شدہ ہے۔

تفسیر

خلقتِ انسان:

گذشتہ آیات میں مخلوقِ خدا کے ایک حصے اور نظامِ ہستی کا بیان تھا۔ اسی مناسبت سے ان آیات میں تخلیق کے عظیم شاہکار یعنی انسان کی خلقت کو بیان کیا گیا ہے۔ متعدد پر معنی آیات کے ذریعے اس خلقت کے بہت سے پہلو واضح کیا گیا ہے۔

ہم پہلے تو آیات کی اجمالی تفسیر بیان کرتے ہیں اس کے بعد اہم نکات پر علیحدہ علیحدہ بحث کریں گے

ارشاد ہوتا ہے: ہم نے انسان کو صلصال سے (یعنی اس مٹی سے جو خشک شدہ ہوا اور کسی چیز سے ٹکراتے وقت آواز دیتی ہو) پیدا کیا ہے کہ جو حمأ مسنون (سخت تاریک، متغیّر اور بدبودار کیچڑ) سے لی گئی ہے (ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حمأ مسنون)۔

اور اس سے پہلے "جنوں" کو ہم نے گرم اور جلانے والی آگ سے پیدا کیا ہے (والجآن خلقنٰه من قبل من نار السموم)۔

"سموم" لغت میں جلانے والی ہوا کے معنی میں ہے گویا یہ ہوا انسانی جسم کے تمام سوراخوں سے نفوذ کرتی ہے کیونکہ عرب انسانی جسم کے بہت ہی چھوٹے سوراخوں کو "مسام" کہتے ہیں۔ "سموم" بھی اسی مناسبت سے ایسی ہوا کو کہا جاتا ہے علاوہ "سم" (زہر) بھی اسی سے ہے کیونکہ وہ بدن میں نفوذ کرکے انسان کو قتل کر دیتی ہے یا بیمار کر دیتی ہے۔

جنوں کے ذکر کے بعد قرآن پھر خلقتِ انسان کے موضوع کی طرف لوٹتا ہے۔ فرشتوں سے اللہ تعالیٰ کی خلقتِ انسان کے

بارے میں جو پہلی گفت گو ہوئی اسے یوں بیان کیا گیا ہے: یاد کرو وہ وقت جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا، فرمایا: میں بشر کو تاریک رنگ بدبودار کیچڑ سے لی گئی خشک مٹی سے پیدا کروں گا (واذ قال ربك للملٰئكة انى خالق بشرًا من صلصال من حمإ مسنون) جب میں اس کی خلقت کو انجام و کمال تک پہنچا لوں اور اپنی (ایک شریف پاک اور باعظمت) روح اس میں پھونک دوں تو سب کے سب اسے سجدہ کرنا (فاذا سويته ونفخت فيه من روحي فقعوا له سٰجدين)۔

خلقتِ انسان تکمیل کو پہنچ گئی اور انسان کے لیے جو جسم و جان مناسب تھا اسے دے دیا گیا اور سب کچھ انجام پا گیا، تو اس وقت تمام فرشتوں نے بلا استثناء سجدہ کیا (فسجد الملٰئكة كلهم اجمعون)۔ وہ تنہا شخص جس نے اس فرمان کی اطاعت نہ کی وہ "ابلیس" تھا۔ لہٰذا مزید فرمایا: سوائے ابلیس کے کہ جس نے ساجدین کے ساتھ ہونے سے انکار کیا (الا ابليس ابٰى ان يكون مع السٰجدين)۔

اس موقع پر ابلیس سے باز پرس کی گئی اور خدا نے "اس سے کہا" اے ابلیس! تو ساجدین میں شامل کیوں نہیں ہے (قال يا ابليس مالك الا تكون مع السٰجدين)۔

ابلیس کہ جو غرور اور خود خواہی میں ایسا غرق تھا کہ اس کی عقل و ہوش غائب ہو چکے تھے۔ پروردگار کی پرستش کے جواب میں بڑی گستاخی سے بولا: "میں ہرگز ایسے بشر کو سجدہ نہیں کروں گا جسے تو نے بدبودار کیچڑ سے لی گئی خشک مٹی سے پیدا کیا ہے" (قال لم اكن لاسجد لبشر خلقته من صلصال من حمإ مسنون)۔

نورانی اور چمکنے والی آگ کہاں اور سیاہ اور متعفن مٹی کہاں۔ کیا مجھ جیسا ایک اعلیٰ موجود پست تر موجود کے سامنے خضوع کر سکتا ہے، یہ کون سا قانون ہے؟

وہ چونکہ غرور اور خود خواہی کے باعث خلقت و آفرینش کے اسرار سے بے خبر تھا اور خاک کی برکات کو فراموش کر چکا تھا کہ جو ہر خیر و برکت کا منبع ہے اور اس سے بڑھ کر وہ شریف اور عظیم الٰہی روح تھی جو آدم میں موجود تھی اس نے اسے لائقِ اعتناء نہ سمجھا۔ اچانک اپنے بلند مقام سے گر پڑا اب وہ اس لائق نہ رہا تھا کہ صفِ ملائکہ میں کھڑا ہو سکے لہٰذا خدا تعالیٰ نے اسے فوراً فرمایا: "یہاں سے (بہشت سے یا آسمانوں سے یا ملائکہ کی صفوں سے) باہر نکل جا کہ تو راندۂ درگاہ ہے (قال فاخرج منها فانك رجيم)۔

اور جان لے کہ تیرا یہ غرور تیرے کفر کا سبب بن گیا ہے اور اس کفر نے تجھے ہمیشہ کے لیے دھتکارا ہوا کر دیا ہے تجھ پر روزِ قیامت تک لعنت اور رحمتِ خدا سے دوری ہے (وان عليك اللعنة الٰى يوم الدين)۔

ابلیس نے جب اپنے آپ کو بارگاہِ الٰہی سے دھتکارا ہوا پایا اور احساس کیا کہ انسان اس کی بدبختی کا سبب بنا ہے تو کینہ کی آگ اس کے دل میں بھڑک اٹھی اور اس نے اولادِ آدم سے انتقام لینے کی ٹھان لی حالانکہ اصلی مجرم وہ خود تھا نہ کہ آدم اور نہ فرمانِ خدا لیکن غرور اور خود خواہی نے کہ جس میں اس کی ہٹ دھرمی بھی شامل تھی اس حقیقت کو سمجھنے کی اجازت نہ دی۔ لہٰذا اس نے عرض کیا پروردگارا! اب جب معاملہ ایسا ہے تو مجھے روزِ قیامت تک مہلت دے دے۔ (قال رب فانظرني الٰى يوم يبعثون)۔

یہ تقاضا اس لیے نہ تھا کہ وہ توبہ کرے، اپنے کیے پر پشیمان ہو یا تلافی کے درپے ہو بلکہ اس لیے تھا کہ اپنی ہٹ دھرمی، عناد، دشمنی اور خیرہ سری کو جاری رکھ سکے۔ خدا نے اس کی خواہش کو قبول کر لیا اور فرمایا" یقیناً تو مہلت یافتہ افراد میں سے ہے" (قال فانك من المنظرین) لیکن روز قیامت مخلوق کے مبعوث ہونے تک کے لیے نہیں جیسا کہ تو نے چاہا ہے بلکہ معین وقت اور زمانے کے لیے (الی یوم الوقت المعلوم)۔

اس بارے میں کہ" یوم الوقت المعلوم" سے کون سا دن مراد ہے مفسرین نے کئی ایک احتمالات ذکر کیے ہیں:

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد اس جہان کا اختتام اور ذمہ داری کے دور کا خاتمہ ہے کیونکہ قرآن کی آیات کے ظاہری مفہوم کے مطابق اس کے بعد تمام مخلوق نابود ہو جائے گی اور صرف خدا کی ذات پاک باقی رہ جائے گی۔ لہٰذا ابلیس کی درخواست ایک حد تک قبول کی گئی۔

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ" وقت معلوم" سے ایک معین زمانہ مراد ہے جسے خدا جانتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی اس سے آگاہ نہیں ہے کیونکہ اگر خدا تعالیٰ اسے واضح کر دیتا تو ابلیس کو گناہ اور سرکشی کی زیادہ تشویق ہوتی۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد یوم قیامت ہے کیونکہ وہ اس دن تک زندہ رہنا چاہتا تھا تاکہ حیات جاوید پائے اور اس کی بات مان لی گئی خصوصاً جبکہ سورۂ واقعہ کی آیہ ۵۰ میں" یوم الوقت المعلوم" کی تعبیر روز قیامت کے بارے میں بھی آئی ہے لیکن یہ احتمال بہت ہی بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو خدا نے اس کی درخواست کی مکمل طور پر موافقت کی ہوتی جبکہ مندرجہ بالا آیات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اس کی درخواست کی پوری موافقت نہیں کی گئی اور صرف" یوم وقت المعلوم" تک درخواست مانی گئی ہے۔

بہرحال پہلی تفسیر آیت کی روح اور ظاہری مفہوم کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتی ہے اور امام صادق علیہ السلام سے منقول بعض روایات میں بھی اس معنی کی تصریح ہوئی ہے[1]

اس مقام پر ابلیس نے اپنی باطنی نیت کو آشکار کر دیا۔ اگرچہ خدا سے کوئی چیز پوشیدہ نہ تھی تاہم وہ کہنے لگا: پروردگار! اس بنا پر کہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے (اور اس انسان نے میری بدبختی کا سامان فراہم کیا ہے) میں زمین کی مادی نعمتوں کو ان کی نگاہ میں دلفریب بناؤں گا اور انسان کو ان میں مشغول رکھوں گا اور آخر کار سب کو گمراہ کر کے رہوں گا (قال رب بما اغویتنی لازینن لهم فی الارض و لاغوینهم اجمعین)۔

لیکن وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اس کے وسوسے خدا کے مخلص بندوں کے دل پر ہرگز اثرانداز نہیں ہوں گے اور اس کے جال انھیں نہیں پھانس سکیں گے۔ خلاصہ یہ کہ خالص و مخلص بندے اس قدر طاقت ور ہیں کہ شیطانی زنجیریں توڑ ڈالیں گے۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۱۳ حدیث ۴۵

لہٰذا فوراً اپنی بات میں استثناء کرتے ہوئے اس نے کہا: "مگر تیرے وہ بندے جو خالص شدہ ہیں (الا عبادك منهم المخلصين)۔

واضح ہے کہ خدا نے شیطان کو گمراہ نہیں کیا تھا بلکہ ابلیس کی یہ بات شیطنت آمیز تھی۔ اصطلاح کے مطابق اپنے آپ کو بری قرار دینے کے لیے اور گمراہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کرنے کے لیے اس نے یہ بات کی تھی اور یہ سب ابلیسوں اور شیطانوں کی رسم ہے کہ اولاً وہ اپنے گناہ دوسروں کے سر ڈال دیتے ہیں اور ثانیاً ہر جگہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے برے اعمال کی غلط توجیہ پیش کریں نہ صرف بندگانِ خدا کے سامنے بلکہ خود خدا کے سامنے بھی کہ جو ہر چیز سے آگاہ ہے۔

ضمناً توجہ رہے کہ "مخلصین" "مخلَص" (لام کی فتح کے ساتھ) جیسا کہ ہم سورۂ یوسف کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ "مخلص" اس شخص کو کہتے ہیں جو ایمان و عمل کے اعلیٰ درجہ پر تعلیم و تربیت اور جہادِ نفس کے بعد پہنچا ہو۔ جس پر شیطان اور کسی اور کے بھی وسوسوں کا کوئی اثر نہ ہو۔[1]

خدا نے شیطان کی تحقیر اور راہِ حق کے متلاشیوں اور طریقِ توحید کے راہیوں کی تقویت کے لیے فرمایا: یہ میری مستقیم راہ ہے (قال هٰذا صراط علی مستقیم)

تو میرے بندوں پر کوئی تسلط نہیں رکھتا مگر وہ کہ جو ذاتی طور پر تیری پیروی کریں (ان عبادی لیس لك علیهم سلطان الا من اتبعك من الغاوین)۔

یعنی درحقیقت تو لوگوں کو گمراہ نہیں کر سکتا بلکہ یہ تو منحرف انسان ہیں جو اپنے ارادے اور رغبت سے تیری دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور تیرے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ آیت انسانوں کے ارادے کی آزادی کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہ واضح کرتی ہے کہ ابلیس اور اس کا لشکر کسی کو زبردستی برائی کی طرف کھینچ کر نہیں لے جاتا بلکہ یہ خود انسان ہی ہیں جو اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور اپنے دل کا دریچہ اس کے لیے کھولتے ہیں اور اسے مداخلت کی اجازت دیتے ہیں خلاصہ یہ کہ شیطانی وسوسے اگرچہ موثر ہیں لیکن آخری فیصلہ شیطان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ خود انسان کے بس میں ہے کیونکہ انسان اس کے مقابلے میں کھڑا ہو کر اسے ٹھکرا سکتا ہے۔ درحقیقت خدا تعالیٰ شیطان کے دفاع سے یہ خیال باطل اور تصور خام نکال دینا چاہتا ہے کہ وہ بالمقابلہ انسان پر حکومت حاصل کرے گا۔

اس کے بعد شیطان کے پیروکاروں کو نہایت صریح دھمکی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جہنم ان سب کی وعدہ گاہ ہے (وان جهنم لموعدهم اجمعين)۔

یہ گمان نہ کریں کہ وہ سزا اور عذاب کے چنگل سے فرار کر سکیں گے یا معاملہ ان کے حساب و کتاب تک نہیں پہنچے گا ان سب کے حساب کتاب کی ایک ہی جگہ اور ایک ہی مقام پر دیکھ بھال کی جائے گی۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۵ ص (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

وہی دوزخ کہ جس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے کے لیے شیطان کے پیروکاروں کا ایک گروہ تقسیم ہوا ہے
(لها سبعة ابواب لكل باب منهم جزء مقسوم) ۔
یہ درحقیقت گناہوں کے دروازے ہیں جن کے ذریعے مختلف افراد دوزخ میں داخل ہوں گے ۔ ہر گروہ ایک گناہ کے ارتکاب کے ذریعے ایک در سے دوزخ میں جائے گا ۔ جیسا کہ جنت کے دروازے اطاعتیں ، اعمالِ صالح اور مجاہدات ہیں کہ جن کے ذریعے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے ۔

چند اہم نکات :

۱۔ تکبر ــــــ عظیم بدبختیوں کا سرچشمہ : ابلیس اور خلقتِ آدم کی داستان قرآن کی مختلف سورتوں میں آئی ہے اس میں اہم ترین نکتہ ابلیس کا تکبر کی وجہ سے انتہائی بلند مقام سے محروم ہو جانا ہے کہ جس پر وہ فائز تھا ۔
ہم جانتے ہیں کہ ابلیس فرشتوں میں سے نہیں تھا (جیسا کہ سورۂ کہف کی آیہ ۵۰ سے معلوم ہوتا ہے) لیکن اس نے اطاعتِ الٰہی کے ذریعے ایسا بلند مقام حاصل کر لیا تھا کہ ملائکہ کی صفوں میں شامل ہو گیا تھا بلکہ یہاں تک کہ بعض کے بقول فرشتوں کا معلم بن گیا تھا اور جیسا کہ نہج البلاغہ کے خطبہ قاصعہ سے معلوم ہوتا ہے اس نے ہزار سال خدا کی عبادت کی تھی لیکن وہ یہ تمام مقامات گھڑی بھر کے تکبر کے باعث کھو بیٹھا اور خود پرستی اور تعصب میں ایسا گرفتار ہوا کہ عذر خواہی اور توبہ کی طرف نہ لوٹا بلکہ اس نے اپنا کام اسی طرح جاری رکھا اور ہٹ دھرمی کے راستے پر ایسا جما رہا کہ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اولادِ آدم میں سے تمام ظالموں اور گنہگاروں کے جرائم میں وسوسہ ڈال کر شرکت کرے گا اور ان سب کے کیفر کردار . . . .
یہ ہے خود خواہی ، غرور ، تعصب ، خود پسندی اور استکبار کا نتیجہ ۔
نہ صرف ابلیس بلکہ ہم نے اپنی آنکھوں سے شیطان صفت انسانوں کو دیکھا ہے یا ان کے حالات تاریخ کے سیاہ صفحات میں دیکھے ہیں کہ جس وقت وہ غرور و تکبر اور خود غرضی کے مرکب پر سوار ہوئے تو انھوں نے ایک دنیا کو خاک و خون میں غلطاں کر دیا گویا آنکھوں میں اترے ہوئے خون اور جہالت کے پردے نے ان کی ظاہری اور باطنی آنکھوں کو بے کار کر دیا اور وہ کسی حقیقت کو نہ دیکھ پائے ۔ انھوں نے دیوانہ وار ظلم و جور کی راہ میں قدم اٹھایا اور آخر کار اپنے آپ کو بدترین گڑھے میں گرا دیا یہ غرور و تکبر جلا ڈالنے والی اور وحشت ناک آگ ہے جیسا کہ ہو سکتا ہے کہ ایک انسان سالہا سال محنت و مشقت کرے ، گھر بنائے اس کا ساز و سامان جمع کرے اور زندگی گذارنے کا سرمایہ فراہم کرے لیکن اس کی تمام محنتوں کا ماحصل آگ کا صرف ایک شعلہ چند لمحوں میں خاکستر بنا دے ۔
اسی طرح پوری طرح ممکن ہے کہ ہزارہا سال کی محنتوں کا ماحصل خدا کے سامنے ایک گھڑی کے غرور کے باعث کھو بیٹھے اس سے بڑھ کر واضح اور ہلا دینے والا سبق کیا ہو گا ۔
تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کی توجہ اپنے واضح اور روشن نکتے کی طرف بھی نہ تھی کہ آگ خاک پر برتری نہیں رکھتی کیونکہ تمام برکات کا سرچشمہ خاک ہے ۔ نباتات ، حیوانات ، معدنیات سب کا تعلق مٹی سے ہے اور پانی ذخیرہ کرنے کے مقامات

اسی کے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہر زندہ موجود کی پیدائش کا سرچشمہ خاک ہے لیکن آگ کا کام جلانا ہے آگ بہت سے مواقع پر ویرانی اور تباہی و بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اسی خطبۂ قاصعہ میں ابلیس کو "عدو اللہ" (دشمنِ خدا) امام المتعصبین (متعصب اور ہٹ دھرم لوگوں کا پیشوا) اور سلف المتکبرین (متکبرین کا بزرگ) کہہ کر پکارتے ہیں اور فرماتے ہیں:

اسی لیے خدا نے عزت کا لباس اس کے بدن سے اتار دیا اور ذلت کی چادر اس کے سر پر ڈال دی۔

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:-

الا ترون کیف صغرہ اللہ بتکبرہ، و وضعہ بترفعہ، فجعلہ فی الدنیا مدحورا و اعدلہ فی الاخرۃ سعیرا

کیا دیکھتے نہیں ہو کہ کس طرح خدا نے اسے اس کے تکبر کی وجہ سے حقیر اور چھوٹا کر دیا اور برتری کی خواہش کے سبب اسے پست کر دیا وہ دنیا میں راندہ درگاہ ہوا اور دارِ آخرت میں اس کے لیے دردناک عذاب فراہم کیا[1]

ضمنی طور پر جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے ابلیس مکتب جبر کا بانی و مبانی ہے وہ مکتب جو ہر انسان کے وجدان کے خلاف ہے اور اس کے پیدا ہونے کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ گنہگار انسان اپنے اعمال سے اپنے آپ کو بری ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ ابلیس نے اپنی برأت کے لیے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اولادِ آدم کو گمراہ کرنے کی کوشش کا حق رکھتا ہے، اسی عظیم گناہ کا ارتکاب کیا اور کہا: خداوندا! تو نے مجھے گمراہ کیا ہے لہٰذا میں بھی اسی بنا پر مخلصین کے علاوہ تمام اولادِ آدم کو گمراہ کروں گا۔

۲۔ شیطان کن لوگوں پر تسلط حاصل کر لیتا ہے؛ ہم دوبارہ اس نکتے کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ شیطانی وسوسوں کا اثر جبری نہیں بلکہ ہم اپنی رغبت سے اس کے وسوسوں کو دل میں جگہ دیتے ہیں ورنہ حتیٰ کہ خود شیطان بھی جانتا ہے کہ وہ مخلصین پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ وہ کہ جنہوں نے اپنے آپ کو تربیت کے زیرِ سایہ خالص کیا ہے اور شرک کے زنگ کو اپنی روح سے دور کیا ہے۔

مندرجہ بالا آیات سے حاصل ہونے والے مفہوم کو دوسرے الفاظ میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ شیطان اور گمراہوں کا تعلق پیشوا اور پیروکاروں کا سا ہے نہ کہ مجبور کرنے والے اور مجبوروں کا سا۔

۳۔ جہنم کے دروازے:- مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ جہنم کے سات دروازے ہیں (بعید نہیں کہ سات کا عدد یہاں عدد تکثیر ہو یعنی جہنم کے بہت سے دروازے ہیں جیسا کہ سورۂ لقمان کی آیہ ۲۷ میں بھی سات کا عدد اسی معنی میں آیا ہے)۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۲۔

لیکن واضح ہے کہ دروازوں کی یہ تعداد (جنت کے دروازوں کی طرح) نہ داخل ہونے والوں کی کثرت کی وجہ سے ہے کہ وہ ایک چھوٹے سے دروازے سے نہیں گزر سکتے اور نہ ہی یہ تکلف کے پہلو سے ہے بلکہ درحقیقت یہ ان مختلف عوامل کی طرف اشارہ ہے جو انسان کو جہنم کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں گناہوں کی ہر قسم جہنم کا ایک دروازہ ہے۔

نہج البلاغہ کے خطبہ جہاد میں ہے:

ان الجهاد باب من ابواب الجنة فتحه الله لخاصة اوليائه۔

جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جسے خدا نے اپنے خاص بندوں کے لیے کھولا ہے[1]۔

ایک مشہور حدیث ہے:

ان السيوف مقاليد الجنة۔

تلواریں جنت کی چابیاں ہیں۔

ان تعبیرات سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ جنت اور دوزخ کے متعدد دروازوں سے کیا مراد ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ امام باقر علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں[2]۔ جبکہ مندرجہ بالا آیات کہتی ہیں کہ جہنم کے سات دروازے ہیں یہ فرق اس طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ بدبختی اور عذاب میں داخل ہونے کے بہت سے دروازے ہیں لیکن اس کے باوجود سعادت و خوش بختی تک پہنچنے کے دروازے اس سے زیادہ ہیں (سورۂ رعد کی آیہ ٢٣ کے ذیل میں بھی ہم اس سلسلے میں گفتگو کر چکے ہیں)۔

٤۔ "سیاہ کیچڑ" اور "خدا کی روح": یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ ان آیات سے اچھی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان دو مختلف چیزوں سے پیدا ہوا ہے ان سے ایک عظمت کی انتہائی بلندیوں پر ہے اور دوسری قدر و قیمت کے لحاظ سے ظاہراً بہت پست ہے۔

انسان کا مادی پہلو بدبودار سیاہ رنگ کے کیچڑ سے تشکیل پاتا ہے اور اس کا معنوی پہلو وہ چیز ہے کہ جسے "روحِ خدا" سے یاد کیا گیا ہے البتہ اللہ تعالیٰ جسم رکھتا ہے نہ روح۔ روح کی خدا کی طرف نسبت اصطلاح کے مطابق اضافت و نسبتِ تشریفی ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسانی کالب میں ایک بہت ہی پُرعظمت روح کو ڈالا گیا ہے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے خانہ کعبہ کو اس کی عظمت کی بناء پر "بیت اللہ" اور ماہِ مبارک رمضان کو اس کی برکت کی وجہ سے "شہر اللہ" (اللہ کا مہینہ) کہا جاتا ہے۔

اسی بناء پر انسان کی قوسِ صعودی اس قدر بلند ہے کہ وہ اس مقام پر پہنچتا ہے کہ اسے سوائے خدا کے کچھ نظر نہیں آتا اور اس کی قوسِ نزول اس قدر پست ہے کہ چوپایوں سے بھی پست ہے (بل هم اضل)۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ٢٧۔

[2] خصال صدوق "ابواب الثمانیۃ"۔

قوس صعودی و نزولی میں اتنا زیادہ فاصلہ خود اس مخلوق کی انتہائی اہمیت کی دلیل ہے اور یہ مخصوص ترکیب اس امر کی بھی دلیل ہے کہ انسانی مقام کی عظمت اس کے مادی پہلو کی وجہ سے نہیں ہے کیونکہ اس کے مادی پہلو کی طرف نظر کریں تو وہ سیاہ کیچڑ سے زیادہ کچھ نہیں یہ روح الٰہی ہے کہ جس میں بہت زیادہ صلاحیتیں پنہاں ہیں اور وہ انوار الٰہی کا مقام تجلّی ہو سکتی ہے لہٰذا یہ سب عظمتیں بخشی گئی ہیں اور اس کے کمال وارتقاء کا صرف یہی راستہ ہے کہ اسے تقویت دی جائے اور مادی پہلو کہ جو اسی مقصد کے لیے ذریعہ ہے، اسے صرف اسی کی پیش رفت کے لیے استعمال کیا جائے (کیونکہ ممکن ہے اس عظیم ہدف تک پہنچنے کے لیے موثر مدد دے)۔

سورۂ بقرہ کی ابتداء میں حضرت آدم کی خلقت کے متعلق جو آیات آئی ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کا آدم کے سامنے سجدہ کرنا ان کے مخصوص الٰہی علم کی وجہ سے تھا۔

لیکن یہ سوال کہ غیر خدا کو سجدہ کس طرح ممکن ہے اور کیا واقعتہً فرشتوں نے اس عجیب و غریب خلقت کی وجہ سے خدا کو سجدہ کیا تھا یا انھوں نے آدم کو سجدہ کیا تھا۔

اس کا جواب سورۂ بقرہ کی انھی آیات کے ذیل میں دیا جا چکا ہے جو خلقت آدم سے متعلق ہیں [1]

۵۔ "جن" کیا ہے؟ لفظ "جن" دراصل ایسی چیز کے معنی میں ہے جو حسِ انسانی سے پوشیدہ ہو مثلاً ہم کہتے ہیں "جنة اللیل" یا "فلما جن علیه اللیل" یعنی جس وقت سیاہ رات کے پردے نے اسے چھپا لیا۔ اسی بناء پر "مجنون" اس شخص کو کہتے ہیں جس کی عقل پوشیدہ ہو۔ "جنین" اس بچے کو کہتے ہیں جو رحم مادر میں مخفی ہو۔ "جنت" اس باغ کو کہتے ہیں جس کے درختوں نے اس کی زمین کو چھپا رکھا ہو۔ "جنان" اس دل کو کہتے ہیں جو سینے کے اندر چھپا ہوا اور "جنة" اس ڈھال کو کہتے ہیں جو انسان کو دشمن کی ضربوں سے چھپائے۔

البتہ آیات قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ "جن" ایک موجود عاقل ہے کہ جو حسِ انسانی سے پوشیدہ ہے اس کی خلقت دراصل آگ سے یا آگ کے صاف شعلوں سے ہوئی ہے ابلیس بھی اسی گروہ میں سے ہے۔

بعض علماء انھیں "ارواح عاقلہ" کی ایک نوع سے تعبیر کرتے ہیں کہ جو مادہ سے مجرد ہیں (البتہ واضح ہے کہ تجرد کامل نہیں رکھتے کیونکہ جو چیز کسی مادہ سے پیدا ہوتی ہے وہ مادی ہے لیکن اس میں کچھ نہ کچھ تجرد ہے کیونکہ ہمارے حواس اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ دوسرے لفظوں میں ایک قسم کا جسم لطیف ہے)۔

نیز آیات قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں مومن بھی ہیں اور کافر بھی۔ مطیع بھی ہیں اور سرکش بھی۔ اور وہ بھی مکلف اور مسئول ہیں۔

البتہ ان مسائل کی تشریح اور دور حاضر کے علم سے ان کی ہم آہنگی کے بارے میں مزید بحث کی ضرورت ہے۔ اس کے بارے میں ہم مناسب حد تک انشاء اللہ سورۂ جن کی تفسیر میں بحث کریں گے کہ جو قرآن کے پارہ انتیس میں ہے۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد اوّل ص (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

جس نکتے کی طرف یہاں اشارہ کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں لفظ "جان" آیا ہے جو اسی مادہ "جن" سے ہے۔

کیا یہ دونوں الفاظ ("جن" اور "جان") ایک معنی رکھتے ہیں یا جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "جان" "جن" کی ایک خاص قسم ہے۔

قرآن کی وہ آیات جو اس سلسلے میں آئی ہیں اگر انھیں ایک دوسرے کے سامنے رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ کیونکہ قرآن میں کبھی "جن" انسان کے ساتھ آیا ہے۔ اور کبھی "جان"۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل کی آیہ ۸۸ میں ہے:

قل لئن اجتمعت الانس و الجن

سورۂ ذاریات کی آیہ ۵۶ میں آیا ہے:

و ما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون

حالانکہ سورۂ رحمان کی آیہ ۱۵ میں ہے:

خلق الانسان من صلصال کالفخار وخلق الجان من مارج من نار۔

اسی سورہ کی آیت ۳۹ میں ہے:

فیومئذ لا یسئل عن ذنبہ انس ولا جان

مندرجہ بالا آیات اور قرآن کی دیگر آیات کے مجموعی مطالعے سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ "جان" اور "جن" دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔ لہٰذا مندرجہ بالا آیات میں کبھی "جن" انسان کے ساتھ آیا ہے اور کبھی "جان"

البتہ قرآن حکیم میں "جان" ایک اور معنی میں بھی آیا ہے۔ کہ جو سانپ کی ایک قسم ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے واقعہ میں ہے:

کانھا جان (قصص: ۳۱)

لیکن یہ ہماری بحث سے خارج ہے۔

۶۔ قرآن اور خلقت انسان: جیسا کہ ہم نے زیر بحث آیات میں دیکھا ہے قرآن میں انسان کے بارے میں بڑی جچی تلی بحث ہے اور اس موضوع سے قرآن تقریباً سربستہ اور اجمالی طور پر گذر گیا ہے کیونکہ اصلی مقصد تربیتی مسائل تھے۔ قرآن کے چند اور مواقع پر بھی اس بحث کی نظیر موجود ہے مثلاً سورۂ سجدہ، مومنون اور حج میں۔ البتہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کوئی علوم طبیعی کی کتاب نہیں ہے بلکہ انسان سازی کی کتاب ہے لہٰذا ہمیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ اس میں ان علوم کی جزئیات مثلاً تکامل سے مربوط مسائل، تشریح، جنین شناسی، نباتات شناسی وغیرہ بیان ہوں۔ لیکن یہ بات اس سے مانع نہیں کہ تربیتی مباحث کی مناسبت سے ان علوم کی بعض جزئیات کی طرف قرآن میں مختصر سا اشارہ ہو جائے۔ بہرحال اس مختصر سی تمہید کے بعد یہاں دو امور پر بحث کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ تکاملِ انواع سائنسی لحاظ سے۔

۲۔ تکاملِ انواع قرآن کی نظر سے۔

پہلے ہم اس موضوع پر آیات وروایات سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف علوم طبیعی کے خصوصی معیاروں کو سامنے رکھ کر بحث کرتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ علوم طبیعی کے علماء کے درمیان زندہ موجودات چاہے نباتات ہوں یا حیوانات، ان کے بارے میں دو مفروضے موجود ہیں۔

الف: تکامل انواع کا مفروضہ یا Transformism اس مفروضے کے مطابق زندہ موجودات کی انواع ابتداء میں موجودہ شکل میں نہ تھیں بلکہ موجودات کا آغاز ایک ایک سلول سے ہوا۔ یہ سلول Cellule سمندروں کے پانی اور دریاؤں کی تہہ کے چکنے سیاہ کیچڑ کے درمیان حرکت سے پیدا ہوئے یعنی بے جان موجودات تھے کہ جو خاص حالات میں تھے ان سے پہلے پہل زندہ سلول CELLULE پیدا ہوئے۔

ان انتہائی چھوٹے زندہ موجودات نے تدریجاً تکامل وارتقاء شروع کیا اور ایک نوع سے دوسری نوع میں بدلتے ہوئے دریاؤں سے صحراؤں کی طرف اور وہاں سے ہوا اور فضا کی طرف منتقل ہوئے۔ اس طرح انواع واقسام کی نباتات اور آبی وزمینی جانور اور پرندے وجود میں آئے۔

اس تکامل وارتقاء کی کامل ترین صورت یہی آج کا انسان ہے جو بندر سے مشابہ موجود سے اور بھی انسان نما بندر سے ظاہر ہوا

ب: ثبوت انواع کا مفروضہ یا Fixism اس مفروضے کے مطابق جانداروں کی ہر نوع ابتداء ہی سے اسی موجودہ شکل میں ظاہر ہوئی اور کوئی نوع دوسری نوع میں تبدیل نہیں ہوئی اور فطرتاً انسان بھی مستقل خلقت کا حامل تھا کہ جو ابتداء سے اسی شکل وصورت میں پیدا ہوا۔

دونوں گروہوں کے سائنسدانوں نے اپنا نظریہ ثابت کرنے کے لیے بہت سے مطالب لکھے ہیں اور علمی محافل میں اس مسئلے پر بہت سے نزاع اور جھگڑے ہوئے ہیں ان جھگڑوں میں شدت اس وقت پیدا ہوئی جب لامارک (مشہور جانور شناس فرانسیسی سائنس دان جو اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں ہوا) اور اس کے بعد ڈاروِن (جانور شناس انگریز سائنسدان جو انیسویں صدی میں ہوا) نے تکامل انواع کے سلسلے میں اپنے نظریات نئے دلائل کے ساتھ پیش کیے۔

البتہ آج کی علوم طبیعی کی محافل میں شک نہیں کہ اکثریت تکاملِ انواع کے مفروضے کے حامی سائنس دانوں کی ہے۔

تکاملِ انواع کے حامیوں کے دلائل:

ان دلائل کو آسانی سے تین حصوں میں خلاصہ کر کے بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) پہلے وہ دلائل ہیں جو قدیم نباتات وحیوانات کے آثار کے علم PALEONTOLOGIE یعنی گذشتہ زندہ موجودات کے پتھرائے ہوئے ڈھانچوں کے مطالعہ کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں ان کا نظریہ ہے کہ زمین کے مختلف طبقوں کا مطالعہ

نشاندہی کرتا ہے کہ زندہ موجودات نے سادہ تر شکلوں سے کامل تر اور زیادہ پیچیدہ شکلوں کی طرف تغیر کیا ہے۔

ان قدیم حیوانات و نباتات کے آثار میں پیش آنے والے فرق کی تفسیر فقط مفروضۂ تکامل کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔

۲۔ دوسری دلیل وہ قرائن ہیں جو علم تشریح (Comparative Anotomy) سے اخذ کیے گئے ہیں اس سلسلے میں وہ لمبی چوڑی بحثیں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس وقت مختلف جانوروں کی ہڈیوں کو جوڑنے کی تشریح کرکے ان کا ایک دوسرے سے موازنہ کیا گیا تو ان کے درمیان بہت زیادہ مشابہت دکھائی دی۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ ان سب کی اصل اور بنیاد ایک ہی ہے۔

۳۔ ان کی تیسری دلیل وہ قرائن ہیں کہ جو جنین (Foetus) سے ہاتھ لگے ہیں ان کا نظریہ ہے کہ اگر جانوروں کا حالتِ جنین میں تقابلی جائزہ کیا جائے جبکہ انھوں نے ابھی ضروری تکامل حاصل نہ کیا ہو تو ہم دیکھیں گے کہ تکامل سے قبل جانور شکمِ مادر میں یا حالتِ نطفہ میں ایک دوسرے سے کس قدر مشابہت رکھتے ہیں یہ امر بھی نشاندہی کرتا ہے کہ سب کے سب ابتداء میں ایک ہی اصل سے لیے گئے ہیں۔

ثبوتِ انواع کے حامیوں کے جوابات

مفروضۂ ثبوتِ انواع (Fixism) کے حامی ان تمام دلائل کا ایک کُلی جواب دیتے ہیں اور وہ یہ کہ ان قرائن میں سے کوئی بھی اطمینان بخش نہیں ہے البتہ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا ان تین طرح کے قرائن میں سے ہر ایک احتمالِ تکامل کو ایک "ظنی احتمال" کے طور پر پیش کرتا ہے لیکن یقین ہرگز پیدا نہیں کرتا۔

واضح لفظوں میں مفروضۂ تکامل کو عقلی دلیل کے ذریعے ایک علمی اور قطعی قانون ثابت کرنا چاہیے یا محسوسات اور تجربے کے ذریعے اور ان دو کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔

لیکن ایک طرف تو ہم جانتے ہیں کہ عقلی اور فلسفیانہ دلائل سے ان مسائل کو ثابت نہیں کیا جا سکتا اور دوسری طرف یہ مسائل کہ جن کی جڑیں لاکھوں برس قبل کے معاملات میں چھپی ہوئی ہیں ان تک تجربے کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تجربے اور مشاہدے سے جو کچھ ہمیں معلوم ہوتا ہے وہ سطحی تغیرات ہیں جو زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ نباتات و حیوانات میں کسی اچانک تبدیلی جہش تاسیون کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں مثلاً عام بھیڑوں میں سے اچانک کوئی ایسی بھیڑ پیدا ہوتی ہے جس کی کھال عام بھیڑوں کی کھال سے مختلف ہوتی ہے۔ یعنی بہت نرم اور ملائم ہوتی ہے اور پھر اس کی کھال کی ان خصوصیات کی وجہ سے بھیڑوں کی ایک نسل گوسفند مرینوس کے نام سے پیدا ہوتی ہے۔

یا بعض جانوروں میں کسی تغیر کی وجہ سے آنکھ، ناخن، بدن یا کھال کے رنگ میں یا اس قسم کی کوئی اور تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے لیکن آج تک کوئی ایسی اچانک تبدیلی نہیں دیکھی گئی جو کسی حیوان کے بدن کے اصلی اعضاء میں کوئی اہم تغیر پیدا کر دے یا ایک نوع کو دوسری نوع میں تبدیل کر دے۔

اس بناء پر صرف ایک قیاس اور گمان ہی کیا جا سکتا ہے کہ پے در پے جست و خیز اور ایکے بعد دیگرے تبدیلیوں کے ذریعے ہو سکتا ہے کبھی روز کسی حیوان کی نوع تبدیل ہو جائے مثلاً پیٹ کے بل زمین پر رینگنے والا جانور پرندے میں تبدیل ہو جائے

لیکن یہ قیاس و تخمین ہرگز یقینی نہیں ہے بلکہ صرف ایک ظنی مسئلہ ہے کیونکہ ہم نے آج تک ایسے ناگہانی تغیرات کا تجربہ نہیں کیا جو اصلی اعضاء کو تبدیل کر دیں۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ہم مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ تبدیلیِ نوع Transformism کے حامیوں کی تین دلیلیں اس نظریے کو ایک مفروضے سے اوپر نہیں لے جا سکتیں اسی بناء پر اس نظریے پر دقتِ نظر سے بحث کرنے والے لوگ ہمیشہ اس پر تکاملِ انواع کے مفروضے کے طور پر گفتگو کرتے ہیں نہ کہ ایک قانون کے طور پر۔

مفروضۂ تکامل اور مسئلۂ خداشناسی:

بہت سے لوگ اس مفروضے اور مسئلۂ خداشناسی کے درمیان ایک قسم کا تضاد پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاید ایک لحاظ سے وہ حق بجانب بھی ہیں کیونکہ ڈاروِن کے نظریے نے اربابِ کلیسا اور اس مفروضے کے حامیوں کے درمیان ایک شدید جنگ چھیڑ دی ہے۔

اسی مسئلے کی بنیاد پر اس زمانے میں سیاسی اور اجتماعی وجوہات کی بنیاد پر جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے بہت پراپیگنڈا کیا گیا کہ ڈارونیسم خداشناسی سے مطابقت نہیں رکھتا۔

لیکن آج یہ مسئلہ ہمارے لیے واضح ہے کہ یہ دونوں امور آپس میں کوئی تضاد نہیں رکھتے یعنی چاہے مفروضۂ تکامل کو قبول کریں چاہے فقدانِ دلیل کے باعث اسے رد کریں دونوں صورتوں میں ہم خداشناس ہو سکتے ہیں۔

فرض کریں کہ مفروضۂ تکامل ثابت بھی ہو جائے تو وہ ایک ایسے قانونِ علمی کی شکل اختیار کرلے گا جو طبیعی علت و معلول سے پردہ اٹھاتا ہے اور جانداروں اور دیگر موجودات کے درمیان اس علت و معلول کے رابطے سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

کیا بارشوں کے نزول، سمندروں کے مدوجزر اور زلزلوں وغیرہ کے طبیعی علل معلوم ہونے سے خداشناسی کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوئی ہے؟ مسلماً نہیں۔ لہٰذا انواعِ موجودات کے درمیان ایک تکاملی وارتقائی رابطے کا انکشاف خداشناسی کے راستے میں مانع کیسے ہو سکتا ہے ایسی باتیں تو صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کا خیال ہے کہ علل طبیعی کا انکشاف وجودِ خدا قبول کرنے کے منافی ہے لیکن ہم آج اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان علل و اسباب کا انکشاف نہ صرف یہ کہ عقیدہ توحید کو ضرر نہیں پہنچاتا بلکہ وہ تو وجودِ خدا کے اثبات کے نظامِ خلقت سے ہمارے لیے مزید دلائل مہیا کرتا ہے۔

یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ خود ڈاروِن پر جب الحاد اور بے دینی کا الزام لگایا گیا تو اس نے اس کی تردید کی اور اصلِ انواع کے بارے میں اپنی کتاب میں تصریح کی کہ میں تکاملِ انواع کو قبول کرنے کے باوجود خدا پرست ہوں نہ اصولی طور پر وجودِ خدا کو قبول کیے بغیر تکامل کی توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔

اس عبارت پر غور کریں۔

> وہ جانوروں کی مختلف انواع کے ظہور کے لیے عللِ طبیعی کو قبول کرنے کے باوجود ہمیشہ خدائے یگانہ پر ایمان رکھتا ہے اور تدریجاً جب اس کا سن آگے بڑھتا ہے تو اس میں مافوقِ بشر قدرت کو

سمجھنے کا ایک خاص اندرونی احساس شدید تر ہو جاتا ہے اس حد تک کہ وہ انسان کے لیے معمائے آفرینش کو لاینحل سمجھتا ہے[1]

اصولی طور پر اس کا عقیدہ تھا کہ تکامل کے اس عجیب و غریب پیچ و خم میں انواع کی ہدایت اور ایک عام زندہ موجود کا ان مختلف انواع اور متنوع جانوروں میں تبدیل ہونا کسی عقلِ کل کی طرف سے حساب شدہ اور دقیق منصوبہ بندی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور واقعاً ہے بھی ایسا ہی۔ کیا تنہا مادہ جو عام اور پست ہے ایسی تعجب خیز اور عجیب و غریب مشتقات کو ایک بے پایاں علم و قدرت کے سہارے کے بغیر کیسے وجود بخش سکتا ہے جبکہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی مفصل تشکیلات ہیں۔

نتیجہ یہ کہ یہ شور و غوغا بالکل بے بنیاد ہے کہ تکاملِ انواع کا نظریہ خداشناسی کے مسئلہ سے تضاد رکھتا ہے (چاہے ہم مفروضہ تکامل کو قبول کریں یا نہ کریں)۔

یہاں صرف ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن نے پیدائشِ آدم کی جو مختصر تاریخ بیان کی ہے کیا تکاملِ انواع کا مفروضہ اس سے تضاد رکھتا ہے یا نہیں۔ اس کے بارے میں ہم ذیل میں بحث کریں گے۔

قرآن اور مسئلہ تکاملِ انواع

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ مسلمانوں میں تکاملِ انواع کے حامیوں اور مخالفوں دونوں نے اپنے مقصد کے اثبات کے لیے آیاتِ قرآن سے تمسک کیا ہے لیکن شاید دونوں نے بعض اوقات اپنے عقیدے اور نظریے کے زیرِ اثر ہو کر ایسی آیات سے استدلال کیا ہے کہ جو ان کے مقصود سے بہت کم ربط رکھتی ہیں۔ لہٰذا ہم دونوں طرف سے زیرِ بحث آنے والی آیات کا انتخاب پیش کرتے ہیں۔

اہم ترین آیت کہ جس کا تکامل کے طرف داروں نے سہارا لیا ہے سورہ آلِ عمران کی آیہ ۳۳ ہے۔

ان اللّٰہ اصطفیٰ اٰدم و نوحا و اٰل ابراھیم و اٰل عمران علی العٰلمین

اللہ نے آدم، نوح، آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو تمام جہانوں پر منتخب کیا۔

وہ کہتے ہیں کہ نوح، آلِ ابراہیم اور آلِ عمران ایک گروہ کے درمیان زندگی بسر کرتے تھے اور ان میں سے چنے گئے۔ آدم کو بھی اسی طرح ہونا چاہیے یعنی ان کے زمانے میں بھی وہ انسان کہ جن پر "عالمین" کا اطلاق ہوتا ہے یقیناً موجود تھے اور آدم انہی میں سے چنے گئے تھے یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ آدم روئے زمین کے پہلے انسان نہ تھے بلکہ قبل ازیں بھی دوسرے انسان موجود تھے اور حضرت آدم کا امتیاز وہی ان کا فکری اور روحانی ارتقاء و تکامل ہے کہ جس کے سبب وہ اپنے جیسے افراد میں سے چنے گئے اس نظریے کے حامیوں نے کچھ اور آیات بھی ذکر کی ہیں کہ جن میں سے بعض مسئلہ تکامل سے بالکل کوئی ربط نہیں رکھتیں اور ان کی تفسیر تکامل کے مفہوم میں کرنا زیادہ تر تفسیر بالرائے بن جاتی ہے۔

---

[1] دارونیسم۔ تالیف محمود بہزاد صفحہ ۷۵، صفحہ ۷۲

ان میں سے بعض آیات ایسی بھی ہیں کہ جو تکامل انواع کے مفہوم سے بھی مطابقت رکھتی ہیں، ثبوت انواع سے بھی اور آدم کی مستقل خلقت سے بھی۔ اسی بناء پر ہم نے بہتر سمجھا ہے کہ ان کے ذکر سے صرف نظر کیا جائے۔

باقی رہا معاعتراض جو اس استدلال پر کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ "عالمین" اگر معاصر لوگوں کے معنی میں ہو اور "اصطفیٰ" (چننا) یقیناً ایسے ہی اشخاص میں سے ہو تو پھر یہ استدلال قابل قبول ہو سکے گا لیکن اگر کوئی کہے کہ "عالمین" معاصرین اور غیر معاصرین سب کے لیے ہے تو اس صورت میں مندرجہ بالا آیت اس امر پر دلالت نہیں کرے گی جیسا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث میں خاتون اسلام حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی فضیلت میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

اما ابنتی فاطمة فهی سیدة نساء العالمین من الاولین والآخرین

باقی رہی میری بیٹی فاطمہ تو وہ اولین و آخرین کے سب جہانوں کی عورتوں کی سردار ہے۔

یہ بالکل اس طرح ہے کہ کوئی کہے کہ کچھ لوگوں کو خدا نے تمام ادوار کے انسانوں میں سے چن لیا ہے اور ان میں سے ایک آدم ہیں اس صورت میں ضروری نہیں کہ حضرت آدم کے زمانے میں دوسرے انسان بھی موجود ہوں کہ جن پر "عالمین" کا اطلاق ہو یا آدم ان میں سے چنے جائیں۔ خصوصاً جبکہ گفتگو خدا کے چننے کے بارے میں ہے کہ جو آئندہ آنے والی اور بعد کے زمانوں میں آنے والی نسلوں سے اچھی طرح آگاہ ہے۔[1]

لیکن اہم ترین دلیل جو ثبوت انواع کے حامیوں نے آیات قرآن میں سے منتخب کی ہے وہ زیر بحث اور اس جیسی آیات ہیں کہ جو کہتی ہیں کہ خدا نے انسان کو خشک مٹی سے پیدا کیا کہ جو سیاہ رنگ بدبودار کیچڑ سے لی گئی تھی۔

یہ امر لائق توجہ ہے کہ "انسان" کی خلقت کے موقع پر بھی یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے:

ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حمأ مسنون (حجر: ۲۶)

نیز بشر کے بارے میں بھی یہ تعبیر آئی ہے:

واذ قال ربك للملٰئكة انی خالق بشرًا من صلصال من حمأ مسنون (حجر: ۲۸)

نیز یہ بھی ہے کہ فرشتوں نے خود ذات آدم کو سجدہ کیا اس سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے (سورۂ حجر کی آیات ۲۹، ۳۰ اور ۳۱ جو سطور بالا میں ہم بیان کر آئے ہیں ان میں غور و فکر کیجیے)۔

پہلی نظر میں ان آیات کا ظاہری مفہوم یہی نکلتا ہے کہ آدم پہلے سیاہ رنگ کے کیچڑ سے پیدا ہوئے۔ اعضاء و جوارح کی تکمیل کے بعد ان میں خدائی روح پھونکی گئی اور اس کے ساتھ ہی ابلیس کے سوا تمام فرشتے ان کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

ان آیات کا طرز بیان نشاندہی کرتا ہے کہ آدم کی مٹی سے خلقت اور موجودہ شکل و صورت پیدا ہونے کے درمیان دیگر انواع موجود نہ تھیں۔

---

[1] یہ احتمال بھی ہے کہ ایک مدت میں اولاد آدم پر مشتمل ایک معاشرہ تشکیل پا گیا ہو اور ان میں سے آدم برگزیدہ اور چنے ہوئے ہوں۔

بعض مندرجہ بالا آیات میں "ثم" کی تعبیر آئی ہے یہ لفظ لغت عرب میں با فاصلہ ترتیب کے لیے استعمال ہوتا ہے یہ لفظ ہرگز لاکھوں سال گذرنے اور ہزاروں انواع کے موجود ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ کوئی مانع نہیں کہ یہ ایسے فاصلوں کی طرف اشارہ ہو جو آدم کی مٹی سے خلقت اور پھر خشک مٹی اور پھر روح الٰہی پھونکے جانے کے مراحل میں موجود تھے اسی لیے لفظ "ثم" عالم جنین میں انسان کی خلقت اور ان مراحل کے بارے میں آیا ہے جو جنین یکے بعد دیگرے طے کرتا ہے، مثلاً۔

یا ایها الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقنٰکم من تراب ثم من نطفة ثم من علقة ثم من مضغة...... ثم نخرجکم طفلاً ثم لتبلغوا اشدکم

اے لوگو! اگر تمھیں بعث و قیامت کے بارے میں شک ہے (تو انسانوں کی خلقت کے بارے میں قدرتِ خدا پر غور و فکر کرو کہ) ہم نے تمھیں خاک سے پیدا کیا پھر نطفہ سے پھر جمے ہوئے خون سے پھر مضغہ (گوشت کے چبائے ہوئے ٹکڑے) سے .... پھر ہم تمھیں بچے کی شکل میں باہر نکالتے ہیں پھر تم مرحلۂ بلوغ تک پہنچتے ہو۔ (حج ـــ ۵)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ضروری نہیں کہ "ثم" ایک طولانی فاصلے کے لیے آئے بلکہ جیسے یہ طولانی فاصلوں کے لیے استعمال ہوتا ہے ویسے ہی مختصر فاصلوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

جو کچھ ہم نے سطورِ بالا میں کہا ہے اس سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ آیاتِ قرآن نے براہِ راست مسئلہ تکامل یا ثبوتِ انواع کو بیان نہیں کیا۔ لیکن (بالخصوص انسان کے بارے میں) آیات کا ظاہری مفہوم مستقل خلقت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اگرچہ اس کے بارے میں کامل صراحت نہیں ہے لیکن خلقتِ آدم سے متعلقہ آیات کا ظاہر زیادہ مستقل خلقت کے مفہوم کے گرد گردش کرتا ہے البتہ دیگر جانوروں کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔

٤٥۔ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝

٤٦۔ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِينَ ۝

٤٧۔ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ ۝

٤٨۔ لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ ۝

٤٩۔ نَبِّئْ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝

٥٠۔ وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ۝

ترجمہ:

٤٥۔ پرہیزگار (بہشت کے سرسبز) باغوں اور اس کے چشموں کے کنارے ہوں گے۔

٤٦۔ (خدا کے فرشتے ان سے کہیں گے) امن و سلامتی کے ساتھ ان باغوں میں داخل ہو جاؤ۔

٤٧۔ ہم ان کے سینوں سے ہر قسم کا غل (حسد، کینہ، عداوت اور خیانت) اتار لیں گے (اور ان کی روح پاک کر دیں گے) اس حالت میں کہ سب بھائی بھائی بن کر تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

٤٨۔ انھیں ہرگز کوئی خستگی اور تکان نہ ہوگی اور انھیں اس سے کبھی بھی نہیں نکالا جائے گا۔

٤٩۔ میرے بندوں کو آگاہ کر دو کہ میں غفور و رحیم ہوں۔

٥٠۔ نیز (انھیں بتا دو کہ) میرا عذاب اور سزا دردناک ہے۔

تفسیر

بہشت کی آٹھ نعمتیں

گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ خدا نے کس طرح تفصیل سے شیطان اور اس کے ساتھیوں، ہمجولیوں اور پیروکاروں کا نتیجہ کار بیان کیا ہے اور ان کے سامنے جہنم کے سات دروازے کھولے ہیں۔

قرآن کی روش ہے کہ وہ موازنہ پیش کرکے تعلیم و تربیت کے لیے استفادہ کرتا ہے اسی روش کے مطابق ان آیات میں بہشت، اہلِ بہشت، مادی اور معنوی نعمات اور جسمانی و روحانی عنایات کے بارے میں گفتگو ہے۔ درحقیقت ان آیات میں آٹھ عظیم مادی و معنوی نعمات کا تذکرہ بہشت کے دروازوں کی تعداد کے مطابق آیا ہے۔

۱۔ پہلے ایک عظیم مادی نعمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: پرہیزگار بہشت کے سرسبز باغوں میں ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشموں کے کنارے ہوں گے (ان المتقین فی جنٰت وعیون)۔

یہ امر جاذبِ نظر ہے کہ یہاں تمام صفات میں سے صرف "تقویٰ" کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہی تقویٰ، پرہیزگاری تعہد اور مسئولیت کہ جس میں تمام عمدہ انسانی صفات جمع ہیں۔

"جنٰت وعیون" کا صیغہ جمع کے ساتھ ذکر ہوا ہے یہ طرح طرح کے باغات، فراواں چشموں اور گوناگوں بہشتوں کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں سے ہر ایک کا ایک نیا لطف ہے اور خاص خصوصیت ہے۔

۲، ۳ اس کے بعد دو اہم معنوی نعمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہیں "سلامتی" اور "امن"۔ ہر قسم کے رنج، ناراضی اور تکلیف سے سلامتی اور ہر قسم کے خطرے سے امن وامان۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ کے فرشتے انھیں خوش آمدید کہتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان باغوں میں کامل سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ (ادخلوھا بسلٰم اٰمنین)۔

بعد والی آیت میں تین اور معنوی نعمات کو صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔

۴۔ ہم ان کے سینوں سے ہر قسم کا حسد کینہ، عداوت اور خیانت دھو دیں گے اور ایسی آلائشیں ان سے دور کردیں گے (ونزعنا ما فی صدورھم من غلٍ[1])۔

۵۔ اور وہ یوں ہوں گے جیسے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ان کے درمیان محبت کا انتہائی قریبی تعلق کارفرما ہے (اخوانًا)۔

۶۔ اس حالت میں کہ وہ ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے (علٰی سرر متقٰبلین[2])۔

ان کی اجتماعی نشستیں اس دنیا کے تکلیف دہ تکلفات کی طرح نہیں ہیں۔ ان مجلس میں کوئی اوپر اور کوئی نیچے ہے۔ اس دنیا کی المناک طبقاتی زندگی کا کوئی اصول وہاں نہیں ہے وہاں سب آپس میں بھائی ہیں سب ایک دوسرے کے آمنے

---

[1] "غل" دراصل کسی چیز کے مخفیانہ نفوذ کے معنی میں ہے اسی لیے حسد، کینہ اور دشمنی کہ جو چپکے سے انسانی روح میں نفوذ کر جاتے ہیں انھیں "غل" کہا جاتا ہے۔ لہٰذا "غل" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں بہت سی بری اور خلافِ اخلاق صفات شامل ہیں (مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۲۹ اردو ترجمہ کے حاشیے کی طرف رجوع کریں)۔

[2] "سرر" "سریر" کی جمع ہے جو دراصل تخت، کرسی یا اس قسم کی کسی چیز کے معنی میں ہے کہ جس پر بیٹھتے ہیں اور خوشی کی محفلیں برپا کرتے ہیں (توجہ رہے کہ "سرور" اور "سرور" ایک ہی مادہ سے ہیں)۔

اور ایک ہی صف میں ہیں ایسا نہیں کہ کوئی تو مجلس میں بالا نشین ہے اور دوسرا جوتے اتارنے کی جگہ پر بیٹھا ہے۔
البتہ یہ امر معنوی درجات مختلف ہونے کے منافی نہیں ہے یہ تو ان کی اجتماعی نشستوں سے مربوط ہے ورنہ ہر ایک کا اپنے تقویٰ و ایمان کے لحاظ سے اپنا مقام ہے۔

۷۔ اس کے بعد ساتویں مادی اور معنوی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے انھیں ہرگز کوئی خستگی اور تکان لاحق نہ ہوگی (لا یمسھم فیھا نصب)۔
جبکہ اس دنیا میں آرام کے ایک دن سے پہلے اور بعد کئی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے کہ جن کا تصور انسان کے راحت و آرام کو درہم برہم کر دیتا ہے ایسا وہاں نہیں ہے۔

۸۔ اسی طرح انھیں فنا اور نعمت کے ختم ہوجانے کا خیال بھی نہیں ستاتا کیونکہ "وہ ہرگز ان پر مسرت نعمتوں سے بھرے ہوئے باغوں سے باہر نہیں نکلیں گے" (وما ھم منھا بمخرجین)۔
اب جبکہ بہشت کی فراواں اور دل انگیز نعمتوں کا مؤثر طریقے سے بیان ہو چکا اور یہ بتایا جا چکا کہ وہ کا ملاً متقین کے سپرد ہوں گی تو اس بات کے پیشِ نظر کہیں گنہ گار افراد اس غم و اندوہ میں ڈوب کر نہ رہ جائیں کہ اے کاش! ہم بھی ان نعمتوں تک پہنچ سکتے ــــــ اس مقام پر رحمان و رحیم خدا ان کے لیے بھی جنت کے دروازے کھولتا ہے مگر مشروط طور پر۔
بہت محبّت بھرے لہجے میں اور نوازشات کے نہایت اعلیٰ انداز میں اپنے پیغمبر کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے کہتا ہے: اے نبی! میرے بندوں کو آگاہ کر دو کہ میں غفور و رحیم ہوں، گناہ بخشنے والا اور محبّت سے معمور ہوں (نبیء عبادی انی انا الغفور الرحیم)۔
"عبادی" (میرے بندے) یہ ایک لطیف تعبیر ہے کہ جو ہر انسان کو اشتیاق دلاتی ہے اور اس کے بعد خدا کی یہ توصیف کہ وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اس اشتیاق کو اوجِ کمال تک پہنچا دیتی ہے۔
لیکن قرآن چونکہ ہمیشہ رحمتِ الہٰی کے مظاہر سے سوءِ استفادہ کو روکتا ہے لہٰذا اس کے بلا دینے والے جملوں کے ذریعے اس کے خشم و غضب کا ذکر ہے یہ اس لیے ہے تاکہ خوف و رجا کے درمیان اعتدال برقرار رہے کیونکہ یہ تکامل و ارتقاء اور تربیت کا راز ہے۔ لہٰذا بغیر کسی فاصلے کے فرمایا گیا ہے: میرے بندوں سے یہ بھی کہہ دو کہ میرا عذاب بھی دردناک عذاب ہے (و ان عذابی ھو العذاب الالیم)۔

چند اہم نکات:

۱۔ بہشت کے باغ اور چشمے: ہمارے لیے کہ جو اس محدود دنیا میں ہیں نعماتِ بہشت کو سمجھنا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ کیونکہ اس جہان کی نعمتیں ان نعمتوں کے مقابلے میں ایسے ہی ہیں جیسے تقریباً صفر کے مقابلے میں ایک بہت بڑا عدد۔ لیکن یہ امر اس میں رکاوٹ نہیں کہ اپنی فکر اور روح کے ذریعے انھیں محسوس کریں یہ بات مسلّم ہے کہ بہشت کی نعمتیں

بہت ہی متنوع ہیں۔ لفظ "جنّت" (باغات) جو مندرجہ بالا اور دیگر بہت سی آیات میں آیا ہے۔ اسی طرح لفظ "عیون" (چشمے) اس حقیقت کے گواہ ہیں۔

البتہ قرآن میں (سورۂ دہر، الرحمٰن، دخان اور محمد وغیرہ میں) ان چشموں کی مختلف انواع کی طرف اشارہ ہوا ہے اور مختصر اشارات کے ذریعے ان کی تنوع کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ جو شاید اس جہان کے طرح طرح کے نیک کاموں کی مجسم ہونے کی طرف اشارہ ہو۔ انشاء اللہ ان سورتوں کی تفسیر میں ہم ان کا تفصیلی ذکر کریں گے۔

۲۔ مادی اور روحانی نعمتیں: برخلاف اس کے کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں قرآن نے ہر جگہ لوگوں کو مادی نعمتوں کی بشارت نہیں دی بلکہ بار ہا گفتگو میں روحانی نعمتوں کا ذکر بھی آیا ہے مندرجہ بالا آیات اس کا واضح نمونہ ہیں اس طرح سے فرشتے اہلِ بہشت کو اس عظیم مرکزِ نعمت میں خوش آمدید کہتے ہوئے جو پہلی بشارت دیں گے وہ سلامتی اور امن کی بشارت ہے۔

کینوں کا سینوں سے دھل جانا اور بری صفات مثلاً حسد، خیانت وغیرہ کہ جو روحِ اخوت کو ختم کر دیتی ہیں کا خاتمہ اور اسی طرح غلط قسم کے تکلفاتی امتیازات کہ جو فکر و روح کا سکون برباد کر دیتے ہیں کا حذف ہو جانا یہ سب ان معنوی و روحانی نعمتوں میں سے ہے کہ جن کی طرف مندرجہ بالا آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ امن و سلامتی کہ جس کا ذکر نعماتِ بہشت کے آغاز میں ہوا ہے ہر دوسری نعمت کی بنیاد ہے کیونکہ ان دو کے بغیر کوئی نعمت قابلِ استفادہ نہیں ہے یہاں تک کہ اس دنیا میں بھی تمام نعمتوں کا نقطۂ آغاز امن و سلامتی کی نعمت ہے۔

۳۔ کینہ اور حسد اخوت کے دشمن ہیں: یہ امر لائقِ توجہ ہے کہ امن و سلامتی کے ذکر کے بعد زیرِ نظر آیات میں نعمت اخوت کے ذکر سے پہلے تمام مزاحم صفات مثلاً کینہ، حسد، غرور اور خیانت کی بیخ کنی کا ذکر ہوا ہے لفظ "غل" جو وسیع مفہوم رکھتا ہے اس کے ذریعے ان سب کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

درحقیقت اگر انسان کا دل اس "غل" سے پاک نہ ہو امن و سلامتی کی نعمت بھی حاصل نہ ہوگی اور نہ ہی اخوت و برادری کی نعمت بلکہ ہمیشہ جنگ و جدال اور کشمکش جاری رہے گی اور رشتۂ اخوت منقطع ہوگا اور امن و سلامتی چھن جائے گی۔

۴۔ جزائے کامل: بعض مفسرین کے بقول جزا تب مکمل ہوتی ہے جب اس میں یہ چار شرطیں موجود ہوں:

۱۔ فائدہ و کھائی دینے والا ہو ۲۔ احترام کے ساتھ ہو ۳۔ ہر قسم کی پریشانی سے خالی ہو ۴۔ دائمی ہو

مندرجہ بالا آیات میں نعماتِ بہشت کے لیے ان چاروں پہلوؤں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

"ان المتقین فی جنّٰت وعیون" پہلی قسم کے لیے ہے۔

"ادخلوھا بسلٰم اٰمنین" احترام و تعظیم کی دلیل ہے۔

"ونزعنا ما فی صدورھم من غل اخوانا علٰی سرر متقٰبلین" ہر قسم کی پریشانی، ناراضی اور روحانی تکلیف کی نفی کی طرف اشارہ ہے۔

"لا یمسھم فیھا نصب" جسمانی نقصان اور ضرر کی نفی کے متعلق ہے۔

وما ھم منھا بمخرجین ۔ آخری شرط پوری کرتا ہے یعنی ان نعمتوں کے لیے مدام ہے لهذا یہ جزا ہر لحاظ سے مکمل ہوگی۔[1]

۵۔ آئیے اس دنیا میں تعمیر جنت کریں: مندرجہ بالا آیات میں جنت کی جن مادی اور معنوی صفات کی تصویر کشی کی گئی ہے اس جہان کی نعمتوں کے اہم اصول بھی یہی ہیں گویا قرآن ہمیں یہ نکتہ سمجھانا چاہتا ہے کہ دنیاوی زندگی میں یہ نعمتیں فراہم کرکے تم بھی اس عظیم جنت کی ایک چھوٹی سی نظیر قائم کر سکتے ہو۔

- اگر سینوں کو کینوں اور عداوتوں سے پاک کر لو۔
- اگر اخوت و برادری کے اصول کو تقویت دو۔
- اگر غیر ضروری طبقاتی تکلفات و تشریفات کو اپنی زندگی سے خصوصاً اجتماعی زندگی سے دور کر لو۔
- اگر امن و سلامتی اپنے معاشرے کو لوٹا دو۔
- اگر تمام لوگوں کو یہ اطمینان دلا دیا جائے کہ کوئی شخص ان کی عزت و آبرو، مقام و حیثیت اور جائز مفادات سے مزاحم نہیں ہوگا اور انھیں اپنی نعمات کے بقاء کا اطمینان ہو تو ——— یہ دن ایک ایسا دن ہوگا جب جنت کی نظیر تمھاری آنکھوں کے سامنے ہوگی۔

---

[1] تفسیر کبیر، فخرالدین رازی جلد ۱۹ صفحہ ۱۹۳

۵۱۔ وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ۝

۵۲۔ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ۝

۵۳۔ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝

۵۴۔ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ۝

۵۵۔ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ۝

۵۶۔ قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ۝

۵۷۔ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝

۵۸۔ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝

۵۹۔ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

۶۰۔ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝

ترجمہ

۵۱۔ اور انھیں (میرے بندوں کو) ابراہیم کے مہمانوں کی خبر دے۔

۵۲۔ جس وقت وہ اس کے پاس پہنچے اور سلام کیا (تو ابراہیم نے) کہا: ہم تم سے خوفزدہ ہیں۔

۵۳۔ انھوں نے کہا: ڈرو نہیں، ہم تجھے ایک دانا اور عالم بیٹے کی بشارت دیتے ہیں۔

۵۴۔ اس نے کہا: کیا مجھے بشارت دیتے ہو حالانکہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں (تو پھر) کس چیز کی بشارت دیتے ہو۔

۵۵۔ انھوں نے کہا: ہم سچی بشارت دیتے ہیں، مایوس لوگوں میں سے نہ ہو۔

۵۶۔ اس نے کہا: اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہوں کے علاوہ کون مایوس ہوتا ہے۔

۵۷۔ (پھر اس نے) کہا: اے فرستادگانِ الٰہی! تم کس کام کے لیے مامور کیے گئے ہو۔
۵۸۔ وہ کہنے لگے: ہماری ذمہ داری گنہگار قوم سے متعلق ہے کہ انھیں ہلاک کریں۔
۵۹۔ سوائے خاندانِ لوط کے کہ ان سب کو بچالیں گے۔
۶۰۔ البتہ اس کی بیوی کہ ہم نے طے کیا ہے کہ وہ (شہر میں) پیچھے رہ جانے والوں (اور ہلاک ہونے والوں) میں سے ہو۔

تفسیر

انجانے مہمان

ان آیات میں اور ان سے بعد والی کچھ آیات میں عظیم انبیاء اور ان کی سرکش امتوں کی تاریخ کا ایک تربیتی حصہ ہے اس میں خدا کے مخلص بندوں اور شیطان کے پیروکاروں کی زندگی کے واضح نمونے ہیں۔

یہ امر جاذبِ نظر ہے کہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کے واقعہ سے شروع کی گئی ہے (وہی فرشتے کہ جو آپ کے پاس انسانی لباس میں آئے تھے پہلے انھوں نے آپ کو ایک ذی وقار بیٹے کی پیدائش کی بشارت دی اور پھر قوم لوط کے دردناک انجام کی خبر دی)۔

قبل کی دو آیتوں میں پیغمبر اسلامؐ کو حکم دیا کہ بندوں کو مقامِ رحمت خدا کے بارے میں بھی بتائیں اور اس کے دردناک عذاب کے متعلق بھی۔ اب حضرت ابراہیم کے مہمانوں کے واقعے میں ان مذکورہ دو صفات کے دو زندہ نمونے دکھائی دیتے ہیں اس طرح گزشتہ آیات اور ان آیات کے درمیان ربط واضح ہو جاتا ہے۔

پہلے ارشاد فرمایا گیا ہے: میرے بندوں کو ابراہیم کے مہمانوں کے بارے میں خبر دو (ونبئھم عن ضیف ابراھیم)۔

اگرچہ "ضیف" یہاں مفرد کی صورت میں آیا ہے لیکن جیسا کہ بعض عظیم مفسرین نے کہا ہے "ضیف" مفرد اور جمع دونوں کے معنی رکھتا ہے (ایک مہمان اور کئی مہمان)۔

یہ بن بلائے مہمان وہی فرشتے تھے جنہوں نے "ابراہیم کے پاس پہنچ کر پہلے انجانے طور پر اسے سلام کیا" (اذ دخلوا علیہ فقالوا سلٰما)۔

جیسا کہ ایک بزرگوار میزبان کا فریضہ ہے، ابراہیم نے ان کی پذیرائی کا اہتمام کیا فوراً ان کے لیے مناسب غذا فراہم کی لیکن جب دستر خوان بچھایا گیا تو انجانے مہمانوں نے غذا کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔ تو حضرت ابراہیم کو اس پر دہشت ہوئی۔ انھوں نے اپنی پریشانی چھپائی نہیں۔ صراحت سے ان سے کہا: ہم تم سے خوفزدہ ہیں" (قال انا منکم وجلون)[1]۔

---

[1] اگرچہ مندرجہ بالا آیات میں اس بات کی طرف اشارہ نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے پذیرائی کی اور مہمانوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ خوف اس رواج کی بناء پر تھا کہ اس زمانے میں اور بعد میں بھی بلکہ ہمارے زمانے تک بعض قوموں کا معمول ہے کہ جب کوئی شخص کسی کا نان و نمک کھا لیتا ہے تو اسے ضرر نہیں پہنچاتا اور اپنے آپ کو اس کا ممنونِ احسان سمجھتا ہے لہٰذا کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھانے کو بُرا سمجھتا ہے اور اسے کینہ و عداوت کی دلیل شمار کیا جاتا ہے۔

لیکن زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پریشانی سے نکال دیا اور "اس سے کہا: ڈرو نہیں ہم تجھے ایک عالم و دانا بیٹے کی بشارت دیتے ہیں" (قالوا لا توجل انا نبشرك بغلام علیم)۔

یہ غلام علیم (صاحب علم لڑکے) سے کون مراد ہے، قرآن کی دیگر آیات کو سامنے رکھتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد اسحاق ہیں کیونکہ فرشتوں نے جب حضرت ابراہیم کو یہ بشارت دی تو ان کی بیوی سارہ جو بظاہر ایک بانجھ عورت تھی وہ بھی موجود تھی انھوں نے اسے بھی یہ بشارت دی جیسا کہ سورۂ ہود کی آیہ ۷۱ میں ہے۔

وامرأته قائمة فضحكت فبشرناها باسحاق

اس کی بیوی کھڑی تھی، وہ ہنسی اور ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سارہ حضرت اسحاق کی والدہ تھیں۔ قبل ازیں حضرت ابراہیم حضرت ہاجرہ سے صاحبِ اولاد تھے حضرت اسماعیل ان کے فرزند تھے (حضرت ہاجرہ وہ کنیز تھیں جنھیں حضرت ابراہیم نے زوجیت کے لیے انتخاب کیا تھا) لیکن حضرت ابراہیم اچھی طرح جانتے تھے کہ طبیعی اصولوں کے لحاظ سے ان سے ایسے بیٹے کی پیدائش بہت بعید ہے اگرچہ خدا کی قدرتِ کاملہ کے لیے کوئی چیز محال نہیں ہے مگر انھوں نے معمول کے طبیعی قوانین کی طرف توجہ سے ان کے تعجب کو ابھارا لہٰذا انھوں نے کہا مجھے ایسی بشارت دیتے ہو حالانکہ میں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا ہوں۔ (قال ابشرتمونی علی ان مسنی الکبر)۔

واقعاً مجھے کس چیز کی بشارت دے رہے ہو (فبم تبشرون)۔

کیا تمھاری یہ بشارت حکمِ الٰہی سے ہے یا خود تمھاری طرف سے ہے صراحت سے کہو تاکہ مجھے زیادہ اطمینان ہو۔

"مسنی الکبر" (مجھے بڑھاپے نے مس کیا ہے) یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بڑھاپے کے آثار میرے سفید بالوں اور چہرے کی جھریوں سے نمایاں ہیں اور اس کے آثار میں اپنے سارے وجود میں محسوس کرتا ہوں۔

ممکن ہے کہا جائے کہ اس لحاظ سے ابراہیم ایک اچھے تجربے سے گزرے تھے کہ بڑھاپے میں ہی ان کے بیٹا اسماعیل پیدا ہوئے تھے لہٰذا نئے بیٹے یعنی حضرت اسحاق کی پیدائش کے بارے میں انھیں تعجب نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن معلوم ہونا چاہیے، کہ بعض مفسرین کے بقول حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق کی پیدائش میں دس سال سے زیادہ فاصلہ تھا لہٰذا بڑھاپے میں دس سال گزر جائیں تو بچے کی پیدائش کا احتمال بہت ہی کم ہوتا ہے۔

ثانیاً اگر کوئی واقعہ خلافِ معمول ہو اگرچہ استثنائی طور پر ہو۔ اس سے مشابہ مواقع پر تعجب کرنے سے مانع نہیں ہے

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) لیکن جیسا کہ سورۂ ہود کی آیہ ۶۹ اور ۷۰ میں ہم پڑھ چکے ہیں یہی تھا۔ (تفسیر نمونہ جلد ۵ میں مذکورہ آیات کی تفسیر ملاحظہ کیجیے)۔

کیونکہ ایسے سن وسال میں بچے کی پیدائش بہرحال ایک امر عجیب ہے۔[1]

بہرحال فرشتوں نے حضرت ابراہیم کو تردد یا زیادہ تعجب کا موقع نہ دیا۔ اور ان سے صراحت وقاطعیت سے کہا ہم تجھے حق کے ساتھ بشارت دے رہے ہیں (قالوا بشرنٰك بالحق)۔ وہ بشارت کہ جو خدا کی طرف سے ہے اور اس کے حکم سے ہے۔ اسی بناء پر یہ حق ہے اور مسلم ہے۔

اس کے بعد اس لیے کہ مبادا ابراہیم مایوس وناامید ہوں تاکید کے طور پر کہنے لگے، اب جبکہ ایسا ہے تو مایوس ہونے والوں میں سے نہ ہو (فلا تکن من القانطین)۔

لیکن ابراہیم نے فوراً ان کے اس خیال کو دُور کر دیا کہ ان پر مایوسی اور رحمتِ خدا سے ناامیدی کا غلبہ نہیں ہے اور واضح کیا کہ یہ تو صرف طبیعی معمولات کے حوالے سے تعجب ہے، لہٰذا صراحت سے کہا: گمراہوں کے سوا اپنے پروردگار کی رحمت سے کون مایوس ہوگا (قال ومن یقنط من رحمة ربه الا الضالون)۔

وہی گمراہ کہ جنھوں نے خدا کو اچھی طرح نہیں پہچانا اور اس کی بے پایاں قدرت پر ان کی نگاہ نہیں۔ وہ خدا کہ جو مشتِ خاک سے ایسا عجیب وغریب انسان پیدا کرتا ہے اور ناچیز نطفہ سے ایک مکمل بچہ وجود میں لاتا ہے خرمے کا خشک درخت جس کے حکم سے پھل سے لد جاتا ہے اور جلانے والی آگ جس کے حکم سے گلزار ہو جاتی ہے کون شخص ایسے پروردگار کی قدرت میں شک کرے یا اس کی رحمت سے مایوس ہو۔

بہرحال یہ بشارت سننے کے بعد ابراہیم اس خیال میں پڑ گئے کہ ان خاص حالات میں یہ فرشتے انھیں صرف بیٹے کی بشارت دینے نہیں آئے، یقیناً یہ کسی نہایت اہم کام پر مامور ہیں اور یہ بشارت تو ان کی ماموریت کا ایک پہلو ہے لہٰذا ان سے پوچھنے لگے: اے فرستادگانِ الٰہی! بتاؤ کہ تم کس اہم ذمہ داری کے لیے بھیجے گئے ہو؟ (قال فما خطبکم ایها المرسلون)۔

انھوں نے کہا: ہم ایک گنہ گار قوم کے لیے بھیجے گئے ہیں (قالوا انا ارسلنا الی قوم مجرمین)۔

چونکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت ابراہیم جستجو اور تحقیق کے بارے میں اپنی خو کی وجہ سے وہ بھی خصوصاً ایسے مسائل میں اتنے جواب پر بس نہیں کریں گے۔ لہٰذا انھوں نے فوراً مزید فرمایا: یہ مجرم قوم لوط کے سوا کوئی اور نہیں ہے ہم مامور ہیں کہ اس بے شرم آلودہ گناہ قوم کو نیست ونابود کر دیں، سوائے خاندانِ لوط کے کہ جسے ہم ہلاکت سے بچالیں گے (الا اٰل لوط انا لمنجوهم اجمعین)۔

لیکن "اجمعین" کی تاکید کے ساتھ "آل لوط" کی تعبیر تمام گھر والوں کے بارے میں تھی یہاں تک کہ ان کی بیوی کہ جو مشرکین کی ہم کار تھی اور شاید ابراہیم بھی اس ماجرے سے آگاہ تھے لہٰذا انھوں نے بلا فاصلہ استثناء کرتے ہوئے کہا: سوائے اس کی بیوی کے کہ ہم نے طے کیا ہے کہ وہ شہر میں رہ جانے والوں کے ساتھ فنا سے دوچار ہوگی اور نجات حاصل نہ کر سکے گی۔

---

[1] بعض مفسرین نے کہا ہے کہ پہلے بیٹے اسماعیل کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ۹۹ سال تھی اور اسحاق کی ولادت کے وقت آپ ۱۱۲ سال کے تھے۔

(الا امرأته قدرنا انها لمن الغٰبرین) ۔

"قدرنا" (ہم نے مقدر کیا ہے)، یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ ہم اس سلسلے میں خدا کی طرف سے ماموریت رکھتے ہیں ۔

فرشتوں کا حضرت ابراہیم سے ملاقات کرنا، انھیں ولادتِ اسحاق کی خوشخبری دینا اور اس طرح ان سے قوم لوط کے بارے میں گفت گو کرنا ——— ان سب امور پر ہم سورہ ہود کی آیات ۶۹ تا ۷۶، کے ذیل میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں[1]

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۵ میں ملاحظہ فرمایئے ۔

۶۱۔ فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨالْمُرْسَلُوْنَ ۝

۶۲۔ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝

۶۳۔ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝

۶۴۔ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝

۶۵۔ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ۝

۶۶۔ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ۝

۶۷۔ وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝

۶۸۔ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ۝

۶۹۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ۝

۷۰۔ قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

۷۱۔ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝

۷۲۔ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝

۷۳۔ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ۝

۷۴۔ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝

۷۵۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ۝

۷۶۔ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ○

۷۷۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○

ترجمہ

۶۱۔ جس وقت (خدا کے) بھیجے ہوئے خاندانِ لوط کے پاس آئے۔

۶۲۔ (لوط نے) کہا تم انجانے افراد ہو۔

۶۳۔ انھوں نے کہا: ہم تیرے پاس وہی چیز لائے ہیں کہ جس کے بارے میں وہ (کافر) شک و تردّد کرتے تھے (ہم عذاب پر مامور ہیں)۔

۶۴۔ ہم تیرے پاس حقیقتِ مسلّم لائے ہیں اور ہم سچ کہتے ہیں۔

۶۵۔ لہٰذا رات کے آخری پہر اپنے گھر والوں کو ساتھ لے اور یہاں سے نکل پڑ۔ تو ان کے پیچھے پیچھے چل تم میں سے کوئی بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے اور جہاں کے لیے تمہیں کہا گیا ہے وہاں چلے جاؤ۔

۶۶۔ اور ہم نے لوط کو وحی کی کہ صبح کے وقت ان سب کی جڑ اکھاڑ پھینکی جائے گی۔

۶۷۔ (دوسری طرف) اہلِ شہر ان کے آنے کا پتہ چل گیا اور وہ لوط کے گھر کی طرف آئے جبکہ وہ ایک دوسرے کو خوشخبری دے رہے تھے۔

۶۸۔ (لوط نے) کہا: یہ میرے مہمان ہیں میری آبرو نہ گنواؤ۔

۶۹۔ خدا سے ڈرو اور مجھے شرمندہ نہ کرو۔

۷۰۔ وہ کہنے لگے: کیا ہم نے تجھے دنیا والوں (کے اِدھر آنے) سے روکا نہ تھا۔

۷۱۔ اس نے کہا: اگر تم صحیح کام انجام دینا چاہتے ہو تو میری بیٹیاں حاضر ہیں (ان سے شادی کر لو اور گناہ کی قباحت سے بچو)۔

۷۲۔ تیری جان کی قسم! وہ اپنی مستی میں سرگرداں ہیں اور اپنی عقل و شعور گنوا بیٹھے ہیں۔

۷۳۔ آخر کار طلوعِ آفتاب کے وقت (صاعقہ یا زمین کے لرزنے کی صورت میں ایک ہولناک) چنگھاڑ نے انھیں گھیر لیا۔

۷۴۔ اس کے بعد (ان کے شہر اور آبادی کو ہم نے زیر وزبر کر دیا) وہ تہہ و بالا ہو گئے اور ہم نے ان پر پتھروں کی بارش فرمائی۔

۷۵۔ اس (عبرت انگیز سرگذشت) میں سمجھ داروں کے لیے نشانیاں ہیں۔

۷۶۔ اور (قافلوں کے) راستوں میں ان کے ویرانے ہمیشہ کے لیے برقرار ہیں۔

۷۷۔ اس میں ایمان داروں کے واسطے نشانیاں ہیں۔

تفسیر

قوم لُوط کے گنہ گاروں کا انجام

گزشتہ آیات میں ہم نے ان فرشتوں کی حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات کا حال پڑھا جو قوم لُوط پر عذاب کے لیے مامور تھے زیر نظر آیات میں ہم ان کے حضرت ابراہیمؑ کے پاس سے چلے آنے اور حضرت لُوط پاس آنے کا حال پوچھیں گے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جس وقت فرستادگانِ الٰہی خاندانِ لُوط کے پاس آئے (فلما جاء ال لوط المرسلون)۔ تو لُوط نے ان سے فرمایا "تم اجنبی لوگ ہو" (قال انکم قوم منکرون)۔

مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام نے ان سے یہ بات اس لیے کہی کہ وہ بہت خوبصورت نوجوانوں کی صورت میں ان کے پاس آئے تھے اور ہو سکتا ہے کہ ان کا آنا آپ کے لیے ایک مشکل کا باعث بن جاتا۔ ایک طرف وہ مہمان تھے محترم تھے اور ان کا آنا مبارک تھا اور دوسری ماحول انتہائی شرمناک اور مشکلات سے پُر تھا اسی لیے سورۂ ہود کی آیات میں یہی واقعہ جو کسی اور مناسبت سے آیا ہے وہاں "سیٔ بھم" کے الفاظ آئے ہیں یعنی یہ امر خدا خاص اس پیغمبر کے لیے سخت ناگوار تھا اور وہ ان کے آنے سے پریشان ہوئے اور کہنے لگے کہ آج کا دن بہت سخت ہے۔

لیکن فرشتوں نے انھیں زیادہ دیر انتظار میں نہ رکھا اور صراحت کے ساتھ کہا کہ ہم تیرے پاس ایسی چیز لے کر آئے ہیں جس میں وہ شک رکھتے تھے۔ (قالوا بل جئنٰک بما کانوا فیہ یمترون) یعنی ہم اس دردناک عذاب کے لیے مامور ہیں جس کے بارے میں تو انھیں تنبیہ کر چکا ہے لیکن انھوں نے اسے کبھی بھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔

اس کے بعد انھوں نے بطور تاکید کہا: "ہم تیرے لیے مسلّم اور ناقابلِ تردید حقیقت لائے ہیں" یعنی ہم اس بے ایمان اور منحرف قوم کے لیے حتمی عذاب اور قطعی سزا لے کر آئے ہیں (واتینٰک بالحق)۔

پھر انھوں نے مزید تاکید کے لیے کہا: "ہم یقیناً سچ کہہ رہے ہیں" (وانا لصٰدقون)۔

یعنی یہ قوم اپنے لوٹنے کے تمام راستے تباہ کر چکی ہے اور ان کی شفاعت کا موقع اب باقی نہیں رہا یہ اس لیے کہا کہ کہیں لُوط ان کی سفارش کے لیے نہ سوچنے لگیں اور جان لیں کہ یہ لوگ اب ہرگز شفاعت کی اہلیت نہیں رکھتے۔

نیز ضروری تھا کہ مومنین کا چھوٹا سا گروہ (کہ جو ان کی بیوی کے سوا باقی اہل خاندان پر مشتمل تھا) اس ہلاکت انگیزی سے بچ جائے لہٰذا انھوں نے حضرت لوطؑ کو ضروری احکامات دیئے، کہنے لگے: رات کے وقت جب یہ گنہ گار لوگ سو جائیں یا شراب و شہوت میں مست ہو جائیں تم اپنے خاندان کو لے کر شہر سے باہر نکل جاؤ (فاسر باهلك بقطع من الليل)۔ لیکن "تم ان کے پیچھے پیچھے رہنا" تاکہ ان کی نگرانی کر سکو کہ ان میں سے کوئی پیچھے نہ رہ جائے (واتبع ادبارهم)۔ "نیز تم میں سے کوئی بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے" (ولا يلتفت منكم احد)۔ "اور اسی مقام (شام یا کوئی دوسرا علاقہ جہاں کے لوگ اس آلودگی سے پاک ہیں) کی طرف چلے جاؤ" (وامضوا حيث تؤمرون)۔

اس کے بعد گفتگو کا لب و لہجہ بدل جاتا ہے اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے "ہم نے لوطؑ کو اس امر کی وحی کی کہ دم صبح سب کی ریشہ کنی ہو جائے گی" "یہاں تک کہ ان میں سے ایک فرد بھی نہیں بچے گا۔ (وقضينا اليه ذلك الامر ان دابر هؤلاء مقطوع مصبحين)۔

غور کیجیے گا۔

قرآن اس واقعے کو یہیں چھوڑ کر ابتدا کی طرف لوٹتا ہے اور واقعے کا وہ حصہ جو ایک مناسبت کی وجہ سے وہاں رہ گیا تھا کہ جس کا ہم بعد میں ذکر کریں گے، اسے بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: شہر والوں کو جب لوط کے پاس آنے والے نئے مہمانوں کا پتہ چلا تو وہ ان کے گھر کی طرف چل پڑے راستے میں وہ ایک دوسرے کو خوشخبری دیتے تھے (وجاء اهل المدينة يستبشرون)۔ گمراہی کی شرمناک وادی میں بھٹکنے والے ان افراد کا خیال تھا کہ گویا تر مال ان کے ہاتھ آگیا ہے خوبصورت اور خوش رنگ نوجوان اور وہ بھی لوط کے گھر میں۔

"اهل المدينة" کی تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ کم از کم شہر کے بہت سے لوگ ٹولیوں میں حضرت لوطؑ کے گھر کی طرف چل پڑے۔ اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک بے شرم، ذلیل اور جسور تھے خصوصاً لفظ "يستبشرون" (ایک دوسرے کو بشارت دیتے تھے) ان کی آلودگی کی گہرائی کی حکایت کرتا ہے کیونکہ یہ ایک ایسا شرمناک عمل ہے کہ شاید کسی نے اس کی نظیر جانوروں میں بھی بہت ہی کم دیکھی ہوگی اور یہ عمل اگر کوئی انجام دیتا بھی ہے تو کم از کم چھپ چھپا کر اور احساس شرمندگی کے ساتھ ایسا کرتا ہے لیکن یہ بدکار کمینہ صفت قوم کھلم کھلا ایک دوسرے کو مبارکباد دیتی تھی۔

حضرت لوط علیہ السلام نے جب ان کا شور و غل سنا تو بہت گھبرائے اور مضطرب ہوئے انھیں اپنے مہمانوں کے بارے میں بہت خوف ہوا کیونکہ ابھی تک وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ مہمان مامورین عذاب ہیں اور قادر و قاہر خدا کے فرشتے ہیں لہٰذا وہ ان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: یہ میرے مہمان ہیں، میری آبرو نہ گنواؤ" (قال ان هؤلاء ضيفي فلا تفضحون)۔ یعنی اگر تم خدا، پیغمبر اور جزاء و سزا کے مسئلے سے صرف نظر کر لو تو بھی کم از کم یہ انسانی مسئلہ ہے اور یہ بات تو سب انسانوں میں چاہے مومن ہوں یا کافر، موجود ہے کہ وہ مہمانوں کا احترام کرتے ہیں تم کیسے انسان ہو کہ اتنی سی بات بھی

نہیں مانتے ہو۔ اگر تمھارا کوئی دین نہیں تو کم از کم آزاد انسان تو ہو۔

اس کے بعد آپ نے مزید کہا : آؤ خدا سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے سامنے شرمسار نہ کرو (و اتقوا اللہ ولا تخزون)[2]

لیکن وہ، وہ بہت جسور اور منہ پھٹ تھے بجائے اس کے کہ وہ شرمندہ ہوتے کہ انھوں نے اللہ کے پیغمبر لوطؑ سے کیسا مطالبہ کیا ہے الٹا اس طرح سے پیش آئے جیسے لوطؑ سے کوئی جرم سرزد ہوا ہے انھوں نے زبانِ اعتراض دراز کی اور کہنے لگے : کیا ہم نے تجھ سے نہ کہا تھا کہ دنیا والوں کو اپنے ہاں مہمان نہ ٹھہرانا اور کسی کو اپنے ہاں نہ آنے دینا (قالوا اولم ننھک عن العٰلمین)۔

تم نے اس کی خلاف ورزی کیوں کی اور ہمارے کہنے پر عمل کیوں نہ کیا۔

یہ اس بناء پر تھا کہ یہ قوم انتہائی کم ظرف اور کنجوس تھی یہ لوگ ہرگز کسی کو اپنے ہاں مہمان نہیں ٹھہراتے تھے اور اتفاق سے ان کے شہر قافلوں کے راستے میں پڑتے تھے کہتے ہیں کہ انھوں نے یہ کام بعض آنے والوں کے ساتھ اس لیے کیا کہ کوئی اُن کے ہاں ٹھہرے نہ۔ آہستہ آہستہ ان کی عادت بن گیا لہٰذا جب حضرت لوطؑ کو شہر میں کسی مسافر کے آنے کی خبر ہوتی تو اسے اپنے گھر میں دعوت دیتے تاکہ وہ کہیں ان کے چنگل میں نہ پھنس جائے ان لوگوں کو جب اس کا پتہ چلا تو بہت سیخ پا ہوئے اور حضرت لوطؑ سے کھل کر کہنے لگے کہ تمھیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اب تم کسی مہمان کو اپنے گھر لے جاؤ۔

لہٰذا یوں لگتا ہے کہ زیرِ نظر آیت میں لفظ "عالمین" مسافروں اور ایسے افراد کی طرف اشارہ ہے جو اس شہر اور علاقے کے رہنے والے نہ تھے اور ان کا صرف وہاں سے گزر ہوتا تھا۔

بہرحال جب حضرت لوطؑ نے ان کی یہ جسارت اور کمینگی دیکھی تو انھوں نے ایک طریقہ اختیار کیا تاکہ انھیں خوابِ غفلت اور انحراف و بے حیائی کی مستی سے بیدار کر سکیں۔ آپ نے کہا : تم کیوں انحراف کے راستے پر چلتے ہو اگر تمھارا مقصد جنسی تقاضوں کو پورا کرنا ہے تو جائز اور صحیح طریقے سے شادی کر کے انھیں پورا کیوں نہیں کرتے، یہ میری بیٹیاں ہیں (میں تیار ہوں کہ انھیں تمھاری زوجیت میں دے دوں) اگر تم صحیح کام انجام دینا چاہتے ہو تو اس کا راستہ یہ ہے (قال ھٰؤلاء بنتی ان کنتم فٰعلین)۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت لوطؑ کی تو چند ایک بیٹیاں تھیں اور ان افراد کی تعداد زیادہ تھی لیکن مقصد یہ تھا کہ ان پر

---

[1] "فضیحت" اصل لغت میں کسی چیز کے منکشف ہو جانے کے معنی میں ہے بعد ازاں یہ عیب ظاہر ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ فارسی میں اس کا متبادل "رسوا کردن" (رسوا کرنا) ہے۔ گویا لوطؑ چاہتے ہیں کہ انھیں سمجھائیں کہ تمھارا یہ کام ان مہمانوں کے سامنے میری آبرو خاک میں ملادیگا اور یہ سمجھیں گے کہ میرے شہر گنا ہوں میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں۔

[2] لیکن "خزی" دراصل دور کرنے کے معنی میں ہے بعد ازاں شرمندگی کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ گویا لوطؑ چاہتے تھے کہ ان مہمانوں کے سامنے مجھے شرمندہ نہ کرو اور انھیں مجھ سے دور نہ کرو۔

اتمام حجت کیا جائے اور کہا جائے کہ میں اپنے مہمانوں کے احترام اور حفاظت اور تمھیں برائی کی دلدل سے نکالنے کے لیے اس حد تک ایثار کے لیے تیار ہوں۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "ھٰؤلاء بناتی" سے مراد شہر کی بیٹیاں ہیں اور روحانی باپ کے اعتبار سے انھوں نے سب کو اپنی بیٹیاں کہا ہے لیکن پہلی تفسیر آیت کے معنی کے زیادہ نزدیک ہے۔

بغیر کہے واضح ہے کہ حضرت لوطؑ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنی بیٹیاں گمراہ مشرکین کی زوجیت میں دے دیں بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ آؤ! ایمان لے آؤ اور اس کے بعد میں اپنی بیٹیاں تمھارے عقد میں دے دوں گا۔

لیکن افسوس ——— شہوت، انحراف اور ہٹ دھرمی کے اس عالم میں ان میں ذرہ بھر بھی انسانی اخلاق اور جذبہ باقی ہوتا تو کم از کم اس امر کے لیے کافی تھا کہ وہ شرمندہ ہوتے اور پلٹ جاتے مگر نہ صرف یہ کہ وہ شرمندہ نہ ہوئے بلکہ اپنی جسارت میں اور بڑھ گئے اور چاہا کہ حضرت لوطؑ کے مہمانوں کی طرف ہاتھ بڑھائیں۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ روئے سخن رسولِ اسلامؐ کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے: تیری جان اور زندگی کی قسم! وہ اپنی مستی میں سخت سرگرداں تھے (لعمرك انهم لفي سكرتهم يعمهون)۔

سورۂ ہود میں اسی قسم کی بحث کے بعد ہے کہ فرشتوں نے اپنی ماموریت سے پردہ اٹھایا اور حضرت لوط سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: ڈریئے نہیں یہ لوگ آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتے۔

سورہ قمر آیہ ۳۷ میں ہے کہ جب ان کی جسارت اور بڑھ گئی اور انھوں نے مہمانوں پر تجاوز کا مصمم ارادہ کر لیا تو ان کی آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ قرآن کے الفاظ میں۔

ولقد راودوه عن ضيفه فطمسنا اعينهم

(انھوں نے ان کے مہمانوں کے بارے میں ناجائز خواہش کی تو ہم نے ان کی آنکھیں اندھی کر دیں)

بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک فرشتے نے مٹھی بھر مٹی ان کے چہروں پر پھینک دی تو وہ سب اندھے ہو گئے (اور چیختے چلاتے پلٹ گئے)۔

اس مقام پر اس قوم کے بارے میں خدا تعالیٰ کی گفتگو انتہاء کو پہنچ جاتی ہے وہ دو چیخی تلی اور مختصر آیات میں ان کا منحوس انجام بڑے قاطع تباہ کن اور عبرت انگیز صورت میں بیان کرتا ہے اور کہتا ہے، آخر کار طلوعِ آفتاب کے وقت وحشت ناک چنگھاڑ نے ان سب کو گھیر لیا (فاخذتهم الصيحة مشرقين)۔

یہ "صیحہ" ہو سکتا ہے کہ ایک عظیم صاعقہ یا وحشت ناک زلزلہ کی آواز ہو۔ بہرحال ایک بہت بڑی چنگھاڑ تھی۔ اس کی وحشت سے سب کے سب بے ہوش ہو گئے یا مر گئے۔

ہم جانتے ہیں کہ آواز کی لہریں جب ایک معین حد سے بڑھ جائیں تو تکلیف دہ اور وحشت ناک ہوتی ہیں اور اس سے بھی بڑھ جائیں تو انسان کو بے ہوش کر دیتی ہیں یا پھر موت کا سبب بن جاتی ہیں یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ وہ عمارتوں کو تباہ کر دیں۔

لیکن ــــــ ہم نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان کے شہر کو ہم نے بالکل زیر و زبر کر دیا اور عمارتوں کے اوپر والے حصے نیچے اور نیچے والے اوپر کر دیئے (فجعلنا عالیها سافلها)۔

ان کے لیے یہ عذاب بھی کافی نہ تھا۔ اس پر ہم نے ان پر پتھریلے کنکروں کی بارش برسائی (وامطرنا علیهم حجارة من سجیل)۔

پتھروں کی یہ بارش ہو سکتا ہے ان لوگوں کے لیے ہو جو اس وقت وحشت ناک چنگھاڑ سے نابود نہیں ہوئے تھے یا جو اسی گرمی و عذاب میں مبتلا نہیں ہوئے تھے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ناپاک اجساد اور ناپاک آثار کو محو کرنے کے لیے ہو شہر کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ پتھروں کی اس بارش کے بعد کوئی شخص اس علاقے سے گزرتا تو آسانی سے باور نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی اس علاقے میں ایک شہر آباد تھا۔

یہ تین عذاب (وحشت ناک چنگھاڑ، شہر کا تہ و بالا ہونا اور پتھروں کی بارش) کیوں تھے جبکہ ان میں سے ہر ایک اس قوم کو ہلاک کرنے کے لیے کافی تھا۔

ایسا یا تو ان کے گناہ کی شدت اور بے حیائی میں ان کے جسور ہونے کی بناء پر تھا یا دوسروں کے لیے عبرت کی خاطر اللہ نے ان پر عذاب کو کئی گنا کر دیا؟

یہ وہ مقام ہے جہاں قرآن تربیتی اور اخلاقی نتیجہ حاصل کرتے ہوئے کہتا ہے: اس واقعے میں باہوش لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں (ان فی ذٰلک لآیٰت للمتوسمین) وہ جو اپنی خاص فراست و دانائی کی وجہ سے ہو، علامت سے واقعہ ہر اشارے سے حقیقت اور ہر نکتے سے اہم تربیتی مطلب اخذ کر لیتے ہیں[1]

لیکن یہ تصور نہ کریں کہ ان کے آثار بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ نہیں "قافلوں اور راہ گیروں کے لیے ہمیشہ برقرار ہیں" (وانها لبسبیل مقیم)۔

اگر تم باور نہیں کرتے تو اٹھ کھڑے ہو اور ان تباہ حال شہروں کے ویرانوں کو جا کر دیکھو جو شام کے ایک راستے پر مدینہ جانے والے مسافروں کے لیے موجود ہیں۔ دیکھو اور ان میں غور کرو۔ عبرت حاصل کرو، خدا کی طرف پلٹ آؤ، راہِ توبہ اختیار کرو اور اپنے قلب و روح کو غلاظتوں سے پاک کر لو۔

تاکید مزید کے لیے اور اہلِ ایمان کو اس عبرت انگیز داستان میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: اس واقعے میں اہلِ ایمان کے لیے نشانیاں ہیں (ان فی ذٰلک لآیة للمؤمنین)۔

کیسے ممکن ہے کہ کوئی صاحبِ ایمان یہ ہلا دینے والا واقعہ پڑھے اور اس سے عبرت حاصل نہ کرے۔

---

[1] "متوسم" "وسم" (بروزن "رسم") کے مادہ سے اثر کرنے کے معنی میں ہے اور "متوسم" اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو تھوڑے سے نشان سے حقیقت معلوم کر لیتا ہے فارسی میں اس کے ہم معنی الفاظ ہوشیار، صاحبِ فراست اور باذکاوت ہیں۔

"سجیل" سے کیا مراد ہے، اس گناہ گار قوم پر پتھروں کی بارش کیوں برسی؟ ان کے شہر تہ و بالا کیوں ہوئے۔ نزولِ عذاب صبح کے وقت کیوں ہوا؟ خاندانِ لوط سے کیوں کہا گیا کہ پلٹ کر نہ دیکھیں اور قوم لوط کا اخلاق ——— ان سب امور کے لیے سورۂ ہود کی تفسیر میں ہم کافی بحث کر چکے ہیں۔
(تفسیر نمونہ جلد ۵ میں ملاحظہ کیجیے)

چند اہم نکات

۱۔ "قطع من اللیل" سے کیا مراد ہے؟: "قطع"، "رات کی تاریکی" کے معنی میں ہے۔
مرحوم طبرسی مجمع البیان میں کہتے ہیں:
گویا "قطع"، "قطعة" کی جمع ہے لہٰذا مذکورہ بالا آیت میں اس سے مراد رات کا زیادہ حصّہ ہے۔
لیکن مفردات میں راغب کے بقول معلوم ہوتا ہے کہ "قطع"، "قطعة" کے معنی میں ہے اور مفرد ہے۔
البتہ بہت سے مفسرین کے بقول یہ لفظ رات کے آخری حصّے اور وقتِ سحر کے معنی میں ہے، شاید یہ تفسیر قرآن کی بعض دوسری آیات کی بناء پر ہے کہ جو صراحت سے آلِ لوط کے بارے میں کہتی ہیں

نجیناھم بسحر

ہم نے انھیں وقتِ سحر نجات دی (قمر ——— ۳۴)

یعنی اس وقت کہ جب شہوت پرست آلودہ دامن لوگ خوابِ غفلت میں ڈوبے ہوئے تھے، شراب، غرور اور شہوت کی مستی ان کے وجود پر چھائی ہوئی تھی اور آلِ لوط کے شہر سے نکلنے کے لئے فضا بالکل سازگار تھی پس وہ نکل کھڑے ہوئے۔
تعجب کی بات یہ ہے کہ انھیں تباہ کرنے والی سزا اور عذاب کی ابتداء بھی دمِ صبح طلوعِ آفتاب کے وقت ہوئی شاید یہ وقت اس لیے منتخب کیا گیا کہ جب حضرت لوط کے گھر پر یورش کرنے والے اندھے ہو گئے اور گھروں کو لوٹ گئے تو ممکن تھا وہ کچھ نہ کچھ سوچ میں پڑ جائیں لہٰذا رات انھیں مہلت کے طور پر دی گئی کہ شاید وہ توبہ کر لیں اور تلافی کا راستہ اختیار کریں۔
بعض روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جب گھروں کو لوٹ گئے تو ان میں سے بعض نے قسم کھائی کہ ہم صبح خاندانِ لوطؑ کے کسی فرد کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس سلسلے میں کوئی اقدام کرتے، عذابِ الٰہی نے انھیں کاٹ کر رکھ دیا[1]

۲۔ "و امضوا حیث تؤمرون" کی تفسیر: ہم بتا چکے ہیں کہ فرشتوں نے خاندانِ لوط کو نصیحت کی کہ آخر شب اس علاقے کی طرف چلے جائیں جہاں کا انھیں حکم دیا گیا ہے۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۳۸۵۔

اس جگہ کے بارے میں آیاتِ قرآن میں اس سے زیادہ وضاحت نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اس بارے میں مفسرین نے بہت سی مختلف باتیں کی ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ ان سے کہا گیا کہ سرزمین شام کی طرف چلے جائیں کہ جہاں کا ماحول نسبتاً پاک تھا۔

بعض نے کہا ہے کہ فرشتوں نے ایک خاص بستی کا ذکر کیا اور انھیں نصیحت کی کہ وہاں چلے جائیں۔

تفسیر المیزان میں اس جملے سے یہ استفادہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے راستے کے لیے ایک طرح کی الٰہی ہدایت اور حقیقی راہنمائی رکھتے تھے اور وہ اس کے مطابق چلے۔

۲۔ "متوسم" اور "مؤمن" کے درمیان واسطہ: مندرجہ بالا آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ کبھی فرمایا گیا ہے کہ قومِ لوط کے عبرت انگیز انجام میں "متوسمین" کے لیے نشانیاں ہیں اور کبھی ارشاد ہوتا ہے "مؤمنین" کے لیے۔ ان دونوں تعبیروں کے درمیان ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے وہ یہ کہ حقیقی "مومنین" "متوسم" ہوتے ہیں یعنی صاحبِ فراست فوراً بات کی تہہ تک پہنچ جانے والے اور بہت سمجھدار ہوتے ہیں۔

ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ سے "ان فی ذٰلک لاٰیٰت للمتوسمین" کی تفسیر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

اس سے مراد اُمتِ اسلامی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا:

قال رسول الله: اتقوا فراسة المؤمن فانه ینظر بنور الله عز وجل

رسول اللہؐ نے فرمایا: مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ نورِ الٰہی سے دیکھتا ہے[1]

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

متوسمین آئمہ ہیں[2]

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے:

رسولِ اکرمؐ متوسم تھے، ان کے بعد میں ہوں اور میرے بعد میری اولاد اور ذریت میں سے امام ہیں[3]

۴۔ **شہوت و غرور کی مستی**: اگرچہ شراب کی مستی مشہور ہے لیکن شراب سے بالاتر مستیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان میں سے مقام و منصب، شہرت اور خواہش نفسانی کی مستی ہے۔ مذکورہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کی جان کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ یہ لوگ اپنی مستی میں سرگرداں ہیں اور انتہائی واضح راہِ نجات بھی انھیں سجھائی نہیں دیتی۔ معاملہ یہاں تک جا پہنچتا ہے کہ حضرت لوطؑ جیسے عظیم پیغمبر اپنی بیٹیاں ان کے نکاح میں دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں تاکہ وہ اپنی نفسانی خواہشات کو حلال و مشروع

---

[1]، [2]، [3] نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۲۳۔

طریقے سے پورا کر سکیں اور آلودگیِ گناہ اور شرمناک زندگی سے نجات پا سکیں لیکن وہ پھر بھی ان کی بات کو ٹھکرا دیتے ہیں ۔

ضمنی طور پر یہ پیغمبر بزرگوار ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ مفاسد کو روکنے کے لیے صرف نفی پر بس نہ کی جائے بلکہ اثبات کا بھی سہارا لیا جائے یعنی انسان کے فطری تقاضے صحیح طور پر پورے ہونے چاہییں تاکہ وہ خرابی کی طرف مائل نہ ہوں اگرچہ قوم لوط کے فاسد افراد ایسے تھے جن پر یہ مثبت طریقہ اثر انداز نہ ہوا لیکن عام طور پر یہ طریقہ بہت زیادہ مؤثر ہوتا ہے ۔

جب ہم غلط اور غیر صحیح سرگرمیوں کو روکنا چاہیں تو پہلے ہمیں لوگوں کے لیے صحیح اور درست سرگرمیاں فراہم کرنا چاہییں ۔

یہ امر جاذبِ نظر ہے کہ بعض روایات میں ہے کہ حضرت لوطؑ جیسے با استقامت پیغمبر تقریباً تیس سال اس پست اور کمینہ خصلت قوم میں تبلیغ کرتے رہے لیکن ان کے گھر والوں کے سوا کوئی ان پر ایمان نہ لایا (اور اس میں بھی ان کی بیوی مستثنیٰ ہے)۔[1]

یہ تمام استقامت کس قدر پُرشکوہ ہے وہ بھی ایسے کمینہ خصلت لوگوں میں جن میں انسان ایک گھنٹہ بھی زندگی گذارے تو عاجز آجائے اور کس قدر تکلیف دہ ہے ایسی بیوی کے ساتھ زندگی گذارنا ۔

سورہ ذاریات کی آیہ ۳۵ ، ۳۶ میں ہے:

فاخرجنا من کان فیہا من المؤمنین فما وجدنا فیہا غیر بیت من المسلمین

ہم نزولِ بلا سے پہلے اس زمین سے ان تمام افراد کو نکال لے گئے جو ایمان لائے تھے لیکن وہاں ایک اہلِ ایمان خاندان کے علاوہ کوئی موجود نہ تھا ۔

یہاں بھی واضح ہو جاتا ہے کہ خدائی عذاب کبھی بھی خشک و تر دونوں کو نہیں جلاتا یہاں تک کہ اگر ایک سچا مومن اور احساس ذمہ داری رکھنے والا مومن ہو تو اسے بھی نجات بخشتا ہے ۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۳۸۲ ۔

۷۸۔ وَإِنْ كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ ۝

۷۹۔ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُبِينٍ ۝

۸۰۔ وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ ۝

۸۱۔ وَآتَيْنَاهُمْ آيَاتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝

۸۲۔ وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ ۝

۸۳۔ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ ۝

۸۴۔ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝

ترجمہ

۷۸۔ اصحاب ایکہ (سرسبز سرزمین والے شعیب کی قوم) یقیناً ستم گر قوم تھی۔

۷۹۔ ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان دونوں (قوم لوط اور اصحاب ایکہ) کے تباہ شدہ شہر سرِ راہ آشکار ہیں۔

۸۰۔ اصحاب الحجر (قوم ثمود) نے مرسلین کی تکذیب کی۔

۸۱۔ ہم نے ان کے لیے اپنی آیات بھیجیں لیکن انھوں نے اُن سے روگردانی کی۔

۸۲۔ وہ پہاڑوں کے اندر اپنے امن و امان والے گھر تراشتے تھے۔

۸۳۔ لیکن آخرکار (ہلاکت آفرین) چنگھاڑ نے صبح کے وقت انھیں آگھیرا۔

۸۴۔ اور جو کچھ وہ حاصل کر چکے تھے وہ عذاب الٰہی سے نجات کے لیے ان کے کام نہ آیا۔

تفسیر

دو ظالم قوموں کا انجام:

ان آیات میں قرآن دو گزشتہ اقوام کی سرگزشت کی طرف اشارہ کرتا ہے ایک کو "اصحاب الایکۃ" کہا گیا ہے اور دوسری کو "اصحاب الحجر" ان میں گزشتہ آیات میں قوم لُوط کے بارے میں جو عبرت انگیز مباحث آئی ہیں انکی تکمیل کی گئی ہے

پہلے ارشاد ہوتا ہے : یقیناً اصحاب الایکہ ظالم اور ستم گر لوگ تھے (وان کان اصحب الایکۃ لظلمین)۔[1] اور ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کی ستم گریوں اور سرکشیوں پر انھیں عذاب دیا (فانتقمنا منھم)۔

ان لوگوں کا علاقہ اور قوم لُوط کہ جس کی داستان گزر چکی ہے ، کی سرزمین تمھارے راستے میں واضح طور پر موجود ہے (وانھما لبامام مبین)۔

پس آنکھیں کھولو، ان کا انجام دیکھو اور اس سے عبرت حاصل کرو۔

اصحاب ایکہ کون ہیں ؟

بہت سے مفسرین اور ارباب لغت کہتے ہیں کہ " ایکہ " کا معنی ہے باہم جُڑے ہوئے درخت یا جنگل اور " اصحاب الایکۃ " وہی قوم شعیب ہے جو حجاز و شام کے درمیان سرسبز و شاداب زمین پر آباد تھی۔

ان کی زندگی بہت خوشحال تھی، ان کے پاس فراواں دولت تھی اسی لیے انھیں غفلت و غرور نے گھیر لیا۔ خاص طور پر وہ کم فروشی اور فتنہ و فساد میں مبتلا ہوگئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام جیسے عظیم پیغمبر نے انھیں متنبہ کیا اور توحید و راہِ حق کی دعوت دی لیکن جیسا کہ ہم نے سورۂ ہود کی آیات میں دیکھا ہے انھوں نے حق کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا اور آخرکار دردناک عذاب کے ذریعے نیست و نابود ہوگئے کئی روز تک وہ نہایت سخت گرمی کا شکار رہے۔ آخری روز بادلوں کے جھنڈ کے جھنڈ آسمان پر چھا گئے انھوں نے بادل کے سایے میں پناہ لی لیکن ایک زبردست بجلی زمین پر ٹوٹ پڑی اور ان ظالموں کو نیست و نابود کرگئی۔

شاید قرآن نے "اصحٰب الایکۃ" (درختوں سے بھری ہوئی زمین والے) اس لیے کہا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ یہ سب نعمتیں ہم نے انھیں بخشی تھیں ۔ اس کے باوجود اُنھوں نے شکرانِ نعمت کی بجائے کفرانِ نعمت کیا اور ظلم و ستم کی بنیاد رکھی اور صاعقہ نے انھیں اور ان کے درختوں کو ختم کردیا۔

ان کے حالات کی مزید تفصیل سورۂ شعراء کی آیہ ۱۷۶ تا ۱۹۰ کے ذیل میں حضرت شعیبؑ کے حوالے سے آئے گی۔

ضمناً توجہ رہے کہ ہوسکتا ہے " فانتقمنا منھم " (ہم نے انھیں سزا دی) ——— قوم لوط اور " اصحاب الایکہ " دونوں کی طرف اشارہ ہو کیونکہ اس جملے کے بعد فوراً یہ عبارت آئی ہے۔

وانھما لبامام مبین

ان دونوں کا علاقہ تمھارے سامنے آشکار ہے۔

" انھما لبامام مبین " کی یہی تفسیر مشہور ہے کہ یہ شہر لوط اور اصحاب الایکہ کے شہر کی طرف اشارہ ہے " امام " " راستہ " اور " جادہ " کے معنی میں ہے۔ (کیونکہ یہ مادہ " ام " سے لیا گیا ہے جو قصد کرنے کے معنی میں ہے اور کیونکہ انسان مقصد تک پہنچنے کے لیے راستوں سے گذرتا ہے)۔

---

[1] لفظ " ان " اس آیت میں شرطیہ نہیں ہے بلکہ " مثقلہ " سے " مخففہ " ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے۔

انہ کان اصحٰب الایکۃ لظٰلمین

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ " امام مبین " سے مراد لوحِ محفوظ ہے اس کے لیے انھوں نے سورۂ یٰس کی آیہ ۱۲ کو قرینے کے طور پر پیش کیا ہے لیکن یہ احتمال بہت ہی بعید ہے کیونکہ قرآن چاہتا ہے کہ لوگوں کو درسِ عبرت دے اور یہ دونوں نام لوحِ محفوظ میں ہوں تو لوگ ان سے اثر نہیں لے سکتے۔

جبکہ یہ شہر قافلوں اور پاس سے گذرنے والے مسافروں کے راستے میں ہوں تو ان پر گہرا اثر مرتب کر سکتے ہیں وہ ایک لمحہ کے لیے وہاں رُک جائیں، غور و فکر کریں۔ ان کا عبرت بیں دل اپنی آنکھوں سے انھیں دیکھے اور اس آفت زدہ زمین کو آئینہ عبرت سمجھے، کبھی قوم لوط کی سرزمین کے پاس اور کبھی اصحاب الایکہ کے علاقے کے نزدیک اور آخر کار ان کے انجام پر آنکھوں سے سیلابِ اشک بہائیں۔

رہے " اصحاب الحجر " ۔۔۔۔۔ تو یہ وہی سرکش قوم کہ جو حجر نامی علاقے میں رہتی تھی، بہت خوش حال تھی۔ ان کے عظیم پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام ان کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے۔ ان کے بارے میں قرآن کہتا ہے: اصحاب حجر نے خدا کے بھیجے ہوؤں کی تکذیب کی (ولقد کذب اصحاب الحجر المرسلین)۔

اس کے بارے میں کہ یہ شہر کہاں واقع ہے، بعض مفسرین اور مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ شہر مدینہ اور شام کے درمیان قافلوں کی راہ میں " وادی القریٰ " میں " تیما " کے جنوب میں پڑتا تھا، اور آج تقریباً اس کا کوئی اثر و نشان باقی نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ شہر گذشتہ زمانے میں عربوں کے تجارتی شہروں میں سے تھا۔ یہ شہر اتنا اہم تھا کہ بطلیموس نے تجارتی شہروں میں لکھا ہے اور روم کے معروف جغرافیہ دان پلین نے اس کا نام " حجری " لکھا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ ہجرت کے نویں سال جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لشکر روم کے مقابلے کے لیے تبوک کی طرف لشکر کشی کی تو مجاہدین اسلام اس مقام پر ٹھہرنا چاہتے تھے۔ پیغمبر اکرم نے منع کیا اور فرمایا:

یہ وہی قوم ثمود کا علاقہ ہے جس پر عذابِ الٰہی نازل ہوا تھا۔[1]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن اصحاب الحجر کے بارے میں (اور اسی طرح قوم نوح، قوم شعیب اور قوم لوط کے بارے میں سورۂ شعراء کی آیات ۱۰۵، ۱۲۳ اور ۱۶۰ میں بالترتیب اور دیگر گزشتہ قوموں کے بارے میں) کہتا ہے کہ انھوں نے "پیغمبروں کی تکذیب کی" حالانکہ ظاہراً ان کے پاس ایک سے زیادہ پیغمبر نہیں آئے اور انھوں نے صرف اسی کی تکذیب کی تھی۔

یہ تعبیر شاید اس بناء پر ہو کہ انبیاء کا پروگرام اور ہدف اس طرح سے ایک دوسرے سے پیوستہ تھا کہ ان میں سے ایک کی تکذیب ان سب کی تکذیب تھی۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ان قوموں کے کئی پیغمبر تھے جن میں سے ایک زیادہ معروف تھا لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] اعلام القرآن خزائلی ص ۲۹۲

بہرحال قرآن اصحاب الحجر کے بارے میں اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے ان کے لیے اپنی آیات بھیجیں لیکن انھوں نے روگردانی کی (واٰتینٰھم اٰیٰتنا فکانوا عنھا معرضین)۔

لفظ "اعراض" (منہ پھیرنا) نشاندہی کرتا ہے کہ وہ ان آیات کو سننے یا ان پر نگاہ ڈالنے کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔

جبکہ اس کے برعکس اپنی دنیادی زندگی کے کاموں میں اس قدر سخت کوش تھے کہ "اپنے لیے پہاڑوں میں امن کے گھر تراشتے تھے" (وکانوا ینحتون من الجبال بیوتاً اٰمنین)۔

یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ ان کا علاقہ کوہستانی تھا نیز یہ کہ ان کا مادی تمدن ترقی یافتہ تھا جبھی تو وہ پہاڑوں میں اپنے لیے امن کے گھر تراشتے تھے کہ جو طوفانوں، سیلابوں بلکہ زلزلوں تک کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

عجیب بات یہ ہے کہ انسان دنیا کی چند روزہ زندگی کے لیے اتنے محکم کام کرتا ہے لیکن اپنی ابدی زندگی کے بارے میں اس قدر تساہل سے کام لیتا ہے کہ خدا کی بات سننے اور اس کی آیات پر ایک منظر ڈالنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا۔

تو اب ایسی قوم کے بارے میں کیا توقع کی جا سکتی ہے سوائے اس کے کہ ان کے لیے "انتخاب اصلح الٰہی" کا قانون حرکت میں آئے اور ایسی قوموں کو جو پوری طرح فاسد و مفسد ہو چکی ہیں انھیں جینے کا حق نہ دیا جائے اور تباہ کن عذاب کے ذریعے انھیں نابود کر دیا جائے۔

اسی لیے قرآن کہتا ہے: آخرکار آسمانی چیخ نے وقت صبح انھیں آلیا (فاخذتھم الصیحۃ مصبحین)۔

یہ چیخ بجلی کی ہولناک آواز تھی جو ان کے گھروں پر گری یہ اس قدر تباہ کن اور وحشت ناک تھی کہ اس نے ان کے بے جان جسموں کو زمین پر پھینک دیا اس بات کی شاہد سورہ حم سجدہ کی آیہ ۱۳ ہے:

فان اعرضوا فقل انذرتکم صاعقۃ مثل صاعقۃ عاد و ثمود

یہ کفار منہ پھیریں تو کہہ دو کہ میں تمھیں ایسی بجلی گرنے سے ڈراتا ہوں جو بجلی قوم عاد و ثمود پر گری۔

ان کے فلک بوس پہاڑ، امن وامان کے گھر، اس سرکش قوم کے طاقتور جسم اور ان کی بہت زیادہ دولت و ثروت کوئی چیز بھی عذاب الٰہی کے سامنے ٹھہر نہ سکی۔ لہٰذا ان کی داستان کے آخر میں فرمایا گیا ہے: جو کچھ ان کے ہاتھ میں تھا وہ انھیں عذاب الٰہی سے بچا نہ سکا (فما اغنٰی عنھم ما کانوا یکسبون)۔

سورۂ شعراء میں آیہ ۱۴۱ تا ۱۵۸ میں ان کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں جو انشاء اللہ ان آیات کی تفسیر میں آئیں گے۔

۸۵۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ○

۸۶۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ○

۸۷۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ○

۸۸۔ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○

۸۹۔ وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ○

۹۰۔ كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ○

۹۱۔ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ○

ترجمہ

۸۵۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے ہم نے بغیر حق کے پیدا نہیں کیا اور وعدہ کی گھڑی (قیامت) یقیناً آکے رہے گی ان دشمنوں سے اچھی طرح صرفِ نظر کر (اور انھیں ان کی نادانیوں پر ملامت نہ کر)۔

۸۶۔ تیرا پروردگار پیدا کرنے والا آگاہ ہے۔

۸۷۔ ہم نے تجھے سورۂ حمد اور قرآن عظیم دیا ہے۔

۸۸۔ (لہٰذا) ان (کفار) میں سے کچھ گروہوں کو جو (مادی) نعمتیں دی ہیں ان پر ہرگز نگاہ نہ ڈال اور جو کچھ ان کے پاس ہے اس پر غمگین نہ ہو اور اپنے پر و بال مومنین کے لیے جھکا دے۔

۸۹۔ اور کہہ دے کہ میں واضح ڈرانے والا ہوں۔

۹۰۔ (ہم ان پر عذاب نازل کریں گے) جیسے ہم نے (آیات الٰہی کو) تقسیم کرنے والوں پر نازل کیا ہے
۹۱۔ وہی لوگ کہ جنھوں نے قرآن کو تقسیم کر دیا ہے (کہ جو کچھ ان کے مفاد میں تھا قبول کر لیا ہے اور جو کچھ ان کی ہوا و ہوس کے خلاف تھا اسے ترک کر دیا ہے)۔

تفسیر

تقسیم اور نکتہ چینی کرنے والے:

انسان ہمیشہ سے ایک صحیح آئیڈیالوجی اور عقیدہ نہ ہونے کی مصیبت میں گرفتار رہا ہے دوسرے لفظوں میں وہ مبداء و معاد کے نظریے کا پابند نہیں رہا۔ قوم لوط، قوم شعیب اور قوم صالح جیسی قومیں کہ جو اس ابتلاء میں گرفتار تھیں کے حالات تفصیل سے بیان کرنے کے بعد اب قرآن مسئلہ توحید اور معاد کی طرف لوٹتا ہے اور ایک ہی آیت میں ان دونوں امور کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کچھ آسمان و زمین میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے ہم نے بغیر حق کے پیدا نہیں کیا (وما خلقنا السمٰوٰت والارض وما بینهما الا بالحق)۔ ان پر جو نظام حاکم ہے وہ بھی حق ہے اور ان کا مقصد تخلیق بھی حق ہے لہٰذا یہ عجیب و غریب نظم و نسق اور دقیق و منظم آفرینش دانا و توانا خالق پر واضح دلیل ہے کہ وہ بھی حق ہے بلکہ حقیقت حق وہی ہے اور ہر حق اسی وقت تک حق ہے جب تک اس کے وجود بے پایاں کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور جو کچھ اس کے سوا ہے اور اس سے تعلق نہیں رکھتا وہ باطل اور فضول ہے۔

یہ تو توحید کے بارے میں تھا۔ اس کے بعد معاد و قیامت کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ وعدے کی گھڑی (قیامت) آخر کار آکے رہے گی (وان الساعة لاٰتية)۔ اگرچہ دیر سے آئے، آخر کار ضرور آئے گی۔

بعید نہیں کہ پہلا جملہ دوسرے جملے کی دلیل کے طور پر ہو کیونکہ یہ وسیع و عریض جہان تبھی حق ہو گا جب صرف یہ چند روزہ دکھ درد سے بھری ہوئی زندگی کے لیے نہ پیدا کیا گیا ہو بلکہ اس کے لیے کوئی ایسا نہایت اعلیٰ ہدف پیش نظر ہو جو اس عظیم آفرینش کی توجیہ کر سکے۔ لہٰذا آسمان و زمین اور عالم ہستی کا حق ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ آگے قیامت اور معاد موجود ہے ورنہ آفرینش و خلقت فضول تھی (غور کیجیے گا)۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو حکم دیتا ہے کہ ان کی ہٹ دھرمیوں، نادانیوں، تعصب، کارشکنیوں اور سخت سے سخت مخالفتوں کے باوجود ملائمت اور محبت کا مظاہرہ کرو" اور ان کے گناہوں سے صرف نظر کرو اور انھیں بخش دو، خوبصورتی کے ساتھ کہ جس بخشش میں ملامت تک نہ ہو (فاصفح الصفح الجميل)۔ کیونکہ لوگوں کے دلوں میں مبداء و معاد کا عقیدہ راسخ کرنے کی دعوت کے لیے تمھارے پاس واضح دلیل موجود ہے لہٰذا انھیں سختی اور خشونت کی کوئی ضرورت نہیں منطق و عقل تمھارے پاس ہے علاوہ ازیں جاہلوں کے ساتھ سختی سے تعصب ہی میں اضافہ ہوتا ہے۔

"صفح" سرچیز کے چہرے کو کہتے ہیں مثلاً صفحۂ صورت[1]۔ اسی لیے "فاصفح" منہ پھیرنے اور صرف نظر کرنے کے معنی میں آیا ہے اور کسی سے منہ پھیرنا چونکہ بعض اوقات بے اعتنائی، اظہار ناراضگی وغیرہ کے لیے ہوتا ہے اور بعض اوقات بزرگانہ عفو و درگذر کے لیے اس لیے زیر بحث آیت میں فوراً اسے لفظ "جمیل" کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے تاکہ دوسرا معنی دے سکے۔

امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں فرمایا:

العفو من غیر عتاب

اس سے مراد مؤاخذہ اور سرزنش کے بغیر عفو و درگذر ہے[2]

ایسی ہی ایک حدیث امام زین العابدین علیہ السلام سے بھی نقل ہوئی ہے[3]

اگلی آیت، جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے درحقیقت درگذر اور "صفح جمیل" کے ضروری ہونے کی دلیل کے طور پر ہے ارشاد ہوتا ہے: تیرا پروردگار پیدا کرنے والا اور آگاہ ہے۔ (ان ربک ھو الخلّق العلیم)۔

وہ جانتا ہے کہ تمام لوگ ایک جیسے نہیں ہیں وہ ان کے اندرونی اسرار، میلانات، سطح فکر اور مختلف قسم کے احساسات و جذبات سے باخبر ہے ان سب سے یہ توقع نہ رکھو کہ وہ ایک جیسے ہوں بلکہ ان سے عفو و درگذر کے جذبے سے پیش آؤ تاکہ تدریجاً ان کی تربیت ہو اور وہ راہ حق کی طرف آئیں۔

البتہ اس گفتگو کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ اپنے طرز عمل اور اعمال میں مجبور ہیں بلکہ یہ صرف ایک تربیتی قانون کی طرف اشارہ ہے اور یہ فکر و نظر اور صلاحیتوں میں اختلاف کی نشاندہی کی گئی ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بعض کا یہ خیال ہے کہ حکم رسول اللہؐ کی مکی زندگی سے مخصوص ہے اور آپ کی مدینہ ہجرت کے بعد جب مسلمان کچھ طاقت ور ہوگئے تو اس کی جگہ جہاد کے حکم نے لے لی لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ حکم مدنی سورتوں میں بھی آیا ہے (مثلاً سورۂ بقرہ، سورۂ نور، سورۂ نور، سورہ تغابن اور سورۂ مائدہ کہ جن میں سے بعض میں رسول اللہ کو صفح و عفو کا حکم دیا گیا ہے اور بعض میں مومنین کو) واضح ہوجاتا ہے کہ یہ ایک عمومی اور ابدی حکم ہے اور اتفاقاً یہ حکم جہاد کے حکم کے منافی نہیں کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا مقام ہے ایک مقام پر عفو و درگذر کے ذریعے آگے بڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور جہاں عفو و درگذر سے دوسرے کی جرأت و جسارت اور بڑھ جائے اور وہ اس سے سوء استفادہ کرے تو وہاں شدت عمل کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

اس کے بعد رسول اللہؐ کی دلجوئی کی گئی ہے اور انھیں تسلی دی گئی ہے کہ دشمنوں کی سختی، کثرت اور فراواں مادی وسائل سے

---

[1] قاموس میں فیروز آبادی نے لکھا ہے:

پہاڑ کا دامن، تلوار کی پہنائی اور چوڑائی اور صورت کو بھی "صفح" کہتے ہیں۔ نیز کسی چیز کے کنارے اور چہرے کو بھی "صفح" کہتے ہیں۔

[2]، [3] نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۷۔

ہرگز پریشان نہ ہوں، کیونکہ خدا نے خود پیغمبر پر وہ انعامات کیے ہیں جن کا کوئی چیز مقابلہ نہیں کر سکتی۔ فرمایا گیا ہے: ہم نے تجھے سورہ حمد اور قرآن عظیم دیا ہے (ولقد اٰتیناک سبعًا من المثانی والقراٰن العظیم)۔

ہم جانتے ہیں کہ "سبع" کا معنی لغت میں "سات" ہے اور "مثانی" "متعدد" "دو دو" کو کہتے ہیں۔ بہت سے مفسرین نے اور روایات میں "سبع من المثانی" کو سورہ حمد کے لیے کنایہ مراد لیا ہے کیونکہ مشہور قول کے مطابق سورہ حمد سات آیات پر مشتمل ہے اور اس لیے کہ اس کی اہمیت اور اس کے مضامین کی عظمت بہت زیادہ ہے یہ دو مرتبہ رسول اللہ پر نازل ہوئی یا یہ کہ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے آدھا حصۂ خدا کی حمد وثنا اور آدھا حصۂ بندوں کی طرف سے تقاضا والتجاء ہے یا یہ کہ یہ ہر نماز میں دو مرتبہ پڑھی جاتی ہے ان پہلوؤں کے پیش نظر اس پر لفظ "مثانی" یعنی کئی دو دو کا اطلاق ہوا ہے [1]

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "سبع" قرآن کی ابتدائی بڑی سات سورتوں کی طرف اشارہ ہے اور مثانی خود قرآن کی طرف اشارہ ہے کیونکہ قرآن رسول اللہؐ پر دو مرتبہ نازل ہوا ایک مرتبہ سارے کا سارا اکٹھا اور ایک مرتبہ تدریجاً ضرورت کے ماتحت مختلف اوقات میں۔ اس لحاظ سے معنی یہ ہوگا: پورے قرآن کی سات اہم سورتیں۔

ان مفسرین نے سورۂ زمر کی آیہ ۲۳ کو بھی اس مفہوم کے لیے شاہد قرار دیا ہے ارشادِ خداوندی ہے:۔

اللہ نزل احسن الحدیث کتابًا متشا بہا مثانی

خدا وہی ہے جس نے بہترین حدیث کو نازل فرمایا کہ جس کے مضامین ومفاہیم ہم آہنگ اور دوسرے سے مشابہ ہیں وہ کتاب کہ جو دو مرتبہ نازل ہوئی۔

لیکن ——— پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے خصوصًا ان بہت سی روایات کی بناء پر جو اہلِ بیتؑ سے نقل ہوئی ہیں جن میں اس کا مطلب سورہ حمد بتایا گیا ہے۔

مفردات میں راغب نے لفظ "مثانی" کا قرآن پر اطلاق اس لحاظ سے صحیح جانا کہ اس کی آیات بار بار پڑھی جاتی ہیں اور یہی تجدید وتکرار قرآن کو حوادث سے محفوظ رکھتا ہے۔

علاوہ ازیں ہر زمانے میں حقیقتِ قرآن کا نیا تکرار اور نئی تجلی سامنے آتی ہے جس کا تقاضا ہے کہ اسے "مثانی" کہا جائے۔

بہر حال سورہ حمد کے بعد قرآن عظیم کا ذکر جب کہ سورۂ حمد بھی اس کا جزو ہے اس سورہ کی اہمیت وعظمت کی دلیل ہے کیونکہ اکثر ہوتا ہے کہ کسی چیز کے ایک حصے کا ذکر اس کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت کی وجہ سے کیا جاتا ہے ایسا عربی، فارسی

---

[1] پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے:۔

خدا فرماتا ہے: میں نے نماز (سورۂ حمد) کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک حصہ مجھ سے مربوط ہے دوسرا بندوں سے۔ (مجمع البیان، جلد ۱، صفحہ ۱۷)

اور دیگر زبانوں میں بہت ہے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ تو ایسے عظیم سرمایے کا حامل ہے ——— قرآن جیسا سرمایہ جو تمام عالمِ ہستی کی عظمت رکھتا ہے وہ سرمایہ جو سراسر نور، برکت، درس اور لائحہ عمل ہے راہیں کھولنے والا ہے خصوصاً سورہ حمد کہ جس کا مفہوم اور مضمون اس قدر بلند ہے کہ لحظہ بھر میں انسان کا رشتہ خدا سے جوڑ دیتا ہے اور اس کی روح کو خدا کے آستانے پر تعظیم و تسلیم اور راز و نیاز کے لیے ایستادہ کر دیتا ہے۔

اس عظیم نعمت کا تذکرہ کرنے کے بعد پیغمبر اکرمؐ کو چار حکم دیئے گئے ہیں۔ پہلے فرمایا گیا ہے: یہ مادی نعمتیں جو ہم نے کافروں کو دی ہیں ان پر ہرگز نگاہ نہ ڈال (لا تمدن عینیك الی ما متعنا به ازواجا منهم)[1]

یہ مادی نعمتیں پائیدار نہیں ہیں اور پھر دردِ سر بھی ہیں یہاں تک کہ اچھے حالات میں بھی انسان کے لیے ان کی حفاظت مشکل ہو جاتی ہے لہٰذا یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو تیری آنکھوں کو متوجہ کرے۔ ان کے مقابلے میں عظیم روحانی نعمت قرآن جو خدا نے تجھے دی ہے وہ بہت اہم ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہ جو مال و ثروت اور مادی نعمتیں ان کے ہاتھ میں ہیں اس پر ہرگز غمگین نہ ہو (و لا تحزن علیهم)۔

درحقیقت پہلا حکم مادی نعمتوں کی طرف آنکھ نہ اٹھانے کے لیے ہے اور دوسرا ان سے محرومی پر غم نہ کھانے کے لیے ہے۔

"ولا تحزن علیهم" کی تفسیر کے بارے میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس کا مطلب ہے:

اگر وہ تجھ پر ایمان نہیں لاتے تو غم نہ کھاؤ کیونکہ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

لیکن پہلی تفسیر قبل کے جملوں کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

بہر حال سورہ طٰہٰ آیہ ۱۳۱ میں اس کی واضح نظیر موجود ہے۔

ولا تمدن عینیك الی ما متعنا به ازواجا منهم زهرة الحیٰوة الدنیا لنفتنهم فیه و رزق ربك خیر و ابقٰی

ان میں سے بعض کو نعمتیں دی ہیں ان پر نظر نہ ڈال یہ دنیاوی زندگی کے پھول ہیں (ناپائیدار پھول، جو بہت جلد مرجھا کر بکھر جائیں گے) لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ انھیں اس کے ذریعے آزمائیں رضا نے تجھے جو روزی دی ہے وہ تیرے لیے بہتر اور زیادہ پائیدار ہے۔

تیسرا حکم تواضع، فروتنی اور مومنین سے نرمی کرنے کے بارے میں ہے فرمایا گیا ہے: اپنے پر و بال مومنین کے لیے پھیلا دے اور نیچے جھکا لے (و اخفض جناحك للمؤمنین)۔

یہ تعبیر تواضع اور محبت کے لیے خوبصورت کنایہ ہے جیسے پرندے اپنے بچوں سے اظہارِ محبت کرتے ہیں انھیں اپنے پر و بال کے

---

[1] "ازواجا" "متعنا" کا مفعول ہے اور "منهم" ایک مادی مقدر فعل کے متعلق جار مجرور ہے اور اس سارے کا معنی ہوگا "کفار کے مختلف گروہ ...."

سینے چھپا لیتے ہیں یہ انتہائی محبت کا منظر ہوتا ہے اس طرح وہ دشمنوں سے انھیں بچاتے ہیں اور بکھر جانے سے روکتے ہیں دراصل کنایہ کی صورت میں یہ جچی تلی مختصر تعبیر بہت سے مطالب کی حامل ہے۔

ضمناً مذکورہ احکام کے بعد یہ جملہ ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ مبادا مادی نعمتوں کے حامل ہونے کی وجہ سے کافروں سے انکساری کرو یہ انکساری اور محبت مومنین کے لیے ہونا چاہیے اگرچہ مالِ دنیا سے ان کا ہاتھ خالی ہو۔

آخر میں پیغمبر اکرمؐ کو جو تھا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان بے ایمان دولت مندوں کے مقابلے میں مضبوطی سے کھڑے ہو جاؤ اور انھیں کھلے بندوں کہہ دو کہ میں واضح ڈرانے والا ہوں (وقل انی انا النذیر المبین)۔

کہہ دو کہ میں تمھیں متنبہ کرتا ہوں کہ خدا نے فرمایا ہے کہ میں تم پر عذاب نازل کروں گا جیسے کہ میں نے تقسیم کرنے والے پر نازل کیا ہے (کما انزلنا علی المقتسمین)۔ وہی تقسیم کرنے والے کہ جنھوں نے آیاتِ الٰہی کو بانٹ دیا (الذین جعلوا القرآن عضین)[1] جو کچھ ان کے مفاد میں تھا وہ تو لے لیا اور جو کچھ ان کے نقصان میں تھا اسے ایک طرف رکھ دیا۔ درحقیقت ہوا یہ کہ بجائے اس کے کہ کتابِ خدا اور اس کے احکام ان کے رہبر و راہنما ہوتے اسے انھوں نے اپنے برے مقاصد کے لیے وسیلہ بنالیا۔ ایک لفظ اُن کے مفاد میں ہوتا اس سے چمٹ جاتے اور اگر ہزار الفاظ ان کے ضرر میں ہوتے تو انھیں ایک طرف رکھ دیتے۔

چند اہم نکات

۱۔ قرآن خدا کی عظیم نعمت ہے: زیرِ نظر آیات میں خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر کے ذریعے دنیا بھر کے مسلمانوں کو خطرے سے خبردار کرنے کے بعد اعلان کرتا ہے کہ یہ عظیم آسمانی کتاب اور بہت بڑا سرمایہ ہے یہ ایک بے نظیر نعمت ہے جو مسلمانوں کو دی گئی ہے یہ ایک ایسا جاودانی پروگرام ہے کہ جس پر عمل کیا جائے تو دنیا آباد و آزاد ہو جائے۔ اور امن و امان اور معنویت سے معمور ہو جائے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے دوسرے لوگ بھی معترف ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمان اس کے معارف زندہ کرتے اور اس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے تو اتنے طاقتور اور ترقی یافتہ ہوتے کہ کوئی ان پر اپنا تسلط نہ جما سکتا۔

یہ سورہ حمد ——— سبعا من المثانی ——— کہ جو فاتحۃ الکتاب، آغازِ قرآن کرنے والی ہے اور فہرستِ قرآن کہلاتی ہے، ایک مکمل درسِ حیات ہے:

اس عظیم مبدأ کی طرف توجہ کر جو تمام عالمین کی راہِ تکامل میں پرورش کرتا ہے جس کی خاص اور عام رحمت سب پر چھائی ہوئی ہے۔

اس عدالت کی طرف توجہ کہ جس پر ایمان انسان کے اعمال کو پوری طرح سے کنٹرول کر لیتا ہے۔

---

[1] "عضین" "عضۃ" کی جمع ہے جس کا معنی ہے متفرق، کسی چیز کے حصے کو بھی عضۃ کہتے ہیں لہٰذا "عضین" کا معنی ہوا "حصے" یا "ٹکڑے"۔

غیر اللہ پر بھروسہ نہ کرنا اور اس کے غیر کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنا۔

مختصر یہ کہ ـــــــــــــ

صراطِ مستقیم پر قدم رکھنا کہ جس میں انحراف نہیں، وہ راستہ جو نہ مشرق کی طرف خم کھاتا ہے نہ مغرب کی طرف، جس میں افراط و تفریط ہے نہ گمراہی اور نہ ہی غضبِ الٰہی۔

یہ سب جب کسی انسان کی روح میں رچ بس جائیں تو ایک اعلیٰ اور باکمال شخصیت بنانے کے لیے کافی ہے۔

لیکن افسوس کہ یہ عظیم سرمایہ ایسے لوگوں کے ہاتھ جا پڑا ہے کہ جنھیں اس کی گہرائی کا پتہ چلا ہے نہ اس کی اعلیٰ قدر و قیمت کا۔ یہاں تک کہ بعض ایسے ناآگاہ لوگ بھی ہیں کہ اس کی آیات کو چھوڑ کر ایسے انسانوں کے گھڑے ہوئے قوانین اور پروگرام کی طرف دستِ نیاز پھیلاتے ہیں جو خود اسیرِ شہوات ہیں۔ کم از کم یہ کہ جن کی فکر ناپختہ اور نارسا ہے یا وہ کہ جو اپنا علم نجس دولت اور حقیر قیمت پر فروخت کرتے ہیں یا دوسروں کے مادی تمدن کی تھوڑی سی ترقی ان کی توجہ کو اس طرح سے کھینچتی ہے کہ جو خود ان کے پاس ہے اس سے غافل ہو جاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم مادی ترقی کو بالکل اہمیت نہ دیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ کبھی کچھ اسے نہ سمجھیں اور قرآن نہ صرف روحانی لحاظ سے ایک پُربار اور عظیم سرچشمہ ہے بلکہ مادی ترقی اور خوشحالی کا بھی مؤثر پروگرام ہے اس سلسلے میں ہم پہلے بھی متعلقہ آیات میں توضیح کر چکے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی کریں گے۔

۲۔ دوسروں کے وسائل پر نگاہ رکھنا انحطاط کا باعث ہے: بہت سے تنگ نظر افراد ایسے ہیں جو ہمیشہ اسی ٹوہ میں رہتے ہیں کہ اس کے پاس کیا ہے اور اس کے پاس کیا ہے؟ یہ لوگ مسلسل اپنی مادی حالت کا دوسروں سے تقابل کرتے رہتے ہیں اور جب اپنے آپ کو کم پاتے ہیں تو رنج و غم میں مبتلا ہو جاتے ہیں چاہے دوسروں نے یہ وسائل اپنی انسانی قدر و قیمت اور اپنا استقلال گنوا کر حاصل کیے ہوں۔

یہ طرزِ فکر رشد کی کمی، احساسِ کمتری اور کم ہمتی کی نشانی ہے۔ یہ زندگی میں پس ماندگی اور تنزل کا سبب ہے یہاں تک کہ مادی زندگی پر بھی اس کا بہت منفی اثر ہوتا ہے بجائے اس کے کہ انسان ایسے گھٹیا اور نقصان دہ تقابل میں پڑے اپنی فکری اور جسمانی صلاحیتوں کو اپنی رشد و ترقی کے لیے استعمال کرے اور اپنے آپ سے کہے کہ میں دوسروں سے کم تر نہیں ہوں اور کوئی وجہ نہیں کہ میں ان سے زیادہ ترقی نہ کر سکوں میں کیوں ان کے مال و مقام پر آنکھ رکھوں میں ان سے بہتر حاصل کر سکتا ہوں۔

مادی زندگی کا ہدف ہرگز نہیں۔ ایک صحیح انسان مادی وسائل یا تو اس قدر چاہتا ہے جو اس کی روحانیت کے لیے ممد گار ہوں یا جس قدر اس کی آزادی اور استقلال کی حفاظت کر سکیں نہ کہ وہ حریصانہ ان کے پیچھے بھاگتا ہے اور نہ ہی ان کے بدلے سب کچھ قربان کر دیتا ہے کیونکہ ایسا سودا احرار اور بندگانِ خدا نہیں کرتے وہ ایسا کام بھی نہیں کرتے جس میں دوسروں کے محتاج ہوں۔

پیغمبر اکرمؐ سے مروی ایک حدیث میں ہے:۔

من رمی ببصرہ ما فی ید غیرہ کثر ھمہ ولم یشف غیضہ

جو شخص اس پر نظریں جمائے رکھے کہ جو دوسروں کے پاس ہے وہ ہمیشہ غمگین رہے گا اور اس کے دل کی آتشِ غضب کبھی نہیں بجھے گی۔[1]

۲۔ رہبر کی انکساری: آیاتِ قرآن میں بارہا پیغمبر اکرمؐ کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ مومنین سے تواضع، مہربانی، نرمی اور ملاطفت سے پیش آئیں۔ یہ امر پیغمبر اسلامؐ کے لیے منحصر نہیں ہے۔ بلکہ جو شخص بھی وسیع یا محدود لوگوں میں رہبری کا فریضہ اپنے ذمے لے اسے چاہیے کہ اس پر کار بند رہے کیونکہ یہ حقیقی قیادت اور تنظیمی اصولوں میں سے ہے اس لیے کہ ایک رہبر کا بہت بڑا سرمایہ اس کے پیروکاروں کا اس سے محبت کرنا اور اس سے روحانی رشتہ ہے اور یہ تواضع، ملنساری اور خیر خواہی کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ رہبروں کی سختی اور فسادات ہمیشہ لوگوں کے ان کے گرد و پیش سے متفرق اور منتشر ہونے کا ایک اہم عامل ہوتے ہیں۔

امیر المومنین حضرت علیؑ محمد بن ابی بکر کو اپنے ایک خط میں اس طرح فرماتے ہیں:

فاخفض لهم جناحك والن لهم جانبك وابسط لهم وجهك وآس بينهم فى اللحظة والنظرة

اپنے پر و بال ان کے لیے جھکا دے، ان سے نرمی سے پیش آ، کشادہ رُو رہ اور ان کے درمیان نظر کرنے میں بھی مساوات اور برابری کو ملحوظ رکھ۔[2]

۴۔ "مقتسمین" کون لوگ ہیں؟ بلاشبہ خدائی احکام اور پروگرام سب لوگوں کے مفاد میں ہوتے ہیں لیکن ظاہراً اور ابتدائی نظر میں عام طور پر ان میں سے بعض ہماری رغبت اور خواہش کے مطابق ہیں اور بعض برخلاف ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں سچے مومن اور جھوٹے دعویدار پہچانے جاتے ہیں، سچے مومن تو ان سب کو کاملاً قبول کر لیتے ہیں یہاں تک کہ جو احکام ظاہراً ان کے فائدے میں نہیں انھیں بھی قبول کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

کل من عند ربنا

سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔

یہ احکامِ الٰہی میں کسی قسم کی تقسیم اور تبعیض کے قائل نہیں ہیں لیکن وہ لوگ کہ جن کے دل بیمار ہیں اور وہ یہ تک چاہتے ہیں کہ دین اور حکمِ خدا کو بھی اپنے مفادات کے لیے استعمال کریں وہ صرف وہی حصہ قبول کرتے ہیں جو ان کے فائدے میں ہو اور باقی پس پشت ڈال دیتے ہیں وہ آیاتِ قرآن کو بلکہ بعض اوقات ایک ہی آیت کو تقسیم کر دیتے ہیں اور ایک حصہ جو ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتا ہے اسے قبول کر لیتے ہیں اور دوسرے حصے کو ایک طرف پھینک دیتے ہیں۔

یہ بات باعثِ فخر نہیں کہ ہم بعض گذشتہ قوموں کی طرح یہ راگ الاپیں:۔

---

[1] تفسیر صافی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] نہج البلاغہ، مکتوب ۲۷۔

نؤمن ببعض و نکفر ببعض

ہم بعض پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض پر نہیں۔

کیونکہ ——— تمام دنیا پرست یہی کچھ کرتے ہیں۔ پیروانِ حق اور پیروانِ باطل میں یہی فرق ہے کہ پیروانِ باطل احکام کے اسی حصّے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں جو ان کی خواہشات، ہوا و ہوس اور ظاہری مفادات سے ہم آہنگ ہو۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کھرا اور کھوٹا اور مومن اور منافق پہچانا جاتا ہے۔

جو کچھ ہم نے سطورِ بالا میں کہا ہے اس کے علاوہ بھی "مقتسمین" کی کچھ تفاسیر علماء نے ذکر کی ہیں یہاں تک کہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس لفظ کی سات تفسیریں بیان کی ہیں ان میں سے زیادہ تر غیر مناسب نظر آتی ہیں لیکن بعض جو غیر مناسب نہیں ہیں ان میں سے ایک ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

مشرکین کے کچھ سردار ایامِ حج میں مکہ کی سڑکوں اور کوچوں کے کنارے کھڑے ہو جاتے تھے ان میں سے ہر ایک گذرنے والوں سے رسول اللہ اور قرآن کے بارے میں کوئی نہ کوئی بات کرتا تاکہ انھیں متنفر کر دیں۔

بعض کہتے: وہ دیوانہ ہے جو کچھ کہتا ہے غیر موزوں ہوتا ہے۔

بعض کہتے: وہ جادوگر ہے اور اس کا قرآن بھی اس کے جادو کا ایک حصّہ ہے۔

بعض آپ کو شاعر کہتے: آیاتِ آسمانی کے جاں نواز آہنگ اور لہجے کو کذب اور جھوٹی شاعری قرار دیتے۔

بعض آپ کو کاہن کا نام دیتے اور قرآن کی غیب کی خبروں کو ایک طرح کی کہانت قرار دیتے۔

انھیں "مقتسمین" کہا گیا ہے کیونکہ انھوں نے مکہ کی سڑکوں اور گلیوں کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تقسیم کر رکھا تھا۔

کوئی مانع نہیں کہ یہ تفسیر اور جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے دونوں آیت کے مفہوم میں شامل ہوں۔

۹۲۔ فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

۹۳۔ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

۹۴۔ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

۹۵۔ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۝

۹۶۔ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝

۹۷۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۝

۹۸۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝

۹۹۔ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝

ترجمہ

۹۲۔ تیرے پروردگار کی قسم ہم ان سب سے سوال کریں گے۔

۹۳۔ جو کچھ وہ کرتے تھے۔

۹۴۔ جس چیز کے لیے مامور ہو اسے واضح طور پر بیان کرو اور مشرکین سے رُخ پھیر لو (اور ان کی پروانہ کرو)

۹۵۔ ہم تمسخر اڑانے والوں کے شر کو تجھ سے دور رکھیں گے۔

۹۶۔ وہ کہ جنھوں نے خدا کے ساتھ اور معبود بنا رکھے ہیں لیکن وہ جلد ہی جان جائیں گے۔

۹۷۔ ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر تیرا سینہ تنگ ہوجاتا ہے (اور تجھے سخت پریشان کرتے ہیں)۔

۹۸۔ (اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے) اپنے پروردگار کی تسبیح کر، حمد و ثنا کر اور سجدہ گزاروں میں سے ہوجا۔

۹۹۔ اور اپنے پروردگار کی عبادت کر یہاں تک کہ یقین (موت) آجائے۔

تفسیر

اپنا مکتب واضح طور پر بیان کرو

یہ سورہ حجر کی آخری آیات ہیں ان میں سب سے پہلے "مقتسمین" کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ جزا کے بارے میں گذشتہ آیات میں گفتگو ہوئی تھی۔ فرمایا گیا ہے: تیرے پروردگار کی قسم! ہم یقینی طور پر ان سب سے سوال کریں گے (فوربك لنسئلنهم اجمعين)۔

ان تمام کاموں کے بارے میں جو وہ انجام دیتے تھے (عما كانوا يعملون)۔

واضح ہے کہ خدا کا سوال اس لیے نہیں کہ وہ پوشیدہ بات ظاہر ہو جائے کیونکہ وہ اندرونی اور بیرونی اسرار سے آگاہ ہے اور زمین و آسمان کا کوئی ذرہ اس کے علم بے پایاں سے مخفی نہیں ہے لہٰذا سوال خود مخاطب کو سمجھانے کے لیے ہے تاکہ وہ اپنے اعمال کی قباحت کو سمجھ لے یا یہ ایک قسم کی نفسیاتی سزا ہے کیونکہ غلط کاموں کے بارے میں باز پرس اور وہ بھی سرزنش اور ملامت کیساتھ اور وہ بھی ایسے جہان میں جہاں انسان حقائق سے زیادہ قریب اور آگاہ ہے بہت تکلیف دہ ہے۔ لہٰذا یہ سوالات درحقیقت ان کی سزا کا ایک حصہ ہیں۔

ضمنی طور پر "عما كانوا يعملون" کی عمومیت نشاندہی کرتی ہے کہ انسان کے تمام اعمال کے بارے میں بلا استثناء سوال ہوگا اور خود تمام انسانوں کے لیے ایک درس ہے کہ وہ لحظہ بھر بھی اپنے اعمال سے غافل نہ رہیں۔

یہ جو بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ سوال توحید اور انبیاء پر ایمان لانے یا مشرکین کے معبودوں سے مربوط ہے ایک ایسی بات ہے جو بغیر دلیل کے ہے۔ آیت کا مفہوم پورے طور پر عمومیت کا حامل ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ اس آیت میں خدا تعالیٰ سوال کرنے کے بارے میں تاکید کر رہا ہے جبکہ سورۂ رحمٰن کی آیہ ۳۹ میں ہے:

فيومئذ لا يسئل عن ذنبه انس ولا جان

اس روز انسانوں اور جنوں میں سے کسی سے بھی کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔

اس کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت میں کئی مراحل ہیں بعض مراحل میں لوگوں سے سوال ہوگا اور بعض میں نہیں ہوگا جہاں مسائل خود بخود واضح ہوں گے یا یہ کہ زبانی سوال نہیں ہوگا کیونکہ سورہ یٰس کی آیہ ۶۵ کے مطابق لبوں پر مُہر لگی ہوگی اور سوال صرف جسم کے اعضاء و جوارح سے کیا جائے گا یہاں تک کہ بدن کی کھال سے بھی پوچھا جائے گا۔[1]

اس کے بعد رسول اللہ کو ایک قطعی فرمان دیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: مشرکین کے شور و غل کے مقابلے میں نہ صرف یہ کہ

---

[1] مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۳ صفحہ ۴۰ (اردو ترجمہ)۔

ضعف و خوف اور سستی کو نہ آنے دو اور خاموش ہو کر نہ بیٹھ جاؤ بلکہ "جس کام کے لیے مامور کیے گئے ہو اسے واضح طور پر بیان کرو"۔ اور حقائق دین صراحت سے برملا کہہ دو" (فاصدع بما تؤمر)۔

اور مشرکین سے رُخ موڑ لو اور ان سے بے اعتنائی کرو (و اعرض عن المشرکین)۔

"فاصدع" "صدع" کے مادہ سے ہے اس کا لغوی معنی ہے شگاف کرنا یا مضبوط چیزوں میں شگاف کرنا اور چونکہ کسی چیز میں شگاف کرنے سے اس کا اندرونی حصہ آشکار ہو جاتا ہے اس لیے یہ لفظ اظہار، افشاء، آشکار اور واضح کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ شدید دردِ سر کو بھی "صداع" کہتے ہیں کیونکہ ایسے لگتا ہے جیسے وہ پھٹ رہا ہو اور شگافتہ ہو رہا ہو۔

بہرحال مشرکین سے اعراض کرنا یہاں یا تو بے اعتنائی کے معنی میں آیا ہے یا پھر ان سے جنگ ترک کرنے کے معنی میں آیا ہے کیونکہ اس زمانے میں ابھی مسلمان اس مرحلے میں نہیں پہنچے تھے کہ دشمن کی سختی کے جواب میں مسلح مقابلہ کر سکیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ قلب پیغمبرؐ کی تقویت کے لیے انھیں اطمینان دلاتا ہے کہ تمسخر اڑانے والوں کے مقابلے میں وہ اپنے نبی کی حمایت کرے گا، ارشاد ہوتا ہے: ہم نے تمسخر اڑانے والوں کے شر کو تجھ سے دُور کیا (انا کفینٰک المستھزئین)۔

یہ جملہ فعل ماضی کے ساتھ آیا ہے حالانکہ اس کا تعلق آئندہ سے ہے ظاہراً یہ اس حمایت کے حتمی ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی ہم ان کے شر کو یقینی طور پر تجھ سے دور کریں گے اور یہ بات حتمی اور طے شدہ ہے۔

بعض مفسرین نے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ چھ طرح کے گروہ تھے جن میں ہر ایک رسول اللہ سے ایک خاص قسم کا تمسخر کرتا تھا اور جب آنحضرتؐ دعوت کے لیے کھڑے ہوتے تو وہ کوشش کرتے کہ اپنی باتوں سے لوگوں کو آپ کے پاس سے دُور کر دیں لیکن خدا تعالیٰ نے ان میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا کر دیا اس طرح انھیں اپنی اپنی پڑ گئی اور رسول اللہ کو بھول گئے (بعض تفاسیر میں ان کی ابتلاء کی تفصیل آئی ہے)۔

اس کے بعد "مستھزئین" کی توصیف قرآن یوں کرتا ہے، وہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے خدا کے ساتھ اور معبود بنا رکھے ہیں لیکن بہت جلد وہ اپنے اس کام کے منحوس نتیجے سے آگاہ ہو جائیں گے (الذین یجعلون مع اللّٰہ الٰھًا اٰخر فسوف یعلمون)۔ ہو سکتا ہے یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے افکار و اعمال خود مضحکہ خیز ہیں کیونکہ یہ اس قدر نادان ہیں جہانِ ہستی کے خالق خدا کے مقابلے میں انھوں نے پتھر اور لکڑی کے معبود تراش رکھے ہیں اس کے باوجود وہ تیرے ساتھ تمسخر کرنا چاہتے ہیں۔

دوبارہ روحِ پیغمبرؐ کی دلجوئی اور تقویت کے لیے فرمایا گیا ہے: ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتیں تیرے سینے کو تنگ کر دیتی ہیں اور تیری پریشانی کا باعث بنتی ہیں (و لقد نعلم انک یضیق صدرک بما یقولون)۔ تیری لطیف روح اور حساس دل یہ سب بدگوئی اور کفر و شرک آمیز باتیں برداشت نہیں کر سکتا اور اسی بناء پر تو پریشان ہو جاتا ہے۔ لیکن تو پریشان نہ ہو ان کی گھٹیا اور ناہنجار باتوں کے اثرات کم کرنے کے لیے "اپنے پروردگار کی تسبیح بیان کر اور اس کی ذات پاک کے سامنے سجدہ ریز ہو جا (فسبح بحمد ربک وکن من السّٰجدین)۔ کیونکہ اللہ کی تسبیح ان کی گفتگو کے بُرے اثرات کو مشتاقانِ خدا کے دلوں سے دُور

کردیتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تجھے توانائی بخشتی ہے اور نور و صفا عطا کرتی ہے، دل کو جلا دیتی ہے، خدا سے تیرے رشتے کو محکم کردیتی ہے، تیرے ارادے کو قوی کردیتی ہے، زیادہ قوتِ برداشت عطا کرتی ہے، جہاد پر زیادہ آمادہ کرتی ہے اور زیادہ راسخ قدم بنا دیتی ہے۔ روایات میں ابنِ عباس سے مروی ہے:

رسولؐ اللہ غمگین ہو جاتے تو نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے اور نماز کے ذریعے ان آثارِ حزن و ملال کو دل سے دور کرتے۔

اس سلسلے میں آخری حکم یہ دیا گیا ہے کہ اپنے پروردگار کی عبادت سے زندگی بھر دستبردار نہ ہونا" ہمیشہ اس کی بندگی کرتا رہ یہاں تک کہ یقین (موت) آجائے (واعبد ربک حتی یأتیک الیقین)۔

مفسرین میں مشہور ہے کہ "یقین" سے مراد یہاں موت ہے اور موت کو اس لیے یقین کہا گیا ہے کہ یہ ایک امرِ مسلّم ہے۔ انسان ہر چیز میں شک کرسکتا ہے لیکن موت میں شک نہیں کرسکتا۔ یا اس لیے اسے یقین کہا گیا ہے کہ موت کے وقت پردے ہٹ جاتے ہیں اور حقائق انسان کی آنکھوں کے سامنے آشکار ہو جاتے ہیں اور اس کے بارے میں یقین کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔

سورۂ مدثر کی آیہ ۴۶ اور ۴۷ میں دوزخیوں کا یہ قول بیان کیا گیا ہے:

وکنا نکذب بیوم الدین حتی اتانا الیقین

ہم ہمیشہ روزِ جزا کو جھٹلاتے تھے یہاں تک کہ یقین (موت) نے ہمیں آلیا۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض صوفیاء نے زیرِ بحث آیت کو ترکِ عبادت کے لیے دستاویز بنا لیا ہے اور کہا ہے کہ آیت کہتی ہے کہ عبادت کرو یہاں تک کہ تمہیں یقین آجائے لہٰذا حصولِ یقین کے بعد عبادت کی ضرورت نہیں، یہ ایک بے بنیاد گفتگو ہے۔ کیونکہ:

اولاً۔ بعض قرآنی آیات گواہی دیتی ہیں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ یقین موت کے معنی میں ہے کہ جو مومنین کو بھی آئے گی اور دوزخیوں کو بھی۔

ثانیاً: اس گفتگو کے مخاطب پیغمبر اکرمؐ ہیں اور یقینِ پیغمبر کا مقام سب پر روشن ہے تو کیا کوئی دعویٰ کرسکتا ہے کہ آپ ایمان کے لحاظ سے مقامِ یقین کے حامل نہ تھے۔

ثالثاً: تواریخ متواتر گواہی دیتی ہیں کہ رسول اللہ نے اپنی عمر کی آخری گھڑیوں تک عبادت ترک نہیں کی اور حضرت علیؑ محرابِ عبادت میں شہید ہوئے اور اسی طرح باقی آئمہ۔

چند اہم نکات

۱۔ اعلانیہ دعوتِ اسلام کا آغاز: جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات:

فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین انا کفینٰک المستھزئین

مکہ میں نازل ہوئیں جبکہ پیغمبرِ اسلام تین برس تک مخفی طور پر دعوت دے چکے تھے اور آپ کے قریبیوں میں سے چند افراد

آپ پر ایمان لا چکے تھے کہ جن میں عورتوں سے سب سے پہلے جناب خدیجہ سلام اللہ علیہا تھیں اور مردوں میں حضرت علی علیہ السلام تھے۔

واضح ہے کہ اس زمانے میں اور اس ماحول میں توحید خالص کی دعوت اور نظام شرک و بت پرستی کو درہم برہم کرنا عجیب و غریب اور نہایت کٹھن کام تھا لہٰذا یہ بات تو شروع ہی سے نمایاں تھی کہ کچھ لوگ مسخر اڑائیں گے لہٰذا خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل کو تقویت دیتا ہے، استہزاء کرنے والوں اور دشمنوں کی کثرت سے نہ ڈریں اور اپنی دعوت کھلے بندوں شروع کردیں اور اس راہ میں ایک پیہم مسلسل اور منطقی جہاد کے لیے تیار ہو جائیں۔[1]

۲۔ خدا کی طرف توجہ کا روحانی اثر: انسانی زندگی میں ہمیشہ مشکلات آتی رہتی ہیں یہ دنیاوی زندگی کا مزاج ہے کہ انسان جس قدر بڑا ہوتا جاتا ہے مشکلات بھی بڑی ہوتی جاتی ہیں اس سے ان عظیم مشکلات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جن کا سامنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی عظیم دعوت کے لیے کرنا پڑا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اپنے رسولؐ کو حکم دیتا ہے کہ زیادہ قوت کے حصول کے لیے اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے زیادہ وسعت قلب کے لیے تسبیح الٰہی، دعا اور اس کے آستانے پر سجدہ ریزی کریں۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ انسانی روح میں ایمان اور ارادے کی تقویت کے لیے عبادت گہرا اثر رکھتی ہے۔

مختلف روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب بزرگ پیشواؤں کو عظیم مشکلات اور بحرانوں کا سامنا ہوتا، تو وہ خانہ خدا کا رخ کرتے اس کی عبادت کے زیر سایہ راحت و آرام اور طاقت و قوت حاصل کرتے۔

۳۔ عبادت اور تکامل و ارتقاء: ہم جانتے ہیں کہ انسان ایسا موجود ہے جو تکامل و ارتقاء کی اعلیٰ ترین استعداد رکھتا ہے اس کے سفر کا آغاز نقطۂ عدم سے ہوا ہے اور وہ لا متناہی منزل کی طرف رواں دواں ہے اور اگر وہ راہ تکامل پر چلتا رہے تو کہیں بھی ٹھہراؤ نہیں آئے گا۔

ایک طرف ہم جانتے ہیں کہ عبادت تربیت انسان کا اعلیٰ ترین مکتب ہے عبادت انسانی سوچ کو بیدار کرتی ہے اور اس کی فکر کو لامتناہی منزل کی طرف متوجہ کرتی ہے اس کے قلب و روح سے گناہ اور غفلت کا گرد و غبار دور کرتی ہے اس کے وجود میں اعلیٰ انسانی صفات کی پرورش کا باعث بنتی ہے۔ روح ایمان کو تقویت دیتی ہے اور انسان کو آگاہی اور مسئولیت عطا کرتی ہے لہٰذا ممکن نہیں کہ انسان لمحہ بھر کے لیے بھی اس عظیم تربیتی مکتب سے بے نیاز ہو اور وہ لوگ جو یہ سوچتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ انسان ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ جہاں اسے عبادت کرنے کی ضرورت نہ ہو انھوں نے انسان کے تکامل و ارتقاء کو محدود خیال کیا ہے یا وہ مفہوم عبادت نہیں سمجھ سکے۔

علامہ طباطبائیؒ نے تفسیر المیزان میں اس سلسلے میں ایک بحث کی ہے ہم اسے اختصار کے ساتھ ذیل میں پیش کرتے ہیں:۔

> اس عالم کے تمام موجودات کمال کی طرف محو سفر ہیں اور انسانی تکامل معاشرے کے اندر ہوتا ہے لہٰذا انسان ذاتی طور پر سماجی فطرت کے ساتھ پیدا ہوا ہے ایک طرف انسانی معاشرہ اس صورت میں انسان کی تربیت اور تکامل کا ضامن بن سکتا ہے کہ وہ منظم قوانین و احکام کا حامل ہو اور افراد معاشرہ ان قوانین کے

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۲۳۔

احترام کے زیر سایہ اپنے امور بجالائیں، ٹکراؤ سے بچیں اور ذمہ داریوں کی حدود واضح کریں۔

دوسرے لفظوں میں اگر انسانی معاشرہ صالح ہو جائے تو لوگ اس میں رہ کر اپنے اصلی ہدف تک پہنچ سکتے ہیں اور اگر معاشرہ خراب ہو تو پھر لوگ اس تکامل وارتقاء سے رک جاتے ہیں یہ احکام و قوانین اجتماعی ہوں یا عبادتی اس صورت میں مؤثر ہوں گے جب نبوت اور آسمانی وحی سے لیے گئے ہیں۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عبادتی احکام انفرادی ہوں یا اجتماعی تکامل کے ایک حصے پر مبنی ہوتے ہیں۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ جب تک انسانی معاشرہ موجود ہے اور اس دنیا میں اس کی زندگی جاری وساری ہے الٰہی ذمہ داریاں اور احکام بھی جاری ہیں اور انسان کی ذمہ داریوں اور قوانین کے خاتمے کا مطلب احکام وقوانین کی فراموشی ہے اور اس کا نتیجہ انسانی معاشرے کی خرابی اور فساد ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ نیک اعمال اور عبادات انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کے حصول کا سرچشمہ ہیں اور جب یہ اعمال کافی حد تک انجام پاجائیں اور انسان کے اندر یہ اعلیٰ صلاحیتیں اور ملکات بیدار ہو جائیں تو یہ ملکات بھی اپنی اپنی باری پر زیادہ نیک اعمال اور خدا کی زیادہ اطاعت وبندگی کا سرچشمہ بن جاتے ہیں۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جن کا گمان ہے کہ حکم کا مقصد انسانی تکمیل ہے لہٰذا جب انسان اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے تو پھر بقاء کا کوئی معنی نہیں ان کا خیال مغالطے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ اگر انسان ذمہ داریوں اور احکام کی انجام دہی سے دستبردار ہو جائے تو معاشرہ فوراً ابتری کا رخ کرے گا لہٰذا ایسے معاشرے میں ایک فردِ کامل کیسے زندگی بسر کر سکتا ہے اور اگر ملکاتِ فاضلہ رکھتے ہوئے خدا کی بندگی سے دستبردار ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا یہ ملکات اپنے حقیقی اثرات سے روگرداں ہو گئے ہیں[1] ——— (غور کیجیے گا)

سُورۂ حجر کی تفسیر کا اختتام ہو گیا ہے۔

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۱۲ صفحہ ۲۱۰

سورۂ نحل

اس کی ۱۲۸ آیات ہیں

اِس کا کچھ حِصّہ مکّی ہے اور کچھ مدنی

اِس سُورہ کے مضامین

اگرچہ بعض مفسّرین اس سُورہ کی تمام آیات کو مکی سمجھتے ہیں لیکن زیادہ تر مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ اس کی کچھ آیات مکہ میں نازل ہوئیں اور کچھ مدینہ میں۔ مکی اور مدنی سورتوں کے جیسے مضامین ہوتے ہیں انھیں پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے خصوصاً اس کی بعض آیات میں صراحت سے ہجرت یا ہجرت اور جہاد کی بات کی گئی ہے۔ مثلاً آیہ ۴۱ :

والذین ھاجروا فی اللہ ------

اسی طرح آیہ ۱۰۱ :

ثم ان ربك للذین ھاجروا من بعد ما فتنوا ثم جاھدوا

فصبروا ------

ہم جانتے ہیں کہ یہ دونوں موضوعات ہجرتِ پیغمبر کے بعد سے مناسبت رکھتے ہیں اور اگر آیہ ۴۱ میں ذکرِ ہجرت کو جعفر بن ابی طالب کی سربراہی میں مسلمانوں کی پہلی ہجرت یعنی ہجرتِ حبشہ کی طرف اشارہ سمجھا جائے تو آیت ۱۰۱ میں تو ہجرت اور جہاد دونوں کا اکٹھا ذکر آیا ہے۔ بہت بعید ہے کہ یہ پہلی ہجرت کی طرف ہو۔ اس آیت کو رسول اللہ کی ہجرتِ مدینہ کے علاوہ کسی اور پر منطبق نہیں کیا جاسکتا۔

علاوہ ازیں آیہ ۱۲۶ :

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ ------

کی تفسیر میں مشہور ہے کہ یہ جنگِ اُحد کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور جنگِ اُحد ہجرت کے بعد ہوئی ہے۔

ان وجوہ کی بناء پر بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سُورہ کی ابتدائی چالیس آیات تو مکہ میں نازل ہوئی ہیں اور باقی آیات مدینہ میں جبکہ بعض دیگر حضرات اس کی تین آیات کے علاوہ باقی سب آیات کو مکی سمجھتے ہیں اور ان تین آیات کو وہ جنگِ اُحد کے سلسلے میں سمجھتے ہیں۔

امرِ مسلّم یہ ہے کہ اس سُورہ کو مکی اور مدنی آیات کا مرکب سمجھا جائے اگرچہ چند ایک آیات کے سوا ہر ہر آیت کے بارے حتمی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مکی ہے یا مدنی۔

بہرحال اس سُورہ کی آیات میں مکی سورتوں کی سی مخصوص بحث بھی نظر آتی ہے مثلاً توحید اور معاد کے بارے میں بحثِ قاطع اور شرک و بُت پرستی سے سخت مقابلہ نیز مدنی سورتوں کی سی مخصوص بحث بھی موجود ہے مثلاً اجتماعی و معاشرتی احکام اور جہاد و ہجرت سے مربوط مسائل۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس سُورہ کے مضامین دلکش اور مناسب انداز میں آپس میں ملے جلے ہوئے ہیں۔ مضامین کے مشتملات کچھ اس طرح سے ہیں :

۱۔ اس سُورہ میں سب سے زیادہ نعماتِ الٰہی کے بارے میں بحث کی گئی ہے اس سلسلے میں ایسی تفصیلات بیان کی گئی ہیں

کہ ہر آزاد انسان کے اندر احساسِ شکر گذاری بیدار ہو جاتا ہے اور اس طرح انسان ان سب نعمات و عنایات کے خالق کے زیادہ نزدیک ہو جاتا ہے۔

یہ نعمات ہیں، بارش، نورِ آفتاب، طرح طرح کے پودے، پھل، پھول، میوے اور دیگر غذائی مواد۔ اسی طرح جانور کہ جو انسان کے خدمت گذار ہیں، منافع اور برکات کہ جو حیوانات سے انسان کو پہنچتے ہیں اور مختلف قسم کے وسائل و اسباب زندگی۔ یہاں تک کہ اولاد اور بیوی کی نعمت۔ مختصر یہ کہ طرح طرح کے "طیبات"۔

اسی وجہ سے بعض اس سورہ کو "سورۂ نعم"[1] کہتے ہیں لیکن اس کا مشہور نام وہی "سورۂ نحل" ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی گوناگوں نعمتوں کو شمار کرتے ہوئے اس میں شہد کی مکھی کی طرف بھی ایک معنی خیز اور عجیب و غریب اشارہ کیا گیا ہے۔ خصوصاً اس سے انسان کو حاصل ہونے والی اہم غذا کے حوالے سے نیز اس حشرہ کی زندگی میں جو توحید کی نشانیاں موجود ہیں ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۲۔ اس سورہ کا دوسرا موضوعِ کلام توحید، خلقتِ خدا کی عظمت، معاد اور مشرکین و مجرمین کو تہدید ہے۔

۳۔ اس سورہ کا ایک اور حصہ اسلام کے مختلف احکام مثلاً عدل و احسان، ہجرت و جہاد، فحشاء، منکر کی نہی اور ظلم و پیمان شکنی کی ممانعت پر مشتمل ہے۔ اسی طرح نعماتِ الٰہی کی شکر گذاری کی دعوت دی گئی ہے نیز اسی سلسلے میں توحید کے ہیرو حضرت ابراہیم کا ذکر ایک شکر گذار بندے کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔

۴۔ گفتگو کا ایک اور پہلو مشرکین کی بدعات کے بارے میں ہے اور اس سلسلے میں کئی ایک جاذبِ نظر حسی مثالیں ذکر کی گئی ہیں۔

۵۔ نیز اس سورہ میں انسانوں کو شیطانی وسوسوں سے ڈرایا گیا ہے۔

اس سورہ کی فضیلت :۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول بعض روایات میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

من قرأها لم يحاسبه الله تعالى بالنعم التي انعمها عليه في دار الدنيا

جو شخص اس سورہ کو پڑھے گا خدا تعالیٰ اس جہان میں اسے بخشی گئی نعمتوں کا حساب نہیں لے گا۔[2]

واضح ہے کہ ان آیات کی تلاوت کہ جن میں نعماتِ الٰہی کا اہم حصہ بیان ہوا ہے اگر فکر و منظر کے ساتھ ہو تو یہ عزم، عمل اور شکر گذاری کا سبب بن جاتا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں انسان ہر نعمت کو ٹھیک اسی مقصد کے لیے صرف کرے گا جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے لہٰذا اس کے بعد اس سے کیسے یہ حساب لیا جائے کہ اس نے نعمت کو بجا صرف نہیں کیا۔

---

[1] "نعمت" کی جمع۔

[2] مجمع البیان جلد ٦ ص ۳۴۷۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ○

۲۔ یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوۡنِ ○

ترجمہ

بخشنے والے مہربان خدا کے نام سے۔

۱۔ (مشرکوں اور مجرموں کی سزا کے بارے میں) حکم خدا پہنچ گیا ہے اس کے لیے جلدی نہ کرو۔ خدا اس سے منزہ و برتر ہے کہ اس کے لیے شریک قرار دیے جائیں۔

۲۔ روح الٰہی کے ساتھ ملائکہ کو اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے نازل کرتا ہے اور انھیں حکم دیتا ہے کہ لوگوں کو ڈراؤ اور (ان سے کہو کہ) میرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے لہذا (میرے حکم کی) مخالفت سے پرہیز کرو۔

تفسیر

حکمِ عذاب قریب ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس سورہ کی ابتدائی آیات کا اہم حصہ مکہ میں نازل ہوا ہے یہ وہ دن تھے جب پیغمبرِ اسلامؐ کو مشرکوں اور بت پرستوں کی طرف سے شدید الجھاؤ اور سختی کا سامنا تھا۔ ہر روز وہ آپ کی حیات آفریں اور آزادی بخش دعوت کے خلاف کوئی نیا بہانہ تراشتے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ جس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انھیں عذابِ الٰہی کی تہدید کرتے تو بعض ہٹ دھرم کہتے کہ اگر یہ عذاب اور سزا کہ جس کی تم دھمکی دیتے ہو سچ ہے تو پھر وہ ہم پر نازل کیوں نہیں ہوتا اور شاید کبھی مزید کہتے کہ اگر فرض کیا عذاب آیا بھی تو ہم بتوں کا دامن تھام لیں گے۔ تاکہ وہ بارگاہِ الٰہی میں سفارش کریں کہ وہ ہم سے عذاب اٹھا لے کیا وہ اس کی بارگاہ کے شفیع نہیں ہیں۔

اس سورہ کی پہلی آیت ان اوہام پر خطِ بطلان کھینچتے ہوئے کہتی ہے: جلدی نہ کرو۔ مشرکوں اور مجرموں کی سزا کے بارے میں حکمِ الٰہی یقیناً پہنچ چکا ہے (اتی امر اللہ فلا تستعجلوہ) اور اگر تمھارا خیال ہے کہ بت اس کی بارگاہ کے سفارشی

توتم سخت غلطی اور اشتباہ میں ہو۔ خدا اس سے منزہ اور برتر ہے کہ جسے تم اس کا شریک بناتے ہو (سبحانہ و تعالیٰ عما یشرکون)۔

لہٰذا اس آیت میں "امر اللہ" مشرکین کے لیے عذاب کے بارے میں حکم خدا کی طرف اشارہ ہے اور لفظ "اتی" اگرچہ فعل ماضی ہے اور گزشتہ زمانے میں اس حکم کے تحقق کی نشاندہی کرتا ہے لیکن اس کا مفہوم مضارع ہے اور یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ حکم یقیناً اور قطعاً تحقق پذیر ہوگا۔ ایسا قرآن میں کثرت سے ہے کہ قطعی الوقوع مضارع صیغہ ماضی کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "امر اللہ" خود عذاب کی طرف اشارہ ہے نہ کہ حکم عذاب کی طرف۔

بعض نے اس سے "روز قیامت" مراد لیا ہے۔

لیکن جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی عذاب اور سزا کافی و وافی بیان اور عادلانہ اتمام حجت کے بغیر نہیں ہے لہٰذا بعد والی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے، خدا ملائکہ کو خدائی روح کے ساتھ حکم الٰہی کے ہمراہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے (ینزل الملائکۃ بالروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ)[1] اور انھیں حکم دیتا ہے کہ لوگوں کو ڈراؤ، شرک و بت پرستی پر متنبہ کرو اور کہو کہ میرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے (ان انذروا انہ لا الٰہ الا انا) - لہٰذا صرف میری نافرمانی سے ڈرو اور میرے سامنے احساسِ ذمہ داری کرو (فاتقون)۔

اس آیت میں روح سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد وحی، قرآن اور نبوت ہے کہ جو انسانوں کی زندگی کا باعث ہے اگرچہ بعض مفسرین نے یہاں وحی کو قرآن سے اور ان تینوں کو نبوت سے جدا کیا ہے اور انھیں تین تفاسیر کی شکل میں بیان کیا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ سب ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتے ہیں۔

بہرحال "روح" یہاں معنوی اور روحانی پہلو سے ہے اور ہر اس چیز کی طرف اشارہ ہے جو دلوں کی زندگی کا سبب ہیں اور نفوس کی تربیت اور عقلوں کی ہدایت کا باعث ہے جیسا کہ سورہ انفال کی آیہ ۲۴ میں ہے۔

یاایھا الذین اٰمنوا استجیبوا للہ و للرسول اذا دعاکم لما یحییکم

اے ایمان والو! خدا اور اس کے رسول کی دعوت قبول کرو۔ جبکہ وہ تمھیں ایسی چیز کی طرف پکارتے ہیں جو تمھاری زندگی کا باعث ہے۔

سورہ مومن کی آیت ۱۵ میں ہے:

یلقی الروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ

وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے روح القاء کرتا ہے۔

---

[1] "من امرہ" میں "من" "ب" کے معنی میں ہے اور یہاں سببیت کے معنی دیتا ہے۔

نیز سورہ شورٰی کی آیہ ۵۲ میں ہے۔

وکذٰلک اوحینا الیک روحا من امرنا ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان

اس طرح ہم نے اپنے حکم سے تجھ پر روح کو وحی کیا اس سے پہلے تو کتاب و ایمان سے آگاہ نہ تھا۔

واضح ہے کہ ان آیات میں "روح" قرآن، مضامین وحی اور فرمان نبوت کے معنی میں ہے اگرچہ روح قرآن کی دیگر آیات میں اور معانی میں بھی آیا ہے لیکن ان مذکورہ قرائن کی طرف توجہ کرتے ہوئے زیر بحث آیت میں روح کا مفہوم قرآن اور مضمون وحی ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ "علی من یشاء من عبادہ" (اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے) کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وحی و نبی کی نبوت بغیر کسی حساب کتاب کے ہے کیونکہ مشیت الٰہی کبھی اس کی حکمت سے جدا نہیں ہوتی اور حکیم ہونے کے تقاضا سے وہ یہ انعام اسے عطا کرتا ہے جو اس کا اہل ہو۔

ارشاد الٰہی ہے۔

اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ

خدا بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں قرار دے (انعام ـــــ ۱۲۴)

یہ نکتہ بھی نظر سے اوجھل نہ رہے کہ اگر انبیاء کے لیے پہلا فرمان الٰہی "ان انذروا" (ڈراؤ) ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک گمراہ اور آلودہ شرک و فساد قوم کو بیدار کرنے کے لیے انذار سے بڑھ کر موثر کوئی چیز نہیں ـــــ انذار ـــــ بیدار کرنے والا۔ آگاہ کرنے والا اور حرکت آفرین۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان نفع کا طالب ہے اور نقصان پسند نہیں کرتا لیکن تجربہ نشاندہی کرتا ہے کہ تشویق کا اثر آمادہ افراد پر زیادہ ہوتا ہے جبکہ آلودہ افراد پر تہدید کا اثر بہت ہوتا ہے اور ابتدائے نبوت میں انذار اور ڈرانے والے امور ہونا چاہییں۔

۳۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ○

۴۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ○

۵۔ وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○

۶۔ وَلَكُمْ فِیْهَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ وَحِیْنَ تَسْرَحُوْنَ ○

۷۔ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰی بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِیْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ○

۸۔ وَّالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِیْنَةً ؕ وَیَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۳۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور وہ اس سے بالاتر ہے کہ اس کے لیے شریک بناتے ہیں۔

۴۔ اس نے انسان کو ایک بے حیثیت نطفے سے پیدا کیا اور آخرکار وہ ایک موجود فصیح اور اپنا واضح مدافع قرار پایا۔

۵۔ اور اس نے چوپایوں کو پیدا کیا جبکہ ان سے تمھیں لباس اور دیگر منافع حاصل ہوتے ہیں اور تم ان کے گوشت میں سے کھاتے ہو۔

۶۔ اور تمھارے لیے ان میں زینت و شکوہ ہے جس وقت انھیں ان کی آرام گاہ کی طرف لوٹاتے ہو اور جب (صبح کے وقت) انھیں صحرا کی جانب بھیجتے ہو۔

۷۔ وہ تمھارے بھاری بوجھ ایسے مقام تک اٹھائے جاتے ہیں جہاں تک تم بہت مشقت کے بغیر نہیں پہنچ سکتے کیونکہ تمھارا پروردگار رؤف و رحیم ہے۔

۸۔ اور (اسی طرح) اس نے گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کو پیدا کیا تاکہ تم ان پر سوار ہوسکو اور وہ تمھاری زینت کا سبب بھی ہوں اور وہ (نقل و حمل کے) دیگر ذرائع پیدا کرے گا کہ جنھیں تم نہیں جانتے۔

تفسیر

جانوروں کے گوناگوں فائدے:

گزشتہ آیات میں شرک کی نفی کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ زیر بحث آیات میں شرک کی بیخ کنی کے لیے اور خدائے یکتا کی طرف توجہ کے لیے دو حوالے سے بات کی گئی ہے۔ پہلے عقلی دلائل کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور عجیب و غریب نظامِ خلقت اور عظمتِ خلقت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور انسان کے لیے خدا کی طرح طرح کی نعمتوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے تاکہ اس میں شکر گزاری کا جذبہ بیدار ہو اور آخر کار اسے خدا کے قریب کر دے۔

ارشاد ہوتا ہے: اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے (خلق السمٰوٰت و الارض بالحق)۔ آسمان و زمین کی حقانیت اس کے عجیب نظام سے بھی واضح ہے اور نظم و حساب شدہ آفرینش سے بھی، اس کے ہدف سے بھی اور اس میں موجود فوائد سے بھی۔

اس کے بعد مزید فرمایا: خدا اس سے برتر و بلند ہے کہ وہ اس کے لیے شریک بناتے ہیں (تعالٰی عما یشرکون)۔ بت کہ جنھیں وہ اس کا شریک قرار دیتے ہیں ایسی تخلیق کی صلاحیت ہرگز نہیں رکھتے یہاں تک کہ وہ تو معمولی سا مچھر یا غبار کا ذرہ بھی پیدا نہیں کر سکتے اس کے باوجود تم انھیں کس طرح خدا کا شریک قرار دیتے ہو۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ مشرکین خود اس عجیب نظام اور بدیع خلقت کو جو خالق کے علم و قدرت کی مظہر ہے کو صرف اللہ کی طرف سے جانتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ عبادت کے وقت بتوں کے سامنے خاک پر گر پڑتے ہیں۔

آسمان و زمین اور ان میں بے پایاں اسرار کی جانب اشارہ کرنے کے بعد خود انسان کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے وہ انسان کہ جو ہر کسی سے بڑھ کر اپنے آپ سے قریب ہے۔ فرمایا گیا ہے: انسان بے وقعت اور بے قیمت نطفے سے پیدا کیا گیا لیکن اس طرح پیدا ہوکر وہ فصیح و بلیغ متفکر، اپنا دفاع کرنے والا اور واضح کلام کرنے والا بن گیا۔ (خلق الانسان من نطفۃ فاذا ھو خصیم مبین)۔

"نطفہ" کا اصلی معنی ہے تھوڑا یا صاف پانی۔ بعد میں ان قطرات کو نطفہ کہا جانے لگا جو تلقیح کے ذریعے انسانی پیدائش کا سبب بنتے ہیں۔

اس تعبیر سے درحقیقت قرآن خدا تعالٰی کی عظیم قدرت کو مجسم صورت میں بیان کرنا چاہتا ہے کہ اس نے پانی کے بے حیثیت قطرے سے کیسی عجیب مخلوق پیدا کی ہے کہ جس کی قوسِ نزول اور قوسِ صعود کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ ہے۔

یہ مفہوم اس صورت میں ہے جب "خصیم" کو مدافع اور اپنی باطنی حالت بیان کرنے والے کے معنی میں لیا جائے جیسا کہ

سورۂ نساء کی آیہ ۱۰۵ میں ہے:

ولا تکن للخائنین خصیما

اے رسولؐ! خیانت کرنے والوں کے حامی اور مدافع نہ ہو۔

یہ تفسیر مفسرین کے ایک گروہ کے نزدیک قابلِ قبول ہے لیکن بعض مفسرین نے ایک اور تفسیر بیان کی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ:

خدا نے انسان کو اپنی قدرتِ کاملہ کے ذریعے ایک بے وقعت نطفے سے پیدا کیا لیکن یہ ناشکرا انسان خدا کے مقابلے میں کھلم کھلا مجادلہ اور مخاصمہ پر اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ مفسرین سورہ یٰس کی آیہ ۷۷ کو اس تفسیر پر شاہد کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ زیرِ نظر آیات عظمتِ خلقتِ الٰہی کے بارے میں ہیں اور عظمت اس وقت آشکار ہوگی جب ظاہراً معمولی موجود سے وہ ایک قیمتی چیز پیدا کر دے۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی ہے کہ:

خلقه من قطرة من ماء منتن فیکون خصیما متکلما بلیغا

خدا نے انسان کو پانی کے بدبودار قطرے سے پیدا کیا ہے اور پھر وہ فصیح و بلیغ کلام کرنے والا ہو گیا [1]

خلقتِ انسان کے ذکر کے بعد ایک اور اہم نعمت کا بیان ہے اور وہ ہے چوپایوں کی خلقت اور ان سے حاصل ہونے والے فائدے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا نے چوپایوں کو پیدا کیا اور وہ تمہارے لباس اور پوشش کا ذریعہ ہیں۔ جب کہ ان سے تمہیں اور فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں اور تم ان کا گوشت کھاتے ہو (والانعام خلقها لکم فیها دفء و منافع و منها تأکلون)

اس آیت میں پہلے تو چوپایوں کی خلقت کا ذکر ہے اور یہ خدا کے علم و قدرت کی دلیل ہے اس کے بعد ان کے ذریعے جو مختلف نعمتیں حاصل ہوتی ہیں ان کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے سب سے پہلے "دفء" کا ذکر ہے یہ ہر قسم کے لباس اور پہناوے کو کہتے ہیں یہ اشارہ ہے جانوروں کی اُون اور چمڑے سے بنائی جانے والی چیزوں مثلاً لباس، سویٹر، کمبل، جوتا، ٹوپی اور خیمہ وغیرہ کی طرف۔ دوسرے نمبر پر "منافع" کا لفظ آیا ہے یہ دودھ اور اس سے بنائی جانے والی چیزوں کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا گیا ہے "ومنها تأکلون" یہ ان کے گوشت سے استفادہ کرنے کی جانب اشارہ ہے۔

یہ امر جاذبِ نظر ہے کہ ان فوائد میں سے سب سے پہلے لباس و پوشش اور مسکن و مکان کے مسئلے کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے کیونکہ بہت سے لوگ (خصوصاً بادیہ نشین) ایسے ہیں کہ ان کا لباس بھی اون یا چمڑے سے تیار ہوتا ہے اور ان کے خیمے بھی جو انھیں سردی اور گرمی سے بچاتے ہیں بہرحال دوسری ہر چیز سے لباس و مکان کی زیادہ اہمیت کی دلیل ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۳۹

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ انھیں "منافع" سے پہلے ذکر کیا گیا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ لباس ضرر کو روکنے کے لیے ہے اور ضرر کو روکنا حصولِ منافع پر مقدم ہے۔

ہوسکتا ہے وہ لوگ جو گوشت کھانے کے مخالف ہیں اس آیت سے یہ بھی مطلب نکالیں کہ خدا نے جانوروں کا گوشت کھانے کا مسئلہ ان کے "منافع" میں شمار نہیں کیا۔ لہٰذا "منافع" کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے: "و منها تأكلون" (اور تم ان حیوانات کا گوشت کھاتے ہو) اس تعبیر سے کم از کم یہ استفادہ تو کیا جاسکتا ہے کہ لبنیات کی اہمیت کہیں زیادہ ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن نے ان مفید جانوروں کے عام معمول کے فوائد بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان سے حاصل ہونے والے نفسیاتی فوائد کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ جانور تمھارے لیے زینت کا باعث ہوتے ہیں جب کہ انھیں آرام کی جگہ واپس لے کر جاتے ہو اور جب صبح کے وقت انھیں صحرا کی طرف بھیجتے ہو (ولكم فيها جمال حين تريحون وحين تسرحون)۔

"تریحون" "اراحه" کے مادہ سے غروب کے وقت جانوروں کو ان کے باڑوں اور آرام کی جگہوں کی طرف واپس لانے کے معنی میں ہے اسی لیے ان کے آرام کی جگہ کو "مراح" کہتے ہیں۔

"تسرحون" "سروح" کے مادہ سے چوپایوں کو صبح کے وقت چراگاہ کی طرف باہر لے جانے کے معنی میں ہے۔

بھیڑ بکریوں اور دوسرے چوپایوں کے بیابان اور چراگاہ کی طرف اکٹھے جانے اور پھر شام ڈھلے باڑوں اور آرام کی جگہ لوٹ آنے کے جاذبِ نظر منظر کو قرآن "جمال" سے تعبیر کرتا ہے یہ صرف ایک ظاہری، تکلفاتی اور رسمی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس میں ایک حقیقت بیان کی گئی ہے کہ جس کا تعلق معاشرے کی گہرائیوں سے ہے یہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اس قسم کا معاشرہ خود کفیل ہوتا ہے فقیر و پس ماندہ نہیں ہے اور اس سے یا اس سے وابستہ نہیں ہوتا وہ خود وسائل مہیا کرتا ہے اور جو کچھ خود اس کے پاس ہوتا ہے اسے صرف کرتا ہے یہ دراصل معاشرے کا جمالِ استغناء اور خود کفالت ہے یہ درحقیقت جمالِ تولید اور ایک ملت کی ضروریات کی تکمیل ہے۔ واضح تر الفاظ میں یہ استقلال، آزادی کے جمال اور ہر قسم کی وابستگی سے نجات ہے۔

اس حقیقت کو دیہات میں رہنے والے اور دیہات میں پیدا ہونے والے شہروں میں رہنے والوں سے بہتر سمجھ سکتے ہیں، کہ جب یہ مفید چوپائے آتے جاتے ہیں تو انھیں دیکھ کر انھیں کیسا روحانی اور دلی سکون ہوتا ہے ایسا سکون جو بے نیازی کے احساس سے اٹھتا ہے ایسا سکون جو ایک مؤثر اجتماعی ذمہ داری کی انجام دہی پر ہوتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ زیرِ نظر آیت میں پہلے ان کے صحرا سے لوٹنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ جب یہ مویشی صحرا سے لوٹتے ہیں تو ان کے پستان دودھ سے بھرے ہوتے ہیں، شکم سیر ہوتے ہیں اور ان کے چہرے سے خوشی اور طمانیت جھلک رہی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس وقت ان میں وہ حرص اور جلد بازی نظر نہیں آتی جو صبح دم صحرا کی طرف جاتے ہوئے ہوتی ہے۔ اطمینان سے کشاں کشاں قدم اٹھاتے ہیں اور اپنے آرام کی جگہ پر جا پہنچتے ہیں۔ ان کے دودھ بھرے پستانوں کو دیکھنے والا ہر کوئی ایک بے نیازی کا احساس کرتا ہے۔

اگلی آیت میں ان جانوروں کے ایک اور اہم فائدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے وہ تمہارے بھاری بوجھ اپنی پشت پر اٹھا کر ایسے دیار کی طرف لے جاتے ہیں جہاں تک تم شدید مشقت کے بغیر نہ پہنچ پاتے (و تحمل اثقالکم الی بلد لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس)۔ یہ خدا کی رحمت وکرم کی نشانی ہے کہ اس نے ان چوپایوں کو اتنی طاقت بخشی اور انھیں تمہارے قابو میں کر دیا کیونکہ "تمہارا پروردگار رؤف ورحیم ہے" (ان ربکم لرؤف رحیم)۔

"بشق" "مشقت" کے مادہ سے ہے لیکن بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ شگاف کرنے اور آدھا آدھا کرنے کے معنی میں ہے یعنی تم خود اس وزن کو اپنے کندھے پر لاد کر جاؤ تو تمہاری آدھی قوت ختم ہو جائے۔ اصطلاح کے مطابق نیم جاں ہو جاؤ لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اس طرح یہ چوپائے پہلے تو انسان کے لیے لباس اور گرمی سردی سے بچنے کا ذریعہ مہیا کرتے ہیں دوسرے درجے پر ان کے لبنیات سے تیار شدہ چیزوں سے استفادہ کیا جاتا ہے اور پھر ان کا گوشت استعمال کیا جاتا ہے اس کے بعد ان کے وہ نفسیاتی آثار ہیں جو احساسات پر مرتب ہوتے ہیں اور آخر میں ان کی بار برداری کا ذکر ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس دور میں جو کہ مشین کا زمانہ ہے اس میں بھی بہت سے مواقع پر صرف چوپایوں سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور جہاں کوئی اور طریقہ کارآمد بھی نہیں ہے اس کے بعد ایسے جانوروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو انسان کی سواری کے کام آتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا نے گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کیے ہیں تاکہ تم ان پر سواری کرسکو اور وہ تمہاری زینت کا سبب بھی بنیں (والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا وزینۃ)۔

واضح ہے کہ یہاں لفظ "زینت" کوئی تکلفاتی اور رسمی طور پر نہیں آیا جو شخص تعلیمات قرآن سے آشنا ہے اس کے لیے اس کا مفہوم واضح ہے۔ وہ حد زینت سے جس کا اثر اجتماعی زندگی میں ظاہر ہوتا ہے اس حقیقت کی تہ تک پہنچنے کے لیے آپ اس شخص کی حالت کا تصور کریں کہ جس نے ایک طویل بیابانی راستے کو پاپیادہ طے کیا ہو اور تھکا ماندہ اپنی منزل تک پہنچا ہے۔ ایک عرصے تک کام کرنے کے قابل نہ رہا ہو اس کا موازنہ ایسے شخص سے کریں کہ سواری جس کے پاس ہو اور وہ بہت جلد اپنی منزل پر پہنچ گیا ہو۔ اس کی قوت وتوانائی اسی طرح باقی ہو، خوش وخرم ہو اور اپنے آئندہ امور کی انجام دہی کے لیے تیار ہو ——— تو کیا یہ زینت نہیں ہے؟

آیت کے آخر میں ایک نہایت اہم مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور انسانی افکار کو آئندہ زمانے میں نقل وحمل کے نئے پیدا ہونے والے ذرائع کی طرف متوجہ کیا گیا ہے یعنی آئندہ زمانے میں انسان کے پاس ان جانوروں کی نسبت نقل وحمل کے بہتر اور خوب تر ذرائع ہوں گے۔ ارشاد ہوتا ہے خدا تعالیٰ (نقل وحمل کے لیے) کئی ایک چیزیں پیدا کرے گا کہ جنھیں تم نہیں جانتے (ویخلق ما لا تعلمون)۔

بعض گذشتہ مفسرین نے اگرچہ اس جملے کو ایسے جانوروں کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو آئندہ پیدا ہوں گے اور نوع بشر کے مطیع ہوں گے لیکن جیسا کہ تفسیر مراغی اور تفسیر فی ظلال میں ہے ہمارے لیے اس جملے کا مفہوم سمجھنا آسان ہے کیونکہ ہم مشینی اور تیز رفتار

سواریوں کے زمانے میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

یہ جو لفظ "یخلق" (پیدا کرے گا) استعمال کیا گیا اس کی دلیل واضح ہے کیونکہ انسان درحقیقت چیزوں کو جوڑ کر اور ملا کر ایجادات کرتا ہے اور کچھ نہیں جبکہ ان چیزوں کا اصلی مواد صرف خدا کی تخلیق ہے علاوہ ازیں انسانی ایجادات میں موجود استعداد خدا ہی کی عطا کردہ ہے۔

جانور پالنے اور کھیتی باڑی کی اہمیت

آج کے زمانے میں پیداواری کارخانے اور مشینیں اتنی زیادہ ہیں کہ تمام دوسری چیزیں ماند پڑ گئی ہیں لیکن آج بھی انسانی زندگی کی پیداوار کا ایک اہم حصہ جانور پالنے اور کھیتی باڑی سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ غذائی مواد کی حقیقی بنیاد یہی دو امور ہیں اسی بناء پر جانوروں اور کھیتی باڑی کی ضروریات میں خود کفالت نہ صرف اقتصادی استقلال کی ضامن ہے بلکہ سیاسی استقلال بھی بہت حد تک اس سے مربوط ہے لہٰذا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ساری دنیا کی قومیں جانوروں کی نشوونما کو وسعت دینے اور اس کی وسعت کے لیے ماڈرن ذرائع استعمال کرنے میں کوشاں ہیں۔

یہ دونوں چیزیں اتنی اہم اور بنیادی ہیں کہ بعض اوقات ان ممالک میں سے جنھیں سوپر پاور کہا جاتا ہے مجبور ہو جاتے ہیں کہ اپنے سیاسی مقام کو نظر انداز کر کے ان ممالک کے سامنے ہاتھ پھیلائیں جو عین ان کے مخالف ہیں۔ اس کے لیے روس کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔

اسی بناء پر اسلام اور اس کی حیات آفریں تعلیمات میں جانوروں کی پرورش اور زراعت کے مسئلے کو انتہائی زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور ان امور کے لیے مسلمانوں کو ترغیب دینے کے لیے ہر موقع سے استفادہ کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن جانوروں کے مسئلے پر کس تشویق آمیز لہجے میں بات کرتا ہے ان سے حاصل ہونے والے منافع کا ذکر کرتا ہے چاہے وہ غذائی اعتبار سے ہوں یا لباس کے لحاظ سے۔ یہاں تک کہ صحراؤں میں ان کے آنے جانے کا ذکر بڑے حسین پیرائے میں کرتا ہے۔

زراعت، کھیتی باڑی اور مختلف قسم کے پھلوں کی اہمیت کے بارے میں اسی طرح آئندہ آیات میں عمومی اعتبار سے گفتگو ہو گی۔

اسلامی روایات میں جانور پالنے کے بارے میں نہایت جاذب توجہ تعبیرات نظر آتی ہیں اسی طرح کھیتی باڑی کے بارے میں بہت سی روایات ہیں ہم نمونے کے طور پر اسلامی مصادر سے چند ایک روایات پیش کرتے ہیں۔

۱۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایک عزیز سے فرمایا:

تم اپنے گھر میں "برکت" کیوں نہیں لاتے ہو؟

اس نے عرض کیا: "برکت" سے آپ کی کیا مراد ہے؟

فرمایا: "شاۃ تحلب"

(دودھ دینے والی بکری)

مزید فرمایا:۔

انه من كانت فى داره شاة تحلب او نعجة او بقرة فبركاة كلهن

جس کے گھر میں دودھ دینے والی بکری، بھیڑ یا گائے ہو تو یہ سب برکتیں ہیں[1]

۲۔ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ آپ نے بکری کی اہمیت کے بارے میں فرمایا:۔

نعم المال الشاة

بکری بہت اچھا سرمایہ ہے[2]

۳۔ تفسیر نور الثقلین میں زیر بحث آیات کے ذیل میں امام امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے:

افضل ما يتخذه الرجل فى منزله لعياله الشاة فمن كان فى منزله شاة قدست عليه الملائكة مرتين فى كل يوم

اپنے اہل خانہ کے لیے انسان گھر میں جو بہترین چیز مہیا کرتا ہے وہ بکری ہے جس شخص کے گھر میں بکری ہو خدا کے فرشتے ہر روز دو مرتبہ اس کی تقدیس کرتے ہیں۔

یہاں غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے، ممکن ہے بہت سے لوگوں کے گھر میں بکری پالنے کے لیے حالات سازگار نہ ہوں لیکن اصلی مقصد یہ ہے کہ جتنے گھر ہوں اتنی بھیڑ بکریاں ہمیشہ پالتے رہنا چاہیے (غور کیجیے گا)۔

۴۔ زراعت کی اہمیت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں (من وجد ماء وترابا ثم افتقر فابعده الله)۔ جس کے پاس پانی اور مٹی ہو اس کے باوجود وہ فقیر ہو، خدا اسے اپنی رحمت سے دور رکھے[3]

واضح ہے کہ یہ عظیم بات جیسے ایک شخص پر صادق آتی ہے اسی طرح ایک قوم پر بھی صادق آتی ہے جن کے پاس مٹی اور پانی کافی مقدار میں موجود ہے پھر بھی وہ دوسروں کے دستِ نگر ہوں تو یقیناً وہ رحمتِ خدا سے دور ہیں۔

۵۔ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

عليكم بالغنم والحرث فانهما يروحان بخير ويغدوان بخير

تمھاری ذمہ داری ہے کہ بھیڑ بکریاں پالو اور کھیتی باڑی کرو ان کا لین دین خیر و برکت کا باعث ہے[4]۔

---

[1] بحار الانوار ج ۱۴ ص ۶۰۶ طبع قدیم۔ مذکورہ حدیث میں بکری اور گائے کے علاوہ "نعجة" کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ لغت میں اس لفظ کے بہت سے معانی صحیح ہیں مثلاً وحشی گائے، پہاڑی بکری اور بھیڑ۔

[2] بحار الانوار جلد ۱۴ ص ۶۰۶ طبع قدیم۔

[3] بحار الانوار جلد ۲۳ ص ۱۹۔

[4] بحار الانوار جلد ۱۴ ص ۳۰۳۔

۶۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

ما فی الاعمال شیء احب الی اللہ من الزراعة

خدا کے ہاں زراعت سے زیادہ کوئی عمل محبوب نہیں[1]

۷۔ امام صادق علیہ السلام ہی سے ایک اور حدیث منقول ہے، فرماتے ہیں:

الزارعون کنوز الانام تزرعون طیبًا اخرجه اللہ عزوجل وھم یوم القیمة احسن الناس مقامًا و قربھم منزلة یدعون المبارکین

کسان لوگوں کے خزانے ہیں وہ خدا کا عطا کردہ پاکیزہ اناج بوتے ہیں قیامت کے دن وہ بلند ترین مقام کے حامل ہوں گے وہ خدا کے زیادہ قریب ہیں اس روز انھیں "مبارکین" کے نام سے پکارا جائے گا[2]

---

[1] بحار الانوار جلد ۲۳ صفحہ ۲۰۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۳ صفحہ ۱۹۴۔

۹۔ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

۱۰۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝

۱۱۔ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

۱۲۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

۱۳۔ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝

ترجمہ

۹۔ خدا کے ذمہ ہے کہ وہ بندوں کو راہِ راست کی نشاندہی کرے البتہ بعض راستے گمراہی کے ہیں اور اگر خدا چاہے تو تم سب کو (جبری طور) ہدایت کرے (لیکن مجبور کرنے کا کوئی فائدہ نہیں)۔

۱۰۔ وہ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی بھیجا کہ جسے تم پیتے ہو نیز یہ پودے اور درخت بھی اسی سے اُگتے ہیں کہ جنھیں چرنے کے لیے تم اپنے جانور لے کر جاتے ہو۔

۱۱۔ اس (بارش کے پانی ہی) سے خدا تمھاری کھیتیاں اگاتا ہے اسی سے وہ تمھارے لیے زیتون، کھجور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔ یقیناً غور و فکر کرنے والوں کے لیے اس میں واضح نشانی موجود ہے۔

۱۲۔ اس نے رات دن اور سورج چاند کو تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے نیز ستارے بھی اس کے حکم سے تمھارے لیے مسخر ہیں اس میں ان لوگوں کے لیے (عظمتِ خدا کی) نشانیاں ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔

۱۳۔ (ان کے علاوہ) جو رنگا رنگ مخلوق اس زمین میں پیدا کی گئی ہے اسے بھی (تمہارے حکم کے سامنے) مسخر کر دیا گیا ہے اس میں ان لوگوں کے لیے واضح نشانی ہے جو متذکر ہوتے ہیں۔

تفسیر

سب چیزیں انسان کے دستِ تسخیر میں ہیں:

گذشتہ آیات میں خدا کی مختلف نعمتوں کا ذکر تھا زیرِ نظر آیات میں بھی خدا کی بعض نہایت اہم نعمتوں کا ذکر ہے۔

ایک بہت اہم معنوی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا کے ذمے ہے کہ لوگوں کو اس صراطِ مستقیم کی ہدایت کرے جس میں کوئی انحراف اور کجی نہیں ہے۔ (وعلی اللہ قصد السبیل)۔

"قصد" راستہ صاف ہونے کے معنی میں ہے لہٰذا "قصد السبیل" کا معنی "سیدھا راستہ" ہوگا یعنی وہ راستہ جس میں انحراف اور گمراہی نہ ہو۔[1]

اس بارے میں کہ یہ "سیدھا راستہ" تکوینی پہلو سے ہے یا تشریعی پہلو سے، اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں لیکن کوئی مانع نہیں کہ اس میں دونوں پہلو شامل ہوں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ خدا نے انسان کو مختلف توانائیاں عطا کی ہیں اور اسے طرح طرح کی استعدادیں دی ہیں تاکہ تکامل و ارتقاء کی راہ میں اس کی مدد کی جائے کیونکہ تکامل و ارتقاء اس کا مقصدِ خلقت ہے اسی طرح نباتات اور دیگر مختلف جانداروں کو بھی اس ہدف تک پہنچنے کے لیے ضروری توانائیاں عطا کی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ انسان اپنے ارادے کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ جبکہ نباتات اور جانور بے اختیار اپنے ہدف کی طرف جاتے ہیں۔ نیز تکاملِ انسان کی قوسِ صعودی کا بھی دیگر جانداروں سے کوئی موازنہ نہیں ہے۔

اس طرح خدا تعالیٰ نے خلقت اور تکوین کے اعتبار سے عقل و استعداد اور دیگر لازمی توانائیاں عطا کر کے اسے اس صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے تیار کیا ہے۔

دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو وحیِ آسمانی، درکار تعلیمات اور انسانی ضرورت کے قوانین کے ساتھ بھیجا تاکہ تشریعی لحاظ سے صحیح اور غلط راستے کو جدا جدا کر کے دکھایں اور اس راستے پر چلنے کے لیے انسان کے شوق کو ابھاریں اور اسے انحرافی راستوں سے باز رکھیں یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں خدا تعالیٰ نے اس امر کو اپنا ایک فریضہ شمار کیا ہے۔ اور "علی اللہ" (خدا پر لازم ہے) کے الفاظ استعمال کیے ہیں قرآن کی دیگر آیات میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً

ان علینا للھدی

---

[1] بعض بزرگ مفسرین مثلاً علامہ طباطبائی نے "المیزان" میں "قصد" کو "قاصد" کے معنی میں لیا ہے کہ جو "جائر" (حق سے منحرف) کا الٹ ہے۔

ہم پر لازم ہے کہ ہم انسان کی ہدایت کریں۔ (دلیل ـــ ۲)

اگر ہم "علی اللہ قصد السبیل" کے مفہوم کی وسعت پر غور کریں اور تمام مادی و روحانی توانائیاں جو خلقت انسان اور اس کی تعلیم و پرورش میں استعمال ہوئی ہیں کے بارے میں سوچیں تو ہمیں "قصد السبیل" کی عظمت کا اندازہ ہوگا کہ جو تمام نعمتوں سے برتر ہے۔

انحرافی راستے چونکہ بہت زیادہ ہیں اس لیے قرآن اگلے مرحلے پر انسان کو بیدار کرتے ہوئے کہتا ہے، ان راستوں میں سے بعض انحرافی ہیں (ومنها جائر)[1]

انسان کے کمال وارتقاء کے لیے چونکہ اختیار وارادے کی آزادی اہم ترین عامل ہے لہٰذا قرآن ایک مختصر سے جملے کے ذریعے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے "اگر خدا چاہتا تو تم سب کو زبردستی راہ راست کی ہدایت کرتا" یہاں تک کہ تم ایک قدم بھی آگے اس سے نہ رکھ سکتے (ولو شاء لهدٰكم اجمعين)۔ لیکن اس نے یہ کام نہیں کیا کیونکہ جبری ہدایت نہ باعث افتخار ہے اور نہ تکامل وارتقاء کا ذریعہ ـــــــ اس نے تمھیں آزادی دی ہے تاکہ تم یہ راستہ اپنے قدموں سے طے کرو اور اوج کمال تک جا پہنچو۔

قرآن کا جملہ ضمنی طور پر اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اگر انسانوں کا ایک حصہ منحرف راستے کی طرف چل پڑتا ہے تو اس سے یہ وہم پیدا نہ ہو کہ ان کے مقابلے میں خدا مغلوب ہو گیا ہے بلکہ اس کی خواہش اور تقاضائے حکمت ہے کہ انسان آزاد ہیں۔

اگلی آیت میں پھر مادی نعمت کا ذکر ہے تاکہ انسانوں کے احساس تشکر کو ابھارا جائے اور ان کے دلوں میں عشق الٰہی کے نور سے اجالا کیا جائے اور انھیں ان نعمتوں کے عطا کرنے والے کی زیادہ سے زیادہ معرفت کی دعوت دی جائے۔ قرآن کہتا ہے:

وہ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی نازل کیا (هو الذی انزل من السمآء مآء) حیات بخش، میٹھا، صاف و شفاف اور ہر قسم کی آلودگی سے پاک پانی ـــــــ جسے تم پیتے ہو (لكم منه شراب)۔

اور اسی سے پودے اور درخت نکلتے ہیں کہ جنھیں چرنے کے لیے تم اپنے جانور بھیجتے ہو (ومنه شجر فيه تسيمون)۔

"تسیمون" "اسامہ" کے مادہ سے جانوروں کو چرانے کے معنی میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ جانور زمین کے پودوں سے بھی استفادہ کرتے ہیں اور درختوں کے پتوں سے بھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ عربی لغت میں "شجر" کا ایک وسیع مفہوم ہے یہ لفظ درخت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور پودے کے لیے بھی۔

اس میں شک نہیں کہ بارش کا فائدہ یہی نہیں کہ اس کا پانی انسانوں کے پینے اور پودوں کے اگنے کے کام آتا ہے بلکہ اس سے

---

[1] "منہا" کی ضمیر "سبیل" کی طرف لوٹتی ہے اور سبیل مؤنث مجازی ہے۔

ہوا صاف ہو جاتی ہے انسانی جسم کو درکار رطوبت اور نمی حاصل ہوتی ہے انسانی تنفس میں سہولت کا باعث ہے اور اسی طرح اس بارش کے اور بے شمار فائدے ہیں لیکن چونکہ مذکورہ دو باتیں زیادہ اہم تھیں اس لیے فقط انہی کا ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے، بارش کے پانی ہی سے تمہاری کھیتیاں اگاتا ہے (ینبت لکم بہ الزرع والزیتون والنخیل و الاعناب) مختصر یہ کہ تمام پھل اسی سے اُگتے ہیں (ومن کل الثمرات)۔

یقیناً یہ رنگارنگ پھل اور طرح طرح کی کھیتیاں خدا کی طرف سے ان لوگوں کے لیے واضح نشانیاں ہیں جو صاحب فکر ہیں (ان فی ذٰلک لاٰیۃ لقوم یتفکرون)۔

"زرع" کے مفہوم میں ہر طرح کی زراعت شامل ہے "زیتون" ایک خاص درخت کا نام ہے اور اس درخت کے پھل کو بھی "زیتون" کہتے ہیں (لیکن بعض مفسرین کے نزدیک "زیتون" صرف درخت کا نام ہے اور "زیتونہ" اس کے پھل کا نام ہے جبکہ سورۂ نور کی آیہ ۳۵ میں لفظ "زیتونہ" خود درخت کے لیے استعمال ہوا ہے)۔

"نخیل" کا معنی ہے کھجور کا درخت یہ لفظ مفرد اور جمع دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

"اعناب" جمع ہے "عنب" کی جس کا معنی ہے انگور۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے تمام پھلوں میں سے صرف ان تین پھلوں زیتون، کھجور اور انگور کا ذکر کیوں کیا ہے اس کی دلیل انشاء اللہ آپ اسی آیت میں پڑھیں گے۔

اس کے بعد اس نعمت کی طرف اشارہ ہے کہ اس جہان کے مختلف موجودات انسان کے لیے مسخر کر دیئے گئے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے اللہ نے تمہارے لیے رات اور دن کو مسخر کر دیا ہے اور اسی طرح سورج اور چاند کو بھی (و سخر لکم الیل و النہار والشمس و القمر) اسی طرح ستارے بھی حکم انسان کے سامنے مسخر ہیں (والنجوم مسخرات بامرہ)۔

ان امور میں یقیناً خدا اور اس کی خلقت کی عظمت کی نشانیاں ہیں ان کے لیے جو عقل و فکر رکھتے ہیں (ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یعقلون)۔

سورۂ رعد اور سورۂ ابراہیم کے ذیل میں ہم کہہ چکے ہیں کہ انسان کے لیے موجودات کے مسخر ہونے کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ موجودات انسانی فائدے کے لیے مصروف خدمت ہوں اور انسان کو اس بات کا امکان فراہم کریں کہ وہ ان سے استفادہ کر سکے۔ اسی بناء پر رات، دن، سورج، چاند اور ستاروں میں سے ہر کوئی انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انسان ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اس لحاظ سے یہ موجودات انسان کے لیے مسخر ہیں۔

یہ جاذب نظر تعبیر کہ موجودات بحکم خدا سے انسان کے لیے مسخر ہیں۔ اسلام اور قرآن کی نگاہ میں انسان کے مقام اور حقیقی عظمت کو واضح کرتی ہے اور اس کے خلیفۃ اللہ ہونے کی اہلیت کا اظہار کرتی ہے اس تعبیر کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خدا کی گوناگوں نعمتوں کا ذکر کر کے انسان کے جذبۂ شکر کو ابھارا جائے اور وہ اس عمدہ و بدیع نظام کی اپنے لیے تسخیر کو دیکھتے ہوں خدا کے نزدیک ہو جائے۔

اسی لیے آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے، اس تسخیر کے لیے ان میں نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اسرار تسخیر سے زیادہ

آگاہی کے لیے سورۂ ابراہیم کی آیات ۳۲ اور ۳۳ کی تفسیر دیکھیے۔

ان کے علاوہ زمین میں پیدا کی گئی مخلوقات کو بھی تمھارے لیے مسخر کر دیا گیا ہے" (وما ذرألکم فی الارض)۔ رنگا رنگ کی مخلوقات (مختلفًا الوانہ) طرح طرح کے لباس، مختلف قسم کی غذائیں، پاکیزہ بیویاں، آرام و آسائش کے وسائل، قسم قسم کی معدنیات، زیر زمین اور بالائے زمین مفید چیزیں اور دوسری نعمتیں ——— "ان میں بھی واضح نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھ جاتے ہیں" (ان فی ذلک لاٰیۃ لقوم یذکرون)۔

چند اہم نکات

۱۔ **مادی اور روحانی نعمتیں:** یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں مادی و روحانی نعمتیں اس طرح آپس میں ملی جلی ہوئی ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اس کے باوجود آیات کے اس سلسلے میں مادی اور روحانی نعمتوں کے بارے میں لب و لہجے میں ایک فرق ضرور ہے۔

کسی موقع پر یہ نہیں کہا گیا کہ خدا پر لازم ہے کہ تمھارے لیے فلاں روزی پیدا کرے لیکن راہِ راست کی ہدایت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ خدا پر لازم ہے کہ تمھیں سیدھے راستے کی ہدایت کرے اور اس راستے کو طے کرنے کے لیے درکار قوت و توانائی بھی تمھیں عطا کرے، تکوینی لحاظ سے بھی اور تشریعی لحاظ سے بھی۔ اصولی طور پر قرآن کی یہ روش ہی نہیں کہ وہ کسی بحث کے صرف ایک ہی پہلو پر نظر رکھے۔ یہاں تک کہ درختوں اور پھلوں کی خلقت اور چاند سورج کے تسخیر ہونے کی بات کرتے ہوئے بھی معنوی و روحانی ہدف کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے یہ مادی نعمتیں بھی عظمتِ خالق کی نشانی ہیں۔

۲۔ **زیتون، کھجور اور انگور ہی کا ذکر کیوں؟** ہو سکتا ہے یہ کہا جائے کہ قرآن نے مندرجہ بالا آیت میں طرح طرح کے پھلوں میں سے زیتون، کھجور اور انگور کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ نزولِ قرآن کے علاقے میں موجود تھے لیکن قرآن کے عالمی اور جاودانی ہونے اور اس کی تعبیرات کی گواہی کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ مطلب اس سے کہیں اونچا ہے۔

غذا شناس اور وہ عظیم سائنس دان جنھوں نے اپنی عمر کے سالہا سال مختلف پھلوں کے خواص کے مطالعے میں صرف کیے ہیں وہ کہتے ہیں کہ بہت کم پھل ایسے ہیں جو غذائیت کے اعتبار سے انسانی جسم کے لیے ان تین پھلوں جتنے مفید اور مؤثر ہوں وہ کہتے ہیں کہ زیتون کا تیل بدن کے جلے ہوئے حصے کے پھر سے بننے کے لیے بہت اہم کردار ادا کر سکتا ہے اس میں حرارت بہت زیادہ ہوتی ہے اسی بنا پر یہ ایک قوت بخش شے ہے۔ جو لوگ اپنی صحت و سلامتی کی حفاظت چاہتے ہیں انھیں اس اکسیر سے استفادہ کرنا چاہیے۔

زیتون کا تیل انسان کے جگر کا مخلص دوست ہے گردوں اور صفرا۔ کے عوارض اور گردے اور جگر کے درد رفع کرنے کے لیے اور قبض کو دور کرنے کے لیے بہت ہی مؤثر ہے اسی بنا پر اسلامی روایات میں بھی اس کی بہت مدح و ثنا اور توصیف کی گئی ہے۔ ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ الرضاؑ سے زیتون کے بارے میں مروی ہے:

بڑی اچھی غذا ہے، منہ کو خوشبودار بنا دیتی ہے بلغم کو دور کرتی ہے چہرے کو صفائی اور تازگی بخشتی ہے

اعصاب کو تقویت دیتی ہے۔ بیماری اور درد کو ختم کر دیتی ہے اور غصے کی آگ کو بجھا دیتی ہے۔[1]

اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ خود قرآن میں زیتون کے درخت کو "شجرہ مبارکہ" (بابرکت درخت) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

اسی طرح میڈیکل سائنس اور علم غذا شناسی کی ترقی نے دوا کی حیثیت سے کھجور کی اہمیت کو بھی درجۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہے۔

کھجور میں موجود کیلشیم ہڈیوں کی مضبوطی اور پختگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں نیز اس میں فاسفر Phosphore بھی موجود ہے جس سے دماغ کے اصلی عناصر کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ اعصاب کو کمزوری اور خستگی سے بھی بچاتا ہے اور قوتِ بینائی کو زیادہ کرتی ہے۔

اس میں پوٹاشیم بھی موجود ہے جبکہ پوٹاشیم کی بدن میں کمی ہی زخم معدہ کی حقیقی وجہ سمجھی جاتی ہے نیز اس کا وجود پٹھوں اور بدن کے تانے بانے کے لیے بہت ہی قیمتی ہے دورِ حاضر کے غذا شناسوں میں یہ بات مشہور ہے کہ کھجور سرطان کو روکتی ہے کیونکہ اس سلسلے میں جو اعداد و شمار مہیا ہوئے ہیں وہ نشاندہی کرتے ہیں کہ جن علاقوں میں کھجوریں زیادہ کھائی جاتی ہیں وہ سرطان کی بیماری میں کم مبتلا ہوتے ہیں۔ عرب کے بدو اور صحرانشین جن کی زندگی فقر و فاقے میں گزرتی ہے کھجور کھانے کی وجہ سے کبھی سرطان میں مبتلا نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ یہ بھی جاتی ہے کہ کھجور میں میگنیشیم (Magnesium) موجود ہے۔

کھجوروں میں شکر بہت ہے اور یہ شکر کی زیادہ صحیح اور بہتر قسم ہے یہاں تک کہ بعض مواقع پر شوگر کی بیماری میں مبتلا شخص بھی آرام سے اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

سائنس دانوں نے کھجور میں تیرہ قسم کے حیاتی مادے اور پانچ طرح کے وٹامن معلوم کیے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت قیمتی اور بھرپور غذا ہے۔[2] اسی بنا پر اسلامی روایات میں بھی اس کے بارے میں بہت زیادہ تاکید نظر آتی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے فرمایا:

کل التمر فان فیہ شفاء من الادواء

کھجور کھاؤ کہ اس میں بہت سی بیماریوں کا علاج ہے۔

نیز یہ بھی روایت ہے کہ حضرت علیؑ کی غذا اکثر اوقات روٹی اور کھجور پر مشتمل ہوتی تھی۔ ایک اور روایت میں ہے:

جس گھر میں کھجور کا درخت نہیں اس کے رہنے والے درحقیقت بھوکے ہیں۔[3]

---

[1] اسلام پزشک بی دارو، ہر

[2] کتاب "اولین دانش گاہ و آخرین پیامبر" جلد ۶، ص ۶۵۔ یہ بات قابلِ نظر ہے کہ اس کتاب کی ساتویں جلد میں غذاؤں ہی کے خواص بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں علاج کے طور پر کھجور اور شفا کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا مطالعہ ان دونوں غذاؤں کی اہمیت سے آشنا کرتا ہے۔

[3] سفینۃ البحار، جلد ۱، ص ۱۲۵ ہر

سورۂ مریم کی آیات میں بھی آئے گا کہ حضرت مریم جس بیابان میں تھیں وہاں کچھ بھی نہ تھا جس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں تازہ کھجوریں عطا کیں یہ اس طرف اشارہ ہے کہ زچہ کے لیے تازہ کھجور بہترین غذاؤں میں سے ہے۔ یہاں تک کہ اس آیت کے ذیل میں آنے والی روایات کے مطابق اس حالت میں عورتوں کے لیے بہترین دوا کھجوریں ہے[1]

باقی رہا انگور ——— تو غذا شناس ماہرین کے بقول یہ اس قدر مؤثر عوامل رکھتا ہے کہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک طبیعی میڈیکل سٹور ہے۔ علاوہ ازیں انگور خواص کے لحاظ سے ماں کے دودھ کے قریب قریب ہے یعنی ایک مکمل غذا ہے انگور جسم میں گوشت سے دگنی حرارت پیدا کرتا ہے اس کے علاوہ یہ زہر کی ضد اور رکاوٹ ہے خون کی صفائی، جوڑوں کے درد کے علاج، ورم کے آرام اور خون بڑھانے کے لیے یہ ایک مؤثر دوا ہے۔ انگور معدہ اور آنتوں کو غیر مشکوک کر دیتا ہے یہ نشاط آفریں ہے، اور رنج و غم کو برطرف کر دینے والا ہے اعصاب کو تقویت پہنچاتا ہے اس میں موجود مختلف وٹامن انسان کو قوت بخشتے ہیں انگور ایک نہایت قیمتی غذا ہونے کے علاوہ جراثیم کشی کی بہت صلاحیت رکھتا ہے یہاں تک کہ سرطان کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی یہ ایک مؤثر عامل ہے[2]

اسی بناء پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث کے مطابق:

خیر طعامکم الخبز وخیر فاکھتکم العنب

تمھاری بہترین غذا روٹی اور بہترین پھل انگور ہے[3]

ان پھلوں کے بارے میں غذا شناسوں نے جو کچھ کہا ہے اور فراواں روایات جو اُن کے بارے میں اسلامی مصادر میں آئی ہیں ہم وہ سب کچھ بیان کرنے لگیں تو یقیناً روشِ تفسیر سے ہٹ جائیں گے۔ مقصد یہ تھا کہ ہم واضح کریں کہ قرآن نے ان تین پھلوں کا ذکر بلاوجہ نہیں کیا اور شاید اس زمانے میں ان کے فوائد کا اہم حصّہ لوگوں سے مخفی تھا۔

۲۔ **تفکر، تعقّل اور تذکّر:** زیرِ بحث آیات میں نعماتِ الٰہی کو تین حصّوں میں بیان کرنے کے بعد لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے فرق یہ ہے کہ ایک موقع پر قرآن کہتا ہے:

ان میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

دوسری جگہ کہتا ہے:

اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

تیسری جگہ فرماتا ہے:

اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو متذکر ہوتے ہیں۔

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۱۲۵۔

[2] اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر جلد، ص ۱۰۱ و ص ۱۴۲۔

[3] اسلام پزشک بی دارو۔

تعبیر کا یہ اختلاف یقیناً ازراہِ تفنن نہیں ہے بلکہ جیسا کہ قرآن کی روش سے واضح ہوتا ہے ان میں سے ہر ایک کسی نکتے کی طرف اشارہ ہے شاید فرق کا پہلو یہ ہے کہ زمین کی رنگا رنگ نعمتوں کا مسئلہ اس قدر واضح ہے کہ وہاں صرف تذکر اور یاد دہانی کافی ہے لیکن زراعت کا معاملہ اور زیتون کھجور، انگور اور کلی طور پر پھلوں کا مسئلہ ایسا ہے جس پر کچھ غور و فکر کرنا ضروری ہے تاکہ ان کے غذائی خواص اور علاج کے لیے ان کی اہمیت سے آشنائی ہو سکے لہٰذا اس ضمن میں "تفکر" کی دعوت دی گئی ہے۔
رہا سورج، چاند اور ستاروں کی تسخیر کا مسئلہ، نیز رات اور دن کے اسرار کا معاملہ تو اس کے لیے زیادہ سوچ بچار کی ضرورت ہے لہٰذا "تعقل" کا ذکر آیا ہے گویا یہ عام غور و فکر سے بالاتر مسئلہ ہے۔

بہرحال قرآن کا روئے سخن ہر جگہ سوچ بچار کرنے والوں، اہل فکر و نظر اور صاحبانِ عقل کی طرف ہے۔

اس طرف توجہ کریں کہ قرآن ایک ایسے ماحول میں اُترا کہ جہاں جہالت کے سوا کسی چیز کی حکمرانی نہ تھی —— اس سے ان تعبیرات کی عظمت اور آشکار ہوتی ہے یہ امر ان لوگوں کے لیے دندان شکن جواب بھی ہے جو بعض خرافاتی مذاہب کی وجہ سے مذاہب پر بھی سُرخ لکیر کھینچ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذہب تو افیون ہے اور یہ فکر و نظر اور عقل و فہم کو بے کار کر دیتا ہے اور خدا پر ایمان لانا آدمی کی جہالت کی پیداوار ہے قرآن کی ایسی آیات تقریباً تمام سورتوں میں موجود ہیں جو وضاحت سے کہہ رہی ہیں کہ سچا مذہب سوچ بچار اور تفکر و تعقل کی پیداوار ہے اور اسلام ہر مقام پر سروکار اہل فکر و نظر اور اولوالالباب سے رکھتا ہے نہ کہ جاہل خرافات بکنے والوں اور بے منطق روشن فکروں سے۔

۱۴۔ وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

۱۵۔ وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝

۱۶۔ وَعَلَامَاتٍ ۚ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ۝

۱۷۔ أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝

۱۸۔ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

ترجمہ

۱۴۔ وہ ذات وہی ہے جس نے (تمھارے لیے) دریا کو مسخر کیا تاکہ اس سے تازہ گوشت کھا سکو اور لباس کے لیے اس سے وسائلِ زینت نکالو اور تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ وہ دریا کا سینہ چیرتی ہیں تاکہ تم (تجارت کر سکو اور) فضلِ خدا سے بہرہ مند ہو شاید تم اس کی نعمتوں کا شکرادا کرو۔

۱۵۔ اور اس نے زمین میں محکم اور مضبوط پہاڑوں کو گاڑ دیا تاکہ تمھیں اس کی حرکت اور لرزنے سے محفوظ رکھے اور اس نے دریا پیدا کیے اور راستے بنائے تاکہ تمھیں ہدایت حاصل ہو۔

۱۶۔ اور اس نے نشانیاں پیدا کیں اور (رات کے وقت) ان (لوگوں) کی ستاروں کے ذریعے راہنمائی کی گئی ہے۔

۱۷۔ کہ خلق کرنے والا اس کی مانند ہے جو خلق نہیں کرتا کیا تم خیال نہیں کرتے۔

۱۸۔ اور اگر تم نعماتِ خدا کو گننا چاہو تو ہرگز شمار نہیں کر پاؤ گے۔ اللہ غفور و رحیم ہے۔

تفسیر

پہاڑ، دریا اور ستارے نعمت ہیں:

ان آیات میں انسان کو حاصل کچھ اور اہم نعماتِ الٰہی کا ذکر ہے یہاں بات دریاؤں سے شروع کی گئی ہے کہ جو انسانی زندگی کا بہت اہم منبع ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: جس نے دریاؤں اور سمندروں کو تمھارے لیے مسخر کیا ہے اور انھیں تمھاری خدمت پر مامور کیا ہے۔ (و ھو الذی سخر البحر)

ہم جانتے ہیں کہ زمین کا زیادہ تر حصہ دریاؤں اور سمندروں پر مشتمل ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ زندگی کی پہلی کونپل دریا سے پھوٹی۔ اس وقت بھی دریا اور سمندر انسانوں اور زمین کی تمام موجودات کی زندگی کو جاری رکھنے کے لیے اہم منبع ہیں انھیں خدمتِ بشر پر مامور کرنا خدا تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے۔

اس کے بعد دریاؤں اور سمندروں کے تین فوائد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ۔ (لتأکلوا منہ لحما طریا) وہ گوشت کہ جس کی پرورش کی زحمت تم نے نہیں اٹھائی۔ صرف خدا کے دستِ قدرت نے انھیں سمندروں اور دریاؤں میں پالا ہے اور تمھیں یہ مفت حاصل ہوا ہے۔

اس گوشت کی تازگی کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اس زمانے میں بھی پرانا اور باسی کئی طرح کا گوشت ملتا تھا اور ہمارے اس زمانے میں بھی ملتا ہے اس صورتِ حال پر نظر رہے تو اس نعمت کی اہمیت اور تازہ گوشت سے غذا تیار کر کے کھانے کی اہمیت زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

انسان کی مادی زندگی اور تمدن میں بہت ترقی ہوئی ہے اس کے باوجود آج بھی دریا اور سمندر انسانی غذا کا ایک اہم منبع ہیں ہر سال لاکھوں ٹن گوشت جسے لطفِ پروردگار کے دستِ مبارک نے انسانوں کے لیے پالا ہے دریا اور سمندر سے حاصل کیا جاتا ہے۔

اس وقت جبکہ زمین پر بڑھتی ہوئی آبادی کو دیکھ کر اور ابتدائی مطالعہ کے بعد بعض لوگ آئندہ غذا کی کمی ہو جانے کا احساس کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ غذا میں آئندہ کمی کی یہ توقع کی ڈراتی ہے لیکن سائنس دانوں کی توجہ دریاؤں اور سمندروں کی طرف سے انھوں نے ان کی طرف چشمِ امید لگا رکھی ہے ان کا خیال ہے کہ مختلف النوع مچھلیاں پال کر اور ان کی نسل کو بڑھا کر اس کمی کو بہت حد تک پورا کیا جا سکتا ہے دوسری طرف سائنس دانوں نے دریاؤں کے پانی کو آلودگی سے اور مچھلیوں کی نسل کو تباہی سے بچانے کے لیے قوانین اور طریقے بھی وضع کیے ہیں ان کے مجموعی مطالعے سے قرآن کے مذکورہ جملے کی اہمیت زیادہ واضح ہو جاتی ہے ——— جو کہ چودہ سو سال پہلے نازل ہوا ہے۔

سمندروں سے ملنے والی چیزوں میں سے زینت اور بناؤ سنگھار کے کام آنے والی چیزیں بھی ہیں لہٰذا قرآن مزید کہتا ہے تاکہ اس سے پہننے کے لیے زینت کی چیزیں نکال سکو (و تستخرجوا منہ حلیۃ تلبسونھا)۔

انسان چوپایوں کی طرح ذوق سے محروم نہیں بلکہ روحِ انسانی کے چار مشہور پہلو ہیں ان میں سے ایک جمالیاتی حس ہے یہی ذوق حقیقی شعر اور ہنر کی تخلیق کا سرچشمہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ انسان کا روحانی پہلو بشری زندگی میں بہت مؤثر ہے لہٰذا صحیح طریقے سے، افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اس پہلو کی ضروریات بھی پوری کرنی چاہییں۔

جو لوگ جمال پرستی اور زینتوں اور لذتوں میں غرق ہیں وہ اسی طرح گمراہ ہیں جیسے وہ خشک افراد جو ہر قسم کی زینت کے مخالف ہیں ان میں سے ایک گروہ افراط میں مبتلا ہے اور دوسرا تفریط میں۔ ایک گروہ سرمایے کو ضائع کرنے، طبقاتی فاصلے پیدا کرنے اور معنویات کو قتل کرنے کا باعث ہے جبکہ دوسرا جمود اور ٹھہراؤ کا باعث ہے۔

اسی بنا پر اسلام میں معقول طریقے سے اور فضول خرچی سے بچتے ہوئے زیب و زینت سے استفادہ کی اجازت دی گئی ہے مثلاً اچھے لباس پہننے، مختلف قسم کے عطر استعمال کرنے بعض قیمتی پتھروں سے استفادہ کرنے کی سفارش کی گئی ہے خصوصاً عورتوں کے لیے چونکہ وہ زیب و زینت کی طرف فطری طور پر زیادہ رغبت رکھتی ہیں لیکن ہم پھر تاکید کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ فضول خرچی سے خالی ہونا چاہیے۔

آخر میں تیسری دریائی نعمت کا ذکر ہے اور وہ ہے اس میں کشتیوں کا چلنا جو کہ انسان اور اس کی ضروریات کی نقل و حمل کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ فرمایا گیا ہے: تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ وہ سمندر کا سینہ چیرتی ہیں (وتری الفلک مواخر فیہ)۔

کشتی پر بیٹھے ہوئے لوگ جب صفحۂ سمندر پر چل رہے ہوتے ہیں تو یہ منظر کس قدر قابلِ دید ہوتا ہے "خدا نے یہ نعمت تمہیں بخشی ہے تاکہ اس سے فائدہ اٹھاؤ اور راہ تجارت میں اس کے فضل و کرم سے استفادہ کرو (ولتبتغوا من فضلہ)[1] ان سب نعمتوں کی طرف متوجہ ہونے سے تم میں احساس ذمہ داری پیدا ہو تو" شاید اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ" (ولعلکم تشکرون)۔

لفظ "فلک" "کشتی کے معنی میں ہے مفرد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

"مواخر" "ماخرۃ" کی جمع ہے اس کا مادہ "مخر" ہے جو پانی کو دائیں بائیں سے چیرنے کے معنی میں ہے کشتیاں چونکہ چلتے وقت پانی کا سینہ چیرتی ہیں اس لیے انہیں "ماخر" یا "ماخرۃ" کہتے ہیں۔

اصولاً وہ کون ہے جس نے اس مادہ میں یہ خاصیت رکھی ہے جس سے کشتی بنائی جاتی ہے کہ وہ پانی کے اوپر ٹھہر سکے اگر ہر چیز پانی سے زیادہ بھاری ہوتی اور پانی کا مخصوص دباؤ بھی نہ ہوتا تو ہم سمندر کے بیکراں صفحے پر کبھی بھی نہیں چل سکتے تھے

---

[1] "ولتبتغوا من فضلہ" واؤ عطف کے ساتھ آیا ہے اس کا کوئی معطوف علیہ ہونا چاہیے قاعدہ مقدر ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے۔

لتنتفعوا بہا و لتبتغوا من فضلہ

تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں پانی کا سینہ چیرتی ہیں تاکہ تم اس سے مختلف فائدے اٹھا سکو اور تجارت کیلئے اس سے بہرہ ور ہو سکو۔

نیز وہ کون ہے جو سمندروں کی سطح پر منظم ہواؤں کو چلاتا ہے اور وہ کون ہے جس نے بخارات میں یہ طاقت پیدا کی ہے کہ ان سے ہم سمندر پر انجن والی کشتیاں چلا سکیں؟ ——— کیا ان میں سے ہر ایک عظیم نعمت نہیں ہے۔
سمندری راستے خشکی کی سڑکوں اور شاہراہوں کی نسبت بہت وسیع، بہت کم خرچ اور زیادہ مہیا ہوتے ہیں۔ بعض دیو قامت بحری جہاز شہروں کی طرح وسیع ہوتے ہیں اور اس طرح انسانوں کو نقل و حمل کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہاتھ آیا ہے ہم اس طرف توجہ کریں تو کشتی رانی کے لیے سمندروں کی نعمت کی عظمت زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

سمندروں اور دریاؤں کی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد قرآن سخت اور مضبوط پہاڑوں کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے: زمین میں محکم اور مضبوط پہاڑ گاڑ دیئے گئے ہیں تاکہ اسے لرزنے اور حرکت کرنے سے بچایا جا سکے اور تم اس پر آرام و اطمینان سے رہ سکو (و القی فی الارض رواسی ان تمید بکم)۔[1]
ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ پہاڑوں کی بنیادیں اور جڑیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں اور باہم وابستہ و پیوستہ ہیں اور زرہ کی طرح زمین کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں یہ چیز اندرونی گیس کے سبب ہر لحظہ ممکن سرزنش سے زمین کو بہت حد تک بچائے ہوئے ہے۔ علاوہ ازیں پہاڑوں کی خاص وضع پانی کے مدوجزر کے مقابلے میں زمین کی جلد کی قوتِ مدافعت کو بڑھاتی ہے اور اس پر پانی کے مدوجزر کے اثر کو بہت کم کر دیتی ہے اسی طرح پہاڑ زمین پر آنے والے شدید طوفانوں کی قوت اور ہواؤں کی حرکت کو کم کر دیتے ہیں کیونکہ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو زمین کی ہموار سطح تیز آندھیوں اور طوفانوں کی زد میں رہتی اور اس حالت میں اس کے لیے سکون ممکن نہ تھا۔
نیز پہاڑ چونکہ پانیوں کے اصل خزانوں میں سے ہیں (برف کی صورت میں یا اندرونی طور پر ان میں پانی ہوتا ہے) لہٰذا ان کے ساتھ ہی فوراً دریاؤں اور نہروں کی نعمت کا ذکر کیا گیا ہے، فرمایا گیا ہے: اور تمہارے لیے دریا اور نہریں پیدا کی گئی ہیں (و انہارا)۔
ممکن تھا کہ پہاڑوں کے وجود سے یہ توہم پیدا ہوتا کہ وہ زمین کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتے ہیں اور راستوں کو بند کر دیتے ہیں لہٰذا مزید فرمایا گیا ہے اور تمہارے لیے راستے بنائے گئے ہیں تاکہ تم ہدایت پاؤ (و سبلا لعلکم تہتدون)۔[2]
یہ مسئلہ قابلِ توجہ ہے کہ دنیا میں پہاڑوں کے بڑے بڑے سلسلوں میں کٹاؤ موجود ہے جس سے انسان ان کے درمیان سے اپنا راستہ بنا لیتا ہے اور بہت کم ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ پہاڑ زمین کے حصوں کو بالکل ہی ایک دوسرے سے

---

[1] "ان تمید بکم" تقدیر میں یوں تھا "لئلا تمید بکم" یا "کراهة ان تمید بکم" (تاکہ وہ تمہیں یا متلاشی سے یا تمہیں حرکت دینے کو ناپسند کرتے ہوئے)۔
[2] بہرحال مندرجہ بالا آیت قرآن مجید کے علمی معجزات میں سے ہے۔ یہ بات کم از کم اس زمانے میں لوگوں پر ابھی منکشف نہیں ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے ہماری کتاب "قرآن و آخرین پیامبر" دیکھیے۔

الگ کر دیں۔

راستہ چونکہ نشانی اور علامت اور راہنما کے بغیر انسان کو مقصد تک نہیں پہنچاتا لہٰذا راستے کی نعمت کا ذکر کرنے کے بعد ان نشانیوں اور علامتوں کا ذکر کیا گیا ہے فرمایا گیا ہے: اور علامتیں قرار دی گئی ہیں (وعلمٰت)۔

یہ علامتیں مختلف قسم کی ہیں پہاڑوں کی شکل و صورت، درّے اور ان کا ایک دوسرے سے کٹاؤ اور علیحدگی، زمین کا نشیب و فراز، مختلف رنگ کی مٹی، پہاڑوں کے مختلف رنگ یہاں تک کہ ہر ایک میں چلنے والی ہواؤں کی کیفیت راستے تلاش کرنے کے لیے علامتیں ہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ یہ علامتیں مسافروں کے لیے کس قدر مددگار ہیں یہ انھیں منزل سے دور ہو جانے اور کھو جانے سے بچاتی ہیں بعض بیابان ایک ہی طرز کے ہوتے ہیں انھیں عبور کرنا بہت زیادہ مشکل اور خطرناک ہے یہ ایسے ایسے بیابان ہیں کہ کتنے ہی لوگ ان میں گئے ہیں اور پھر پلٹ کر نہیں آئے۔ غور کیجیے کہ اگر اسی طرح ساری زمین ایک ہی طرز اور کیفیت کی ہوتی، پہاڑ ایک جیسے ہوتے، سب دشت و بیابان ایک ہی رنگ کے ہوتے اور درّے ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے تو کیا پھر انسان آسانی سے اپنے راستے معلوم کر سکتے؟

بعض اوقات انسان تاریک راتوں میں بیابانوں میں سفر کرتا ہے یا رات کو وسط سمندر میں سفر کرتا ہے اور اس کے لیے ایسی کوئی علامات نہیں ہوتیں ایسے میں اللہ تعالیٰ آسمانی علامتوں کو مدد کے لیے بھیجتا ہے تاکہ اگر زمین میں کوئی علامت نہیں ہے تو مسافر آسمانی علامت سے استفادہ کریں اور بھٹک نہ جائیں لہٰذا مزید فرمایا گیا ہے اور ستاروں کے ذریعے لوگوں کی راہنمائی کی جاتی ہے (وبالنجم ھم یھتدون)۔

البتہ یہ ستاروں کے فوائد میں سے ایک کا ذکر ہے ورنہ ان کے بہت سے فوائد ہیں تاہم اگر ان کا صرف یہی فائدہ ہوتا تو بھی اہم تھا اگرچہ اب تو کشتیاں قطب نما کی مدد سے تیار کردہ نقشوں کے مطابق اپنا راستہ معین کر لیتی ہیں لیکن قطب نما کی ایجاد سے پہلے تو سمندروں میں ستاروں کی مدد کے بغیر چلنا ممکن ہی نہ تھا یہی وجہ ہے کہ رات کو جب بادل آسمان پر چھائے ہوتے تھے کشتیاں رک جاتی تھیں اور اگر وہ ایسے میں چلتی رہتیں تو انھیں موت کا خطرہ درپیش رہتا۔

البتہ ہم جانتے ہیں کہ جو ستارے آسمان میں ہمیں اپنی جگہ بدلتے نظر آتے ہیں وہ پانچ سے زیادہ نہیں ہیں انھیں سیارے کہتے ہیں اگرچہ سیارے ان سے زیادہ ہیں لیکن باقی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے۔ باقی ستارے اپنی جگہ پر برقرار رہتے ہیں گویا یہ سیاہ کپڑے پر جڑے ہوئے موتی ہیں یہ موتی کپڑے کو افق کی ایک طرف سے کھینچ کر دوسری طرف لے جاتے ہیں دوسرے لفظوں میں ثوابت کی حرکت مجموعی ہے لیکن سیاروں کی حرکت انفرادی ہے اور دیگر ستاروں سے ان کا راستہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں ثابت ستاروں کی مختلف شکلیں ہیں جو "اشکالِ فلکی" کے نام سے مشہور ہیں اور چاروں سمتیں (مشرق، مغرب شمال، جنوب) معلوم کرنے کے لیے ان شکلوں کی پہچان بہت مفید ہے۔

پروردگار کی ان عظیم نعمتوں اور پوشیدہ الطاف کا ذکر کرنے کے بعد قرآن انسانی وجدان کو فیصلے کی دعوت دیتا ہے کیا پیدا کرنے والا اس کی طرح ہے جو پیدا نہیں کرتا، کیا تم خیال نہیں کرتے (افمن یخلق کمن لا یخلق

افلا تذکرون)۔

یہ تربیت کا ایک نہایت موثر طریقہ ہے۔ قرآن نے اس سے بہت سے مواقع پر استفادہ کیا ہے۔ قرآن سوالیہ طریقے سے مسائل پیش کرتا ہے اور ان کا جواب ان پر چھوڑ دیتا ہے جن کا وجدان بیدار ہے۔ قرآن اس طریقے سے لوگوں کے احساس کو ابھارتا ہے تاکہ جواب اُن کی رُوح کے اندر سے اُٹھے اور پھر وہ اسے قبول کر لیں اور اس جواب سے اس طرح محبت کریں جیسے وہ اپنے وجود سے پیدا ہونے والی اولاد سے کرتے ہیں۔

اصولی طور پر علمِ نفسیات کی رُو سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ صحیح تعلیم و تربیت کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کی جانا چاہیے اس طرح کی جسے تعلیم دی جارہی ہو وہ مطالب کا خود سے احساس کرے اور خود اس کے اندر سے وہ مطالب نکلیں اسے یہ احساس نہ ہو کہ کوئی ایسی چیز ہے جو باہر سے اس پر ڈالی گئی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ ان مطالب کو اپنے پورے وجود کے ساتھ قبول کرے اور ان کا دفاع بھی کرے۔

اس نکتے کا تکرار بھی ضروری ہے کہ وہ مشرکین جو مختلف بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں ان کا کبھی یہ عقیدہ نہیں ہوتا کہ بت پیدا کرتے ہیں اور وہ خالق ہیں بلکہ وہ بھی خلقت کو اللہ کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے: کیا ان نعمتوں کے خالق کے سامنے سجدہ کرنا چاہیے یا ان کے سامنے جو ایک ناچیز مخلوق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور جنھوں نے کبھی کسی چیز کو خلق نہیں کیا اور نہ وہ خلق کر سکتے ہیں۔

آخر میں اس بنا پر کہیں کوئی یہ خیال نہ کرے کہ نعمتِ الٰہی انھی چیزوں پر منحصر ہے، قرآن کہتا ہے: اور اگر خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو یہ تمھارے بس میں نہیں (وان تعدوا نعمۃ اللہ لاتحصوھا)۔

سرتاپا تمھارا وجود اس کی نعمتوں میں مستغرق ہے ہر سانس جو اندر اور باہر آتا ہے یہی دو نعمتیں نہیں۔ لمحہ بھر میں ہزاروں نعمتیں ہیں اور ہر نعمت پر ایک شکر واجب ہے ہماری عمر کے گذرنے والے ہر لمحے کے لیے ہمارے بدن کے اندر اور باہر لاکھوں زندہ اور بے جان موجود کام کرتے ہیں جن کی فعالیت کے بغیر لحظہ بھر کی زندگی ممکن نہیں۔

اصولاً ہم تمام نعمتوں سے آگاہ ہی نہیں۔ انسانی علم و دانش کا دامن جتنا پھیلتا جارہا ہے ان نعمتوں کے نئے افق ہم پر کھلتے جارہے ہیں ایسے افق کہ جو بے کنار ہیں کیا ان حالات میں ہم خدا کی نعمتیں شمار کر سکتے ہیں؟

اس وقت سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ہم کس طرح اس کے شکر کا حق اُدا کر سکتے ہیں اس حالت میں کیا ہم ناشکروں کے زُمرے میں نہیں آئیں گے؟

اس سوال کا جواب قرآن اس آیت کے آخری جملے میں دیتا ہے، کہتا ہے: خدا غفور و رحیم ہے۔ (ان اللہ لغفور رحیم)۔

جی ہاں! اللہ اس سے زیادہ مہربان اور بزرگوار ہے کہ اپنی نعمتوں پر شکر کی طاقت نہ ہونے پر تمھارا مواخذہ کرے اگر تم یہ جان لو کہ تم سرتاپا اس کی نعمت میں غرق ہو اور اس کا شکر ادا کرنے سے عاجز ہو اور اپنا عذرِ کوتاہی اس کی بارگاہ میں

پیش کرو تو تم نے اس کا بہت شکر ادا کیا ہے ——— ورنہ وہ شکر کہ جو اس کی خداوندی کے لائق ہے کوئی ادا نہیں کر سکتا ——— لیکن یہ سب کچھ اس میں مانع نہیں کہ ہم مقدور بھر اس کی نعمتوں کو شمار کریں کیونکہ جس قدر جہاں بینی اور جہاں شناسی میں اضافہ ہوتا جائے گا معرفتِ الٰہی میں بھی اضافہ ہوگا اور عشقِ الٰہی کا نور بھی دل میں زیادہ ضیا پاش ہوگا۔ اس کی نعمتوں پر غور ہمارے احساس شکر گذاری کو بھی متحرک کرتا ہے اسی لیے ہادیانِ دین اپنے ارشادات میں بلکہ اپنی دعاؤں اور مناجاتوں میں بھی اس کی کچھ بے پایاں نعمتوں کو بیان کیا کرتے تھے تاکہ دوسروں کے لیے سبق ہو۔

شکرِ نعمت کے بارے میں اور اس بارے میں کہ انسان پروردگار کی نعمتوں کو شمار نہیں کر سکتا ——— ہم سورۂ ابراہیم کی آیہ ۳۴ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں۔

راہ، نشانی اور رہبر

مندرجہ بالا آیات میں اگرچہ زمین کے راستوں کا ذکر ایک نعمتِ الٰہی کے طور پر آیا ہے کیونکہ راستے تمدنِ انسانی کی ترقی کا ذریعہ ہیں۔ اسی لیے ترقیاتی کاموں میں سب سے پہلے مناسب راستہ بنانے کی فکر کی جاتی ہے کیونکہ اس کے بغیر کسی قسم کی آبادکاری اور انسانی فعالیت ممکن نہیں۔

بہرحال ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے میں قرآن کا بیان انسان کی روحانی اور معنوی زندگی کے لیے نمونے کے طور پر ہو کیونکہ ہر مقدس ہدف تک پہنچنے کے لیے سب سے پہلے صحیح راستے کا انتخاب ضروری ہے تیز راستے کے علاوہ علامات اور نشانیوں کا وجود بھی زندگی کے لیے بہت اہم ہے کیونکہ ایک دوسرے سے مشابہ راستے بہت سے ہیں اور ان میں سے اصلی راستہ بھول جانا بہت ممکن ہے۔ ایسے موقع پر "علامات" کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

خصوصاً وہ مومنین جنھیں قرآن نے "متوسمین" (ہوشیار) کہا ہے انھیں چاہیے کہ ان نشانیوں پر گہری نظر رکھیں انھیں چاہیے کہ مکاتبِ مذاہب اور سنت و دعوت کو یہاں تک کہ اشخاص و افراد کو بھی نشانیوں کے حوالے سے پہچانیں اور حق کی نشانیوں کو دیکھ کر اسے باطل سے جدا طور پر پہچانیں۔

اسی طرح رہبر و رہنما کا مسئلہ بھی محتاجِ وضاحت نہیں۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی بہت سی روایات میں "نجم" سے رسول اللہ اور "علامات" سے ائمہ مراد لی گئی ہے۔ بعض روایات میں "نجم" اور "علامات" دونوں سے ائمہ اور ہادیان راہِ حق مراد لی گئی ہے ہم یہاں ان میں سے چند ایک احادیث کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ تفسیر علی بن ابراہیم میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے، آپ نے فرمایا:

النجم رسول الله و العلامات الائمة علیهم السلام

ستارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اور علامات ائمہ علیہم السلام کی طرف اشارہ ہے[1]۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۴۵۔

بعینہ یہی مضمون امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے بھی نقل ہوا ہے۔

۲۔ ایک اور حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں فرمایا:

نحن النجم

ہم ہیں ستارہ۔[1]

۳۔ ایک اور حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

انت نجم بنی هاشم

تم بنی ہاشم کا ستارہ ہو۔[2]

ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

انت احد العلامات

علامات میں سے ایک تم ہو۔[3]

یہ سب روایات مندرجہ بالا آیات کی معنوی تفسیر کی طرف اشارہ ہیں۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۴۵۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۴۵۔

[3] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۴۵۔

۱۹۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۝

۲۰۔ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝

۲۱۔ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝

۲۲۔ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝

۲۳۔ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۹۔ جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم اعلانیہ کرتے ہو اللہ سب کو جانتا ہے۔

۲۰۔ خدا کے علاوہ وہ جن معبودوں کو پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کو خلق نہیں کر سکتے بلکہ وہ تو خود مخلوق ہیں۔

۲۱۔ وہ بے جان موجودات ہیں جن میں زندگی کی کوئی رمق نہیں اور انھیں معلوم نہیں کہ ان کی عبادت کرنے والے کب محشور ہوں گے۔

۲۲۔ تمھارا معبود خدائے یکتا ہے لیکن جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل حق کا انکار کرتے ہیں اور وہ بڑے بن بیٹھے ہیں۔

۲۳۔ جسے وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں یقیناً خدا اس سب سے باخبر ہے۔ اور وہ مستکبرین کو پسند نہیں کرتا۔

تفسیر

مُردہ اور بے شعور معبود

گزشتہ آیات میں خدا کی ان دو نہایت اہم صفات کی طرف اشارہ تھا جن میں سے کوئی بھی بتوں اور تراشے ہوئے معبودوں میں نہیں تھی یعنی موجودات کا خالق ہونا اور نعمتیں عطا کرنا۔

زیرِ نظر پہلی آیت میں معبودِ حقیقی کی تیسری صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے علم اور دانائی۔ ارشاد ہوتا ہے:

جسے تم پنہاں رکھتے ہو اور جسے تم آشکار کرتے ہو خدا سب کو جانتا ہے (واللہ یعلم ما تسرون و ما تعلنون)۔

پھر تم بتوں کے پیچھے کیوں جاتے ہو کہ جن کا کائنات کی خالقیت میں ذرہ برابر بھی حصّہ نہیں، نہ جنھوں نے تمھیں کوئی چھوٹی سی چھوٹی نعمت بخشی ہے اور نہ جو تمھارے پوشیدہ اسرار اور ظاہری اعمال کو جانتے ہیں یہ کیسے معبود ہیں کہ جن میں ضرورت کی ایک بھی صفت نہیں۔

اس کے بعد قرآن دوبارہ مسئلۂ خالقیت کی طرف لوٹتا ہے لیکن اس کے مشابہ آنے والی پہلی آیت سے بات کچھ آگے کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جن معبودوں کو وہ پکارتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ کوئی چیز خلق نہیں کرتے بلکہ خود بھی مخلوق ہیں۔

(والذین یدعون من دون اللہ لا یخلقون شیئا و ھم یخلقون)۔

اب تک تو بحث اس بارے میں تھی کہ وہ خالق نہیں ہیں لہٰذا لائقِ عبادت نہیں ہو سکتے اب فرمایا گیا ہے کہ وہ تو خود مخلوق ہیں، نیازمند اور محتاج ہیں۔ اس صورت میں وہ انسانوں کا سہارا کیسے ہو سکتے ہیں۔ کس طرح ان کی مشکل کشائی کر سکتے ہیں؟ یہ کیسا احمقانہ فیصلہ ہے۔

علاوہ ازیں وہ تو "مردہ" ہیں۔ انھوں نے زندگی کی بُو تک نہیں سونگھی اور نہ اس کی استعداد رکھتے ہیں (اموات غیر احیاء)۔

کیا معبود کو موجودِ زندہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ جو اپنے عبادت کرنیوالوں کی نیاز، حاجت اور عبادت سے باخبر ہو۔ لہٰذا معبودِ حقیقی کی چوتھی صفت یعنی "حیات" بھی ان میں بالکل نہیں ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: یہ بت بالکل نہیں جانتے کہ ان کی عبادت کرنے والے کس وقت اور کس زمانے میں مبعوث ہوں گے (وما یشعرون ایان یبعثون)۔

ثواب و جزا ان کے ہاتھ میں ہوتی تو انھیں کم از کم اپنے عبادت گزاروں کے پھر سے جی اٹھنے کا تو پتہ ہوتا۔ اس جہالت کے ہوتے ہوئے وہ کس طرح لائقِ عبادت ہو سکتے ہیں۔ یہ پانچویں صفت ہے جو معبودِ حقیقی میں ہونا چاہیے جبکہ وہ اس سے محروم ہیں۔[1]

---

[1] "اموات غیر احیاء و ما یشعرون ایان یبعثون" اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے دیگر احتمالات بھی ذکر کیے ہیں (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اب تک ہم کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ بُت اور بُت پرستی کا قرآن کی منطق میں وسیع مفہوم ہے ہر موجود یا ہر شخص جسے ہم خدا کے بدلے سہارا قرار دے لیں اور اپنی تقدیر اس کے ہاتھ میں سمجھیں وہ ہمارا بُت شمار ہوگا لہٰذا جو کچھ مندرجہ بالا آیات میں آیا ہے وہ ان لوگوں کے بارے میں بھی ہے جو ظاہراً بُت پرست نہیں ہیں لیکن ایک سچے مومن کا سا استقلال نہیں رکھتے وہ جو کمزور بندوں کو اپنا سہارا بنائے ہوئے ہیں اور آزادی کی بجائے وابستگی اور دوسروں پر انحصار کی زندگی گزارتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ عالمی سوپر طاقتیں مشکلات میں ان کا سہارا بن سکتی ہیں جبکہ یہ طاقتیں جنہیں اور خدا سے بیگانہ ہیں ایسے لوگ بھی عملی طور پر بُت پرست اور مشرک ہیں اور ہمیں ان سے کہنا چاہیے کہ کیا تمہارے ان معبودوں نے کوئی چیز خلق کی ہے؟ کیا وہ کسی نعمت کا سرچشمہ ہیں؟ کیا یہ تمہارے اندرونی اسرار سے آگاہ ہیں۔

کیا وہ جانتے ہیں کہ تم کب اپنی قبروں سے اٹھو گے کہ تمہیں تمہاری جزا یا سزا دے سکیں۔ پس کیوں ان کی بتوں کی سی پرستش کرتے ہو۔

بتوں کی صلاحیت کی نفی پر ان واضح دلائل کے بعد نتیجہ اخذ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: تمہارا اللہ الٰہِ واحد ہی ہے (الٰھکم الٰہ واحد)۔ مبداء و معاد چونکہ ہر جگہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں لہٰذا بلا فاصلہ مزید فرمایا گیا ہے وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (اور فطرتاً مبداء کے بارے میں بھی ٹھیک ایمان نہیں رکھتے) ان کے دل حقیقت کے منکر ہیں اور وہ حق کے مقابلے میں مستکبر بنے ہوئے ہیں (فالذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ قلوبھم منکرۃ وھم مستکبرون)۔[1]

ورنہ توحید کے دلائل تو متلاشیانِ حق کے لیے اور حقیقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والوں کے لیے آشکار ہیں۔ اسی طرح معاد کے دلائل بھی واضح ہیں۔ استکبار و تکبر اور حق کے سامنے سر نہ جھکانے کے سبب وہ ہمیشہ انکار ہی کرتے ہیں یہاں تک کہ حسی حقائق کے بھی منکر ہو جاتے ہیں۔

یہاں تک کہ ان کا یہ طرزِ عمل ان میں رچ بس جاتا ہے اور اس عادت کے ہوتے ہوئے حق کی کوئی بات اور دلیل و منطق ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

بُت پرستش کے لائق نہیں اس سلسلے میں گذشتہ آیات میں جو زندہ دلائل گزر چکے ہیں کیا وہ کافی نہیں کہ ہر ذی شعور تصدیق کرے کہ بُت لائق عبادت نہیں لیکن انتہائی تعجب کی بات ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ پھر بھی حقیقت قبول نہیں کرتے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) ان میں سے ایک کے مطابق یہاں مراد یہ ہے کہ بُت نہیں جانتے کہ وہ کب مبعوث ہوں گے اس سلسلے میں مفسرین نے بعض آیات سے شواہد بھی پیش کیے ہیں۔ سورۂ انبیاء کی آیت ۹۸ میں خدا فرماتا ہے:

مشرکین اور ان کے بُت دونوں ہی جہنم میں ہوں گے۔

لیکن واضح ہے کہ اگر یہ مراد ہو تو پہلے اور بعد کی آیات میں مناسب ربط نہیں ہوگا لہٰذا صحیح تفسیر وہی ہے جو ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں (غور کیجیے گا)۔

[1] جیسا کہ ہم جانتے ہیں "فالذین لا یؤمنون" میں "ف" تفریع کے لیے ہے۔ قیامت و مبعوث ہونے کا انکار مبداء کے انکار کی وجہ سے ہے اور اس کا سرچشمہ استکبار ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں ہم پھر دیکھتے ہیں۔ غیب و شہود اور پنہاں و آشکار پر خدا کی آگاہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے: جسے تم پنہاں رکھتے ہو اور جسے تم آشکار کرتے ہو یقیناً خدا اس سے باخبر ہے (لا جرم ان اللہ یعلم ما یسرون وما یعلنون)۔

یہ جملہ درحقیقت کفار اور دشمنانِ حق کے لیے ایک دھمکی ہے کہ خدا تمہاری حالت سے ہرگز غافل نہیں ہے وہ نہ صرف ان کے ظاہر کو جانتا ہے بلکہ ان کے باطن سے بھی آگاہ ہے اور موقع آنے پر ان سے حساب لے گا۔

وہ مستکبر ہیں اور "خدا مستکبرین کو پسند نہیں کرتا" (انہ لا یحب المستکبرین) کیونکہ حق کے سامنے استکبار اور تکبر خدا سے بیگانگی کی پہلی دلیل ہے۔

لفظ "لا جرم" "لا" اور "جرم" کا مرکب ہے یہ لفظ عام طور پر تاکید کے لیے اور قطعاً اور یقیناً کے معنی میں آتا ہے اور کبھی "لابد" (ناچار) کے معنی میں آتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات قسم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں:

لا جرم لا فعلن

میں قسم کھاتا ہوں کہ یہ کام کروں گا۔

رہا یہ سوال کہ "لا جرم" سے یہ معانی کیسے معلوم ہوتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ "جرم" دراصل درخت سے پھل چننے اور توڑنے کے معنی میں ہے اور جب اس کے شروع میں "لا" لگا دیا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہو جاتا ہے کہ کوئی چیز اسے توڑ اور کاٹ نہیں سکتی اس طرح اس سے مسلماً، ناچار اور کبھی قسم کا مفہوم حاصل سمجھا جاتا ہے۔

مستکبر کون ہیں؟

قرآن مجید کی چند آیات میں "استکبار" کفار کی ایک خاص صفت کے عنوان سے استعمال ہوا ہے ان سب آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد "تکبر" کرتے ہوئے حق کو قبول نہ کرنا ہے۔ سورۂ نوح کی آیہ ۷ میں ہے:

وانی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اذانھم واستغشوا ثیابھم واصروا واستکبروا استکبارًا

میں جب بھی اس بے ایمان گروہ کو دعوت دیتا ہوں تاکہ تیری عفو و بخشش ان کے شامل حال ہو تو اس دعوت پر وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور اپنے آپ کو اپنے لباس کے نیچے چھپا لیتے ہیں اور گمراہی پر اصرار کرتے ہیں اور حق کے سامنے استکبار کرتے ہیں۔

نیز سورۂ منافقین کی آیہ ۵ میں ہے:

واذا قیل لھم تعالوا یستغفر لکم رسول اللہ لوّوا رءوسھم ورایتھم یصدّون وھم مستکبرون

اور جب ان سے کہو کہ آؤ تا کہ اللہ کا رسول تمہارے لیے بخشش و مغفرت طلب کرے تو وہ نافرمانی کرتے ہیں اور تم دیکھو گے کہ وہ لوگوں کو راہ حق سے روکتے ہیں اور استکبار کرتے ہیں۔

اور سورۂ جاثیہ کی آیہ ۸ میں اسی گروہ کے بارے میں ہے:

یسمع ایات اللہ تتلی علیہ ثم یصر مستکبرا کان لم یسمعہا

اللہ کی آیات انہیں سنائی جاتی ہیں وہ سنتے ہیں لیکن اس کے باوجود کفر پر اس طرح سے اصرار کرتے ہیں گویا انہوں نے یہ آیات سنی ہی نہیں۔

درحقیقت بدترین استکبار یہی ہے کہ حق کو قبول کرنے کی بجائے تکبر کیا جائے کیونکہ یہ تکبر ہدایت کے تمام راستے انسان کے سامنے بند کر دیتا ہے اور وہ ساری عمر بدبختی، گناہ اور بے ایمانی میں گرفتار رہتا ہے۔

نہج البلاغہ کے خطبہ قاصعہ میں حضرت علیؑ نے صراحت سے شیطان کو "سلف المستکبرین" (تکبر کرنے والوں کا سربراہ) قرار دیا ہے کیونکہ اس نے پہلا قدم ہی اٹھایا کہ حق کی مخالفت کی اور اس حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا کہ آدمؑ اس سے زیادہ کامل ہیں اسی طرح وہ تمام افراد جو حق کو قبول کرنے سے منہ پھیر لیتے ہیں مالی طور پر تہی دست ہوں یا دولتمند وہ متکبر ہیں لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اکثر اوقات زیادہ مالی طاقت ہی کے سبب انسان حق کو قبول کرنے سے روگردانی کرتا ہے۔

روضۃ الکافی میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

ومن ذھب یری ان لہ علی الاخر فضلا فھو من المستکبرین، فقلت انما یری ان لہ علیہ فضلا بالعافیۃ اذا راہ مرتکبا للمعاصی؟ فقال ھیھات ھیھات! فلعلہ ان یکون قد غفر لہ ما اتی، وانت موقوف تحاسب، اما تلوت قصۃ سحرۃ موسٰی (ع)۔

جو شخص دوسرے پر برتری اور امتیاز کا قائل ہو وہ متکبرین میں سے ہے۔

راوی کہتا ہے: میں نے امام سے پوچھا کیا اس میں کوئی حرج ہے کہ انسان کسی کو گناہ میں مشغول دیکھے اور خود اس نے چونکہ گناہ کا ارتکاب نہیں کیا لہٰذا اس پر اپنی برتری اور امتیاز سمجھے؟

امام نے فرمایا:

تو نے اشتباہ اور غلطی کی ہے ہو سکتا ہے کہ خدا بعد از اں اس کا گناہ بخشش دے اور تجھے حساب کے لیے ٹھہرا رکھے۔ کیا تو نے قرآن میں زمانہ موسٰیؑ کے جادوگروں کا قصہ نہیں پڑھا کہ وہ فرعون کے انعام و اکرام کی خاطر اور اس کے دربار میں تقرب حاصل کرنے کے لیے: اللہ کے ایک اولوالعزم پیغمبر کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے تیار

ہو گئے۔ لیکن جونہی انھوں نے حق کا چہرہ دیکھا فوڑا اپنا راستہ بدل لیا یہاں تک کہ فرعون کی طرف سے قتل کی دھمکیاں سن کر بھی وہ ڈٹے رہے اور خدا تعالٰی نے انھیں اپنی عفو بخشش اور رحمت و مہربانی سے نوازا[1]

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۴۰۔

۲۴۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۙ ○

۲۵۔ لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ○ ع

۲۶۔ قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ○

۲۷۔ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِىَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْىَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۙ ○

۲۸۔ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِىْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

۲۹۔ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ○

ترجمہ

۲۴۔ اور جس وقت ان سے کہا جاتا ہے کہ تمھارے پروردگار نے کیا چیز نازل کی ہے تو وہ کہتے ہیں یہ (خدائی وحی نہیں) یہ تو گذشتہ لوگوں کے جھوٹے افسانے ہیں۔

۲۵۔ روز قیامت ان کے گناہوں کا بوجھ انھیں پوری طرح اپنے کندھے پر اٹھانا ہوگا اور ان لوگوں کے گناہوں کا ایک حصّہ بھی جنھیں انھوں نے جہالت کی وجہ سے گمراہ کیا ہے۔ جان لو کہ اپنے کندھے پر بڑا سنگین بوجھ اٹھاتے ہیں۔

۲۶۔ جو لوگ ان سے پہلے تھے وہ (بھی) اس قسم کی سازشیں کرتے تھے لیکن خدا ان کی (زندگی) کی بنیاد کی طرف گیا اور اسے بنیاد سے اکھاڑ پھینکا اور اوپر سے ان کے سروں پر چھت گرائی اور (اللہ کا) عذاب ان پر اُدھر سے آیا جہاں سے وہ نہیں جانتے تھے۔

۲۷۔ پھر قیامت کے دن خدا انھیں رسوا کرے گا اور انھیں کہے گا کہ تم نے جو میرے شریک بنا رکھے تھے کہ جن کی وجہ سے دوسروں کے ساتھ تم دشمنی کرتے تھے وہ کہاں ہیں۔ اس وقت اہلِ علم کہیں گے کہ آج کے دن رسوائی اور بدبختی کافروں کے لیے ہے۔

۲۸۔ (روح قبض کرنے والے) فرشتے ان کی روح اس حالت میں قبض کریں گے کہ انھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہوگا۔ اس وقت وہ سر جھکا لیں گے۔ (اور کہیں گے کہ) ہم بُرے کام نہیں کرتے تھے۔ جی ہاں! جو کچھ تم انجام دیتے تھے خدا اسے جانتا ہے۔

۲۹۔ اب جہنم کے دروازوں میں سے داخل ہو جاؤ وہ اس عالم میں ہمیشہ اس میں رہیں گے یہ مستکبرین کے لیے کیسا بُرا ٹھکانا ہے۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ بعض روایات کے مطابق پہلی آیت "مقتسمین" (تبعیض کرنے والوں) کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن کے متعلق پہلے بحث ہو چکی ہے۔

یہ سولہ افراد تھے۔ ان کے چار گروپ تھے ان میں سے چار افراد حج کے دنوں میں مکہ کی سڑک پر لوگوں کے راستے میں کھڑے ہو جاتے تھے تاکہ مکہ میں لوگوں کے داخل ہونے سے پہلے ان کے ذہنوں کو قرآن اور اسلام کے خلاف کر دیں وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کوئی نیا دین نہیں لایا بلکہ وہی پرانے لوگوں کے جھوٹے افسانے ہیں۔

تفسیر

جو دوسروں کے گناہ اپنے کندھے پر لاد لیتے ہیں

گذشتہ آیات میں ان مستکبرین کے بارے میں گفتگو تھی جو کبھی بھی حق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح حق کو قبول کرنے سے بچ جائیں۔

زیر نظر آیات میں اس بے ایمان گروہ کی دائمی منطق بیان کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے کیا چیز نازل کی ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی وحی نہیں ہے یہ تو وہی اگلے لوگوں کے افسانے ہیں۔

(و اذا قیل لهم ماذا انزل ربکم قالوا اساطیر الاولین)۔

اس تکلیف دہ بات کے ساتھ دو باتیں وہ اور بھی کہتے۔ پہلی یہ کہ ہماری سطح فکر ان مسائل سے بہت بلند ہے یہ باتیں تو افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں جو عوام کو مشغول رکھنے کے لیے گھڑی گئی ہیں۔ دوسری یہ کہ یہ کوئی نئی باتیں نہیں ہیں کیونکہ یہ پہلا موقع نہیں کہ کوئی انسان ایسی باتیں سناۓ کہ ہم کہیں کہ محمد نے کوئی ایجاد کی ہے یا کوئی اپنی نئی تخلیق کی ہے یہ تو انھی گذشتہ لوگوں کی فضول باتوں کا تکرار ہے۔ "اساطیر" "اسطورۃ"[1] کی جمع ہے یہ لفظ فضول اور جھوٹے قصے کہانیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ نو مرتبہ انبیاء کے مقابلے میں بے ایمان کافروں کی زبانی نقل ہوا ہے وہ لوگ اکثر اوقات ہادیانِ الٰہی کی دعوت کے جواب میں اپنی مخالفت کی توجیہ اور بہانے کے لیے اس لفظ کا سہارا لیتے تھے تعجب کی بات یہ ہے کہ ہمیشہ لفظ "اساطیر" کے ساتھ "اولین" کو بھی صفت کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ تاکہ ثابت کریں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے یہاں تک کہ کبھی تو یہ بھی کہتے کہ:

یہ کوئی اہم چیز نہیں ہے ہم بھی اگر چاہیں تو ان جیسی باتیں کر سکتے ہیں۔

(انفال ــــ ۳۱)

یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ آج کے مستکبرین بھی اکثر اوقات حق سے فرار کرتے ہوئے تکلیف و اذیت دینے کے لیے نیز دوسروں کو گمراہ کرنے کے لیے ایسی ہی باتیں کرتے ہیں یہاں تک کہ انھوں نے معاشرہ شناسی کے نام پر کتابیں لکھی ہیں اور اپنے ان نظریات کو علمی شکل میں پیش کیا ہے انھوں نے مذہب کو انسانی جہالت کی پیداوار اور مذہبی تفاسیر و تشریحات کو افسانے اور قصے کہانیاں قرار دیا ہے لیکن اگر ان کی فکر کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسئلہ کچھ اور ہے اور یہ لوگ فضول اور جعلی مذاہب کے خلاف مصروفِ جنگ نہیں بلکہ یہ خود ان کی پیدائش اور نشر و اشاعت کے حامل ہیں۔ ان کی

---

[1] بعض اسے جمع الجمع سمجھتے ہیں ان کے مطابق "اساطیر" "اسطار" کی جمع ہے اور "اسطار" "سطر" کی جمع ہے بعض کا نظریہ ہے کہ "اساطیر" وہ جمع ہے کہ جس کا مفرد اس کی جنس میں سے نہیں ہے لیکن مشہور وہی ہے جو ہم نے متن تفسیر میں بیان کیا ہے۔

مخالفت صرف سچے مذاہب کے ساتھ ہے کہ جو انسانی افکار کو بیدار کرتے ہیں۔ سامراج و استعمار کی زنجیریں توڑتے ہیں اور جو مستکبرین اور استعمار گروں کے لیے سدِ راہ ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ مذہبی تعلیمات ان کے منصوبوں کے خلاف ہیں کیونکہ وہ عدل و انصاف کے اصول پر مبنی ہیں اور تفریق ظلم اور ہر قسم کی خود غرضی کے خلاف جنگ کرتی ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی آرزوؤں کے برخلاف مذہب کے اخلاقی احکام سرکش ہوا و ہوس اور بے سر و پا آزادیوں سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ان سب پہلوؤں کو جب وہ مجموعی طور پر دیکھتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ اس رکاوٹ کو راستے سے ہٹادیں یقیناً اپنے اس کام کے لیے انھیں ایک جواب کی بھی ضرورت ہے جو وہ لوگوں کو دے سکیں لہٰذا ان کے لیے اس سے بہتر کون سا جواب ہے کہ ان تعلیمات کو جھوٹے افسانے قرار دے لیں۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں کو کامیاب کرنے میں ان خرافات کا بہت ہاتھ ہے جنھیں بعض اوقات نادان اور ناآگاہ افراد گھڑتے ہیں اور انھیں مذہب کے سانچے میں ڈھال کر مذہب کے نام پر پیش کرتے ہیں۔

مذہب کے تمام حقیقی طرفداروں پر لازم ہے کہ وہ ایسی خرافات کا شدت سے مقابلہ کریں اور ان کے خلاف جنگ کریں اور دشمنوں کو غیر مسلح کر دیں یہ حقیقت ہر جگہ لکھیں اور کہیں کہ اس قسم کی خرافات کا سچے مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور دشمن کو انھیں سند نہیں بنانا چاہیے۔ اصول عقائد اور مسائل عملی کے بارے میں انبیاء کی تعلیمات عقل و منطق سے اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ ان کے لیے اس قسم کی تہمتوں کی کوئی گنجائش نہیں۔

اگلی آیت میں ان دل کے اندھوں کے اعمال کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: روز قیامت یہ لوگ اپنے گناہوں کا بوجھ پوری طرح اپنے دوش پر اٹھائیں گے اور ایک حصہ ان لوگوں کے گناہوں کا بھی کہ جنھیں جہالت کی وجہ سے انھوں نے گمراہ کیا ہے (لیحملوا اوزارھم کاملة یوم القیٰمة ومن اوزار الذین یضلونھم بغیر علم)۔

جان لو کہ وہ بدترین بوجھ اور ذمہ داری اپنے کندھے پر اٹھائے ہوں گے (الا ساء ما یزرون)۔ کیونکہ بعض اوقات ان کی گفتگو ہزاروں افراد کی گمراہی کا سبب بن جاتی ہے۔

کس قدر دشوار ہے کہ انسان اپنے گناہوں کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھائے ہزاروں دوسرے افراد کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائے اور اگر ان کی گمراہ کن باتیں بعد کی نسلوں کی گمراہی کا سرچشمہ بن جائیں تو ان کا بوجھ بھی ان کے کندھے پر پڑے گا۔

"لیحملوا" (چاہیے کہ اس بوجھ کو کندھے پر اٹھائیں) ــــــــ یہ لفظ صیغہ امر کی شکل میں ہے جس کا مقصد نتیجہ اور انجام کار بیان کرنا ہے یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہم کسی سے کہیں کہ اب جبکہ یہ غلط کام تو نے انجام دیا ہے تو اس کا نتیجہ بھی بھگتو اور اس کی تلخی بھی چکھو۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ "لیحملوا" کی لام، لام عاقبت ہے۔

"اوزار" "وزر" کی جمع ہے اس کا معنی ہے بھاری بوجھ۔ یہ لفظ گناہ کے معنی میں بھی آیا ہے اور یہ جو "وزیر" کو "وزیر" کہا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے کندھوں پر بھاری ذمہ داری ہوتی ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن کس طرح کہتا ہے کہ کچھ ان افراد کے گناہوں کا بوجھ بھی اپنے کندھے پر اٹھاتے ہیں جنہیں انھوں نے گمراہ کیا ہے۔

قرآن نے یہ نہیں کہا کہ "ان کے تمام گناہ" حالانکہ روایات میں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بُرے کام کی بنیاد رکھے تو جتنے لوگوں نے اس پر عمل کیا ان سب کا گناہ بنیاد رکھنے والے کے کندھے پر ہوگا۔

بعض مفسرین نے اس سوال کے جواب میں کہا ہے کہ گمراہ پیروکاروں کے دو قسم کے گناہ ہوتے ہیں ایک وہ کہ جن کا ارتکاب وہ اپنے رہبروں کی پیروی میں کرتے ہیں اور دوسرے وہ کہ جو وہ خود سے بجالاتے ہیں جبکہ رہبروں کے کندھے پر پہلی قسم کے گناہوں کا بوجھ ہے۔

بعض نے مندرجہ بالا آیت میں لفظ "من" کو تبعیض کے لیے نہیں لیا بلکہ "من" کو اس بات کا بیان سمجھا ہے کہ پیروکاروں کے گناہ رہبروں کے دوش پر ہیں۔

لیکن ایک اور تفسیر بھی نظر آتی ہے جو ان سب سے زیادہ دلچسپ ہے اور وہ یہ کہ گمراہ پیروکاروں کی دو حالتیں ہیں، بعض اوقات وہ جانتے بوجھتے ہوئے ان منحرف اور کج رو رہبروں کے پیچھے جاتے ہیں اور اس کی مثالیں پوری تاریخ میں بہت ہیں اس صورت میں گناہ کا عامل رہبروں کا حکم بھی ہے اور ان کا اپنا ارادہ بھی۔ یہ وہ مقام کہ جہاں ان کے گناہوں کی ذمہ داری کا ایک حصہ رہبروں کے کندھے پر ہے۔ (بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں سے کسی چیز کی کمی ہو)۔

لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پیروکار مائل و راغب نہیں ہوتے بلکہ انھیں غفلت میں ڈالا جاتا ہے اور وہ گمراہ رہبروں کے وسوسوں کا شکار ہو جاتے ہیں بہت سے معاشروں میں عوام میں اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں ہو سکتا ہے کبھی وہ ایسے کاموں میں " تقرب الی اللہ " کی نیت سے شریک ہوں اس صورت میں ان کے تمام گناہوں کا بوجھ گمراہ پیشواؤں کے کندھے پر ہے اور اگر ایسے پیروکاروں نے تحقیق میں کوتاہی نہ کی ہو تو جوابدہ نہیں ہیں لیکن وہ لوگ کہ جنھوں نے علم و آگہی کے ہوتے ہوئے گمراہ پیشواؤں کی پیروی کی یقیناً ان کے گناہوں میں سے سوئی کے سرے کے برابر بھی کمی نہیں کی جائے گی جبکہ ان کے پیشواؤں کے کندھے پر بھی ذمہ داری کا ایک حصہ لادا جائے گا۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ "بغیر علم" کے الفاظ اس بات کی دلیل نہیں کہ ان گمراہوں کے پیروکار اپنے رہبروں کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے اور وہ بالکل ہی غافل تھے کہ اس طرح ان کی کوئی ذاتی ذمہ داری ہی نہ ہو بلکہ یہ تعبیر اس بات کی طرح ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ جاہل و نادان افراد اغوا کرنے والوں کے جال میں جلدی سے پھنس جاتے ہیں لیکن دانا اور سمجھدار لوگ بہت دیر میں۔

اسی لیے قرآن نے دوسری آیات میں ان پیروکاروں کو بری الذمہ نہیں قرار دیا بلکہ ذمہ داری کا ایک حصہ ان کے کندھے پر رکھا ہے چنانچہ سورۂ مومن کی آیہ ۴۷ اور ۴۸ میں ہے:

واذ یتحاجون فی النار فیقول الضعفاء للذین استکبروا انا کنا لکم تبعا فھل انتم مغنون عنا نصیبا من النار ٭ قال الذین استکبروا انا کل فیھا ان اللہ قد حکم بین العباد

گمراہ کرنے والے اور گمراہ ہونے والے آپس میں دوزخ میں بحث و مباحثہ اور جھگڑا کریں گے نادان اور کمزور پیروکار ، مستکبرین سے کہیں گے ہم تمھارے پیرو تھے تو کیا آگ کا کچھ حصہ ہماری طرف سے تم قبول کرو گے وہ جواب میں کہیں گے : ہم سب دوزخ میں ہیں خدا نے اپنے بندوں میں (عادلانہ) فیصلہ کیا ہے ۔

بعد والی آیت میں یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ پہلا موقع نہیں کہ مستکبرین ہادیانِ الٰہی پر تہمت لگا رہے ہیں اور آسمانی وحی کو "اساطیر الاولین" (پہلے لوگوں کے افسانے) شمار کرتے ہیں بلکہ ان سے پہلے والے بھی ایسی سازشیں کرتے تھے لیکن خدا ان کی زندگی کی بنیاد کی طرف گیا اور اسے بنیاد سے اکھیڑ دیا اور اوپر سے ان کے سروں پر چھت گرا دی (قد مکر الذین من قبلھم فاتی اللہ بنیانھم من القواعد فخر علیھم السقف من فوقھم)۔

اور عذابِ الٰہی ادھر سے ان کی طرف آیا جدھر کا انھیں وہم و گمان بھی نہ تھا (و اتاھم العذاب من حیث لا یشعرون)۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر نمرود کے ایک واقعے کی ہے اس نے ایک عمارت بنائی تھی تاکہ آسمان کی طرف چڑھ کر آسمانی خدا سے مقابلہ کرے ۔

بعض دیگر مفسرین نے اسے بخت النصر کے واقعہ کی طرف اشارہ قرار دیا ہے ۔

لیکن مسلم ہے کہ آیت کا مفہوم عام ہے اور اس میں تمام مستکبر اور گمراہ رہبر شامل ہیں ۔

یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ خدا ان مستکبرین کے منصوبوں کو ناکام بنانے کے لیے ان کی عمارت کے سامنے کے حصے کی طرف سے اقدام نہیں کرتا بلکہ ان کی جڑ اکھاڑنے اور بیخ کنی کے لیے اقدام کرتا ہے اور چھتوں کو ان کے سروں پر گراتا ہے جی ہاں ایسے لوگوں کے لیے خدائی سزا ایسی ہی ہوتی ہے ۔

عمارت کو بنیاد سے اکھاڑ پھینکنا اور چھت کو نیچے گراتا ہو سکتا ہے ظاہری طور پر عمارتوں اور ان کی چھتوں کی طرف اشارہ ہو کہ جو زلزلوں اور بجلیاں گرنے سے تباہ و برباد ہو جائیں اور ان کے سروں پر آ گریں یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے اداروں اور ڈویلپمنٹ کی طرف اشارہ ہو کہ جو حکمِ خدا سے جڑ سے اکھاڑ پھینکی گئیں اور تباہ و برباد ہو گئیں ۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ آیت دونوں معانی کی طرف اشارہ ہو ۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن لفظ "سقف" کے بعد "من فوقھم" کہتا ہے حالانکہ مسلم ہے کہ چھت ہمیشہ اوپر کی طرف ہوتی ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تاکید کے لیے بھی ہو اور یہ نکتہ بیان کرنا مقصود ہو کہ بعض اوقات چھت تو نیچے

لیکن صاحب خانہ چھت کے نیچے نہ ہو جب کہ ان ظالموں پر چھت گری تو وہ اس کے نیچے تھے اور وہ نابود ہو گئے آج کی اور گذشتہ تاریخ میں اس خدائی سزا کے کس قدر مناظر موجود ہیں۔

کتنی طاقت ور اور جابر حکمران ہیں جو اپنے محلِ اقتدار کو اس قدر مستحکم سمجھتے تھے کہ انھوں نے صرف اپنے لیے بلکہ اپنی اولاد کے مستقبل کے لیے بھی اس کے منصوبے بنا رکھے تھے ان کے پروگرام مکمل تھے اور ظاہراً انھوں نے اپنے اقتدار اور نظام کی بقا اور حفاظت کے پورے انتظامات کر رکھے تھے لیکن اچانک اس طرف سے عذابِ الٰہی ان کی طرف آیا جدھر سے وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے اور ان کے اقتدار کی چھت ان کے سر پر آ گری اور وہ یوں نابود اور منتشر ہو گئے گویا کبھی صفحۂ ارض پر وہ تھے ہی نہیں۔

جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان کے لیے دنیاوی عذاب ہے لیکن ان کی سزائیں یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے بعد روزِ قیامت بھی خدا انھیں رسوا کرے گا (ثم یوم القیامة یخزیھم) وہاں ان سے پوچھے گا اور کہے گا کہاں ہیں تمھارے وہ شریک جو تم نے میرے لیے بنائے تھے اور ان سے تمھیں بڑی عقیدت تھی اور ان کی وجہ سے تم دوسروں سے جنگ و جدال کرتے تھے بلکہ دشمنی پر تل جاتے تھے" (و یقول این شرکائی الذین کنتم تشاقون فیھم)۔[1]

یقیناً اس سوال کا جواب ان کے پاس نہیں ہے لیکن اس موقع پر اہلِ علم لب کشائی کریں گے اور کہیں گے۔ شرمندگی، رسوائی اور بدبختی آج کے دن کفار کے لیے ہے۔ (قال الذین اوتوا العلم ان الخزی الیوم و السوء علی الکافرین)۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ روزِ قیامت گفتگو علماء کریں گے کیونکہ اس عظیم بارگاہ میں ایسی گفتگو کرنا چاہیے جس میں کوئی غلطی نہ ہو اور ایسا اہلِ ایمان علماء کے سوا کسی سے نہیں ہو سکتا۔ یہ جو بعض روایات میں اس سے مراد آئمہ اہلِ بیت لیے گئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ با ایمان علماء کا بہترین مصداق ہیں۔[2]

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ مشرکین اور علماء کے درمیان اس سوال و جواب کا رد و بدل کسی پنہاں بات کو ظاہر کرنے کے لیے نہیں بلکہ یہ بھی مشرکین کے لیے ایک قسم کی نفسیاتی سزا اور عذاب ہے خصوصاً آگاہ مومنین اس جہان میں ہمیشہ ان مغرور مشرکین کی ملامت کا نشانہ بنتے رہے تھے اور وہاں یہ مغرور اپنی سزا بھی اسی کیفیت سے پائیں گے انھیں بھی ملامت کی جائے گی جبکہ وہ ایسی جگہ پر ہوں گے جہاں نہ وہ انکار کر سکتے ہوں گے اور نہ وہاں سے نکل سکتے ہوں گے۔

گذشتہ آیت کے آخر میں جن کفار کا ذکر تھا اگلی آیت کے بارے میں انھی کا ذکر ہے یہ ذکر دراصل ایک ہلا دینے والا اور غافل افراد کو بیدار کرنے والا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وہ ایسے لوگ ہیں کہ موت کے فرشتے اس عالم میں ان کی روحیں قبض کرتے ہیں جبکہ انھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہوتا ہے (الذین تتوفٰھم الملائکة ظالمی انفسھم)۔

---

[1] "تشاقون" "شقاق" کے مادہ سے مخالفت اور دشمنی کے معنی میں ہے اور اس کی اصل "شق" ہے — ٹکڑے اور شگافتہ کرنے کے معنی میں آیا ہے۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۵۰ کی طرف رجوع فرمائیں۔

انسان جو ظلم و ستم کرتا ہے، پہلے مرحلے میں وہ خود اسی پر ہوتا ہے اور دوسروں کے گھر سے پہلے وہ اپنا ہی گھر ویران کرتا ہے کیونکہ ظلم کا پہلا قدم یہ ہے کہ خود ظلم کرنے والے کی باطنی خوبیاں اور اس کی اپنی اچھی صفات برباد ہو جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں جس معاشرے میں ظلم کی بنیاد رکھی جائے اجتماعی و معاشرتی رشتوں کے حوالے سے چکر لگاتا ہوا وہ ظلم خود ظالم کے گھر کی طرف پلٹ آتا ہے۔

لیکن یہ ظالم جب اپنے آپ کو موت کی چوکھٹ پر دیکھتے ہیں اور غرور و غفلت کے پردے ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹتے ہیں تو وہ فوراً مان لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے بُرا کام انجام دیا ہے (فالقوا السلم ما کنا نعمل من سوء)۔

وہ ہر قسم کے بُرے کام کا انکار کیونکر کریں گے؟ کیا وہ جھوٹ بولیں گے، اس لیے کہ بار بار جھوٹ بولنے کی وجہ سے جھوٹ ان کی ذاتی صفت بن گیا ہے یا کیا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ ہم نے یہ کام انجام دیے ہیں لیکن ہم سے غلطی ہو گئی ہے اگرچہ ہماری نیت بُری نہیں تھی۔ ممکن ہے دونوں وجوہ ہوں۔

مگر ان سے فوراً کہا جائے گا کہ تم جھوٹ بولتے ہو تم نے بہت سے بُرے کام کیے ہیں۔ جی ہاں! اللہ تمہارے اعمال اور اسی طرح تمہاری نیتوں سے باخبر ہے (بلیٰ ان اللہ علیم بما کنتم تعملون)۔ لہٰذا اب انکار کرنے اور بہانے بنانے کی گنجائش نہیں۔

اب جبکہ ایسا ہے تو جہنم کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ کہ تم نے اس میں ہمیشہ کے لیے رہنا ہے (فادخلوا ابواب جھنم خالدین فیھا)۔ متکبرین کا ٹھکانا کس قدر بُرا ہے (فلبئس مثوی المتکبرین)۔

چند اہم نکات

۱۔ **اچھی اور بُری سُنّت:** ایک عمل انجام سے پہلے کئی مرحلوں سے گزرتا ہے اس میں رہبروں، ہدایت کرنے والوں یا وسوسے ڈالنے والوں کا اثر بھی اہمیت رکھتا ہے اسی طرح اچھی یا بُری سنتیں اور رسمیں بھی اعمال کے لیے فکری اور معاشرتی اعتبار سے زمین ہموار کرتی ہیں اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اوقات رہبروں اور کسی کام کی بنیاد رکھنے والوں کا اثر دیگر تمام عوامل سے زیادہ ہوتا ہے لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ وہ برائیوں یا نیکیوں میں شریک نہ ہوں اسی منطق کی رو سے قرآنی آیات اور اسلامی روایات میں نیکی یا بدی کی بنیاد رکھنے یا اچھی بُری سنت قائم کرنے کے مسئلہ کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ گمراہ اور گمراہ کنندہ متکبر اپنے گناہوں کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر رکھتے ہیں اور ایک حصّہ اپنے پیروکاروں کے گناہوں کا بھی (بغیر اس کے کہ پیروکاروں کی ذمہ داری میں کوئی کمی واقع ہو)۔

یہ بات اس قدر اہم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

الدال علی الخیر کفاعلہ

نیکی کی دعوت دینے والا نیکی کرنے والے کی طرح ہے[۱]

---

[۱] وسائل الشیعہ جلد ۱۱ ص ۴۳۶۔

زیرِ بحث آیت کے ذیل میں رسول اللہؐ سے منقول حدیث میں ہے آپ نے فرمایا:

ایما داع دعی الی الهدی فاتبع، فله مثل اجورهم، من غیر ان ینقص من اجورهم شیئاً وایما داع دعی الی ضلالة فاتبع علیه فان علیه مثل اوزار من اتبعه، من غیر ان ینقص من اوزارهم شیئاً۔

جو شخص ہدایت کی دعوت دے اس کا اجر اس ہدایت پر عمل کرنے والوں جتنا ہوگا جبکہ عمل کرنے والوں کے ثواب میں بھی کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور جو شخص گمراہی کی دعوت دے گا اسے اس کے پیروکاروں جتنی سزا ملے گی جبکہ پیروکاروں کی سزا میں بھی کوئی تخفیف نہ ہوگی۔[1]

امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

من استن بسنة عدل فاتبع کان له اجر من عمل بها، من غیر ان ینتقص من اجورهم شیٔ ومن استن سنة جور فاتبع کان علیه مثل وزر من عمل به، من غیر ان ینتقص من اوزارهم شیٔ

جو شخص کسی اچھی سُنّت کی بنیاد رکھے اور لوگ اس کی پیروی کریں تو اس کا اجر پیروی کرنے والوں جتنا ہوگا جبکہ خود عمل کرنے والوں کا اجر بھی کم نہ ہوگا اور جو شخص کسی ظلم و جور کی بنیاد رکھے اور لوگ اس کی پیروی کریں تو اس کا گناہ عمل کرنے والوں جتنا ہوگا جبکہ عمل کرنے والوں کے گناہوں میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی۔[2]

اس مضمون کی متعدد دیگر روایات معصوم پیشواؤں سے نقل ہوئی ہیں شیخ حر عاملی علیہ الرحمۃ نے یہ روایات وسائل کی جلد ۱۱ "کتاب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر" کے باب ۱۶ میں جمع کی ہیں۔

"صحیح مسلم" میں بھی رسولِ اکرمؐ سے اس مضمون کی ایک حدیث نقل ہوئی ہے۔

رسول اللہؐ اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے تھے کچھ افراد آپ کے پاس آئے ان کے پاؤں ننگے تھے جسم پر لباس نہیں تھا، تلواریں انھوں نے اپنی کمروں سے باندھ رکھی تھیں (اور وہ جہاد کے لیے تیار تھے) ان کے فقر وفاقہ کا یہ عالم دیکھا تو رسول اللہؐ کا چہرہ دگرگوں ہوگیا آپ اپنے گھر میں چلے گئے واپس آئے تو بلالؓ کو حکم دیا کہ لوگوں سے کہو کہ جمع ہو جائیں اور انھیں نماز کی دعوت دو، نماز پڑھی گئی، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا:

---

[1] مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۱ ص ۴۳۶۔

اے لوگو! خدا سے ڈرو، وہی خدا کہ جس نے تم سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے، اور جان لو کہ خدا تمھیں دیکھ رہا ہے لوگو تقویٰ اختیار کرو اور کل قیامت کے لیے غور و فکر کرو۔ تم میں سے جو جس کے بس میں ہے۔ دینار، درہم، لباس، گندم، کھجور یہاں تک کہ آدھی کھجور سے بھی حاجت مند کی مدد کرو۔

اس دوران ایک انصاری رقم کی ایک تھیلی لے آیا تھیلی اتنی بڑی تھی کہ اس کے ہاتھ میں نہیں آسکتی تھی۔ اس سے لوگوں کو تشویق ہوئی۔ یکے بعد دیگرے انھوں نے مختلف چیزیں امداد کے طور پر دیں۔ یہاں تک کہ اناج اور لباس کے دو ڈھیر لگ گئے۔

رسول اللہؐ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، اس وقت آپؐ نے فرمایا:

من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها بعده من غیر ان ینتقص من اجورهم شیء ومن سن فی الاسلام سنة سیئة کان علیه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غیر ان ینتقص من اوزارهم شیء۔

یعنی جس نے اسلام میں کسی اچھی سنت کی بنیاد رکھی، اسے اس کا اجر ملے گا اور اس پر جو عمل ہوگا اس کا اجر بھی ملے گا جبکہ عمل کرنے والوں کے اجر میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی۔ اور جو کوئی اسلام میں کسی بری سنت کی بنیاد رکھے گا اُسے اس کا بوجھ اٹھانا پڑے گا اور اس پر جو عمل ہوگا اس کا بوجھ بھی۔ جبکہ عمل کرنے والوں کے بوجھ میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی [1]

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ یہ احادیث اور ان جیسی قرآنی آیات سورۂ انعام کی اس آیت سے کیسے مطابقت رکھتی ہیں، جس میں فرمایا گیا ہے:

ولا تزر وازرة وزر اخریٰ

کوئی دوسرے کا گناہ اپنے کندھے پر نہیں اٹھاتا۔ (انعام ــــــ ۱۶۵)

ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب پوری طرح واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ یہ لوگ دوسروں کے گناہوں کے جواب دہ نہیں ہیں بلکہ اپنے ہی گناہوں کے جواب دہ ہیں کیونکہ یہ دوسروں کے گناہوں کے عمل میں آنے میں شریک ہیں اور ایک لحاظ سے یہ خود انہی کا گناہ شمار ہوتا ہے۔

۲۔ سب سے موقع تسلیم حق: بہت کم ایسے لوگ ہیں جو حقیقت کو شہود کے عالم میں دیکھ کر بھی جھٹلا دیں۔ یہی وجہ ہے کہ گنہگار اور ظالم جب موت کی چوکھٹ پر پہنچتے ہیں اور غفلت و غرور کے پردے ہٹ جاتے ہیں۔ اور ان کی نگاہ برزخ کھل جاتی ہے تو اظہار ایمان

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۷۰۴، (باب "الحث علی الصدقة ولو بشق تمرة")۔

کرنے لگتے ہیں جیسا کہ مندرجہ بالا آیات میں ہے۔

فالقوا السلم

البتہ ایسے لوگ اس موقع پر مختلف باتیں کرتے ہیں۔ بعض اپنے پرانے اعمال کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے کوئی بُرا کام نہیں کیا (جیسا کہ مندرجہ بالا آیات میں آیا ہے) یعنی وہ اس قدر جھوٹ بول چکے ہوتے ہیں کہ جھوٹ اب اُن کے خمیر بدن کا حصّہ ہو گیا ہے اگرچہ وہ جانتے ہیں کہ جھوٹ بولنے کا موقع نہیں پھر بھی جھوٹ بولتے ہیں یہاں تک کہ بعض آیاتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ روزِ قیامت بھی جھوٹ بولیں گے۔ قرآن کہتا ہے:

قالوا و اللہ ربنا ما کنا مشرکین

مشرکین کہیں گے پروردگار کی قسم ہم مشرک نہیں ہیں ———— (انعام — ۲۳)

بعض دوسرے اظہارِ ندامت کریں گے اور دُنیا کی طرف لوٹائے جانے کی درخواست کریں گے۔ (سجدہ — ۱۲)

بعض ایسے بھی ہوں گے جو صرف اظہارِ ایمان کریں گے مثلاً فرعون۔ (یونس — ۹۰)

بہرحال ان میں سے کوئی چیز بھی قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ اس کا وقت گزر چکا ہوگا۔ ایسا اظہارِ ایمان اضطراری پہلو رکھتا ہے۔ اور ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ اضطراری ایمان کا کوئی فائدہ نہیں۔

۳۰۔ وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا خَيْرًا ۗ لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ ○

۳۱۔ جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْزِي اللَّهُ الْمُتَّقِينَ ○

۳۲۔ الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ ۙ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ○

ترجمہ

۳۰۔ جب پرہیزگاروں سے کہا جاتا ہے کہ تمھارے پروردگار نے کیا نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں خیر (اور سعادت) جن لوگوں نے اس دُنیا میں نیکی کی ہے ان کے لیے بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو اس سے بھی بہتر ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کتنا اچھا ہے۔

۳۱۔ بہشتِ جاوداں کے باغات ہیں کہ جن میں وہ سب داخل ہوں گے ان کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ جو کچھ چاہیں گے وہاں موجود ہے۔ اللہ پرہیزگاروں کو اسی طرح جزا دیتا ہے۔

۳۲۔ وہی کہ (قبض روح کرنے والے) فرشتے جن کی روح اس حالت میں قبض کریں گے کہ وہ پاک و پاکیزہ ہوں گے انھیں کہیں گے کہ تم پر سلام ہو اپنے اعمال کے سبب بہشت میں داخل ہو جاؤ۔

تفسیر

نیک لوگوں کا انجام:

گذشتہ آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ مشرکین قرآن کے بارے میں کیا اظہارِ خیال کرتے تھے ان آیات میں ہم نے ان مشرکین کا

انجام بھی پڑھا ہے۔ زیر نظر آیات میں مومنین کا اعتقاد بتایا گیا ہے اور ان کے انجام کار کی بھی خبر دی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جب پرہیزگاروں سے کہا جاتا کہ تمہارے پروردگار نے کیا نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں خیر و سعادت (وقیل للذین اتقوا ماذا انزل ربکم قالوا خیرا)۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ جس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں تھے تو موسم حج میں جزیرۃ العرب کے مختلف گوشوں سے لوگ جوق در جوق مکہ میں آتے تھے۔ ان کے کانوں تک پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں ادھر اُدھر سے اڑتی ہوئی باتیں پہنچی ہوتی تھیں لہٰذا جب وہ مختلف لوگوں سے ملتے تو اس بارے میں پوچھتے۔ جب وہ مشرکین سے بات کرتے تو وہ کہتے کہ کوئی خاص بات نہیں وہی فضول افسانے اور گھسی پٹی کہانیاں ہیں اور جب اُن کی ملاقات مومنین سے ہوتی اور وہ ان سے سوال کرتے تو وہ کہتے کہ ہمارے پروردگار نے سوائے خیر و سعادت کے کوئی چیز نازل نہیں کی۔

"خیر" کس قدر معنی خیز، خوبصورت اور جامع تعبیر ہے وہ بھی مطلق صورت میں کہ جس کے مفہوم میں تمام طرح کی نیکیاں، مادی روحانی سعادتیں اور کامیابیاں شامل ہیں۔ دنیا میں خیر، آخرت میں خیر، فرد کے لیے خیر، معاشرے کے لیے خیر، تعلیم و تربیت میں خیر، سیاست و اقتصاد میں خیر اور امن و آزادی کی خیر، مختصر یہ کہ ہر لحاظ سے خیر۔ (کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جب کسی لفظ کے متعلق کو حذف کر دیا جائے تو اس کے مفہوم میں عمومیت پیدا ہو جاتی ہے)۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ قرآن کے متعلق خود قرآن میں طرح طرح کی تعبیریں آئی ہیں مثلاً نور، شفاء، ہدایت اور فرقان (حق کو باطل سے جدا کرنے والا) حق اور تذکرہ وغیرہ۔ لیکن شاید یہ واحد آیت ہے جس میں "خیر" کی تعبیر آئی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ دیگر تمام خاص مفاہیم اس عام مفہوم میں جمع ہیں۔

ضمناً وہ اختلاف تعبیر جو مشرکین اور مومنین قرآن کے بارے میں کرتے تھے قابل ملاحظہ ہے مومنین کہتے تھے "انزل خیرا" یعنی خدا نے خیر و سعادت نازل کی ہے اس طرح سے وہ اپنے اس ایمان کا بھی اظہار کرتے تھے کہ قرآن وحی الٰہی ہے[1]۔ جبکہ مشرکین سے پوچھا جاتا کہ تمہارے پروردگار نے کیا نازل کیا ہے تو وہ کہتے کہ یہ تو "اساطیر الاولین" یعنی گزرے ہوؤں کے قصے کہانیاں ہیں۔ اس طرح وہ قرآن کے وحی الٰہی ہونے کا قطعی انکار کر دیتے تھے[2]۔

اس کے بعد جیسا کہ گزشتہ آیات میں مشرکین کی باتوں کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے کہ انھیں دنیا اور آخرت میں کئی گنا مادی و روحانی عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

زیر نظر آیات میں مومنین کے اعتقادات کا نتیجہ بھی بیان کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے جنھوں نے نیکی کی ہے ان کے لیے اس دنیا میں نیکی ہے (للذین احسنوا فی ھذہ الدنیا حسنۃ)۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ ان کی جزا "حسنۃ" ان کے اظہار ایمان "خیر" کی طرح مطلق ہے اور اس کے مفہوم میں اس جہان کی

---

[1] "خیرا" درحقیقت فعل محذوف کا مفعول ہے اور تقدیر میں "انزل خیرا" تھا۔

[2] "اساطیر الاولین" مبتداء محذوف کی خبر ہے اور تقدیر میں "ھذہ اساطیر الاولین" تھا۔

انواع و اقسام کی حسنات اور نعمات شامل ہیں۔

یہ تو ان کی دنیا کی جزا ہے جبکہ "آخرت کا گھر اس سے بھی بہتر ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کس قدر اچھا ہے (ولدار الاخرة خیر ولنعم دار المتقین)۔

یہاں پھر ہم "خیر" اور "نعم دار المتقین" کے الفاظ پا رہے ہیں یہ دونوں اپنے وسیع مفہوم کے ساتھ مطلق ہیں اور ایسا ہی ہونا چاہیے کیونکہ ثواب اور جزا کیفیت و کمیت کے اعتبار سے انسانی اعمال کا عکس العمل ہیں۔

جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے ضمناً یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ "للذین احسنوا ...... تا آخر آیہ" ——— ظاہراً کلام خدا ہے اور ان آیات میں اور گذشتہ آیات میں مقابلے کا قرینہ اس معنی کو تقویت پہنچاتا ہے البتہ بعض مفسرین نے اس کی تفسیر میں دو احتمال ذکر کیے ہیں پہلا یہ کہ یہ کلام خدا ہے اور دوسرا یہ کہ پرہیزگاروں کے کلام کا تتمہ ہے۔

پہلے تو پرہیزگاروں کے گھر کا ذکر سربستہ طور پر کیا گیا ہے اگلی آیت میں اس کی توصیف یوں کی گئی ہے: پرہیزگاروں کا گھر بہشت کے جاوداں باغ ہیں۔ یہ سب ان گھروں میں داخل ہو جائیں گے (جنات عدن یدخلونها) ان درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (تجری من تحتها الانهر)۔ یہی نہیں کہ وہاں باغات اور درخت ہوں گے بلکہ وہ جو کچھ چاہیں وہاں موجود ہے (لهم فیها ما یشاءون)۔

کیا نعمات بہشت کی جامعیت اور وسعت کے بارے میں اس سے بہتر تعبیر ہو سکتی ہے؟ یہاں تک کہ یہ تعبیر سورہ زخرف کی آیہ[1] میں آنے والی تعبیر سے زیادہ وسیع نظر آتی ہے، جہاں فرمایا گیا ہے:

وفیها ما تشتهیه الانفس و تلذ الاعین

بہشت میں ہر وہ چیز موجود ہے جو دل چاہیں گے اور آنکھیں جس سے لذت محسوس کریں گی۔

سورہ زخرف کی اس آیت میں دلوں کی خواہش کا ذکر ہے جبکہ زیر بحث آیت میں مطلق "خواہش" کی بات کی گئی ہے (یشاءون)

بعض مفسرین نے "لهم فیها" کے "ما یشاءون" پر مقدم ہونے سے انحصار کا استفادہ کیا ہے یعنی صرف وہی ایسی جگہ ہے جہاں انسان کو وہ سب کچھ ملے گا جو وہ چاہے گا ورنہ دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ زیر بحث آیات کہ جن میں پرہیزگاروں کی زندگی اور موت کی کیفیت بیان کی گئی ہے، گزشتہ آیات سے ہم آہنگ اور ہم قرینہ ہیں کہ جن میں مستکبر مشرکین کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ وہاں ہم نے پڑھا ہے کہ فرشتے ان کی روح اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ ظالم ہیں اور ان کی موت ان کی بدبختی کے نئے دور کی ابتداء ہے۔ اس کے بعد انھیں حکم دیا جائے گا کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔

لیکن یہاں فرمایا گیا ہے: پرہیزگار وہ لوگ ہیں کہ روح قبض کرنے والے فرشتے ان کی روح اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ پاک و پاکیزہ ہیں (الذین تتوفاهم الملئکة طیبین) اس موقع پر فرشتے "انھیں کہتے ہیں سلام ہو تم پر" (یقولون سلام علیکم)۔ وہ سلام کہ جو امن و سلامتی اور آرام و سکون کی نشانی ہے۔

اس کے بعد کہتے ہیں: اپنے اعمال کے سبب جنت میں داخل ہو جاؤ (ادخلوا الجنة بما کنتم تعملون)۔

تتوفاھم (ان کی روح حاصل کرتے ہیں) ــــــــ یہ موت کے بارے میں ایک لطیف تعبیر ہے اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ موت فنا و نابودی نہیں اور اس سے ہر چیز ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ایک بالاتر مرحلے کی طرف منتقل ہونے کا مرحلہ ہے۔

تفسیر المیزان میں ہے کہ:

اس آیت میں تین موضوعات پیش کیے گئے ہیں:

۱۔ متقین کی روح اس حالت میں قبض کی جائے گی کہ وہ پاک و طیب ہوں گے۔

۲۔ ان کے لیے ہر لحاظ سے امن و سلامتی کا ہونا۔

۳۔ بہشت کی طرف ان کی راہنمائی۔

ان تین نعمات کی نظیر سورہ انعام کی آیہ ۸۲ میں بھی ہم پڑھ چکے ہیں۔

الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولئک لھم الامن وھم مھتدون

وہ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا ان کے لیے امن و امان ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔

۳۳۔ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ أَمْرُ رَبِّكَ ۚ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوٓا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ○

۳۴۔ فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ○

۳۵۔ وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِينُ ○

۳۶۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۚ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ○

۳۷۔ إِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ يُضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِنْ نٰصِرِينَ ○

ترجمہ

۳۳۔ کیا وہ اس چیز کے علاوہ کسی چیز کے منتظر ہیں کہ (قبض روح کرنے والے) فرشتے ان کے پاس آئیں یا پھر (ان کی سزا کے بارے میں) تیرے پروردگار کا حکم آپہنچے (اور پھر وہ توبہ کریں جبکہ اس وقت کی توبہ

بے سود ہے) ان سے پہلے والے لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ خدا نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ خود انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔

۳۴۔ اور ان کے بُرے اعمال کا نتیجہ ان تک پہنچا اور جس (وعدۂ عذاب) کا وہ مذاق اڑاتے تھے وہ ان تک آپہنچا۔

۳۵۔ مشرکین نے کہا: اگر خدا چاہتا تو ہم اور ہمارے آباؤ اجداد اس کے غیر کی عبادت نہ کرتے اور نہ اس کی اجازت کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے (جی ہاں) ان سے پہلے لوگوں نے بھی یہی کام انجام دیے ہیں لیکن کیا انبیاء کی ذمہ داری سوائے واضح تبلیغ کے کچھ ہے؟

۳۶۔ ہم نے ہر امت میں ایک رسُول بھیجا کہ وہ خدائے یکتا کی عبادت کریں اور طاغوت سے اجتناب کریں۔ ایک گروہ کو خدا نے ہدایت کی اور ایک گروہ کو گمراہی دامن گیر ہوئی پس رُوئے زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔

۳۷۔ تم ان کی ہدایت کی جتنی بھی لالچ کرو (کوئی فائدہ نہیں) کیونکہ اللہ نے جسے گمراہ کیا ہے اس کی ہدایت نہیں کرتا اور اُن کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

تفسیر

انبیاء کی ذمہ داری واضح تبلیغ ہے

قرآن دوبارہ مشرکین اور مستکبرین کی طرزِ فکر اور طرزِ عمل کے بارے میں تجزیہ و تحلیل کرتا ہے اور تہدید آمیز لہجے میں کہتا ہے: وہ کس انتظار میں ہیں "کیا وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ موت کے فرشتے ان کے پاس آئیں" توبہ کے دروازے بند ہو جائیں دفتر اعمال لپیٹ دیا جائے اور واپسی کی کوئی راہ باقی نہ رہے (هل ینظرون الا ان تأتیهم الملائکة)۔

یا پھر کیا وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے لیے تیرے پروردگار کی طرف سے عذاب کا حکم صادر ہو (او یأتی امر ربك) جبکہ اس حالت میں بھی توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے اور بازگشت اور تلافی کا راستہ باقی نہ رہے گا۔

یہ ان کی کیسی طرزِ فکر ہے، کیسی ہٹ دھرمی ہے اور کیا احمقانہ انداز ہے۔

یہاں لفظ "ملائکہ" اگرچہ مطلق طور پر آرہا ہے لیکن گذشتہ آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جن میں روح قبض کرنے والے فرشتے کے بارے میں گفتگو ہے یہاں بھی وہی مراد ہیں۔

"یأتی امر ربك" (خدا کا حکم آجائے گا) اس جملے سے بہت سے احتمالات پیدا ہو سکتے ہیں لیکن اگر اس اَمر کی طرف

توجہ کی جائے کہ یہ تعبیر قرآن کی مختلف آیات میں نزولِ عذاب کے بارے میں آئی ہے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہاں بھی وہی معنی مراد ہے۔

بہرحال مجموعی طور پر ان دو جملوں سے تہدید کا مفہوم نکلتا ہے یہ تہدید اور دھمکی مستکبرین کے لیے ہے ان سے کہا گیا ہے کہ اگر خدا کی طرف سے پند و نصیحت اور اس کے انبیاء کی طرف سے وعظ و نصیحت سے تم بیدار نہیں ہوتے تو عذاب اور موت کے تازیانے تمھیں بیدار کریں گے لیکن اس وقت بیدار ہونے سے تمھیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہی گروہ نہیں کہ جس کا یہ طرزِ عمل ہے بلکہ "گذشتہ مشرکین اور مستکبرین بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے (کذٰلک فعل الذین من قبلھم) خدا نے تو ان پر ظلم نہیں کیا انھوں نے خود ہی اپنے اُوپر ظلم کیا ہے (وما ظلمھم الله ولکن کانوا انفسھم یظلمون)۔

کیونکہ درحقیقت خدا اُن کے اعمال ہی کا نتیجہ ان کی طرف لوٹائے گا۔ یہ جملہ پھر اس حقیقت کی تاکید کرتا ہے کہ ہر ظلم اور برائی جو انسان سے سرزد ہوتی ہے آخر کار اسی کی دامن گیر ہوتی ہے بلکہ ہر چیز سے پہلے ان تک آ پہنچتی ہے کیونکہ بُرے عمل کے بُرے آثار اپنے فاعل کی روح پر اثرانداز ہوتے ہیں اور اس سے اس کا دل تاریک ہوجاتا ہے روح آلودہ ہوجاتی ہے اور آرام و سکون جاتا رہتا ہے۔

دوبارہ ان کے اعمال کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: بالآخر ان کے اعمال کی برائیاں ان تک آ پہنچتی ہیں (فاصابھم سیئات ما عملوا)۔ (وعدہ عذابِ الٰہی کہ) جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ان تک آ پہنچے گا (وحاق بھم ما کانوا بہ یستھزءون)۔

"حاق بھم" کا معنی ہے "ان پر وارد ہوا" لیکن قرطبی، فرید وجدی اور بعض دیگر مفسّرین نے اسے احاطہ کرنے کے معنی میں لیا ہے۔ البتہ اس سے ایسا مفہوم مراد لیا جانا چاہیے جس میں وارد ہونا اور احاطہ کرنا دونوں معانی شامل ہوں۔

بہرحال یہ آیت کہ جو کہتی ہے کہ "ان کے اعمال کی برائیاں اُن تک آ پہنچیں" ایک مرتبہ پھر اس حقیقت پر زور دیتی ہے کہ یہ انسان کے اپنے ہی اعمال ہیں کہ جو اس جہان میں بھی اور اس جہان میں بھی اسے دامن گیر ہوتے ہیں اس کے یہ اعمال مختلف صورتوں میں بھی مجسّم ہوتے ہیں اور اسے رنج تکلیف، آزار اور اذیت دیتے ہیں۔[1]

اگلی آیت مشرکین کی ایک کمزور اور بے بنیاد منطق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: مشرکین کہتے ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو ہم ہمارے آباؤ اجداد اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرتے" اور بتوں کا رُخ نہ کرتے (وقال الذین اشرکوا لو شاء الله ما عبدنا من دونہ من شیءٍ نحن ولا اٰباؤنا) اور کوئی چیز اس کے اذن کے بغیر حرام قرار دیتے (ولا حرمنا من دونہ من شیءٍ)۔

یہ کچھ چوپایوں کی طرف اشارہ ہے کہ جنھیں مشرکین نے زمانۂ جاہلیت میں اپنی طرف سے حرام قرار دے لیا تھا اُن کے اس طرزِ عمل پر پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شدید تنقید کرتے تھے۔

---

[1] اس بناء پر ضروری نہیں کہ ہم "جزا" کو "سیئات" سے پہلے مقدر فرض کریں۔

خلاصہ یہ کہ ان کا دعوٰی تھا کہ بتوں کی پرستش اور حلال حرام قرار دینا اور ان کے دیگر کام اللہ کی رضا سے ہیں اور اس کے اذن کے بغیر نہیں ہیں۔

ہو سکتا ہے یہ گفتگو اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ وہ جبر کا عقیدہ رکھتے تھے اور ہر چیز کو تقدیر سے وابستہ سمجھتے تھے۔ اس آیت سے بہت سے مفسرین نے یہی مراد لیا ہے۔

لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ ان کا یہ کہنا عقیدۂ جبر کی بنیاد پر نہ ہو اور اس کا استدلال یہ ہو کہ اگر ہمارے اعمال پر خدا راضی نہیں ہے تو پھر اس نے پہلے پیغمبر اور رسول بھیج کر ان سے منع کیوں نہیں کیا اور کیوں ہمارے بزرگوں سے پہلے دن ہی نہیں کہا کہ میں ان کاموں سے راضی نہیں ہوں۔ اس کی یہ خاموشی اس کی رضا کی دلیل ہے۔

یہ تفسیر اس آیت اور اس کے بعد کی آیات کے ظاہری مفہوم سے مناسبت رکھتی ہے اسی لیے بلا فاصلہ فرمایا گیا ہے ان کے آباؤ اجداد بھی یہی کچھ کرتے تھے (اور انھی بہانوں کا سہارا لیتے تھے) لیکن کیا انبیاءِ الٰہی کی ذمہ داری واضح تبلیغ کے علاوہ کچھ اور ہے؟

(کذلک فعل الذین من قبلھم فھل علی الرسل الا البلاغ المبین)۔

یعنی ——————

اولاً یہ جو تم کہتے ہو کہ خدا نے سکوت اختیار کر رکھا ہے، ایسا ہرگز نہیں ہے، جو پیغمبر بھی آیا ہے اس نے توحید کی اور نفیِ شرک کی دعوت دی ہے۔

ثانیاً خدا اور پیغمبر کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ مجبور کریں بلکہ ان کے ذمہ ہے کہ راستے کی نشان دہی کریں اور یہ کام کیا جا چکا ہے۔

ضمنی طور پر "کذلک فعل الذین من قبلھم" (جو لوگ ان سے پہلے تھے انھوں نے بھی یہی کام انجام دیے ہیں) یہ ایک طرح سے پیغمبر کی تسلی کے لیے ہے تاکہ وہ جان لیں کہ یہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں پہلے انبیاء کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا آیا ہے لہٰذا ملول نہ ہوں، استقامت سے کام لیں اور ڈٹ جائیں خدا آپ کا یار و مددگار ہے۔

یہ حقیقت بیان کرنے کے بعد کہ انبیاء کی ذمہ داری صرف ابلاغِ آشکار اور تبلیغ واضح ہے۔ اگلی آیت میں انبیاء کی کیفیتِ دعوت کی طرف ایک مختصر اور جامع اشارہ کیا گیا ہے فرمایا گیا ہے: ہم نے ہر اُمت میں رسول بھیجا ہے (و لقد بعثنا فی کل امۃ رسولًا)۔

لفظ "امۃ" "ام" سے ماں کے معنی میں ہے یا ہر اس چیز کے معنی میں ہے جو کسی دوسری چیز کو اپنا ضمیمہ قرار دے لہٰذا ہر وہ جماعت کہ جس کے افراد میں زمان، مکان، فکر یا ہدف میں کسی طرح کی وحدت ہو اسے "امۃ" کہا جاتا ہے قرآن میں یہ لفظ ۶۴ سے زیادہ مرتبہ آیا ہے ان کے مطالعے سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: کہ ان سب رسولوں نے یہی دعوت دی ہے کہ خدائے یکتا کی پرستش کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو (ان اعبدوا اللہ و اجتنبوا الطاغوت)[1]

---

[1] یہ جملہ تقدیر میں یوں تھا۔ "یقول لھم اعبدوا اللہ ......"

یعنی تمام انبیاء کی دعوت کی بنیاد عقیدۂ توحید اور طاغوت سے مقابلہ تھا اور یہی وہ پہلی چیز تھی کہ جس کی طرف سب انبیاءؑ بلااستثناء دعوت دیتے تھے کیونکہ اگر توحید کے ستون مستحکم نہ ہوں اور انسانی معاشرے سے طاغوتیت اور طاغوتی افکار نکال باہر نہ کیے جائیں تو کوئی اصلاحی پروگرام قابلِ عمل نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں "طاغوت" مبالغے کا صیغہ ہے یہ "طغیان" کے مادہ سے ہے جس کا مطلب ہے حد اور سرحد سے تجاوز کرنا اور "طاغوت" تجاوز کرنے والے کو کہتے ہیں لہٰذا شیطان، بُت اور ظالم و ستمگر حاکم کو "طاغوت" کہتے ہیں اور ہر وہ راستہ جو غیر حق تک جا پہنچائے اسے "طاغوت" کہا جاتا ہے یہ لفظ مفرد اور جمع دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے اگرچہ بعض اوقات اس کی جمع "طواغیت" کی جاتی ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء کی دعوتِ توحید کا نتیجہ کیا نکلتا ہے قرآن کہتا ہے: ان امتوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھیں خدا نے ہدایت کی (فمنھم من ھدی اللہ) اور ان میں ایسے بھی تھے کہ گمراہی جنھیں دامن گیر ہوئی (و منھم من حقت علیہ الضلالۃ)۔

اس موقع پر بھی مکتبِ جبر کے پیروکاروں نے آواز بلند کی ہے کہ یہ آیت بھی ہمارے مکتب کی صداقت کے لیے ایک دلیل ہے لیکن ہم نے بارہا کہا ہے کہ اگر ہدایت و ضلالت والی آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو کسی قسم کا کوئی ابہام باقی نہیں رہتا اور نہ صرف یہ کہ وہ جبر کی طرف اشارہ نہیں کرتیں، وضاحت سے انسانی اختیار، ارادے اور آزادی کو بیان کرتی ہیں کیونکہ بہت سی قرآنی آیات میں ہے کہ خدائی ہدایت و ضلالت اس اہلیت اور نااہلی کے بعد ہے کہ جو انسانوں کے اعمال کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ ظالموں، ہیرا پھیری کرنے والوں، جھوٹوں اور اس قسم کے لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا اس کے برعکس جو لوگ راہِ خدا میں جہاد اور جدوجہد کرتے ہیں اور دعوتِ انبیاء کو قبول کرتے ہیں ان پر اپنی رحمتیں نازل کرتا ہے۔ انھیں تکامل وارتقاء کی منزلوں کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور سیر الی اللہ کا راستہ کہ جو نشیب و فراز سے پُر ہے اس میں ہدایت کرتا ہے جبکہ ظالموں اور جھوٹوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتیں اور عالمِ بے راہ روی میں سرگرداں رہیں نیز اعمال اچھے ہوں یا بُرے ان کی خاصیت چونکہ خدا کی طرف سے ہے لہٰذا ان کے نتائج کی نسبت خدا کی طرف دی جا سکتی ہے۔

جی ہاں! خدا کی سنت یہ ہے کہ وہ ہدایتِ تشریعی کا طریقہ اختیار فرماتا ہے یعنی انبیاء کو مبعوث کرتا ہے تاکہ وہ فطرت سے ہم آہنگ ہو کر لوگوں کو توحید اور نفیِ طاغوت کی دعوت دیں اس ہدایتِ تشریعی کے بعد جو شخص یا گروہ اپنی لیاقت و اہلیت ثابت کرتا ہے وہ اس کے لطف و ہدایتِ تکوینی سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔

جی ہاں! یہ ہے خدا کی دائمی سنت، نہ وہ کہ جو فخرالدین رازی اور اس جیسے مکتبِ جبر کے طرفداروں نے کہا ہے کہ خدا پہلے انبیاء کے ذریعے دعوت دیتا ہے اور پھر جبری طور پر (بغیر کسی وجہ کے) لوگوں میں ایمان یا کفر پیدا کر دیتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کے خیال میں اس سلسلے میں خدا سے کسی قسم کا کوئی سوال و جواب نہیں ہو سکتا۔

واقعاً ان لوگوں نے خدا کا کیسا وحشت ناک تصور پیش کیا ہے کہ جو کسی عقل، احساس اور منطق سے مناسبت نہیں رکھتا۔

یہ امر لائقِ توجہ ہے کہ زیرِ بحث آیت میں ہدایت اور ضلالت کے بارے میں مختلف انداز سے بات کی گئی ہے پہلے فرمایا گیا ہے : "خدا نے ایک گروہ کی ہدایت کی" لیکن ضلالت کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ "خدا نے ایک گروہ کو گمراہ کیا" بلکہ فرمایا :۔

حقت علیھم الضلالۃ

یعنی ——— گمراہی ان کے لیے ثابت ہوگئی اور ان کے دامن سے لپٹ گئی ۔

تعبیر کا یہ فرق ہو سکتا ہے۔ دوسری آیاتِ قرآن اور بعض روایات سے ظاہر ہونے والی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ ہدایت کا زیادہ تر تعلق ان مقدمات سے ہے جو خدا تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں، اس نے عقل دی ہے، انسانی فطرت کو توحید کے لیے آمادہ کیا ہے، انبیاء بھیجے ہیں اور تشریعی و تکوینی آیات دکھائی ہیں اب صرف بندوں کی طرف سے ایک آزادانہ ارادے کی ضرورت ہے کہ جو انھیں منزلِ مقصود تک پہنچا دے ۔

جبکہ ضلالت و گمراہی میں تمام تر کردار خود بندوں کا ہے کیونکہ خود بندے ہی تکوینی و تشریعی ہدایت کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں الٰہی فطرت کے قوانین کو پامال کرتے ہیں تشریعی و تکوینی آیات کو پسِ پُشت ڈال دیتے ہیں اور انبیاء کی دعوت پر چشمِ بصیرت اور گوش ہوش بند کر لیتے ہیں۔ خلاصہ یہ تخریب و تحریف کے ان سب عناصر کے ساتھ وادیٔ ضلالت میں قدم رکھتے ہیں ——— تو کیا یہ سب امور خود انھی کی طرف سے نہیں ہیں ؟

سورۃ نساء کی آیہ ۹ میں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔

ما اصابك من حسنة فمن الله و ما اصابك من سيئة فمن نفسك

جو بھلائی تجھے حاصل ہو وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو برائی تجھے پہنچے وہ خود تیری طرف سے ہے ۔

امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کی طرف سے اصولِ کافی میں ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ جو اس مطلب کو زیادہ واضح کرتی ہے ۔

ایک صحابی نے آپ سے جبر و اختیار کے بارے میں سوال کیا ۔

آپ نے جواب میں فرمایا :

لکھو :

بسم الله الرحمٰن الرحيم

قال علی بن الحسین قال الله عز وجل :

يا ابن آدم ! بمشيتي كنت انت الذي تشاء ،

وبقوتی اديت الی فرائضی ،

و بنعمتی قويت علی معصيتی ،

جعلتك سميعًا بصيرًا ،

"ما اصابك من حسنة فمن الله و ما اصابك من سيئة فمن نفسك"

"و ذلك انى اولى بحسناتك منك، و انت اولى بسيئاتك منى"

ترجمہ:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(امام) علی بن الحسین (زین العابدین) نے فرمایا کہ

(حدیثِ قدسی میں) اللہ عزوجل فرماتا ہے:

اے فرزندِ آدم! میرا ارادہ ہے کہ جس کی بنیاد پر تو ارادہ کر سکتا ہے (میں نے تجھے ارادے کی آزادی بخشی ہے)،

اور میری عطا کردہ قوت کے ساتھ تو واجبات ادا کر سکتا ہے،

جبکہ میری نعمت سے ہوئے استفادہ کرتے ہوئے تو نے اس قوت کو نافرمانی کی طاقت میں بدل لیا ہے،

میں نے تجھے سننے اور دیکھنے والا بنایا ہے (اور صحیح اور غلط راستے کی نشاندہی کر دی ہے)۔

اب جو بھلائی تجھے پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جس برائی کا تجھے سامنا کرنا پڑتا ہے وہ خود تیری طرف سے ہے"

یہ اس لیے ہے کہ تو جو نیک کام انجام دیتا ہے اس کے حوالے سے میں تجھ سے اولیٰ اور زیادہ مستحق ہوں اور جن برے کاموں کا تو مرتکب ہوتا ہے مجھ سے سزاوار تر ہے[1]

آیت کے آخر میں گمراہوں کو بیدار کرنے اور ہدایت یافتہ افراد کی روحانی تقویت کے لیے ایک عمومی حکم صادر فرمایا گیا ہے: زمین میں چلو پھرو اور صفحۂ زمین پر یا تہِ خاک چھپے ہوئے گزشتہ لوگوں کے آثار کا مطالعہ کرو اور دیکھو آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کا کیا انجام ہوا (فسیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبة المكذبين)۔

یہ تعبیر بھی انسانی ارادے کی آزادی کے لیے ایک زندہ دلیل ہے کیونکہ ہدایت و گمراہی جبری ہوتی تو زمین میں چلنا پھرنا اور گزشتہ لوگوں کے حالات کا مطالعہ کرنا فضول تھا لہٰذا یہ حکم بذاتِ خود اس بات کی تاکید ہے کہ کسی شخص کی سرنوشت پہلے سے معین شدہ نہیں ہے بلکہ خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔

"سیر فی الارض" (زمین میں چلنا پھرنا) اور گزشتہ لوگوں کے حالات کا مطالعہ کرنا، اس بارے میں قرآن مجید میں بہت اور قابلِ توجہ مباحث موجود ہیں اس کا تفصیلی ذکر ہم تفسیر نمونہ، جلد ۲ سورہ آلِ عمران آیت ١٣٧ کے ذیل میں کر آئے ہیں۔

زیرِ بحث آخری آیت میں پیغمبرِ اکرمؐ کی دلجوئی کے طور پر تاکید کی گئی ہے آخرکار یہ گمراہ اور ہٹ دھرم لوگ اس مقام تک

---

[1] اصول کافی جلد ١ ص ١٦٠ (باب الجبر والقدر حدیث ١٢)۔

جا پہنچیں گے تو جس قدر بھی "ان کی ہدایت کے لیے خواہش مند ہو جائے اور کوشش کرے، کوئی فائدہ نہ ہوگا، کیونکہ خدا جسے گمراہ کرے (پھر اسے) ہدایت نہیں کرتا" (ان تحرص علی ھداھم فان اللہ لا یھدی من یضل) "اور ان کے لیے کوئی یار و مددگار نہیں ہے" (و مالھم من ناصرین)۔

"تحرص" مادہ "حرص" سے خوب کوشش کے ساتھ کوئی چیز طلب کرنے کے معنی میں ہے۔

واضح ہے کہ یہ جملہ تمام منحرفین اور کج رو لوگوں کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ پیغمبر کا فریضہ ہے تبلیغ و ہدایت کرنا اور ہم جانتے ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ تبلیغ و ہدایت بہت سے گمراہوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کے باعث بہت سے افراد دینِ حق سے منسلک ہو جاتے ہیں اور بڑے عشق اور جذبے سے دینِ حق کا دفاع کرنے لگتے ہیں اور اس کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔

لہٰذا مندرجہ بالا جملہ ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے کہ جن کی ہٹ دھرمی اور بد دماغی انتہاء کو پہنچ گئی ہو اور وہ استکبار، غرور، غفلت اور گناہ میں ایسے غرق ہو گئے ہوں کہ ان کے سامنے ہدایت کے دروازے نہ کھل سکیں۔ ایسے لوگوں کی ہدایت کے لیے پیغمبر جتنی بھی کوشش کریں بے نتیجہ ہوتی ہے کیونکہ اپنے اعمال کے سبب وہ اس حد تک گمراہ ہیں کہ قابلِ ہدایت نہیں رہے۔

فطری امر ہے کہ ایسے لوگوں کا کوئی یار و مددگار بھی نہیں ہوتا کیونکہ یار و مددگار تو کسی مناسب موقع پر ہی اقدام کر سکتا ہے۔

ضمنی طور پر یہ تعبیر بھی نفی جبر کی دلیل ہے کیونکہ "ناصر" ایسے موقع سے مربوط ہے جہاں خود انسان کے اندر سے جوش پیدا ہو اور اس کا نتیجہ نصرت و مدد ہو (غور کیجئے گا)۔

"ناصرین" جمع کی صورت میں ہے یہ شاید اس طرف اشارہ ہو اس گروہ کے برعکس گروہِ مومنین کا ایک دوست اور مددگار نہیں بلکہ بہت سے دوست اور مددگار ہیں خدا ان کا مددگار ہے انبیاء اور اولیاء الٰہی ان کے ناصر ہیں۔ ملائکہ رحمت بھی ان کے حامی و مددگار ہیں۔ سورۂ مومن کی آیہ ۵۱ میں ہے۔

> انا لننصر رسلنا و الذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا و یوم یقوم الاشھاد
>
> ہم اپنے رسولوں کی اور اسی طرح مومنین کی اس جہان میں روزِ قیامت جبکہ گواہی دینے والے شہادت کے لیے اٹھیں گے، نصرت کریں گے۔

نیز سورۂ حم السجدہ کی آیہ ۳۰ میں ہے:

> ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ الا تخافوا و لا تحزنوا و ابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون ۝
>
> جو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس عقیدے پر استقامت سے قائم رہتے ہیں ان پر آسمان کے ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور انھیں کہتے ہیں ڈرو نہیں اور غم نہ کھاؤ تمھیں اس جنت کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **"بلاغ مبین" کیا ہے:** آیات بالا میں بتایا گیا ہے کہ تمام انبیاء کی ذمہ داری "بلاغ مبین" ہے۔

فھل علی الرسل الا البلاغ المبین

یعنی ہادیانِ الٰہی محدود وقت کے سوا اپنی دعوت مخفی طور پر جاری نہیں رکھ سکتے۔ مخفی کام اور وہ بھی دعوتِ رسالت کے زمانے میں قابلِ قبول اور نتیجہ بخش نہیں ہو سکتا۔ ایسی صراحت کہ جس میں رشد و ہدایت اور قاطعیت ہو تدبیر کے ساتھ ساتھ اس دعوت کی شرط ہے۔

اسی بناء پر تاریخ شاہد ہے کہ تمام انبیاء اگرچہ وہ عام طور پر تنہا ہوتے تھے، اپنی دعوت صراحت و وضاحت سے پیش کرتے تھے اور اس سلسلے میں ہر قسم کی مشکلات کے لیے تیار رہتے تھے اور یہی تمام حقیقی رہبروں کا دستور العمل ہے چاہے وہ انبیاء و مرسلین ہوں یا ان کے علاوہ۔ کیونکہ خاموش رہنے سے دعوت کو کوئی قبول نہیں کرتا اور نہ ہی دو مختلف پہلو رکھنے والی باتوں سے کوئی استفادہ کر پاتا ہے۔ حقیقی رہبر حقیقت بیان کرنے کے لیے کوئی چیز فروگذاشت نہیں کرتے وہ اس صراحت و قاطعیت کے تمام نتائج بھی دل و جان سے قبول کرتے ہیں۔

۲۔ **ہر اُمت کے لیے ایک رسُول:** زیر بحث آیات میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے: ہم نے ہر اُمت میں ایک رسُول مبعوث کیا ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر ہر اُمت میں رسول بھیجا گیا ہے تو پھر دنیا کے تمام ممالک میں پیغمبر مبعوث ہوئے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کم از کم ایک امت ہے حالانکہ تاریخ اس بات کی نشاندہی نہیں کرتی۔

ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ انبیاء بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ خدائی دعوت اُمتوں کے کانوں تک پہنچ جائے ورنہ ہم جانتے ہیں کہ جس زمانے میں پیغمبر اسلامؐ نے مکہ یا مدینہ میں قیام کیا تھا حجاز کے دوسرے شہروں میں کوئی پیغمبر نہ تھا لیکن رسول اللہ نے اپنے نمائندے ان علاقوں میں بھیجے تھے ان نمائندوں نے رسول اللہ کی آواز ان سب کے کانوں تک پہنچائی علاوہ ازیں خود رسول اللہ نے خطوط لکھے اور مختلف ممالک مثلاً ایران، روم اور حبشہ کی طرف قاصد روانہ کیے اس طرح ان تک پیغام الٰہی پہنچایا گیا۔

اس وقت ہم بھی ایک اُمت ہیں ہم نے صدیوں بعد پیغمبر اسلامؐ کی دعوت آپکا پیغام لانے والے علماء کے ذریعے سُنی ہے۔ ہر اُمت میں رسول بھیجنے کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

۳۸۔ وَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰہِ جَہۡدَ اَیۡمَانِہِمۡ ۙ لَا یَبۡعَثُ اللّٰہُ مَنۡ یَّمُوۡتُ ؕ بَلٰی وَعۡدًا عَلَیۡہِ حَقًّا وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿ۙ﴾

۳۹۔ لِیُبَیِّنَ لَہُمُ الَّذِیۡ یَخۡتَلِفُوۡنَ فِیۡہِ وَ لِیَعۡلَمَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّہُمۡ کَانُوۡا کٰذِبِیۡنَ ﴿﴾

۴۰۔ اِنَّمَا قَوۡلُنَا لِشَیۡءٍ اِذَاۤ اَرَدۡنٰہُ اَنۡ نَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿﴾

ترجمہ

۳۸۔ انھوں نے تاکید سے قسم کھا کر کہا کہ مرجانے والوں کو خدا ہرگز مبعوث نہیں کرے گا۔ جی ہاں! یہ خدا کا قطعی وعدہ ہے (کہ وہ تمام مرنے والوں کو پھر سے زندہ کرے گا) لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۳۹۔ مقصد یہ ہے کہ جس چیز کے بارے میں وہ اختلاف کرتے تھے وہ ان کے سامنے واضح کر دی جائے تاکہ انکار کرنے والے جان لیں کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔

۴۰۔ (معاد و قیامت ہمارے لیے مشکل نہیں ہے کیونکہ) ہم جس وقت کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو صرف کہتے ہیں کہ ہو جا، تو وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

شانِ نزول

پہلی آیت کی شانِ نزول کے بارے میں مفسرین نقل کرتے ہیں:

ایک مسلمان نے کسی مشرک سے کچھ لینا تھا جب اس نے مطالبہ کیا تو اس نے قرض ادا کرنے میں لیت و لعل کی۔ مسلمان پریشان ہوا، اس نے دورانِ گفتگو قسم کھائی:

اس چیز کی قسم کہ میں جس کے انتظار میں ہوں ......

(اس کا مقصد قیامت اور حسابِ خدا تھا)۔

مشرک کہنے لگا:

"تم سمجھتے ہو کہ ہم موت کے بعد زندہ کیے جائیں گے۔ واللہ وہ کسی مُردہ کو زندہ نہیں کرے گا۔
(اس نے یہ بات اس لیے کہی کیونکہ ان لوگوں کا خیال تھا کہ مردوں کی بازگشت اور حیاتِ نو فضول یا محال بات ہے)۔
اس کی اس بات پر مذکورہ آیت نازل ہوئی اس میں اسے اور اس جیسے افراد کو جواب دیا گیا ہے اور مسئلہ معاد کو واضح دلیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے[1]

تفسیر

معاد اور اختلافات کا خاتمہ

گزشتہ آیات توحید اور رسالتِ انبیاء کے بارے میں تھیں۔ زیر بحث آیات میں مباحثِ توحید کے ایک پہلو کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ تاکید کے ساتھ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ مرجانے والوں کو خدا ہرگز مبعوث نہیں کرے گا اور انھیں حیاتِ نو عطا نہیں کرے گا (واقسموا باللہ جھد ایمانھم لا یبعث اللہ من یموت)۔

بغیر کسی دلیل کے ان کا یہ انکار اور وہ بھی تاکیدی قسموں کے ساتھ ان کی نادانی اور جہالت کی نشانی ہے لہٰذا ان کے جواب میں قرآن کہتا ہے: یہ خدا کا قطعی وعدہ ہے (کہ وہ تمام مرنے والوں کو حیاتِ نو عطا کرے گا تاکہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھ لیں) لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے اور نہ جاننے کی وجہ سے انکار کر دیتے ہیں (بلیٰ وعدا علیہ حقا ولکن اکثر الناس لا یعلمون)۔

"بلیٰ" (جی ہاں) "حقًا"، اور اس کے بعد وعدہ کا ذکر، وہ وعدہ کہ جو خدا کی طرف سے ہے۔ معاد کی تاکید اور قطعیت کی دلیل ہیں۔

اصولی طور پر جو شخص کسی حقیقت کا قاطعیت کے ساتھ انکار کرے اس کا جواب بھی قاطعیت کے ساتھ دیا جانا چاہیے تاکہ اس انکار کے بُرے نفسیاتی اثرات اثباتِ قاطع کے ذریعے دُور ہو سکیں اور یہ بات واضح ہو جائے کہ اس کی طرف سے نفی، بے خبری اور نادانی کی وجہ سے ہے۔ اس طرح انکار اپنا اثر بالکل کھو دے گا۔

اس کے بعد معاد و قیامت کا مقصد اور اس پر خدا کی قدرت کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس امر کی نشاندہی کی جائے کہ اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حیاتِ نو قدرتِ خدا میں نہیں ہے تو یہ ان کا بہت بڑا اشتباہ ہے اور اگر ان کا خیال ہے کہ معاد و قیامت بے مقصد ہے تو یہ بھی ان کی بہت بڑی غلطی ہے۔

فرمایا گیا ہے: خدا مرنے والوں کو مبعوث کرے گا تاکہ جس چیز کے بارے میں وہ اختلاف کرتے تھے ان کے سامنے واضح کردے (لیبین لھم الذی یختلفون فیہ) اور اس لیے کہ وہ جان لیں کہ وہ اس حقیقت کا جھوٹا انکار کرتے تھے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر قرطبی اور تفسیر ابوالفتوح رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

(ولیعلم الذین کفروا انھم کانوا کٰذبین)۔ کیونکہ وہ جہان تو ایسا ہے کہ جس میں پردے ہٹ جائیں گے، اور حقائق آشکار ہو جائیں گے۔

جیسا کہ سورہ قٓ کی آیہ ۲۲ میں ہے۔

لقد کنت فی غفلۃ من ھٰذا فکشفنا عنک غطائک فبصرک الیوم حدید

انسان سے کہا جائے گا کہ تو اس دن کے بارے میں غفلت میں تھا لیکن ہم نے تیری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا ہے اور آج تو خوب دیکھتا ہے۔

سورۂ طارق کی آیہ ۹ میں ہے:

یوم تبلی السرائر

قیامت ایسا دن ہے کہ جب رازہائے پنہاں آشکار ہو جائیں گے۔

نیز سورۂ ابراہیم کی آیت ۴۸ میں ہے:

وَبَرَزُوا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ‎o

اس روز سب کے سب خدائے واحد و قہار کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔

خلاصہ یہ کہ وہ دن شہود، کشف اسرار اور ظہور کا دن ہے۔ اس روز پنہاں چیزیں آشکار ہو جائیں گی ایسے حالات اور ماحول میں اختلاف عقیدہ کا کوئی معنی نہیں ہے اگرچہ ممکن ہے کہ بعض ہٹ دھرم منکر اپنے آپ کو بچانے کے لیے جھوٹے سہارے لینے کی کوشش کریں لیکن یہ ایک استثنائی اور زودگزر امر ہے یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کسی مجرم کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے تو وہ اپنے تمام جرائم کا انکار کر دے لیکن جب فوراً ٹیپ ریکارڈ لگا کر اس کی آواز اسے سنائی جائے اس کے دستخط اسے دکھائے جائیں اور واضح ثبوت اس کے سامنے پیش کیے جائیں اور اسے ساتھ لے جا کر، اس کے جرم کے آثار، موقع و محل دکھایا جائے تو اب جائے کلام باقی نہ رہے گی اور وہ اقرار کرلے گا۔ عالم قیامت میں حقائق کا ظہور اس سے بھی زیادہ واضح اور آشکار ہوگا۔

موت کے بعد کی زندگی اور قیامت کے مختلف اہداف و مقاصد ہیں جن کی مختلف مقامات پر آیات قرآنی میں نشاندہی کی گئی ہے مثلاً انسان کا تکامل وارتقاء، اجرائے عدالت، اس جہان کی زندگی کو بامقصد بنانا، فیض الٰہی کو جاری و ساری رکھنا وغیرہ۔ زیر بحث آیت ایک اور مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ ہے اختلافات کو دُور کرنا اور توحید کی طرف لوٹنا۔

ہم جانتے ہیں کہ بہترین اصل کہ جو سارے عالم پر حکمران ہے وہ اصل توحید ہے۔ یہ وسیع اور ہمہ گیر اصل خدا کی ذات، صفات اور افعال پر بھی صادق آتی ہے سارے عالم خلقت اور قوانین آفرینش پر بھی یہ اصل حکمران ہے اور ہر چیز کو آخرکار اسی اصل کی طرف پلٹنا چاہیے لہٰذا ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ اختلافات اور نزاعات ایک دن ختم ہو جائیں گے اور ساری دنیا کے لوگ ایک حکومت کے پرچم تلے جمع ہو جائیں گے اور یہ حضرت مہدی علیہ السلام کی حکومت ہوگی کیونکہ عالم ہستی کی رُوح یعنی توحید کے برخلاف جو کچھ بھی ہے اسے آخرکار ایک دن ختم ہونا چاہیے۔

لیکن ـــــــ عقائد کا یہ اختلاف دنیا سے مکمل طور پر کبھی بھی ختم نہیں ہوگا کیونکہ یہ جہان عالم غطا ہے یہاں بہت کچھ پردے

میں ہے ۔ البتہ ایک دن آئے گا کہ جب یہ پردے ہٹ جائیں گے اور وہ "یوم ظہور" ہے ۔ اس بناء پر معاد کا ایک ہدف یہ ہے کہ سب وحدت کی طرف پلٹ آئیں اور تمام اختلافات ختم ہو جائیں ۔ اسی ہدف کی طرف مذکورہ بالا آیت میں اشارہ ہوا ہے قرآن مجید کی بہت سی آیات میں اس مسئلے کی تکرار اور تاکید موجود ہے کہ خداوند عالم روز قیامت لوگوں کے درمیان عدالت کرے گا اور اختلافات ختم ہو جائیں گے[1]

دوسرا نکتہ ایک اور حقیقت پر مبنی ہے وہ یہ کہ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی بازگشت اور نئی زندگی محال ہے تو یہ جان لیں کہ قدرت خدا اس سے برتر اور بالا ہے "جب ہم کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو فقط یہ کہتے ہیں کہ "ہو جا" تو وہ فوراً موجود ہوتی ہے" (انما قولنا لشیء اذا اردنه ان نقول له کن فیکون) ۔

ایسی قدرتِ کاملہ کہ جس میں صرف "ہو جا" کا فرمان ہر چیز کے وجود کے لیے کافی ہو تو پھر اس کے لیے مُردوں کے حیاتِ نو عطا کرنے کی قدرت کے بارے میں تردد و شک کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے ۔

شاید وضاحت کی ضرورت نہ ہو کہ "کن" (ہو جا) کی تعبیر بھی تنگیِ بیان کی وجہ سے ہے ورنہ خدا کے لیے "کن" کی ضرورت نہیں ۔ اس کا ارادہ ہی کام کا ہو جانا ہے ۔ اس کی ناقص سی مثال اپنی زندگی سے پیش کرنا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ ہم ارادہ کرتے ہیں کسی چیز کے تصور کا تو وہ ہمارے ذہن میں ایجاد ہو جاتا ہے ہم اگر کسی عظیم پہاڑ، وسیع سمندر، درختوں سے بھرے بہت بڑے باغ یا ایسی کسی چیز کا تصور کرنا چاہیں تو ہمارے لیے کیا مشکل ہے کیا اس کے لیے ہمیں کسی جملے اور لفظ کی احتیاج ہے ؟ ان موجوداتِ ذہنی کی تصویر تو صرف تصور ہی سے ہمارے صفحۂ ذہن پر ابھر آتی ہے ۔ تو اسی طرح خدا کے "ہو جا" کہے بغیر صرف ارادے سے چیز موجود ہو جاتی ہے ۔

امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے کہ ایک صحابی نے آپ سے عرض کیا کہ خدا کے ارادہ اور مخلوق کے ارادہ کے بارے میں وضاحت فرمائیے تو امامؑ نے فرمایا :

> مخلوق کا ارادہ باطنی ہے اس کے بعد افعال ہیں کہ جو بعد میں آشکار ہوتے ہیں لیکن خدا کا ارادہ ہی اس کی ایجاد ہے نہ کہ اس کا غیر، کیونکہ خدا میں سوچ بچار، تصمیم اور فکر و نظر نہیں ہے (کیونکہ یہ صفات زائد بر ذات ہیں) خدا کے بارے میں ان چیزوں کا کوئی مفہوم نہیں ہے یہ مخلوقات کی صفات ہیں لہٰذا خدا کا ارادہ ہی ایجادِ افعال ہے ۔ فقط خدا کہتا ہے : "ہو جا" تو وہ ہو جاتا ہے بغیر کوئی لفظ ادا کیے، اسے زبان سے ادا کرنے، کمر ہمت باندھنے اور غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور خدا کا یہ ارادہ بھی اس کی ذات کی طرح قابلِ توصیف نہیں ہے[2]

---

[1] اس سلسلے میں آل عمران کی آیہ ۵۵، مائدہ کی ۴۸، انعام کی ۱۶۴، نحل کی ۹۲ اور حج کی ۶۹ کی طرف رجوع فرمائیں ۔

[2] اصولِ کافی جلد ۱، بابُ الارادہ حدیث نمبر ۳ ۔

۴۱۔ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ○

۴۲۔ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ○

ترجمہ

۴۱۔ جن لوگوں پر ظلم ہوا ہے اور پھر انھوں نے خدا کے لیے ہجرت کی ہے ہم اس دنیا میں انھیں اچھا مقام دیں گے اور اگر وہ جانیں تو آخرت کی جزا بہت بڑی ہے۔

۴۲۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جنھوں نے صبر و استقامت کو اختیار کیا ہے اور وہ صرف اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں۔

شانِ نزول

ان آیات کی شانِ نزول میں بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ مکہ میں اسلام لانے کے بعد بعض مسلمانوں مثلاً بلال، عمار یاسر صہیب اور خباب پر سخت تشدد کیا گیا اسلام کی تقویت اور دوسروں تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی یہ ہجرت آپ کی اور دوسروں کی کامیابی کا باعث بنی۔ صہیب سن رسیدہ شخص تھے انھوں نے مشرکین مکہ سے کہا کہ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں میں اگر تمھارے پاس رہوں تو تمھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا اور اگر میں تمھارا مخالف رہوں تو تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکتا تم ایسا کرو کہ میرا مال لے لو اور مجھے مدینہ جانے دو۔ اس پر وہ لوگ راضی ہو گئے۔ صہیب نے انھیں اپنا تمام مال و اسباب دے دیا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہجرت کی۔ اس پر بعض لوگوں نے صہیب سے کہا کہ تو نے نفع کا سودا کیا ہے اس پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں جن میں اس جہان میں، دوسرے جہان میں ان کی اور ان جیسے لوگوں کی کامیابی کا تذکرہ ہے۔

تاریخ میں ہے کہ خلفاء کے زمانے میں جب بیت المال کے اموال تقسیم ہوتے تھے تو مہاجرین کی باری آتی تھی تو انھیں کہا جاتا تھا کہ اپنا حصہ لے لو یہ وہی ہے کہ جو خدا نے تمھیں دنیا میں دینے کا وعدہ کیا ہے اور جو کچھ دوسرے جہان میں تمھارے انتظار میں ہے وہ بہت زیادہ ہے اس کے بعد وہ مذکورہ بالا آیت تلاوت کرتے تھے۔[1]

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

تفسیر

مہاجرین کی جزا

ہم نے بارہا کہا ہے کہ قرآن اپنے تربیتی اُمور میں جس مؤثر ترین روش سے استفادہ کرتا ہے وہ ہے موازنہ اور تقابل۔ قرآن ہر چیز کو اس کے متضاد کے سامنے لے آتا ہے تاکہ ہر ایک کا مقام واضح اور متعین ہو جائے۔ گزشتہ آیات میں منکرینِ قیامت اور ہٹ دھرم مشرکین کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیرِ بحث آیات سچے اور پاکباز مہاجرین کی بات کرتی ہیں تاکہ موازنہ اور تقابل سے دونوں کی کیفیت واضح ہو جائے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جن لوگوں نے ستم اٹھائے اور پھر راہِ خدا میں ہجرت کی ہم اس دنیا میں انھیں اچھی جگہ اور مقام دیں گے (والذین ھاجروا فی اللہ من بعد ما ظلموا لنبوئنھم فی الدنیا حسنۃ)۔

یہ ان کی دنیاوی جزاء ہے، رہی اُخروی جزا، اگر وہ جانیں تو وہ بہت ہی بڑی ہے (و لاجر الاٰخرۃ اکبر لو کانوا یعلمون)۔

بعد والی آیت میں ان سچے باستقامت اہلِ ایمان مہاجرین کی توصیف میں ان کے دو اوصاف بیان کیے گئے ہیں فرمایا گیا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے صبر و استقامت کا دامن تھاما اور جو اللہ پر توکل رکھتے ہیں (الذین صبروا و علیٰ ربھم یتوکلون)۔

چند اہم نکات

۱۔ ہجرت اور مہاجرین: آغازِ اسلام میں مسلمانوں نے دو ہجرتیں کیں۔ پہلی ہجرت نسبتاً مختصر تھی اس میں چند مسلمانوں نے حضرت جعفرؑ بن ابی طالب کی سربراہی میں حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ دوسری ہجرت ہمہ گیر تھی۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام مسلمانوں نے مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ زیرِ نظر آیات دوسری ہجرت سے متعلق ہیں۔ ان آیات کی شانِ نزول بھی اس امر کی تائید کرتی ہے۔

گزشتہ زمانے میں اور دورِ حاضر میں مسلمانوں کے لیے ہجرت کی دائمی اہمیت کے متعلق ہم سورۂ نساء کی آیہ ۱۰۰ اور سورۂ انفال کی آیہ ۷۵ کے ذیل میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔[1]

بہرحال مہاجرین کا مقام اسلام میں بہت بلند ہے۔ خود پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور بعد کے مسلمان سب ان کا خاص احترام کرتے تھے کیونکہ انھوں نے دعوتِ اسلام کی توسیع کی خاطر اپنے تمام سرمایۂ حیات کو ٹھوکر مار دی۔ بعض نے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۲ ص ۵۶۲ (اردو ترجمہ) اور جلد ۴ ص ۵۰۵ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

صہیبؓ جیسے بعض افراد نے اپنے سارے مال و متاع سے منہ پھیر لیا

ان دنوں میں اگر ان مہاجرین کا ایثار نہ ہوتا تو مکّہ کا تنگ ماحول اور اس میں موجود شیطانی عناصر ہرگز اجازت نہ دیتے کہ اسلام کی آواز کسی کے کانوں تک پہنچے وہ یہ آواز ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے حلقوم میں دبا دیتے لیکن یہ مہاجرین تھے کہ جن کی اس سوچی سمجھی تحریک اور انقلاب کے ذریعے نہ صرف مکّہ ان کے زیر تسلط آگیا بلکہ اسلام کی آواز پوری دنیا کے کانوں تک پہنچ گئی ان کا یہ طرزِ عمل بعد کے مسلمانوں کے لیے اس قسم کے حالات میں ایک دائمی سُنّت کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ **"ھاجروا فی اللّٰہ" کا مفہوم:** اس تعبیر میں لفظ "سبیل" تک ذکر نہیں ہوا۔ یہ دراصل ان مہاجرین کے انتہائی خلوص کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے صرف خدا کی راہ میں۔ اس کی رضا کی خاطر اور اس کے دین کی حفاظت کے لیے اس قسم کی ہجرت کی، نہ کہ اپنی جان بچانے کے لیے یا کسی دوسرے مادّی مفاد کے لیے۔

۳۔ **"من بعد ما ظلموا" کا مطلب:** یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ میدان فوراً خالی نہیں کر دینا چاہیے بلکہ جب تک ممکن ہو قیام کرنا چاہیے اور مشکلات کو برداشت کرنا چاہیے۔ البتہ جس وقت دشمن کے آزار اور مظالم برداشت کرنے کا نتیجہ اس کی جسارت میں اضافہ ہو اور مومنین کی کمزوری کے سوا کچھ نہ ہو اس وقت ہجرت کرنا چاہیے تاکہ زیادہ طاقت جمع کرنے اور زیادہ مضبوط مورچہ قائم کرنے کا موقع مل سکے اور ہمہ گیر جہاد کے لیے بہتر جگہ میسّر آسکے اور اہلِ حق کو فوجی، ثقافتی اور تبلیغاتی محاذ پر کامیابی حاصل ہو سکے۔

۴۔ **"لنبوئنھم فی الدنیا حسنۃ" کا مفہوم:** یہ جملہ "بوأت لہ مکانا" (وہ مکان کہ جو میں نے اس کے لیے تیار کیا اور اسے اس میں جگہ دی) کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ حقیقی مہاجرین اگرچہ ابتداء میں اپنے مادی وسائل کھو بیٹھے تھے لیکن آخر کار انھیں مادی زندگی کے لحاظ سے بھی کامیابی حاصل ہوئی۔[1]

انسان آخر دشمن کی ضربوں میں رہ کر ذلّت کے ساتھ کیوں مر جائے؟ وہ شجاعت و جراءت کے ساتھ ہجرت کیوں نہ کر جائے اور کیوں نہ نئی جگہ سے مقابلے کی تیاری کرے تاکہ اپنا حق لے سکے۔

سورۂ نساء کی آیہ ۱۰۰ میں یہی مسئلہ زیادہ صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

ومن یھاجر فی سبیل اللّٰہ یجد فی الارض مراغمًا کثیرًا وسعۃ

جو لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں انھیں دنیا میں امن کی بہت وسیع جگہ ملے گی کہ جہاں رہ کر وہ دشمن کو رسوا کر سکتے ہیں۔

۵۔ **مہاجرین کی صفات:** مہاجرین کی دو صفات بیان کی گئی ہیں صبر اور توکّل۔ ان کی ان صفات کو بیان کرنے کا مقصد واضح ہے کیونکہ انسانی زندگی میں پیش آنے والے ایسے روح فرسا حوادث میں سب سے پہلے صبر و استقامت ضروری ہے جتنی مصیبت

---

[1] "لنبوئنھم" اصل میں "بواء" کے مادہ سے جگہ کے اجزاء مساوی ہونے کے معنی میں ہے۔ اس کے برعکس "نبوہ" (بر وزن "مبدء") جگہ کے اجزاء مساوی نہ ہونے کے معنی میں ہے۔ لہٰذا "بوأت لہ مکانا" کا معنی ہے: میں نے اس کے لیے جگہ صاف کی لہٰذا یہ کسی کے لیے کوئی جگہ تیار کرنے کے معنی میں ہے۔

زیادہ ہوگی، اتنی ہی استقامت زیادہ درکار ہوگی پھر اللہ پر توکّل اور اعتماد بھی ضروری ہے اصولی طور پر ایسی مشکلات میں اگر انسان کا کوئی مستحکم اور قابلِ اطمینان سہارا نہ ہو تو اس کے لیے صبر و استقامت ممکن نہیں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ صبر کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اس راہ میں پہلے پہل خواہشاتِ نفسانی کے مقابلے میں صبر و استقامت ضروری ہے اور توکّل کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اس راستے کا آخر یہ ہے کہ انسان اللہ کے سوا ہر کسی سے کٹ جائے اور اس سے پیوستہ ہو جائے لہٰذا پہلی صفت آغازِ سفر ہے اور دوسری اختتامِ سفر[1]

بہر حال بیرونی ہجرت اندرونی ہجرت کے بغیر ممکن نہیں ہے انسان کو چاہیے کہ پہلے وہ اندرونی مادی برائیوں کو چھوڑ کر اخلاقی فضائل کی طرف ہجرت کرے تاکہ وہ بیرونی طور پر اس قسم کی ہجرت کر سکے اور دار الکفر کی ہر چیز کو ٹھوکر مار کر دار الایمان کی طرف منتقل ہو سکے۔

---

[1] تفسیر کبیر، فخر الدین رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں

۴۳۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

۴۴۔ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۭ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝

ترجمہ

۴۳۔ ہم نے تجھ سے پہلے بھی ایسے مرد کہ جن پر وحی نازل کی، کے سوا کسی کو نہیں بھیجا، اگر تم نہیں جانتے تو باخبر لوگوں سے پوچھ لو۔

۴۴۔ (اور وہ لوگ جو) واضح دلائل اور (گزشتہ انبیاء کی) کُتب سے (آگاہ ہیں) اور ہم نے اس ذکر (قرآن) کو تجھ پر نازل کیا ہے تاکہ لوگوں کی طرف جو کچھ ہم نے بھیجا ہے وہ ان سے بیان کرو شاید وہ غور و فکر کریں۔

تفسیر

نہیں جانتے تو پوچھ لو

گزشتہ دو آیتیں حقیقی مہاجرین کے بارے میں تھیں البتہ زیر بحث آیات کے بارے میں دوبارہ اصولِ دین سے متعلق گزشتہ مسائل کا ذکر ہے ان میں مشرکین کے ایک مشہور اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔

وہ کہتے تھے کہ خدا نے تبلیغ رسالت کے لیے کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیج دیا (یا وہ کہتے تھے کہ پیغمبرؐ کے پاس کوئی ایسی غیر معمولی قوت کیوں نہیں ہے جس کے ذریعے وہ ہمیں یہ کام ترک کرنے پر مجبور کر دے کہ جو ہم انجام دیتے ہیں) ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ہم نے تجھ سے پہلے بھی رسول بھیجے ہیں اور وہ بھی بس ایسے ہی مرد تھے کہ جن پر وحی نازل ہوتی تھی (وما ارسلنا من قبلك الا رجالا نوحی الیهم)۔

جی ہاں! یہ مرد نوعِ بشر میں سے تھے ان میں تمام تر انسانی جذبات و احساسات موجود تھے یہ لوگوں کی مشکلات اور مصائب کو سب سے زیادہ سمجھتے تھے۔ ان کی ضروریات کو جانتے تھے جبکہ کوئی فرشتہ ان امور سے اچھی طرح آگاہ نہیں ہو سکتا۔ انسان کے اندر جو گزرتی ہے فرشتہ اُسے نہیں سمجھ پاتا۔

مُسلّم ہے کہ صاحبانِ وحی کی اس کے سوا کوئی ذمہ داری نہ تھی کہ وہ ابلاغِ رسالت کریں۔ ان کا کام تھا کہ وہ پیامِ وحی حاصل کریں

اسے انسانوں تک پہنچائیں اور معمول کے ذرائع کے ساتھ مقاصد وحی کے حصول کی جدوجہد کریں۔ ان کا یہ کام نہ تھا کہ کسی غیر معمولی خدائی طاقت کے ذریعے تمام طبعی قوانین کو توڑتے ہوئے لوگوں کو قبولیت کی دعوت دیں اور انھیں تمام انحرافات ترک کرنے پر مجبور کریں کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو پھر کسی کا ایمان لانا کوئی افتخار کی بات نہ ہوتی اور نہ ہی ایسا ایمان ترقی و کمال کا ذریعہ ہوتا۔

اس حقیقت پر تاکید اور اس کی تائید کے لیے مزید فرمایا گیا ہے: اگر اس بات کا تمھیں علم نہیں تو جاؤ باخبر لوگوں سے پوچھو (فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لاتعلمون)۔

"ذکر" آگاہی اور اطلاع کے معنی میں ہے اور "اھل الذکر" کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ مختلف سطح پر اس کے مفہوم میں تمام آگاہ اور باخبر لوگ شامل ہیں۔

بہت سے مفسرین نے "اھل الذکر" سے اہل کتاب کے علماء مراد لیے ہیں۔ البتہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ "اھل الذکر" کا مفہوم اسی میں محدود سمجھ لیا جائے بلکہ یہ درحقیقت اس کے کلی مفہوم کا ایک مصداق ہے کیونکہ اس بارے میں سوال قاعدتاً اہل کتاب کے اور یہود و نصاریٰ کے علماء سے کیا جانا چاہیے کہ گذشتہ انبیاء و مرسلین نوع بشر میں سے تھے اور مرد تھے کہ جو خدائی احکام کی تبلیغ اور اجراء کے لیے مامور ہوئے تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اہل کتاب ہر لحاظ سے مشرکین کے ہم آہنگ نہ تھے لیکن اسلام کی مخالفت میں وہ ان سے ہم آہنگ تھے لہٰذا گذشتہ انبیاء کے حالات بیان کرنے کے لیے اہل کتاب کے علماء بہتر ذریعہ تھے۔

مفردات میں راغب نے کہا ہے کہ "ذکر" کے دو معانی ہیں یہ لفظ کبھی "حفظ" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی "یاد آوری" کے معنی میں۔ البتہ ممکن ہے یاد آوری دل ہی سے ہو (دل سے یاد کرنا دراصل باطنی ذکر شمار ہوتا ہے) یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کو ذکر کہا جاتا ہے یہ اس بناء پر ہے کہ قرآن حقائق کو واضح کرتا ہے۔

اگلی آیت میں ہے: اگر تم انبیاء اور ان کی کتب کے واضح دلائل سے آگاہ نہیں ہو تو آگاہ اور باخبر لوگوں کی طرف رجوع کرو (بالبینٰت و الزبر)[1]

"بیّنات" "بیّنة" کی جمع ہے اس کا معنی ہے "واضح دلائل"۔ ہوسکتا ہے یہاں یہ انبیاء کے معجزات اور ان کی حقانیت کے دیگر دلائل کی طرف اشارہ ہو۔

"زبر" "زبور" کی جمع ہے اس کا معنی ہے "کتاب"۔

---

[1] "بالبینٰت والزبر" ترکیب کے لحاظ سے کس فعل سے متعلق ہے اس سلسلے میں مفسرین نے کئی ایک احتمالات ذکر کیے ہیں بعض نے اسے "لاتعلمون" سے متعلق سمجھا ہے (جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے اور ظاہری مفہوم سے یہی بات مطابقت رکھتی ہے)
توجہ رہے کہ علم باء کے بغیر اور باء کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔
بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے پہلے "ارسلنا" مقدر ہے اور اصل میں یوں تھا۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

درحقیقت "بینات" کا مفہوم ہے اثباتِ نبوّت کے دلائل اور "زبر" ان کتب کی طرف اشارہ ہے جن میں انبیاء کی تعلیمات جمع تھیں۔

اس کے بعد قرآن روئے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے یہ ذکر (قرآن) تجھ پر نازل کیا تاکہ لوگوں کے لیے جو کچھ نازل ہوا ہے تو ان سے بیان کرے (وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم)۔

تاکہ وہ ان آیات پر غور و فکر کریں اور ان کے حوالے سے جو ذمہ داریاں ان پر عائد ہوتی ہیں ان کی طرف متوجہ ہوں (و لعلھم یتفکرون)۔

درحقیقت تیری دعوت اور رسالت کا پروگرام اصولی طور پر کوئی نئی چیز نہیں۔ گزشتہ رسولوں پر بھی ہم نے آسمانی کتابیں نازل کی ہیں تاکہ وہ لوگوں کو ان ذمہ داریوں سے آگاہ کریں کہ جو خدا، مخلوق اور خود اپنی ذات کی طرف سے ان پر عائد ہوتی ہیں ہم نے تجھ پر قرآن نازل کیا ہے تاکہ تو اس کے مفاہیم اور تعلیمات کو بیان کرے اور انسانوں کی فکر کو بیدار کرے تاکہ وہ مسئولیت اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ قدم اٹھائیں اور رشد و کمال کی طرف آگے بڑھیں (نہ کہ جبری طریقے سے اور خدا کی خلافِ معمول جبری طاقت سے)۔

ایک اہم نکتہ

اہلِ ذکر کون ہیں؟ اہلِ بیت علیہم السلام کے ذرائع سے مروی متعدد روایات میں ہے کہ اہلِ ذکر آئمہ اہلِ بیت ہیں۔

ان میں سے ایک روایت امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے مروی ہے۔ اس آیت کے بارے میں آپ سے پوچھا گیا تو فرمایا:

نحن اھل الذکر و نحن المسئولون

ہم ہیں اہلِ ذکر اور ہم سے سوال کیا جانا چاہیے[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں فرمایا:

الذکر القرآن، و آل الرسول اھل الذکر و ھم المسئولون

ذکر قرآن ہے اور آلِ رسولؐ اہلِ ذکر ہیں اور انھیں سے سوال کیا جانا چاہیے[2]

بعض روایات میں ہے کہ ذکر خود رسول اللہؐ ہیں اور ان کے اہلِ بیت اہل الذکر ہیں[3]

اس مضمون کی اور بھی کئی ایک روایات ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر) ارسلناھم بالبینات والزبر

بعض نے کہا ہے کہ اس کا متعلق "وما ارسلنا" قبل کی آیت میں ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ "نوحی الیھم" سے متعلق ہے۔

واضح ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے مطابق آیت کا ایک خاص مفہوم ہوگا لیکن مجموعی طور پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

[1]، [2]، [3] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۵۵ تا ۵۶۔

اہل سنت کی تفاسیر اور کتب میں بھی اسی مضمون کی بہت سی روایات ہیں ان میں سے ایک روایت ابن عباس سے مروی ہے جسے اہل سنت کی مشہور بارہ تفاسیر میں زیر بحث آیت کی تفسیر کے ضمن میں نقل کیا گیا ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں:

هو محمد وعلی وفاطمه والحسن والحسین هم اهل الذکر والعقل والبیان

محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ ہی اہل ذکر، اہل عقل اور اہل بیان ہیں[1]

آیات قرآن کی تفسیر میں معین مصادیق پر مبنی روایات سے یہ ہمارا پہلا سابقہ نہیں ہے ایسا مصداق آیت کے وسیع مفہوم کو کبھی محدود نہیں کرتا۔

اسی طرح یہاں بھی جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ذکر ہر قسم کی آگاہی، یادآوری اور اطلاع کے معنی میں ہے اور اہل ذکر کے مفہوم میں ہر سطح کے آگاہ اور باخبر افراد شامل ہیں لیکن قرآن مجید چونکہ یادآوری، علم اور آگہی کا زیادہ واضح نمونہ ہے لہٰذا اس پر "ذکر" کا اطلاق

---

[1] احقاق الحق جلد ۳ ص ۴۸۲۔

بارہ تفاسیر سے مندرجہ ذیل تفاسیر مراد ہیں:

۱۔ تفسیر ابو یوسف

۲۔ تفسیر ابن جریح

۳۔ تفسیر مقاتل بن سلیمان

۴۔ تفسیر وکیع بن جراح

۵۔ تفسیر یوسف بن موسیٰ

۶۔ تفسیر قتادہ

۷۔ تفسیر حرب الطائی

۸۔ تفسیر سدی

۹۔ تفسیر مجاہد

۱۰۔ تفسیر مقاتل بن حیان

۱۱۔ تفسیر ابو صالح اور

۱۲۔ تفسیر محمد بن موسیٰ الشیرازی

اسی آیت کی تفسیر میں جابر جعفی کی ایک حدیث ثعلبی کی کتاب میں مرقوم ہے۔ وہ کہتا ہے:

لما نزلت هذه الآية قال علی (ع)، نحن اهل الذکر

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی، حضرت علیؑ نے فرمایا: "ہم اہل ذکر ہیں"

(مذکورہ بالا مدرک کی طرف رجوع کریں)

ہوا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ کی ذات بھی اس کا واضح مصداق ہے اسی طرح آئمہ معصومین کہ جو آنحضرتؐ کے اہل بیت اور آپ کے علم کے وارث ہیں وہ "اہل الذکر" کا واضح ترین مصداق ہیں۔

اس سارے مسئلے کو قبول کر لیا جائے تو یہ آیت کے عمومی مفہوم کے منافی نہیں اور نہ ہی اس بات کے منافی ہے کہ اہل کتاب کے علماء کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علماء اصول اور فقہاء نے اس سے اجتہاد اور تقلید کی بحث میں استدلال کیا ہے اور کہا ہے کہ دینی مسائل میں ناآگاہ افراد کو آگاہ افراد مجتہدین کی پیروی اور تقلید کرنا چاہیے۔

اس موقع پر ایک روایت کے حوالے سے ایک سوال ابھرتا ہے۔ روایت عیون الاخبار میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے مروی ہے روایت کے مطابق جو لوگ اس آیت کی تفسیر میں کہتے تھے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی طرف رجوع کرو ان پر آپ نے اعتراض کیا اور فرمایا:

سبحان اللہ! کیسے ممکن ہے کہ ہم علماء یہود و نصاریٰ کی طرف رجوع کریں کیونکہ اس طرح تو یقیناً وہ ہمیں اپنے مذہب کی طرف دعوت دیں گے۔

پھر فرمایا:

اہلِ ذکر ہم ہیں[1]

اس سوال کا جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ امام نے یہ بات ان لوگوں سے کہی ہے جو آیت سے یہ مراد سمجھتے ہیں کہ ہر دور میں صرف علماء اہلِ کتاب کی طرف رجوع کیا جائے حالانکہ یہ بات ہر زمانے کے لیے نہیں ہے۔ مثلاً امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کے زمانے میں لوگوں کی ہرگز یہ ذمہ داری نہ تھی کہ وہ حقائق جاننے کے لیے یہودی اور عیسائی علماء کے پاس جائیں ایسے زمانے میں علماء اسلام مرجع ہیں اور علماء اسلام کے سید و سردار آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام ہیں۔

دوسرے لفظوں میں پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کے مشرکین کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اس مسئلے سے آگاہی کے لیے کہ اللہ کے نبی نوع بشر میں سے تھے، علماء اہلِ کتاب کی طرف رجوع کریں لیکن اس کا یہ مفہوم نہیں کہ ہر زمانے میں تمام لوگ انہی کی طرف رجوع کریں بلکہ چاہیے کہ ہر زمانے میں ہر مسئلہ اس مسئلے سے آگاہ افراد سے پوچھا جائے اور یہ ایک بدیہی بات ہے۔

بہرحال زیر بحث آیت میں ایک بنیادی اسلامی اصول بیان کیا گیا ہے یہ آیت مادی و روحانی تمام پہلوؤں پر محیط ہے اور تمام مسلمانوں کو تاکید کرتی ہے کہ جو چیز وہ نہیں جانتے اس کے بارے میں آگاہ افراد سے پوچھیں اور جن مسائل سے جو لوگ آگاہ نہیں ہیں وہ ان میں دخل اندازی نہ کریں۔ اس طرح سے قرآن نے نہ صرف اسلامی دینی مسائل میں "تخصص" (SPECIALIZA-TION) کی ضرورت کو باقاعدہ قانونی طور پر تسلیم کیا ہے بلکہ تمام شعبوں، تمام مواقع اور تمام علاقوں میں اس کے لیے تاکید کی ہے اس بناء پر تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ ہر زمانے میں ہر شعبے اور ہر موضوع پر ان کے پاس آگاہ اور ماہر افراد موجود ہوں۔ تاکہ نہ جاننے والے ان کی طرف رجوع کریں۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۵۷۔

اس نکتے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ ہمیں ایسے متخصصین اور ماہرین کی طرف رجوع کرنا چاہیے جن کی صداقت، بے غرضی اور درستی ثابت ہو۔ کیا ہم کبھی کسی ایسے ماہر ڈاکٹر کی طرف رجوع کریں گے خود جس کے کام سے ہم مطمئن نہ ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ تقلید اور مرجعیت کی بحث میں اجتہاد یا اعلمیت کے ساتھ عدالت کو بھی شرط قرار دیا جاتا ہے ——— یعنی مرجع تقلید اسلامی مسائل کا عالم و آگاہ بھی ہو، صاحب تقویٰ بھی ہو۔

۴۵۔ اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

۴۶۔ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝

۴۷۔ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ

۴۵۔ کیا سازش کرنے والے اللہ کے اس دردناک عذاب سے مامون ہو گئے ہیں کہ جو ممکن ہے۔ خدا ان کو زمین میں دھنسا دے یا (اس کی) سزا ایسی جگہ سے ان کے پاس آپہنچے کہ جہاں سے انھیں توقع نہیں ہے۔

۴۶۔ یا جس وقت (زیادہ مال و دولت سمیٹنے کے لیے) وہ دوڑ دھوپ کر رہے ہوں ان کا دامن آپکڑے، جبکہ وہ کہیں فرار بھی نہ کر سکیں۔

۴۷۔ یا انھیں تدریجی طور پر خوف انگیز تنبیہات کے ساتھ اپنی گرفت میں لے کیونکہ پروردگار رؤف اور رحیم ہے۔

تفسیر

مختلف گناہوں کی مختلف سزائیں:

بہت سے مباحث میں قرآن استدلالی مطالب، جذباتی پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ وہ سامعین کے دلوں کے لیے بہت زیادہ اثرانگیز ہو جاتے ہیں۔ زیرِ نظر آیات قرآن کی اسی روش کا ایک نمونہ ہیں۔

گذشتہ آیات میں نبوت و معاد کے مسئلے پر مشرکین سے ایک بحث تھی لیکن زیر بحث آیات میں جابر، مستکبر اور ہٹ دھرم گنہگاروں کو تہدید کی گئی ہے اور انھیں مختلف طرح کے عذابِ الٰہی سے ڈرایا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: نورِ حق کو بجھا دینے کے لیے طرح طرح کی منحوس سازشیں کرنے والے یہ لوگ کیا عذابِ الٰہی سے مامون ہو گئے ہیں حالانکہ ہر آن ممکن ہے خدا انھیں زمین میں دھنسا دے (افامن الذین مکروا السیأت ان یخسف اللہ بھم الارض)۔

کیا یہ بعید ہے کہ زمین پر ایک دہشت ناک زلزلہ آجائے سطح زمین پھٹ جائے اور اس میں وہ تمام تر ساز و سامانِ حیات کے ساتھ دھنس جائیں اور اقوامِ عالم کی تاریخ میں ایسا بارہا ہوا ہے۔

"مکروا السیئات" گھٹیا مقاصد اور غلط اہداف تک پہنچنے کے لیے سازشیں کرنے اور منصوبے بنانے کے معنی میں ہے جیسا کہ مشرکین نور قرآن کو خاموش کرنے، پیغمبر اسلام کو ختم کرنے اور مومنین کو اذیت دینے کے لیے سازشیں کرتے تھے۔

"یخسف" "خسف" (بروزن "وصف") کے مادہ سے پنہاں ہونے اور مخفی ہونے کے معنی میں ہے اسی لیے چاند کی روشنی جب زمین کے سایے میں چھپ جائے تو اسے "خسوف" کہتے ہیں۔ نیز "مخسوف" اس کنوئیں کو کہتے ہیں جس میں پانی چھپ جائے اسی طرح انسان اور مکان زلزلے وغیرہ سے پیدا ہونے والے زمین کے شگاف میں چھپ جائیں تو اسے "خسف" کہتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: یا جب وہ غفلت میں ہوں عذابِ الٰہی ایسی جگہ سے آپہنچے جہاں سے انھیں توقع ہی نہ ہو (او یأتیھم العذاب من حیث لا یشعرون)۔

یا جس وقت وہ زیادہ مال جمع کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے ہوں انھیں عذاب دامنگیر ہو جائے (او یأخذھم فی تقلبھم) جبکہ وہ کہیں بھاگ بھی نہ سکیں (فما ھم بمعجزین)۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں "معجزین" "اعجاز" کے مادہ سے ناتواں اور عاجز کرنے کے معنی میں ہے۔ ایسے مواقع پر یہ عذاب کے چنگل سے فرار کرنے کے معنی میں ہے۔

یا یہ کہ عذابِ الٰہی اچانک ان تک نہ پہنچے بلکہ تدریجی طور پر پے در پے تنبیہوں کے بعد انھیں اپنی گرفت میں لے (او یأخذھم علی تخوف)۔

آج ان کا ہمسایہ کسی سانحے کا شکار ہوا، کل ان کے کسی باغ کو نقصان پہنچا اگلے روز ان کے کچھ اموال ضائع ہو گئے ——— خلاصہ یہ کہ یکے بعد دیگرے انھیں تنبیہیں کی گئیں وہ بیدار ہو گئے تو کیا خوب ورنہ آخری اور اصلی عذاب انھیں اپنی گرفت میں لے لے گا۔

کسی گروہ کے لیے ایسے مواقع پر عذاب اور سزا تدریجی اس لیے ہے کہ ابھی ان میں احتمالِ ہدایت موجود ہے اور خدا کی رحمت اجازت نہیں دیتی کہ اس کے ساتھ دوسروں کا سا سلوک کیا جائے کیونکہ تمھارا پروردگار رؤف اور رحیم ہے (فان ربکم لرءوف رحیم)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ زیرِ بحث آیات میں چار قسم کی سزاؤں کا تذکرہ ہے:

پہلی "خسف" اور زمین میں دھنس جانا۔

دوسری بے خبری میں ایسی جگہ سے عذاب آنا کہ جہاں سے توقع نہ ہو۔

تیسری اس وقت عذاب آپہنچنا جب انسان مال و دولت جمع کرنے کی دُھن میں مگن ہو۔

چوتھی تدریجی سزا اور تدریجی عذاب۔

مسلّم ہے کہ چار قسم کی ان سزاؤں میں سے ہر ایک کسی خاص قسم کے گناہ سے مناسبت رکھتی ہے اگرچہ یہ سب گناہگار "الذین مکروا السیئات" (ایسے لوگ جو گھٹیا سازشیں کرتے اور غلط منصوبے بناتے ہیں) کا مصداق ہیں۔ مختلف گناہوں پر یہ مختلف سزائیں اس لیے ہیں کہ خدا کے تمام کام حکمت کے مطابق اور استحقاق کی مناسبت سے ہوتے ہیں۔

جہاں تک ہماری نظر ہے، اس سلسلے میں مفسرین نے کوئی بات نہیں کہی لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ :
پہلا عذاب سازشیوں کے اس گروہ کے لیے مخصوص ہے جو خطرناک، جابر اور مستکبر ہیں جیسے قارون۔ خدا ان لوگوں کو اقتدار اور طاقت کی ایسی بلندی سے نیچے کھینچتا ہے اور انھیں زمین کی گہرائیوں میں اس طرح سے دھنسا دیتا ہے کہ وہ سب کے لیے باعث عبرت بن جاتے ہیں۔

دوسرا عذاب ایسے سازشیوں کے لیے مخصوص ہے کہ جو عیش و نوش میں سرمست ہوں اور جو سرکش ہوا و ہوس میں غرق ہوں عذاب الٰہی اچانک ایسی جگہ سے انھیں آ پکڑتا ہے کہ جہاں سے انھیں توقع تک نہیں ہوتی۔
تیسرا عذاب دنیا پرست زراندوز لوگوں کے لیے مخصوص ہے ایسے لوگ کہ جو شب و روز اس کوشش میں ہیں کہ جیسے بھی ممکن ہو اور جس جرم اور ظلم سے ہو سکے اپنی دولت میں اضافہ کریں یہ لوگ مال و دولت جمع کرنے میں لگے ہوتے ہیں کہ عذاب الٰہی انھیں آ جکڑتا ہے۔[1]

چوتھا عذاب ایسے لوگوں کے لیے ہے جو طغیان و سرکشی اور سازش و گناہ میں اس حد تک جا پہنچے ہیں کہ اب ان کے لوٹ آنے کی اور کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اس مقام پر تخوف جیسے تہدید کے ذریعے اللہ تعالیٰ انھیں بیدار کرتا ہے، وہ بیدار ہو جائیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو بہتر ورنہ انھیں دہن عذاب میں ڈال دیتا ہے۔
خدا کی رأفت و رحمت کا ذکر ایک علت کے طور پر چوتھے گروہ سے مربوط ہے یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ابھی خدا سے اپنے تمام رشتے منقطع نہیں کیے اور اپنی واپسی کے تمام راستے ابھی تباہ نہیں کیے۔

---

[1] لغت عرب میں "تقلب" اگرچہ ہر قسم کی آمد و رفت کے معنی میں ہے لیکن جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے اور بعض اسلامی روایات میں بھی تاکید کی گئی ہے ایسے مواقع پر تجارت اور کسب مال کے لیے آمد و رفت کے معنی میں ہے (غور کیجیے گا)۔

۴۸۔ اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰہِ وَ ہُمۡ دٰخِرُوۡنَ ○

۴۹۔ وَ لِلّٰہِ یَسۡجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ مِنۡ دَآبَّۃٍ وَّ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ ہُمۡ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ ○

۵۰۔ یَخَافُوۡنَ رَبَّہُمۡ مِّنۡ فَوۡقِہِمۡ وَ یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ ○

ترجمہ

۴۸۔ کیا انھوں نے مخلوق کے خدا کو نہیں دیکھا کہ ان کے سائے کس طرح دائیں بائیں سے حرکت کرتے ہیں اور وہ خضوع و خشوع سے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔

۴۹۔ (نہ صرف ان مخلوقات کے سائے بلکہ) آسمانوں اور زمین میں چلنے والے تمام اور ملائکہ خدا کے حضور سجدہ کرتے ہیں اور ان میں کسی قسم کا کوئی تکبر نہیں ہے۔

۵۰۔ وہ اپنے پروردگار (کی نافرمانی) سے ڈرتے ہیں کہ جو اُن کا حاکم ہے اور جس چیز پر وہ مامور ہیں اسے انجام دیتے ہیں۔

تفسیر

سائے تک اللہ کے حضور سجدہ ریز ہیں

ان آیات میں دوبارہ بحث توحید کی طرف لوٹ آئی ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: کیا وہ (سازشی مشرک) مخلوقِ خدا کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح ان کے سائے ان کے دائیں بائیں حرکت کرتے ہیں اور بڑے خشوع و خضوع سے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں (اولم یروا الی ما خلق اللہ من شیء یتفیؤا ظلٰلہ عن الیمین والشمائل سجدًا للہ وھم داخرون)۔[1]

"یتفیؤا" "فیئ" کے مادہ سے لوٹ آنے اور رجوع کے معنی میں ہے۔

---

[1] "داخرہ" اصل میں "دخور" کے مادہ سے انکساری اور اپنے آپ کو چھوٹا ظاہر کرنے کے معنی میں ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ عرب چیزوں کے صبح کے سائے کو "ظل" کہتے ہیں اور عصر کے سائے کو "فیئ" کہتے ہیں اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ عنائم واموال کے ایک حصے کو "فیئ" کہا گیا ہے تو یہ اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ مالِ دنیا کا بہترین حصہ بھی وقتِ عصر کے سائے کی طرح ہے کہ جو جلد ہی زائل اور ختم ہو جاتا ہے۔

لیکن اس طرف توجہ کی جائے کہ زیر بحث آیت میں دائیں اور بائیں طرف کے سایوں کا ذکر ہے اور لفظ "فیئ" ان سب کے لیے استعمال ہوا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں لفظ "فیئ" وسیع معنی رکھتا ہے اور اس کے مفہوم میں ہر طرح کا سایہ شامل ہے۔

جس وقت آفتاب طلوع ہوتا ہے، انسان جنوب کی طرف منہ کرکے کھڑا ہو تو وہ دیکھے گا کہ سورج اس کے بائیں طرف افقِ مشرق سے بلند ہو رہا ہے اور تمام چیزوں کا سایہ اس کی دائیں طرف پڑ رہا ہے۔ اسی دائیں طرف مغرب ہے یہ صورت اسی طرح سے رہتی ہے اور دائیں طرف کا سایہ رفتہ رفتہ کم ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ وقت زوال آپہنچتا ہے اس وقت سائے بائیں جانب کو ڈھلنے لگتے ہیں اور غروبِ آفتاب تک مشرق کی طرف سائے بڑھتے پھیلتے رہتے ہیں یہاں تک کہ سورج غروب ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ چھپ جاتا ہے۔

اس مقام پر خدا تعالیٰ چیزوں کے سایوں کی دائیں اور بائیں طرف حرکت کا ذکر اپنی عظمت کی نشانی کے طور پر کرتا ہے اور ان کے اس ڈھلنے کو پروردگار کے حضور عالمِ خضوع وخشوع میں سجدہ ریز ہونا قرار دیتا ہے۔

ہمارے سایوں کا ہماری زندگی پر اثر

اس میں شک نہیں کہ ہمارے سائے ہماری زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں شاید بہت سے لوگ اس سے غافل ہیں قرآن نے سایوں کا ذکر اس مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لیے کیا ہے۔

سائے اگرچہ عدم نور کے علاوہ کچھ نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود بہت سے فوائد کے حامل ہیں مثلاً:

۱۔ سورج کی روشنی اور اس کی حیات بخش شعائیں موجودات کی زندگی اور نشوونما کا باعث ہیں جبکہ سائے روشنی کی شعاعوں کی تابش کو اعتدال میں رکھنے کے لیے ایک حیات آفریں کردار ادا کرتے ہیں سورج کی روشنی اگر ایک ہی طرز پر طویل عرصے کے لیے چمکتی رہے تو ہر چیز پژمردہ ہو جائے اور جل جائے ایسے میں سایہ اس شدت وحدت کو اعتدال عطا کرتے ہیں وہ کم وبیش ہوتے رہتے ہیں کبھی اس جانب کو جھکتے ہیں اور کبھی اس جانب کو۔ گویا کبھی اِدھر نوازش کرتے ہیں اور کبھی اُدھر عنایت کرتے ہیں سایوں کا یہ طرزِ عمل چیزوں کی حفاظت اور بچاؤ میں نہایت تاثیر بخش ہے۔

۲۔ جو لوگ بیابانوں میں پھرتے رہتے ہیں یا جنہیں بیابانوں میں رہنا اور گزرنا پڑ جاتا ہے ان کے لیے انسانی سہولت کے لیے سایوں کی غیر معمولی اثر انگیزی بالکل واضح ہے ایسے میں سایہ بھی وہ کہ جو متحرک ہو اور ایک ہی جگہ ٹھہر نہ جاتا ہو اور ہر طرف حرکت کرتا ہو انسانی خواہش اور ضرورت کے عین مطابق ہوتا ہے۔

۳۔ سائے کا ایک مفید پہلو یہ بھی ہے جو عام لوگوں کے خیال کے برخلاف ہے۔ عام لوگ سمجھتے ہیں چیزوں کو دیکھنے کا ذریعہ صرف روشنی ہی ہے حالانکہ نور ہمیشہ سایہ یا نیم سایہ کے ساتھ ہو تو چیزیں دکھائی دیتی ہیں دوسرے لفظوں میں اگر کسی موجود کے ہر طرف ایک جیسی روشنی چمکے اور اس پر کسی قسم کا کوئی سایہ یا نیم سایہ نہ ہو تو روشنی میں مستغرق یہ چیز ہرگز نہیں دیکھی جا سکے گی۔

یعنی ـــــ جس طرح مطلق تاریکی میں کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی اسی طرح مطلق نور میں بھی کوئی چیز نہیں دیکھی جا سکتی بلکہ نور و ظلمت باہم ہوں تو چیزوں کا دیکھا جانا ممکن ہوتا ہے، لہٰذا سایے بھی چیزوں کے نظر آنے اور ان کی شناخت میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ (غور کیجیے گا)۔

زیرِ نظر آیت میں ایک نکتہ اور قابلِ توجہ ہے آیت میں لفظ "یمین" (دائیں طرف) مفرد صورت میں آیا ہے جبکہ "شمائل" جمع کی صورت میں ہے "شمائل" "شمال" (بروزن "مشعل") کی جمع ہے اور شمال کا معنی ہے بائیں طرف۔

تعبیر کا یہ فرق ہو سکتا ہے اس بناء پر ہو کہ جو لوگ جنوب کی طرف رُخ کیے ہوں، دم صبح سایہ ان کے دائیں طرف پڑتا ہے اور پھر وہ مسلسل بائیں طرف حرکت کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وقتِ مغرب افقِ مشرق میں محو ہو جاتا ہے[1]

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ "یمین" اگرچہ مفرد ہے لیکن بعض اوقات اس سے جمع مراد ہوتی ہے اور یہاں جمع مراد ہے[2]

گذشتہ آیت میں صرف سایوں کے سجدہ کرنے کی بات ایک وسیع مفہوم کے طور پر آئی تھی لیکن اگلی آیت میں تمام مادی و غیر مادی اور تمام آسمانی و زمینی موجودات کے بارے میں فرمایا گیا ہے: آسمانوں اور زمین میں حرکت کرنے والی تمام موجودات اور اسی طرح فرشتے خدا کے حضور سجدہ کرتے ہیں (وللہ یسجد ما فی السموٰت وما فی الارض من دابۃ والملٰئکۃ)۔

اور وہ اس میں کسی قسم کا کوئی تکبر نہیں کرتے (وھم لا یستکبرون)۔ اور وہ خدا اور اس کے فرمان کے سامنے تسلیم محض ہیں۔

سجدہ درحقیقت انتہائی خشوع و خضوع اور پرستش کا نام ہے وہ سجدہ جو سات اعضاء کے ساتھ ہم انجام دیتے ہیں سجدہ کے عمومی مفہوم کا ایک مصداق ہے ورنہ سجدہ کا مفہوم بس اسی میں منحصر نہیں ہے۔

عالمِ تکوین اور جہانِ آفرینش میں خدا کی تمام مخلوقات اور موجودات عام قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ اور ان قوانین سے انحراف نہیں کرتیں اور تمام قوانین خدا کی طرف سے ہیں ـــــ پس درحقیقت تمام چیزیں بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہیں، سب اس کی عظمت کی ترجمان ہیں سب اس کی بندگی و بے نیازی کا مظہر ہیں مختصر یہ کہ سب اس کی مقدس ذات کی دلیل ہیں۔

"دابۃ" "حرکت کرنے والے موجود" کے معنی میں ہے نیز اس سے زندگی کا معنی بھی لیا جاتا ہے یہ جو زیرِ نظر آیت میں کہا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں چلنے والی سب موجودات خدا کے حضور میں سجدہ ریز ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندہ موجودات کرۂ ارض ہی سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ آسمانی کرات میں بھی زندہ اور چلنے پھرنے والے موجودات وجود رکھتے ہیں۔

اگرچہ بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ لفظ "من دابۃ" صرف "ما فی الارض" کے لیے ہے یعنی یہاں صرف زمین میں حرکت کرنے اور چلنے پھرنے والوں کے بارے میں بات کی گئی ہے لیکن یہ احتمال بہت بعید معلوم ہوتا ہے خصوصاً جبکہ سورہ شوریٰ کی

---

[1] تفسیر قرطبی، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۷، ص ۱۱۰۔

آیہ ۴۹ میں ہے ۔

ومن اٰیاتہ خلق السمٰوٰت والارض وما بث فیھما من دابۃ

خدا کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین دونوں میں اس کی چلنے پھرنے والی مخلوق موجود ہے ۔

یہ بجا ہے کہ تکوینی اعتبار سے سجدہ اور خشوع وخضوع متحرک موجودات میں منحصر نہیں ہے لیکن چونکہ متحرک موجودات خلقت و آفرینش کے بہت سے اسرار و عجائبات کا مظہر ہیں لہٰذا یہاں انہی کی نشاندہی کی گئی ہے ۔

آیت کے مفہوم میں چونکہ عقل رکھنے والے انسان اور صاحب ایمان فرشتے بھی شامل ہیں نیز حیوانات اور دوسرے جانور بھی اس کے مفہوم میں داخل ہیں لہٰذا سجدہ یہاں عام اختیاری اور تشریعی معنی کا بھی حامل ہے اور تکوینی واضطراری معنی کا بھی ۔

رہا یہ سوال کہ زیر بحث آیت میں فرشتوں کا الگ سے ذکر کیوں ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ " دابۃ "صرف ان چلنے پھرنے والے موجودات کو کہا جاتا ہے کہ جو جسم رکھتی ہیں جبکہ فرشتے چلتے پھرتے تو ہیں لیکن مادی جسم نہیں رکھتے لہٰذا وہ " دابۃ " کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں ۔

ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرم فرماتے ہیں :

اللہ کے کچھ فرشتے ایسے بھی ہیں جو ابتدائے آفرینش سے خدا کے حضور سجدے میں ہیں اور روز قیامت تک اسی طرح سربسجود رہیں گے اور جب وہ قیامت کے دن سجدے سے سر اٹھائیں گے تو کہیں گے ،

ماعبدناک حق عبادتک

ہم سے حق عبادت ادا نہیں ہو سکا ۔

" وھم لا یستکبرون " فرشتوں کی اسی کیفیت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بارگاہ حق میں خضوع اور سجدہ کرتے ہیں اور اس میں ان کے اندر غرور و تکبر کا شائبہ تک نہیں ہوتا ۔

لہٰذا اس کے بعد فوراً ان کی دو صفات کا تذکرہ ہے اور یہ دونوں ان میں تکبر کے نہ ہونے کی جانب اشارہ کرتی ہیں ۔

ارشاد ہوتا ہے وہ اپنے پروردگار کی مخالفت سے ڈرتے ہیں کہ جو ان کا حاکم ہے (یخافون ربھم من فوقھم) ۔

اور جس چیز پر وہ مامور ہیں اسے خوب انجام دیتے ہیں (ویفعلون ما یؤمرون) ۔

جیسا کہ سورہ تحریم کی آیہ ۶ میں فرشتوں کے ایک گروہ کے بارے میں ہے :

لا یعصون اللہ ما امرھم و یفعلون ما یؤمرون

وہ فرمان الٰہی کی مخالفت نہیں کرتے اور انھیں جو کچھ حکم دیا جاتا ہے اسے بجا لاتے ہیں ۔

اس آیہ سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ غرور و تکبر کے نہ ہونے کی دو نشانیاں ہیں ۔ ذمہ داریوں کا خوف اور احکام الٰہی کو بے چون و چرا انجام دینا ۔ ان میں سے ایک تکبر نہ کرنے کی نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے اور دوسری قوانین اور احکام کے بارے میں ان کے طرز عمل کی طرف ۔ طرز عمل درحقیقت نفسیاتی کیفیت کا رد عمل ہے اور اس کا عملی مظاہرہ ہے ۔

آیت میں "من فوقھم" یقیناً حسی اور مکانی طور پر اوپر ہونے کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ مقام کی برتری کی طرف اشارہ ہے کیونکہ خدا سب سے برتر اور بالاتر ہے۔

سورہ انعام کی آیہ ۶۱ میں ہے :

وھوالقاھر فوق عبادہ

وہ اپنے بندوں پر قاہر و غالب ہے۔

قرآن میں ہے کہ فرعون نے اپنی قدرت و طاقت کے اظہار کے لیے کہا :

وانا فوقھم قاھرون

میں ان پر قاہر و غالب ہوں۔ (اعراف ——— ۱۲۷)

ان تمام مواقع پر لفظ "فوق" مقام کی برتری کو بیان کرتا ہے۔

۵۱۔ وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ۝

۵۲۔ وَلَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا ؕ اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ۝

۵۳۔ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَیْهِ تَجْــَٔرُوْنَ ۝

۵۴۔ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ یُشْرِكُوْنَ ۝

۵۵۔ لِیَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَیْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ :

۵۱۔ اور اللہ نے حکم دیا ہے کہ دو خداؤں کا انتخاب نہ کرو (تمہارا) معبود صرف ایک ہے۔ صرف مجھ سے (اور میرے عذاب سے) ڈرو۔

۵۲۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اسی کا ہے اور دین (اور دینی قانون) ہمیشہ اسی کا ہے تو کیا اس کے غیر سے ڈرتے ہو؟

۵۳۔ تمہارے پاس جو کچھ بھی نعمتیں ہیں سب خدا کی طرف سے ہیں پھر جب تمھیں پریشانیاں (اور تکالیف) پہنچتی ہیں تو اسی کو پکارتے ہو۔

۵۴۔ اور جب وہ رنج و تکلیف تم سے دُور کر دیتا ہے تو تم میں سے بعض اپنے پروردگار کے لیے شریک ماننے لگتے ہیں۔

۵۵۔ (چھوڑ و انھیں) ہم نے انھیں جو نعمتیں دی ہیں ان کا کفران کریں اور چند دن (اس دنیاوی مال و متاع سے) فائدہ اٹھائیں۔ پس عنقریب جان لیں گے (تمہارا انجام کا تمھیں کہاں کھینچ لے آیا ہے)۔

تفسیر:

ایک دین اور ایک معبود

توحید اور خدا شناسی کی بحث کے بعد زیرِ نظر آیات میں نظامِ خلقت کے حوالے سے نفی شرک پر زور دیا گیا ہے تاکہ ان دونوں سے مجموعی طور پر حقیقت زیادہ آشکار ہو جائے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: خدا نے حکم دیا ہے کہ دو خدا نہ مانو (وقال الله لاتتخذوا الٰهين اثنين)۔ معبود ایک ہی ہے (انما هو اله واحد)۔

نظامِ خلقت کی وحدت اور اس پر حاکم قوانین کی وحدت، خود خالق و معبود کی وحدت کی دلیل ہے اب جبکہ ایسا ہی ہے تو صرف میرے عذاب سے ڈرو اور میرے فرمان کی مخالفت سے خوف کھاؤ نہ کہ کسی غیر سے ڈرتے پھرو (فایای فارھبون)۔

لفظ "ایای" کا مقدم ہونا حصر کی دلیل ہے جیسے "ایاك نعبد"۔ مطلب یہ ہے کہ صرف اور صرف میری مخالفت اور میرے عذاب سے ڈرتے رہو۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں صرف دو معبودوں کی نفی کی گئی ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ عرب کے مشرکین نے بہت سے بُت اور معبود بنا رکھے تھے اور ان کے بُت خانے مختلف قسم کے بتوں سے بھرے ہوئے تھے ہو سکتا ہے یہ تعبیر ذیل کے نکات میں سے کسی ایک یا سب کی طرف اشارہ ہو۔

۱۔ آیت کہتی ہے کہ دو معبودوں کی عبادت بھی غلط ہے چہ جائیکہ زیادہ معبودوں کی۔ دوسرے لفظوں میں کم از کم بات بیان کر دی گئی ہے تاکہ باقی ماندہ کی نفی زیادہ تاکید کے ساتھ ہو کیونکہ ایک سے زیادہ جس عدد کو بھی اختیار کریں دو سے بہر حال گزرنا پڑے گا۔

۲۔ یہاں تمام باطل معبود ایک شمار کیے گئے ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ انہیں حق کے مقابلے میں قرار نہ دو۔ اور دو معبودوں (معبودِ حق اور معبودِ باطل) کی پرستش نہ کرو۔

۳۔ زمانہ جاہلیت کے عربوں نے درحقیقت دو معبود اپنا رکھے تھے ایک وہ معبود جو خالق ہے اور جہان کو پیدا کرنے والا ہے یعنی اللہ اور دوسرا وہ معبود جسے وہ اپنے اور اللہ کے درمیان وسیلہ سمجھتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ بُت خیر و برکت اور نعمت کا وسیلہ ہیں۔

۴۔ ہو سکتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت "ثنویین" (دو خداؤں کی پوجا کرنے والوں) کے عقیدے کے لیے نفی ہو ثنویین دو خداؤں یعنی نیکی کا خدا اور بدی کا خدا کے قائل تھے۔ دو خداؤں کی پوجا کرنے والوں کی منطق اگرچہ ضعیف اور غلط تھی۔ لیکن عرب بُت پرستوں کے پاس تو ایسی کمزور منطق بھی نہ تھی۔

عظیم مفسر مرحوم طبرسی نے اس آیت کے ذیل میں بعض حکماء سے یہ لطیف جملہ نقل کیا ہے:۔

خدا نے تجھے حکم دیا ہے کہ دو خداؤں کی عبادت نہ کر لیکن تو نے تو اپنے اتنے سارے معبود بنا رکھے ہیں۔

ایک بُت تیرا سرکش نفس ہے، دوسرا بُت تیری ہلو ہوس ہے۔ تیرے مادی مقاصد اس پر مستزاد ہیں یہاں تک کہ تو انسانوں کو سجدہ کرتا ہے۔ تو کس قسم کا توحید کا پرستار ہے۔

اس کے بعد تین آیات میں توحید عبادت کی دلیل چار حوالوں سے پیش کی گئی ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کی ملکیت ہے (و لہ ما فی السمٰوٰت و الارض)۔ تو کیا عالم ہستی کے مالک کو سجدہ کرنا چاہیے، یا بتوں کو کہ جو کسی بھی مالکیت سے محروم ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ نہ صرف آسمان و زمین اس کی ملکیت ہیں بلکہ ہمیشہ سے دین اور تمام قوانین بھی اسی کی طرف سے ہیں (و لہ الدین واصبًا)۔

جب یہ ثابت ہے کہ عالم ہستی اسی کی طرف سے ہے اور وہی تکوینی قوانین ایجاد کرتا ہے تو مسلم ہے کہ تشریعی قوانین بھی اسی کے ذریعے معین ہونا چاہییں لہٰذا طبعاً و فطرتاً اطاعت بھی اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔

"واصب" دراصل "وصب" کے مادہ سے "دوام" کے معنی میں لیا گیا ہے بعض نے اس کا معنی "خالص" کیا ہے فطری بات ہے کہ جب تک کوئی چیز خالص نہ ہو دوام حاصل نہیں کر سکتی) ہو سکتا ہے آیت میں یہ لفظ دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ کر رہا ہو یعنی ہمیشہ اور ہر زمانے میں دینِ خالص خدا کی طرف سے ہے جنھوں نے دین کو اطاعت کے مفہوم میں لیا ہے، انھوں نے "واصب" کا معنی "واجب" لیا ہے یعنی صرف خدا کے حکم کی اطاعت ہونی چاہیے۔

ایک روایت میں بھی ہے کہ ایک شخص نے امام صادق علیہ السلام سے اس جملے کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا تو امام نے فرمایا
واصب یعنی واجب [1]

لیکن واضح ہے کہ یہ معانی ایک دوسرے سے لازم و ملزوم ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کیا اس کے باوجود کہ تمام قوانین دین اور اطاعت خدا سے مخصوص ہیں اس کے غیر سے ڈرتے ہو (افغیر اللہ تتقون)۔

کیا بُت تمھیں کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں ؟
کیا بُت تمھیں کوئی نعمت بخش سکتے ہیں ؟

نہیں تو ——— پھر ان کی مخالفت کا تمھیں خوف کیوں ہے اور ان کی عبادت کو تم کیوں ضروری سمجھے ہو حالانکہ جتنی نعمتیں تمھارے پاس ہیں سب خدا کی طرف سے ہیں (و ما بکم من نعمۃ فمن اللہ)۔

یہ درحقیقت معبودِ یگانہ یعنی اللہ کی عبادت ضروری ہونے کے بارے میں یہاں تیسری بات کی گئی ہے مراد یہ ہے کہ بتوں کی عبادت اگر شکرِ نعمت کی وجہ سے ہے تو انھوں نے تو تمھیں کوئی نعمت نہیں دی کہ جس کا شکر ضروری ہو بلکہ تمھارے وجود پر سرتاپا نعمتِ الٰہی محیط ہے اس کے باوجود تم نے اس کی بندگی کو چھوڑ رکھا ہے اور بتوں کے پیچھے لگے پھرتے ہو۔

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ ص ۳۷۳۔

علاوہ ازیں جب تمھیں پریشانیوں، مصیبتوں اور رنج و بلا کا سامنا ہوتا ہے تو انھیں دور کرنے کے لیے بارگاہِ الٰہی میں آہ و زاری کرتے ہو اور اسے پکارتے ہو (ثم اذا مسکم الضر فالیہ تجئرون)۔ لہٰذا بتوں کی پرستش اگر دفع ضرر اور حلِ مشکلات کے لیے کرتے ہو تو غلط ہے کیونکہ خود تم نے بھی عملی طور پر ثابت کیا ہے کہ زندگی کے سنگین لمحات میں سب چیزوں کو چھوڑ کر خدا کی بارگاہ کی طرف جاتے ہو۔ یہ دراصل مسئلہ توحید عبادت کے بارے میں چوتھی بات ہے۔

"تجئرون" دراصل "جؤار" (بروزن "غبار") کے مادہ سے ہے یہ چوپایوں اور وحشی جانوروں کی اس آواز کو کہتے ہیں جو تکلیف کے عالم میں ان سے بے اختیار نکلتی ہے بعد ازاں یہ لفظ کنایہ کے طور پر ہر اس آہ و زاری کے لیے استعمال ہونے لگا جو درد و غم کے موقع پر بے اختیار بلند ہو۔

اس لفظ کا یہاں پر خصوصیت سے انتخاب اس بات کو تقویت پہنچاتا ہے کہ جب مشکلات بہت زیادہ ہو جائیں جان عذاب میں ہو اور درد و غم کے مارے بے اختیار فریاد بلند کرو تو کیا اس وقت اللہ کے علاوہ کسی کو پکارتے ہو؟ نہیں تو پھر آرام اور سکون کے وقت اور چھوٹی چھوٹی مشکلات کے موقع پر بتوں کے دامن سے کیوں جا لگتے ہو۔

جی ہاں! ان مواقع پر خدا تمھاری فریاد سنتا ہے اس کا جواب دیتا ہے اور تمھاری مشکلات کو برطرف کرتا ہے "پھر جب اللہ تمھارے ضرر اور رنج و غم کو برطرف کر دیتا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ اپنے پروردگار کے لیے شریک ماننے لگتے ہیں اور بتوں کی راہ لیتے ہیں (ثم اذا کشف الضر عنکم اذا فریق منکم بربھم یشرکون)۔

قرآن درحقیقت اس باریک نکتے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے کہ فطرتِ توحید تم سب میں موجود ہے عام حالات میں غفلت غرور، جہالت، تعصب اور خرافات کے پردے اسے ڈھانپ دیتے ہیں لیکن جب طوفانِ حوادث آجائیں اور مصائب کی تند و تیز آندھیاں چل پڑیں تو یہ پردے ہٹ جاتے ہیں اور نورِ فطرت آشکار ہو جاتا ہے اور چہرہ فطرت چمکنے لگتا ہے ایسی حالت میں تم خدا کو اپنے پورے وجود اور اخلاص کے ساتھ پکارتے ہو۔ اور خدا بھی رنج و بلا تم سے دور کر دیتا ہے۔ رنج و بلا کے پردے اس لیے ہٹ جاتے ہیں کہ غفلت کے پردے اٹھ چکے ہوتے ہیں (توجہ رہے کہ آیت میں لفظ "کشف الضر" استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے مشکلات کے پردے ہٹ جانا)۔

ادھر طوفانِ مصائب تھمتا ہے زندگی ساحلِ سکون سے ہم کنار ہوتی ہے اور ادھر وہی غفلت، غرور اور شرک و بت پرستی ظاہر ہونے لگتی ہے۔

منطقی دلائل اور توضیحِ حقیقت کے بعد، زیرِ بحث آخری آیت میں تہدید آمیز لہجے میں کہا گیا ہے، تمھیں جو نعمتیں دی گئی ہیں ان کا کفران کرلو اور چند روز اس دنیاوی مال و متاع سے بہرہ مند ہو لو لیکن عنقریب تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ تمھارے کام کا انجام کیا ہے (لیکفروا بما اٰتینٰھم فتمتعوا فسوف تعلمون)۔

یہ بالکل اس طرح ہے جیسے کوئی انسان کسی منحرف شخص کو مختلف دلائل و براہین کے ساتھ وعظ و نصیحت کرے تو ممکن ہے اس پر کوئی اثر نہ ہو تو آخر میں ایسے تہدید آمیز جملے پر اپنی گفتگو کو تمام کر دے کہ: جو باتیں میں تم سے کہہ چکا ہوں یہ سننے کے باوجود اگر تم

اپنی اصلاح نہ کرو تو پھر جو کچھ کر سکو کرتے رہو لیکن یاد رکھو تم جلد اس کے انجام سے دوچار ہو گے۔

اس بناء پر "لیکفروا" میں "لام" "لام امر" ہے وہ امر جو تہدید کے لیے آیا ہے جیسے "تمتعوا" بھی امر ہے تہدید کے لیے۔ فرق یہ ہے کہ "لیکفروا" غائب کا صیغہ ہے اور "تمتعوا" مخاطب کا۔ گویا پہلے انھیں غائب فرض کرکے قرآن کہتا ہے:

یہ جائیں اور تمام نعمتوں کا کفران کریں۔

اس تہدید سے اب وہ کچھ متوجہ ہوئے ہیں گویا وہ مخاطب کے طور پر سامنے آگئے ہیں۔ اب قرآن ان سے کہتا ہے۔

ان دنیاوی نعمتوں سے چند دن فائدہ اٹھالو لیکن ایک روز دیکھو گے کہ تم کس عظیم اشتباہ اور کتنی بڑی غلطی کے مرتکب ہوئے ہو اور آخرکار تم کس انجام تک آ پہنچے ہو۔

درحقیقت یہ آیت سورۂ ابراہیم کی آیہ ۳۰ کے مشابہ ہے:

قل تمتعوا فان مصیرکم الی النار

کہہ دو چند روز اس دنیا کی لذتیں اٹھالو آخرکار تمھارا انجام کار آتش جہنم ہے[1]

---

[1] بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے "لیکفروا" اس شرک و کفر کی غایت و نتیجہ ہے جو پہلی آیت میں ذکر ہوا ہے اس بناء پر معنی یہ ہوگا:

حوادث کے چنگل سے نجات مل گئی تو بعد ازاں انھوں نے راہِ توحید کو چھوڑ دیا اور شرک کی راہ اپنا لی تاکہ نعمتوں کا کفران و انکار کریں۔

۵۶۔ وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ۗ تَاللّٰهِ لَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُونَ ○

۵۷۔ وَيَجْعَلُونَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُونَ ○

۵۸۔ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ○

۵۹۔ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ○

۶۰۔ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

ترجمہ:

۵۶۔ جو روزی ہم نے انھیں دی ہے وہ اس کا ایک حصّہ بتوں کے نام کر دیتے ہیں جبکہ ان سے وہ کسی قسم کے سود وزیاں کی خبر نہیں رکھتے۔ خدا کی قسم (قیامت کی عدالت میں) ان جھوٹی تہمتوں پر اُن سے بازپرس ہوگی۔

۵۷۔ وہ (اپنے خیال میں) اللہ کے لیے بیٹیوں کے قائل تھے وہ (اس سے) منزہ ہے (کہ اس کی اولاد ہو) لیکن اپنے لیے وہ کچھ چاہتے جو انھیں پسند ہوتا ہے۔

۵۸۔ حالانکہ جب اُن میں سے کسی کو بشارت دی جائے کہ تمھارے ہاں بیٹی ہوئی ہے تو (غم اور پریشانی کے مارے) اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ زہر کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔

۵۹۔ اس بُری خبر پر اپنے قوم قبیلے سے منہ چھپائے پھرتا ہے اور اس فکر میں ہوتا ہے کہ ذلت اٹھا کر اسے زندہ رہنے دے یا تہِ خاک چھپا دے یہ لوگ کیسا بُرا فیصلہ کرتے ہیں۔

۶۰۔ بُری صفتیں انھیں ہی جچتی ہیں جو دارِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ خدا کے لیے تو اعلیٰ صفات ہیں اور وہ عزیز و حکیم ہے۔

تفسیر

جہاں بیٹی کو باعثِ رسوائی سمجھا جاتا تھا

گذشتہ آیات میں شرک و بُت پرستی کے خلاف مدلل بحث تھی۔ اب زیرِ نظر آیات میں مشرکین کی بعض بُری بدعتوں اور گھٹیا عادتوں کو بیان کیا گیا ہے تاکہ شرک پرستی کے خلاف ایک اور دلیل قائم ہو جائے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ان مشرکوں کو ہم نے جو روزی دی ہے اس کا ایک حصّہ بتوں کی نذر کر دیتے ہیں جبکہ انھیں ان سے کسی نفع و نقصان کی خبر تک نہیں (و یجعلون لما لا یعلمون نصیبًا مما رزقنٰھم[1])۔

جس حصّے کا بیان ذکر ہے اُس میں کچھ اونٹ اور دیگر چوپایے شامل ہوتے ہیں اور کچھ حصّہ وہ زرعی پیداوار کا وقف کرتے ہیں اس کی طرف سورۂ انعام کی آیہ ۱۳۶ میں اشارہ ہوا ہے کہ مشرکین زمانہ جاہلیت میں اسے بتوں کے لیے مخصوص سمجھتے تھے اور ان کی راہ میں خرچ کرتے تھے۔ حالانکہ بتوں سے انھیں کوئی فائدہ پہنچتا تھا نہ ضرر کا خوف ہوتا تھا یہ نہایت احمقانہ کام تھا جو وہ انجام دیتے تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا: قسم بخدا! قیامت کی عدالت میں ان تہمتوں اور جھوٹوں کے بارے میں بازپُرس ہوگی (تا للہ لتسئلن عما کنتم تفترون)۔

اس بازپُرس پر ان کے لیے اعتراف کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔ اس اعتراف کے بعد انھیں سزا ملے گی لہٰذا تمھارے اس بُرے اور منحوس عمل کا دنیاوی نقصان بھی ہے اور اُخروی بھی۔

ان کی دوسری منحوس بدعت یہ تھی کہ وہ اس خدا کے لیے بیٹیوں کے قائل تھے کہ جو ہر قسم کی آلائشِ جسمانی سے پاک ہے وہ معتقد تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں (و یجعلون للہ البنات سبحٰنہ)۔ لیکن اپنی نوبت پر اپنے لیے وہ کچھ چاہتے

---

[1] "لما لا یعلمون" کے معنی اور اس کی ضمیر کے بارے میں مفسرین نے دو تفسیریں بیان کی ہیں:

پہلی یہ کہ "لا یعلمون" کی ضمیر مشرکین کی طرف لوٹتی ہے یعنی مشرکین اپنے بتوں کے لیے ایک حصّہ وقف کر دیتے ہیں جبکہ ان سے کسی خیر و شر کی انھیں خبر نہیں۔ ہم نے یہی تفسیر انتخاب کی ہے۔

دوسری یہ کہ "لا یعلمون" کی ضمیر خود بتوں کی طرف لوٹتی ہے یعنی وہ بُت کہ جو علم، شعور اور عقل نہیں رکھتے، ان کے لیے ایک حصّہ نذر کرتے تھے۔

لیکن اس دوسری صورت میں آیت کی تعبیرات میں ایک تضاد سا محسوس ہوتا ہے کیونکہ "ما" عام طور پر غیر ذوی العقول موجودات کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ "یعلمون" عموماً ذوی العقول کے لیے آتا ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتے۔

جبکہ پہلی تفسیر کی بناء پر "ما" بتوں کی طرف اشارہ ہے اور "لا یعلمون" عبادت کرنے والوں کی طرف۔

جو انھیں پسند تھا (و لهم ما يشتهون)۔
یعنی وہ کسی صورت تیار نہ تھے کہ انھی بیٹیوں کو اپنے لیے پسند کریں کہ جنھیں خدا کے لیے قرار دیتے تھے۔ بیٹی تو ان کی نظر میں سخت ننگ و عار، رسوائی اور بدبختی کی علامت تھی۔

اگلی آیت میں بات جاری رکھتے ہوئے ان کی تیسری بری عادت کی نشاندہی کی گئی ہے فرمایا گیا ہے: جب ان میں سے کسی کو بشارت دی جاتی ہے کہ خدا نے تجھے بیٹی دی ہے تو غم اور غصے کے مارے ان کا رنگ سیاہ پڑ جاتا ہے (و اذا بشر احدهم بالانثى ظل وجهه مسودا) اور زہر کے گھونٹ پی کر رہ جاتا (و هو كظيم)[1]

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اپنے خیالِ باطل کے باعث وہ جس ننگ و عار میں مبتلا ہے اس میں اس کی حالت یہ ہے کہ "یہ بری خبر سن کر وہ اپنی قوم قبیلے سے چھپتا چھپاتا ہے" (یتواری من القوم من سوء ما بشر به)۔

بات اس پر بھی بس نہیں ہوتی بلکہ وہ ہمیشہ اس فکر میں غوطہ زن رہتا ہے کہ کیا وہ اس ننگ و عار کو قبول کر لے اور اپنی بیٹی کو اپنے پاس رکھے یا اسے زندہ درگور کر دے (أيمسكه على هون ام يدسه في التراب)۔

آیت کے آخر میں اس ظالمانہ شقاوت آمیز غیرانسانی فیصلے کی انتہائی صراحت سے مذمت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جان لو کہ وہ بہت برا اور قبیح فیصلہ کرتے ہیں (الا ساء ما يحكمون)۔

آخر میں ان تمام برائیوں اور قباحتوں کو آخرت پر ایمان نہ ہونے کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جو دار آخرت پر ایمان نہیں رکھتے انھی کی ایسی بری صفات ہوتی ہیں (للذين لا يؤمنون بالاخرة مثل السوء)۔

لیکن خدا کی صفات بہت عالی ہیں (و لله المثل الاعلى)۔ اور وہ زبردست حکمت والا ہے (و هو العزيز الحكيم)۔

یہی سبب ہے کہ جو انسان اس عظیم و عزیز اور حکیم و دانا خدا کے نزدیک ہوتا ہے اس کے علم و قدرت و حکمت کی بلند صفات کی طاقت ور شعاعیں اس پر پڑتی ہیں اور وہ خرافات اور گھٹیا بدعات سے الگ ہو جاتا ہے۔

لیکن انسان جس قدر اللہ سے دور ہوتا ہے اسی قدر جہالت، زبوں حالی اور ظلمتوں میں پھنستا چلا جاتا ہے۔

اللہ اور اس کی عدالت کو بھول جانا تمام ترپستیوں، برائیوں اور بے راہ رویوں کا باعث ہے۔

ان دونوں بنیادی اصولوں کو یاد رکھا جائے تو انسان میں احساسِ مسئولیت زندہ رہتا ہے وہ جہالت و خرافات کے خلاف جنگ کے لیے توانائی و دانائی کے حقیقی سرچشمہ سے مدد حاصل کرتا رہتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کیوں کہتے تھے؟ قرآن کی متعدد آیات کے مطابق عرب کے مشرکین فرشتوں کو خدا کی

---

[1] "کظیم" اس شخص کو کہتے ہیں جو غم و اندوہ کے عالم میں اپنے تئیں سنبھالے رہا ہو یعنی زہر کے گھونٹ پی رہا ہو۔

بیٹیاں خیال کرتے تھے یا خدا کی طرف منسوب کیے بغیر انھیں عورتوں کی صنف میں سے سمجھتے تھے۔

سورہ زخرف کی آیہ ۱۹ میں ہے:

وجعلوا الملائکة الذین هم عباد الرحمٰن اناثاً

فرشتے کہ جو رحمٰن کے بندے ہیں انھیں وہ عورتیں قرار دیتے تھے۔

سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۴۰ میں ہے:

افاصفاکم ربکم بالبنین واتخذ من الملائکة اناثاً

کیا تمھیں خدا نے بیٹے دیے ہیں اور خود فرشتوں میں سے بیٹیاں بنا رکھی ہیں۔

ہو سکتا ہے یہ خیال گزشتہ اقوام کی خرافات میں سے زمانہ جاہلیت کے عربوں تک پہنچا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ فرشتے چونکہ نظروں سے پوشیدہ ہیں اور پردے میں رہنے کی صفت عورتوں میں پائی جاتی ہے اس لیے وہ انھیں مؤنث سمجھتے ہوں یہی وجہ ہے کہ بعض کے بقول عرب سورج کو مؤنث مجازی اور چاند کو مذکر مجازی کہتے تھے کیونکہ سورج کا قرص اپنے خیرہ کن نور میں چھپا ہوتا ہے اور اس کی طرف نگاہ کرنا آسان نہیں ہے جبکہ چاند کی ٹکیہ پوری طرح نمایاں ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ فرشتوں کے وجود کی لطافت اس توہم کا سبب بنی ہو کیونکہ عورت مرد کی نسبت زیادہ لطیف ہے۔

بہرحال یہ ایک پرانا، غلط اور فضول سا تصور ہے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس خیال باطل کی تلچھٹ ابھی تک بعض لوگوں کی فکر میں موجود ہے یہاں تک کہ مختلف زبانوں کے ادب میں بھی یہ بات دکھائی دیتی ہے کہ کسی خوبصورت عورت کی تعریف کے لیے اسے فرشتہ کہتے ہیں۔ اسی طرح فرشتوں کی تصویر بناتے ہیں تو انھیں عورتوں کی شکل دیتے ہیں حالانکہ اصولی طور پر فرشتے مادی جسم ہی نہیں رکھتے کہ ان کے بارے میں مذکر و مؤنث کی بحث میں پڑا جائے۔

۲۔ **بیٹیوں کو زندہ درگور کیوں کیا جاتا تھا؟** واقعاً یہ بات بڑی دہشت انگیز ہے کہ انسان اپنے انسانی جذبات و احساسات کو مسل کر اتنا آگے بڑھ جائے کہ دوسرے انسان کو قتل کر دے ——— قتل بھی ایسا بدترین کہ پھر جس پر وہ فخر کرتا پھرے ——— پھر قتل بھی اسے کرے کہ جو اس کا اپنا جگر گوشہ ہو ——— کمزور اور ننھی سی جان ہو ——— اور پھر قتل بھی اس طرح سے کہ اس زندہ بولتی جاگتی جان کو اپنے ہاتھوں مٹی میں دفن کر دے۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ انسان ایسا دہشت ناک جرم کرنے لگے چاہے وہ نیم وحشی ہی کیوں نہ ہو۔

اس کام کی یقیناً کچھ معاشرتی، نفسیاتی اور اقتصادی بنیادیں تھیں۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ اس فعل کی ابتداء زمانہ جاہلیت میں یوں ہوئی کہ:

ایک مرتبہ دو گروہوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ فاتح گروہ نے مغلوب گروہ کی بیٹیوں اور عورتوں کو قید کر لیا۔ ایک مدت بعد جب ان کے مابین صلح ہو گئی تو انھوں نے شکست کھانے والے گروہ کے قیدی واپس کرنا چاہے لیکن بعض قیدی لڑکیوں نے فتحمند گروہ کے مردوں سے شادی کر لی تھی انھوں نے یہی پسند کیا کہ دشمنوں کے ہاں ہی رہ جائیں اور پلٹ کر اپنے قبیلے میں نہ جائیں

ان لڑکیوں کے والدوں پر یہ بات بہت گراں گذری۔ انھیں اس پر بہت شرمساری اٹھانا پڑی یہاں تک کہ ان میں سے بعض نے قسم کھائی کہ اگر آئندہ ان کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو وہ خود اسے اپنے ہاتھوں ختم کردیں گے تاکہ وہ دشمنوں کے ہاتھ نہ لگے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح وحشت ناک ترین جرائم اور مظالم ناموس و شرافت کی حفاظت اور خاندان کی عزت کے نام پر انجام دیئے گئے۔

بات یہاں تک جا پہنچی کہ اس قبیح اور شرمناک بدعت کو بعض لوگ سراہنے لگے اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا زمانہ جاہلیت کی ایک رسم بن گئی جس کی قرآن نے شدت کے ساتھ مذمت کی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

واذا الموءودة سئلت بأی ذنب قتلت ۰

وہ لڑکی جسے زندہ درگور کردیا گیا تھا جب اس سے پوچھا جائے گا کہ بتا تجھے کس جرم میں قتل کیا گیا۔

(تکویر ـــــــ ۸، ۹)

لڑکے چونکہ تولید کنندہ ہوتے ہیں اور لڑکیاں مصرف کنندہ لہٰذا یہ احتمال بھی ہے کہ اس امر نے بھی اس ظلم میں مدد کی ہو لڑکے کو وہ لوگ بڑا سرمایہ سمجھتے تھے۔ لوٹ مار اور اونٹوں کی حفاظت وغیرہ میں اس سے کام لیتے تھے۔ جب کہ بیٹیاں ایسے کسی کام نہ آتی تھیں۔

دوسری طرف ان میں قبائلی جنگوں کا ایک دائمی سلسلہ تھا۔ جھگڑے فساد ہوتے رہتے تھے ان میں بہت سے جنگجو مرد اور لڑکے کام آجاتے تھے لہٰذا لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد میں توازن اور تناسب باقی نہیں رہتا تھا۔ لڑکوں کا وجود اس قدر نادر اور عزیز ہوچکا تھا کہ ایک بھی لڑکا پیدا ہوتا تو خاندان کے لیے بڑے فخر کی بات ہوتی جب کہ ایک لڑکی پیدا ہوجاتی تو پورا خاندان رنجیدہ ہوجاتا۔

بات یہاں تک جا پہنچی کہ بعض مفسرین کے بقول جب کسی عورت کے ہاں بچے کی پیدائش کا وقت ہوتا تو اس کا شوہر کہیں غائب ہوجاتا کہیں ایسا نہ ہو کہ لڑکی پیدا ہوجائے اور وہ گھر پر ہو۔ اس کے بعد اگر اسے خبر ملتی کہ لڑکا پیدا ہوا ہے تو ناقابلِ توصیف خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اور شور مچاتے ہوئے گھر میں پلٹ آتا لیکن اگر اسے پتہ چلتا کہ بیٹی ہوئی ہے تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی[1]

بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کی داستان بڑی ہی دردناک ہے ان واقعات پر نظر پڑے تو حالت غیر ہوجاتی ہے۔

ایسے ہی ایک واقعے کے بارے میں لکھا ہے:

ایک شخص پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے اسلام قبول کرلیا، سچا اسلام۔

---

[1] تفسیر فخرالدین رازی جلد ۲۰ ص ۵۵۔

ایک روز وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا اور سوال کیا: اگر میں نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہو تو کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟

آپؐ نے فرمایا: خدا تواب و رحیم ہے۔

اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرا گناہ بہت ہی بڑا ہے۔

آپؐ نے فرمایا: وائے ہو تجھ پر، تیرا گناہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو خدا کی بخشش سے بڑا تو نہیں؟

وہ کہنے لگا: اب جبکہ آپ یہ کہتے ہیں تو میں عرض کروں۔ زمانہ جاہلیت میں میں ایک دور دراز کے سفر پر گیا ہوا تھا ان دنوں میری بیوی حاملہ تھی میں چار سال بعد گھر واپس لوٹا۔ میری بیوی نے میرا استقبال کیا میں گھر آیا تو مجھے ایک بچی نظر پڑی۔ میں نے پوچھا یہ کس کی لڑکی ہے؟ اس نے کہا: ایک ہمسایے کی لڑکی ہے۔ میں نے سوچا گھنٹے بھر تک اپنے گھر چلی جائے گی لیکن مجھے بڑا تعجب ہوا کہ وہ نہ گئی۔ مجھے علم نہ تھا کہ یہ میری لڑکی ہے اور اس کی ماں حقیقت کو چھپا رہی ہے کہ کہیں یہ میرے ہاتھوں قتل نہ ہو جائے۔

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: آخر کار میں نے بیوی سے کہا: سچ بتاؤ یہ کس کی لڑکی ہے؟

بیوی نے جواب دیا: جب تم سفر پر گئے تھے تو میں امید سے تھی بعد میں یہ بیٹی پیدا ہوئی۔ یہ تمہاری ہی بیٹی ہے۔

اس شخص نے مزید کہا: میں نے وہ رات بڑی پریشانی کے عالم میں گزاری کبھی آنکھ لگ جاتی اور کبھی میں بیدار ہو جاتا۔ صبح قریب تھی، میں بستر سے اُٹھا، لڑکی کے بستر کے پاس گیا وہ اپنی ماں کے پاس سو رہی تھی۔ میں نے اسے بستر سے نکالا، اسے جگایا۔ اس سے کہا: میرے ساتھ نخلستان کی طرف چلو۔

اس نے بات جاری رکھی: وہ میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھی یہاں تک کہ ہم نخلستان میں پہنچ گئے میں نے گڑھا کھودنا شروع کیا وہ میری مدد کر رہی تھی میرے ساتھ مل کر مٹی باہر پھینکتی تھی گڑھا مکمل ہو گیا میں نے اسے بغل کے نیچے سے پکڑ کر اس گڑھے کے درمیان دے مارا۔

اتنا سننا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں بھر آئیں ....

اس نے مزید بتایا: میں نے اپنا بایاں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا تا کہ وہ باہر نہ نکل سکے دائیں ہاتھ سے میں اس پر مٹی ڈالنے لگا اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، بڑی مظلومانہ فریاد کی: وہ کہتی تھی ابو جان! آپ مجھ سے یہ سلوک کیوں کر رہے ہیں؟

اس نے بتایا: میں اس پر مٹی ڈال رہا تھا کہ کچھ مٹی میری داڑھی پر آ پڑی بیٹی نے ہاتھ بڑھایا اور

میرے چہرے سے مٹی صاف کی لیکن میں اسی قساوت اور سنگدلی سے اس کے منہ پر مٹی ڈالتا رہا یہاں تک کہ اس کے نالہ و فریاد کی آخری آواز تہِ خاک دم توڑ گئی ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے داستان بڑے غم کے عالم میں سُنی ۔ وہ بہت دکھی اور پریشان تھے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے جا رہے تھے ....

آپ نے فرمایا : اگر رحمتِ خدا کو اس کے غضب پر سبقت نہ ہوتی تو ضروری تھا کہ جتنا جلدی ہوتا وہ تجھ سے انتقام لیتا[1]

قیس بن عاصم بنی تمیم کے سرداروں میں سے تھا ۔ ظہورِ رسالت مآب کے بعد وہ اسلام لے آیا تھا اس کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک روز وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ چاہتا تھا کہ جو سنگین بوجھ وہ اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتا ہے اسے کچھ ہلکا کرے ۔ اس نے رسول اکرمؐ کی خدمت میں عرض کیا :

گزشتہ زمانے میں بعض باپ ایسے بھی تھے جنھوں نے جہالت کے باعث اپنی بے گناہ بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا تھا میری بھی بارہ بیٹیاں ہوئیں میں نے سب کے ساتھ یہ گھناؤنا سلوک کیا لیکن جب میرے ہاں تیرہویں بیٹی ہوئی تو میری بیوی نے اسے مخفی طور پر جنم دیا اس نے یہ ظاہر کیا کہ نومولود مردہ پیدا ہوئی ہے ۔ لیکن اسے چھپ چھپا کر اپنے قبیلے والوں کے ہاں بھیج دیا اس وقت تو میں مطمئن ہو گیا لیکن بعد میں مجھے اس ماجرے کا علم ہو گیا میں نے اسے حاصل کیا اور اپنے ساتھ ایک جگہ لے گیا ۔

اس نے بہت آہ و زاری کی ، میری منتیں کیں ، گریہ و بکا کی مگر میں نے پرواہ نہ کی اور اسے زندہ درگور کر دیا ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ واقعہ سنا تو بہت ناراحت ہوئے ۔ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ آپؐ نے فرمایا :۔

من لا یرحم لا یرحم

جو کسی پر رحم نہیں کھاتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا ۔

اس کے بعد آپؐ نے قیس کی طرف رُخ کیا اور یوں گویا ہوئے :

تمھیں سخت دن درپیش ہے ۔

قیس نے عرض کیا :

---

[1] القرآن یواکب الدھر جلد ۲ ص ۲۱۴ ۔

میں کیا کروں کہ اس گناہ کا بوجھ میرے کندھے سے ہلکا ہو جائے ؟

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

تو نے جتنی بیٹیوں کو قتل کیا ہے اتنے ہی غلام آزاد کر (کہ شاید تیرے گناہ کا بوجھ ہلکا ہو جائے)[1]

نیز مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ بن ناجیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ حریت فکر رکھنے والا ایک شریف انسان تھا۔ زمانہ جاہلیت میں وہ لوگوں کی بہت سی بُری عادات کے خلاف جدوجہد کرتا تھا یہاں تک کہ اس نے ۳۶۰ لڑکیاں ان کے والدوں سے خرید کر انھیں موت سے نجات بخشی۔ ایک مرتبہ اس نے دیکھا کہ ایک باپ اپنی نومولود بیٹی کو قتل کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے۔ اس بچّی کی نجات کے لیے اس نے اپنی سواری کا گھوڑا تک اور دو اونٹ اس کے باپ کو دیئے اور اس بچّی کو نجات دلائی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

تو نے بہت ہی بڑا کام انجام دیا ہے اور تیری جزا اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔

فرزدق نے اپنے دادا کے اس کام پر فخر کرتے ہوئے کہا:

ومنا الذی منع الوائدات

فاحیا الوئید فلم توائد

اور وہ شخص ہمارے خاندان میں سے تھا جس نے بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے کے خلاف قیام کیا۔ اس نے لڑکیوں کو لے لیا اور انھیں زندگی عطا کی اور انھیں تہہِ خاک دفن نہ ہونے دیا۔[2]

ابھی ہم اس مسئلے پر گفتگو تفصیلی کریں گے اور دیکھیں گے کہ اسلام نے کس طرح ان تمام قباحتوں، مظالم اور جرائم کو ختم کر دیا اور عورت کو ایک ایسا مقام بخشا کہ تاریخ میں جس کی نظیر نہیں ملتی۔

۲۔ عورت کے مقام کے احیاء میں اسلام کا کردار: عورت کی تحقیر و تذلیل اور اس کی حیثیت کی تباہی زمانۂ جاہلیت کے عربوں ہی میں نہ تھی بلکہ اس زمانے کی سب سے زیادہ متمدن قوموں کا بھی یہی حال تھا وہ عورت کو ایک حقیر وجود سمجھتے تھے اس سے زیادہ تر ایک متاعِ بازار کا سلوک کرتے تھے نہ کہ انسان کا سا۔ البتہ دورِ جاہلیت کے عربوں کے ہاں عورت کی تذلیل زیادہ تکلیف دہ اور زیادہ وحشت ناک تھی یہاں تک کہ وہ نسب کو صرف مرد سے مربوط سمجھتے تھے اور عورت کو تو قبل پیدائش بچے کی پرورش کے لیے ایک ظرف شمار کرتے تھے۔ زمانہ جاہلیت کے اس شعر سے بھی ان کا یہ نظریہ ظاہر ہوتا ہے:

---

[1] جاہلیت و اسلام صفحہ ۶۲۲۔

[2] قاموس الرجال جلد ۵ ص ۱۲۵۔

بنونا بنو ابنائنا و بناتنا

بنوهن ابناء الرجال الاباعد

ہمارے بیٹے تو صرف ہمارے بیٹوں کے بیٹے ہیں۔ باقی رہے ہماری بیٹیوں کے بیٹے تو وہ تو اور مردوں کے بیٹے ہیں۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ عورت کے لیے حق میراث کے قطعاً قائل نہ تھے اور تعدد ازواج کے لیے بھی کسی حد و حدود کے قائل نہ تھے وہ شادی اس آسانی سے کر لیتے جیسے پانی پیتے ہیں اور اسی آسانی سے طلاق دے دیتے تھے۔

اسلام نے ظہور کیا تو اس نے اس فضول اور بے ہودہ روش کے خلاف مختلف حوالوں اور طریقوں سے سخت جنگ کی۔ اسلام نے خاص طور پر بیٹی کی پیدائش کو ننگ و عار سمجھنے کے خلاف بہت جنگ کی ہے احادیث اسلامی میں کسی خاندان میں بیٹی کی پیدائش کو رحمت الٰہی کی آبشار جاری ہو جانے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ رسول اسلام خود اپنی بیٹی بانوئے اسلام فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا اس قدر احترام کرتے کہ لوگوں کو تعجب ہوتا آپ اپنے اس قدر بلند مقام و منزلت کے ہوتے ہوئے اپنی بیٹی کے ہاتھ چومتے، کسی سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے اپنی بیٹی فاطمہؑ سے ملنے جاتے اور اس کے برعکس جب کسی سفر کے لیے روانہ ہوتے تو آخری گھر جس میں خدا حافظ کہنے کے لیے آتے وہ فاطمہؑ ہی کا گھر ہوتا۔

ایک حدیث میں ہے:

جب رسول اللہؐ کو خبر دی گئی کہ خدا نے انھیں بیٹی عطا فرمائی ہے تو اچانک آپ نے اپنے اصحاب کے چہروں کی طرف دیکھا ان کے چہروں پر افسوس کے آثار نمایاں تھے (گویا زمانہ جاہلیت کی رسموں کے کچھ آثار ابھی ان کے دماغوں میں باقی تھے)۔

رسول اللہؐ نے فوراً فرمایا:۔

ما لکم؟

ریحانة اشمها، و رزقها علی الله عز وجل

تمھیں کیا ہوا؟

اللہ نے مجھے ایک مہکتا ہوا پھول دیا ہے میں جس کی خوشبو سونگھوں گا (رہی بات اس کی روزی کی تو) اس کا رزق خدا کے ذمے ہے[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے، آپ نے فرمایا:

نعم الولد البنات ملطفات، مجهزات، مونسات مفليات۔

بیٹی کتنی اچھی ہوتی ہے، وہ محبت کرنے والی، مددگار، مونس و غم خوار اور پاک و پاک کنندہ

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۵ ص ۱۰۲۔

ہوتی ہے[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا :

من دخل السوق فاشتری تحفۃ فحملھا الی عیالہ کان کحامل الصدقۃ الی قوم محاویج ولیبدء بالاناث قبل الذکور، فانہ من فرح ابنتہ فکانما اعتق رقبۃ من ولد اسمعیل۔

جو شخص بازار جائے اور اپنے گھر والوں کے لیے کوئی تحفہ خریدے وہ اس شخص کی طرح ہے جو حاجت مندوں کی مدد کرے (اسے اس شخص کی سی جزا ملے گی) اور جب گھر آکر اسے بانٹنے لگے تو سب سے پہلے بیٹیوں کو دے اور پھر بیٹوں کو دے کیونکہ جو شخص اپنی بیٹی کو خوش کرے ایسے ہے گویا اس نے اولادِ اسماعیل میں سے کسی غلام کو آزاد کیا ہے[2]

درحقیقت عورت کو اسلام نے جو احترام عطا کیا ہے اسی کے سبب اسے معاشرے میں آزادی نصیب ہوئی اور اسی کے سبب عورتوں کی غلامی کا دور ختم ہوا۔

اس سلسلے میں اور بھی بہت سی کہنے کی باتیں ہیں جو متعلقہ آیات کی تفسیر میں بیان کی جائیں گی لیکن اس حقیقت کو یہاں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اب بھی اسلامی معاشروں میں دورِ جاہلیت کے آثار باقی ہیں۔ اب بھی ایسے گھرانوں کی کمی نہیں جو لڑکے کی پیدائش پر تو خوش ہوتے ہیں لیکن لڑکی کی پیدائش پر افسردہ اور پریشان ہوجاتے ہیں یا کم از کم لڑکے کی پیدائش کو لڑکی پر ترجیح دیتے ہیں۔

البتہ ہوسکتا ہے کہ معاشرے میں عورتوں کی کیفیت کے حوالے سے خاص قسم کے اقتصادی اور معاشرتی حالات ایسی غلط عادات و رسوم کا باعث ہوں لیکن کچھ بھی ہو تمام سچے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایسے طرزِ فکر کو ختم کرنے کی جدوجہد کریں اور اس فکر کی معاشرتی اور اقتصادی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکیں کیونکہ اسلام یہ بات پسند نہیں کرتا کہ چودہ صدیوں بعد اس کے پیروکار دورِ جاہلیت کے افکار و نظریات کی طرف پلٹ جائیں۔ اور ایک نئے دورِ جاہلیت کا آغاز ہوجائے۔

حالت تو یہ ہے کہ مغرب کے معاشرے میں بھی جہاں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ عورت کے لیے اعلیٰ مقام کے قائل ہیں عملی طور پر اسے اس قدر ذلیل کیا گیا ہے کہ اس کی حیثیت ایک بے قیمت گڑیا، آتشِ شہوت کو خاموش کرنے والے وجود یا مال اسباب کے لیے ایک اشتہار سے زیادہ نہیں رہی[3]

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۵ ص ۱۰۰۔

[2] مکارم الاخلاق ص ۵۴۔

[3] یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ اتفاق سے یہ سطور ۲۰ جمادی الثانیہ سنہ ۱۴۰۱ھ کو لکھی جارہی ہیں کہ جو بانوئے اسلام حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا روزِ ولادت ہے۔ اور اسی دن کو اسلامی جمہوریہ ایران کی طرف سے "یومِ خواتین" قرار دیا گیا ہے۔

۶۱۔ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ○

۶۲۔ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۖ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ○

۶۳۔ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

۶۴۔ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

ترجمہ:

۶۱۔ اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم کی وجہ سے سزا دے تو مشیت زمین پر چلنے والا کوئی باقی نہ رہے لیکن وہ ایک عرصے تک انھیں مؤخر کر دیتا ہے البتہ جب ان کی اجل آپہنچتی ہے تو پھر وہ نہ ساعت بھر تاخیر کرتے ہیں اور نہ گھڑی بھر تقدیم کرتے ہیں۔

۶۲۔ وہ خدا کے لیے وہ کچھ قرار دیتے ہیں کہ جسے خود ناپسند کرتے ہیں (یعنی بیٹیاں) اس کے باوجود جھوٹ بولتے ہیں کہ ان کا انجام نیک ہے۔ ناچار ان کے لیے آگ ہے اور وہ (آتش جہنم کی طرف) پیش قدمی کرنے والے ہیں۔

۶۳۔ بخدا تجھ سے پہلے ہم نے اُمتوں کی طرف نبی بھیجے لیکن شیطان نے (ان اُمتوں کو) ان کے اعمال انھیں سجا بنا کر دکھائے اور آج وہی ان کا ولی ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

۶۴۔ ہم نے قرآن تجھ پر نازل نہیں کیا مگر اس لیے کہ جس امر میں وہ اختلاف کرتے ہیں تو ان سے بیان کر دے

اور یہ ان کے لیے ہدایت و رحمت ہے جو لوگ ایمان رکھتے ہیں۔

تفسیر:

خدا فوراً سزا کیوں نہیں دیتا؟

گذشتہ آیات میں مشرکین عرب کے وحشت ناک جرائم اور قبیح بدعتوں کا ذکر ہے ان میں بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ ہو سکتا ہے اس موقع پر بعض ذہنوں میں یہ سوال ابھرے کہ ایسے ظالمانہ اقدامات پر خدا تعالیٰ فوری عذاب کیوں نہیں کرتا؟

زیر نظر آیت اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتی ہے، اگر خدا لوگوں کو ان کے ظلم و گناہ پر سزا دے تو سطح زمین پر کوئی حرکت کرنے والا باقی نہ رہے (ولو یواخذ اللہ الناس بظلمھم ما ترک علیھا من دابۃ)[1]۔

"دابۃ" ہر قسم کے زندہ اور متحرک موجود کو کہتے ہیں یہاں ممکن ہے "علی ظلمھم" کے قرینے سے انسانوں کے لیے کنایہ ہو یعنی اگر خدا انسانوں کا ان ظلم کی وجہ سے مواخذہ کرے تو کوئی انسان سطح زمین پر باقی نہ رہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد زمین پر تمام حرکت کرنے والے اور چلنے پھرنے والے ہوں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ زمین پر چلنے والے جانور معمولاً انسان کے لیے پیدا کیے گئے ہیں جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

هو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعًا

اللہ وہ ہے کہ جس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔

(بقرہ — ۲۹)

لہٰذا جب انسان ختم ہو جائیں تو دوسرے چلنے پھرنے والے جانداروں کے وجود کا فلسفہ بھی ختم ہو جائے گا، اس لیے ان کی نسل بھی منقطع ہو جائے گی۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آیت کے مفہوم کی عمومیت اور وسعت کو دیکھا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ زمین پر بسنے والے تمام انسان ظالم ہیں اور ہر شخص کسی نہ کسی ظلم کا مرتکب ہوا ہے اور اگر فوری سزا نافذ ہو تو کسی کا دامن نہیں بچے گا ——— حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ نہ صرف انبیاء و مرسلین اس زمین پر موجود رہے ہیں کہ جو معصوم ہیں اور اس ظلم کے مصداق نہیں ہیں بلکہ ہر زمانے میں ایسے نیک پاک اور سچے مجاہدین رہے ہیں کہ جن کی نیکیاں یقیناً ان کی چھوٹی برائیوں سے زیادہ ہوتی ہیں اور جو ہرگز ایسی سزا کے مستحق نہیں ہوتے کہ جو نابود کر دے۔

---

[1] "علیھا" کی ضمیر "ارض" کی طرف لوٹتی ہے۔ اگرچہ پہلے اس کا ذکر نہیں آیا اور یہ مطلب کی وضاحت کے لیے ہے۔ اس کی نظیر عربی ادب میں اور دیگر زبانوں کے ادب میں بہت ملتی ہے۔

اس سوال کا جواب یوں دیا جاسکتا ہے ــــــــــ

آیت کا حکم نوعی ہے نہ کہ عمومی کہ جو سب کے لیے ہو۔

ایسے بیانات کی مثالیں عربی ادب میں اور دیگر زبانوں میں موجود ہیں یہ مشہور شعر ہم نے اکثر سُنا ہے:

گر حکم شود کہ مست گیرند
در شہر ہر آنچہ ہست گیرند

اگر حکم ہو کہ جو بھی نشے میں ہو اسے پکڑ لیا جائے تو شہر میں کوئی بھی گرفتاری سے بچ نہ سکے۔

اسی طرح ایک اور شاعر کہتا ہے:

گفت باید حد زند ہشیار، مردِ مست را
گفت ہشیاری بیار، اینجا کسی ہشیار نیست

اس نے کہا کہ جو ہوش میں ہے وہ اس مست شخص پر حد جاری کرے تو جواب ملا کہ پہلے کسی باہوش کو لے آؤ کیونکہ یہاں تو کوئی ہوش میں نہیں ہے۔

اس استثناء کی شاہد سورۂ فاطر کی آیہ ۳۲ ہے، اس میں ارشادِ الٰہی ہے:

ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا فمنھم ظالم لنفسہ ومنھم مقتصد ومنھم سابق بالخیرات باذن اللہ ذٰلک ھو الفضل الکبیر۔

پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے جنھیں چن لیا انھیں کتاب کا وارث بنایا اور انسانوں میں تین طرح کے لوگ ہیں ایک وہ جنھوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا، دوسرے وہ جو درمیانے سے ہیں اور تیسرے وہ کہ جو اذنِ الٰہی سے نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں اور یہ بڑے فضل کی بات ہے۔

یہ بات یقینی ہے کہ زیرِ بحث آیت میں جس عذاب کا ذکر ہے وہ سورۂ فاطر کی مذکورہ آیت کے بیان کردہ پہلے گروہ کے لیے ہے اور ایسے لوگوں کی چونکہ معاشروں میں کثرت ہوتی ہے لہٰذا آیت کے انداز میں عمومیت کوئی قابلِ تعجب بات نہیں ہے۔

ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت انبیاء کی عصمت کی نفی پر ہرگز دلالت نہیں کرتی اور جنھوں نے یہ خیال کیا ہے انھوں نے قرآن کی دیگر آیات اور کلام میں موجود قرائن کی طرف توجہ نہیں کی۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: خدا سب ظالموں کو مہلت دیتا ہے اور اجلِ مسمّٰی (ایک معین زمانے) تک ان کی موت کو مؤخر کر دیتا ہے (ولٰکن یؤخرھم الی اجل مسمّٰی)۔

لیکن جب ان کی اجل آپہنچتی ہے تو پھر گھڑی بھر کی تاخیر ہوتی ہے نہ تقدیم (فاذا جاء اجلھم لا یستأخرون ساعۃ ولا یستقدمون)۔ بلکہ ٹھیک اسی لمحے موت انھیں دامن گیر ہو جاتی ہے اور لحظے کے لیے بھی آگے

پیچھے نہیں ہوتی۔

اجل مسمّٰی کیا ہے؟

"اجل مسمّٰی" کے مفہوم کے بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں البتہ قرآن حکیم کی دیگر آیات کہ جن میں سورۂ انعام کی آیت ۲ اور سورۂ اعراف کی آیہ ۳۴ شامل ہیں، پر نظر رکھی جائے تو اس سے مراد موت کا آنا ہی ہے یعنی خدا بندوں کو ان کی عمر کے آخر تک اتمامِ حجت کے لیے مہلت دیتا ہے کہ شاید ظالم اپنی اصلاح کی فکر کریں اور اپنے طرزِ عمل پر تجدید نظر کریں اور خدا، حق اور عدالت کی طرف پلٹ آئیں۔ جب مہلت کی یہ مدت ختم ہو جاتی ہے تو موت کا حکم جاری ہو جاتا ہے اور موت کے اسی لمحے سے سزا اور عذاب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

"اجل مسمّٰی" کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۳ ص ۲۷۸ (اردو ترجمہ) اور جلد ۴ ص ۹۹ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

اگلی آیت میں قرآن ایک مرتبہ پھر زمانہ جاہلیت کے عربوں کی بری رسموں کی مذمت کرتا ہے قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ وہ خود بیٹیوں سے نفرت کرتے تھے جبکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: ایک طرف تو وہ خود اپنے لیے بیٹیوں کو ناپسند کرتے ہیں لیکن دوسری طرف خدا کے لیے ان کے قائل ہیں (و یجعلون للہ ما یکرھون)۔

یہ عجیب و غریب تناقض اور تضاد ہے سورۂ نجم کی آیہ ۲۲ میں ہے:

یہ ایک انتہائی ناپسندیدہ تقسیم ہے۔

فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ بیٹیاں اچھی چیز ہیں تو پھر تم کیوں بیٹی پیدا ہونے پر پریشان ہو جاتے ہو اور اگر یہ بری چیز ہے تو پھر خدا کے لیے اس کے قائل کیوں ہوتے ہو؟

اس کے باوجود ان کا غلط دعویٰ ہے کہ ان کا انجام نیک ہے اور جزائے خیر انہی کے لیے ہے (و تصف السنتھم الکذب ان لھم الحسنیٰ)۔

کس عمل کی وجہ سے وہ ایسی جزا کی توقع رکھتے ہیں کیا معصوم، بے گناہ بے چاری بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے پر یا پروردگار کی ساحتِ مقدس پر افتراء باندھنے پر؟

لفظ "حسنیٰ"، "احسن" کا مؤنث ہے اس کا معنی ہے نہایت عمدہ، بہت اچھا۔ یہاں بہترین جزا یا بہترین انجام کے معنی میں آیا ہے جس کی یہ مغرور اور گمراہ قوم اپنے تمام تر جرائم کے باوجود قائل تھی۔ اس صورت میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب تو معاد اور قیامت پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے اس کے باوجود اس قسم کی باتیں کیوں کرتے تھے۔

اس سلسلے میں توجہ رہے کہ وہ سب کے سب مطلقاً معاد کے منکر نہیں تھے بلکہ معادِ جسمانی کا انکار کرتے تھے۔ انھیں اس بات سے انکار تھا کہ انسان کو پھر سے مادی زندگی دی جائے گی وہ اس بات پر تعجب کرتے تھے علاوہ ازیں ممکن ہے یہ تعبیر "قضیۂ شرطیہ" کے طور پر ہو یعنی وہ کہتے تھے: بالفرض دوسرا جہان ہو تو ہمیں وہاں بہترین جزا ملے گی۔

بہت سے ظالم وجابر، منحرف اور ہٹ دھرم افراد کی یہی طرزِ فکر ہے کہ خدا سے دُور ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو خدا سے بہت نزدیک سمجھتے ہیں اور انتہائی مضحکہ خیز دعوے کرتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ "حسنیٰ" سے "نعمتِ حسنیٰ" یعنی بیٹے مراد ہیں کیونکہ وہ بیٹیوں کو بُرا اور منحوس سمجھتے تھے لیکن بیٹوں کو اچھا اور اعلیٰ نعمت جانتے تھے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ۔۔۔۔۔۔ اسی لیے بلافاصلہ فرمایا گیا ہے: ناچار ان کے لیے جہنم کی آگ ہے (لا جرم ان لهم النار) یعنی نہ صرف یہ کہ ان کی عاقبت بخیر نہیں بلکہ ان کا انجام کار جہنم کی آگ کے علاوہ کچھ نہیں اور وہ اسی آگ کی طرف پیش قدمی کرنے والے ہیں۔ (و انهم مفرطون)۔

"مفرط" "فرط" (بروزن "فقط") کے مادہ سے آگے بڑھنے والے کے معنی میں ہے۔

ہوسکتا ہے زمانہ جاہلیت کے عربوں کی داستان سن کر بعض یہ سوال کریں کہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اپنے جگر گوشہ و دست بر ربیت کے ساتھ مٹی میں زندہ گاڑ دے۔ اس سلسلے میں اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے: بخدا ہم نے تجھ سے پہلے امتوں کی طرف نبی بھیجے لیکن شیطان نے ان اُمتوں کے اعمال انھیں بہت بنا سنوار کر پیش کیے تھے (تالله لقد ارسلنا الى امم من قبلك فزين لهم الشيطان اعمالهم)۔

جی ہاں شیطان اپنے وسوسوں میں اتنا ماہر ہے کہ قبیح ترین اور بدترین جرائم کو بھی بعض اوقات انسان کے سامنے بہت خوبصورت بنا کر پیش کر دیتا ہے اور وہ اسے باعثِ فخر سمجھنے لگتا ہے جیسا کہ دورِ جاہلیت کے عرب اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کو اپنے لیے سندِ افتخار جانتے تھے وہ اسے غیرت مندی کا مظاہرہ قرار دیتے اور قبیلے کی عزت وآبرو کی حفاظت کے نام پر اس فعل کی تعریف کرتے۔

بیٹی کو زندہ گاڑ دینے والا باپ کہتا:

> میں نے اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں زیرِ خاک دفن کر دیا ہے تاکہ کل کو وہ کسی جنگ میں دشمن کے ہاتھ نہ لگے۔

ظاہر ہے ۔۔۔۔۔۔ جہاں ایسے شرمناک ترین اعمال شیطانی تزئین کے بعد ایسے پُرفریب ہو جائیں تو باقی کاموں کی حالت کیا ہوگی۔

آج بھی شیطانی تزئین کے ایسے نمونے بہت سے افراد کے اعمال میں نظر آتے ہیں۔ آج بھی چوری، غارت گری، تجاوز اور جرم کو مختلف پُرفریب نام دیے جاتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ دورِ حاضر کے مشرکین بھی ان گزشتہ امتوں کے انحرافی طرزِ عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ شیطان نے جن کے اعمال کو خوبصورت بنا کر پیش کیا تھا آج بھی شیطان ان کا ولی، راہنما اور سرپرست ہے (فهو وليهم اليوم) اور یہ اسی کی راہنمائی میں قدم اٹھاتے ہیں۔ اسی بناء پر دردناک عذابِ الٰہی ان کے انتظار میں ہے (ولهم عذاب اليم)۔

" فھو ولیھم الیوم " (آج شیطان ان کا ولی وسرپرست ہے) ——— اس جملے کی مفسرین نے مختلف پیرائے میں تفسیر کی ہے۔ شاید ان میں سے زیادہ واضح وہی ہے جو ہم کہہ چکے ہیں۔ یعنی یہ جملہ دور جاہلیت کے مشرکین عرب کی کیفیت واضح کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ انھوں نے بھی گزشتہ منحرف امتوں کے طرز عمل کی پیروی کی اور شیطان ان کا سرپرست ہے جیسے وہ گزشتہ گمراہوں کا سرپرست تھا۔[1]

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ ابھی تک گزشتہ منحرف امتوں کے کچھ لوگ موجود ہیں اور وہ اپنے انحرافی طریقے کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور شیطان آج بھی پہلے کی طرح ان کا سرپرست ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں بعثت انبیاء کا مقصد بیان کیا گیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ اگر قومیں اور ملتیں اپنی خود غرضیوں اور غلط طور طریقوں کو چھوڑ کر رہبری انبیاء سے وابستہ ہو جائیں تو ایسے خرافات، اختلافات اور عملی تضادات ختم ہو جائیں۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے قرآن تجھ پر صرف اس لیے نازل کیا ہے کہ وہ جس امر میں اختلاف رکھتے ہیں تو اسے ان پر واضح کر دے۔ (وما انزلنا علیك الكتٰب الا لتبین لهم الذی اختلفوا فیه)۔ اور یہ قرآن ان لوگوں کے لیے باعث ہدایت و رحمت ہے جو ایمان رکھتے ہیں (وهدی ورحمة لقوم یؤمنون) شیطانی وسوسے ان کے دلوں سے نکال دیتا ہے نفس امارہ اور شیطان صفت لوگوں کے پہنائے ہوئے پر فریب پردے حقائق کے چہرے سے ہٹا دیتا ہے۔ پس پردہ خرافات و جرائم کو واضح کر دیتا ہے خود غرضیوں نے جو اختلافات پیدا کر دیے ہوتے ہیں انھیں ختم کر دیتا ہے۔ بربریتوں کا خاتمہ کر دیتا ہے اور ہر طرف ہدایت و رحمت کا نور پھیلا دیتا ہے۔

---

[1] لیکن اس تفسیر کا لازمی مطلب یہ ہے کہ " اعمالهم " اور " ولیهم " کی ضمیر میں معنی کے لحاظ سے فرق ہو پہلی ضمیر گزشتہ امتوں کے لیے ہو اور دوسری رسول اللہ کے زمانے کے مشرکین کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے یہ جملہ مقدر مانا جا سکتا ہے۔

هؤلاء یتبعون الامم الماضیة (غور کیجیے گا)

٦٥۔ وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ۝

٦٦۔ وَ اِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِیْكُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآىِٕغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ ۝

٦٧۔ وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ وَ الْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝

ترجمہ:

٦٥۔ اللہ نے آسمان سے پانی نازل کیا اور جب زمین مردہ ہو چکی تھی اسے پھر سے حیات بخشی اس میں اس قوم کے لیے واضح نشانی ہے جو سننے والے کان رکھتی ہے۔

٦٦۔ اور چوپایوں کے وجود میں تمھارے لیے عبرت (کے درس) ہیں۔ ان کے شکم کے اندر سے ہم تمھارے پینے کے لیے ہضم شدہ غذا اور خون میں سے خالص اور پسندیدہ دودھ فراہم کرتے ہیں۔

٦٧۔ کھجور اور انگور کے درختوں کے میووں سے شراب (ناپاک) اور اچھا رزق حاصل کرتے ہو۔ اس میں عقل و دانائی سے کام لینے والی قوم کے لیے روشن نشانی ہے۔

تفسیر:

پانی پھل اور حیوانات

قرآن ایک مرتبہ پھر پروردگار کی گوناگوں نعمتوں کا تذکرہ کرتا ہے یہ در اصل توحید اور خداشناسی کے لیے ایک تاکید بھی ہے اور ساتھ ہی معاد کی طرف بھی اشارہ ہے۔ نیز ان نعمتوں کا تذکرہ بندوں کے احساسِ تشکر کو بیدار کرنے کے لیے بھی ہے اس طرح انھیں زیادہ قربِ الٰہی کے حصول کی طرف مائل کیا گیا ہے ان تینوں پہلوؤں پر نظر رکھی جائے تو ان آیات کا گزشتہ آیات سے تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف گزشتہ آیات میں سے آخری آیت قرآن کے نزول کے بارے میں تھی یہ آیات کہ جو روحِ انسانی کے لیے

حیات بخش ہیں اور زیرِ نظر پہلی آیت آسمان سے بارش کے نزول کے بارے میں ہے۔ اور بارش جسمِ انسانی کے لیے حیات بخش ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس طرح زمین کو جو مردہ ہو چکی تھی اسے حیاتِ تازہ بخشی (واللہ انزل من السماء ماءً فاحیا بہ الارض بعد موتہا)۔

اس امر میں ان کے لیے عظمتِ الٰہی کی واضح نشانی ہے کہ جو سننے والے کان رکھتے ہیں (ان فی ذٰلک لاٰیۃ لقوم یسمعون)۔

آسمان سے بارش برسنے سے زمین کو جو حیات نو ملتی ہے اس کا ذکر قرآن کی بہت سی آیات میں آیا ہے۔ بعض اوقات خشک سالی زمین کو اس طرح سے خشک، خاموش اور بے روح کر دیتی ہے کہ وہ بالکل بے کار اور بنجر ہو جاتی ہے یہاں تک کہ کسی کو یقین نہیں آتا کہ کبھی اس زمین پر بھی سرسبز کھیتیاں لہراتی رہی ہیں یا آئندہ کبھی اس کی کوکھ سے کوئی زندگی جنم لے گی ـــــــ لیکن چند پے در پے بارشیں ہوتی ہیں اور پھر سورج کی حیات بخش شعاعیں اس میں حرکت پیدا کر دیتی ہیں گویا کوئی سو رہا تھا اور اب بیدار ہو گیا ہے یا زیادہ صحیح الفاظ میں کوئی مردہ تھا کہ جس میں بارش کے دمِ مسیحائی سے زندگی لوٹ آئی ہے اس میں طرح طرح کے پھل پھول اُگنے لگتے ہیں۔ سبزے لہلہانا شروع کر دیتے ہیں۔ حشرات الارض اس پر رینگنے لگتے ہیں۔ پرندے اس میں چہچہانے لگتے ہیں اور جانور پھر سے اس کا رُخ کرنے لگتے ہیں اور اس طرح زمزمۂ حیات پھر سے گونج اٹھتا ہے۔

مختصر یہ کہ وہ زمین جو پہلے مردہ اور خاموش تھی اس میں ایسا غلغلہ جاگ اٹھتا ہے کہ انسان مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عالمِ آفرینش کا ایک شاہکار ہے یہ خالق کی قدرت و عظمت کی نشانی بھی ہے اور معاد و قیامت کے امکان کی دلیل بھی ہے اس سے کھلتا ہے کہ مُردے کس طرح دوبارہ لباسِ حیات زیبِ تن کرتے ہیں یہ خدا کی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت بھی ہے ـــــــ خصوصاً بارش ایک ایسی نعمت ہے کہ جس کے حصول کے لیے بندے کچھ بھی زحمت نہیں کرتے۔

پانی کہ جو بہارِ کُن حیات ہے اس کے ذکر کے بعد چوپایوں کے وجود کی نعمت کی طرف اشارہ ہے اس سلسلے میں خصوصیت سے دودھ کا تذکرہ ہے کہ جو انتہائی مفید غذائی عنصر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اور چوپایوں کے وجود میں تمہارے لیے ایک بہت بڑا درسِ عبرت ہے (وان لکم فی الانعام لعبرۃ)۔

اس سے بڑھ کر عبرت کی بات کیا ہو گی کہ ہم تمہیں ان جانوروں کے شکم میں ہضم شدہ غذا اور خون کے درمیان میں سے تمہارے پینے کے لیے خالص اور عمدہ دودھ فراہم کرتے ہیں (نسقیکم مما فی بطونہ من بین فرث ودم لبنا خالصا سائغا للشٰربین)۔

"فرث" لغت میں اس ہضم شدہ غذا کے معنی میں ہے کہ جو معدے کے اندر ہو اور جب وہ انتڑیوں تک پہنچتا ہے تو اس کا حیاتی مادہ بدن میں جذب ہو جاتا ہے اور اس کا پھوک اور فضلہ باہر نکل جاتا ہے اس فضلے کو "روث" (گوبر)

کہتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ شکر کا کچھ مواد اور اسی طرح پانی وغیرہ کی کچھ مقدار معدے کی دیواروں کے ذریعے بدن میں جذب ہو جاتی ہے اور اس کا ایک اہم حصّہ ہضم شدہ غذا کی صورت میں انتڑیوں کی طرف منتقل ہو کر خون میں داخل ہو جاتا ہے۔ نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ دودھ پستان کے اندر موجود خاص غدودوں سے نکلتا ہے اور اس کا اصلی مواد خون اور چربی ساز غدوددوں سے لیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ سفید رنگ، صاف ستھرا اور خالص مادہ، یہ قوت بخش اور عمدہ غذا ہضم شدہ غذاؤں کے درمیان سے کہ جو فضلہ سے مخلوط ہیں اور خون کے بیچوں بیچ سے حاصل ہوتا ہے واقعتاً یہ ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ سرچشمہ اس طرح سے آلودہ اور تنفر آمیز لیکن ماحصل خالص، خوبصورت، دل انگیز اور عمدہ ——— دودھ۔

جانوروں اور ان کے دودھ کے ذکر کے بعد کچھ نباتات کی نعمت کا تذکرہ ہے ارشاد ہوتا ہے: اللہ نے تمہیں کھجور اور انگور کی صورت میں پر برکت غذا عطا کی ہے کبھی تم اسے نقصان دہ شکل میں ڈھال لیتے ہو اور اس سے شراب بناتے ہو اور کبھی اس سے پاک و پاکیزہ رزق حاصل کرتے ہو۔ (ومن ثمرات النخيل والاعناب تتخذون منه سكرًا ورزقًا حسنًا)

اس امر میں ان کے لیے قدرت پروردگار کی ایک اہم نشانی ہے جو عقل و خرد رکھتے ہیں (ان فی ذلك لاٰية لقوم يعقلون)۔

"سکر" کے اگرچہ لغت میں مختلف معانی ہیں۔ یہاں سکرات، مشروبات الکحل اور شراب کے معنی میں ہے اور یہی اس کا مشہور معنی ہے۔

واضح ہے اس آیت میں قرآن نے کھجور اور انگور سے شراب بنانے کی ہرگز اجازت نہیں دی بلکہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "سکرًا" کو "رزقًا حسنًا" کے بالمقابل بیان کیا گیا ہے یہ دراصل شراب کی حرمت اور اس کے غیر مطلوب ہونے کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے لہٰذا اس بات کی ضرورت نہیں کہ ہم یہ کہیں کہ یہ آیت حرمت شراب نازل ہونے سے پہلے کی ہے اور اس کے حلال ہونے کی طرف اشارہ ہے بلکہ اس کے برعکس آیت اس کے حرام ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور شاید یہ تحریم شراب کے لیے پہلا الارم ہے۔

درحقیقت ایک جملہ معترضہ کی صورت میں غذا چاہتا ہے کہ نعماتِ الٰہی سے سوء استفادہ کی طرف بھی اشارہ کرے۔

چند اہم نکات

۱۔ دودھ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا آیات میں پڑھا ہے، قرآن مجید کہتا ہے: کہ دودھ "فرث" (معدے کے اندر ہضم شدہ غذا) اور "دم" (خون) کے درمیان سے نکلتا ہے۔

آج کی فزیالوجی (Physiology)[1] نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ جس وقت غذا معدے میں ہضم اور

---

[1] علم الاعضاء۔

جذب کے لیے تیار ہوجاتی ہے تو معدے اور انتڑیوں کی سطح میں کئی ملین بالوں کی رگوں کے ساتھ ساتھ بہت پھیل جاتی ہے۔ مفید اور ضروری عناصر اُسے جذب کر کے اسے ایک جڑدار درخت تک پہنچاتے ہیں وہی جڑدار درخت کہ جس کی جڑیں پستان کی نوک میں جا کر جمع اور تمام ہوتی ہیں۔ ماں غذا کھاتی ہے تو اس کا نچوڑ خون میں داخل ہوجاتا ہے خون کی ان رگوں کی آخری شاخیں اور "جنین" کے گردشِ خون کا آخری مقام اور اس کی رگوں کی آخری شاخیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہوتی ہیں جب تک بچہ شکمِ مادر میں ہوتا ہے اس طرح غذا ملتی رہتی ہے لیکن جب وہ ماں سے الگ ہوجاتا ہے تو غذا دینے والے قطب نما عقربہ کی نوک ماں کے پستان کی نوک کی طرف رُخ کرتی ہے اس حالت میں اب ماں کا خون نوزاد بچے کے خون تک نہیں پہنچ سکتا یہاں ایک تغیر اور تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے اب ایک صاف شدہ محصول کی ضرورت ہوتی ہے جو بچے کے لیے گوارا اور مناسب ہو ایسے میں "فرث" اور "دم" کے درمیان میں سے دودھ پیدا ہوتا ہے ــــــــ ماں جو کچھ کھاتی ہے اس سے "فرث" بنتا ہے اور پھر اس سے خون پیدا ہوتا ہے اور پھر ان دونوں کے درمیان میں سے دُودھ وجود میں آتا ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ دودھ کی ترکیب بھی "خون" اور "فرث" کی درمیانی سی ترکیب ہے یہ نہ صاف شدہ خون ہے نہ ہضم شدہ غذا۔ یہ "فرث" سے بالا اور خون سے نیچے کی ایک چیز ہے۔ دودھ کے بعض عناصر خون میں نہیں ہوتے اور پستان کی غدود میں بنتے ہیں۔ مثلاً کازوئین ......

خون کے کچھ عناصر جو دودھ میں موجود ہیں وہ بغیر کسی تغیر کے خون کے پلازما (Plasma) سے ترشح ہو کر دودھ میں داخل ہوتے ہیں مثلاً مختلف وٹامن، خوردنی نمک اور مختلف فاسفیٹ۔

کچھ اور مواد بھی خون سے حاصل ہوتا ہے مثلاً دودھ میں موجود شکر (Lactose) خون میں موجود شکر سے حاصل ہوتی ہے جو پستان کے عمل میں مددگار ہوتی ہے اور اس تغیر میں ایک اہم کردار کرتی ہے۔

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں دودھ کی تولید نتیجہ ہے خون کے ذریعے جذبِ غذا کا اور خون کے پستانوں کی غدود سے براہِ راست تعلق کا، لیکن یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ "فرث" کی مخصوص بُو اور خون کا مخصوص رنگ دودھ میں منتقل نہیں ہوتے بلکہ یہ دودھ نئے رنگ اور نئی مہک کے ساتھ پستان کی نوک سے نکلتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ فزیالوجی کے ماہرین کہتے ہیں کہ پستان میں ایک لٹر دودھ پیدا ہونے کے لیے کم از کم پانچ سو لٹر خون کو اس حصے سے گزرنا چاہیے تاکہ ایک لٹر دودھ کے لیے درکار ضروری مواد خون سے حاصل کیا جاسکے جبکہ رگوں میں ایک لٹر خون پیدا ہونے کے لیے ضروری مقدار میں غذائی مواد کو انتڑیوں سے گزرنا پڑتا ہے یہ وہ مقام ہے کہ جہاں "من بین فرث و دم" (ہضم شدہ غذا اور خون کے درمیان میں سے) کا مفہوم پوری طرح واضح ہوتا ہے[1]

۲۔ دودھ ــــــــ ایک اہم غذا۔ دودھ اہم حیاتین سے بھرپور ہے یہ اجزاء باہم مل کر ایک مکمل غذا بناتے ہیں۔

دودھ کے اجزاء یہ ہیں :۔

---

[1] کتاب "شیمی حیاتی و پزشکی" اور کتاب "اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر" جلد ۵ ص ۱ تا ص ۱۱۔

سوڈیم (Sodium)، پوٹاشیم (Pot)، کیلشیم (Calcium)، میگنیشیم، کانسی، تانبا، آئرن، فاسفورس۔۔۔۔ آیوڈ (Iode) اور گندھک۔

اس کے علاوہ دودھ میں آکسیجن، ازات (Azote) اور کاربانک ایسڈ کے اجزا بھی موجود ہوتے ہیں۔ دودھ میں شکر کافی مقدار میں لکٹوز (Lactose) کی شکل میں ہوتی ہے۔

دودھ میں تحلیل شدہ وٹامن اے، بی، سی اور ڈی ہوتے ہیں۔ دورِ حاضر میں ثابت ہو چکا ہے کہ اگر جانور نے خوب چارہ چرلیا ہو تو اس کے دودھ میں ہر طرح کے وٹامن موجود ہوتے ہیں جن سب کی تفصیل اس کتاب میں نہیں آسکتی نیز اس مسئلے پر بھی تقریباً اتفاق ہے کہ دودھ ایک مکمل غذا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں رسول اللہؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

لیس یجزی مکان الطعام والشراب الا اللبن

دودھ کے سوا کوئی چیز کھانے پینے کا مکمل نعم البدل نہیں ہے۔

نیز روایات میں ہے:

دودھ عقل انسانی کو بڑھاتا ہے، ذہن انسانی کو شفا بخشتا ہے، آنکھوں کی بینائی میں اضافے کا باعث بنتا ہے، نسیان کو ختم کرتا ہے، دل کو تقویت دیتا اور کمر کو مضبوط کرتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ آثار دودھ میں موجود حیاتین سے قریبی ربط رکھتے ہیں[1]

۳۔ دودھ ایک خالص اور عمدہ غذا:۔ زیر بحث آیات میں دودھ کو "خالص" اور "گوارا" غذا قرار دیا گیا ہے اور یہ بات پہلی نظر ہی میں ہر شخص کے لیے واضح ہے کہ دودھ کم حجم، پُرقوت اور اضافی مواد سے پاک ایک خالص غذا ہے اور ساتھ ہی یہ ہر سن و سال کے شخص کے لیے، بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے لیے نہایت گوارا، مفید اور مناسب ہے۔

انھی وجوہ کی بناء پر بہت سے بیمار اس غذا سے استفادہ کرتے ہیں خصوصاً ہڈیوں کی نشو و نما کے لیے اس کی بہت زیادہ تاثیر مانی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہڈی ٹوٹ جانے کی صورت میں اس کی سفارش کی گئی ہے۔

"خلوص" کا ایک معنی "پیوند" بھی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ اس قرآنی تعبیر کو ہڈی جوڑنے میں دودھ کے بہت مؤثر ہونے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ دودھ پلانے کے بارے میں جو اسلامی احکام وارد ہوئے ہیں ان میں یہ معنی وضاحت سے نظر آتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ فقہا کہتے ہیں:

اگر بچہ کسی عورت کا اس قدر دودھ پیئے کہ اس کی ہڈی مضبوط ہو جائے اور گوشت اُگ آئے تو یہ اس عورت کا محرم اور رضاعی بیٹا ہو جائے گا۔

---

[1] کتاب "اولین دانش گاہ و آخرین پیامبر" جلد ۲ میں موجود دودھ کی بحث سے استفادہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح کا حکم اس عورت کے شوہر اور دیگر رشتہ داروں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔[1]

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء کے نزدیک پندرہ مرتبہ پے در پے دودھ پینے سے یہاں تک کہ ایک شب و روز دودھ پینے سے پینے والا اس عورت کا محرم ہو جاتا ہے جس کا اس نے دودھ پیا ہے۔

ان دونوں باتوں کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو کیا اس کا یہ مفہوم نہیں ہو گا کہ چوبیس گھنٹے دودھ پینا بھی ہڈیوں کی تقویت اور گوشت لگنے کے لیے مؤثر ہے۔

اس نکتے کی یاددہانی بھی ضروری ہے کہ اسلامی احکام میں پہلے دن کے دودھ کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے یہاں تک کہ اسلام کی فقہی کتب میں بچے کی زندگی کو اس سے وابستہ سمجھا گیا ہے۔ اسی بناء پر بچے کو پہلا دودھ پلانا واجبات میں شمار کیا گیا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے بارے میں سورۂ قصص کی آیہ میں ہے۔

واوحینا الی ام موسی ان ارضعیه فاذا خفت علیه فالقیه فی الیم

موسیٰ کی ماں کو ہم نے وحی کی کہ اسے دودھ پلاؤ اور جب تمہیں اس کے بارے میں خوف لاحق ہو تو اسے دریا کی موجوں کے سپرد کر دو۔

---

[1] شرح لمعہ، کتاب نکاح احکام الاولاد و منہا الرضاع۔

۶۸۔ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝

۶۹۔ ثُمَّ كُلِىْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِىْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۭ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَاۗءٌ لِّلنَّاسِ ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

ترجمہ:

۶۸۔ تیرے پروردگار نے (نظامِ فطرت کے تحت) شہد کی مکھی کو وحی کی کہ پہاڑوں میں، درختوں میں اور جو عرشے لوگ بناتے ہیں ان میں گھر بنا۔

۶۹۔ پھر تمام پھلوں میں سے کھا اور جو راستے تیرے پروردگار نے تیرے لیے معین کیے ہیں ان میں راحت سے چل پھر۔ ان کے بطن سے پینے کی ایک خاص چیز نکلتی ہے اس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ اس امر میں اہلِ فکر و نظر کے لیے بڑی نشانی ہے۔

تفسیر:

شہد کی مکھی اور وحی الٰہی

یہاں قرآن کا لب و لہجہ بہت شگفت انگیز ہوگیا ہے نعماتِ الٰہی اور اسرارِ آفرینش کی بات جاری رکھتے ہوئے شہد کی مکھی اور پھر شہد کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے لیکن اس طرح سے کہ شہد کی مکھی خدا کی طرف سے مامور ہے ——— بتایا گیا ہے کہ رمز آمیز الہام و ہدایت کہ جسے "وحی" کا نام دیا گیا ہے کے تحت شہد کی مکھی مشغول کار ہے۔ ارشاد ہوتا ہے تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کو وحی کی کہ درختوں، پہاڑوں اور لوگوں کے بنائے ہوئے عرشوں اور مچانوں میں گھر بنا (واوحی ربك الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتًا ومن الشجر ومما یعرشون)۔

اس آیت میں چند قابلِ غور تعبیرات آئی ہیں:

۱۔ "وحی" کا مفہوم، جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے دراصل تیز اشارے کے معنی میں ہے بعد ازاں یہ لفظ مخفی طور پر کوئی بات القاء کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ لیکن قرآن مجید میں یہ مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ ان سب

معانی کی بازگشت اسی اصل معنی کی طرف ہے قرآن کے مفاہیم میں ایک ——— وحی نبوت ——— ہے زیادہ تر یہ لفظ قرآن میں اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ سورۂ شوریٰ کی آیت ۵۱ میں ہے:

وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیًا ۔ ۔ ۔ ۔

انسان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ طریقِ وحی کے سوا کسی طرح اللہ سے کلام کرسکے۔

نیز "وحی" الہام کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے یہ الہام خودآگاہ (انسانوں کے لیے) بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً

واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیہ فاذا خفت علیہ فالقیہ فی الیم

اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی کہ اپنے نومولود کو دودھ پلا اور جب بچے اس کے بارے میں دشمنوں کا خطرہ محسوس ہو تو اسے دریا کی لہروں کے سپرد کر دے (قصص ——— ۷)

اور یہ الہام ناآگاہ اور طبعی صورت میں بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ شہد کی مکھی کے بارے میں زیر بحث آیات میں مذکور ہے کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ یہاں "وحی" حکم غریزہ یا طبیعت میں کوئی بات ڈال دینے کے معنی میں ہے اور یہ چیز خدا تعالیٰ نے مختلف جانوروں میں رکھی ہے۔

نیز "وحی" اشارے کے معنی میں بھی ہے جیسا کہ حضرت زکریا کے واقعے میں ہے:

فاوحیٰ الیھم ان سبحوا بکرۃ و عشیا

زکریا نے لوگوں کو اشارے سے کہا، صبح و شام اللہ کی تسبیح کرو۔ (مریم ——— ۱۱)

نیز مخفی طور پر خبر پہنچانے کے معنی میں بھی آیا ہے جیسا کہ سورۂ انعام کی آیہ ۱۱۲ میں ہے:

یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورًا

انسانی اور غیر انسانی شیاطین مخفی طریقے سے پُر فریب اور گمراہ کن مطالب ایک دوسرے تک پہنچاتے ہیں۔

۲۔ کیا طبعی الہام شہد کی مکھیوں سے مخصوص ہے؟ طبائع و غرائز یا طبعی الہام شہد کی مکھیوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام جانوروں میں موجود ہے اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہاں یہ تعبیر استعمال کیوں کی گئی ہے۔

ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہوجاتا ہے وہ یہ کہ موجودہ زمانے میں جبکہ شہد کی مکھیوں کی زندگی کا سائنسدانوں نے نہایت دقتِ نظر کے ساتھ مطالعہ کیا ہے تو یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اس عجیب و غریب جانور کا تمدن اور شگفت آمیز اجتماعی طرزِ حیات کئی حوالے سے انسان اور اس کی اجتماعی زندگی سے بڑھ کر ہے۔

گزشتہ زمانے میں اس کی عجیب و غریب زندگی کچھ تو واضح تھی لیکن عصرِ حاضر کی مانند اس کی زندگی کے ایک سے ایک بڑھ کر عجیب تر پہلو انسان کے سامنے نہ تھے۔ قرآن نے نہایت اعجاز آمیز انداز میں لفظ "وحی" کے ذریعے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے تاکہ یہ حقیقت واضح کرے کہ شہد کی مکھی کی زندگی کا ہرگز چوپایوں اور دیگر جانوروں کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا اس طرح سے قرآن چاہتا ہے کہ ہم اس عجیب جانور کی اسرار آمیز دنیا میں قدم رکھیں اس کے خالق کی عظمت و قدرت سے آشنا ہوں۔ اس آیت میں

کلام کا لب و لہجہ بدلنے کا یہی راز ہے۔

۲۔ شہد کی مکھی کا گھر: آیت میں سب سے پہلے شہد کی مکھی کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اسے گھر بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے شاید پہلے اس بات کا ذکر اس لیے کیا گیا ہو کہ مناسب گھر زندگی کی پہلی ضرورت ہے باقی کاموں کی باری بعد میں آتی ہے یا ہو سکتا ہے یہ اس بناء پر ہو کہ مسدس کمروں کی شکل میں بنی ہوئی شہد کی مکھیوں کی عمارت جو شاید کئی ملین سالوں سے دنیا بھر میں یونہی بنتی چلی آرہی ہے، ان کی زندگی کی ایک عجیب ترین بات ہو۔ یہاں تک کہ یہ تعمیر خود شہد بنانے سے عجیب تر ہے۔ شہد کی مکھی کس طرح سے ایک خاص قسم کی موم تیار کرتی ہے اور کیسی عمدگی، نفاست اور صفائی سے پیمائش شدہ مسدس کمرے بناتی ہے۔ بنیادی طور پر کسی ایک سطح سے اس طرح سے پورا استفادہ کرنا کہ اس کا کوئی حصہ بے کار نہ رہ جائے یا اس کے زاویے و رونے تنگ و تاریک نہ ہوں ـــــ اس کے لیے مسدس شکل سے بہتر مساوی زاویوں کا کوئی اور انتخاب نہیں ہو سکتا علاوہ ازیں ایسے گھروں میں پائیداری بھی ہوتی ہے۔

۳۔ گھر کا انتخاب: جیسا کہ قرآن کہتا ہے ایسے گھر بعض اوقات پہاڑوں میں بنائے جاتے ہیں ـــــ ناقابل عبور پتھروں کے درمیان ان کے ایسے خاص سوراخوں میں جو اس مقصد کے لیے بالکل مناسب ہوتے ہیں۔

کبھی شہد کی مکھیاں یہ گھر درختوں کی ٹہنیوں میں بناتی ہیں۔ اور گاہ ان گنبد نما جگہوں میں کہ جو لوگ ان کے لیے عرشوں کے اوپر بناتے ہیں۔

اس تعبیر سے ضمناً معلوم ہوتا ہے کہ شہد کا چھتہ پہاڑ، درخت اور عرش کی بلند جگہ پر ہونا چاہیے تاکہ وہ اس سے اچھی طرح فائدہ اٹھا سکیں۔

اس کے بعد شہد کی مکھی کی دوسری ذمہ داری بیان کی گئی ہے قرآن کہتا ہے: اس کے بعد ہم نے اسے یہ وحی کی کہ تو تمام قسم کے پھلوں میں سے کھا۔ (ثم کلی من کل الثمرات)۔ اور جو راستے تیرے رب نے تیرے لیے معین کیے ہیں ان میں بڑی راحت سے چل پھر۔ (فاسلکی سبل ربک ذللا)۔

"ذلل" "ذلول" کی جمع ہے اس کا معنی ہے "ہموار" اور "تسلیم" یہ راستوں کی توصیف کے لیے آیا ہے اس لیے کہ یہ راستے اس باریک بینی کے ساتھ معین کیے گئے ہیں کہ شہد کی مکھیوں کے سامنے تسلیم اور ہموار ہیں اس سلسلے میں ہم بعد ازیں وضاحت کریں گے۔

آخر میں ایک نتیجے کی صورت میں ان کی ماموریت کا آخری مرحلہ بیان کیا گیا ہے: شہد کی مکھیوں کے اندر سے ایک خاص طرح کی پینے کی چیز نکلتی ہے کہ جو مختلف رنگ کی ہوتی ہے (یخرج من بطونها شراب مختلف الوانه)۔

---

[1] ابھی تک شہد کی مکھیوں کی ۵۰۰۰ اقسام دریافت ہو چکی ہیں لیکن یہ بات بڑی عجیب ہے کہ جماعت اختیار کرنے میں ان کا طرز عمل، شہد بنانا، پھولوں کا رس چوسنا اور کھانا سب کچھ ایک جیسا ہے۔ (اولین دانشگاہ وآخرین پیامبر جلد ۵ ص ۵۵)

یہ شرابِ حلال انسانوں کے لیے بڑی اہم شفا بخش چیز ہے (فیہ شفاء للناس)۔
شہد کی مکھیوں کی یہ زندگی انسان کے لیے غذا بھی مہیا کرتی ہے اور شفا بھی اور سبق آموز بھی ہے اس میں اہل فکر و نظر کے لیے عظمت و قدرت پروردگار کی واضح نشانی ہے (ان فی ذٰلک لاٰیۃ لقوم یتفکرون)۔
اس آیت میں بھی چند پُر معنی اور قابلِ توجہ نکات ہیں۔

چند قابلِ توجہ نکات :

۱۔ شہد کس چیز سے بنتا ہے؟ شہد کی مکھیاں عموماً شکر کا خاص مادہ جو پھولوں کی جڑوں اور ابتدائی حصّوں میں ہوتا ہے اسے چوستی ہیں اور اسے جمع کرتی ہیں لیکن ان مکھیوں کی شناخت رکھنے والے کہتے ہیں کہ مکھیاں پھولوں کے نیچے ابتدائی حصّوں میں موجود شکر سے ہی استفادہ نہیں کرتیں بلکہ بعض اوقات پھولوں کے تخمدانوں نیز بیجوں اور پھلوں کے ابتدائی حصّوں سے بھی استفادہ کرتی ہیں۔ قرآن ان سب کو "من کل الثمرات" (سب پھلوں سے) تعبیر کرتا ہے۔
ایک ماہر حیاتیات مسٹر مٹرلینگ اس سلسلے میں ایک عجیب بات کہتا ہے اس کی اس بات سے قرآنی تعبیر کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے وہ کہتا ہے :

> آج اگر شہد کی مکھی (پالتو ہو یا جنگلی جس قسم کی بھی ہو) ختم ہو جائے تو ہمارے ایک لاکھ قسم کے نباتات، پھول اور پھل نابود ہو جائیں اور کیا معلوم کہ اصلاً ہمارا تمدن ہی ختم ہو جائے۔[1]

اس نے یہ اس لیے کہا ہے کیونکہ نر پھولوں کے دانے بکھیرنے میں، مادہ پودوں کو حاملہ کرنے میں اور اس کے بعد پھلوں کی پرورش میں شہد کی مکھیوں کا کردار اس قدر عظیم ہے کہ بعض ماہرین کے نزدیک ان کا یہ کام شہد بنانے سے کہیں اہم ہے درحقیقت شہد کی مکھیاں جو کچھ ان سے کھاتی ہیں وہ بالقوہ طرح طرح کے پھل ہیں کہ جو ان کی مدد سے صورت پذیر ہوتے ہیں اس صورت میں دیکھا جائے تو "کل الثمرات" کی تعبیر کس قدر معنی خیز معلوم ہوتی ہے۔
۲۔ ہموار اور مطیع راستے : مکھیوں کا علم رکھنے والے اپنی تحقیقات کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ صبح کے وقت شہد کی مکھیوں کا ایک غول جو پھولوں کی پہچان پر مامور ہوتا ہے چھتے سے نکلتا ہے اور پھولوں سے بھری جگہوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے لوٹ آتا ہے اور دوسروں کو اطلاع فراہم کرتا ہے اس طرح سے ان کی سمت اور پروگرام کا تعین ہوتا ہے اور چھتے سے ان کا فاصلہ بھی دوسروں پر واضح ہو جاتا ہے۔ شہد کی مکھیاں پھولوں کی جگہ تک پہنچنے کے لیے بعض اوقات اپنے راستے میں نشانیاں اور علامتیں مقرر کرتی ہیں وہ اپنے راستے میں مختلف قسم کی مہک پھیلا کر یا کسی اور طرح سے راستے کو معین کرتی ہیں اس کے باعث بہت کم امکان ہوتا ہے کہ کوئی مکھی راستے سے بھٹک جائے۔
"فاسلکی سبل ربک ذللا" (اپنے رب کے راستوں پر چل پھر کہ جو تیرے لیے مطیع اور ہموار کیے گئے ہیں)۔

---

[1] اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر جلد ۵ ص ۵۵۔

یہ جملہ گویا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۲۔ شہد کہاں بنتا ہے؟ شاید ابھی تک بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ شہد کی مکھیوں کا طریق کار یہ ہے کہ وہ پھول کا شیرہ چوس کر منہ میں جمع کر لیتی ہیں اور پھر چھتے میں سٹور کر دیتی ہیں حالانکہ معاملہ اس طرح نہیں ہے وہ پھولوں کا شیرہ اپنے بدن کے بعض خانوں میں بھیج دیتی ہیں ان خانوں کو مکھیوں کا علم رکھنے والے "پوٹ" کہتے ہیں۔ یہ جگہ دراصل ایک چھوٹے سے کیمیکل کارخانے کی حیثیت رکھتی ہے، یہاں پھولوں کے رس میں مختلف تغیرات اور تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور آخر کار یہ شہد کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پھر مکھی اس تیار شدہ شہد کو اپنے بدن سے باہر نکالتی ہے۔

یہ بات عجیب ہے کہ سورۂ نحل مکی سورتوں میں سے ہے اور ہم جانتے ہیں کہ مکہ کے علاقے میں نہ پھل ہوتے ہیں نہ پھول اور نہ ہی شہد کی مکھیاں لیکن قرآن اس بارے میں اس عمدگی اور باریکی سے گفتگو کر رہا ہے اور انتہائی دلکش انداز میں شہد بنانے کی تفصیلات بیان کر رہا ہے۔ مثلاً

یخرج من بطونها شراب مختلف الوانه

شہد کی مکھیوں کے اندر سے مختلف رنگوں کا ایک مائع نکلتا ہے۔

۴۔ شہد کے مختلف رنگ: شہد کی مکھی جس رنگ کے پھل یا پھول پر بیٹھتی ہے اور اس کا رس چوستی ہے اس رنگ کے اعتبار سے شہد مختلف رنگوں کا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ شہد کبھی سیاہ قہووں کی طرح کا، کبھی چاندی کی سی سفیدی کے ساتھ، کبھی بے رنگ، کبھی زرد، کبھی شفاف، کبھی سیاہ، کبھی گولڈن، کبھی بھورے کی مانند یہاں تک کہ کبھی سیاہی مائل ہوتا ہے۔

رنگوں کا یہ تنوع شہد کے سرچشموں کے تنوع کو ظاہر کرنے کے علاوہ ذوق کے تنوع کا بھی غماز ہوتا ہے کیونکہ آج کے زمانے میں ثابت ہو چکا ہے کہ غذا کا رنگ انسان کی بھوک اور خواہش کو تحریک کرنے میں بہت ہی مؤثر ہوتا ہے۔ متقدمین بھی گویا اس نفسیاتی مسئلے کو پہچانتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی غذاؤں کو زعفران، ہلدی اور دوسرے رنگوں سے رنگین کرتے تھے تاکہ دیکھنے میں مہمانوں کو غذا اچھی لگے اور انھیں کھانے کے لیے تشویق پیدا ہو۔ غذا شناسی کی کتب میں اس ضمن میں بہت بحث کی گئی ہے کہ جسے تفسیر کی موجودہ حدود کے پیش نظر تمام تر نقل کرنا مناسب نہیں ہے۔

۵۔ شہد، غیر معمولی شفا بخش مادہ ہے: ہم جانتے ہیں کہ نباتات اور پھلوں میں حیات بخش دوائیں مخفی ہیں۔ آج بھی ہماری وسیع معلومات جڑی بوٹیوں اور نباتات میں دواؤں کی موجود صلاحیت کے اعتبار سے کچھ بھی نہیں۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ سائنس دان تجربے کے ذریعے اس حقیقت تک پہنچے ہیں کہ شہد کی مکھیاں شہد بناتے وقت اس مہارت سے کام کرتی ہیں کہ نباتات میں موجود دواؤں کے خواص پوری طرح شہد میں منتقل کر دیتی ہیں جو اس میں محفوظ ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ شہد اس زمین کے بہت سے نباتات اور پھولوں کے معالجاتی خواص کا زندہ ثبوت ہے۔

سائنس دانوں اور ڈاکٹروں نے شہد کے بہت زیادہ خواص بیان کیے ہیں۔ ان خواص کا تعلق علاج معالجے سے بھی ہے، احتیاطی تدابیر سے بھی اور حصولِ قوت سے بھی۔

شہد بہت جلد خون میں جذب ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ قوت بخش ہے اور خون بنانے میں نہایت مؤثر ہے۔

شہد ــــــ معدے اور انتڑیوں میں بدبو پیدا ہونے سے بچاتا ہے۔
شہد ــــــ خشکی اور قبض کو دور کرتا ہے۔
شہد ــــــ بے خوابی کے علاج کے لیے بہت مؤثر ہے۔ (بشرطیکہ تھوڑی مقدار میں پی جائے ورنہ اس کا زیادہ استعمال نیند کو کم کر دیتا ہے)۔
شہد ــــــ تھکان کو دور کرنے اور پٹھوں کے کھنچاؤ کو دور کرنے کے لیے اثر آفریں ہے۔
شہد ــــــ حاملہ عورتوں کو دیا جائے تو ان کے بچوں کے اعصاب قوی کر دیتا ہے۔
شہد ــــــ خون کے کیلشیم میں اضافہ کر دیتا ہے۔
شہد ــــــ کمزور ہاضمے کے لیے مفید ہے خصوصاً جن کے پیٹ میں ہوا بھر جاتی ہو اطباء ان کے لیے اسے تجویز کرتے ہیں۔
شہد ــــــ بدن کی تعمیر میں جلدی سے اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیتا ہے لہٰذا فوری طور پر انرجی پیدا کرتا ہے اور قوٰی پر اثر انداز ہوتا ہے۔
شہد ــــــ دل کو تقویت بخشتا ہے۔
شہد ــــــ جگر اور پھیپھڑوں کے علاج کے لیے ایک اچھی دوا ہے۔
شہد ــــــ جراثیم کش خاصیت کی بناء پر اسہال میں مبتلا افراد کے لیے مفید ہے۔
شہد ــــــ معدے اور انتڑیوں کے زخم کے علاج کے لیے مؤثر عامل شمار ہوتا ہے۔
شہد ــــــ گٹھیا (Rheumatism) پٹھوں کی بیماریوں اور عضلات کے نمو میں نقص کے علاج کے لیے مفید دوا ہے۔
شہد ــــــ کھانسی کے علاج کے لیے مؤثر ہے اور آواز کو صاف کرتا ہے۔
خلاصہ یہ کہ ــــــ شہد دوا کے طور پر اس قدر خواص رکھتا ہے کہ اس مختصری کتاب میں بیان نہیں کیے جا سکتے۔
علاوہ ازیں ــــــ
شہد ــــــ سے جلد کی لطافت، چہرے کی خوبصورتی، طول عمر کے لیے پر تاثیر دوائیں بنتی ہیں۔
شہد ــــــ منہ زبان اور آنکھ کے ورم دور کرنے کے لیے فائدہ مند دوائیں تیار کرنے کے کام آتا ہے۔
شہد ــــــ جلد تھک جانے کے علاج کے لیے بننے والی دواؤں میں استعمال ہوتا ہے۔
شہد میں کئی ایک معدنیات اور وٹامن پائے جاتے ہیں مثلاً۔
آئرن (Iron)، فاسفورس (Phosphorous)، پوٹاشیم (Potasium)، میگنیشیم (Megnesium)، سیسہ (Lead)، تانبا (Copper)، سلفر (Sulpher)، نکل (Nickel)، کانسی (Bronze)، سوڈیم (Sodium) وغیرہ اس میں موجود ہیں۔
ان کے علاوہ اس میں گوند، پولن، لکٹک ایسڈ (Lactic Acid)، فارمک ایسڈ (Formic Acid. D)، سٹرک ایسڈ

Citric Acid سٹرک ایسڈ ٹارٹرک ایسڈ Tartaric Acid اور معطر روغن بھی اس میں موجود ہوتا ہے۔
اس میں چھ طرح کے وٹامن پائے جاتے ہیں۔ اے، بی، سی، ڈی، کے اور ای۔ بعض کا خیال ہے کہ (پی.پی.فیکٹر) بھی شہد میں ہوتے ہیں۔
شہد انسانوں کے علاج کے لیے بھی مفید ہے صحت کے استحکام کے لیے بھی اور خوبصورتی میں بھی خدمت گزار ہے۔

اسلامی روایات میں بھی دوا کی حیثیت سے شہد کی خاصیت کا بہت ذکر آیا ہے اس سلسلے میں حضرت امام علی علیہ السلام امام صادق علیہ السلام اور دیگر معصومینؑ سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا:

ما استشفی الناس بمثل العسل

لوگوں کے لیے شہد کی سی شفا کسی چیز میں نہیں ہے[1]

یہ بھی حدیث ہے۔

لم یستشف مریض بمثل شربة عسل

کسی مریض کے لیے شربتِ شہد سے بڑھ کر کوئی چیز شفا بخش نہیں ہے[2]

کئی ایک روایات میں درد دل کے علاج کے لیے شہد کو تجویز کیا گیا ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

من شرب العسل فی کل شهر مرة یرید ما جاء به القرآن عوفی من سبع و سبعین داء

جو شخص مہینے میں کم از کم ایک مرتبہ شربتِ شہد پئے اور خدا سے اس شفاء کا تقاضا کرے کہ جس کا قرآن میں ذکر ہے تو وہ اسے ستر قسم کی بیماریوں سے شفا بخشے گا[3]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ہر حکم کے استثنائی مواقع بھی ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ چند ایک ایسے مواقع بھی ہیں کہ جن میں شہد کے استعمال سے منع کیا گیا ہے۔

۶۔ "للناس" یعنی انسانوں کے لیے: یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ مکھیوں کا علم رکھنے والے کہتے ہیں کہ شہد کی مکھی کی بھوک ختم کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ دو یا تین پھولوں کو چوس لے جبکہ وہ ایک گھنٹے میں اوسطاً اڑھائی سو پھولوں پر بیٹھتی ہے اور کئی کلومیٹر کا سفر طے کرتی ہے اور اپنی مختصر سی عمر میں ڈھیر سارا شہد جمع کر لیتی ہے۔
بہر حال اس کی یہ تگ و تاز اور کارکردگی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ صرف اپنے لیے کام نہیں کرتی بلکہ جیسا کہ قرآن کہتا ہے

---

[1]، [2] وسائل الشیعہ جلد ۱۷ ص ۲ تا ص ۵۔
[3] سفینۃ البحار، جلد ۲ ص ۱۹۰۔

" للناس " (سب انسانوں کے لیے) کرتی ہے ۔

۷ ۔ شہد کے بارے میں دیگر اہم امور ، موجودہ زمانے میں یہ نکتہ ثابت ہو چکا ہے کہ شہد کبھی بھی خراب نہیں ہوتا یعنی یہ ایسی غذا ہے جو ہمیشہ تازہ اور زندہ دستیاب رہتی ہے یہاں تک کہ اس میں موجود وٹامن کبھی ختم نہیں ہوتے ۔ ماہرین کے نزدیک اس کی وجہ اس میں پوٹاشیم کی فراواں موجودگی ہے ۔ کہ جو جراثیموں کو پیدا نہیں ہونے دیتی ۔ علاوہ ازیں اس میں ایسا مواد بھی موجود ہے جو بدبو پیدا ہونے سے روکتا ہے مثلاً اس میں فارمک ایسڈ (FORMIC ACID) موجود ہے لہٰذا شہد میں جراثیم کی پیدائش روکنے کی خاصیت بھی موجود ہے اور جراثیم کشی کی بھی ۔ قدیم مصری اسی بات کو جانتے ہوئے اپنے مُردوں کو مومیانے کے لیے اسے استعمال کرتے تھے ۔

شہد کو معدنیات سے بنے ہوئے برتنوں میں ذخیرہ نہیں کرنا چاہیے یہ وہ بات ہے جو ماہرین بتاتے ہیں اور جاذب نظر یہ ہے کہ قرآن شہد کی مکھیوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے :

من الجبال بیوتا و من الشجر و مما یعرشون

یعنی شہد کی مکھیوں کے گھر صرف پتھروں اور لکڑیوں میں ہوتے ہیں ۔

ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ شہد کو بطور دوا استعمال کرنے کے لیے اور صحت کے لیے اس کے خواص سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے ہرگز حرارت نہ پہنچائی جائے اور دوسری غذاؤں میں پکا کر اس سے استفادہ نہ کیا جائے ۔

بعض کا نظریہ ہے کہ قرآن نے شہد کے لیے جو " شراب " (پینے کی چیز) کی تعبیر استعمال کی ہے یہ اسی نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ اسے پیا جائے ۔

نیز یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ شہد کی مکھی کا ڈنگ بھی معالجانہ خاصیت رکھتا ہے البتہ شہد کی مکھی اپنے لطیف مزاج کے باعث کسی کو ڈنگ نہیں مارتی ۔ یہ تو ہم ہیں جو اسے ڈنگ مارنے پر ابھارتے ہیں ۔

ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ شہد کی مکھی بدبو سے پریشان ہو جاتی ہے اگر کوئی شہد حاصل کرنے والا بدبودار ہاتھ ، بدبودار لباس کے ساتھ چھتے کے قریب جائے تو اسے ضرور ڈستی ہے اگر اس نے پہلے کسی چھتے میں ہاتھ ڈالا ہو اور غیر چھتے کی بُو اس کے ہاتھ میں لگی ہو تو دوسرے چھتے میں ہاتھ ڈالنے پر مکھیاں اس پر حملہ کر دیں گی ۔ لہٰذا ضروری ہے کہ پہلے وہ اپنے ہاتھ کو اچھی طرح دھولے ۔

البتہ شہد کی مکھی جب ڈنگ مارتی ہے تو خود مر جاتی ہے اس بناء پر ڈنگ مارنا اس کی ایک طرح کی خودکشی ہے ۔

مختلف بیماریوں کے علاج کے لیے شہد کی مکھی کے ڈنگ سے استفادہ کیا جاتا ہے مثلاً گٹھیا (RHEUMATISM) ، ملیریا ، درد اعصاب وغیرہ ۔ البتہ اس کے لیے اطباء کی راہنمائی کے مطابق استفادہ کرنا چاہیے ورنہ شہد کی مکھی کا ڈنگ خطرناک بھی ہو سکتا ہے چند ایک مکھیاں ڈس لیں تو عموماً قابلِ برداشت ہوتا ہے لیکن دو سو سے لے کر تین سو تک مکھیاں ڈس لیں تو بہت زہر پیدا ہو جاتا ہے اور دل کی تکلیف کا باعث بنتا ہے اور اگر پانچ سو کی تعداد تک مکھیاں ڈس لیں تو عملِ تنفس مفلوج ہو جانے اور موت کا احتمال بھی ہوتا ہے ۔

۸۔ شہد کی مکھیوں کی عجیب و غریب زندگی: گزشتہ زمانے میں کم موجودہ زمانے میں بہت سے علماء و محققین کے پیہم مطالعات سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ شہد کی مکھیوں کی زندگی بہت ہی منظم ہوتی ہے ان کے ہاں بڑے سلیقے سے کام تقسیم ہوتا ہے بہت دقیق نظام کے تحت ذمہ داریاں بانٹی ہوئی ہوتی ہیں۔

شہد کی مکھیوں کا شہر بہت زیادہ پاک و صاف اور متحرک زندگی سے بھرپور ہوتا ہے ان کا شہر عام شہروں سے بہت مختلف ہوتا ہے یہ روشن اور درخشاں تمدن کا حامل ہوتا ہے۔ اس شہر میں خلاف ورزی کرنے والے اور کاہل افراد بہت کم نظر آتے ہیں اگر کبھی چھتے کے باہر کچھ مکھیاں سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بدبودار اور نقصان دہ پھولوں کا رس چوس آئیں تو چھتے کے دروازے پر ہی اس سے باز پرس ہوتی ہے۔ پھر ایک کھلی عدالت لگتی ہے اور اس مقدمے کے ضمن میں ان کے قتل کا حکم صادر ہوتا ہے۔

بلجیم کے ماہر حیاتیات مٹرلنگ نے شہد کی مکھیوں کے بارے میں بہت زیادہ مطالعہ اور تحقیق کی ہے اس نے ان کے شہر پر محکم فرما عجیب و غریب نظام کا گہرا مطالعہ کیا ہے، وہ لکھتا ہے:

> ملکہ (یا زیادہ صحیح الفاظ میں چھتے کی ماں) مکھیوں کے شہر کی ایسی حکمران نہیں جیسا ہم تصور کرتے ہیں بلکہ وہ بھی اس شہر کے دیگر باسیوں کی طرح یہاں کے نظام اور قوانین کی فرمانبردار ہوتی ہے۔
>
> ہمیں یہ علم نہیں کہ یہ نظام اور قوانین کہاں پر وضع ہوتے ہیں ہمیں انتظار ہے کہ شاید کسی دن اس بات کا ہمیں سراغ مل جائے اور ان قوانین کے بنانے والے کو ہم پہچان لیں لیکن فی الحال ہم اس قانون ساز کو "چھتے کی روح" کے نام سے پکارتے ہیں۔
>
> ہمیں معلوم نہیں کہ "چھتے کی روح" کہاں ہے اور شہر میں رہنے والے کس فرد میں حلول کیے ہوئے ہیں لیکن یہ ہم جانتے ہیں کہ چھتے کی روح پرندوں کے مزاج اور طبیعت سے مشابہ نہیں ہے نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ چھتے کی روح شہد کی مکھیوں کا انحصار ارادہ و عادت نہیں ہے چھتے کی روح شہر میں رہنے والے ہر فرد کو اس کی استعداد کے مطابق ذمہ داری سونپتی ہے اور ہر کسی کو کسی نہ کسی کام پر لگاتی ہے۔ "چھتے کی روح" ماہر تعمیرات اور کاریگر مکھیوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ گھر بنائیں چھتے کی روح "معین دن اور معین لمحے میں شہر کے تمام باسیوں کو حکم دیتی ہے کہ شہر سے ہجرت کر جائیں اور نیا مسکن تلاش کرنے کے لیے اپنے آپ کو ان دیکھے حوادث اور مشقتوں کے حوالے کر دیں۔
>
> ہمیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ شہد کے قوانین جو چھتے کی روح" کے ذریعے وضع ہوئے ہیں کس پارلیمنٹ میں پیش کیے گئے ہیں کہ جس نے انہیں جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور کون ہے جو ایک معین دن چل پڑنے کا حکم صادر کرتا ہے۔

جی ہاں! چھتے میں مہاجرت کے یہ مقدمات اطاعتِ خدا میں فراہم ہوتے ہیں ——————

وہی خدا کہ جس کے ہاتھ میں شہد کی مکھی کی تقدیر ہے[1]

---

[1] کتاب زندہ عسل (شہد کی مکھی) تالیف مٹرلنگ ص ۳۵، ص ۳۶۔

مذکورہ دانش مند اپنی فکر و نظر میں موجود مکتب مادیت کے پرانے خیالات کی وجہ سے اس مسئلے پر اگر ابہام کے ساتھ گفتگو کرتا ہے تو ہماری نظر تو قرآن کی راہنمائی پر ہے ہم تو یہ بات اچھی طرح سے سمجھتے ہیں کہ یہ آوازیں کہاں سے آتی ہیں یہ نظام کہاں ترتیب پاتا ہے۔ یہ پروگرام کہاں بنتا ہے انھیں منظم کرنے والا کون ہے اور کون ان کے لیے حکم جاری کرتا ہے۔ قرآن کتنی خوبصورت تعبیر کہتا ہے۔

واوحی ربك الی النحل .....

تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی والہام کیا .....

کیا اس سے زیادہ رسا، جامع، منہ بولتی اور ناطق تعبیر کا تصور ہو سکتا ہے۔

شہد کی مکھیوں کے بارے میں جو کچھ بیان نہیں کیا جا سکا اگرچہ وہ بیان کیے جانے والے کی نسبت بہت زیادہ ہے لیکن ہماری طرز تفسیر اجازت نہیں دیتی کہ اس موضوع پر اس سے زیادہ گفتگو کریں [1]

لیکن جو کچھ ہم نے کہا ہے کیا یہی اہل فکر و نظر کے لیے عظمت پروردگار کا اندازہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہے جی ہاں ———— ضرور ہے۔

ان فی ذٰلك لاٰیة لقوم یتفكرون

بے شک اس میں صاحبان فکر کے لیے عظمت پروردگار کی نشانی ہے۔

---

[1] مندرجہ بالا مباحث میں شہد کی مکھیوں اور شہد کے خواص کے بارے میں ان کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۱۔ اولیں دانشگاہ و آخرین پیامبر

۲۔ زنبور عسل۔ تالیف میٹرلینگ

۳۔ شگفتی ہائے۔ عالم حیوانات

(دیگر ایرانی مصنفین کی کتابوں کے فارسی ترجمے سے استفادہ کیا گیا ہے وغیرہ اور ترجمے ہی کا نام بیان دیا گیا ہے۔ مترجم)

۷۰۔ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝

۷۱۔ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَاۗدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰي مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝

۷۲۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۝

ترجمہ:

۷۰۔ اللہ نے تمھیں پیدا کیا پھر وہی تمھیں مارے گا تم میں سے بعض سخت بڑھاپے کو جا پہنچتے ہیں کہ علم و آگاہی کے بعد (ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ) کچھ نہیں جانتے (اور سب کچھ بھول جاتے ہیں) بیشک خدا علیم و قدیر ہے۔

۷۱۔ خدا نے تم میں سے بعض کو بعض دوسروں پر رزق میں برتری دی ہے (کیونکہ تمھاری استعداد اور کوشش میں فرق ہے) لیکن جنھیں برتری دی گئی ہے وہ اس بات پر تیار ہیں کہ اپنی روزی میں سے اپنے غلاموں کو دیں تاکہ سب کے سب برابر ہو جائیں کیا وہ نعمتِ خدا کا انکار کرتے ہیں؟

۷۲۔ اور اللہ نے تمھارے لیے تمھاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور ان بیویوں سے تمھیں پوتے نواسے اور بیٹے عطا کیے اور تمھارے لیے طیبات میں روزی قرار دی کیا پھر یہ باطل پر ایمان لے آتے ہیں اور نعمتِ خدا کا انکار کرتے ہیں۔

تفسیر:

رزق میں اختلاف کا سبب

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی کچھ اہم نعمتوں اور عنایات کا تذکرہ تھا کچھ نباتات اور حیوانات کی تخلیق کا بیان تھا تاکہ لوگ ان پر نظر کرتے ہوئے ان سب نعمتوں اور اس دقیق نظام کے خالق سے آشنا ہوں۔

زیر بحث آیات بھی ایک اور حوالے سے خالق یکتا کے اثبات کے مسئلہ پر گفتگو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ آیات نعمتوں کے تغیرات کے حوالے سے بات کرتی ہیں۔ ایسے تغیرات کا ذکر ہے کہ جو انسانی اختیار سے باہر ہیں اور ان کا فیصلہ کسی اور کی جانب سے ہوا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اللہ نے تمہیں پیدا کیا (و اللہ خلقکم) اس کے بعد وہ تمہاری روح کو لے لے گا (ثم یتوفٰکم)۔

زندگی بھی اسی کی طرف سے ہے اور موت بھی تاکہ تم جان لو کہ موت وحیات پیدا کرنے والے تم نہیں ہو لمبی عمر کا ہونا بھی تمہارے اختیار میں نہیں ہے بعض جوانی میں یا بڑھاپے کی سرحد پر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں لیکن "تم میں سے بعض لمبی عمر پاتے ہیں۔ عمر کے بدترین دور یعنی انتہائی بڑھاپے تک جا پہنچتے ہیں (ومنکم من یرد الی ارذل العمر)۔[1]

اور اس طولانی عمر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علم و آگاہی کے بعد انہیں کچھ معلوم نہیں ہوتا اور وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں (لکی لا یعلم بعد علم شیئا)[2]

بعینہ اس کی حالت بچپن کی سی ہو جاتی ہے کہ جب وہ بھول جاتا ہے اور نا آگاہ بھی تھا جی ہاں! "خدا آگاہ اور قادر ہے" (ان اللہ علیم قدیر)۔

---

[1] "ارذل" "رذل" کے مادہ سے پست، ناچیز اور حقیر شے کے معنی میں ہے "ارذل العمر" سے مراد بڑھاپے کا وہ دور ہے کہ جب ناتوانی اور نسیان انسان کو اس طرح سے آلے کہ وہ اپنی ابتدائی ضروریات بھی پورا نہ کر سکے اسی بناء پر قرآن اس مدت کو عمر کا غیر مطلوب حصہ قرار دیتا ہے۔ بعض مفسرین اسے ۷۵ سال کی عمر سمجھتے ہیں۔ بعض ۹۰ اور بعض ۹۵ شمار کرتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ یہ کوئی معین عمر نہیں ہے ہر شخص میں فرق ہوتا ہے۔

[2] لکی لا یعلم بعد علم شیئا ——— ہو سکتا ہے عمر کے بالائی سالوں تک پہنچنے کا نتیجہ ہو۔ اس طرح اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ ان سالوں میں انسان کے اعصاب اور دماغ تمرکز اور حافظے کی طاقت گنوا بیٹھتے ہیں اور انسان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ فراموشی اور بے خبری میں گھر جاتا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ جملہ علت غائی کے معنی میں ہو یعنی اللہ انہیں ان بالائی سالوں کی طرف لے جاتا ہے اس کی علت یہ ہے کہ ان پر حالت نسیان طاری کرے تاکہ یہ انسان جان لیں کہ ان کے پاس جو کچھ ہے کچھ بھی ان کی اپنی طرف سے نہیں ہے۔

تمام قدرتیں اسی کے اختیار میں ہیں وہ جس قدر مصلحت سمجھتا ہے عطا کرتا ہے اور جس موقع پر ضروری سمجھتا ہے لے لیتا ہے۔

اگلی آیت میں یہی بات بیان ہوئی ہے اور فرمایا گیا کہ تمہاری روزی تک تمہارے اختیار میں نہیں ہے "یہ خدا ہے جو تم میں سے بعض کو رزق کے اعتبار سے دوسروں پر برتری دیتا ہے (واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق)۔

لیکن جنھیں یہ برتری دی گئی ہے ان کی تنگ نظری کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ان کے اختیار میں ہے وہ اپنے غلاموں کو دینے کے لیے تیار نہیں ہیں اور انھیں اپنے اموال میں شریک نہیں کرتے کہ وہ بھی ان کے برابر ہو جائیں (فما الذین فضلوا برادی رزقھم علی ما ملکت ایمانھم فھم فیہ سواء)۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ جملہ مشرکین کے بعض احمقانہ افعال کی طرف اشارہ ہے کہ جو اپنے بتوں اور خداؤں کے لیے اپنے چوپاؤں اور زرعی پیداوار کا ایک حصّہ مختص کر دیتے تھے حالانکہ یہ بے وقعت پتھر اور لکڑیاں ان کی زندگی پر قطعہ بھر اثر نہیں رکھتے تھے لیکن وہ اس بات پر تیار نہ تھے کہ اس دولت میں سے کچھ اپنے بے چارے غلاموں کو دیں کہ جو رات دن ان کی خدمت کرتے تھے۔

کیا رزق کی تفریق عدالت پر مبنی ہے؟

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا لوگوں میں تقسیم رزق میں اختلاف پیدا کرنا اللہ کے اصولِ عدالت و مساوات کے مطابق ہے جبکہ اصولِ عدالت و مساوات کو انسانی معاشروں پر حاکم ہونا چاہیے۔

اس سوال کے جواب میں دو نکتوں کی طرف توجہ رکھنا چاہیے:

۱۔ اس میں شک نہیں کہ انسانوں میں موجود مادی فوائد و وسائل اور آمدنی میں اختلاف کا ایک اہم حصّہ ان کی استعداد اور صلاحیتوں میں اختلاف سے مربوط ہے۔ جسمانی اور روحانی صلاحیتوں کا فرق اقتصادی کارکردگی کی کمیت و کیفیت کا سرچشمہ ہے اسی سے بعض کا حصّہ رزق کم اور بعض کا زیادہ ہو جاتا ہے۔

البتہ اس میں بھی شک نہیں کہ بعض اوقات ایسے حوادث پیش آتے ہیں کہ جو ہمارے نزدیک اتفاقات ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے بعض لوگوں کو زیادہ نعمات میسر آجاتی ہیں لیکن انھیں استثنائی امور شمار کرنا چاہیے لیکن اکثر امور کی بنیاد وہی سعی و کوشش کی کمیت و کیفیت کا فرق ہے۔

البتہ ہماری مراد ایسے معاشرے سے ہے جو صحیح نہج پر قائم ہو جو ظالمانہ لوٹ کھسوٹ سے پاک ہو نہ کہ ایسا معاشرہ جو منحرفانہ رو ہو اور جو قوانین آفرینش اور انسانی بنیادوں پر قائم نظام سے ہٹ گیا ہو۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم بعض لوگوں کو بے وقعت اور بے دست و پا سمجھتے ہیں لیکن ان کے پاس بہت وسائل اور مال و دولت ہوتی ہے ہم اس پر تعجب کرتے ہیں لیکن اگر ہم ان کے جسم، روح اور اخلاق پر زیادہ غور و خوض کریں اور سطحی مطالعے پر مبنی فیصلہ ایک طرف کر دیں تو ہم دیکھیں گے کہ وہ کوئی نہ کوئی ایسی قوت رکھتے ہیں کہ جس کی وجہ سے وہ اس مقام پر پہنچے ہیں۔

ہم پھر یہ بات دہراتے ہیں کہ ہمارا موضوع بحث وہ صحیح و سالم معاشرہ ہے کہ جو ظالمانہ لوٹ کھسوٹ سے پاک ہو۔

بہرحال آمدن اور وسائل کا یہ فرق صلاحیتوں کے فرق پر مبنی ہے اور یہ صلاحیتیں نعمات الٰہی ہیں البتہ ہو سکتا ہے کہ چند مواقع پر یہ اکتسابی ہوں۔

لیکن بعض مواقع یقیناً غیر اکتسابی ہوتے ہیں اور اس بناء پر ایک صحیح و سالم معاشرے میں بھی اقتصادی لحاظ سے آمدن کا فرق قابل انکار نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہم سب لوگوں کو ہم شکل، ہم رنگ، ہم استعداد اور ہم قالب بنا سکیں۔ سب لوگ ایسے ہو جائیں کہ ان میں کسی قسم کا کوئی فرق باقی نہ رہے لیکن ایسا ممکن نہیں ہے۔

۲۔ انسان، درخت یا پھول کے کسی پودے کو دیکھیے کیا ممکن ہے کہ ان کے بدن کی متناسب عمارت اعضاء کے لحاظ سے مساوی ہو۔ کیا پودے کی جڑیں اس کے پھولوں کی نازک پتیوں جیسی ہو سکتی ہیں؟ کیا انسان کی ایڑی کی ہڈی اس کی آنکھ کی لطیف پتلی کے ہر لحاظ سے مساوی ہو سکتی ہے اور اگر ہم انھیں یکساں کر سکیں تو کیا آپ سمجھیں گے کہ ہم نے صحیح کام انجام دیا ہے۔

پُرفریب اور شور سے عاری نعروں سے قطع نظر کر کے فرض کیجیے کہ ایک دن ہم ہر لحاظ سے ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے خیالی انسان بنالیں پوری دنیا کو پانچ ہزار ملین (۵ ارب) ایسے انسان سے بھر دیں جو ہم شکل، ہم لباس، ہم ذوق، ہم فکر اور ہر لحاظ سے یکساں ہیں۔ کسی کارخانے سے نکلنے والے ایک ہی برانڈ کے سگرٹوں کی طرح۔ تو ذرا سوچیں کہ کیا اس روز انسانوں کو اچھی زندگی نصیب ہو جائے گی۔ مسلّم ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ دنیا ایک جہنم بن جائے گی۔ سب کے سب ایک مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ سب کے سب ایک ہی طرف چل پڑیں گے سب کے سب ایک ہی چیز چاہیں گے سب ایک ہی پوسٹ کے خواہش مند ہوں گے۔ سب ایک ہی قسم کی غذا چاہیں گے اور سب ایک ہی کام کرنا چاہیں گے۔ ظاہر ہے اس قسم کی زندگی بہت ہی جلد ختم ہو جائے گی اور فرض کریں کہ وہ باقی رہ جائے تو ایک تھکا دینے والی بے روح، بے کیف اور ایک ہی طرز کی زندگی ہو گی۔ ایسی زندگی جو موت سے زیادہ مختلف نہ ہو گی۔

لہٰذا صلاحیتوں کا اختلاف اور اس کے لوازم معاشرتی نظام کی بقا کے لیے ناگزیر ہے بلکہ ایسا ہونا استعداد و صلاحیت کی نشو و نما کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ پُرفریب نعروں سے اس حقیقت کو بدلا نہیں جا سکتا۔

لیکن ایسا نہ ہو کہ کوئی ہماری اس گفتگو کا یہ مطلب سمجھنے لگے کہ ہم طبقاتی معاشرے اور لوٹ کھسوٹ اور استعماری نظام کو قبول کرتے ہیں ____ نہیں ہرگز نہیں ____ ہماری مراد طبعی اور فطری اختلاف ہے نہ کہ مصنوعی ____ ہماری مراد وہ تفاوت اور فرق ہیں کہ جو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں نہ کہ ایک دوسرے کی ترقی میں سدِ راہ اور ایک دوسرے پر تجاوز و ظلم کرنے والے۔

طبقاتی فرق (توجہ رہے کہ یہاں طبقاتی فرق سے مراد اس کا وہی اصطلاحی مفہوم ہے یعنی ایک لوٹ کھسوٹ کرنے والا طبقہ اور دوسرا جسے لوٹا جا رہا ہے) ہرگز نظامِ آفرینش سے مطابقت نہیں رکھتا۔ نظامِ خلقت سے ہم آہنگ استعداد اور کوشش کا فرق ہے اور ان دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ (غور کیجیے گا)

دوسرے لفظوں میں استعداد کے اختلاف کو اصلاح و تعمیر کے لیے استعمال ہونا چاہیے جیسے ایک بدن اختلاف ہوتا ہے جیسے ایک پھول کے پودے میں مختلف حصوں کا اختلاف ہوتا ہے ____ وہ اختلاف کہ جو ایک دوسرے کے

مزاحم نہیں ہوتا بلکہ ایک دوسرے کا معاون ہوتا ہے۔ [1]

مختصر یہ کہ استعداد اور آمدن کے اختلاف سے طبقاتی معاشرہ پیدا کرنے کے لیے سوء استفادہ نہیں کرنا چاہیے

پر زیر بحث آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: کیا وہ نعمت خدا کا انکار کرتے ہیں (افبنعمة الله یجحدون)

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ اختلافات فطرت کی صورت میں ہوں نہ کہ مصنوعی اور ظالمانہ صورت میں تو خدا کی نعمت ہیں اور انسان کے نظام معاشرہ کی حفاظت کے لیے ہیں۔

زیر بحث آخری آیت گزشتہ دو آیات کی طرح لفظ "اللہ" سے شروع ہوتی ہے اس میں نعمات الٰہی کا ذکر ہے اس میں انسان کی انفرادی قوت، انسان کے معاونین اور مددگاروں اور اسی طرح پاکیزہ رزق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس طرح ان تین آیتوں میں جن نعمتوں کا ذکر شروع ہوا ہے اس کی تکمیل ہو جاتی ہے یعنی بات زندگی اور موت کے نظام سے شروع کی گئی ہے پھر رزق اور استعدادوں میں فرق کا ذکر ہے کہ جو زندگی میں تنوع کا باعث ہے اور آخری آیت میں نسل انسانی کے زیادہ ہونے اور پاکیزہ رزق کی طرف اشارہ ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اللہ نے تمہاری نوع میں سے تمہارے لیے بیویاں بنائی ہیں (و الله جعل لكم من انفسكم ازواجا)۔ ــــــ وہ بیویاں کہ جو تسکین جسم و روح کی باعث بھی ہیں بقائے نسل کا ذریعہ بھی ــــــ اسی لیے ساتھ ہی اضافہ کیا گیا ہے: اور تمہاری بیویوں کے ذریعے تمہیں بیٹے، پوتے اور نواسے عطا کیے ہیں (و جعل لكم من ازواجكم بنين و حفدة)۔

"حفدة" "حافد" کی جمع ہے۔ دراصل اس کا معنی ہے وہ شخص جو کسی جزا کی توقع کے بغیر تعاون کرے لیکن زیر نظر آیت میں بہت سے مفسرین کے نظریے کے مطابق "حفدة" [2] اس سے مراد پوتے اور نواسے ہیں، بعض اس سے مراد صرف نواسے لیتے ہیں اور بعض نے "بنين" سے چھوٹے بیٹے مراد لیا ہے اور "حفدة" سے بڑے بیٹے کہ جو مدد اور ہمکاری کر سکتے ہیں بعض نے "حفدة" سے مراد ہر طرح کے معاون و مددگار لیے ہیں چاہے وہ بیٹے ہوں یا کوئی اور ہے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ ہر شخص کے اردگرد بیٹوں، پوتوں اور نواسوں اور بیویوں کی صورت میں انسانی قوتوں کا وجود اس کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے ــــــ یہ روحانی لحاظ سے بھی مدد کرتے ہیں اور مادی لحاظ سے بھی۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اللہ نے تمہیں پاکیزہ چیزوں میں سے رزق دیا ہے (و رزقكم من الطيبت)۔

"طیبات" کا یہاں وسیع مفہوم ہے اس میں ہر قسم کا پاکیزہ رزق شامل ہے چاہے وہ مادی پہلو سے ہو یا روحانی پہلو سے، انفرادی حوالے سے ہو یا اجتماعی حوالے سے۔

آخر میں اس بحث سے نتیجہ نکالتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کیا وہ خدا کی عظمت و قدرت کے یہ سب آثار دیکھنے کے

---

[2] اس صورت میں "حفدة" کا عطف "بنين" پر نہیں ہونا چاہیے بلکہ "ازواج" پر ہونا چاہیے یہ خلاف ظاہر ہے۔ جبکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ "بنين" پر ہی عطف ہے (غور کیجیے گا)۔

باوجود اور اس کی جانب سے پشادور ہونے والی ان تمام نعمتوں کے باوجود بتوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں" کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں (افبالباطل یؤمنون و بنعمت اللہ ھم یکفرون)۔ یہ ان کا کیسا غلط فیصلہ ہے اور کس قدر غلط طرزِ عمل ہے کہ وہ نعمتوں کے سرچشمے کو فراموش کر کے اس کے پیچھے جاتے ہیں کہ جو ان کی زندگی پر کچھ بھی اثر نہیں رکھتا اور ہر لحاظ سے "باطل" کا مصداق ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ رزق کے اسباب اور سرچشمے: جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس میں شک نہیں کہ خداداد صلاحیتوں اور نعمتوں کے لحاظ سے انسان مختلف ہیں لیکن کامیابیوں کی اصل بنیاد انسان کی سعی و کوشش اور جدوجہد ہی ہے۔ زیادہ کوشش کرنے والے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں اور سُست و کم کوش محروم رہتے ہیں۔

اسی بنا پر قرآن انسان کے نصیب کو اس کی سعی و کوشش سے مربوط قرار دیتا ہے اور صراحت سے کہتا ہے:

وان لیس للانسان الا ما سعٰی

یقیناً انسان کے لیے بس وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ (نجم ــــــ ۳۹)

نیز اس کے ساتھ ساتھ تقویٰ، درست راستے کا انتخاب، امانتداری، نظام و قوانینِ الٰہی کی پاسداری اور عدل و انصاف کے اصولوں کے مطابق عمل بھی اس میں غیر معمولی اثر رکھتا ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ولو ان اھل القرٰی اٰمنوا و اتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض

اگر شہروں اور قصبوں کے باسی ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیں۔ (اعراف ــــــ ۹۶)

نیز وہ فرماتا ہے:

و من یتق اللہ یجعل لہ مخرجًا و یرزقہ من حیث لا یحتسب

جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ اسے رزق کی فراوانی عطا کرتا ہے اور جہاں سے اسے گمان نہیں ہوتا وہاں سے عطا کرتا ہے۔ (طلاق ــــــ ۲،۲)

اسی بنا پر انفاق اور راہِ خدا میں خرچ کرنے کو وسعتِ رزق کا وسیلہ قرار دیتے ہوئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

ان تقرضوا اللہ قرضًا حسنًا یضاعفہ لکم

اگر تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو یعنی اس کی راہ میں خرچ کرو تو وہ اسے کئی گنا کر دے گا۔

(تغابن ــــــ ۱۷)

شاید یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ اجتماعی زندگی میں سے ایک فرد یا ایک گروہ کے چلے جانے سے سارے معاشرے کو نقصان پہنچتا ہے۔ اسی لیے فرد کی نگہداری اور مدد کرنا سارے معاشرے کے لیے فائدہ مند ہے (اس مسئلے کے معنوی اور

انسانی پہلوؤں سے قطع نظر بھی یہ فائدہ ہے)۔

خلاصہ یہ کہ معاشرے کے اقتصادی نظام پر تقویٰ، درست روی، پاکیزگی، امداد باہمی ایک دوسرے سے تعاون اور اتفاق کے اصول کارفرما ہوں تو وہ طاقت ور اور سربلند ہوگا۔

لیکن اس کے برعکس معاشرے میں لوٹ کھسوٹ، دھوکا دہی، غارتگری، تجاوز اور دوسروں کو نظرانداز کر دینے کا عمل جاری ہو تو وہ اقتصادی لحاظ سے پس ماندہ رہے گا اور اس کی مادی زندگی بھی پراگندگی اور انتشار کا شکار ہو جائے گی۔

اسلامی روایات میں حصولِ رزق کے لیے سعی و کوشش پر زور دیتے ہوئے اسے تقویٰ کے ساتھ ہونے کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے یہاں تک کہ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: لا تکسلوا فی طلب معایشکم فان اٰباءنا کانوا یرکضون فیھا ویطلبونھا

حصولِ رزق میں سستی سے کام نہ لو۔ کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد اس راہ میں دوڑتے تھے اور اسے طلب کرتے تھے۔[1]

انہی امام بزرگوار سے منقول ہے:

الکاد علی عیالہ کالمجاہد فی سبیل اللہ

جو شخص اپنے اہل و عیال کے تلاشِ رزق کو نکلتا ہے وہ مجاہد راہِ خدا کی طرح ہے۔[2]

یہاں تک کہ حکم دیا گیا ہے کہ مسلمان صبح سویرے جتنی جلدی ہو سکے اپنے گھروں سے نکلیں اور اپنی زندگی کے لیے سعی و کوشش کریں۔[3]

وہ اشخاص کہ جن کی دعا قبول نہیں ہوتی ان میں وہ افراد بھی شامل ہیں جن کا جسم صحیح و سالم ہو مگر وہ گھر میں پڑے رہتے ہوں اور کشائشِ رزق کے لیے صرف دعا کرتے رہتے ہوں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ پھر بہت سی روایات میں یہ کیوں کہا گیا ہے کہ روزی خدا کے ہاتھ میں ہے اس کے حصول کے لیے کوشش کرنے کی مذمت کی گئی ہے۔

اس سوال کے جواب میں مندرجہ ذیل دو نکات کی طرف توجہ کرنا چاہیے:

۱۔ اسلامی مصادر میں غور و خوض کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ زیرِ بحث مسئلہ ہو یا کوئی اور، جو آیات و روایات ابتدائی نظر میں ایک دوسرے سے متضاد نظر آتی ہے در اصل ان میں سے ہر ایک مسئلے کے ایک پہلو کے بارے میں ہوتی ہے جبکہ دوسرے پہلوؤں سے غفلت کے باعث تضاد کا شک گزرتا ہے۔

وہ مقام کہ جہاں لوگ دنیا پر ریجھ جاتے ہیں ان کا حرص بہت زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ مادی دنیا کی زرق برق زندگی کے

---

[1] وسائل جلد ۱۲ ص ۴۰۔

[2] وسائل جلد ۱۲ ص ۴۳۔

[3] وسائل جلد ۱۲ ص ۵۰۔

پیچھے لگ جاتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے کسی جرم اور زیادتی سے نہیں چوکتے وہاں پیہم تاکیدی احکام کے ذریعے انھیں اس ...ری اور دنیاوی مال وجاہ کی بے وقعتی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جبکہ وہ مقام کہ جہاں کچھ لوگ زہد وتقویٰ کے بہانہ سعی، کوشش سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں وہاں انھیں محنت، کام کاج اور کوشش کی اہمیت یاد دلائی گئی ہے۔

درس سچے رہبروں کا یہی طرزِ عمل ہونا چاہیے کہ وہ افراط سے بھی مناسب طریقے سے روکیں اور تفریط سے بھی:

جن آیات و روایات میں تاکید کی گئی ہے کہ رزق خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس نے ہر شخص کا حصہ معین کیا ہوا ہے ــــــ درحقیقت یہ حرص وطمع، دنیا پرستی اور بے اصول وبے حد دولت سمیٹنے سے روکنے کے لیے ہے اور ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان کے نشاط کار کے ولولوں کو ختم کر دیا جائے۔ اور ایک آبرومندانہ، خود کفایت اور اپنے قدموں پر کھڑی زندگی کی جدوجہد کو ختم کر دیا جائے۔

اس حقیقت کی طرف توجہ کرتے ہوئے ان روایات کی تعبیر واضح ہو جاتی ہے کہ جن میں کہا گیا ہے کہ بہت سی روزیاں ایسی ہیں کہ اگر تم ان کے پیچھے نہ جاؤ تو وہ تمھارے پیچھے آئیں گی۔

۲۔ توحیدی نقطہ نگاہ سے کائنات کو دیکھا جائے تو ہر چیز خدا کی طرف منتہی ہوتی ہے اور ایک خدا پرست سچا موحد کسی چیز کو اپنی طرف سے نہیں سمجھتا بلکہ اس تک جو بھی نعمت پہنچتی ہے اس کا سرچشمہ خدا ہی کو جانتا ہے وہ کہتا ہے۔

بیدک الخیر انک علی کل شیء قدیر

ہر طرح کی نیکی اور خیر کی کلید تیرے ہاتھ میں ہے اور تو ہر چیز پر قادر اور توانا ہے

(آل عمران ــــــ ۲۶)

اس لحاظ سے ایک حقیقی توحید پرست کو ہر موقع پر اس حقیقت کی طرف متوجہ رہنا چاہیے یہاں تک کہ اس کی سعی و کاوش، فکر اور آلات واسباب پیداوار بھی دراصل خدا ہی کی طرف سے ہیں۔ اس کی نگاہ لطف لمحہ بھر کے لیے پھر جائے تو سب کچھ ختم ہو جائے۔

خدا پر ایمان رکھنے والا ایک شخص جب کسی سواری پر سوار ہوتا ہے تو کہتا ہے:

سبحان الذی سخر لنا هذا

پاک ہے وہ خدا کہ جس نے اسے ہمارے لیے مسخر کیا ہے۔

وہ جب کوئی نعمت پاتا ہے تو زمزمۂ توحید اس کے ہونٹوں سے نکلتا ہے،

وما بنا من نعمة فمنك

ہمارے پاس جو بھی نعمت ہے بار الٰہا! تیری طرف سے ہے۔

یہاں تک کہ انسانوں کی نجات کے لیے جب کوئی قدم اٹھاتا ہے تو پیروئ انبیاء میں کہتا ہے:۔

وما توفیقی الا بالله علیه توکلت والیه انیب

میری توفیق صرف اللہ کی طرف سے ہے، میں نے اسی پر توکل کیا ہے اور میں اسی کی طرف پلٹتا ہوں (ہود ۸۸)

لیکن ان تمام مباحث میں جو چیز مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ تلاشِ رزق کو نکلنا چاہیے۔ سعی و کوشش کرنا چاہیے اور اس کے لیے مثبت اور اصلاحی راستہ اختیار کرنا چاہیے ـــــــ وہ راستہ کہ جو ہر قسم کی افراط و تفریط سے پاک ہو۔

رہی اس روزی کی بات کہ جو انسان کو بغیر کوشش کے مل جاتی ہے تو وہ فرعی مسئلہ ہے نہ کہ اساسی اور بنیادی۔ شاید اسی بناء پر حضرت علی علیہ السلام نے اپنے کلمات قصار میں پہلے درجے میں اس رزق کا ذکر فرمایا ہے کہ انسان جس کے لیے نکلتا ہے اور اس کے بعد اس رزق کا جو خود انسان کے پیچھے آتا ہے۔

یا ابن آدم! الرزق رزقان، رزق تطلبه و رزق یطلبك

اے ابن آدم! رزق دو قسم کا ہوتا ہے ایک وہ کہ جس کی تلاش میں تو نکلتا ہے اور دوسرا وہ کہ جو تیری تلاش میں آتا ہے[2]

۲۔ دوسروں سے برابری کا سلوک: زیر نظر آیات میں بہت سے انسانوں کی تنگ نظری اور بخل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: فرمایا گیا ہے کہ وہ اس بات کے لیے تیار نہیں کہ ان کے اختیار میں جو بہت سی نعمتیں دی گئی ہیں وہ اپنے زیردست افراد کو بخشیں البتہ وہی لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو انبیاء اور ہادیان الٰہی کے تربیتی مکتب کے تربیت یافتہ ہیں۔

ان آیات کے ضمن میں کئی ایک روایات میں مساوات اور مواسات کی تاکید کی گئی ہے۔ تفسیر علی بن ابراہیم میں اس سلسلے میں ہے:

لا یجوز للرجل ان یخص نفسه بشیء من المأکول دون عیاله

کسی انسان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے لیے گھر میں مخصوص غذا رکھے اور وہ کچھ کھائے کہ جس سے اس کے گھر والے محروم رہیں[3]

نیز حضرت ابوذرؓ سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے سنا:

انما هم اخوانکم فاکسوهم مما تکسون، و اطعموهم مما تطعمون، فما رؤی عبده بعد ذلك الا و رداؤه رداؤه، و ازاره ازاره، من غیر تفاوت

جو افراد تمہارے زیردست اور ماتحت ہیں وہ تمہارے بھائی ہیں جو کچھ خود پہنتے ہو انھیں پہناؤ اور جو کچھ خود کھاتے ہو انھیں کھلاؤ۔

رسولؐ اللہ کی اس وصیت کے بعد ابوذر کا طرز عمل اپنے ماتحت افراد سے یہ تھا کہ ان کا لباس ان کے اپنے لباس سے بالکل مختلف نہ ہوتا تھا[4]

---

[1] کتب دعا میں اس جملے کا ذکر نماز عصر کی تعقیبات میں کیا گیا ہے۔

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار ص ۳۷۹۔

[3] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۶۰۔

[4] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۶۰۔

مذکورہ روایات اور اسی طرح خود زیر بحث آیت کہ جو کہتی ہے "فھم فیہ سوآء" (بس وہ اس میں مساوی ہیں) سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نصیحت کرتا ہے کہ تمام مسلمان اسلامی اخلاق کے طرز عمل کے طور پر اپنے گھر کے تمام افراد اور اپنے ماتحت افراد سے حتی الامکان مساوات کریں اور برابری کا سلوک کریں گھریلو ماحول اور اپنے ماتحت افراد میں اپنے لیے کوئی امتیاز نہ برتیں۔

۷۳۔ وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝

۷۴۔ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ:

۷۳۔ وہ خدا کو چھوڑ کر کچھ ایسے موجودات کی پرستش کرتے ہیں کہ جو آسمانوں اور زمین میں سے ان کے رزق کے مالک نہیں ہیں اور یہ کام جن کے بس کا نہیں۔

۷۴۔ لہٰذا اللہ کے لیے امثال (اور شبیہ) کا عقیدہ نہ رکھو کیونکہ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

تفسیر:

خدا کے لیے شبیہ کا عقیدہ نہ رکھو:

گزشتہ آیات میں توحید کے بارے میں گفتگو تھی اب زیر بحث آیات میں مسئلہ شرک کے بارے میں بات کی گئی ہے سرزنش و ملامت کے لہجے میں فرمایا گیا ہے: وہ خدا کو چھوڑ کر ایسے موجودات کی پرستش کرتے ہیں کہ جو آسمان و زمین میں سے ان کی روزی کے مالک نہیں ہیں اور اس سلسلے میں ان کا ذرہ بھر بھی کوئی اثر نہیں (ویعبدون من دون الله ما لا یملک لهم رزقا من السموٰت والارض شیئا)۔

نہ صرف یہ کہ اس سلسلے میں وہ کسی چیز کے مالک نہیں بلکہ خلق و ایجاد اور ان پر دسترسی کی طاقت نہیں رکھتے (ولا یستطیعون)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ مشرکین اس لیے بتوں کی پوجا پاٹ کرتے تھے کہ ان کا خیال تھا کہ یہ ان کی زندگی اور نفع و نقصان میں کوئی اہم کردار ادا کرتے ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں رزق کا مسئلہ انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل میں سے ہے چاہے وہ آسمان سے بارش کے حیات بخش قطروں اور سورج سے زندگی بخش شعاعوں کی صورت میں ہو یا وہ زمین سے نکلنے والا ہو اس میں سے کچھ بھی بتوں کے اختیار میں نہیں وہ تو بے اہمیت اور بے قیمت موجودات ہیں کہ جن کا اپنا کوئی ارادہ نہیں ہوتا یہ تو صرف خرافات اور جہالت پر مبنی تعصبات ہیں کہ جنھوں نے انھیں اہمیت دے رکھی ہے۔

درحقیقت " لایستطیعون " " لا یملکون " (وہ کسی چیز کے مالک نہیں) کی دلیل ہے اس لیے کہ وہ ان کی خلقت یا حفاظت کی ذرہ بھر قدرت بھی نہیں رکھتے۔

اگلی آیت میں نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اب جبکہ ایسا ہے تو پھر تم خدا کی کسی مثل، شبیہ اور نظیر کے قائل نہ ہو (فلا تضربوا للہ الامثال) کیونکہ خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے (ان اللہ یعلم وانتم لا تعلمون)۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ "فلا تضربوا للہ الامثال" زمانہ جاہلیت کے مشرکین کی ایک منطق کی طرف اشارہ ہے (ہمارے زمانے کے بعض مشرکین بھی یہ بات کرتے ہیں) وہ کہتے تھے کہ اگر ہم بتوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس لائق نہیں کہ خدا کی پرستش کریں لہٰذا ہمیں بتوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے کہ جو اس کے مقرب بارگاہ ہیں۔ خدا ایک عظیم شہنشاہ کی طرح ہے کہ وزراء اور خواص ہی اس سے رابطہ کرسکتے ہیں اور عام لوگ جن کی اس بادشاہ تک رسائی نہیں وہ بادشاہ کے قریبی خواص اور مقربین کے پیچھے ہی لگیں گے۔

اس قسم کی قبیح اور غلط منطق بہت خطرناک ہے بعض اوقات بڑے انحرافی انداز میں اسے خوب صورت بنا کر پیش کیا جاتا ہے قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے:

خدا کے لیے مثالیں بیان نہ کرو۔

یعنی ایسی مثال اس کے لیے پیش نہ کرو جو محدود افکار اور ممکن موجودات کے حوالے سے ہو اور نقائص سے معمور ہو کیونکہ ایسی مثال اس سے مناسبت نہیں رکھتی تم اگر اس امر کی طرف توجہ رکھتے کہ تمام موجودات اللہ کے احاطہ وجودی میں ہیں اور اس کے غیر متناہی لطف و رحمت کے سایے میں ہیں اور وہ خود تم سے تمہاری نسبت زیادہ نزدیک ہے تو کبھی بھی وسائط و وسائل کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔

وہ خدا جو براہِ راست اپنے سے راز و نیاز اور گفتگو کی دعوت دیتا ہے اور جس نے اپنے گھر کے دروازے شب و روز تمہارے لیے کھول رکھے ہیں اسے کسی جابر و متکبر بادشاہ سے تشبیہ نہیں دینا چاہیے کیونکہ یہ بادشاہ تو محل نشین رہتے ہیں اور گنتی کے چند افراد کے سوا کوئی ان کے محل میں نہیں جاسکتا (فلا تضربوا للہ الا مثال)۔

صفاتِ خدا کی بحثوں میں ہم اس نکتے کی طرف خصوصی طور پر متوجہ ہوتے ہیں کہ صفاتِ الٰہی کی شناخت کی راہ میں تشبیہ کا مسئلہ نہایت خطرناک ہے یعنی اس کی صفات کو بندوں پر قیاس کرنا اور ان سے مشابہ قرار دینا کیونکہ خدا ہر لحاظ سے ایک لامتناہی وجود ہے اور دوسرے ہر لحاظ سے محدود وجود ہیں لہٰذا ہر قسم کی تشبیہ و تمثیل ہمیں اس کی ذات سے دور لے جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جہاں ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس کی ذاتِ مقدس کو نور یا اس قسم کی چیز کے ساتھ تشبیہ دیں وہاں بھی ہمیں متوجہ رہنا چاہیے کہ ایسی تشبیہات بہر حال ناقص اور نارسا ہیں اور صرف کسی ایک پہلو سے قابل قبول ہیں نہ کہ ہر پہلو سے (غور کیجیے گا)۔ جبکہ بہت سے لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور زیادہ تر تشبیہ و قیاس کی گمراہ کن وادیوں میں گھر جاتے ہیں، اور حقیقتِ توحید سے بہت دور جا پڑتے ہیں لہٰذا قرآن بار بار بیدار کرتا ہے اور تنبیہ کرتا ہے کبھی کہتا ہے:

ولم یکن له کفوًا احد

کوئی چیز اس کے ہم پلہ اور اس کی مثل نہیں۔ (اخلاص ۴)

کبھی کہتا ہے:

لیس کمثله شیء

کوئی شے اس کی مانند و مثل نہیں ہے۔ (شوریٰ ۱۱)

کبھی فرماتا ہے:

فلا تضربوا لله الامثال

یہ در اصل اسی حقیقت کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے ہے اور شاید "ان الله یعلم وانتم لا تعلمون" (خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے) اسی مسئلے کی طرف اشارہ کر رہا ہو کہ عام طور پر لوگ صفاتِ الٰہی کے اسرار سے بے خبر ہیں۔

۷۵۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ۭ هَلْ يَسْتَوٗنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

۷۶۔ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ ع

۷۷۔ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

ترجمہ:

۷۵۔ خدا نے مثال بیان کی ہے اس مملوک غلام کی جس کی قدرت میں کوئی چیز نہیں ہے اور اس (باایمان) انسان کی جسے اچھا رزق بخشا گیا ہے اور وہ چھپ کر اور آشکارا اس عطائے خدا میں خرچ کرتا ہے کیا یہ دونوں برابر ہیں۔ حمد و شکر خدا کے لیے ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

۷۶۔ اور اللہ نے دو افراد کی (ایک اور) مثال بیان کی ہے کہ جن میں سے ایک مادر زاد گونگا ہے کہ جو کچھ نہیں کر سکتا اور اپنے ساتھی پر بوجھ ہے اسے جس کام کے لیے بھی بھیجا جائے اچھا عمل انجام نہیں دیتا کیا ایسا شخص اس انسان کے برابر ہے جو عدل و انصاف سے فیصلہ کرتا ہے اور راہِ مستقیم پر قائم ہے۔

۷۷۔ آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ کے لیے ہے (اور وہی سب کچھ جانتا ہے) اور قیامت کا معاملہ اس کے لیے بالکل پلک جھپکنے یا اس سے بھی معمولی کام کی طرح ہے (کیونکہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے)۔

تفسیر:

مومن اور کافر کے لیے مثالیں:

گزشتہ آیات میں ایمان و کفر اور مومنین و مشرکین کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر نظر آیات میں دو زندہ اور روشن مثالوں کے ذریعے ان کی حالت کو واضح کیا گیا ہے۔

پہلی مثال میں مشرکین کو اس غلام مملوک سے تشبیہ دی گئی ہے جس کے بس میں کچھ نہیں ہوتا اور مومنین کو غنی و بے نیاز انسان سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو اپنے وسائل سے سب کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اللہ غلام مملوک کا ذکر بطور مثال کرتا ہے کہ جس کے بس میں کچھ بھی نہیں (ضرب اللہ مثلاً عبداً مملوکاً لایقدر علی شیء)۔ نہ تکوین میں اس کی کوئی قدرت ہے اور نہ تشریع میں۔ کیونکہ ایک طرف وہ ہمیشہ اپنے آقا کی قید میں ہوتا ہے اور ہر لحاظ سے محدود ہوتا ہے اور دوسری طرف اسے اپنے مال میں (وہ بھی اگر ہو تو) کوئی حق تصرف نہیں ہوتا اور اسی طرح اپنی ذات سے متعلق دیگر امور میں بھی وہ آزاد نہیں ہوتا۔

جی ہاں ــــ بندوں کا غلام اور بندہ ہونے کا تو قید اور ہر لحاظ سے محدودیت کے سوا کچھ نہیں۔

جبکہ اس کے مقابلے میں آزاد انسان کی مثال اس شخص کی سی ہے جسے رزق حسن اور طرح طرح کی روزی اور پاکیزہ نعمتیں میسر ہوں (ومن رزقناہ منا رزقاً حسناً)۔

ان آزاد انسانوں کے پاس بہت سے وسائل ہیں کہ جن سے وہ چھپ چھپا کر بھی اور اعلانیہ بھی خرچ کرتے ہیں اور انفاق کرتے ہیں (فھو ینفق منہ سراً و جھراً)۔

کیا یہ دونوں افراد برابر ہیں (ھل یستوٗن)۔

مسلم ہے کہ ایسا نہیں ہے لہٰذا "تمام حمد اللہ کے لیے مخصوص ہے" (الحمد للہ)۔

وہ اللہ کہ جس کا بندۂ آزاد قدرت مند بھی ہے اور عطا کرنے والا بھی ــــ جبکہ بتوں کے بندے ناتواں، محدود، بے قدر اور قیدی ہیں "لیکن ان (مشرکین) میں سے اکثر نہیں جانتے (بل اکثرھم لایعلمون)"۔[1]

اس کے بعد ایک اور مثال بتوں کے بندوں اور سچے مومنین کے بارے میں بیان کی گئی ہے بتوں کے بندوں کو مادر زاد گونگوں سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو غلام اور ناتواں بھی ہیں اور سچے مومنین کو اس آزاد انسان سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو قوت گویائی رکھتا ہے

---

[1] جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے اس کے مطابق مذکورہ دو مثالیں مومن اور کافر کے لیے ہے لیکن بعض مفسرین نے اس تشبیہ کے لیے ایک اور احتمال ذکر کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ یہاں مراد یہ ہے کہ بتوں کو مملوک غلام سے اور خدا کو اس آزاد مومن سے تشبیہ دی جائے کہ جو صاحب نعمات بے حساب اس میں سے خرچ کرتا ہے۔ لیکن یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے۔

ہمیشہ عدل و انصاف کی دعوت دیتا ہے اور صراطِ مستقیم پر قائم ہے۔

ارشاد ہوتا ہے : اللہ نے دو اشخاص کی مثال دی ہے ان میں سے ایک مادرزاد گونگا ہے اور کچھ اس کے بس میں نہیں (و ضرب الله مثلاً رجلين احدهما ابكم لا يقدر على شیء)[1]

وہ غلام ہونے کے باوجود اپنے مولا و آقا کے لیے بوجھ ہے (و هو كل على مولٰه)۔ یہی وجہ ہے کہ اسے جس کام کے لیے بھی بھیجا جائے وہ اچھا کام انجام نہیں دے سکتا (اينما يوجهه لا يأت بخير)۔

گویا اس میں چار منفی صفات ہیں :

۱۔ وہ مادرزاد گونگا ہے۔

۲۔ بالکل ناتواں ہے۔

۳۔ اپنے مالک کے لیے بوجھ ہے اور

۴۔ جب اسے کسی کام کے لیے بھیجا جائے تو کوئی مثبت اقدام نہیں کر پاتا۔

یہ چار صفات اگرچہ ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں مگر ایک انسان کی منفی حالت کی سو فی صد تصویر کشی کرتی ہیں کہ جس کے وجود سے کوئی خیر و برکت حاصل نہیں ہوتی اور جو معاشرے اور اپنے خاندان پر بوجھ ہے۔

کیا ایسا شخص اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے کہ جو فصیح و گویا زبان رکھتا ہے اور ہمیشہ عدل و انصاف کی دعوت دیتا رہتا ہے اور صاف راستے اور سیدھی راہ پر قائم ہے۔ (هل يستوي هو ومن يأمر بالعدل وهو على صراط مستقيم)۔

یہاں اگرچہ دو ہی صفات بیان ہوئی ہیں ——————

ایک مسلسل عدل و انصاف کی صورت اور

دوسری طرزِ مستقیم اور صحیح راستہ کہ جو ہر قسم کے انحراف سے پاک ہو۔

لیکن —————— یہ دونوں صفات دوسری صفات کو واضح کرتی ہیں وہ شخص کہ جو ہمیشہ عدل و انصاف کی دعوت دیتا ہے، کیا ہو سکتا ہے کہ وہ ایک گونگا، بزدل اور بے وقعت انسان ہو۔ ہرگز نہیں ایسا شخص —————— زبان گویا، منطق محکم ارادہ قوی اور شجاعت و شہامت کا حامل ہوگا۔

وہ شخص کہ جو راہِ مستقیم پر گامزن ہو —————— کیا وہ بے دست و پا، ناتواں، بے ہوش اور کم عقل انسان ہو سکتا ہے؟ —————— ہرگز نہیں —————— مسلّم ہے کہ وہ ایک صاحبِ فکر و نظر، صاحبِ کاوش و جستجو، باہوش، باتدبیر اور با استقامت

---

[1] ولنسب مفردات میں لکھا ہے کہ "ابکم" اس شخص کے معنی میں ہے جو مادرزاد گونگا ہو جبکہ "اخرس" ہر طرح کے گونگے کو کہتے ہیں

كل ابكم اخرس وليس كل اخرس ابكم

ہر "ابکم" "اخرس" ہوگا جبکہ ہر "اخرس" "ابکم" نہیں ہوگا۔

اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ کبھی یہ لفظ ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو عقلی کمزوری کی وجہ سے بات کرنے سے عاجز ہو۔

شخص ہوگا۔

ان دونوں کا موازنہ کیا جائے تو بت پرستی اور خدا پرستی میں وسیع فرق واضح ہو جاتا ہے اور ان دونوں نقطۂ ہائے نظر اور مکاتب فکر کے تحت تربیت پانے والوں کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔

عام طور پر ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن توحید کے بیان اور شرک کے خلاف گفتگو کو معاد اور قیامت کی عظیم عدالت کے مسائل سے مربوط کر دیتا ہے یہاں بھی ایسی ہی صورت حال ہے گزشتہ اور زیر بحث آیات شرک کی نفی اور اثبات توحید کے بارے میں ہیں اب گفتگو کا رُخ معاد کی طرف ہو رہا ہے اور مشرکین کے بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: اللہ آسمانوں اور زمین کے غیبی امور سے آگاہ ہے۔ (و للہ غیب السمٰوٰت و الارض)۔

گویا یہ اس اعتراض کا جواب ہے کہ جو معاد جسمانی کے منکر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم جس وقت مر جائیں گے اور ہماری خاک کے ذرّے ادھر ادھر بکھر جائیں گے تو کیسے ان کا علم ہوگا کہ وہ ہمیں جمع کر سکے۔ علاوہ ازیں، وہ کہتے، اگر فرض کریں ہمارے جسموں کے بکھرے ہوئے ذرات جمع بھی ہو جائیں اور ہمیں پھر سے زندگی بھی مل جائے ان جسموں کے بھولے بسرے ہوئے اعمال سے کون آگاہ ہوگا اور کون ان کے نامۂ اعمال کی پڑتال کرے گا۔

زیر بحث آیت ایک ہی جملے میں اس سوال کے تمام پہلوؤں کا جواب دیتی ہے کہ خدا آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہے، وہ ہر جگہ ہمیشہ حاضر ہے لہٰذا اصولی طور پر غیب و پنہاں کا اس کے لیے کوئی مفہوم ہی نہیں۔ اس کے لیے تمام چیزیں شہود ہیں

یہ مختلف تعبیرات تو ہمارے وجود کے حساب سے ہیں اور ہماری منطق سے ہم آہنگ ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: قیامت کا معاملہ تو پلک جھپکنے یا اس سے بھی کم تر لحظے پر آسان ہے (وما امر الساعۃ الا کلمح البصر او ھو اقرب)[1]

یہ درحقیقت منکرین معاد کے دوسرے اعتراض کی طرف اشارہ ہے وہ کہتے تھے کہ یہ کام تو انتہائی مشکل ہے، کون اسے انجام دینے کی قدرت رکھتا ہے؟

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: تمہاری طاقت بہت کم ہے اس لیے تمہیں یہ کام مشکل دکھائی دیتا ہے لیکن خدا کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں اس کے لیے یہ کام آسان سا ہے جیسے تمہارا پلک جھپکنا آسان سا بھی ہے اور تیزی سے انجام بھی پا جاتا ہے

یہ بات جاذب نظر ہے کہ قیام قیامت کو پلک جھپکنے یا جلدی سے کسی چیز کو دیکھنے سے تشبیہ دے کر مزید فرمایا گیا ہے او ھو اقرب (یا اس سے بھی نزدیک تر) یعنی نظر بھر دیکھنا اور پلک جھپکنے کی تشبیہ بھی تنگی بیان کی وجہ سے ہے یعنی قیامت اس تیزی سے برپا ہوگی کہ اس کے لیے مدت اور زمانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جو یہ "لمح البصر" کہا گیا ہے یہ بھی اس لیے ہے

---

[1] "لمح" (بروزن "مسح") اصل میں بجلی چمکنے کے معنی میں ہے بعد ازاں ایک چکتی نگاہ ڈالنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ معنا توجہ رہے کہ یہاں "او" "بل" کے معنی میں ہے۔

کہ تمھاری منطق میں اس سے مختصر تر کوئی زمانہ نہیں ہے ۔
بہرحال یہ دو چھوٹے چھوٹے جملے اللہ کی بے انتہاء قدرت پر ـــــــ خصوصاً معاد اور انسانوں کے قبروں سے جی اٹھنے میں اس کی قدرت پر ـــــــ زندہ ناطق اور منہ بولتے اشارے ہیں۔ اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کیونکہ خدا ہر چیز پر توانا و قادر ہے (ان اللہ علی کل شیءٍ قدیر)۔

چند اہم نکات :

۱۔ آزاد اور قیدی انسان : بعض لوگوں کے نظریے کے برخلاف توحید اور شرک کا مسئلہ صرف ایک اعتقادی اور ذہنی مسئلہ نہیں ہے بلکہ انسان کی ساری زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اور ہر چیز کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے توحید کا پودا جس دل میں لگ جاتا ہے اس دل کی زندگی اور رشد و نمو کا عامل بن جاتا ہے کیونکہ توحید انسانی نگاہ کو اس قدر وسیع کر دیتی ہے کہ اس کا رشتہ لامتناہی ذات سے جوڑ دیتی ہے۔

لیکن اس کے برعکس شرک انسان کو پتھر، لکڑی کے بتوں کی انتہائی محدود دنیا میں محصور کر دیتا ہے انسانوں کو بتوں کی طرح کمزور کر دیتا ہے اور انسان کی فکر، نظر، ہمت، سعی اور توانائی کو اسی رنگ میں رنگ دیتا ہے ۔
زیر بحث آیت میں یہ حقیقت مثال کے پیرائے میں اس خوبصورتی سے بیان ہوئی ہے کہ اس سے عمدہ اور رسا انداز ممکن نہیں ہے۔ مشرک "ابکم" (گونگا ہے) مادرزاد گونگا کہ جس کا عمل اس کی فکری کمزوری اور رعاری ازمنطق ہونے کا ترجمان ہے اور وہ شرک کے چنگل میں گرفتار ہونے کی وجہ سے کوئی مثبت کام نہیں کر سکتا (لا یقدر علی شیءٍ)۔
وہ ایک آزاد انسان نہیں ہے بلکہ خرافات و موہومات کا قیدی ہے ۔ اپنی انھی صفات کی بنا پر وہ معاشرے پر ایک بوجھ ہے کیونکہ اس نے اپنی تقدیر کی مہار بتوں یا استعمار گر انسانوں کے ہاتھ میں دے رکھی ہے وہ ہمیشہ بندھا ہوا اور کسی پر انحصار کیے ہوئے ہوتا ہے جبکہ توحید آزادی اور استقلال کا آئینہ ہے وہ جب تک توحید کا ذائقہ نہ چکھے اس بندھن سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ وھو کل علی مولاہ"
اپنی یہ طرز فکر لیے ہوئے وہ جس راستے پر بھی قدم رکھے گا ، ناکام رہے گا اور کسی طرف اسے خیر و سعادت نصیب نہیں ہوگی ۔"اینما یوجھہ لایأت بخیر"
کتنا فکری کے اس اسیر اور عاجز و ناتواں شخص کی زندگی کا کوئی ہدف اور پروگرام نہیں ہے یہ اس مرد آزاد و شجاع سے کس قدر مختلف ہے جو نہ صرف خود عدل و داد پر کاربند ہے بلکہ ہمیشہ اپنے معاشرے میں عدل و داد کی حکمرانی کا پرچم بلند کیے رہتا ہے ۔ علاوہ ازیں ایک آزاد انسان منطقی فکر اور توحید کے فطری نظام سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ راہ مستقیم پر گامزن رہتا ہے وہی راہ مستقیم جو منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے نزدیک ترین راستہ ہے اس راستے سے انسان تیزی سے منزل تک جا پہنچتا ہے ایک آزاد انسان کج راستوں پر اپنا سرمایۂ وجود ضائع نہیں کرتا ہے ۔
خلاصہ یہ کہ توحید و شرک صرف عقیدہ نہیں ہے بلکہ پوری زندگی سے ان کا تعلق ہے سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور تمدنی زندگی

ان سے مربوط ہے۔ اگر ہم زمانہ جاہلیت کے مشرک عربوں اور ابتدائے اسلام کے موحد مسلمانوں کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ان دونوں راستوں کا واضح فرق معلوم ہو جائے گا۔

وہی افراد جو کل تک جہالت، تفرقہ، انحطاط اور بدبختی میں ایسے گرفتار تھے کہ انھیں فقر و فساد سے آلودہ اپنے ماحول کے سوا کچھ خبر نہ تھی لیکن جب انھوں نے وادی توحید میں قدم رکھا تو انھیں ایسی وحدت، آگہی اور توانائی میسر آئی کہ اس زمانے کی ساری متمدن دنیا ان کے زیر نگیں ہو گئی۔

۲۔ **انسانی زندگی پر عدالت اور سچائی کا اثر:** یہ بات جاذب نظر ہے کہ زیر بحث آیات میں مومدین کے کاموں میں سے صرف دعوت عدل اور صراط مستقیم پر گامزن ہونے کا ذکر کیا گیا ہے یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ کسی فرد یا معاشرے کی حقیقی سعادت انھی دو چیزوں میں مضمر ہے انسان کا طرز عمل صحیح ہو اس کی زندگی کا پروگرام نہ شرقی ہو نہ غربی وہ نہ دائیں طرف متوجہ ہو اور نہ بائیں طرف اور پھر قیام عدل کی دعوت۔ وہ بھی وقتی نہیں بلکہ "یامر بالعدل" کے مفہوم کے مطابق دائمی اور مسلسل (کیونکہ "یامر" مضارع کا صیغہ ہے جو دوام کا مفہوم دیتا ہے)۔

۳۔ **ایک روایت پر نظر:** طرق اہل بیت سے ایک روایت مندرجہ بالا آیات کی تفسیر کے ضمن میں آئی ہے روایت میں ہے

الذی یأمر بالعدل امیر المؤمنین والائمة (صلوٰة اللہ علیہم)

عدل و انصاف کی دعوت دینے والے امیر المؤمنین علی اور آئمہ اہل بیت (صلوٰۃ اللہ علیہم) ہیں[1]

بعض مفسرین نے "من یأمر بالعدل" سے حضرت حمزہ، عثمان بن مظعون یا عمار یاسر مراد لیے ہیں اور "ابکم" سے ابی بن خلف اور ابو جہل وغیرہ۔

واضح ہے کہ یہ سب ان کے لیے واضح مصداق ہیں اور ان روایات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کا مفہوم انھی افراد میں منحصر ہے۔ ضمنی طور پر ان تفاسیر سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ آیات کی تشبیہ بتوں اور خدا کی طرف اشارہ نہیں کرتی بلکہ مشرکین اور مومنین کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

---

[1] نور الثقلین، جلد ۳ ص ۷۰۔

۷۸۔ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

۷۹۔ اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

۸۰۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَا اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ○

۸۱۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ○

۸۲۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○

۸۳۔ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ ع

ترجمہ:

۷۸۔ اللہ نے تمھیں تمھاری ماؤں کے شکم سے اس حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے لیکن اس نے تمھیں کان، آنکھ اور عقل عطا کی تاکہ اس کی نعمت کا شکر ادا کرو۔

۷۹۔ کیا انھوں نے ان پرندوں پر نظر نہیں ڈالی کہ جو فضائے آسمانی میں مسخر ہیں انھیں خدا کے سوا کس نے

مقام رکھا ہے اس میں عظمت و قدرتِ خدا کی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے کہ جو ایمان رکھتے ہیں۔

۸۰۔ اور اللہ نے تمھارے لیے تمھارے گھروں میں سے آرام و قیام کی جگہ قرار دی اور اسی نے تمھارے لیے چوپایوں کی کھالوں سے خیمے بنائے جنھیں تم سبک پاکر اپنے سفر و حضر میں کام میں لاتے ہو اور ان سے حاصل ہونے والی اُون، روئی اور بالوں سے تمھارے لیے ایک معین وقت تک کے لیے بہت سے اسباب اور کارآمد چیزیں پیدا کی ہیں۔

۸۱۔ اس نے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں سے تمھارے لیے سایے کا انتظام کیا۔ پہاڑوں میں تمھارے لیے پناہ گاہیں بنائیں اور تمھارے لیے ایسے لباس بنائے کہ جو گرمی (اور سردی) سے بچاتے ہیں، اور جنگ میں تمھاری حفاظت کرنے والے لباس بھی بناتے ہیں اس طرح وہ تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرتا ہے تاکہ تم اس کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو۔

۸۲۔ (ان سب چیزوں کے باوجود) اگر وہ روگردانی کریں (تو تم پریشان نہ ہو جاؤ) تیرے ذمے تو صرف واضح ابلاغ کرنا ہے۔

۸۳۔ (لیکن) وہ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر کافر ہیں

تفسیر:

طرح طرح کی مادی اور روحانی نعمتیں:

قرآن حکیم ایک درسِ توحید اور خداشناسی کے لیے ایک مرتبہ پھر پروردگار کی گوناگوں نعمتوں کا ذکر کرتا ہے اس میں سب سے پہلے علم و دانش اور معرفت و شناخت کے آلات کی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے اللہ نے تمھیں تمھاری ماؤں کے شکم سے اس حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے (واللہ اخرجکم من بطون امھاتکم لا تعلمون شیئًا)۔

البتہ اس محدود، تاریک، وابستہ اور بندھے ہوئے ماحول میں یہ جہالت اور بے خبری گوارا تھی لیکن جب تم نے اس وسیع دنیا میں قدم رکھا اب ممکن نہ تھا یہ جہالت یونہی جاری رہے۔ لہذا ادراکِ حقائق اور شناخت موجودات کے لیے کان، آنکھ اور عقل جیسے وسائل تمہیں عطا کیے گئے (وجعل لکم السمع والابصار والافئدة) تاکہ تم ان عظیم نعمتوں کو سمجھ سکو اور انھیں عطا کرنے والے کے لیے تمھارے اندر احساسِ تشکر پیدا ہو "شاید تم اس کا شکر ادا کرو" (لعلکم تشکرون)۔

چند قابلِ توجہ نکات :

۱۔ ابتداء میں انسان کچھ نہیں جانتا ہوتا : یہ آیت صراحت کے ساتھ کہتی ہے کہ پیدائش کے وقت انسان بالکل کوئی علم نہیں رکھتا ہوتا لہٰذا وہ جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ ولادت کے بعد اللہ کے عطا کردہ وسائل سے حاصل کرتا ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے وہ یہ کہ قرآن کہتا ہے بچہ جب حالتِ جنین سے نکلتا ہے اس وقت کچھ بھی نہیں جانتا ہوتا حالانکہ ہم کئی طرح کے فطری چیزوں کے حامل ہوتے ہیں۔ مثلاً خدا شناسی اور اسی طرح کئی واضح مسائل (جیسے متضاد چیزوں کا جمع نہ ہو سکنا۔ یا کل جزء سے بڑا ہوتا ہے) یا کئی اجتماعی اور اخلاقی مسائل (جیسے عدل اچھا ہے اور ظلم بُرا ہے) اور اس طرح کے کئی اور مسائل سے انسان فطری طور پر آگاہ ہوتا ہے کیونکہ یہ آگاہی تو ہماری فطرت میں رکھ دی گئی ہے تو پھر قرآن کیوں کہتا ہے کہ پیدائش کے وقت تم کچھ نہیں جانتے تھے۔

کیا ہمیں اپنے وجود کا علم بھی نہیں تھا کہ جو علمِ حضوری شمار ہوتا ہے اور وہ بھی کان، آنکھ اور عقل کے ذریعے ہمیں حاصل ہوتا ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں یہ بدیہی ضروری اور فطری علوم بھی اس لمحے عملی طور پر انسان میں نہیں تھے صرف ان کی استعداد اور قوت انسان کے اندر موجود تھی۔ دوسرے لفظوں میں ولادت کے وقت ہم ہر چیز سے غافل تھے یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی۔ البتہ استعداد کے اعتبار سے بہت سے حقائق کا ادراک ہمارے اندر مخفی تھا۔ رفتہ رفتہ ہماری آنکھ میں قوتِ بینائی پیدا ہوئی۔ کان میں طاقتِ شنوائی پیدا ہوئی اور عقل نے ادراک، تجزیہ اور تحلیل کی قدرت حاصل کی اور ہم خدا کی ان تینوں نعمتوں سے بہرہ مند ہوئے پہلے پہل قوتِ حس کے ذریعے بہت سی چیزوں کے تصورات پیدا ہوگئے وہ تصورات عقل کی طرف منتقل ہوئے۔ پھر ان سے کامل اور کامل تر مفاہیم بننے لگے اور تعمیم و تجرید کے ذریعے کلی حقائق تک ہماری رسائی ہوئی اس سفر سے گزرتی ہوئی ہماری قوتِ فکر اس مقام تک آ پہنچتی ہے کہ ہم علمِ حضوری کے طور پر اپنے آپ سے آگاہ ہوتے ہیں پھر وہ علوم جو استعداد کے طور پر ہمارے اندر موجود ہیں ان میں جان پیدا ہوتی ہے اور وہ عملی شکل اختیار کرتے ہیں ان بدیہی اور ضروری علوم کی بنیاد پر ہم نظری اور غیر بدیہی علوم تک پہنچتے ہیں لہٰذا آیت میں جو عمومیت پائی جاتی ہے اس میں تخصیص اور استثناء کی گنجائش نہیں اور اس بات کا مفہوم کلی ہے کہ "جب تمہیں پیدا کیا گیا تم کچھ نہ جانتے تھے"۔

۲۔ آلاتِ شناخت کی نعمت : اس میں شک نہیں کہ عالمِ خارج کے لیے ہمارے وجود کی داخلی دنیا کے لیے کوئی راستہ نہیں البتہ ہماری روح میں موجود مختلف آلات و وسائل کے ذریعے اس کی تصویر اور شکل نقش ہوتی ہے اس طرح خارجی دنیا سے ہماری شناخت آلات کے ذریعے ہوتی ہے اور ان آلات میں سے سب [illegible] کان اور آنکھ ہیں۔

بیرونی دنیا سے یہ آلات جو کچھ حاصل کرتے ہیں ہمارے ذہن اور فکر کی طرف منتقل کرتے ہیں اور ہم عقل و فکر کی قوت سے انھیں حاصل کرتے ہیں اور اس کا تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں۔

اسی بناء پر زیرِ بحث آیت میں یہ بتانے کے بعد کہ انسان جب اس جہان میں قدم رکھتا ہے تو اسے مطلقاً کسی چیز کا علم نہیں ہوتا قرآن مزید فرماتا ہے :

"اللہ نے تمھیں آنکھ، کان اور دل عطا کیے ہیں (تاکہ تم حقائقِ ہستی تک پہنچ سکو)۔"

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے کان کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر آنکھ کا، حالانکہ ظاہراً آنکھ کی کارکردگی کا دائرہ زیادہ وسیع ہے اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ نوزائیدہ بچے میں پہلے کان کارکردگی کا آغاز کرتا ہے اور آنکھیں کچھ مدت بعد دیکھنے لگتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ رحمِ مادر کی دنیا تو بالکل تاریک ہوتی ہے سابتدائے تولد میں آنکھیں روشنی کی شعاعیں قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں یہی وجہ ہے کہ ولادت کے بعد عام طور پر آنکھیں بند ہوتی ہیں اور رفتہ رفتہ روشنی کی عادی ہوتی ہیں اور ان میں دیکھنے کی قوت زیادہ ہوتی ہے جبکہ کان کے بارے میں بعض کا نظریہ یہ ہے کہ وہ عالمِ جنین میں بھی تھوڑا بہت سن لیتے ہیں اور بچہ ماں کے پیٹ میں اس کے دل کی دھڑکن سنتا ہے اور اس کا عادی ہوتا ہے۔

ان سب چیزوں سے قطع نظر انسان آنکھ کے ساتھ صرف حسی امور کو دیکھتا ہے جبکہ کان تمام پہلوؤں سے تعلیم و تربیت کا ذریعہ ہے۔ کان الفاظ سننے کے ذریعے تمام حقائق سے آشنا ہو جاتا ہے چاہے وہ حسی ہوں یا قوتِ حس کے دائرے سے باہر جبکہ آنکھ یہ وسعتِ عمل نہیں رکھتی یہ ٹھیک ہے کہ انسان آنکھ کے ذریعے الفاظ پڑھ کر ان مسائل سے آگاہ ہو جاتا ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ سب لوگ نہیں پڑھ سکتے۔ جبکہ الفاظ سُن تو سبھی سکتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ "سمع" مفرد شکل میں اور "ابصار" (جو "بصر" کی جمع ہے) جمع کی شکل میں کیوں آیا ہے تو اس کی وجہ ہم پہلی جلد میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۷ کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ "فؤاد" اگرچہ "قلب" (عقل) کے معنی میں آیا ہے لیکن "قلب" سے اس کا فرق یہ ہے کہ "فؤاد" کے مفہوم میں جوش، جذبہ اور ولولہ پیدا ہونے کا مفہوم بھی شامل ہے یعنی تجزیہ و تحلیل اور تخلیق و ایجاد کا معنی بھی اس میں پنہاں ہیں۔

راغب مفردات میں کہتا ہے:

الفؤاد کالقلب لکن یقال له فؤاد اذا اعتبر فیه معنی التفؤد ای التوقد

"فؤاد" "قلب" کی طرح ہے لیکن یہ لفظ وہاں بولا جاتا ہے جہاں اس سے روشنی دینا اور درخشندگی مراد ہو۔

یہ بات مسلّم ہے کہ یہ چیز کافی تجربے کے بعد انسان کے ہاتھ آتی ہے بہرحال شناخت کے آلات اگرچہ ان دو یا تین میں منحصر نہیں ہیں تاہم تسلیم شدہ امر ہے کہ اہم ترین آلاتِ شناخت یہی ہیں کیونکہ انسان کا علم تجربے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے یا عقلی استدلال کے ذریعے۔ ظاہر ہے کہ تجربہ آنکھ اور کان کے بغیر ممکن نہیں ہے سب عقلی استدلالات تو وہ "فؤاد" یعنی عقل کے ذریعے صورت پذیر ہوتے ہیں۔

۲۔ **تاکہ اس کا شکر بجا لاؤ:** آلاتِ شناخت بہت بلند اور عظیم نعمت ہے کہ جو انسان کو عطا کی گئی ہے کیونکہ آنکھ اور کان سے انسان نہ صرف وسیع عالمِ ہستی میں آثارِ الٰہی دیکھتا ہے اور رہبرانِ الٰہی کی باتیں سنتا ہے اور دل کے ذریعے ادراک اور

تجزیہ وتحلیل کرتا ہے بلکہ اس کی مادی زندگی میں بھی ہر قسم کی ترقی وتکامل انہی تین وسائل کا مرہونِ منت ہے اسی لیے ان کے ذکر کے ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: "لعلکم تشکرون"۔

یہ جملہ ان تین چیزوں کی اہمیت یاددلاتا ہے یعنی یہ وسائل تمہیں عطا کیے گئے ہیں تاکہ تم عالم اور آگاہ ہو اور اس کے بعد اس آگہی وعلم پر شکر بجالاؤ کہ جو حیوانوں سے تمہیں بہت ممتاز کرتا ہے اس میں شک نہیں کہ کوئی انسان ان عظیم نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرسکتا سوائے اس کے کہ بارگاہ ایزدی میں عذر کوتاہی پیش کرے۔

اس کے بعد کی آیت میں بھی وسیع عالم ہستی میں پھیلے ہوئے عظمت الٰہی کے اسرار کا ذکر جاری ہے ارشاد ہوتا ہے: کیا وہ ان پرندوں کو نہیں دیکھتے کہ جو وسعتِ آسمان میں پرواز کرتے ہیں (الم یروا الی الطیر مسخرات فی جو السماء)۔

"جو" لغت میں فضا کے معنی میں ہے (جیسا کہ مفردات میں راغب نے بیان کیا ہے) اور یا پھر یہ ہوا کا وہ حصہ ہے جو زمین سے دور ہے (جیسا کہ تفسیر مجمع البیان، المیزان اور آلوسی میں بیان کیا گیا ہے)۔

اجسام کی فطرت یہ ہے کہ وہ زمین کی طرف کھنچتے ہیں لہٰذا زمین سے اوپر پرندوں کی پرواز اور آمدورفت کو "مسخرات" (تسخیر شدہ) کہا گیا ہے یعنی اللہ نے ان کے پروبال کو قوت دی ہے اور ہوا میں ایک خاصیت پیدا کی ہے کہ جو ان کے لیے اسے ممکن بناتی ہے کہ کشش ثقل کے باوجود وہ فضا میں پرواز کرتے ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: خدا کے سوا کوئی انہیں فضا میں اس طرح روکے نہیں رکھ سکتا (ما یمسکھن الا اللہ)۔

یہ ٹھیک ہے کہ پروبال کی طبعی خاصیت ان میں پیدا کئے گئے عضلات، پرندوں کی مخصوص شکل اور ہوا میں موجود خصوصیات نے باہم مل کر پرندوں کی پرواز کو ممکن بنایا ہے لیکن یہ شکل وصورت اور ان خواص کو کس نے پیدا کیا ہے اور اس گہرے حساب شدہ نظام کو کس نے مقرر کیا ہے کیا اندھی گونگی طبیعت نے یا اس ذات نے کہ جو اجسام کے تمام طبیعاتی خواص سے آگاہ ہے اور جس کا لامتناہی علم ان سب پر محیط ہے۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ ان تمام امور کی خدا کی طرف نسبت دی جاتی ہے تو اس کی یہی وجہ ہے کہ وہی ان سب کا سرچشمہ ہے ایسی تعبیرات کہ جن میں اسباب وعلل اور خواص کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے قرآن حکیم میں بہت ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اس امر میں اللہ کی عظمت وقدرت کی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں (ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یؤمنون)۔

یعنی جو متلاشیانِ حق ان امور کو چشم بصیرت سے دیکھتے ہیں اور ان کا تجزیہ وتحلیل کرتے ہیں ان کا ایمان ان سے زیادہ قوی اور راسخ تر ہے۔

چند قابلِ غور نکات:

۱۔ فضائے آسمانی میں پرندوں کی پرواز کے اسرار: اس بات کو سمجھنا آسان ہے کہ جہانِ ہستی کی بہت سی

چیزیں ہمیں زیادہ حیرت میں کیوں نہیں ڈالتیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم انھیں دیکھتے رہتے ہیں اور ان کے عادی ہو چکے ہیں اس عادت نے درحقیقت ان طرح طرح کی حیران کن چیزوں کے درمیان ایک پردہ سا حائل کر دیا ہے۔

اگر ہم اپنے ذہن کو اس عادی زندگی سے نکال لیں تو ہمیں اپنے گرد اگرد بہت ہی حیران کن چیزیں دکھائی دیں۔

پرندوں کی پرواز کا مسئلہ بھی ایسے ہی امور میں سے ہے۔ بھاری جسم کشش ثقل کے قانون کے برخلاف آسانی سے چلتے پھرتے ہیں کتنی جلدی سے وہ بلند جا پہنچتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ یہ بات کوئی سیدھی سادی نہیں ہے۔

اگر ہم پرندوں کی ساخت اور ان کے جسم کو ہر حوالے سے غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان کا پورا جسم پرواز کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

ان کے جسم کی مخروطی شکل کہ جو ان کے بدن پر ہوا کا دباؤ بہت کم کر دیتی ہے ہلکے پھلکے پر اور اس کے ساتھ ساتھ نچلی طرف ان کا چوڑا سینہ سب مل کر انھیں امواج ہوا پر سوار ہونے کے قابل بناتے ہیں اور ان کے پروں کی خصوصی ساخت کہ جو ان کو اوپر اٹھنے کی طاقت بخشتے ہیں[1]

نیز ان کی دُم کی مخصوص ساخت کہ جو ان کے دائیں بائیں اور اوپر نیچے تیزی سے حرکت کے لیے (ہوائی جہاز کی دُم کی طرح) مدد کرتی ہے۔ ان کی قوتِ نظر اور دیگر حواس ایسے ہم آہنگ ہیں کہ جو ان کی تیز اور سریع پرواز کو ممکن بناتے ہیں۔

ان سب چیزوں کے علاوہ ان کے بچوں کی پرورش ان کے وجود سے الگ ہوتی ہے کہ جو انڈوں میں سے نکلتے ہیں ظاہر ہے انھیں اٹھائے پھرنا پرواز کے لیے رکاوٹ ہوتا۔

ان کے علاوہ بھی بہت سے امور ہیں کہ جن میں سے ہر ایک فزکس کے اصول کے تحت پرواز کے لیے بہت مؤثر ہے ان سب کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ انھیں پیدا کرنے والے نے کس قدر وسیع علم و قدرت سے کام لیا ہے قرآن کے بقول:۔

ان فی ذٰلک لاٰیات لقوم یؤمنون

---

[1] اوپر اٹھنے کی طاقت .... یہ فزکس میں نئی اصطلاح ہے کہ جو ہوائی جہازوں کے امور میں استعمال ہوتی ہے۔ مختصراً اس کے بارے میں یہ ہے کہ ایک جسم کی اگر دو مختلف سطحیں ہوں (جیسے ہوائی جہاز کی ہوتی ہیں کہ جس کی نچلی سطح سیدھی ہوتی ہے اور بالائی سطح اوپر کو اٹھی ہوئی خمدار ہوتی ہے) تو ایسا جسم اگر افقی حرکت کرے تو اس کے اندر ایک خاص قسم کی قوت (ENERGY) پیدا ہوتی ہے جو اسے بلند سطح کی طرف لے جاتی ہے یہ قوت اس لیے ہوتی ہے کہ ہوا کا دباؤ بالائی سطح کی نسبت نچلی سطح پر زیادہ ہوتا ہے کیونکہ نیچے والی سطح چھوٹی ہوتی ہے اور اوپر والی سطح زیادہ لمبی ہوتی ہے۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ ہوائی جہازوں کی حرکت کا دار و مدار اسی پر ہے اگر ہم پرندوں پر توجہ کریں تو ان میں یہ امر بہت وضاحت سے دیکھا جا سکتا ہے۔

اصولی طور پر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہوائی جہاز کی ساخت میں پرندوں کی ساخت کی تقلید کی گئی ہے۔

بے شک اس میں اہلِ ایمان کے لیے اللہ کی عظمت و قدرت کی نشانیاں ہیں۔

پرندوں کی دنیا کے عجائبات اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ ایک یا چند کتب میں سما سکیں دورِ حاضر میں بہت سے پرندوں کو ہم مہاجر پرندوں کے نام سے پہچانتے ہیں یہ پرندے اپنی زندگی کی بقاء کے لیے دنیا کے مختلف علاقوں کا سفر کرتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات شمال سے جنوب تک کا بہت ہی طولانی فاصلہ طے کرتے ہیں اور دور دراز کے اس سفر میں انتہائی رمز آمیز وسائل سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں ان کی مدد سے پہاڑوں، صحراؤں، بیابانوں، دروں اور دریاؤں میں اپنا راستہ ڈھونڈھ لیتے ہیں یہاں تک کہ ابر آلود دنوں میں اور کبھی تاریک راتوں میں بھی راہ تلاش کر لیتے ہیں کہ جن میں کوئی انسان اپنا راستہ تلاش کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

بعض اوقات تو یہ ہوتا ہے کہ وہ آسمان کی پہنائیوں میں محوِ خواب بھی ہوتے ہیں اور محوِ پرواز بھی۔ بعض اوقات بغیر کسی لحہ بھر توقف کے کئی کئی ہفتے رات دن محوِ پرواز رہتے ہیں یہاں تک کہ انھیں کھانے پینے کی احتیاج بھی نہیں ہوتی کیونکہ وہ پرواز سے پہلے ایک اندرونی راہنمائی کے ذریعے خوب کھا پی لیتے ہیں یہ غذا بھی چربی کی شکل میں ان کے جسم میں اسٹور ہو جاتی ہے اور راستے میں انھیں ضرورت نہیں پڑتی۔

اسی طرح گھر بنانے، اولاد کی تربیت کرنے، دشمن کا مقابلہ کرنے اور ضروری غذا مہیا کرنے میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے بلکہ اپنی نوع کے علاوہ غیر سے تعاون اور اکٹھے زندگی گزارنے اور اس قسم کے دیگر بہت سے امور میں پرندوں کی زندگی کے ایسے ایسے اسرار ہیں کہ ان میں ہر ایک، ایک طویل داستان ہے۔

جی ہاں! جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا آیت میں پڑھا ہے:

ان میں سے ہر ایک میں عظمت پروردگار اور اس کے لامتناہی علم و قدرت کی نشانیاں ہیں۔

۲۔ آیات کا باہمی ربط: اس میں شک نہیں کہ پرندوں کے پرواز کے بارے میں زیرِ بحث آیت اور اس سے آگے پیچھے کی آیات میں یہ تعلق ہے کہ سب کی سب جہانِ خلقت میں نعماتِ الٰہی کے مختلف پہلوؤں اور اس کی قدرت و عظمت کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں لیکن یہ احتمال بھی زیادہ بعید نہیں کہ آلاتِ شناخت کے ذکر کے بعد پرندوں کی پرواز کا ذکر یہ لطیف نکتہ ہو کہ عالم محسوس میں ان پرندوں کی پرواز کو عالم غیر محسوس میں افکار و خیالات کی پرواز سے تشبیہ دی گئی ہو۔ یعنی ان میں سے ہر ایک اپنے آلات کے ساتھ اپنی اپنی مخصوص فضا میں پرواز کرتے ہیں۔

خطبہ شقشقیہ میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ینحدر عنی السیل ولا یرقی الی الطیر

علم و دانش کی آبشار میرے وجود کے کوہسار سے گرتی ہے اور بلند افکار اس کی چوٹی تک نہیں پہنچ پاتیں۔

آپ کے کلمات قصار میں ہے کہ آپ نے مالک اشتر جیسے جانباز افسر کی فضیلت میں فرمایا:

لا یرتقیہ الحافر ولا یوفی علیہ الطائر

کوئی رہوار اس کے کوہسار وجود سے اوپر نہیں جا سکتا اور کوئی طائرِ فکر اس کی بلندی

چھو نہیں سکتا۔[1]

جیسا کہ ہم نے اس سورہ کی ابتداء میں کہا تھا کہ اس کا ایک نام "نعمتوں کی سورت" ہے کیونکہ اس میں پروردگار کی کوئی پچاس روحانی اور مادی نعمتوں کا ذکر ہے یہ نعمتیں اس کی ذات پاک کی شناسائی کی دلیل بھی ہیں اور ان کا ذکر اس کی شکر گزاری کا سبب بھی ہے۔

زیر بحث تیسری آیت میں بھی اس مسئلے پر گفتگو جاری ہے، ارشاد ہوتا ہے: اور اللہ نے تمہارے لیے تمہارے بعض گھروں میں سے آرام و قیام کی جگہ قرار دیا ہے (واللہ جعل لکم من بیوتکم سکنا)۔

حقیقت یہ ہے کہ گھر اور مسکن ایک ایسی عظیم نعمت ہے کہ جب تک یہ میسر نہ ہو باقی نعمتوں کا کوئی لطف نہیں۔

لفظ "بیوت" "بیت" کی جمع ہے یہ کمرے یا گھر کے معنی میں ہے یہ "بیتوتہ" کے مادہ سے ہے کہ جو در اصل رات میں توقف کرنے کے معنی میں ہے اور چونکہ انسان اپنے کمرے اور گھر سے زیادہ تر رات کو آرام کرنے کے لیے استفادہ کرتا ہے لہٰذا اس پر لفظ "بیت" کا اطلاق ہوا ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ ہم نے تمہارے گھروں کو تمہارے لیے مقام سکونت قرار دیا ہے بلکہ لفظ "من" کہ جو تبعیض یعنی بعض کے لیے آتا ہے استعمال ہوا ہے یعنی تمہارے کمروں اور گھروں میں مقام سکونت قرار دیا ہے۔ یہ تعبیر بہت معنی خیز ہے کیونکہ پورے گھر کے تو اور بھی بہت سے فائدے ہوتے ہیں اس میں مقام سکونت بھی ہوتا ہے سواری کے ٹھہرانے کی جگہ بھی، ضروریات زندگی رکھنے کے لیے سٹور وغیرہ بھی۔

ثابت اور ٹھہرے ہوئے گھروں کے ذکر کے بعد سیار اور چلتے پھرتے گھروں کا ذکر آتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اللہ نے ہی جانوروں کی کھالوں سے تمہارے لیے خیمے بنائے (وجعل لکم من جلود الانعام بیوتا)[2] اور یہ ایسے گھر ہیں کہ جو بہت ہلکے پھلکے ہیں۔ کوچ اور قیام کے وقت انہیں آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکتا ہے (تستخفونها یوم ظعنکم و یوم اقامتکم)۔

علاوہ ازیں ان سے حاصل ہونے والی اُون، روئی اور بالوں سے تمہارے لیے ایک معین وقت تک کے لیے بہت سے اسباب، وسائل زندگی اور کارآمد چیزیں پیدا کی ہیں (ومن اصوافها و اوبارها و اشعارها اثاثا و متاعا الی حین)۔

ہم جانتے ہیں کہ چوپایوں کے بدن پر جو بال اگتے ہیں ان میں سے بعض بہت سخت اور موٹے ہوتے ہیں مثلاً بکری کے بال کہ جنہیں عرب "شعر" کہتے ہیں (اشعار اس کی جمع ہے) اور کبھی کچھ نرم ہوتے ہیں جنہیں پشم یا اون کہتے ہیں عرب انہیں صوف

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار، ص ۴۴۳ ۔

[2] اگرچہ ہمارے زمانے میں چمڑے سے بہت کم خیمے بنائے جاتے ہیں لیکن زیر نظر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں چمڑے کے خیموں کو بہترین سمجھا جاتا تھا اسی لیے قرآن نے اس احسان کا ذکر کیا ہے۔ شاید خیمے سے چمڑے اس لیے بنائے جاتے تھے کہ عرب کے بیابانوں کی نہایت گرم ہواؤں سے بچنے کے لیے ایسے خیمے زیادہ مفید رہتے تھے۔

کہتے ہیں (یہ "اصواف" اس کی جمع ہے) اور کبھی بہت ہی نرم ہوتے ہیں فارسی میں انھیں "کرک" کہتے ہیں۔ عرب انھیں "وبر" (بروزن "قمر") کہتے ہیں (اوبار اس کی جمع ہے)۔[1]

واضح ہے کہ مختلف ساخت اور نوعیت کے ہونے کی وجہ سے ان بالوں کو مختلف کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے کسی سے قالین بنتے ہیں کسی سے لباس اور کسی سے خیمے وغیرہ۔

اس بارے میں کہ آیت میں "اثاث" اور "متاع" سے کیا مراد ہے مفسرین نے مختلف احتمالات ذکر کیے ہیں مجموعی طور پر "اثاث" گھر کے ساز و سامان کو کہا جاتا ہے اس کا مادہ "اث" ہے اور یہ کثرت اور ایک دوسرے میں خلط ملط ہونے سے لیا گیا ہے گھر کا سامان چونکہ عموماً زیادہ ہوتا ہے لہٰذا اسے "اثاث" کہتے ہیں۔

"متاع" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان "متمتع" ہو اور فائدہ اٹھائے۔ لہٰذا یہ دونوں تعبیریں دو مختلف زاویوں سے ایک ہی مطلب کی نشاندہی کرتی ہیں۔

جو کچھ کہا جا چکا ہے اسے ذہن میں رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ان دو تعبیروں کا یکے بعد دیگرے آنا ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ تم چوپایوں کی اون، روئی کے سے نرم اور دوسرے بالوں سے اپنے گھر کے لیے درکار بہت سا ساز و سامان تیار کر سکتے ہو اور اس طرح ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔

فخرالدین رازی اور بعض اور مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ "اثاث" سے مراد لباس ہے اور "متاع" سے زمین پر بچھانے والی چیز ہے لیکن انھوں نے اس کے لیے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔

"روح المعانی" میں آلوسی نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ "اثاث" گھر کے سامان کی طرف اشارہ ہے اور "متاع" مالِ تجارت کی طرف اشارہ ہے۔

البتہ ہم جو شروع میں کہہ چکے ہیں وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

"الی حین" کے مفہوم کے بارے میں بھی مختلف تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔ لیکن ظاہراً اس سے مراد یہ ہے کہ تم اس دُنیا اور زندگی کے اختتام تک ان چیزوں سے فائدہ اٹھاؤ گے یہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی اور اسباب جاودانی نہیں ہیں اور یہاں کی ہر چیز محدود ہے۔

سائے، گھر اور لباس:

اس کے بعد ایک اور نعمتِ الٰہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: خدا نے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں میں تمھارے لیے سائے بھی بنائے ہیں (واللہ جعل لکم مما خلق ظلٰلاً)۔ اور پہاڑوں میں تمھارے لیے پناہ گاہیں بنائی ہیں

---

[1] یہ لفظ "روئی" کے گالوں کی طرح کے نرم بالوں کے لیے آیا ہے۔ (ش۔ ن)

(وجعل لکم من الجبال اکنانًا)۔

"اکنان" "کِن" (بروزن "جن") کی جمع ہے یہ لفظ کسی ایسی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ڈھانپنے اور حفاظت کے لیے استعمال ہوتی ہو۔ پہاڑوں کے اندر موجود مخفی جگہوں، غاروں اور پناہ گاہوں کو اسی لیے "اکنان" کہا جاتا ہے۔

یہاں ہم واضح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ درختوں کے سائے ہوں یا پہاڑوں کے . . . سائے کا عمومی طور پر ایک اہم نعمت کے عنوان سے ذکر کیا جارہا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ انسان کو جس طرح زندگی میں روشنی کی چمک کی ضرورت ہے بہت سے اوقات میں سائے کی بھی احتیاج ہے اس لیے کہ روشنی اگر ایک ہی طرح چمکتی رہے تو زندگی ناممکن ہوجائے اور ہم جانتے ہیں ہم زمین کے باسیوں کے لیے سب سے بڑا سایہ کرۂ زمین کا سایہ ہے کہ جسے "رات" کہتے ہیں۔ یہ سایہ سطح زمین کے نصف حصے کو چھپا دیتا ہے۔ انسانی زندگی پر اس عظیم سایے کی تاثیر کسی سے مخفی نہیں ہے۔ اسی طرح دن کے اوقات میں مختلف چیزوں کے چھوٹے بڑے سایوں کے اثرات اور فوائد بھی ہمارے سامنے واضح ہیں۔

گھروں اور خیموں کی نعمت کا ذکر کرنے کے بعد سایوں اور پہاڑی پناہ گاہوں کی نعمت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ گویا یہ اس طرف اشارہ ہے کہ انسانوں کے تین ہی گروہ ہوتے ہیں۔ ایک بستیوں اور آبادیوں میں رہنے والا۔ دوسرا کہ جو سفر میں اور خیمے ان کے ساتھ ہوں اور تیسرا ان مسافروں کا گروہ کہ جن کے پاس خیمے نہ ہوں۔ خدا نے انھیں بھی محروم نہیں کیا بلکہ انھیں راہوں میں پناہ گاہیں مہیا کی ہیں۔

ہوسکتا ہے شہروں میں آرام کی زندگی گزارنے والوں پر غاروں اور کوہستانی پناہ گاہوں کی اہمیت بالکل واضح نہ ہو لیکن بیابانوں میں پھرنے والے بے امان مسافروں اور چرواہوں کو ان کی قدر معلوم ہے وہ تمام لوگ کہ جن کے پاس نہ ثابت گھر ہوں اور نہ سیار اور سورج کی تیز دھوپ یا سردیوں کی شدید لہر سے دوچار ہوں وہ جانتے ہیں کہ ایک کوہستانی پناہ گاہ کا وجود زندگی کیلیے کتنا اہم ہے کہ بعض اوقات بہت سے انسانوں اور حیوانوں کو یقینی موت سے بچالیتا ہے جبکہ عام طور پر ایسی پناہ گاہیں سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں سرد ہوتی ہیں۔

ان فطری اور مصنوعی سائبانوں کے ذکر کے بعد انسان کے لباس کا ذکر کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے خدا نے تمھیں لباس عطا کیے ہیں کہ جو گرمی سے تمھیں بچاتے ہیں (وجعل لکم سرابیل تقیکم الحر)۔

اور اسی طرح ایسے خاص دفاعی لباس بھی عطا کیے ہیں کہ جو جنگ کے موقع پر تمھاری حفاظت کرتے ہیں (وسرابیل تقیکم بأسکم)۔

"سرابیل" "سربال" (بروزن "مثقال") کی جمع ہے۔ مفردات میں راغب نے اس کا معنی پیراہن اور قمیص بیان کیا ہے چاہے وہ کسی چیز کی بھی بنی ہو۔ دیگر مفسرین نے بھی اس معنی کی تائید کی ہے البتہ بعض مفسرین نے اسے ہر طرح کے لباس کے معنی میں لیا ہے لیکن پہلا معنی ہی مشہور ہے۔

البتہ لباس کا صرف یہی فائدہ نہیں کہ وہ گرمی اور سردی میں انسان کی حفاظت کرتا ہے بلکہ یہ انسان کے وقار کا بھی باعث ہے اور جسم انسانی کو بہت سے خطرات سے بچائے رکھتا ہے۔ کیونکہ انسان برہنہ ہو تو شاید اس کے بدن کا کوئی نہ کوئی حصہ

ہر روز زخمی ہو جاتے مگر لیکن مندرجہ بالا آیت میں لباس کا جو فائدہ بیان کیا گیا ہے وہ اہمیت کے لحاظ سے ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ آیت میں صرف گرمی سے بچانے کا ذکر کیا گیا ہے شاید یہ اس لیے ہو کہ بہت سے مواقع پر عرب اختصار کے طور پر دو ضدوں میں سے ایک کا ذکر کرتے ہیں اور دوسری پہلی کے قرینے سے واضح ہو جاتی ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اس بناء پر ہو کہ قرآن جن علاقوں میں نازل ہوا تھا وہاں گرمی سے بچانے کا مسئلہ زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ گرمی لگنے اور سورج کی تیز حدت کے خطرات زیادہ سریع اور زیادہ خطرناک ہوتے ہیں دوسرے لفظوں میں شدید گرمی اور سورج کی شدید تپش کے سامنے انسان کی قوتِ برداشت سردی کے مقابلے میں قوتِ برداشت کی نسبت بہت کم ہوتی ہے کیونکہ سردی میں انسان کی اندرونی حرارت بہت حد تک اس کی حفاظت کر سکتی ہے جبکہ گرمی کے مقابلے میں اس کی قوتِ مدافعت بہت کم ہوتی ہے۔

آیت کے آخر میں یاددہانی اور تنبیہ کے طور پر فرمایا گیا ہے: اس طرح سے اللہ تم سب پر اپنی نعمت کو پورا کرتا ہے کہ شاید تم اس کے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دو (کذلک یتم نعمته علیکم لعلکم تسلمون)۔

یہ ایک فطری امر ہے کہ انسان جب دیکھتا ہے کہ بہت سی نعمتیں اس کے وجود کو گھیرے ہوئے ہیں تو بے اختیار اس کا خیال ان نعمتوں کو بخشنے والے کی طرف لوٹ جاتا ہے اور اگر اس طرح اس کے اندر قدردانی اور شکر گزاری کا کچھ بھی احساس پیدا ہو جائے تو وہ معطیِ نعمت کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

لفظ "نعمت" کو جو مذکورہ بالا آیت میں آیا ہے بعض مفسرین نے اسے نعمتِ خلقت، نعمتِ کمال، نعمتِ عقل، نعمتِ توحید شناسی یا نعمتِ وجودِ پیغمبر اسلام میں محدود سمجھا ہے لیکن واضح ہے کہ یہاں یہ لفظ ایک وسیع معنی کا حامل ہے کہ جس میں یہ تمام مذکورہ نعمتیں اور ان کے علاوہ دیگر نعمتیں بھی شامل ہیں۔ محدودیت والی یہ تفاسیر دراصل نعمت کے واضح مصادیق کی طرف اشارہ سمجھی جانا چاہییں۔

ان ظاہر و مخفی نعمتوں کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے: ان تمام امور کے باوجود اگر وہ روگردانی کریں اور دعوتِ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کریں تو تم پریشان نہ ہونا کیونکہ تمہاری ذمہ داری تو بس یہ ہے کہ واضح طور پر ابلاغ کر دو (فان تولوا فانما علیك البلاغ المبین)۔

کہنے والے کی بات کیسی ہی استدلالی، مؤثر اور جاذب کیوں نہ ہو جب تک سننے والا مائل نہ ہو، اثر نہیں کر سکتی۔ دوسرے لفظوں میں اہلیتِ مقام بھی شرط ہے اور ہر بات اس کے اہل پر ہی اثرانداز ہوتی ہے لہٰذا اگر کوردل، ہٹ دھرم تیری دعوت تسلیم نہیں کرتے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے اہم بات یہ ہے کہ تو بلاغِ مبین میں کسر نہ چھوڑے اور سب کے سامنے اپنی دعوت کھلے بندوں پیش کرے۔

یہ جملہ درحقیقت رسولِ اکرمؐ کی دلجوئی اور تسلیِ خاطر کے لیے ہے۔

بات پوری کرنے کے لیے مزید فرمایا گیا ہے: وہ نعمتِ الٰہی کو پہچانتے ہیں اس کے پہلوؤں اور وسعت سے آشنا

ہیں اور اس کی گہرائی کو جان چکے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کا انکار کرتے ہیں (یعرفون نعمت اللہ ثم ینکرونہا)۔
لہٰذا ان کے کفر کا سبب ناآگاہی اور بے علمی میں تلاش نہیں کیا جانا چاہیے کیونکہ وہ کافی حد تک آگاہ ہو چکے ہیں اس کفر کا باعث ان کی کوئی اور پست صفات ہیں کہ جو ان کے ایمان میں سدِ راہ بنی ہوئی ہیں اور وہ ہیں اندھا تعصب، ہٹ دھرمی، حق دشمنی، مادی زندگی کے تھوڑے سے مفادات کو ہر چیز پر مقدم کرنا، طرح طرح کی خواہشات میں اسیری اور تکبر۔
شاید اسی بناء پر آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: اور ان میں سے اکثر کافر ہیں (و اکثرھم الکافرون)۔
لفظ "اکثرھم" نے بہت سے مفسرین کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور انھوں نے سوچا ہے کہ یہاں "اکثر" کا لفظ کیوں آیا ہے ہر مفسر نے اس کی کوئی نہ کوئی تفسیر بیان کی ہے لیکن ان میں سے جو زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے وہ وہی ہے جو سطور بالا میں بیان کی گئی ہے یعنی ان کفار کی اکثریت ہٹ دھرم، معاند اور متعصب ہے اور ان میں سے جو غلط فہمی کا شکار ہیں، وہ اقلیت میں ہیں۔
وہ کفر جو تکبر کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اس کا ذکر قرآن حکیم کی دیگر آیات میں بھی دکھائی دیتا ہے مثلاً شیطان کے بارے میں ہے:۔

ابیٰ واستکبر و کان من الکافرین

ابلیس نے حکم ماننے سے انکار کر دیا اور تکبر اختیار کیا اور وہ کافروں میں سے تھا (بقرہ ۳۴)

کچھ مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "اکثر" سے مراد وہ افراد ہیں کہ جن پر اتمام حجت ہو چکا تھا جبکہ جن پر ابھی تک اتمام حجت نہیں ہوا وہ اقلیت میں تھے اس معنی کو بھی پہلے معنی کے ذیل میں دیکھا جا سکتا ہے۔

چند اہم نکات:

"نعمت اللہ" سے مراد: اس سلسلے میں مفسرین کی مختلف تفسیریں ہیں کہ آیت میں "نعمت اللہ" سے کیا مراد ہے ان میں سے زیادہ تر کوئی ایک مصداق بیان کرتی ہیں حالانکہ "نعمت اللہ" کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ تمام مادی و معنوی نعمتیں اس میں شامل ہیں یہاں تک کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی بھی اس مفہوم میں شامل ہے روایات اہل بیتؑ میں بتایا گیا ہے کہ اس سے مراد آئمہ اور معصوم رہبروں کے وجود کی نعمت ہے۔
ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

نحن واللہ نعمۃ اللہ التی انعم بھا علی عبادہ و بنا فاز من فاز

قسم بخدا کہ جس نعمت کی وجہ سے اللہ نے بندوں پر اپنا لطف و کرم کیا ہے وہ ہم ہی ہیں اور ہمارے سبب سے سعادت مند سعید و کامیاب ہیں۔[1]

---

[1] نور الثقلین جلد ۳ ص ۷۰۔

یہ بات واضح ہے کہ سچے رہبروں کی رہبری سے استفادہ کیے بغیر سعادت و کامیابی ممکن نہیں اور ان ہادیانِ حق کا وجود اللہ کی سب سے واضح نعمت ہے اور یہاں اس کا ذکر ایک آشکار مصداق کے طور پر کیا گیا ہے۔

۲۔ **حق و باطل میں کش مکش :** بعض مفسرین نے زیر بحث آیات میں "یعرفون نعمت اللہ ثم ینکرونھا" میں لفظ "ثُمَّ" پر غور و خوض کیا ہے۔ یہ لفظ عموماً، عام فاصلے کے ساتھ آنے والے عطف کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ نشاندہی کرتا ہے کہ نعماتِ الٰہی کی اس آگہی و علم اور پھر ان کے انکار کے درمیان فاصلہ تھا۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ تعبیر یہ نکتہ بیان کر رہی ہے کہ مناسب تو یہ تھا کہ وہ نعمتِ الٰہی کو پہچان لینے کے ساتھ ہی صمیم قلب سے اعتراف کرتے اور اس کی طرف آتے لیکن انھوں نے انکار کا راستہ اختیار کر لیا قرآن نے ان کے اس عمل کو دور کی بات شمار کیا ہے، اور اسے "ثُمَّ" سے تعبیر کیا ہے۔

لیکن ہم یہ احتمال پیش کرتے ہیں کہ یہاں "ثُمَّ" ایک زیادہ ظریف اور عمدہ نکتے کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ جس وقت دعوتِ حق اپنے منطقی اصول کی بناء پر انسان کی روح پر پَر تو ڈالے تو وہ ان منفی عوامل کے خلاف برسرپیکار ہو جاتی ہے کہ جو کبھی کبھی اس میں موجود ہوتے ہیں یہ پیکار ایک عرصے تک جاری رہتی ہے اور یہ عرصہ منفی عوامل کی قوت یا ضعف کے تناسب سے ہوتا ہے اگر منفی عوامل زیادہ قوی ہوں تو کچھ عرصے بعد انھیں غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ ان کے لیے "ثُمَّ" کی تعبیر بالکل مناسب ہے۔

سورۂ انبیاء کی آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داستان میں بتایا گیا ہے کہ جب آپ نے بتوں کو توڑنے کے بعد بُت پرستوں کے سامنے اپنی قوی منطق پیش کی تو چند لمحے تو وہ سوچ میں پڑ گئے اور اپنے آپ کو ملامت کرنے لگے قریب تھا کہ وہ حق کی طرف جھکتے اور بیداری کی یہ لہر ان کے پورے وجود کو روشن کر دیتی لیکن منفی عوامل یعنی تعصب تکبر اور ہٹ دھرمی دعوتِ حق کے آگے آ گئی...... یہ لمحات جاتے رہے اور وہ پھر سے انکار کرنے لگ پڑے۔ یہاں بھی لفظ "ثُمَّ" استعمال ہوا ہے۔

فرجعوا الی انفسھم فقالوا انکم انتم الظالمون ۝ ثم نکسوا علی رءوسھم لقد علمت ما ھؤلاء ینطقون ۝

پس وہ اپنی ضمیر کی طرف متوجہ ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگے تم تو خود ظالم ہو پھر ان کی گردنیں اسی گمراہی کی طرف مڑ گئیں اور وہ کہنے لگے کہ تم تو جانتے ہی ہو کہ یہ بُت بولا نہیں کرتے (انبیاء ۶۴، ۶۵)

ضمناً کافروں کے بارے میں جو کچھ ہم نے کہا ہے اس بیان سے اس کی "ثُمَّ" کے ساتھ ہم آہنگی زیادہ واضح ہو گئی ہے۔

۸۴۔ وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ○

۸۵۔ وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ○

۸۶۔ وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ أَشْرَكُوا شُرَكَاءَهُمْ قَالُوا رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُو مِنْ دُونِكَ ۖ فَأَلْقَوْا إِلَيْهِمُ الْقَوْلَ إِنَّكُمْ لَكَاذِبُونَ ○

۸۷۔ وَأَلْقَوْا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلَمَ ۖ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ○

۸۸۔ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ ○

۸۹۔ وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِنْ أَنْفُسِهِمْ ۖ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ ۚ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ○

ترجمہ:

۸۴۔ اس دن کے بارے میں سوچو کہ جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ کو اٹھا کھڑا کریں گے پھر کافروں کو (بات کرنے کی) اجازت نہیں دی جائے گی (کیونکہ ان کے ہاتھ، پاؤں، کان اور آنکھ یہاں تک کہ ان کے بدن کی جلد بھی گواہی دے گی۔) اور نہ ان کا عذر سنا جائے گا۔

۸۵۔ اور جب ظالم عذاب کو دیکھیں گے تو پھر انھیں تخفیف ملے گی نہ مہلت۔

۸۴۔ اور جب مشرکین اپنے ان معبودوں کو دیکھیں گے کہ جنھیں وہ خدا کا شریک قرار دیتے تھے تو کہیں گے: پروردگارا! یہ ہمارے وہ شریک ہیں جنھیں ہم تیری بجائے پکارتے تھے اس وقت ان کے معبود ان سے کہیں گے: تم جھوٹ بولتے ہو۔

۸۷۔ اور اس دن سب بارگاہِ الٰہی میں جھک جائیں گے اور ان کا وہ سارا جھوٹ رفوچکر ہو جائے گا۔

۸۸۔ اور جن لوگوں نے کفر کا راستہ اپنایا اور (لوگوں کو بھی) راہِ خدا سے روکا، انھیں ہم ان کے فساد کے باعث عذاب پر عذاب دیں گے۔

۸۹۔ اس دن کے بارے میں سوچو کہ جب ہر اُمت میں خود اسی میں سے ایک گواہ ہم اٹھا کھڑا کریں گے اور تجھے ان پر گواہ بنائیں گے اور یہ (آسمانی) کتاب ہم نے تجھ پر اتاری ہے کہ جو ہر چیز کو واضح کرتی ہے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت، رحمت اور بشارت ہے۔

تفسیر:

جب بدکاروں کو کوئی راہ سجھائی نہ دے گی:

گزشتہ آیات میں اللہ کی گوناگوں نعمتوں پر منکرینِ حق کے غلط ردِ عمل کا ذکر تھا ان آیات میں ان منکرینِ حق کی دوسرے جہان میں بعض دردناک سزاؤں کا تذکرہ ہے کہ جہاں کا بُرا اور منحوس انجام ہے ان سزاؤں کا تذکرہ اس لیے ہے تاکہ وہ جلد اپنے طرزِ عمل پر تجدیدِ نظر کریں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اس دن کا سوچو جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ پیش کریں گے (ویوم نبعث من کل امۃ شھیدا)۔[1]

یہ عبارت پڑھتے ہی فوراً سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ کے لامتناہی علم کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے گواہ کی ضرورت رہ جاتی ہے۔

ایک نکتے کی طرف توجہ کی جائے تو اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ ایسے امور عام طور پر نفسیاتی پہلو سے ہوتے ہیں یعنی جتنا انسان کو احساس ہوگا کہ اس کی طرف دیکھنے والے اور گواہ زیادہ ہیں اتنا ہی اپنے کام کو بہتر حساب کتاب سے انجام دے گا یا کم از کم زیادہ افراد کے سامنے رسوائی سے بچا پریشان ہوگا۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اس عدالت میں کفار کو بات کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ (ثم لا یؤذن للذین کفروا)۔

---

[1] "یوم" یہاں ظرف ہے۔ یہ ایک فعل مقدر سے متعلق ہے جس کی تقدیر یوں تھی: "واذکروا" یا "ولیذکروا"

کیا ممکن ہے کہ اللہ مجرم کو دفاع کی اجازت نہ دے؟
جی ہاں! وہاں زبان سے بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہاتھ، پاؤں، کان، آنکھ بلکہ وہ زمین بھی جس پر انسان نے نیکی یا بدی کی ہوگی گواہی دے گی اس لیے زبان کی باری نہیں آئے گی۔

اس حقیقت کا ذکر قرآن حکیم کی دوسری آیات میں بھی ہے۔ مثلاً سورہ یٰس ۶۵ اور مرسلات ۳۶۔
نہ صرف انھیں بات کرنے کی اجازت نہیں ہوگی بلکہ اس وقت وہ تلافی، اصلاح اور تقاضائے عفو بھی نہ کرسکیں گے (ولا هم يستعتبون)[1] کیونکہ وہ ردِعمل کا موقع ہوگا نہ کہ عمل، تلافی اور اصلاح کا۔ جیسے کوئی پھل شاخ سے گر جائے تو اس کی نشوونما کا زمانہ ختم ہوجاتا ہے۔

اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: یہ ستم پیشہ ظالم جب حساب کتاب کے مرحلے سے گذر کر عذابِ الٰہی کا سامنا کریں گے تو کبھی تخفیف کا اور کبھی مہلت کا تقاضا کریں گے لیکن جب ظالم عذاب کو دیکھیں گے تو ان کے عذاب میں کمی ہوگی نہ انھیں کوئی مہلت دی جائے گی۔ (واذا رأ الذين ظلموا العذاب فلا يخفف عنهم ولا هم ينظرون)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ان دو آیتوں میں مجرموں کے چار مرحلوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس دنیا میں بھی یہ مرحلے ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں:

پہلا مرحلہ: یہ کہ مجرم کوشش کرے گا کہ مکر و حیلے سے اپنے آپ کو بچالے۔
دوسرا مرحلہ: جب پہلے مرحلے میں بات نہ بنے تو وہ دوسرے مرحلے میں کوشش کرے گا کہ مدِمقابل کو مہر و محبت کی طرف مائل کرے اس کی سرزنش کو برداشت کرے اور اس کی رضا حاصل کرے۔
تیسرا مرحلہ: دوسرا مرحلہ بھی کامیاب نہ ہوا تو تیسرے مرحلے میں سزا میں کمی کا تقاضا کرے گا اور کہے گا کہ عذاب کچھ کم۔
چوتھا مرحلہ: اگر اس کا جرم زیادہ ہونے کی وجہ سے تیسرے مرحلے پر بھی بات نہ بنی تو تقاضا کرے گا کہ مجھے کچھ مہلت دے دے اور سزا سے نجات کی یہ آخری کوشش ہوگی۔

لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان ظالموں کے اعمال اتنے قبیح اور بُرے ہیں اور ان کے گناہوں کا بوجھ اتنا زیادہ ہوگا کہ نہ انھیں دفاع کی اجازت ملے گی، نہ وہ رضا حاصل کرسکیں گے نہ انھیں تخفیف ملے گی اور نہ مہلت۔

اگلی آیت میں مشرکین کے بُرے انجام کے بارے میں ایسی ہی گفتگو کی گئی ہے۔ ان کا یہ انجام بتوں کی پرستش کے باعث ہوگا ارشاد ہوتا ہے کہ میدانِ قیامت میں خود ساختہ معبود اور انسان کہ جن کی بتوں کی طرح پرستش کی جاتی تھی، پوجا کرنے والوں کے ساتھ ہوں گے جس وقت یہ عبادت کرنے والے اپنے معبودوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے پروردگارا! یہ ہمارے

---

[1] "یستعتبون" "استعتاب" کے مادہ سے ہے کہ جو عتاب سے لیا گیا ہے کہ جس کا معنی ہے دوسرے سے گفتگو میں سختی کا اظہار کرنا۔ "استعتاب" کا مفہوم ہے کہ گنہگار شخص صاحبِ حق سے عتاب طلب کرے یعنی اپنے تئیں اس کی سرزنش کے سامنے پیش کرے تاکہ صاحبِ حق کا غصہ ختم ہوجائے اور وہ راضی ہوجائے یہی وجہ ہے کہ بعض "استعتاب" کا معنی "استرضاء" (کسی کی رضا طلب کرنا) لیتے ہیں حالانکہ اس کا مفہوم یہ نہیں بلکہ اس کے مفہوم کا لازمہ ہے۔

وہی شریک ہیں جنھیں ہم تیری بجائے پکارتے تھے۔ (واذا رأ الذین اشرکوا شرکاءهم قالوا ربنا هؤلاء شرکاؤنا الذین کنا ندعوا من دونک)۔
ان معبودوں نے بھی اس کام میں ہمیں وسوسے میں ڈالا اور درحقیقت ہمارے شریک جرم ہیں لہٰذا ہمارے عذاب کا کچھ حصہ ان کے لیے قرار دے۔ اس وقت بحکم خدا یہ "بت بول اٹھیں گے اور اپنی عبادت کرنے والوں سے کہیں گے یقیناً تم جھوٹے ہو (فالقوا الیهم القول انکم لکاذبون)۔ نہ ہم خدا کے شریک تھے اور نہ ہم نے تمھیں وسوسے میں ڈالا اور نہ تمھارے عذاب کا کوئی حصہ ہمیں پہنچے گا۔

چند قابل توجہ نکات:

۱۔ "شرکاء اللہ" کی بجائے "شرکاءهم": "شرکاء اللہ" (اللہ کے شریک) کی بجائے "شرکاءهم" (بت پرستوں کے شریک) ______ اس بناء پر ہے کہ وہ ہرگز پروردگار کے شریک نہ تھے بلکہ خیالی اور جھوٹے شریک تھے۔ کہ جو بت پرستوں نے اپنے لیے بنا رکھے تھے اور کیا ہی بہتر ہے کہ انھیں انھی کی طرف نسبت دی جائے نہ کہ خدا کی طرف۔
علاوہ ازیں جیسا کہ ہم نے پہلے بھی دیکھا ہے کہ بت پرست اپنے کچھ چوپائے اور زرعی پیداوار بتوں کے نام کر دیتے تھے اور اس طرح انھیں اپنا شریک بناتے تھے۔

۲۔ بے جان بت بھی پیش ہوں گے۔ زیر بحث آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ روز قیامت بت بھی ظاہر ہوں گے۔ فرعون اور نمرود کی طرح کے انسانی بت ہی وہاں پیش نہیں ہوں گے بلکہ بے جان بت بھی حاضر ہوں گے سورۂ انبیاء کی آیہ ۹۸ میں مشرکین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جهنم

تم اور اللہ کو چھوڑ کر جن کی تم عبادت کرتے ہیں جہنم کا ایندھن ہیں۔

۳۔ بت مشرکین کی تکذیب کریں گے: زیر بحث آیت میں ہے کہ اس دن مشرکین کہیں گے۔

ہم ان معبودوں کی پرستش کرتے تھے۔

ان کی یہ بات غلط نہیں کہ بت ان کی تکذیب کریں لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ تکذیب اس بناء پر ہو کہ جعلی معبود اس بات کی تکذیب کریں کہ وہ پرستش کے لائق ہیں یا شاید وہ اس بناء پر تکذیب کریں گے کہ ان کی عبادت کرنے والے یہ بھی کہیں گے کہ:

خدایا! یہ معبود ہمیں وسوسہ ڈالنے میں شریک تھے۔

لہٰذا وہ جواب دیں گے:

تم جھوٹ بولتے ہو ہم وسوسہ نہیں ڈال سکتے تھے۔

۴۔ "فالقوا الیهم القول" کا مفہوم: اس کا معنی ہے "قول اس کی طرف القاء کرتے تھے" یہ نہیں

کہا: "قالوا لهم" (انھیں کہتے تھے) یہ شاید اس بناء پر ہو کہ بُت خود سے بات کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور اگر بات کریں گے تو وہ پروردگار کی طرف سے القاء ہو گا یعنی خدا انھیں القاء قول کرے گا اور وہ اسے اپنی پوجا کرنے والوں کی طرف القاء کریں گے۔

اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: یہ بات اور یہ جواب سننے کے بعد "سب بارگاہِ الٰہی میں جھک جائیں گے" یہ نادان عبادت کرنے والے جب حق کا چہرہ دیکھ لیں گے تو ان کے غرور، نخوت اور اندھے تعصبات کا خاتمہ ہو جائے گا اور وہ اس کی بارگاہ میں سر جھکا دیں گے (والقوا الی اللہ یومئذٍ السلم)۔[1]

اس موقع پر جبکہ ہر چیز آفتاب کی مانند روشن ہو گی "ان کا سارا جھوٹ رفوچکر ہو جائے گا" (وضل عنهم ما کانوا یفترون)۔

خدا کی طرف شریک کی جھوٹی نسبت بھی برباد ہو جائے گی اور یہ خیال بھی محو ہو جائے گا کہ بُت بارگاہِ الٰہی میں شفیع ہیں کیونکہ سب اچھی طرح دیکھ لیں گے کہ نہ صرف بُت کچھ نہیں کر سکتے بلکہ خود بھی جہنم کا ایندھن بن رہے ہیں۔

یہاں تک ان گمراہ مشرکین کی حالت بیان کی گئی ہے کہ جو خود شرک و انحراف میں غوطہ زن تھے مگر دوسروں کو اس راہ کی طرف دعوت نہ دیتے تھے اب ان لوگوں کی حالت بیان کی جا رہی ہے کہ جو خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کے درپے ہیں، ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ جو کافر ہو گئے ہیں اور لوگوں کو راہِ خدا سے روکتے ہیں ان کے کفر کے عذاب پر ہم دوسروں کو گمراہ کرنے کے عذاب کا اضافہ کریں گے کیونکہ وہ فساد برپا کرتے تھے (الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ زدناهم عذابا فوق العذاب بما کانوا یفسدون)۔

وہ اپنی ذمہ داری کا بوجھ بھی اپنے کندھے پر اٹھاتے ہیں اور دوسروں کے شریکِ جرم بھی ہوتے ہیں یہ لوگ زمین پر فساد اور برائی کا سبب بنتے ہیں، خلقِ خدا کی گمراہی کا باعث ہوتے ہیں اور راہِ حق پر چلنے والوں کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں۔

ہم نے کئی مرتبہ بیان کیا ہے کہ اسلام کی اجتماعی منطق کے لحاظ سے جو شخص بھی کوئی اچھی یا بُری روایت قائم کرتا ہے اس روایت پر عمل کرنے والوں کے عمل میں شریک ہے۔ ایک مشہور حدیث میں ہے:

> جو شخص کسی اچھی سُنت کی بنیاد رکھتا ہے اس پر عمل کرنے والوں کا اجر اُسے ملے گا جب کہ عمل کرنے والوں کی جزا بھی کم نہ ہو گی۔ اسی طرح جو کوئی بُری سنت کی بنیاد رکھتا ہے، اس پر عمل کرنے والے سب لوگوں کے گناہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھے جاتے ہیں جبکہ عمل کرنے والوں کی

---

[1] المیزان کے محترم مؤلف اور بعض دیگر مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ اظہارِ تسلیم یہاں صرف عبادت کرنے والوں کی طرف سے ہو گا نہ کہ بتوں کی طرف سے۔ ان مفسرین نے آیت کے آخری جملے کو شہادت کے طور پر پیش کیا ہے۔

گناہ میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

بہر حال قرآن اور احادیث کے لرزا دینے والے یہ الفاظ اللہ اور مخلوقِ خدا کے بارے میں رہبروں اور راہنماؤں کی ذمہ داری کو واضح کرتے ہیں۔

قبل کی چند آیات میں ہر امت میں گواہ ہونے کا ذکر آیا تھا۔ اب پھر وہی گفتگو کچھ مزید وضاحت کے ساتھ آئی ہے ارشاد ہوتا ہے: اس وقت کا سوچو جب ہم ہر امت کے لیے اسی میں سے ایک گواہ اٹھا کھڑا کریں گے (و یوم نبعث فی کل امۃ شھیداً علیھم من انفسھم)۔

علمِ خدا ہر چیز پر محیط ہے مگر پھر ہر امت کے لیے خود اسی میں سے گواہ کا ہونا اس بات پر مزید تاکید کرتا ہے کہ انسانوں کے اعمال کی مسلسل نگرانی کی جا رہی ہے۔ یہ ایک تنبیہ بھی ہے۔

اس عام حکم میں اگرچہ مسلمان بھی شامل ہیں، رسولِ اسلام بھی، لیکن اس بات پر مزید تاکید کے طور پر بالخصوص فرمایا گیا ہے: اور تجھے ہم ان مسلمانوں پر شاہد قرار دیں گے (وجئنابک شھیداً علیٰ ھٰؤلاء)۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس کی بناء پر "ھٰؤلاء" سے مراد وہ مسلمان ہیں کہ جو زمانہ پیغمبر میں تھے اور رسول اللہ ان کے اعمال پر ناظر و شاہد تھے لہٰذا فطرتاً رسول اللہ کے بعد امت میں کوئی ایسا شخص ہونا چاہیے کہ جو بعد والوں پر شاہد ہو اور شاہد کسی ایسے شخص کو ہونا چاہیے جو خود ہر قسم کے گناہ اور خطا سے پاک ہو تاکہ وہ شہادت کا حق اچھی طرح سے ادا کرسکے۔ اسی بناء پر بعض شیعہ و سنی مفسرین نے آیت کو ہر زمانے میں حجت عادل اور شاہد عادل کے وجود پر دلیل قرار دیا ہے البتہ شیعہ کہ جو ہر زمانے میں امامِ معصوم کے وجود پر اعتقاد رکھتے ہیں، ان کے لیے اس کی تفسیر واضح ہے لیکن اہلِ سنت علماء کے لیے اس کی توجیہ آسان نہیں ہے۔

شاید اسی مشکل کی بناء پر فخرالدین رازی اپنی تفسیر میں ایسی توجیہ میں اُلجھے ہیں کہ جو اشکال سے خالی نہیں ہے وہ کہتے ہیں:

> اس آیت سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوتا جب لوگوں پر گواہ نہ ہو اور گواہ کو جائز الخطا نہیں ہونا چاہیے ورنہ اس کے لیے بھی ایک گواہ کی ضرورت ہوگی اور اس معاملے کا سلسلہ لامتناہی ہو جائے گا ہر زمانے میں ایسے افراد کو ہونا چاہیے کہ جن کی گفتار اور قول حجت ہو اس معاملے کا اس کے سوا کوئی حل نہیں کہ ہم کہیں کہ اجماعِ امت حجت ہے (یعنی ہر زمانے کے تمام لوگ باہم مل کر کبھی راہِ خطا اختیار نہیں کریں گے)[1]

جناب فخرالدین رازی اپنے متعصبانہ عقیدے سے تھوڑا سا باہر نکل آتے تو یقیناً ایسی تعصب آمیز گفتگو میں مبتلا نہ ہوتے

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۲۰ ص ۹۰

کیونکہ قرآن کہتا ہے:

ہر اُمت کے لیے خود اسی کی نوع میں سے ہم نے ایک گواہ بنایا ہے۔

قرآن یہ نہیں کہتا کہ اجماعِ اُمت ہر فردِ امت کے لیے حُجت اور گواہ ہے۔

البتہ جیسا کہ ہم نے سورۂ نساء کی آیت ۴۱ کے ذیل میں — تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ "ھٰؤلاء" کی تفسیر میں دو اور احتمال بھی ذکر کیے گئے ہیں۔

پہلا یہ کہ "ھٰؤلاء" گزشتہ امتوں کے گواہوں یعنی انبیاء و اوصیاء کی طرف اشارہ ہے لہٰذا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس اُمت پر بھی گواہ ہیں اور گزشتہ انبیاء پر بھی۔

دوسرا یہ کہ شاہد اور گواہ سے مراد عملی گواہ ہے یعنی وہ شخص کہ جس کا وجود نمونہ، ماڈل اور حق و باطل کی پہچان کے لیے میزان ہے۔

مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۲ ص ۴۵۲ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

شہید اور گواہ معین کرنا اس بات کی دلیل ہے انسان کے لیے پہلے سے ایک ایسا مکمل اور جامع پروگرام موجود ہے کہ جس سے سب پر حجت تمام ہو جاتی ہے تبھی تو نگرانی کا صحیح مفہوم پیدا ہو سکتا ہے لہٰذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے اور ہم نے یہ آسمانی کتاب (قرآن مجید) تجھ پر نازل کی ہے کہ جس میں ہر چیز کا واضح بیان موجود ہے (و نزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شیء)۔

یہ ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی اور ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے بشارت بھی ہے (وھدی و رحمۃ و بشریٰ للمسلمین)۔

چند اہم نکات:

۱۔ قرآن سب کچھ واضح کرتا ہے: مندرجہ بالا آیات میں سب سے اہم بات یہ آئی ہے کہ قرآن "تبیانا لکل شیء" (ہر چیز کا واضح بیان) ہے۔ "تبیان" ("ت" پر زبر یا زیر کے ساتھ) مصدری معنی رکھتا ہے یعنی "بیان کرنا"۔[1]

اس تعبیر سے "کل شیء" کے مفہوم کی وسعت کی طرف توجہ کی جائے تو یہ واضح استدلال کیا جا سکتا ہے کہ قرآن میں ہر چیز کا بیان ہے لیکن اس نکتے کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن ایک تربیتی اور انسان ساز کتاب ہے کہ جو ہر پہلو سے معاشرے کے کمال و ترقی کے لیے نازل ہوئی ہے واضح ہو جاتا ہے کہ تمام چیزوں سے مراد وہ تمام امور ہیں جو اس سفر کے لیے ضروری ہیں نہ یہ کہ قرآن ایک بہت بڑا دائرۃ المعارف ہے کہ جس میں ریاضی، جغرافیہ، کیمیا، فزکس، فزیالوجی وغیرہ کی تفصیلات

---

[1] آلوسی نے روح المعانی میں بعض عربی ادیبوں سے نقل کیا ہے کہ وہ تمام مصادر جو "تفعال" کے وزن میں آتے ہیں "ت" کی زبر کے ساتھ ہیں سوائے "تبیان" اور "تلقاء" کے۔ مثلاً اس لفظ کو بعض نے مصدر اور بعض نے اسم مصدر کہا ہے۔

بیان کی گئی ہیں۔ اگرچہ قرآن نے تمام علوم کے حصول کی ایک کلی دعوت دی ہے کہ جس میں مذکورہ اور غیر مذکورہ سب علوم جمع ہیں۔ علاوہ کبھی کبھی اس نے توحیدی اور تربیتی مباحث کی مناسبت سے علوم کے حساس حصوں سے پردہ اٹھایا ہے لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود جس چیز کے لیے قرآن نازل ہوا ہے اور جو قرآن کا اصلی اور آخری ہدف ہے وہ انسان سازی ہی ہے اور اس سلسلے میں اس نے کسی چیز کو فروگذاشت نہیں کیا۔

بعض اوقات قرآن ان سب مسائل کی جزئیات تک کا ذکر کرتا ہے اور مسئلے کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی بیان کر دیتا ہے (مثلاً تجارتی معاہدے اور قرض کے لیے اسناد لکھنے کے احکام کہ جو قرآن کی طویل ترین آیت میں بیان کیے گئے ہیں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۲ میں اس سلسلے میں ۱۸ احکام بیان ہوئے ہیں)[1]

کبھی قرآن انسانی زندگی کے مسائل کو کلی صورت میں بیان کرتا ہے مثلاً یہ آیت کہ جس کی تفسیر بعد میں آرہی ہے۔

ان اللہ یأمر بالعدل و الاحسان و ایتاء ذی القربی و ینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی

یقیناً اللہ عدل واحسان کا حکم دیتا ہے اور وہ فرمان دیتا ہے کہ قریبیوں کو عطا کرو۔ نیز وہ برائی نافرمانی اور ظلم سے منع کرتا ہے۔

اسی طرح بعض امور کو بڑے وسیع مفہوم کے اعتبار سے بیان کیا گیا ہے۔

ایفائے عہد کے بارے میں ہے:

ان العھد کان مسئولاً

یقیناً عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ (بنی اسرائیل ـــ ۳۴)

اسی طرح اس آیت میں بھی مفہوم بہت وسیع ہے۔

اوفوا بالعقود (اپنے اقراروں کو پورا کرو) (مائدہ ـــ ۱)

حق جہاد کی ادائیگی کے لازمی ہونے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وجاھدوا فی اللہ حق جھادہ

اور راہ خدا میں ایسا جہاد کرو کہ اس کا حق جہاد ادا ہو جائے (حج ـــ ۷۸)

اسی طرح قیام عدل کا وسیع مفہوم کے اعتبار سے بیان فرمایا گیا ہے۔

لیقوم الناس بالقسط (تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں)۔ (حدید ـــ ۲۵)

تمام امور میں نظم کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔

والسماء رفعھا و وضع المیزان الا تطغوا فی المیزان و اقیموا الوزن

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۲ ص ۲۶۱ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

بالقسط ولا تخسروا المیزان[1] (رحمن ـــــ ۹)

زمین میں ہر قسم سے فتنہ وفساد اور برائی سے اجتناب کا حکم اس وسیع مفہوم میں پیش کرتا ہے۔

ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا

جب زمین میں اصلاح ہو چکی تو اس میں فتنہ وفساد برپا نہ کرو (اعراف ـــــ ۸۵)

اسی طرح بہت سی آیات میں تدبر، تفکر اور تعقل کی دعوت دی گئی ہے اور یہ بہت سی قرآنی آیات میں موجود ہے اس طرح کے ہمہ گیر انسانی پروگرام کہ جو ہر سمت کی راہیں کھولتے ہیں اس امر کی روشن دلیل ہیں کہ قرآن میں تمام چیزوں کا بیان ہے یہاں تک کہ ان کلی احکام کی فروعات بھی معین کیے بغیر نہیں چھوڑی گئیں۔ نیز جس مرکز سے احکام اور پروگرام جاری اور بیان ہونا ہیں اس کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔

وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا

جس چیز کا تمھیں رسول حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔

(حشر ـــــ ۷)

قرآن کے بے کنار سمندر میں انسان جس قدر شناوری کرتا ہے اور اس کی گہرائی سے سعادت بخش پروگراموں کے موتی نکال کر لاتا ہے اس آسمانی کتاب کی عظمت، وسعت اور جامعیت زیادہ آشکار ہوتی چلی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو مسلمان حیات انسانی کی راہنمائی کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ پھیلاتے ہیں انھوں نے یقیناً قرآن کو نہیں پہچانا اور جو کچھ خود ان کے پاس ہے اس کی آرزو دوسروں سے کرتے ہیں۔

یہ آیت ہر پہلو سے اسلامی تعلیمات کی اصالت واستقلال کو واضح کرنے کے علاوہ مسلمانوں پر ایک بھاری ذمہ داری بھی عائد کرتی ہے کہ انھیں جس چیز کی احتیاج ہو اس قرآن سے حاصل کریں۔

اس آیت اور ایسی دیگر آیات کے حوالے سے اسلامی روایات میں جامعیتِ قرآن پر بہت زور دیا گیا ہے ان میں سے ایک حدیث امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے، آپ فرماتے ہیں۔

ان اللہ تبارک وتعالی انزل فی القراٰن تبیان کل شیء حتی واللہ ما ترک شیئا تحتاج الیہ العباد، حتی لا یستطیع عبد یقول لو کان ھذا، انزل فی القراٰن، الا وقد انزلہ اللہ فیہ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن میں ہر چیز بیان کی ہے۔ خدا کی قسم! جو چیز لوگوں کی ضرورت ہے اسے ترک نہیں کیا تاکہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ کاش فلاں حکم قرآن میں نازل ہوتا، لہٰذا اسے نازل کیا گیا ہے[2]

ایک دیگر حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

---

[1] ترجمہ: اسی نے آسمان بلند کیا اور ترازو (انصاف) کو قائم کیا تاکہ تم لوگ ترازو (سے تولنے) میں حد سے تجاوز نہ کرو اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور تول کم نہ کرو۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۷۷۰۔

ان اللہ تبارک وتعالٰی لم یدع شیئًا تحتاج الیہ الامۃ الا انزلہ فی کتابہ وبینہ لرسولہ (ص) وجعل لکل شیء حدًا، وجعل علیہ دلیلا یدل علیہ، وجعل علی من تعدی ذلک الحد حدًا۔

اللہ تبارک وتعالٰی نے کوئی ایسی چیز جس کی اس اُمت کو ضرورت تھی اپنی کتاب میں فروگذاشت نہیں کی اور اسے اپنے رسول سے بیان کیا ہے اس نے ہر چیز کے لیے ایک حد مقرر کر دی ہے اور اس پر ایک واضح دلیل قائم ہے اور ہر اس شخص کے لیے حد اور سزا مقرر ہے جو اس حد سے تجاوز کرے[1]

یہاں تک کہ اسلامی روایات میں اس مسئلے کی واضح نشاندہی کی گئی ہے کہ ظاہر قرآن کہ جسے عام لوگ اور علماء سمجھ لیتے ہیں کے علاوہ باطنِ قرآن بھی ایک وسیع سمندر ہے جس میں بہت سے مسائل مخفی ہیں کہ جہاں تک ہماری فکر نہیں پہنچ سکتی۔ قرآن کا یہ پہلو خاص اور پیچیدہ علم کا حامل ہے کہ جو رسول اللہ اور ان کے سچے اوصیاء کی دسترس میں ہے جیسا کہ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:۔

ما من امر یختلف فیہ اثنان الا ولہ اصل فی کتاب اللہ عز وجل ولکن لا تبلغہ عقول الرجال۔

ہر امر کہ جن کے بارے میں دو افراد کے درمیان بھی اختلاف ہو اس کے بارے میں قرآن میں ضابطہ موجود ہے لیکن لوگوں کی عقل و دانش اس تک نہیں پہنچ سکتی[2]

جو چیز عام لوگوں کی دسترس میں نہیں اسے انسان کے وجدانِ ناخود آگاہ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے البتہ یہ اس چیز سے مانع نہیں کہ اس کے خود آگاہ اور ظاہری حصے سے سب استفادہ کر سکتے ہیں۔

۲- ہدایت کے چار مرحلے: یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ زیرِ بحث آیت میں نزولِ قرآن کا مقصد بیان کرتے ہوئے چار تعبیریں آئی ہیں:۔

۱- تبیانًا لکل شیء قرآن میں ہر چیز کا واضح بیان ہے:
۲- باعثِ ہدایت ہے (ھدی)۔
۳- سببِ رحمت ہے (ورحمۃ)۔
۴- تمام مسلمانوں کے لیے موجبِ بشارت ہے (وبشرٰی للمسلمین)۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۳ ص ۷۰۔

[2] نور الثقلین جلد ۳ ص ۵۔

اگر صحیح طور پر غور و فکر کیا جائے تو ان چار مراحل میں واضح منطقی تعلق دکھائی دے گا۔ کیونکہ انسانوں کی ہدایت و راہنمائی کے راستے میں پہلا مرحلہ بیان اور آگاہی کا ہے۔ اور مسلّم ہے کہ آگاہی کے بعد ہدایت اور راہ چلنے کا مرحلہ ہے اور اس کے بعد عمل کرنے کی باری ہے کہ جو باعثِ رحمت ہے۔ اور آخر کار جب انسان مثبت اور صالح عمل انجام دے لے تو وہ دیکھے گا کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے لامحدود جزا ملے گا۔ کہ جو اس راہ کے تمام راہیوں کے لیے بشارت و سرور کا باعث ہے۔

۹۰۔ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○

ترجمہ:

۹۰۔ اللہ عدل و احسان اور قریبیوں کو عطا کرنے کا حکم دیتا ہے اور برائیوں، نافرمانیوں اور ظلم سے منع کرتا ہے۔ اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ شاید تم سبق لو۔

تفسیر:

نہایت جامع معاشرتی پروگرام:

گذشتہ آیت میں تھا کہ قرآن میں ہر چیز کا بیان موجود ہے۔ زیرِ نظر آیت میں تعلیماتِ اسلام کا ایک جامع اجتماعی انسانی اور اخلاقی پروگرام پیش کیا ہے۔ یہاں آیت میں چھ اہم اصول بیان کیے گئے ہیں۔ تین مثبت پہلو سے ہیں، اور تین منفی پہلو سے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اللہ عدل و احسان اور اسی طرح قریبیوں کو عطا کرنے کا حکم دیتا ہے (ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان و ایتاء ذی القربی)۔

عدل سے بڑھ کر کون سا قانون وسیع اور جامع متصور ہو سکتا ہے۔ عدل وہ قانون ہے جس کے محور پر تمام نظامِ ہستی گردش کرتا ہے۔ آسمان و زمین اور تمام موجودات عدالت کے ساتھ قائم ہیں (بالعدل قامت السمٰوٰت والارض)۔

انسانی معاشرہ اس وسیع عالمِ ہستی کا ایک گوشہ ہے۔ یہ معاشرہ عالمِ ہستی کے اس عمومی قانون سے الگ نہیں ہو سکتا اور عدل کے بغیر صحیح طرح اپنی زندگی جاری نہیں رکھ سکتا۔

ہم جانتے ہیں کہ عدل کا حقیقی معنی ہے کہ ہر چیز اپنی جگہ پر ہو لہٰذا ہر قسم کا انحراف، افراط و تفریط، حد سے تجاوز اور دوسروں کے حقوق کا استحصال عدالت کے برخلاف ہے۔ ایک صحیح انسان وہ ہے جس کے بدن کے تمام حصے بغیر کسی کمی بیشی کے اپنا اپنا کام کریں جب کبھی اس کا کوئی ایک یا کچھ حصے اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں کوتاہی کریں یا تجاوز کریں تو فوراً سارے بدن پر خرابی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں اور بیماری یقینی طور پر آجاتی ہے۔

سارا انسانی معاشرہ بھی ایک انسانی بدن کی طرح ہے۔ اگر عدل ملحوظ نہ رکھا جائے تو یہ بیمار ہو جائے گا۔

لیکن چونکہ بعض بحرانی و استثنائی مواقع پر تنہا عدالت اپنے جاہ و جلال اور گہرائی کے ساتھ کارساز نہیں ہوتی۔ لہٰذا ساتھ ہی

احسان کا حکم دیا گیا ہے۔

زیادہ واضح الفاظ میں انسانوں کی طویل زندگی میں ایسے حساس مواقع بھی آجاتے ہیں کہ جب مشکلات کا حل عدالت کی مدد سے ممکن نہیں ہوتا بلکہ ایثار، درگزر اور قربانی کی ضرورت ہوتی ہے کہ جس کا مفہوم "احسان" میں مضمر ہے۔

مثلاً ایک غدار اور دھوکا باز دشمن نے علاقے پر حملہ کر دیا۔ یا طوفان، سیلاب اور زلزلے نے ملک کا ایک حصہ تباہ کر دیا ہے۔ اب اگر لوگ ان حالات میں اس انتظار میں رہیں کہ مالی لحاظ سے اور دیگر لحاظ سے عادلانہ قوانین ان مسائل کو حل کریں تو یہ ممکن نہیں ہے ایسے مواقع پر وہ تمام لوگ کہ جن کے پاس زیادہ وسائل ہیں، جن کے پاس فکری، جسمانی اور مالی طاقت ہے انھیں چاہیے کہ ایثار و قربانی سے کام لیں اور اپنی طاقت کے مطابق ایثار کریں۔ ورنہ ہو سکتا ہے ظالم دشمن سارے ملک کو ختم کر دے یا قدرتی آفات بہت سے لوگوں کو بالکل مفلوج کر دیں۔

اتفاق کی بات ہے کہ یہ دونوں اصول ایک انسان کے بدن میں بھی فطری طور پر کار فرما ہیں۔ عام حالات میں بدن کے تمام حصے ایک دوسرے کی خدمت کرتے ہیں اور ہر عضو سارے بدن کے لیے کام کرتا ہے اور دوسرے اعضاء کی خدمات سے بہرہ مند ہوتا ہے یہ در اصل عدالت ہی ہے لیکن جب کبھی ایک عضو زخمی ہو جاتا ہے اور مقابلتہً خدمت کی قوت کھو بیٹھتا ہے تو کیا ممکن ہے اس حالت میں باقی اعضاء اسے بھلا دیں کیونکہ وہ بیکار ہو گیا ہے یہ کیا ممکن ہے زخمی عضو کا دوسرے اعضاء ساتھ نہ دیں اور اسے غذا نہ پہنچائیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہے ———— یہ در اصل احسان ہی ہے۔

سارے انسانی معاشرے پر بھی یہ دو اصول کار فرما ہونے چاہییں ورنہ معاشرہ صحیح و سالم نہیں ہو سکتا۔

اسلامی روایات اور اسی طرح مفسرین کے اقوال میں عدل و احسان کے درمیان فرق کے بارے میں مختلف بیانات دکھائی دیتے ہیں جو شاید زیادہ تر اسی مفہوم کی طرف لوٹتے ہیں جو ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے۔

ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے:

العدل الانصاف، و الاحسان التفضل

عدل یہ ہے کہ لوگوں کے حقوق ان تک پہنچائے جائیں اور احسان یہ ہے کہ ان پر تفضل کیا جائے۔[1]

اسی چیز کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

بعض نے کہا ہے:

"عدل" توحید ہے اور "احسان" واجبات کی ادائیگی ہے۔

اس تفسیر کی بناء پر "عدل" اعتقاد کی طرف اور "احسان" عمل کی طرف اشارہ ہے۔

بعض نے کہا ہے:

"عدالت" ظاہر و باطن کی ہم آہنگی کا نام ہے اور "احسان" یہ ہے کہ انسان کا باطن اس کے

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار، جملہ ۲۳۱۔

ظاہر ہے بہتر ہو۔

بعض دیگر مفسرین نے عدالت کو عملی پہلوؤں سے مربوط سمجھا ہے اور "احسان" کو گفتار کے ساتھ۔

لیکن ———— جیسا کہ ہم نے کہا ہے ان میں سے بعض تفاسیر ہمارے ذکر کردہ مفہوم سے ہم آہنگ ہیں اور دوسری بھی اس کے منافی نہیں ہے اور اس قابل ہیں کہ سب کو اس آیت میں جمع سمجھا جائے۔

(۳) "اِیتاءِ ذِی القُربٰی" یعنی قریبیوں کے ساتھ نیکی کرنے کا مسئلہ تو یہ درحقیقت مسئلہ احسان کا ایک حصہ ہے۔ فرق یہ ہے کہ "احسان" پورے معاشرے کے ساتھ ہے اور "ایتآءِ ذی القربٰی" خصوصیت سے اقرباء اور وابستگان کے ساتھ ہے کہ جو ایک چھوٹا معاشرہ شمار ہوتا ہے یہ خاندان معاشرے کی ایک اکائی ہے اگر اس میں باہمی اتحاد ہوگا تو اس کا اثر پورے معاشرے پر مرتب ہوگا۔ درحقیقت اس طرح لوگوں میں فرائض اور ذمہ داریاں صحیح صورت میں تقسیم ہوتی ہیں، کیونکہ ہر گروہ قدرا پہلے درجے میں اپنے اقرباء میں سے کمزور افراد کی دستگیری کرے گا تو اس طرح سے تمام افراد کے اپنے اقرباء کے ساتھ خوشگوار مراسم قائم ہو جائیں گے۔

بعض احادیثِ اسلامی میں ہے کہ "ذی القربٰی" سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیکی یعنی آئمہ اہل بیت علیہم السلام ہیں اور "ایتآءِ ذی القربٰی" سے مراد خمس کی ادائیگی ہے۔

اس تفسیر کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ آیت کا مفہوم محدود کر دیا جائے بلکہ کوئی مانع نہیں کہ آیت اپنے وسیع مفہوم میں باقی رہے اور یہ مفہوم دراصل اس کے عمومی مفہوم کا ایک روشن مصداق ہے۔

اور اگر ہم "ذی القربٰی" کو مطلق طور پر نزدیکیوں کے معنی میں لیں ———— چاہے وہ نسب اور خاندان کے اعتبار سے نزدیکی ہوں یا کسی اور اعتبار سے نزدیکی ———— تو آیت کا مفہوم اور بھی وسیع ہو جائے گا۔ اس طرح اس کے مفہوم میں ہمسایے، دوست اور اس قسم کے دیگر قریبی بھی شامل ہو جائیں گے۔ اگرچہ "ذی القربٰی" کا مشہور معنی وہی "اقرباء و خویش" ہی ہے۔

چھوٹے معاشرہ (یعنی اقرباء و اعزاء) کی حد میں چونکہ خود انسان کے احساسات، کارفرما ہوتے ہیں لہٰذا اجراء کے لحاظ سے یہ حکم زیادہ قوی تر ہے۔

ان تین مثبت اصولوں کے ذکر کے بعد تین ممانعتوں کا ذکر شروع ہوتا ہے فرمایا گیا ہے: اللہ "فحشاء" و "منکر" اور "بغی" کی ممانعت کرتا ہے (وینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی)۔

"فحشاء"، "منکر" اور "بغی" کے مفہوم کے بارے میں بھی مفسرین میں بہت اختلاف ہے لیکن ان کے لغوی معانی کو ایک دوسرے کے قرینے سے دیکھا جائے تو زیادہ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ "فحشاء" سے مراد چھپے ہوئے گناہ ہیں "منکر" کھلے عام گناہوں کو کہتے ہیں اور "بغی" کا مطلب حق سے ہر قسم کے تجاوز ظلم اور اپنے تئیں دوسرے سے بڑا سمجھنے کی طرف اشارہ ہے۔

بعض مفسرینؒ نے کہا ہے کہ اخلاقی انحراف کا سرچشمہ تین قوتیں ہیں:

ۖ تفسیر فخر الدین رازی جلد ۲۰ ص ۱۰۴

۱۔ قوتِ شہوانی
۲۔ قوتِ غضبی
۳۔ قوتِ وہمی شیطانی

قوت شہوانی: انسان کو زیادہ سے زیادہ لذتیں حاصل کرنے پر ابھارتی ہے اور اسے فحشاء میں غرق کر دیتی ہے۔
قوت غضبی: انسان کو منکرات انجام دینے اور لوگوں کو اذیت پہنچانے پر انگیخت کرتی ہے۔
قوت وہمی شیطانی: انسان کو مقام و منصب اور بڑا بننے پر ابھارتی ہے اور انسان کی منظر کو فقط اس کی اپنی ذات تک محدود کر دیتی ہے انسان میں دوسروں کے حقوق پر تجاوز کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور اسے ایسے کاموں پر اکساتی ہے۔
اللہ تعالیٰ نے مذکورہ تعبیرات کے ذریعے ان جبلتوں کی سرکشی پر تنبیہ کی ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں ایک جامع بیان کہ جس میں یہ تمام اخلاقی انحرافات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کے ذریعے راہ حق کی طرف ہدایت کی گئی ہے۔
آیت کے آخر میں ان چھ اصولوں پر ایک اور تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے شاید تم خیال کرو اور عمل کرنے لگو (یعظکم لعلکم تذکرون)۔

خیر و شر کے بارے میں جامع ترین آیات:

اس آیت کی جاذبیت اور طرز بیان کے بارے میں یہ روایت ملاحظہ ہو:
عثمان بن مظعون رسول اکرمؐ کے مشہور صحابہ میں سے تھے۔ وہ کہتے ہیں:

> شروع میں میں نے اسلام ظاہری طور پر ہی قبول کیا تھا اور دل سے اُسے نہیں مانا تھا وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ بار بار مجھے اسلام کی دعوت دیتے۔ شرم کی وجہ سے میں نے قبول کر لیا میری یہ کیفیت یونہی رہی یہاں تک کہ ایک روز میں آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے دیکھا کہ آپ بہت گہری فکر میں ہیں اور سخت پریشان ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اچانک آپ نے اپنی نظریں آسمان پر گاڑ دیں، یوں لگتا تھا جیسے کوئی پیغام وصول کر رہے ہیں یہ حالت ختم ہوئی تو میں نے ماجرا پوچھا تو آپؐ نے فرمایا:
>
> جس وقت میں تم سے باتیں کر رہا تھا، اچانک میں نے جبرئیل کو دیکھا وہ میرے پاس یہ آیت لے کر آئے تھے:
>
> ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ۔
>
> آپ نے میرے سامنے یہ آیت پوری تلاوت کی تو اس کے مضمون نے میرے دل پر ایسا اثر کیا کہ اسی وقت اسلام میری روح میں اُتر گیا میں آپ کے چچا ابوطالب کے پاس گیا اور انھیں یہ واقعہ سنایا تو انھوں نے فرمایا:

اے اہلِ قریش! محمد (ص) کی پیروی کرو تو ہدایت پاؤ گے کیونکہ وہ تمہیں مکارمِ اخلاق کے سوا کسی چیز کی دعوت نہیں دیتا۔

پھر میں ولید بن مغیرہ کے پاس گیا (یہ مشہور عالم اور مشرکین کا ایک سردار تھا) یہی آیت میں نے اس کے سامنے پڑھی تو اس نے کہا:

اگر یہ بات خود محمد (ص) کی طرف سے ہے تو بہت عمدہ ہے اور اگر اس کے خدا کی طرف سے ہے تو بھی بہت ہی اچھی ہے۔[1]

ایک اور حدیث میں ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت ولید بن مغیرہ کے سامنے پڑھی تو اس نے کہا برادر زادہ![2] اسے پھر پڑھنا۔

رسول اللہ نے یہ آیت پھر پڑھی تو ولید نے کہا:

ان له لحلاوة، و ان علیه لطلاوة، و ان اعلاه لمثمر، و ان اسفله لمغدق، و ما هو قول البشر

یہ خاص مٹھاس، حسن اور درخشندگی کی حامل ہے اس کی شاخیں پُر بار ہیں اور اس کی جڑیں پُر برکت ہیں اور کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک اور حدیث مروی ہے، آپ نے فرمایا:

جماع التقوی فی قوله تعالیٰ ان الله یأمر بالعدل و الاحسان

تقویٰ سارے کا سارا خدا کے اس ارشاد میں ہے: ان الله یأمر بالعدل و الاحسان۔[4]

مذکورہ بالا احادیث اور دیگر متعدد احادیث سے یہ بات اچھی طرح سے معلوم ہو جاتی ہے کہ زیرِ نظر آیت اسلام کا ایک ہمہ گیر حکم، اسلام کے ایک بنیادی قانون اور اس کے عالمی منشور کی بنیاد کے طور پر ہمیشہ مسلمانوں کے ہاں بہت اہم رہی ہے یہاں تک کہ ایک حدیث کے مطابق جب امام باقر علیہ السلام نمازِ جمعہ پڑھاتے تو خطبہ نماز کے آخر میں آپ یہی آیت تلاوت فرماتے اور اس کے بعد ان الفاظ میں دعا کرتے۔

اللّٰهم اجعلنا ممن یذکر فتنفعه الذکریٰ

---

[1] مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] بھائی کا بیٹا، اس نے اس لیے کہا کہ ولید بن مغیرہ ابوجہل کا چچا تھا اور یہ دونوں قریش میں سے تھے۔

[3] مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[4] نور الثقلین جلد ۲ ص ۱۷۸۔

خداوندا! ہمیں ان لوگوں میں سے قرار دے جو پند و نصیحت کو سنتے ہیں اور یہ اُن کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے۔

اس کے بعد آپ منبر سے اُتر آتے تھے[1]

اگر ہم چاہتے ہیں کہ دنیا ہر قسم کی بدبختی، فساد اور بُرائی سے پاک ہوجائے تو اس کے لیے کافی ہے کہ ان تین اصولوں پر عمل کیا جائے:

۱۔ عدل ۲۔ احسان ۳۔ ایتاء ذی القربیٰ

اور ان تین انحرافات کا سطحِ ارض سے خاتمہ کر دیا جائے:

۱۔ فحشاء ۲۔ منکر اور ۳۔ بغی

مشہور صحابیٔ رسول ابنِ مسعود سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا:

یہ آیت قرآن میں خیر اور شر کے بارے میں جامع ترین آیت ہے۔

ان کے اس قول کی بھی یہی وجہ ہے جو بیان کی جاچکی ہے۔

اس آیت کا مفہوم ہمیں رسولِ اکرمؐ کی ایک لرزا دینے والی حدیث یاد دلاتا ہے، آپؐ نے فرمایا:

صنفان من امتی اذا صلحا صلحت امتی و اذا فسد فسدت امتی

میری اُمت کے دو گروہ ایسے ہیں کہ اگر ان کی اصلاح ہوجائے گی تو میری امت کی اصلاح ہوجائے گی اور وہ فاسد اور خراب ہوجائیں گے تو میری اُمت فاسد ہوجائے گی۔

آپؐ سے پوچھا گیا:

"یارسول اللہؐ! یہ دو گروہ کون سے ہیں؟"

آپؐ نے فرمایا:

الفقهاء و الامراء

علماء اور امراء و اہلِ اقتدار۔

محدث قمی، "سفینۃ البحار" میں یہ حدیث نقل کرنے کے بعد پیغمبر اکرمؐ کی ایک اور حسبِ حال حدیث نقل کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:

قال تكلم النار يوم القيمة ثلاثة! اميرًا، و قاريًا، و ذاثروة من المال، فيقول للامير يا من وهب الله له سلطانا فلم يعدل، فتزدرده كما تزدرد الطير حب السمسم، و تقول للقارى يا من تزين للناس و بارز الله

---

[1] نورالثقلین جلد ۳ ص ،، بحوالہ کافی

بالمعاصی فتزدرده، و تقول للغنی یامن وهب الله له دنیا کثیرة واسعة فیضًا وسئله الحقیر الیسیر قرضا فابی الا بخلا فتزدرده.

قیامت کے دن جہنم کی آگ تین گروہوں سے بات کرے گی اہل اقتدار، علماء اور دولت مند۔
اہل اقتدار سے کہے گی: تمھیں خدا نے اقتدار دیا تھا لیکن تم نے عدل سے کام نہیں لیا۔
یہ کہہ کر آگ انھیں اس طرح سے نگلے گی جیسے پرندہ تلوں کے دانوں کو نگل جاتا ہے۔
اس کے بعد علماء سے کہے گی: تم نے ظاہراً تو اپنے آپ کو بہت اچھا بنا رکھا تھا لیکن تم اللہ کی نافرمانی کرتے تھے۔
یہ کہہ کر آگ انھیں بھی نگل جائے گی۔
پھر دولت مندوں سے کہے گی: خدا نے تمھیں بہت سے وسائل عطا کیے تھے اور تم سے چاہا تھا کہ ان میں سے کچھ مال خرچ کرو لیکن تم نے بخل سے کام لیا۔
یہ کہہ کر آگ انھیں بھی نگل جائے گی[1]

(عدالت اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی تیسری جلد میں سورۂ مائدہ کی آیہ ۸ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی ہے اُدھر رجوع کیجیے گا)۔

[1] سفینۃ البحار جلد ۲، ص ۳۰۔

اللہ ہی کی عطا ہیں۔

"ایمان" "یمین" کی جمع ہے اس کا معنی ہے قسم۔ مندرجہ بالا آیت میں آنے والے اس لفظ کی بھی مختلف تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔ جملے کے مفہوم کی طرف توجہ کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بھی وسیع مفہوم ہے اس میں بھی وہ تمام معاہدے شامل ہیں جو انسان خدا کے سامنے کرتا ہے اور تمام معاہدے اور وعدے جو قسم کے ذریعے مخلوق خدا کے سامنے کیے جاتے ہیں اس کے مفہوم میں داخل ہیں دوسرے لفظوں میں ہر قسم کا معاہدہ یا وعدہ جو اللہ کے نام پر یا اس کی قسم کے ذریعے انجام پائے وہ "ایمان" کے معنی میں داخل ہے خصوصاً جبکہ اس کے بعد "وقد جعلتم اللہ علیکم کفیلاً" (جبکہ تم نے خدا کو اپنا کفیل و ضامن قرار دیا ہو) تفسیر و تاکید کے طور پر آیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ "اوفوا بعھد اللہ" خاص حکم ہے اور "لا تنقضوا الایمان" عام حکم ہے۔

ایفائے عہد کا مسئلہ معاشرے کے ثبات و قیام کے لیے چونکہ بہت اہم ستون کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا اگلی آیت میں ملامت کے لہجے میں اس کے بارے میں گفتگو جاری ہے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے: تم اس عورت کی طرح نہ ہو جانا جس نے خوب سوت کاتا اور پھر اس سارے کو کھول دیا۔ (ولا تکونوا کالتی نقضت غزلھا من بعد قوۃ انکاثاً)[1]

یہ زمانہ جاہلیت کی ایک قریشی عورت "رائطہ" کی طرف اشارہ ہے وہ خود اور اس کی کنیزیں صبح سے دوپہر تک سوت کاتتیں پھر وہ عورت حکم دیتی کہ اس سارے کو کھول دو۔ اسی وجہ سے وہ عربوں میں "حمقاء" (احمق عورت) کے نام سے مشہور تھیں۔

ان عورتوں کے اس کام پر غور کیا جائے تو یہ ایک رجعت پسندانہ کام دکھائی دیتا ہے کیونکہ کاتنے کے بعد سوت ایک نیا استحکام اور تکامل حاصل کر لیتا ہے اب اس کو ادھیڑنا ایک رجعتی عمل ہی ہے کہ جو نہ صرف فضول اور لاحاصل ہے، بلکہ نقصان دہ بھی ہے اسی طرح جو لوگ اللہ سے عہد باندھتے ہیں یا اس کے نام پر کوئی معاہدہ کرتے ہیں ان کا اس عہد اور معاہدے کو توڑ دینا نہ صرف فضول اور بے ہودہ حرکت ہے بلکہ ایسا کرنے والوں کے شخصی انحطاط کی دلیل بھی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: تم اِس کی یا اس کی خاطر اور اس خیال سے کہ فلاں گروہ کی نفری دوسرے سے زیادہ ہے اپنا پیمان اور قسم نہ توڑو اور اس پیمان اور قسم کو دھوکا دہی اور برائی کا ذریعہ نہ بناؤ (تتخذون ایمانکم دخلاً بینکم ان تکون امۃ ھی اربی من امۃ)[2]۔

---

[1] "انکاث"، "نکث" (بروزن "قسط") کی جمع ہے یہ بٹنے کے بعد اون اور بالوں کو کھول دینے کے معنی میں ہے یہ لفظ اون اور بالوں سے بنے ہوئے لباس کو ادھیڑنے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ اس بارے میں کہ زیر بحث آیت میں "انکاث" کیا محل اعراب رکھتا ہے، بعض اسے حال تاکیدی اور بعض "نقضت" کا دوسرا مفعول سمجھتے ہیں ——— "ای جعلت غزلھا انکاثاً" (اس نے اپنی کاتی ہوئی چیز کو ادھیڑ دیا)۔

[2] "دخل" (بروزن "دخل") اندرونی برائی، باطنی دشمنی اور مکر و فریب کے معنی میں ہے اسی مادہ سے "داخل" اندر کے معنی میں لیا گیا ہے اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ ہم نے جو تفسیر سطور بالا میں پیش کی ہے اس کے مطابق "تتخذون ایمانکم" جملہ حالیہ ہے لیکن بعض مفسرین نے اسے جملہ استفہامیہ سمجھا ہے البتہ پہلی تفسیر آیت کے ظہور سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

یہ چیز انسان کی شخصیت اور روح کی کمزوری پر دلالت کرتی ہے یا اس کے مکر و فریب اور خیانت کی دلیل ہے کہ وہ صرف مخالفین کی کثرت دیکھ کر اپنے سچے دین کو چھوڑ دے اور اس دین سے رشتہ جوڑ لے کہ جو بے بنیاد ہے، اس لیے کہ اس کے طرفدار زیادہ ہیں۔

آگاہ رہو کہ اس طرح اللہ تمھیں آزمائے گا (انما یبلوکم اللہ بہ)۔

اگر تم کثرت میں ہو اور تمھارا دشمن اقلیت میں تو یہ آزمائش کی بات نہیں آزمائش تو جبھی ہے کہ دشمن بڑی تعداد میں تمھارے سامنے کھڑا ہو اور تم ظاہراً کم اور کمزور ہو۔

بہرحال اس آزمائش کا نتیجہ اور جس امر میں تم اختلاف رکھتے تھے، خدا کی طرف سے روز قیامت تمھارے سامنے واضح ہو جائے گا اور اس روز دلوں کے بھید آشکار ہو جائیں گے اور ہر شخص اپنے اعمال کی جزا پائے گا (ولیبینن لکم یوم القیمۃ ما کنتم فیہ تختلفون)۔

خدا کی طرف سے آزمائش، ایمان پر زور دینا اور فرائض کی انجام دہی کی بحث سے عام طور پر یہ توہم پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ مشکل ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں سے جبری طور پر حق منوالے۔ یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں اس توہم کا جواب دیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے، خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا (ولوشاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ)، امت واحدہ ——— ایمان اور قبول حق کے لحاظ سے لیکن جبری طور پر۔

واضح ہے اس طرح سے حق قبول کرنا نہ کمال وارتقاء کا باعث ہے اور نہ باعث افتخار ہے یہی وجہ ہے کہ سنت الٰہی یہ ہے کہ سب کو آزادی دی جائے تاکہ وہ اپنے اختیار اور ارادے سے راہ حق طے کریں۔

لیکن اس آزادی کا یہ معنی نہیں کہ جو لوگ اس کی راہ پر چلتے ہیں اللہ ان کی کسی قسم کی کوئی مدد نہیں کرتا بلکہ جو لوگ راہ حق پر قدم رکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں اللہ کی توفیق ان کے شامل حال ہوتی ہے اور وہ اس کی ہدایت کے زیر سایہ منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں اور جو باطل کے راستے پر قدم رکھتے ہیں وہ اس نعمت سے محروم رہتے ہیں۔ اور ان کی گمراہی میں اضافہ ہوتا ہے۔

اسی لیے مزید فرمایا گیا ہے: لیکن خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے (ولکن یضل من یشاء ویھدی من یشاء)۔

لیکن خدا کی طرف سے اس ہدایت و گمراہی کا یہ مطلب نہیں کہ تمھاری ذمہ داری سلب ہو گئی ہے کیونکہ اس سے پہلے خود تم نے قدم اٹھائے ہیں۔

اسی لیے مزید فرمایا گیا ہے، تم اپنے اعمال کے یقیناً جواب دہ ہو اور تم سے بازپرس ہو گی (ولتسئلن عما کنتم تعملون)۔

یہ تعبیر کہ جس میں ایک طرف اعمال انجام دینے کی نسبت انسانوں کی طرف دی جا رہی ہے اور دوسری طرف اعمال پر جواب دہی پر زور دیا جا رہا ہے ——— گزشتہ جملے کے مفہوم کے تعین کے لیے واضح قرائن میں سے ہے۔ اس سے

۹۱۔ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ○

۹۲۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ○

۹۳۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

۹۴۔ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○

ترجمہ:

۹۱۔ اللہ سے پیمان باندھو تو ایفائے عہد کرو اور اپنی قسموں کو ان کے پکا ہوجانے کے بعد نہ توڑو جبکہ تم خدا کو اپنی قسموں پر کفیل وضامن قرار دے چکے ہو جو کچھ تم انجام دیتے ہو اللہ اس سے آگاہ ہے

۹۲۔ اس (کم عقل) عورت کی طرح نہ ہوجاؤ جو اپنے سوت کو خوب کات کر کھول دیتی ہے جبکہ تم اپنی قسموں (اور پیمانوں) کے ذریعے خیانت وفساد کرتے ہو اس بناء پر کہ ایک گروہ کی نفری دوسرے سے زیادہ ہے (اور دشمن کی کثرت کو رسولِ خدا کی بیعت توڑنے کے لیے بہانہ بناتے ہو) اور اللہ تمھیں آزماتا ہے اور جس چیز کے بارے میں تم اختلاف کرتے ہو، روزِ قیامت اسے واضح کردے گا۔

۹۳۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک اُمت بنا دیتا (سب کو جبری طور پر ایمان قبول کروا دیتا لیکن جبری ایمان کا کیا فائدہ ہے) مگر خدا جس شخص کو چاہتا ہے (اور مستحق پاتا ہے) اسے گمراہ کردیتا ہے اور جس

شخص کو چاہتا ہے (اور اسے اس لائق سمجھتا ہے) ہدایت کرتا ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو تمھاری اس بارے میں باز پرس ہوگی۔

۹۴۔ اپنی قسموں کو باہم دھوکا بازی اور خیانت کا ذریعہ نہ بناؤ، مبادا (ایمان پر) جمے ہوئے قدم اکھڑ جائیں اور پھر راہِ خدا سے (لوگوں کو) روکنے کے بُرے آثار کا مزہ چکھو اور تمھارے لیے بڑا سخت عذاب ہوگا۔

شانِ نزول:

عظیم مفسرِ قرآن علامہ طبرسی "مجمع البیان" میں مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت کے شانِ نزول کے بارے میں کہتے ہیں:

> جس وقت مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور دشمن بہت زیادہ تھے ایسے میں امکان تھا کہ اپنے فرق کا احساس کرتے ہوئے بعض مومنین رسول اللہؐ سے کی ہوئی اپنی بیعت توڑ دیتے اور آپ کا ساتھ چھوڑ جاتے ـــــــ ان حالات میں یہ آیت نازل ہوئی اور انھیں اس سلسلے میں تنبیہ کی گئی اور خبردار کیا گیا۔

تفسیر

عہد و پیمان ـــــــ ایمان کی دلیل:

گزشتہ آیت میں اسلام کے اساسی اصول، عدالت، احسان وغیرہ کے ذکر کے بعد زیرِ نظر آیات میں اسلامی تعلیمات کے ایک نہایت اہم گوشے کا تذکرہ شروع کیا گیا ہے اور وہ ہے ایفائے عہد اور قسموں کو پورا کرنا۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اللہ سے جب عہد کرو تو اسے ایفا کرو (واوفوا بعهد الله اذا عاهدتم)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اور اپنی قسموں کو پکا کرنے کے بعد توڑ نہ دو (ولا تنقضوا الایمان بعد توکیدها)۔

جبکہ تم نے اللہ کے نام کی قسم کھائی ہو اور اپنی قسم پر اللہ کو کفیل اور ضامن قرار دیا ہو (وقد جعلتم الله علیکم کفیلاً)۔

کیونکہ اللہ تمھارے اعمال کو جانتا ہے (ان الله یعلم ما تفعلون)۔

مفسرین نے "عهد الله" کی بہت سی تفسیریں کی ہیں لیکن ظاہری مفہوم وہی عہد و پیمان ہی ہے جو لوگ اللہ کے ساتھ باندھتے ہیں (اور واضح ہے کہ اس کے رسول کے ساتھ عہد کرنا بھی اس کے ساتھ عہد کرنا ہی ہے) لہٰذا ایمان اور جہاد وغیرہ کے نام پر بیعت کرنا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے بلکہ تمام شرعی ذمہ داریاں تو رسولؐ کے ذریعے بتائی جاتی ہیں، ضمنی طور پر عہدِ الٰہی کے مفہوم میں داخل ہیں اور عقلی احکام کی بھی یہی صورت ہے کیونکہ عقل و ہوش اور استعداد

اللہ ہی کی عطا ہیں۔

"ایمان" "یمین" کی جمع ہے اس کا معنی ہے قسم۔ مندرجہ بالا آیت میں آنے والے اس لفظ کی بھی مختلف تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔ جملے کے مفہوم کی طرف توجہ کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بھی وسیع مفہوم ہے اس میں بھی وہ تمام معاہدے شامل ہیں جو انسان خدا کے سامنے کرتا ہے اور تمام معاہدے اور وعدے جو قسم کے ذریعے مخلوق خدا کے سامنے کیے جاتے ہیں اس کے مفہوم میں داخل ہیں دوسرے لفظوں میں ہر قسم کا معاہدہ یا وعدہ جو اللہ کے نام پر یا اس کی قسم کے ذریعے انجام پائے وہ "ایمان" کے معنی میں داخل ہے خصوصاً جبکہ اس کے بعد "وقد جعلتم الله علیکم کفیلاً" (جبکہ تم نے خدا کو اپنا کفیل و ضامن قرار دیا ہو) تفسیر و تاکید کے طور پر آیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ "اوفوا بعهد الله" خاص حکم ہے اور "لا تنقضوا الایمان" عام حکم ہے۔

ایفائے عہد کا مسئلہ معاشرے کے ثبات و قیام کے لیے چونکہ بہت اہم ستون کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا اگلی آیت میں ملامت کے لہجے میں اس کے بارے میں گفتگو جاری ہے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے: تم اس عورت کی طرح نہ ہو جانا جس نے خوب سُوت کاتا اور پھر اس سارے کو کھول دیا۔ (ولا تکونوا کالتی نقضت غزلها من بعد قوة انکاثاً[۱])۔

یہ زمانہ جاہلیت کی ایک قریشی عورت "رائطہ" کی طرف اشارہ ہے وہ خود اور اس کی کنیزیں صبح سے دوپہر تک سُوت کاتتیں پھر وہ عورت حکم دیتی کہ اس سارے کو کھول دو۔ اسی وجہ سے وہ عربوں میں "حمقاء" (احمق عورت) کے نام سے مشہور تھیں۔

ان عورتوں کے اس کام پر غور کیا جائے تو یہ ایک رجعت پسندانہ کام دکھائی دیتا ہے کیونکہ کاتنے کے بعد سوت ایک نیا استحکام اور تکامل حاصل کر لیتا ہے اب اس کو ادھیڑنا ایک رجعتی عمل ہی ہے کہ جو نہ صرف فضول اور لاحاصل ہے، بلکہ نقصان دہ بھی ہے اسی طرح جو لوگ اللہ سے عہد باندھتے ہیں یا اس کے نام پر کوئی معاہدہ کرتے ہیں ان کا اس عہد اور معاہدے کو توڑ دینا نہ صرف فضول اور بے ہودہ حرکت ہے بلکہ ایسا کرنے والوں کے شخصی انحطاط کی دلیل بھی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: تم اِس کی یا اس کی خاطر اور اس خیال سے کہ فلاں گروہ کی نفری دوسرے سے زیادہ ہے اپنا پیمان اور قسم نہ توڑو اور اس پیمان اور قسم کو دھوکا دہی اور برائی کا ذریعہ نہ بناؤ (تتخذون ایمانکم دخلاً[۲] بینکم ان تکون امة هی اربی من امة)۔

---

[۱] "انکاث"، "نکث" (بروزن "قسط") کی جمع ہے، یہ بٹنے کے بعد اُون اور بالوں کو کھول دینے کے معنی میں ہے یہ لفظ اون اور بالوں سے بُنے ہوئے لباس کو ادھیڑنے کے لیے بھی بولا جاتا ہے اس بارے میں کہ زیر بحث آیت میں "انکاث" کیا محل اعراب رکھتا ہے۔ بعض اسے حال تاکیدی اور بعض "نقضت" کا دوسرا مفعول سمجھتے ہیں ———— "ای جعلت غزلها انکاثا" (اس نے اپنی کاتی ہوئی چیز کو ادھیڑ دیا)۔

[۲] "دخل" (بروزن "دَخل") اندرونی برائی، باطنی دشمنی اور مکر و فریب کے معنی میں ہے اسی مادہ سے "داخل" اندر کے معنی میں لیا گیا ہے اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ ہم نے جو تفسیر سطور بالا میں پیش کی ہے اس کے مطابق "تتخذون ایمانکم" جملہ حالیہ ہے لیکن بعض مفسرین نے اسے جملہ استفہامیہ سمجھا ہے البتہ پہلی تفسیر آیت کے ظہور سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

یہ چیز انسان کی شخصیت اور روح کی کمزوری پر دلالت کرتی ہے یا اس کے مکروفریب اور خیانت کی دلیل ہے کہ وہ صرف مخالفین کی کثرت دیکھ کر اپنے سچے دین کو چھوڑ دے اور اس دین سے رشتہ جوڑ لے کہ جو بے بنیاد ہے، اس لیے کہ اس کے طرفدار زیادہ ہیں۔

آگاہ رہو کہ اس طرح اللہ تمھیں آزمائے گا (انما یبلوکم اللہ بہ)۔

اگر تم کثرت میں ہو اور تمھارا دشمن اقلیت میں تو یہ آزمائش کی بات نہیں آزمائش تو جبھی ہے کہ دشمن بڑی تعداد میں تمھارے سامنے کھڑا ہو اور تم ظاہراً کم اور کمزور ہو۔

بہرحال اس آزمائش کا نتیجہ اور جس امر میں تم اختلاف رکھتے تھے، خدا کی طرف سے روز قیامت تمھارے سامنے واضح ہو جائے گا اور اس روز دلوں کے بھید آشکار ہو جائیں گے اور ہر شخص اپنے اعمال کی جزا پالے گا (ولیبینن لکم یوم القیمۃ ما کنتم فیہ تختلفون)۔

خدا کی طرف سے آزمائش، ایمان پر زور دینا اور فرائض کی انجام دہی کی بحث سے عام طور پر یہ توہم پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ مشکل ہے کہ اللہ تعالٰی تمام انسانوں سے جبری طور پر حق منوالے۔ یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں اس توہم کا جواب دیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا (ولو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ)، امت واحدہ ——— ایمان اور قبول حق کے لحاظ سے لیکن جبری طور پر۔

واضح ہے اس طرح سے حق قبول کرنا نہ کمال وارتقاء کا باعث ہے اور نہ باعثِ افتخار ہے یہی وجہ ہے کہ سنت الٰہی یہ ہے کہ سب کو آزادی دی جائے تاکہ وہ اپنے اختیار اور ارادے سے راہ حق طے کریں۔

لیکن اس آزادی کا یہ معنی نہیں کہ جو لوگ اس کی راہ پر چلتے ہیں اللہ ان کی کسی قسم کی کوئی مدد نہیں کرتا بلکہ جو لوگ راہِ حق پر قدم رکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں اللہ کی توفیق ان کے شاملِ حال ہوتی ہے اور وہ اس کی ہدایت کے زیر سایہ منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں اور جو باطل کے راستے پر قدم رکھتے ہیں وہ اس نعمت سے محروم رہتے ہیں۔ اور ان کی گمراہی میں اضافہ ہوتا ہے۔

اسی لیے مزید فرمایا گیا ہے: لیکن خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے (ولکن یضل من یشاء ویھدی من یشاء)۔

لیکن خدا کی طرف سے اس ہدایت وگمراہی کا یہ مطلب نہیں کہ تمھاری ذمہ داری سلب ہوگئی ہے کیونکہ اس سے پہلے خود تم نے قدم اٹھائے ہیں۔

اسی لیے مزید فرمایا گیا ہے: تم اپنے اعمال کے یقیناً جواب دہ ہو اور تم سے باز پرس ہوگی (ولتسئلن عما کنتم تعملون)۔

یہ تعبیر کہ جس میں ایک طرف اعمال انجام دینے کی نسبت انسانوں کی طرف دی جارہی ہے اور دوسری طرف اعمال پر جواب دہی پر زور دیا جارہا ہے ——— گزشتہ جملے کے مفہوم کے تعین کے لیے واضح قرائن میں سے ہے۔ اس سے

ثابت ہوتا ہے کہ ہدایت وگمراہی ہرگز جبری نہیں ہے۔
(اس سلسلے میں ہم پہلے بھی بحث کر چکے ہیں۔ قارئین تفسیر نمونہ جلد اوّل میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶ کی تفسیر کی طرف رجوع فرمائیں)

اس کے بعد پھر ایفائے عہد کی طرف تاکید کی جا رہی ہے۔ اور قسمیں پوری کرنے پر زور دیا جا رہا ہے چونکہ معاشرے کے ثبات وبقاء کے لیے یہ ایک اہم عامل ہے ارشاد ہوتا ہے: اپنی قسموں کو اپنے درمیان مکر و فریب اور نفاق کا ذریعہ نہ بناؤ (ولا تتخذوا ایمانکم دخلاً بینکم)۔ کیونکہ اس کام کے دو عظیم نقصانات ہیں۔ پہلا یہ کہ اس سے ایمان پر جمے ہوئے قدم متزلزل ہو جاتے ہیں (فتزل قدم بعد ثبوتها)۔ اس لیے کہ جب تم قسم کھاتے ہو یا عہد باندھتے ہو تو اگر اس وقت تمہارا ایفائے عہد کا ارادہ نہیں ہوتا پھر بھی ایسا کرتے ہو تو لوگوں کا تم پر اعتماد اٹھ جائے گا اور ایمان لانے والوں میں سے بعض لوگوں کا ایمان بھی اس طرح متزلزل ہو جائے گا گویا ان کے ایمان کی بنیاد مضبوط نہ تھی۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ تمہیں اس کام کے بُرے نتائج بھگتنا پڑیں گے۔ اس دنیا میں اللہ کے راستے سے محروم ہو جاؤ گے اور دوسری دنیا میں اللہ کا سخت عذاب تمہارے انتظار میں ہوگا۔ (وتذوقوا السوء بما صددتم عن سبیل اللہ ولکم عذاب عظیم)۔

درحقیقت پیمان شکنی اور قسموں کی خلاف ورزی سے ایک طرف تو لوگ دینِ حق سے بدبین اور متنفر ہو جاتے ہیں، انتشار اور بداعتمادی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اسلام قبول کرنے کی طرف لوگوں کی رغبت کو نقصان پہنچتا ہے اس حالت میں اگر دوسرے لوگ کوئی عہد و پیمان باندھیں گے تو اسے پورا کرنے کے لیے وہ اپنے آپ کو پابند نہیں سمجھیں گے اور یہ صورتِ حال خود دنیا میں بے شمار پریشانیوں اور تلخ کامیوں کا باعث ہے۔
دوسری طرف دارِ آخرت میں تمہیں عذابِ الٰہی کی سوغات ملے گی۔

چند اہم نکات:

۱۔ عہد و پیمان کے احترام کا فلسفہ: ہم جانتے ہیں کسی معاشرے کا اہم ترین سرمایہ لوگوں کا باہمی اعتماد ہے۔ اصولی طور پر جو چیز معاشرے کو بکھری ہوئی اکائیوں سے نکال کر ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح آپس میں منسلک اور وابستہ کر دیتی ہے وہ یہی باہمی اعتماد ہی ہے یہ اعتماد ہی ہے جس کی بنیاد پر انسانوں کے کاموں میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور وہ آپس میں مل جل کر کام کرتے ہیں اور رہتے سہتے ہیں۔ عہد و پیمان اور قسمیں اس باہمی اعتماد ہی کے لیے تاکید کا کام دیتی ہیں۔

اگر عہد و پیمان ٹوٹتے رہیں تو پھر معاشرے میں باہمی اعتماد کے عظیم رشتے بھی ٹوٹ جاتے ہیں اور معاشرہ ظاہری صورت میں ایک ہونے کے باوجود بکھرا ہوا اور پراگندہ ہوتا ہے اور وہ ایسی اکائیوں میں بدل جاتا ہے جن میں کوئی دم خم نہیں ہوتا۔
یہی وجہ ہے کہ قرآنی آیات اور اسلامی احادیث میں ایفائے عہد اور قسموں کو پورا کرنے پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے

اور بدعہدی اور قسموں کو توڑنے کو گناہِ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر کے نام اپنے فرمان میں اسلام اور زمانہ جاہلیت میں اس امر کی بہت زیادہ اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسے ایک نہایت اہم اور عمومی مسئلہ شمار کرتے ہوئے اس پر بہت تاکید کی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ مشرکین تک اپنے عہد اور معاہدوں کی پابندی کیا کرتے تھے کیونکہ انھیں پیمان شکنی کے المناک انجام کا علم تھا۔[1]

اسلام کے جنگی احکام میں ہے کہ ایک عام سپاہی بھی دشمن فوج کے ایک فرد یا چند افراد کو امان دے دے تو تمام مسلمانوں کے لیے اس امان کا احترام لازمی ہے۔

مورخین اور مفسرین کہتے ہیں کہ صدر اسلام میں جو بہت سے گروہوں نے اسلام جیسا عظیم الٰہی دین قبول کیا اس کا ایک سبب مسلمانوں کا اپنے عہد و پیمان کا پابند ہونا اور اپنی قسموں کو پورا کرنا تھا۔

یہ معاملہ اس قدر اہم ہے کہ حضرت سلمان فارسی سے ایک روایت ان الفاظ میں مروی ہے:

تهلك هذه الامة بنقض مواثيقها

اس امت کی ہلاکت پیمان شکنیوں کی وجہ سے ہوگی[2]

یعنی جیسے ایفائے عہد عظمت و شوکت اور ترقی کا سبب ہے اسی طرح پیمان شکنی، درماندگی، تنزلی اور نابودی کا سبب ہے۔

تاریخ اسلام میں ہے کہ جب خلیفہ ثانی کے دور میں مسلمانوں نے ساسانیوں کو شکست دی اور ایران کے لشکر کا عظیم بادشاہ ہرمزان گرفتار ہوا تو اسے حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا گیا۔ خلیفہ نے اس سے کہا: تم نے بارہا ہم سے عہد و پیمان کیا اور پھر پیمان شکنی کی، اس کی کیا وجہ تھی۔

ہرمزان کہنے لگا: مجھے خوف ہے کہ اس کی وجہ بیان کرنے سے پہلے تم مجھے قتل نہ کردو۔

خلیفہ نے کہا: ڈرو نہیں۔

ہرمزان نے پانی مانگا، فوراً ایک عام سے بے قیمت برتن میں پانی بھر کے اسے پیش کیا گیا۔

ہرمزان نے کہا: میں پیاس سے مر بھی جاؤں تو اس برتن میں پانی نہیں پیوں گا۔

خلیفہ نے کہا: ایسے برتن میں پانی لے آؤ جو اس کے لیے قابلِ قبول ہو۔

ایسا برتن لایا گیا پانی بھر کر اسے دیا گیا وہ اِدھر اُدھر دیکھتا تھا اور پانی نہیں پیتا تھا اور کہتا تھا: مجھے ڈر ہے کہ میں پانی پینے لگوں گا تو مجھے قتل کر دیا جائے گا۔

خلیفہ نے کہا: ڈرو نہیں، میں تجھے اطمینان دلاتا ہوں کہ جب تک تو پانی پی نہ لے تجھے کچھ نہیں کہا جائے گا۔

ہرمزان نے اچانک پانی کا برتن اوندھا کر دیا۔ پانی زمین پر گر گیا۔ خلیفہ نے سمجھا پانی اس کے ہاتھوں سے بے اختیار

---

[1] نہج البلاغہ خطوط علی (ع) نامہ ۵۳۔

[2] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

گر گیا ہے لہذا کہا: اس کے لیے اور پانی لے آؤ اور اسے پیاسا قتل نہ کرو۔

ہرمزان نے کہا: مجھے پانی نہیں چاہیے میرا مقصد تو یہ تھا کہ تجھ سے امان لے لوں۔

خلیفہ نے کہا: میں تجھے ہر صورت میں قتل کروں گا۔

ہرمزان کہنے لگا: تو مجھے امان دے چکا ہے اور اطمینان دلا چکا ہے۔

خلیفہ نے کہا: تو جھوٹ بولتا ہے، میں نے تجھے امان نہیں دی۔

انس[1] وہاں موجود تھے کہنے لگے: ہرمزان سچ کہتا ہے، آپ نے اسے امان دی ہے کیا آپ نے نہیں کہا کہ جب تک تو پانی نہ پی لے تجھے کچھ نہیں کہا جائے گا۔

خلیفہ بات کہہ کر پھنس گئے، ہرمزان سے کہنے لگے: تو نے مجھے دھوکا دیا ہے لیکن میں نے اس لیے دھوکا کھایا کہ تو اسلام قبول کر لے۔

ہرمزان نے یہ منظر دیکھا (اور مسلمانوں کے عہد و پیمان کی پابندی دیکھی تو اس کے سینے میں نورِ ایمان چمک اٹھا) تو مسلمان ہو گیا۔[2]

۲۔ پیمان شکنی کے لیے بہانے: پیمان شکنی اتنی بری چیز ہے کہ کوئی شخص پسند نہیں کرتا کہ اپنے اوپر اس کا الزام لے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد شکنی کرنے والے عذر تلاش کرتے ہیں چاہے وہ عذر کتنا ہی بے بنیاد کیوں نہ ہو۔ اس کی مثال ہم نے زیر بحث آیات میں بھی دیکھی ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض مسلمان خدا اور رسولؐ سے باندھے ہوئے اپنے عہد میں تزلزل کے لیے دشمنوں کی کثرت کا بہانہ کرتے تھے حالانکہ کثرت کامیابی کی دلیل نہیں کیونکہ ایسا بہت ہوا ہے کہ ایک باایمان اور عزم صمیم کی حامل اقلیت کسی بڑی بے ایمان اکثریت پر کامیاب ہو گئی۔ اسی طرح دشمنوں کی کثرت اس بات کے لیے کب جواز بن سکتی ہے کہ دوستوں سے عہد شکنی کی جائے کیونکہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو ایسی عہد شکنی دراصل ایک قسم کا شرک اور خدا سے بیگانگی ہے۔

آیت میں جو مثال پیش کی گئی ہے۔ ہمارے زمانے میں اس بات نے ایک نئی صورت اختیار کی ہے بعض ایسی مسلمان حکومتیں ہیں کہ جو بظاہر چھوٹی ہیں بڑی استعماری طاقتوں کے خوف سے مومنین سے باندھے ہوئے اپنے پیمان پورے نہیں کرتیں ان کے حکمران ناچیز اور کمزور انسانی طاقت کو خدا کی لامتناہی قدرت پر مقدم سمجھتے ہیں۔ غیر خدا پر تکیہ کرتے ہیں اور غیر خدا سے ڈرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے عہد و پیمان بھی اسی انحصار اور خوف کا شکار ہو جاتے ہیں جبکہ یہ ساری کیفیت شرک و بت پرستی کی پیداوار ہے۔

---

[1] ایک مشہور صحابی۔

[2] تاریخ کامل جلد ۲ ص ۵۴۹۔

۹۵۔ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

۹۶۔ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۭ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

۹۷۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۹۵۔ اللہ کے عہد کو (کبھی بھی) تھوڑی سی قیمت کے بدلے نہ بیچو (اور اس کے لیے ہر قیمت بے وقعت ہے) اور اگر تم جانو تو جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی بہتر ہے۔

۹۶۔ (کیونکہ) جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ فانی ہے لیکن جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے اور جو لوگ صبر و استقامت اختیار کریں گے ہم انھیں بہترین اعمال کی جزا دیں گے۔

۹۷۔ مرد ہو یا عورت جو کوئی بھی نیک عمل کریگا اس حالت میں کہ وہ مومن ہو ہم اسے حیات پاکیزہ عطا کریں گے اور انھیں ان کی سی جزا دیں گے جنھوں نے بہترین اعمال انجام دیے ہیں۔

شانِ نزول:

عظیم مفسر مرحوم طبرسی نے ابنِ عباس سے نقل کیا ہے:

ایک شخص حضر موت کا رہنے والا تھا وہ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرا ایک ہمسایہ ہے اس کا نام امراؤالقیس ہے اس نے میری زمین کا کچھ حصّہ غصب کر رکھا ہے، لوگ میری سچائی کے گواہ ہیں لیکن چونکہ اس کا احترام کرتے ہیں لہذا میری حمایت پر آمادہ نہیں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امرؤالقیس کو طلب کیا اور اس سے اس سلسلے میں پوچھا تو اس نے جواب میں کچھ ماننے سے انکار کردیا۔ رسول اللہ نے اس سے کہا کہ اپنی سچائی کے لیے

قسم کھاؤ، لیکن مدعی نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ شخص کسی اصول کا پابند نہیں لہٰذا اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں یہ تو جھوٹی قسم کھا لے گا۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: بہرحال اس کے علاوہ کوئی چارا نہیں یا تو اپنے گواہ پیش کرو یا اس کی قسم تسلیم کرو۔

امرؤالقیس قسم کھانے کے لیے اٹھا تو رسول اللہؐ نے اُسے روک دیا اور مہلت دی (اور فرمایا: اس بارے میں سوچ سمجھ لو پھر قسم اٹھانا)

وہ دونوں چلے گئے اسی دوران میں زیرِ نظر پہلی اور دوسری آیت نازل ہوئی (جس میں جھوٹی قسم کے انجام سے خبردار کیا گیا) رسول اللہؐ نے یہ دونوں آیتیں ان کے سامنے پڑھیں تو امرؤالقیس کہنے لگا: حق ہے، جو کچھ میرے پاس ہے بالآخر فانی ہے اور یہ شخص سچ کہتا ہے۔ میں نے اس کی زمین کا کچھ حصّہ غصب کر رکھا ہے لیکن مجھے علم نہیں کہ وہ کتنا ہے؟ اب جبکہ یہ صورت ہے تو جتنا یہ چاہتا ہے (اور سمجھتا ہے کہ اس کا حق ہے) لے لے اور اس مقدار کے برابر مزید بھی لے لے چونکہ میں نے اتنی مدت اس کی زمین سے استفادہ کیا ہے

اس اثناء میں تیسری زیرِ نظر آیت بھی نازل ہوئی (جس میں ایمان کے ساتھ عمل صالح کرنے والوں کو "حیاتِ طیبہ" کی بشارت دی گئی ہے)۔

تفسیر

حیاتِ طیبہ کی بنیاد

گزشتہ آیات میں پیمان شکنی اور جھوٹی قسم کی قباحت کے بارے میں گفتگو تھی۔ اس کے تسلسل میں زیرِ بحث پہلی آیت میں اسی مطلب کی تاکید کی گئی ہے البتہ فرق یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں پیمان شکنی اور جھوٹی قسم کا سبب دشمن کی زیادہ تعداد سے مرعوب ہونا بیان کیا گیا تھا جبکہ یہاں بے قیمت مادی مفادات کے حصول کا مسئلہ درپیش ہے اسی لیے فرمایا گیا ہے: عہدِ الٰہی کا کبھی بھی کم قیمت پر سودا نہ کرو (ولا تشتروا بعهد الله ثمنًا قليلًا)۔

یعنی عہدِ الٰہی کی جو بھی قیمت لگاؤ وہ حقیر اور ناچیز ہے یہاں تک کہ اس کے بدلے تمھیں ساری دنیا بھی مل جائے تو ایفائے عہدِ الٰہی کے ایک لمحے کی بھی قیمت کے برابر نہیں ہے۔

اس کے بعد بطور دلیل مزید فرمایا گیا ہے: جو کچھ اللہ کے پاس ہے تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جان لو (انما عند الله هو خير لكم ان كنتم تعلمون)۔

اگلی آیت میں اس بہتری کی دلیل یوں بیان کی گئی ہے: جو کچھ تمھارے پاس ہے آخرکار فانی ہے اور نابود ہو جائے گا۔

اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی اور جاوداں ہے۔ (ما عندکم ینفد و ما عند اللہ باق)۔

مادی مفادات ظاہراً کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں پانی کے بلبلے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے جبکہ اللہ کی جزا اس کی ذات کی طرح جاوداں ہے اور ان سب سے برتر و بالا ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: جو لوگ ہمارے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے (خصوصاً قسموں اور عہد و پیمان کے معاملے میں) صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہم انھیں ان کے بہترین عمل کی جزا دیں گے (و لنجزین الذین صبروا اجرھم باحسن ما کانوا یعملون)۔

"احسن" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے تمام نیک اعمال ایک جیسے نہیں ہیں، بعض اچھے ہیں اور بعض بہت اچھے ہیں لیکن اللہ ان کے سارے اعمال کو زیادہ اچھے اعمال کے حساب میں رکھے گا اور انھیں زیادہ اچھے اعمال والی جزا دے گا اور یہ انتہائی عظمت کی بات ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کئی قسم کا مال و اسباب بیچنے کے لیے لاتا ہے بعض چیزیں بہت اعلیٰ ہیں کچھ اچھی ہیں اور کچھ درمیانی سی۔ لیکن خریدار سب چیزوں کو بہت بڑھیا والی کی قیمت پر خرید لیتا ہے۔

ضمناً "و لنجزین الذین صبروا ......" اس نکتے کی طرف اشارے سے خالی نہیں ہے کہ راہ اطاعت میں صبر و استقامت دکھانا، خصوصاً عہد و پیمان کا پابند ہونا، انسان کے بہترین اعمال میں سے ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

الصبر من الایمان کالرأس من الجسد و لا خیر فی جسد لا رأس معه و لا فی ایمان لا صبر معه

صبر و استقامت ایمان کے لیے ایسے ہے جیسے بدن کے لیے سر۔ بدن میں سر کے بغیر کوئی خوبی کی بات نہیں اور وہ سر کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح ایمان کی بھی صبر کے بغیر کوئی حیثیت نہیں۔[1]

اس کے بعد ایک ہمہ گیر قانون کے طور پر ایمان کے ساتھ اعمالِ صالح کی انجام دہی کا نتیجہ اس جہان کے لیے اور دوسرے جہان کے لیے بیان کیا گیا ہے چاہے کوئی بھی شخص کسی حالت میں بھی ایمان کے ساتھ اعمالِ صالح بجا لائے قرآن اس کے بارے میں کہتا ہے: مرد ہو یا عورت، جو کوئی بھی حالتِ ایمان میں نیک عمل انجام دے ہم انھیں بہترین اعمال کی جزا دیں گے۔ (من عمل صالحا من ذکر او انثی وھو مؤمن فلنحیینه حیوة طیبة ولنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون)۔

گویا معیار صرف ایمان اور اس کے نتیجے میں انجام دیئے جانے والے نیک اعمال ہیں اس کے علاوہ کوئی شرط نہیں

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار ص ۸۲

نہ سن و سال کا مسئلہ ہے، نہ قوم و قبیلے کا نہ جنس و صنف کا اور نہ معاشرے میں مقام و مرتبے کا وہ عمل صالح جو ایمان کی پیداوار ہو، اس جہان میں اس کا نتیجہ "حیاتِ طیبہ" ہے۔ یعنی اس سے ایسا معاشرہ وجود پاتا ہے جس میں آرام و سکون ہو امن و خوشحالی ہو، صلح و آشتی ہو اور تعاون و محبت ہو۔ ایسا معاشرہ جو انسان ساز اور اصلاحی مفاہیم کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں معاشرے سے ایسی بدحالی اور ایسے مصائب اور رنج و محن ختم ہوجاتے ہیں کہ جو استکبار، ظلم، طغیان، خود غرضی اور ہوس پرستی کی پیداوار ہوتے ہیں اور جن کے باعث آسمانِ حیات تیرہ و تار ہوجاتا ہے ——— ایمان اور عملِ صالح کی بنیاد پر وجود میں آنے والا معاشرہ ان سب مشکلات اور قباحتوں سے پاک ہوجاتا ہے۔ ایک طرف تو امن و خوشحالی کا یہ دور دورہ ہوتا ہے اور دوسری طرف خدا انھیں "ان کے بہترین اعمال کے مطابق جزا و ثواب دے گا"۔ اور اس کی تفسیر گزشتہ آیات میں گزر چکی ہے۔

چند اہم نکات:

۱۔ سرمایۂ جاوداں: اس مادی دنیا کے مزاج میں فنا ہونا موجود ہے۔ مضبوط ترین عمارتیں، طویل حکومتیں، نہایت قوی انسان اور ان سے بھی مضبوط ہر چیز نے آخر کار کہنہ، فرسودہ اور نابود ہونا ہے۔ بلااستثناء ہر چیز کے لیے زوال ہے لیکن ان موجودات کا رشتہ اگر کسی طرح خدا کی ذات پاک سے قائم ہوجائے اور انھیں اس کے لیے اس کی راہ پر ڈال دیا جائے تو وہ جاودانی رنگ اختیار کرلیتی ہیں کیونکہ اس کی ذاتِ پاک ابدی ہے۔ شہید حیاتِ جاوداں رکھتے ہیں۔ انبیاء، آئمہ حقیقی علماء اور مجاہدین راہِ خدا کی تاریخ جاودانی ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ اسی بناء پر زیر بحث آیات ہمیں خبردار کرتی ہیں کہ آؤ اور اپنے سرمایۂ وجود کو فنا ہونے سے بچاؤ اس سرمائے کو اس بنک میں محفوظ کرلو کہ جس میں جتنا بھی زمانہ گزر جائے کسی چیز کے ضائع ہونے کا احتمال نہیں۔ اپنے وسائل اور صلاحیتیں خدا کے لیے مخلوق خدا کے مفاد میں اور اس کی رضا کے حصول کے لیے استعمال میں لاؤ تاکہ وہ "عند اللہ" کا مصداق ہوجائیں اور "ما عند اللہ باق" کے تقاضے کے مطابق باقی رہیں۔

ایک حدیث میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

اذا مات ابن آدم انقطع امله الاعن ثلاث صدقة جارية علم ينتفع به وولد صالح يدعو له

فرزند آدم جب دنیا سے جاتا ہے تو تین چیزوں کے سوا ہر چیز سے اس کی اُمید کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور وہ تین چیزیں یہ ہیں،

۱۔ صدقاتِ جاریہ:۔ (لوگوں کی خدمت کی غرض سے اور راہِ خدا میں انجام دیئے جانے والے کاموں کے آثارِ خیر)۔

۲۔ وہ علم کہ جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

۲۔ اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہے[1]

یہ سب چیزیں جو اللہ کے لیے اور اس کی راہ میں ہیں اس لیے ابدیت کا رنگ رکھتی ہیں :

شتان ما بین عملین : عمل تذهب لذته و تبقی تبعته و عمل تذهب مؤونته و یبقی اجره۔

بہت فرق ہے اس عمل میں جس کی لذت ختم ہوجاتی ہے اور باز پرس باقی رہتی ہے اور اس عمل میں کہ جس کی سختی ختم ہوجاتی ہے اور اس کا اجر باقی رہ جاتا ہے[2]

۲۔ مرد اور عورت کی برابری :۔ اس میں شک نہیں کہ جسمانی اور روحانی اعتبار سے مرد اور عورت میں کئی لحاظ سے فرق ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی سماجی ذمہ داریاں اور مناصب مختلف ہیں اور بقول ے

ہر کسے را بہر کارے ساختند

ہر کسی کو ایک خاص کام کے لیے بنایا گیا ہے۔

ہر کسی کا اپنا الگ کام ہے لیکن ان میں سے کوئی فرق بھی ان کے مقامِ انسانیت یا بارگاہِ خداوندی میں ان کے مقام کے جدا ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اور اس لحاظ سے دونوں مکمل طور پر برابر ہیں۔ اسی بناء پر جس معیار کی بناء پر ان کے معنوی روحانی مرتبے کا تعین کیا جاتا ہے وہ ایک سے زیادہ نہیں اور وہ ہے ایمان، عملِ صالح اور تقویٰ کہ جن میں دونوں یکساں طور پر اپنا مقام پیدا کرسکتے ہیں۔

زیرِ نظر آیات میں یہ حقیقت صراحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ عورت کے مقام و مرتبے کے بارے میں بیہودہ گو لوگ گزشتہ زمانے میں جو شک رکھتے تھے یا موجودہ زمانے میں رکھتے ہیں یا جو عورت کے لیے مرد سے کم تر انسانی مقام کے قائل تھے۔ ان آیات میں ان کا منہ بند کردیا گیا ہے اور ضمناً اس اہم معاشرتی مسئلے کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر واضح کردیا گیا ہے یہ آیات ثابت کرتی ہیں کہ کوتاہ فکر لوگوں کی سوچ کے برخلاف دینِ اسلام مرد کے تفوق کا دین نہیں بلکہ جس قدر اس کا تعلق مردوں سے ہے اسی قدر عورتوں سے بھی ہے۔ مرد اور عورت ـــــــ دونوں صنفیں اعمالِ صالح کی طرف گامزن ہوں اور ان کا قدم مثبت، تعمیری اور اصلاحی ہو اور جذبہ ایمانی سے سرشار ہو تو دونوں یکساں طور پر "حیاتِ طیبہ" کے حامل ہوں گے اور دونوں بارگاہِ الٰہی میں مساوی اجر و ثواب سے بہرہ مند ہوں گے۔ اور ان کی اجتماعی حیثیت بھی یکساں ہوگی۔ ہاں البتہ جو ایمان اور عملِ صالح کو معیار قرار دیئے بغیر برتری کی تمنا کرے گا اس کے لیے حیاتِ طیبہ نہیں ہوگی۔

۳۔ عملِ صالح کی جڑ سرچشمۂ ایمان سے سیراب ہوتی ہے : "عملِ صالح" کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ تمام

---

[1] ارشاد دیلمی۔

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار صفحہ ۱۲۱۔

مثبت، مفید، تعمیری اور اصلاحی کام اور پروگرام اس میں شامل ہیں، چاہے وہ علمی ہوں یا ثقافتی، اقتصادی ہوں یا سیاسی اور چاہے وہ فوجی ہوں۔ ایک سائنس دان کہ جس نے انسانوں کے فائدے کے لیے، سالہا سال زحمت و مشقت جھیلی اور کوئی چیز ایجاد کی، وہ شہید کہ جس نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر معرکۂ حق و باطل میں شرکت کی اور اپنے خون کا آخری قطرہ تک نثار کر دیا، وہ با ایمان ماں — جس نے بچہ جننے سے لے کر اس کی پرورش تک تکلیف برداشت کی ہے، وہ علماء کرام جو اپنی بلند پایہ کتابیں لکھنے کے لیے زحمتیں اور مشقتیں جھیلتے ہیں، سب کے کام عملِ صالح کے مفہوم میں شامل ہیں۔

عظیم ترین کارناموں مثلاً انبیاء کی رسالت اور پیامبری سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے کام مثلاً راستے سے چھوٹا سا پتھر ہٹانے تک سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عملِ صالح کے ساتھ ایمان کی شرط کیوں لگائی گئی ہے جبکہ یہ ایمان کے بغیر بھی انجام پا سکتا ہے اور بہت سے مواقع پر ہم نے ایسا ہوتے بھی دیکھا ہے۔

اس سوال کے جواب میں ایک ہی نکتہ قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ اگر جذبۂ ایمان نہ ہو تو عموماً عمل آلودہ ہو جاتا ہے اور ایسا بہت کم ہی ہوتا ہے کہ ایمان کے بغیر انجام پانے والا عمل آلودہ نہ ہو لیکن اگر عملِ صالح کی جڑیں توحید پرستی اور ایمان باللہ کے چشمے سے سیراب ہوں تو بہت کم ممکن ہے کہ اس میں تکبر، ریاکاری، خود نمائی، مکروفریب اور احسان دھرنے کی سی آفات اور بلائیں اس پر اثر انداز ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً قرآن مجید عملِ صالح اور ایمان کو ایک دوسرے سے مربوط کر کے بیان کرتا ہے کیونکہ ان کا رشتہ نہ ٹوٹنے والا اور ایک عینی حقیقت ہے۔

ضروری ہے کہ ایک مثال کے ذریعے ہم اس مسئلے کو اور واضح کر دیں۔

فرض کیجئے دو افراد ہیں۔ ان میں سے ہر کوئی ایک ہسپتال بنا رہا ہے۔ ایک کے اندر جذبۂ الٰہی کارفرما ہے اور وہ خدمتِ خلقِ خدا کے لیے یہ کام کر رہا ہے لیکن دوسرے کا مقصد خود نمائی ہے اور وہ اس کے ذریعے معاشرے میں بلند مقام حاصل کرنا چاہتا ہے ہو سکتا ہے ہم سطحی نظر سے دیکھیں تو سوچیں کہ آخر دونوں ہسپتال ہی بنا رہے ہیں اور لوگوں کو تو ان کے عمل کا ایک جیسا فائدہ ہوگا۔ ٹھیک ہے کہ ایک کو اللہ کی طرف سے جزا و ثواب بھی ملے گا اور دوسرے کو نہیں ملے گا لیکن ظاہراً ان کے عمل میں کوئی فرق نہیں۔

لیکن —— جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ سوچ ایک سطحی مطالعے کا نتیجہ ہے۔ کچھ مزید غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ خود یہ دونوں عمل مختلف جہات سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں مثلاً پہلا شخص شہر کے ایسے محلے کو منتخب کرے گا کہ جس میں مستضعفین، غریب اور ضرورتمند لوگ زیادہ ہوں۔ بعض اوقات یہ محلہ گمنام سا ہوگا جہاں کوئی بڑی گزرگاہ نہیں پڑتی، اور وہ آمد و رفت کا راستہ نہیں ہے لیکن دوسرا شخص ایسا علاقہ تلاش کرے گا جو زیادہ لوگوں کی نگاہوں کے سامنے ہے چاہے وہاں ضرورت بہت ہی کم کیوں نہ ہو۔ پہلا شخص عمارت کی ساخت وغیرہ میں مستقبل بعید کو نظر میں رکھے گا اور ایسی بنیادیں رکھے گا جو صدیوں باقی رہیں لیکن دوسرا شخص عام طور پر یہ سوچے گا کہ عمارت جلد از جلد کھڑی ہو۔ اس کا افتتاح ہو اور وہ شور و غل مچا سکے۔ اور اس کا مقصد حاصل کر سکے۔ پہلا شخص اس کام کے باطن کو مضبوط کرنے کی کوشش کرے گا جبکہ دوسرا شخص

ظاہری ٹیپ ٹاپ کا خیال رکھے گا۔ اسی طرح علاج معالجے کی مختلف اقسام، ڈاکٹروں اور نرسوں کے انتخاب اور اس ہسپتال کی دیگر ضروریات کے انتخاب میں ان دونوں میں بہت زیادہ فرق ہوگا کیونکہ ان کے مقاصد عمل کا اثر ہر مقام پر ہوگا، بالفاظ دیگر عمل کو وہ اپنے رنگ میں پیش کریں گے۔

۴۔ "حیاتِ طیّبہ" کیا ہے؟ "حیات طیّبہ" (پاکیزہ زندگی) کی مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں:

بعض نے اسے حلال روزی کے معنی میں لیا ہے۔

بعض نے قناعت اور نصیب پر راضی رہنا مراد لیا ہے۔

بعض نے روزانہ کا رزق سمجھا ہے۔

بعض نے حلال روزی کے ساتھ بجالائی جانے والی عبادت کا مفہوم لیا ہے۔

اور بعض نے اطاعت حکم خدا کی توفیق وغیرہ کا مطلب لیا ہے۔

لیکن شاید یاددہانی کی ضرورت نہ ہو کہ حیاتِ طیّبہ کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ یہ سب مطالب اور ان کے علاوہ دوسری چیزیں بھی اس کے اندر سموئی ہوئی ہیں۔ پاکیزہ زندگی کہ جو ہر لحاظ سے آلودگی، ظلم، خیانت، عداوت، ذلت، پریشانی اور بدبختی سے پاک ہو ایسی زندگی کہ جس کے پاک وشفاف چشمے میں ایسی کوئی آلودگی نہ ہو کہ اس کا پانی انسان کے حلق کے لیے ناگوار ہو جائے۔

البتہ اس سے پہلے جو گفتگو آئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیات طیبہ اس دنیا کے لیے مربوط ہے اور جزائے احسن آخرت کے ساتھ۔ یہ بات جاذب نظر ہے کہ نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

وسئل عن قوله تعالیٰ:

"فلنحيينه حيوة طيبة"

فقال:

هي القناعة

آپؑ سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں پوچھا گیا

فلنحيينه حيوة طيبة

آپ نے فرمایا:

یہ قناعت ہے[1]

اس میں شک نہیں کہ اس تفسیر کا مطلب یہ نہیں کہ "حیات طیّبہ" کا مفہوم قناعت میں محدود ہے بلکہ اس میں ایک مصداق بیان کیا گیا ہے لیکن یہ بات واضح مصداق ہے کیونکہ اگر انسان کو ساری دنیا دے دی جائے لیکن اس سے قناعت کی روح لے لی جائے تو وہ ہمیشہ تکلیف و آزار اور رنج و پریشانی میں رہے گا اس کے برعکس اگر انسان میں جذبۂ قناعت

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار ۲۲۹۔

موجود ہو اور وہ حرص و طمع سے محفوظ ہو تو وہ ہمیشہ آسودہ خاطر اور خوش و خرّم رہے گا۔

اسی طرح بعض دیگر روایات میں بتایا گیا ہے کہ حیاتِ طیبہ یہ ہے کہ انسان اس پر راضی رہے، جو کچھ خدا نے دیا ہے۔

ان روایات کا مفہوم "قناعت" کے قریب قریب ہے۔ البتہ معانی کو ان مفاہیم میں ہرگز منحصر نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ رضا و قناعت کو بیان کرنے کا یہاں اصلی مقصد حرص و آزار اور طمع و ہوا پرستی کو ختم کرنا ہے کیونکہ یہی تجاوز، لوٹ کھسوٹ، جنگوں اور خوں ریزی کے عامل ہیں اور یہی بعض اوقات ذلّت و رسوائی کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔

۹۸۔ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○
۹۹۔ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○
۱۰۰۔ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ○

ترجمہ

۹۸۔ جب قرآن پڑھو تو دھتکارے ہوئے شیطان سے خدا کی پناہ مانگو۔
۹۹۔ کیونکہ جو اہلِ ایمان اپنے رب پر توکل کرنے والے ہیں، ان پر اس کا بس نہیں چلتا۔
۱۰۰۔ اس کا تسلط تو صرف ان لوگوں پر ہے جنھوں نے اسے اپنا سرپرست بنا لیا ہے۔ اور وہ کہ جو اس کے بارے میں شرک اختیار کرتے ہیں (اور حکمِ خدا کے بجائے اس کے حکم پر عمل درآمد ضروری سمجھتے ہیں)۔

تفسیر

قرآن اس طرح سے پڑھو

ہمیں یاد ہے کہ پہلی چند آیات میں اس نکتے کی طرف اشارہ ہوا تھا کہ قرآن میں ہر چیز کا بیان ہے "تبیانا لکل شیء" اور اس کے بعد عزاینِ الٰہی کا ایک نہایت اہم حصہ بیان ہوا ہے۔ زیرِ نظر آیات میں قرآن مجید سے استفادہ کرنے اور اس کی تلاوت کا طریقہ بیان کرتی ہیں کیونکہ یہی کافی نہیں کہ مضامین قرآن پُرثمر ہوں بلکہ ضروری ہے کہ ہمارے وجود اور ہماری فکر و روح کے اردگرد موجود رکاوٹیں بھی دور ہوں تاکہ اُن پُرثمر مضامین تک رسائی ممکن ہو سکے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جس وقت قرآن پڑھو، دھتکارے ہوئے شیطان کے شر سے خدا کی پناہ مانگو (فاذا قرأت القراٰن فاستعذ باللّٰه من الشیطٰن الرجیم)۔

البتہ اس سے صرف یہ مراد نہیں کہ "اعوذ باللّٰه من الشیطان الرجیم" پڑھ لیا جائے بلکہ اس مفہوم کو اپنے اخلاق اور مزاج میں شامل کرنا شرط ہے یعنی اس جملے کا ذکر انسان کے اندر ایک حالت پیدا ہونے کا مقدمہ بننا چاہیے ——

خدا کی طرف توجہ کی حالت، سرکش ہوا و ہوس کہ جو صحیح فہم و ادراک سے مانع ہے، سے جدائی کی حالت اور تعصب، غرور اور خود پرستی سے لاتعلقی کی حالت کیونکہ یہ چیزیں انسان سے تقاضا کرتی ہیں کہ ہر چیز سے یہاں تک کہ کلام الٰہی سے بھی اپنی انحرافی خواہشات کے لیے فائدہ اٹھائے جب تک انسان کی روح میں ایسی حالت پیدا نہ ہو جائے، حقائق قرآن کا ادراک اس کے لیے ممکن نہیں ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی شرک آلود خواہشات کی توجیہ کے لیے اس کی تفسیر بالرائے کرنے لگے۔

اگلی آیت درحقیقت پہلی آیت میں کہی گئی بات کی دلیل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے شیطان کا ان لوگوں پر بس نہیں چلتا کہ جو اہل ایمان ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں (انه لیس له سلطٰن علی الذین اٰمنوا وعلی ربهم یتوکلون)۔

اس کا تسلط تو صرف ان لوگوں پر ہے جنھوں نے اسے اپنی رہبری اور سرپرستی کے لیے منتخب کر رکھا ہے (انما سلطٰنه علی الذین یتولونه)۔ اور وہ لوگ کہ جنھوں نے اطاعت و بندگی میں اسے خدا کا شریک بنا رکھا ہے (والذین هم به مشرکون)۔ وہ لوگ کہ جو حکم خدا کی بجائے حکم شیطان کو عمل در آمد کے لائق سمجھتے ہیں۔

چند اہم نکات:

۱۔ شناخت کی رکاوٹیں: حقیقت کا چہرہ کتنا ہی آشکار، درخشاں اور واضح کیوں نہ ہو جب تک نگاہ بینا کے سامنے نہ ہو اس کا ادراک ممکن نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں حقائق کی شناخت کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک چہرۂ حق کا آشکار اور واضح ہونا اور دوسرا نظر اور قوتِ ادراک کا ہونا۔

کیا کبھی کوئی نابینا سورج کو دیکھ سکتا ہے؟ کیا بہرہ شخص عالمِ امکان کے دل نواز نغمے سن سکتا ہے؟ اسی طرح جو لوگ نگاہِ حق بیں نہیں رکھتے وہ چہرۂ حقیقت دیکھنے سے محروم ہیں۔ اور جو حق بات سننے والے کان نہیں رکھتے، وہ آیات نہیں سن سکتے۔

وہ کون سی رکاوٹ ہے کہ جس کے باعث انسان قوتِ شناخت کھو بیٹھتا ہے؟

اس میں شک نہیں کہ پہلے سے کیے ہوئے غلط فیصلے، نفسانی ہوا و ہوس، اندھے انتہائی تعصبات، خود غرضی اور غرور حقیقت شناسی کے لیے سب سے پہلے درجے پر رکاوٹ بنتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ ہر چیز جو انسان کے دل کی صفائی اور روح کی پاکیزگی کو درہم برہم کر دے اور انسان کے باطن کو تیرہ و تار کر دے، ادراکِ حقیقت میں مانع ہے۔

جمال یار ندارد حجاب و پردہ ولی

غبار رہ بنشاں تا نظر توانی کرد

جمالِ یار پر تو کوئی پردہ اور حجاب نہیں ہے لیکن اگر تو نظارۂ رخِ یار کرنا چاہتا ہے تو راستے میں جو غبار حائل ہے پہلے اسے بٹھا دے۔

تا نفس مبرا ز نواہی نشود
دل آئینہ نور الٰہی نشود

جب تک نفس نواہی اور نافرمانی سے پاک نہ ہو جائے دل نور الٰہی کا آئینہ نہیں بن سکتا۔

ایک حدیث میں ہے:

لولا ان الشیاطین یحومون حول قلوب بنی ادم لنظروا الی ملکوت السمٰوت

اگر اولادِ آدم کے دلوں کے گرد شیطان محوِ گردش نہ ہوتے تو انسان ملکوتِ آسمانی کو دیکھ سکتے۔

یہی وجہ ہے کہ راہِ حق کے مسافروں کے لیے پہلی شرط تہذیبِ نفس اور تقویٰ ہے اس کے بغیر انسان وہم کی تاریکیوں اور بے راہ رویوں میں سرگرداں رہتا ہے۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کہتا ہے:

ھدًی للمتقین

یہ آیاتِ الٰہی پرہیز گاروں کے لیے ہدایت ہیں۔

یہ بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

ہم نے بہت دیکھا ہے کہ جو لوگ تعصب، ہٹ دھرمی اور پہلے سے کیے گئے انفرادی یا گروہی فیصلوں کے ساتھ آیاتِ قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں وہ قرآن سے ادراک حقیقت کی بجائے اپنی خواہشوں کو ان پر ٹھونس دیتے ہیں بالفاظِ دیگر ــــــ جو کچھ وہ چاہتے قرآن میں تلاش کرتے ہیں، وہ کچھ نہیں ڈھونڈتے جو اللہ نے بیان کیا ہے اس طرح بجائے اس کے کہ قرآن ان کی ہدایت کا سبب بنے ان کے انحراف میں اضافہ ہو جاتا ہے البتہ قرآن ایسا نہیں کرتا بلکہ ان کی سرکش ہوا و ہوس اس کا سبب بنتی ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے:

فاما الذین اٰمنوا فزادتھم ایمانًا و ھم یستبشرون واما الذین فی قلوبھم مرض فزادتھم رجسًا الی رجسھم وماتوا و ھم کافرون

جو لوگ ایمان لائے ہیں آیاتِ قرآنی ان کے ایمان میں اضافہ کرتی ہیں اور وہ مسرور ہوتے ہیں جبکہ جن کے دلوں میں بیماری ہے ان کی ناپاکی میں اور ناپاکی کا اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ دنیا سے حالتِ کفر میں جاتے ہیں۔

(توبہ ـــــ ۱۲۴، ۱۲۵)

لہذا بالصراحت کہنا چاہیے کہ زیر بحث آیت کا یہ مقصد نہیں کہ صرف "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" پڑھ لیا جائے اور بس ــــــــ بلکہ ضروری ہے کہ یہ ذکر فکر میں بدل جائے اور فکر احساس میں ڈھل جائے اور ہر آیت پڑھتے ہوئے خدا سے پناہ مانگیں کہ کہیں کوئی شیطانی وسوسہ ہمارے اور حیات بخش کلام الٰہی میں حائل نہ ہو جائے۔

۲۔ شیطان کو یہاں "رجیم" کیوں کہا گیا ہے؟ "رجیم" "رجم" کے مادہ سے دھتکارے ہوئے کے معنی میں ہے اور اصل میں یہ لفظ پتھر مارنے کے معنی میں ہے بعد ازاں دھتکارے ہوئے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔

یہاں شیطان کی تمام صفات میں سے اس کے دھتکارا ہوا ہونے کا ذکر کیا گیا ہے یہ ذکر ہمیں یاد دلاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے جب شیطان کو دعوت دی کہ وہ آدم کے سامنے سجدہ کرے تو اس نے تکبر کیا اس کا یہ تکبر سبب بنا کہ ادراکِ حقائق اور اس کے درمیان پردہ حائل ہو گیا یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو آدم سے برتر خیال کرنے لگا اور کہنے لگا کہ:

میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے اور اسے مٹی سے پیدا کیا ہے۔

یہاں تک کہ اس سرکشی اور غرور کے باعث اس نے فرمانِ خدا پر اعتراض کر دیا ایسا اعتراض کہ جو اس کے کفر اور راندۂ درگاہ ہونے کا باعث بنا۔

یہاں "رجیم" کی تعبیر استعمال کر کے قرآن گویا یہ حقیقت سمجھانا چاہتا ہے کہ تلاوتِ قرآن کے وقت غرور و تکبر اور تعصب کو اپنے آپ سے دور رکھو تاکہ کہیں شیطانِ رجیم جیسا حال نہ ہو جائے اور کہیں ادراکِ حقیقت کی بجائے کفر و بے ایمانی کے گڑھے میں نہ جا گرو۔

۳۔ گروہِ حق اور گروہِ شیطان: زیر بحث آیات میں لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک گروہ شیطان کے زیر تسلط ہے اور دوسرا اس کے تسلط سے خارج ہے ان دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کی دو دو صفات بیان کی گئی ہیں۔

جو لوگ شیطان کے تسلط سے باہر ہیں وہ باایمان ہیں اور توکل علی اللہ کے حامل ہیں یعنی عقیدے کے لحاظ سے صرف خدا پرست ہیں اور عمل کے لحاظ سے ہر چیز کے بارے میں خدا پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں۔ ان کا سہارا نہ کمزور انسان ہیں نہ ہوا و ہوس نہ تعصب اور نہ ہٹ دھرمی۔

لیکن جو شیطان کے کنٹرول میں ہیں اولاً اس کی رہبری پر اعتقاد رکھتے ہیں "یتولونہ"

ثانیاً عمل کے لحاظ سے اسے اطاعتِ خدا کا شریک سمجھتے ہیں یعنی عملی طور پر اس کے مطیعِ فرمان ہیں۔

البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو اپنے آپ کو پہلے گروہ میں شمار کروانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن تربیت کنندگانِ الٰہی سے دور ہونے، غلط ماحول میں رہنے یا دیگر وجوہات کے باعث دوسرے گروہ میں جا پڑتے ہیں۔

بہر حال زیر بحث آیات ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کی تاکید کرتی ہیں کہ انسانوں پر شیطان کا تسلط جبری اور بے اختیاری کی بناء پر نہیں بلکہ یہ انسان ہی ہے جو اسے اپنے اوپر تسلط کے حالات فراہم کرتا ہے اور اس کے لیے دل کے دروازے کھول دیتا ہے۔

۴۔ تلاوتِ قرآن کے آداب : ہر کام کے لیے ایک طرزِ عمل کی ضرورت ہے خصوصاً قرآن جیسی عظیم کتاب سے فائدہ اٹھانے کے لیے کوئی انداز اور آداب درکار ہیں اسی بناء پر قرآنی آیات کی تلاوت اور ان سے استفادہ کرنے کے آدابِ شرائط خود قرآن میں بتائے گئے ہیں، مثلاً :

۱۔ لا یمسہ الا المطھرون

پاک لوگوں کے علاوہ کوئی قرآن کو نہیں چھوتا۔

ہوسکتا ہے یہ تعبیر ظاہری پاکیزگی کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی قرآن کے الفاظ اور سطروں کو طہارت اور وضو کے بغیر مَس نہ کیا جائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس طرف اشارہ ہو کہ ان آیات کے مضامین و مفاہیم کا ادراک صرف وہ لوگ کرسکتے ہیں جو اخلاقی برائیوں سے پاک ہوں کیونکہ بُری صفات انسان کی حقیقت بین نگاہوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں کہ جس کے باعث وہ جمالِ حق کے مشاہدے سے محروم ہوجاتا ہے۔

۲۔ آغازِ تلاوتِ قرآن کے وقت راندۂ درگاہِ حق شیطان سے خدا کی پناہ طلب کی جائے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا آیات میں ہے :۔

فاذا قرأت القراٰن فاستعذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ سے سوال کیا گیا کہ اس حکم پر کیسے عمل کیا جائے اور کیا کہا جائے، آپؑ نے فرمایا :

استعیذ بالسمیع العلیم من الشیطان الرجیم

میں شیطانِ مردود سے سمیع و علیم خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ امام علیہ السلام نے سورۂ الحمد کی تلاوت کے وقت فرمایا :

اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم، واعوذ باللہ ان یحضرون

میں شیطان مردود سے سمیع و علیم خدا کی پناہ مانگتا اور میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں اس امر کے بارے میں کہ وہ (شیطان) میرے پاس آئیں۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ پناہ طلبی فقط زبان اور الفاظ تک محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے روح کی گہرائیوں میں اُترنا چاہیے اور تلاوتِ قرآن کے وقت شیطانی عادات سے دُور اور الٰہی صفات کے قریب ہونا چاہیے تاکہ وہ رکاوٹیں انسان کی فکر سے دور ہوجائیں جو کلامِ حق کے سمجھنے میں حائل ہوجاتی ہیں اور حقیقت کے جمالِ دل آراء کو نظروں سے اوجھل کردیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ آغازِ تلاوت کے وقت بھی شیطان سے خدا کی پناہ طلب کرنا بھی ضروری ہے اور تلاوت کے دوران میں بھی مسلسل ــــــ اگرچہ زبان سے نہ ہو۔

۳۔ تلاوت بصورت ترتیل کرنا چاہیے یعنی ٹھہر ٹھہر کر اور غور و فکر کے ساتھ۔ ارشادِ الٰہی ہے :

ورتل القراٰن ترتیلا (مزمل - ۴)

ایک اور حدیث میں ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

ان القرآن لایقرء ھذرمۃ ، ولکن یرتل ترتیلا ، اذا مررت بآیۃ فیھا ذکر النار وقفت عندھا ، تعوذت باللہ من النار

قرآن کو جلدی جلدی اور اس کے اعضاء شکستہ کرکے نہیں پڑھنا چاہیے بلکہ اس کی تلاوت سکون و اطمینان سے کرنا چاہیے۔ جب تم تلاوت کرتے ہوئے کسی ایسی آیت تک پہنچو کہ جس میں آتش جہنم کا ذکر ہو وہاں رک جاؤ (اور غور و فکر) اور جہنم کی آگ سے خدا کی پناہ مانگو۔

۴۔ ترتیل کے علاوہ قرآنی آیات میں تدبر و تفکر کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

افلا یتدبرون القرآن

کیا وہ قرآن میں سوچ بچار نہیں کرتے۔ (نساء — ۸۲)

ایک حدیث میں ہے کہ اصحاب رسولؐ آنحضرتؐ سے قرآن کی دس دس آیتیں سیکھتے تھے اور جب تک پہلی آیات میں جو علم و عمل ہوتا اسے جان نہ لیتے مزید دس آیات نہ سیکھتے۔[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اعربوا القرآن و التمسوا غرائبہ

قرآن کو فصیح طریقے سے اور واضح کرکے پڑھو اور اس کے حیران کن مفاہیم کو تلاش کرو۔[2]

نیز ایک حدیث امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

لقد تجلی اللہ لخلقہ فی کلامہ ولکنھم لایبصرون

خدا نے اپنے کلام میں اپنی ذات کی تجلی رکھی ہے لیکن دلوں کے اندھے نہیں دیکھتے۔[3]

یعنی ——— صرف آگاہ، روشن ضمیر اور غور و فکر کرنے والے اہل ایمان اس کے کلام میں اس کے جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

۵۔ جو لوگ آیات قرآن کو سنیں ان کا بھی ایک فریضہ ہے اور وہ یہ کہ خاموشی اختیار کریں ایسی خاموشی کہ جس میں وہ سنیں بھی اور غور و فکر بھی کریں۔ ارشاد الٰہی ہے:

واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ و انصتوا لعلکم ترحمون

جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔ تاکہ تم پر اللہ تعالیٰ کی

---

[1] بحار، جلد ۹۲ ص ۱۰۶۔

[2] بحار، جلد ۹۲ ص ۱۰۶۔

[3] بحار، جلد ۹۲ ص ۱۰۷۔

رحمت ہو۔ (اعراف ـــــــ ۲۰۴)

ان کے علاوہ بھی اسلامی روایات میں آدابِ قرآن کے بارے میں کئی احکام موجود ہیں مثلاً اسے اچھے لحن سے پڑھنا کیونکہ اچھی آواز بھی یقینی طور پر اس کے مفاہیم کے بارے میں ایک نفسیاتی تاثیر پیدا کرتی ہے۔ البتہ یہ موقع نہیں کہ ہم اس بات کی تفصیل میں جائیں [1]

---

[1] مزید معلومات کے لیے بحارالانوار جلد ۹ ص ۱۹۰ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۱۰۱۔ وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

۱۰۲۔ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ○

۱۰۳۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ○

۱۰۴۔ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

۱۰۵۔ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ○

ترجمہ

۱۰۱۔ اور جب (کسی حکم کو منسوخ کرتے ہوئے) ایک آیت کو دوسری آیت سے بدل دیتے ہیں تو اللہ بہتر جانتا ہے کہ کون سا حکم نازل کرے۔ وہ کہتے ہیں کہ تو جھوٹ بولتا ہے لیکن ان میں سے اکثر (حقیقت کو) نہیں سمجھتے۔

۱۰۲۔ کہہ دے: اسے رُوح القدس حق کے ساتھ تیرے پروردگار کی طرف سے لایا ہے تاکہ اہلِ ایمان کو ثابت قدم کردے اور یہ تمام مسلمانوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے۔

۱۰۳۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ آیات اسے ایک بشر سکھاتا ہے حالانکہ جس کی طرف وہ انھیں نسبت دیتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے جبکہ یہ (قرآن) واضح عربی زبان ہے۔

۱۰۴۔ جو لوگ آیاتِ الٰہی پر ایمان نہیں رکھتے اللہ انھیں ہدایت نہیں کرتا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

۱۰۵۔ جھوٹ صرف وہ لوگ بولتے ہیں جو آیاتِ الٰہی پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ واقعاً جھوٹے ہیں۔

شانِ نزول:

ابن عباس کہتے ہیں:

کبھی کوئی آیت نازل ہوتی اور اس میں کوئی سخت حکم ہوتا اور اس کے بعد کوئی آیت آتی کہ جس میں نسبتاً سہل حکم ہوتا تو بہانہ ساز مشرکین کہتے: محمد (ص) اپنے اصحاب سے مذاق کرتا ہے اور یہ اپنے پاس سے کرتا ہے آج ایک چیز کا حکم دیتا ہے اور اس سے منع کر دیتا ہے۔ یہ امور ظاہر کرتے ہیں کہ محمد (ص) سب کچھ اپنی طرف سے کہتا ہے نہ کہ خدا کی طرف سے۔

اس سلسلے میں پہلی آیت میں انھیں جواب دیا گیا ہے۔

تفسیر

رُسوا کُن جھُوٹ:

گذشتہ آیات میں قرآن اور اس سے استفادہ کرنے کے طریقے کے بارے میں بات تھی۔ زیر بحث آیات بھی قرآن سے مربوط کچھ مسائل بیان کر رہی ہیں۔ خصوصاً ان میں مشرکین کی طرف سے آیاتِ الٰہی پر کیے جانے والے اعتراضات کا ذکر ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت لے آتے ہیں یہ تغیّر و تبدّل حکمت و مصلحت کے تحت ہوتا ہے اور خدا بہتر جانتا ہے کہ اس کی حکمت کیا ہے اور کس طرح سے نازل کرنا چاہیے تو وہ کہتے ہیں کہ تو خدا پر جھوٹ باندھتا ہے لیکن ان میں سے اکثر حقیقتِ امر کو نہیں جانتے (واذا بدلنا اٰیة مکان اٰیة و الله اعلم بما ینزل قالوا انما انت مفتر بل اکثرهم لا یعلمون)۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بات کا ادراک ہی نہیں کہ قرآن کی ذمہ داری کیا ہے اور کیا پیغام رسانی اس کے ذمہ ہے وہ نہیں جانتے کہ قرآن ایک معاشرے کی تعمیر کے درپے ہے وہ ایک ایسا معاشرہ تعمیر کرنا چاہتا ہے جو ترقی یافتہ ہو آباد ہو، آزاد ہو اور بلند روحانی مقام رکھتا ہو ــــــــــ جی ہاں! ”اکثرهم لا یعلمون“ (ان میں سے اکثر نہیں جانتے)۔

واضح ہے کہ ان مقاصد کے لیے یہ خدائی نسخہ جو ان بیماروں کی جان بچانے کے لیے لکھا گیا ہے اس میں بعض اوقات تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے ہو سکتا ہے آج ایک نسخہ لکھا جائے کل اس کی کچھ اور تکمیل کی جائے اور آخر میں اصل نسخہ صادر ہو۔

جی ہاں! وہ ان حقائق سے بے خبر ہیں انھیں نزولِ قرآن کی شرائط و کوائف کی خبر نہیں ورنہ وہ جانتے کہ کچھ احکام و آیاتِ قرآن کی تبدیلی ایک دقیق اور سوچے سمجھے تربیتی پروگرام کا حصہ ہے۔ اس کے بغیر اصلی مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ ایسا کرنا کمال و ارتقاء کے حصول کے لیے ضروری ہے۔

اپنی اسی ناسمجھی کی بناء پر ان کا خیال تھا کہ یہ تبدیلی پیغمبر اکرمؐ کی تناقض گوئی اور اللہ پر افتراء باندھنے کی دلیل ہے۔ حالانکہ ایک ایسا معاشرہ جو بہت ہی پست ہو اور اسے بلند مراحل کی طرف لے جانا ہو اس کے لیے نسخ کی حکمتِ عملی ناگزیر ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی مرحلے میں تمام تر تبدیلی ممکن نہیں ہوتی۔ اور اسے مرحلہ بہ مرحلہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ کیا کسی دیرینہ بیماری کا علاج ایک ہی دن میں ہوسکتا ہے۔ ایک شخص کہ جو سالہا سال سے منشیات کا عادی ہو گیا اس کا ایک ہی دن میں علاج ممکن ہے؟ کیا اس کے لیے مرحلہ وار طریقِ کار اختیار نہیں کرنا پڑے گا؟ کیا مرحلہ وار پروگرام میں جو تبدیلی رونما ہوتی ہے نسخ و منسوخ اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟

(نسخ کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد اوّل میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۰۶ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں)۔

اگلی آیت میں اسی مسئلے پر گفتگو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے: کہہ دے: اسے روح القدس نے تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا ہے (قل نزلہ روح القدس من ربك بالحق)۔

"روح القدس" یا "روحِ مقدس" وحی الٰہی کا قاصد جبریل امین ہے۔ وہی ہے کہ جو حکمِ خدا سے آیاتِ الٰہی ناسخ ہوں یا منسوخ رسولؐ پر لے کر آتا ہے۔ وہ آیات جو سب کی سب حق ہیں اور سب ایک حقیقت کا سلسلہ ہیں ——— اور وہ حقیقت تربیتِ نوعِ انسانی کے علاوہ کچھ نہیں ——— وہ تربیت کہ جس کے لیے کبھی احکام میں ناسخ و منسوخ کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسی بناء پر اس کے بعد فرمایا گیا ہے: مقصد یہ ہے کہ اہلِ ایمان کو اپنے اپنے راستے میں زیادہ ثابت قدم کیا جائے اور یہ تمام مسلمانوں کے لیے ہدایت و بشارت ہے (لیثبت الذین اٰمنوا وھدی و بشری للمسلمین)۔

مفسرِ عالی قدر مؤلف المیزان کے بقول یہ آیت مومنین کے بارے میں کہتی ہے کہ مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے راستے میں ثابت قدم ہو جائیں لیکن مسلمانوں کے بارے میں کہتی ہے کہ مقصد، ہدایت و بشارت ہے۔ یہ فرق اسی فرق کی بناء پر ہے جو مومن اور مسلم میں موجود ہے کیونکہ ایمان کا تعلق دل سے ہے اور اسلام کا تعلق ظاہری عمل سے ہے۔

بہرحال قوتِ ایمان کو مضبوط کرنے اور راہِ ہدایت و بشارت کو طے کرنے کے لیے بعض اوقات چھوٹی مدت کے پروگراموں (SHORT-TERM PROGRAMMES) کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہوتا اور بعد میں ان کی جگہ آخری اور حتمی پروگرام لے لیتے ہیں آیاتِ الٰہی میں ناسخ و منسوخ کا یہی راز ہے۔

آیاتِ قرآن پر بہانہ ساز مشرکوں نے جو اعتراض کیا تھا یہ اس کا جواب تھا۔ اس کے بعد ان کے دوسرے اعتراض یا زیادہ واضح الفاظ میں پیغمبرِ اسلام پر مخالفین کے افتراء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: ہم جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ آیات اسے ایک انسان سکھاتا ہے (ولقد نعلم انھم یقولون انما یعلمہ بشر)۔

اس بارے میں کہ مشرکین کی مراد اس سے کون شخص تھا، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں:

ابن عباس سے منقول ہے وہ ایک مکّہ کا شخص تھا جس کا نام "بلعام" تھا وہ تلواریں بناتا تھا۔ بنیادی طور پر اس کا تعلق رُوم سے تھا اور وہ عیسائی تھا۔

بعض کا خیال ہے کہ قبیلۂ بنی حضرم کا ایک شخص تھا جس کا نام "یعیش" یا "عائش" تھا وہ اسلام لے آیا تھا اور اصحابِ رسول میں شمار ہوتا تھا۔

بعض دیگر سمجھتے ہیں کہ وہ دو عیسائی غلام تھے۔ جن کا نام "یسار" اور "جبر" تھا۔ ان کے پاس ان کی زبان میں ایک کتاب تھی جسے کبھی کبھی وہ بلند آواز سے پڑھتے تھے۔

بعض نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ اس سے مراد سلمان فارسیؓ ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں سلمان مدینہ میں بارگاہِ رسالتؐ میں پہنچے تھے اور وہاں پہنچ کر انھوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ سورۂ نحل کا زیادہ تر حصّہ مکّی ہے اور مشرکین کی ایسی تہمتوں کا تعلق بھی اسی دور سے ہے۔

بہرحال ان بے بنیاد باتوں پر قرآن نے خطِ بطلان کھینچ دیا ہے انھیں دندان شکن جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جس شخص کی طرف یہ اس قرآن کی نسبت دیتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے۔ حالانکہ یہ قرآن فصیح و واضح عربی میں نازل ہوا ہے۔

(لسان الذی یلحدون[1] الیه اعجمی[2] و هذا لسان عربی مبین)۔

اس تہمت سے اگر ان کی مراد یہ ہے کہ یہ الفاظِ قرآن رسول اللہ کو ایک ایسا انسان سکھاتا کہ جو عربی زبان سے بیگانہ تھا تو یہ انتہائی پست بات ہے ایسے شخص کی عبارات ایسی فصیح و بلیغ کیسے ہو سکتی ہیں کہ جن کے سامنے خود اہلِ زبان عاجز ہیں یہاں تک کہ اس جیسی ایک سُورت بھی نہیں بنا سکتے۔

اگر ان کی مراد یہ ہے کہ قرآن کے مضامین و مفہوم پیغمبرؐ نے ایک عجمی معلّم سے لیے ہیں تو بھی یہ سوال سامنے آئے گا کہ ان مضامین کو ایسے اعجاز آمیز الفاظ و عبارات میں کس شخص نے ڈھالا ہے جن کے سامنے دنیائے عرب کے تمام فصحاء نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں کیا یہ کام اس شخص کا ہو سکتا ہے جو عربی زبان سے ناواقف ہو یا پھر یہ اس ذات کا کام ہے کہ جس کی قدرت تمام انسانوں کی قدرت سے مافوق ہے یعنی اللہ۔

علاوہ ازیں فلسفے اور قوی منطق کے لحاظ سے، عقائد کے اعتبار سے اور اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے اس قرآن کے مضامین ایسے ہیں کہ جو انسان کے باطن اور روح کی پرورش کرتے ہیں۔ مختلف انسانی ضروریات کے حوالے سے اس کے

---

[1] "یلحدون" "الحاد" کے مادہ سے ہے یہ حق سے باطل کی طرف انحراف کے معنی میں ہے اور کبھی یہ ہر قسم کے انحراف کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے یہاں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ افتراء پرداز چاہتے تھے کہ قرآن کو ایک انسان کی طرف نسبت دیں اور اسے رسول اللہ کا استاد قرار دیں۔

[2] "اعجام" اور "عجمة" در اصل "ابہام" کے معنی میں ہے اور "عجمی" اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کے بیان میں نقص ہو چاہے وہ عرب ہو یا غیر عرب۔ عربوں کو چونکہ دوسروں کے بارے میں ناقص اطلاعات تھیں لہٰذا دوسروں کو "عجم" کہتے تھے۔

معاشرتی قوانین ایسے ہیں کہ جو انسانی افکار سے مافوق ہیں۔ یہ نشاندہی کرتے ہیں کہ افتراء پردازوں کو بھی اپنی بات پر یقین نہ تھا یہ صرف ان کا شیطانی ہتھکنڈا تھا وہ تو ایسی باتیں کر کے سادہ لوح افراد کو گمراہ کرنا چاہتے تھے اور ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنا چاہتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مشرکین عرب کو اپنے میں سے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا تھا جس کی طرف اس قرآن کی نسبت دے سکیں لہٰذا کوشش کرتے تھے کہ کوئی ایسا اجنبی شخص کہ جس کی زندگی وہاں کے لوگوں کے لیے مبہم ہو اس کی طرف ان مطالب کی نسبت دے دیں تاکہ ہو سکتا ہے چند دنوں تک وہ سادہ لوح لوگوں کو گمراہ رکھ سکیں۔

ان تمام چیزوں سے قطع نظر خود پیغمبر اکرمؐ کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو ایسا کوئی شخص نہیں ملتا حالانکہ اگر واقعاً ایسے افراد ہی اس قرآن کے اصلی موجد ہوتے تو پھر اس قسم کا رابطہ ان سے برقرار رہنا چاہیے تھا ——— لیکن جیسا کہ پرانی مثل ہے کہ:

الغریق یتشبث بکل حشیش

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔

وہ بھی اس قسم کے سہارے ڈھونڈتے تھے۔

نزولِ قرآن کا زمانہ اور عربوں کی جاہلیت کا دور تو معمولی بات ہے آج تمدنِ انسانی کے مختلف میدانوں میں اس قدر پیش رفت ہو چکی ہے بے پناہ کتابوں کے ذریعے انسانی معاشرے میں افکارِ انسانی پھیل چکے ہیں، مختلف نظام ہائے حیات اور قوانین معرض وجود میں آچکے ہیں مگر اس کے باوجود موازنہ کیا جائے تو ان سب پر قرآنی تعلیمات کی برتری پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے۔

یہاں تک کہ سید قطب نے تفسیر "فی ظلال القرآن" میں لکھا ہے کہ روسی مادہ پرستوں نے ۱۹۵۴ء میں قرآن پر اعتراض کرنے کی غرض سے مستشرقین کا ایک سیمینار منعقد کیا تو انھوں نے کہا،

> یہ کتاب ایک انسان ——— محمدؐ ——— کے دماغ کا نتیجہ نہیں ہو سکتی بلکہ یہ ایک بڑی جماعت کی کوشش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے یہاں تک کہ یہ یقین بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ساری کی ساری جزیرۃ العرب میں لکھی گئی ہے بلکہ یقینی طور پر اس کے کچھ حصے جزیرۃ العرب سے باہر لکھے گئے ہیں[1]

ان کی منطق کی بنیاد وجودِ خدا اور نزولِ وحی کا انکار تھی وہ ہر چیز کی مادی تفسیر تلاش کرتے تھے دوسری طرف وہ جزیرۃ العرب میں قرآن کو انسانی ذہن کی پیداوار نہیں سمجھ سکتے تھے مجبوراً انھوں نے ایک مضحکہ خیز بات کی اور اسے عرب اور عرب کے باہر کے بہت سے افراد کی پیداوار قرار دیا جبکہ یہ وہ چیز ہے تاریخ جس کا بالکل انکار کرتی ہے۔

---

[1] تفسیر "فی ظلال القرآن" جلد ۵ ص ۲۸۲۔

بہرحال اس آیت سے خوب واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن کا اعجاز صرف اس کے مضامین کے حوالے سے نہیں بلکہ الفاظِ قرآن بھی معجزہ ہیں۔ ان الفاظ کی خاص کشش، مٹھاس، ہم آہنگی اور جملوں کی بندش ایسی ہے کہ جو انسانی طاقت سے ماوراء ہے۔
(اعجاز قرآن کے سلسلے میں ہم جلد اول سورۂ بقرہ آیہ ۲۳ کے ذیل میں کافی بحث کر آئے ہیں)

اس کے بعد قرآن تنبیہ کے انداز میں یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ ان کے یہ الزامات اور انحرافات سب کے سب ان کی داخلی بے ایمانی کے سبب سے ہیں اور "جو لوگ آیاتِ الٰہی پر ایمان نہیں رکھتے خدا انھیں ہدایت نہیں کرتا (نہ صراطِ مستقیم کی ہدایت اور نہ جنت و سعادت جاوداں کے راستے کی ہدایت) اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے" (ان الذین لا یؤمنون بآیات اللہ لا یھدیھم اللہ ولھم عذاب الیم)۔ کیونکہ وہ اس طرح سے تعصب، ہٹ دھرمی اور حق دشمنی میں گرفتار ہیں کہ ہدایت کی اہلیت گنوا بیٹھے ہیں اور اب وہ عذابِ الیم کے علاوہ کسی چیز کی اہلیت نہیں رکھتے۔

زیر بحث آخری آیت میں مزید فرمایا گیا ہے اللہ والوں پر صرف وہ لوگ جھوٹ باندھتے ہیں کہ جو آیاتِ الٰہی پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ پکے جھوٹے ہیں (انما یفتری الکذب الذین لا یؤمنون بآیات اللہ و اولٰئک ھم الکاذبون)۔

اے محمد (ص)! جھوٹ وہ بولتے ہیں نہ کہ تو ـــــــ کیونکہ ان آیات، واضح نشانیوں اور دلیلوں کو کہ جن میں سے ہر ایک دوسری سے زیادہ آشکار ہے، دیکھنے کے باوجود وہ افتراء پردازی کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہوگا کہ انسان مردانِ حق پر تہمت باندھے اور اس طرح سے وہ حق کے پیاسے لوگوں اور ان کے درمیان دیوار کھڑی کردے۔

اسلام کی نگاہ میں جھوٹ کی قباحت:

زیر بحث آخری آیت قرآن کی لرزا دینے والی آیتوں میں سے ہے۔ یہ آیت جھوٹ کی قباحت کے بارے میں گفتگو کررہی ہے اس آیت نے جھوٹوں کو کافروں اور آیاتِ الٰہی کے منکروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے آیت اگرچہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر جھوٹ باندھنے کے بارے میں ہے تاہم جھوٹ کی قباحت اجمالاً اس سے مشخص ہوجاتی ہے اس پیشِ نظر ہم کچھ تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں کہ اسلام کی نگاہ میں جھوٹ کی قباحت کس قدر ہے۔

۱۔ راست گوئی اور امانت ایمان کی دلیل ہیں: راست گوئی اور امانت کی ادائیگی ایمان اور بلندیٔ کردار کی دو واضح نشانیاں ہیں یہاں تک کہ نماز سے بڑھ کر ایمان پر دلالت کرتی ہیں۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

لا تنظروا الی طول رکوع الرجل وسجودہ، فان ذٰلک شیٔ قد اعتادہ ولو ترکہ استوحش لذٰلک، ولٰکن انظروا الی صدق حدیثہ واداء امانتہ

لوگوں کے لمبے لمبے رکوع اور سجدے نہ دیکھو۔ ہوسکتا ہے اس کی انھیں عادت پڑگئی ہو۔

اس طرح سے کہ وہ انھیں چھوڑ دے تو پریشان ہوجائے۔ البتہ ان کے قول کی سچائی اور امانت کی ادائیگی کی طرف دیکھو[1]

راست گوئی اور ادائے امانت کا باہم ذکر اس بنا پر ہے کہ ان کی بنیاد ایک ہی ہے کیونکہ راست گوئی بات میں امانتداری کے علاوہ کچھ نہیں اور امانت بھی سچائی ہی ہے۔

۲۔ **جھوٹ سب گناہوں کی جڑ ہے :** اسلامی روایات میں جھوٹ کو "گناہوں کی چابی" کہا گیا ہے حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

الصدق یھدی الی البر، و البر یھدی الی الجنۃ

سچائی نیکی کی دعوت دیتی ہے اور نیکی جنت کی طرف ہدایت کرتی ہے[2]

ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں :

ان اللہ عز و جل جعل للشر اقفالا، وجعل مفاتیح تلک الاقفال الشراب، والکذب شر من الشراب

اللہ بزرگ و برتر نے برائی کے کچھ قفل قرار دیئے ہیں اور ان کی چابی شراب ہے (کیونکہ یہ عقل ہے کہ جو برائیوں سے روکتی ہے اور شراب عقل کو بیکار کردیتی ہے) :

اس کے بعد مزید فرمایا :

جھوٹ بولنا شراب نوشی سے بھی بدتر ہے[3]

امام عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں :

جعلت الخبائث کلھا فی بیت وجعل مفتاحھا الکذب

تمام خباثتیں ایک کمرے میں بند کردی گئی ہیں اور اس کمرے کی چابی جھوٹ ہے[4]

جھوٹ اور دوسرے گناہوں کا تعلق یہ ہے کہ گناہ گار شخص ہرگز سچا نہیں ہوسکتا کیونکہ سچائی اس کی رسوائی کا سبب ہے اور آثارِ گناہ چھپانے کے لیے اسے عموماً جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں جھوٹ انسان کو گناہ کی چھوٹ دیتا ہے اور سچائی گناہ پر پابندی لگاتی ہے۔

اتفاق سے یہ حقیقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ایک حدیث سے ظاہر ہوتی ہے۔ حدیث یوں ہے :

---

[1] سفینۃ البحار مادہ "صدق" منقول از کتاب کافی۔

[2] مشکوٰۃ الانوار طبرسی ص ۱۵۷۔

[3] اصول کافی جلد ۲ ص ۲۵۴۔

[4] جامع السعادات جلد ۲ ص ۲۲۳۔

ایک شخص رسول اللہ (ص) کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کی، میں نماز نہیں پڑھتا اور ایسے کام کرتا ہوں تو عفت و پاکدامنی کے منافی ہیں اور جھوٹ بھی بولتا ہوں۔ ان میں سے کس کو پہلے چھوڑوں؟

رسول اللہ (ص) نے فرمایا: جھوٹ کو۔

اس نے رسول اللہ (ص) کے سامنے عہد کیا کہ آیندہ ہرگز جھوٹ نہیں بولے گا۔

جب وہ آپ کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا تو اس کے دل میں شیطانی وسوسے پیدا ہوئے، اور غلط کاری پر ابھارنے لگے۔ فوراً اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر کل رسول اللہ نے اس سلسلے میں پوچھ لیا تو کیا کہوں گا۔ کیا یہ کہوں گا کہ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا اگر یہ کہا تو یہ جھوٹ ہوگا اور اگر سچ کہہ دیا تو اس پر حد جاری ہوگی۔ اسی طرح دوسرے غلط کاموں کے بارے میں اس کے دل میں یہ خیالات پیدا ہوتے رہے اس وجہ سے وہ گناہوں سے بچتا رہا۔ اس طرح سے جھوٹ ترک کرنا سارے گناہ ترک کرنے کی بنیاد بن گیا۔

۳۔ جھوٹ نفاق کی بنیاد ہے: جھوٹ نفاق کا سرچشمہ ہے کیونکہ راست گوئی کا مطلب ہے زبان و دل کی ہم آہنگی۔ لہٰذا جھوٹ ان دونوں کی باہم آہنگی اور نفاق ظاہر و باطن میں اختلاف کے سوا کچھ نہیں۔

سورۂ توبہ کی آیت ۷۷ میں ہے:

فاعقبهم نفاقاً فی قلوبهم الی یوم یلقونه بما اخلفوا الله ما وعدوه و بما کانوا یکذبون ۝

ان کے اعمال نے روز قیامت تک کے لیے ان کے دل میں نفاق پیدا کر دیا کیونکہ انھوں نے عہدِ الٰہی کو توڑا اور وہ جھوٹ بولتے تھے۔

۴۔ جھوٹ اور ایمان کا کوئی تعلق نہیں: یہ حقیقت نہ صرف اس آیت سے ظاہر ہوتی ہے بلکہ اسلامی احادیث میں بھی صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ جھوٹ اور ایمان ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔

ایک حدیث میں ہے:

سئل رسول الله (ص): یکون المؤمن جباناً؟

قال: نعم،

قیل: و یکون بخیلاً؟

قال: نعم

قیل: یکون کذاباً؟

قال: لا

رسول اللہ (ص) سے سوال کیا گیا: کیا ایک باایمان شخص (کبھی) بزدل ہو سکتا ہے ؟

فرمایا : ہاں

پھر پوچھا گیا: کیا وہ کبھی بخیل ہو سکتا ہے ؟

فرمایا : ہاں

پھر پوچھا گیا: کیا وہ کبھی جھوٹا ہو سکتا ہے ؟

فرمایا: نہیں [1]

کیونکہ جھوٹ نفاق کی نشانیوں میں سے ہے اور نفاق اور ایمان ایک ساتھ کبھی نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام سے منقول ہے:

لایجد العبد طعم الایمان حتی یترک الکذب هزله وجده

انسان کبھی بھی ایمان کا ذائقہ نہیں چکھ سکتا جب تک جھوٹ ترک نہ کرے چاہے مزاح میں ہو یا واقعی طور پر [2]

۵۔ جھوٹ سے اعتماد جاتا رہتا ہے: ہم جانتے ہیں کہ کسی معاشرے کا اہم ترین سرمایہ باہمی اعتماد اور عمومی اطمینان ہے جب کہ خیانت اور دھوکا بازی اس سرمایے کو تباہ کر دیتی ہے اسلامی تعلیمات میں سچائی کو اختیار کرنے اور جھوٹ کو چھوڑ دینے کے لیے ایک اہم دلیل یہی بیان کی گئی ہے۔

اسلامی احادیث میں ہے کہ ہادیانِ دین نے جن لوگوں سے شدت سے منع کیا ہے ان میں دروغ گو اور جھوٹے بھی ہیں کیونکہ وہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام اپنے کلماتِ قصار میں فرماتے ہیں:

ایاك و مصادقة الکذاب فانه کالسراب، یقرب علیك البعید، و یبعد علیك القریب

جھوٹے سے دوستی کرنے سے بچو کیونکہ وہ سراب کی مانند ہے بعید کو تجھے قریب کر دکھائے گا اور قریب کو دور کر دے گا [3]

جھوٹ کی قباحتوں کے بارے میں اور بھی بہت گفتگو کی جا سکتی ہے اس کے نفسیاتی علل و اسباب بھی ہیں اور اس کا مقابلہ کرنے کے طریقے بھی بہت ہیں یہ تفصیلات اخلاق کے بارے میں لکھی گئی کتب میں دیکھنا چاہیے [4]

---

[1] جامع السعادات، جلد ۲ ص ۳۲۲۔

[2] مشکوٰۃ الانوار ص ۱۵۶۔

[3] نہج البلاغہ کلماتِ قصار ص ۳۷۔

[4] ہماری کتاب "زندگی پہ تو اخلاق" کی طرف رجوع فرمائیں۔

۱۰۶۔ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَٰكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○

۱۰۷۔ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَأَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ○

۱۰۸۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ○

۱۰۹۔ لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ○

۱۱۰۔ ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوا ثُمَّ جَاهَدُوا وَصَبَرُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ○

۱۱۱۔ يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا وَتُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ○

ترجمہ

۱۰۶۔ جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو جائے مگر یہ کہ وہ مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو مگر جس نے آزادی سے کفر قبول کر لیا ہو عاصیوں پر اللہ کا غضب ہے اور عذابِ عظیم ان کے انتظار میں ہے۔

۱۰۷۔ یہ اس بناء پر ہے کہ انھوں نے (پست) دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے اور اللہ بے ایمان (اور ہٹ دھرم) افراد کو ہدایت نہیں کرتا۔

۱۰۸۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ (ان کے گناہوں کی کثرت کے باعث) اللہ نے ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مُہر لگا دی ہے (اس لیے وہ کچھ نہیں سمجھ سکتے) اور وہ واقعی غافل ہیں۔

۱۰۹۔ اور یقیناً آخرت میں وہ خسارے میں ہیں۔

۱۱۰۔ لیکن تیرا رب اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے دھوکا کھانے کے بعد (ایمان کی طرف پلٹ کر) ہجرت کی پھر راہِ خدا میں جہاد کیا اور استقامت دکھائی۔ یہ کام انجام پانے کے بعد تیرا رب غفور و رحیم ہے (اور اپنی رحمت ان کے شاملِ حال کرے گا)۔

۱۱۱۔ اس دن کا سوچو جب ہر شخص (اپنی فکر میں پڑا ہوگا اور) اپنے دفاع کے لیے کھڑا ہوگا اور ہر شخص کا نتیجۂ اعمال بے کم و کاست اسے دیا جائے گا اور اُن پر ظلم نہیں ہوگا۔

شانِ نزول:

بعض مفسرین نے پہلی آیت کی شانِ نزول کے بارے میں نقل کیا ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کے ایک خاص گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے وہ مشرکین کے چنگل میں گرفتار ہو گئے تھے کفار نے انھیں مجبور کیا کہ اسلام کے خلاف کفر و شرک کا اظہار کریں۔ یہ افراد عمار، ان کے والد یاسر، ان کی والدہ سمیہ، صہیب، بلال اور خباب تھے۔ عمار کے ماں باپ نے اس واقعے میں بڑی استقامت دکھائی اور ڈٹے رہے۔ انھیں قتل کر دیا گیا۔ عمار نوجوان تھے مشرکین جو چاہتے تھے انھوں نے کہہ دیا۔ یہ خبر مسلمانوں تک پہنچی تو بعض نے غائبانہ طور پر عمار کی مذمت کی اور کہا کہ عمار اسلام سے نکل گیا ہے اور کافر ہو گیا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

ان عماراً ملاء ایماناً من قرنه الی قدمه واختلط الایمان بلحمه ودمه

ایسا نہیں ہے (میں عمار کو خوب جانتا ہوں) عمار سر تا پا ایمان سے معمور ہے ایمان اس کے گوشت اور خون میں ملا ہوا ہے (وہ ہرگز ایمان کو ترک نہیں کرے گا اور مشرکین سے نہیں ملے گا)۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ عمار رسولِ خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے رسول اللہ نے فرمایا: کیا بات ہے؟

انھوں نے عرض کی بہت بُرا ہوا۔ انھوں نے اس وقت تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا جب تک میں نے آپ کے بارے میں جسارت نہیں کی اور ان کے بتوں کے بارے میں کلمۂ خیر نہیں کہا۔

رسول اللہؐ اپنے مبارک ہاتھوں سے عمار کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے: اگر دوبارہ تم ان کے ہاتھوں میں آجاؤ تو جو کچھ وہ کہیں کہہ دو (اور اپنی جان کو مشکل سے بچاؤ) اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

من کفر بالله من بعد ایمانه الا من اکره ......

اس آیت نے مسائل کو واضح کر دیا۔[1]

---

[1] تفسیر مجمع البیان۔

تفسیر

اسلام سے پھر جانے والے ـــــــــ (مُرتدین):

گزشتہ آیات مشرکین اور کفار کے طرزِ عمل کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں۔ ان آیات میں بھی وہی سلسلۂ کلام جاری ہے ان میں کفار کے ایک اور گروہ یعنی مرتدین اور اسلام سے پھر جانے والوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: جو لوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو جائیں سوائے ان کے جو دباؤ میں آکر اظہارِ کفر کریں، جبکہ ان کا دل ایمان پر ہو ـــــــ مگر جنھوں نے اپنا سینہ پھر سے کفر کے لیے کھول دیا ہے ان پر خدا کا غضب ہے اور عذابِ عظیم ان کے انتظار میں ہے (من کفر باللّٰہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدرًا فعلیھم غضب من اللّٰہ ولھم عذاب عظیم)۔

درحقیقت یہاں دو گروہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ایک وہ کہ جو دشمنوں کے چنگل میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ جو منطق کی زبان نہیں جانتے۔ اس ظلم اور دباؤ کی وجہ سے وہ اسلام سے بیزاری اور کفر سے وفاداری کا اظہار کر دیتے ہیں حالانکہ وہ یہ سب کچھ زبان سے کہتے ہیں اور ان کے دل ایمان سے مالامال ہوتے ہیں یہ لوگ یقیناً عفو و درگزر کے قابل ہیں بلکہ اصلاً ان سے کوئی گناہ ہی سرزد نہیں ہوا یہی وہ تقیہ ہے کہ جس کی اجازت دی گئی ہے جس کا مقصد جان کی حفاظت ہے تاکہ زیادہ طاقت جمع کر کے راہِ خدا میں زیادہ خدمت کی جا سکے۔ اسی تقیہ کو اسلام میں جائز قرار دیا گیا ہے۔

دوسرے وہ کہ جو سچ مچ اپنے دل کے دریچے کفر اور بے ایمانی کے لیے کھول دیتے ہیں اور اپنا عقیدہ بالکل بدل لیتے ہیں ایسے لوگ غضبِ الٰہی اور اس کے عذابِ عظیم میں گرفتار ہوں گے۔

ہو سکتا ہے یہاں "غضب" اس جہان میں رحمتِ الٰہی اور اس کی ہدایت سے محرومی کی طرف اشارہ ہو، اور "عذابِ عظیم" دوسرے جہان کی سزا اور عذاب کی طرف اشارہ ہو۔ بہرحال مرتدین کے بارے میں اس آیت میں جو تعبیر آئی ہے وہ بہت سخت اور ہلا دینے والی ہے۔

اگلی آیت میں ان کے مرتد ہونے کی وجہ بیان کی گئی ہے یہ اس لیے ہے کہ انھوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے لہٰذا انھوں نے پھر سے کفر کی راہ اختیار کر لی ہے (ذٰلک بانھم استحبوا الحیٰوۃ الدنیا علی الاخرۃ)۔ اور خدا (کفر و انکار پر اصرار کرنے والی) کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا (وان اللّٰہ لا یھدی القوم الکٰفرین)۔

مختصر یہ کہ جب وہ ایمان لائے تھے تو وقتی طور پر ان کے کچھ مادی مفادات خطرے میں پڑ گئے تھے اور چونکہ وہ دنیا سے لگاؤ رکھتے تھے لہٰذا اپنے ایمان پر پشیمان ہوئے اور پھر کفر کی طرف لوٹ گئے۔

اگلی آیت میں ان کی عدم ہدایت کی دلیل بیان کی گئی ہے: "وہ ایسے لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مُہر لگا دی ہے"۔ اس طرح سے کہ وہ حق کو دیکھنے، سننے اور سمجھنے سے محروم ہیں (اولٰئک الذین طبع اللہ علی قلوبھم وسمعھم وابصارھم)۔

اور واضح ہے کہ ایسے افراد معرفت کے سارے ذرائع گنوا بیٹھنے کی وجہ سے واقعاً غافل ہیں (واولٰئک ھم الغٰفلون)۔

ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں غلط اعمال اور طرح طرح کے گناہ انسان کی حِسّ ادراک اور نگاہِ معرفت پر بُرے اثرات مرتب کرتے ہیں اور ان کے باعث انسان کی سلیم فکری رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے اور انسان اس راہ پر جس قدر آگے بڑھتا ہے اس کے دل، کان اور آنکھ پر غفلت کے پردے دبیز تر ہوتے چلے جاتے ہیں آخر کار اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ آنکھ رکھتے ہوئے دیکھ نہیں پاتا، کان رکھتے ہوئے سُن نہیں پاتا اور اس کی روح کا دریچہ حقائق کے لیے بند ہو جاتا ہے حسِ ادراک اور قوتِ تمیز اس سے لے لی جاتی ہے حالانکہ یہ اللہ کی عظیم ترین نعمتیں ہیں۔

"طبع" یہاں پر "مہر لگانے" کے معنی میں آیا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بعض اوقات کسی صندوق کو مضبوطی سے بند کر کے اس پر خاص انداز سے مُہر لگا دیتے ہیں مقصد یہ ہوتا ہے کہ کوئی اس کے سامان کو نہ چھیڑے اور اگر کوئی اسے کھولے تو فوراً معلوم ہو جائے۔ اس لحاظ سے یہ تعبیر مطلقاً نفوذ ناپذیر کے لیے کنایہ ہے۔

اگلی آیت میں ان کے کام کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے کہ ناچار اور یقیناً آخرت میں وہ خسارے میں ہیں (لا جرم انھم فی الاٰخرۃ ھم الخٰسرون)۔

اس سے بڑھ کر خسارا کیا ہو گا کہ انسان ہدایت و سعادتِ جاوداں کے تمام ضروری وسائل اپنی ہوا و ہوس کی وجہ سے گنوا بیٹھے۔

پہلے دو گروہ بیان کیے گئے ہیں۔ ایک وہ کہ جو دشمن کے ظلم اور دباؤ کی وجہ سے تقیہ کے طور پر کفر آمیز باتیں کہہ دے جبکہ اس کا دل ایمان سے معمور ہو۔ اور دوسرا وہ کہ جو آزادی اور رغبت کے ساتھ کفر کی طرف پلٹ جائے۔ ان کے ساتھ ساتھ ایک تیسرا گروہ بھی ہے اور وہ ہے فریب خوردہ لوگوں کا گروہ۔ لہٰذا اگلی آیت میں ان کی کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: تیرا رب ان لوگوں کے بارے میں کہ جو دھوکا کھا کر ایمان سے پلٹ گئے ہیں لیکن بعد ازاں انھوں نے توبہ کر لی اور ہجرت، جہاد اور صبر و استقامت کے ذریعے اپنی توبہ کی سچائی کو ثابت کیا ——— جی ہاں! ان کے بارے میں تیرا رب غفور و رحیم ہے (ثم ان ربک للذین ھاجروا من بعد ما فتنوا ثم جاھدوا وصبروا ان ربک من بعدھا لغفور رحیم)[1]

---

[1] "بعدھا" کی ضمیر بہت سے مفسرین کے بقول لفظ "فتنہ" کی طرف لوٹتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ہجرت، جہاد اور صبر کی طرف لوٹتی ہے جن کا ذکر اس سے پہلے کی آیت میں آیا ہے۔

یہ آیت مُرتد کی توبہ قبول ہونے کے لیے واضح دلیل ہے لیکن جن افراد کے بارے میں یہ آیت بات کررہی ہے وہ پہلے مشرک تھے اور بعد میں مسلمان ہوئے تھے لہٰذا وہ "مرتد ملی" شمار ہوں گے نہ کہ "مرتد فطری"۔[1]

زیر بحث آخری آیت میں ایک عمومی تنبیہ کے طور پر اور بیداری کے لیے فرمایا گیا ہے: اس دن کا سوچو جب ہر شخص اپنی فکر میں غلطاں ہوگا اور اپنے ہی دفاع کے درپے ہوگا" تاکہ اپنے تئیں اس دردناک عذاب اور سزا سے بچا سکے (یوم تاتی کل نفس تجادل عن نفسھا)۔[2]

بعض اوقات گنہ گار عذاب سے بچنے کے لیے اپنے غلط اعمال کا سرے سے انکار ہی کردیتے ہیں اور کہتے ہیں:۔

واللہ ربنا ما کنا مشرکین

اس اللہ کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے ہم مُشرک نہ تھے (انعام ——— ۲۳)

جب وہ دیکھیں گے کہ اس مکروفریب اور دروغ سے کام نہیں بنتا تو کوشش کریں گے کہ اپنے گناہ اپنے گمراہ رہنماؤں کی گردن پر ڈال دیں۔ وہ کہیں گے:

ربنا ھٰؤلاء اضلونا فاٰتھم عذابًا ضعفًا من النار

پروردگارا! یہ تھے جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا ان کا عذاب دگنا کردے اور ہمارے عذاب کا حصّہ انھیں دے دے۔

(اعراف ——— ۳۸)

لیکن اس طرح سے ہاتھ پاؤں مارنا فضول ہے" اور وہاں ہر شخص کا نتیجۂ اعمال بے کم وکاست اسی کو دیا جائے گا (وتوفی کل نفس ما عملت)، اور کسی شخص پر ذرہ بھر ظلم نہیں ہوگا (وھم لا یظلمون)۔

چند اہم نکات:

۱۔ تقیہ اور اس کا فلسفہ: ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تربیت یافتہ حقیقی مسلمان دشمنوں کے مقابلے میں حیران کُن، تحمّل اور قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرتے تھے مثلاً جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے عمارؓ کے والد ایک جملہ بھی دشمن کی مرضی کا کہنے کو تیار نہ ہوئے ان کا دل ایمان باللہ اور عشقِ رسولؐ سے سرشار تھا اور انھوں نے اسی راہ میں اپنی جان نثار کردی جبکہ عمار زبان سے کچھ کہنے کے لیے تیار ہو گئے پھر وہ سرتاپا پریشانی اور ندامت میں غرق ہو گئے

---

[1] "مرتد فطری" اسے کہتے ہیں کہ جو مسلمان باپ یا ماں سے پیدا ہوا اور اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام سے پھر جائے لیکن "مرتد ملی" اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کے ماں باپ اس کے انعقاد نطفہ کے وقت مسلمان نہ ہوں لیکن بعد میں اس نے اسلام قبول کرلیا ہو اور پھر اس سے پھر جائے۔

[2] مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ "یوم" کس فعل سے تعلق رکھتا ہے بعض اسے فعلِ مقدر سے متعلق سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تقدیر میں "ذکرھم یوم تاتی" تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ گزشتہ آیت میں جو "غفور رحیم" آیا ہے یہ ان کے فعل "غفران" اور "رحمت" سے تعلق رکھتا ہے (لیکن ہم نے سطور بالا میں پہلے احتمال کو اس کی عملی جامعیت کی وجہ سے ترجیح دی ہے)۔

وہ اپنے آپ کو قصوروار سمجھتے تھے انھیں اس وقت تک قرار نہ آیا جب تک رسول اللہؐ نے اطمینان نہ دلا دیا کہ ان کا عمل جان بچانے کے لیے ایک تدبیر کے طور پر شرعاً جائز ہے۔

حضرت بلالؓ کے حالات میں ہے کہ جس وقت وہ اسلام لائے اور وہ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے دفاع کے لیے بڑی شجاعت سے اُٹھ کھڑے ہوئے تو مشرکین انھیں شدید اذیتیں دینے لگے یہاں تک کہ انھیں چلچلاتی دھوپ میں گھسیٹ کر لے جاتے اور بہت بڑا پتھر ان کے سینے پر رکھ دیتے اور ان سے مشرکانہ کلمات ادا کرنے کو کہتے مگر وہ ایسا نہ کرتے۔ مشرکین اتنا ستم ڈھاتے کہ ان کی سانس اکھڑ اکھڑ جاتی مگر وہ مسلسل " احد" "احد" (اللہ ایک ہی ہے، اللہ ایک ہی ہے) کہتے چلے جاتے اور اس کے بعد کہتے کہ بخدا اگر مجھے معلوم ہو کہ کوئی بات بھی اس سے بڑھ کر تمھیں ناگوار ہے تو میں وہی کہتا۔[1]

حبیب بن زید انصاریؓ کے حالات میں ہے کہ جب مسیلمہ کذاب نے انھیں گرفتار کر لیا تو ان سے پوچھا۔

"کیا تو گواہی دیتا ہے کہ محمدؐ اللہ کا رسول ہے؟

انھوں نے کہا: ہاں

پھر اس نے پوچھا: کیا تو یہ گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟

حبیب نے تمسخر سے کہا: مجھے تمھاری بات نہیں سنائی دے رہی۔

مسیلمہ اور اس کے پیروکاروں نے انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا مگر ان کے پائے استقامت میں کوئی لرزش نہ آئی اور وہ چٹان کی طرح ڈٹے رہے۔[2]

ایسے ہلا دینے والے واقعات تاریخِ اسلام میں خصوصاً صدرِ اوّل کے مسلمانوں اور آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام کے اصحاب و انصار میں بہت زیادہ ہیں۔

اسی بناء پر محققین نے کہا ہے کہ ایسے مواقع پر تقیہ اختیار نہ کرنا اور دشمن کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنا جائز ہے اگرچہ اس میں انسان کی جان کیوں نہ چلی جائے کیونکہ ہدف پرچمِ اسلام کی سربلندی اور اعلائے کلمۂ اسلام ہے خصوصاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے آغاز میں یہ امر خاص اہمیت رکھتا تھا۔

اس کے باوجود اس میں شک نہیں ہے کہ ایسے مواقع پر بھی تقیہ جائز ہے اور اس سے کم تر مواقع پر واجب ہے۔ تقیہ (خاص مواقع پر ہر جگہ نہیں) ناآگاہ افراد کے خیال کے برخلاف نہ تو کمزوری کی نشانی ہے نہ جمعیت دشمن سے خوف کی اور نہ ان کے دباؤ کے سامنے جھک جانے کی۔ بلکہ تقیہ ایک سوچی سمجھی تدبیر اور تکنیک ہے انسانی قوتوں کی حفاظت کی اور کم اہم مواقع پر اہلِ ایمان کی جان ضائع ہونے سے بچانے کی۔

---

[1] تفسیر فی ظلال جلد ۵ ص ۲۸۴۔

[2] تفسیر فی ظلال جلد ۵ ص ۲۸۴۔

ساری دنیا میں معمول ہے کہ حریت پسند اور مجاہد اقلیتیں خود سر اور ظالم اکثریتوں کا تختہ الٹنے کے لیے مخفی طریقے اختیار کرتی ہیں یہ لوگ زیر زمین افراد تیار کرتے ہیں جو خفیہ طور پر کام کرتے ہیں اور بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ دوسروں کے بھیس میں کام کرتے ہیں یہاں تک کہ گرفتار ہو جائیں تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کا اصلی کام مخفی رہے تاکہ ان کے گروہ کی قوتیں بیکار ضائع نہ ہو جائیں اور وہ جد و جہد جاری رکھ سکیں۔

کوئی عقل اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ایسے حالات میں وہ مجاہدین کہ جو تھوڑی سی تعداد میں ہیں اپنے آپ کو دشمن پر ظاہر کر کے تباہ ہو جائیں۔

اسی بناء پر تقیہ ایک اسلامی حکمتِ عملی سے پہلے ان تمام لوگوں کے لیے ایک عقلی اور منطقی طریقہ ہے کہ جو کسی طاقتور دشمن کا مقابلہ کر رہے ہیں یا کر رہے ہیں۔

اسلامی روایات میں بھی تقیہ کو ایک دفاعی ہتھیار اور ڈھال سے تشبیہ دی گئی ہے۔ چنانچہ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

التقية ترس المؤمن والتقية حرز المؤمن

تقیہ ــــــ مومن کی ڈھال اور اس کا دفاعی ہتھیار ہے[1]

(توجہ رہے کہ تقیہ کو یہاں سپر اور ڈھال سے تشبیہ دی گئی ہے جبکہ ڈھال وہ ہتھیار ہے کہ جسے صرف میدانِ جنگ میں دشمن سے مقابلہ کرتے ہوئے انقلابی قوتوں کی حفاظت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے)۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ احادیث میں تقیہ کو دین کی نشانی، ایمان کی علامت اور دین کے دس حصوں میں سے نو حصے شمار کیا گیا ہے اس کی وجہ یہی ہے۔

البتہ تقیہ ایک وسیع موضوع ہے یہاں اس کی تفصیلات کی گنجائش نہیں ہے ہمارا مقصد یہ تھا کہ اس بات کی وضاحت ہو جائے کہ جو لوگ تقیہ کی مذمت کرتے ہیں وہ درحقیقت اس کی شرائط اور فلسفے سے آگاہی نہیں رکھتے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض مواقع ایسے بھی ہیں جہاں تقیہ اختیار کرنا حرام ہے مثلاً جہاں تقیہ اسلامی قوتوں کی حفاظت کی بجائے مکتبِ دین کی نابودی یا اس کے لیے خطرے کا باعث ہو یا اس سے کسی بڑے فساد کی برائی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو ایسے مواقع پر تقیہ کا بند توڑ دینا چاہیے اور اس سے جو نتائج برآمد ہوں انھیں قبول کر لینا چاہیے[2]

۲۔ فطری و ملی مرتد اور فریب خوردہ لوگ: جن لوگوں نے اسلام قبول نہ کیا ہو ان کے بارے میں اسلام سخت گیری نہیں کرتا (ہماری مراد اہل کتاب سے ہے)۔ اسلام انھیں پیہم دعوت اور منطقی تبلیغ کے ذریعے اپنی طرف بلاتا ہے اگر وہ اسے قبول نہ کریں اور ذمیوں کی شرائط پر مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہیں تو اسلام نہ صرف انھیں

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۱ حدیث ۶ باب ۲۶، امر بالمعروف کے ابواب میں سے۔

[2] تقیہ کے بارے میں مکمل وضاحت، اس کے احکام، فلسفہ اور مختلف مدارک کے لیے ہماری کتاب "القواعد الفقهية" کی تیسری جلد کی طرف رجوع فرمائیں۔

امان دیتا ہے بلکہ ان کے مال و جان اور جائز مفادات کی حفاظت اپنے ذمے لیتا ہے۔

لیکن جو لوگ اسلام قبول کرلیں اور پھر اس سے پھر جائیں اسلام کا رویہ ان کے بارے میں نہایت سخت ہے کیونکہ یہ عمل اسلامی معاشرے کو متزلزل کرنے کا سبب بنتا ہے یہ عمل حکومت اسلامی اور اس کے طریقے کے خلاف ایک قسم کا قیام شمار ہوتا ہے اور اکثر اوقات یہ عمل بدنیتی کی دلیل ہوتا ہے اور سبب بنتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے راز دشمنوں کے ہاتھ جا لگیں۔

بہر حال مرتد فطری وہ ہے کہ جس کا حمل ٹھہرتے وقت اس کے ماں باپ میں سے کوئی مسلمان تھا یا آسان لفظوں میں جو مسلمان زادہ ہے اور پھر وہ اسلام سے پھر جائے اور اسلامی عدالت میں یہ امر ثابت ہو جائے تو اسلام اس کے خون کو مباح سمجھتا ہے اس کے اموال اس کے وارثوں میں تقسیم ہونے چاہییں۔ اس کی بیوی کے لیے حکم ہے کہ وہ اس سے الگ ہو جائے اور ظاہراً اس کی توبہ قابل قبول نہیں ہے یعنی یہ تینوں احکام ایسے شخص پر ہر حالت میں نافذ ہوں گے لیکن اگر وہ واقعی پشیمان ہوں تو بارگاہِ الٰہی میں اس کی توبہ قبول ہوگی (البتہ اگر عورت اس جرم کا ارتکاب کرے تو اس کی توبہ مطلقاً قبول کی جائے گی)۔

اسلام سے پھرنے والا اگر مسلمان زادہ نہ ہو تو اسے توبہ کا موقع دیا جائے گا اب اگر وہ توبہ کرلے وہ قابلِ قبول ہوگی اور اس کے لیے تمام سزائیں ختم ہو جائیں گی۔

جو لوگ اصل مفہوم سے آگاہ نہیں ہیں ہو سکتا ہے وہ مرتد فطری کے بارے میں اس سیاسی حکم کو سختی، عقیدے کا ٹھونسنا اور آزادی فکر سلب کرنا قرار دیں لیکن انھیں چاہیے کہ وہ اس حقیقت کی طرف غور کریں کہ یہ احکام اس شخص کے بارے میں نہیں ہیں جو باطنی طور پر یہ عقیدہ رکھتا ہے اور اس کا اظہار نہیں کرتا۔ یہ احکام تو صرف اس شخص کے بارے میں ہیں، جو اظہار کرے اور پراپیگنڈا کرے۔ یعنی دراصل وہ موجود حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے اس امر پر غور سے واضح ہو جائے گا کہ یہ سختی بلا وجہ نہیں ہے یہ مسئلہ آزادی فکر و نظر کے بھی منافی نہیں ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا بہت سے مشرقی اور مغربی ممالک میں اس سے ملتے جلتے قوانین موجود ہیں۔

اس سلسلے میں اسلام کی نظر اس نکتے پر بھی ہے کہ اسلام کو منطق اور دلیل کے ساتھ قبول کیا ہو۔ خاص طور پر جو شخص مسلمان باپ یا ماں سے پیدا ہوا ہو اور اس نے اسلامی ماحول میں پرورش پائی ہو اس کے لیے بہت بعید ہے کہ اس نے مفہوم اسلام کو نہ پہچانا ہو۔ لہٰذا ایسے شخص کا پھر جانا اشتباہ اور ادراک حقیقت نہ کرنے کی نسبت سازش اور خیانت سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے اور ایسا شخص ایسی ہی سزا کا مستحق ہے۔

ضمناً یاد رکھیں کہ احکام ایک یا دو افراد کے ہرگز تابع نہیں ہوتے اس کے لیے مجموعی اور کلی صورت حال کو نظر رکھنا چاہیے[1]

---

[1] "من کفر باللہ ...." اس جملے کی ترکیب کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا)

بعض اسے اس سے پہلے جملے کی تشریح و توضیح سمجھتے ہیں۔ بزبان اصطلاح یہ " الذین لا یؤمنون بآیات اللہ" کا بدل ہے۔

بعض اسے " کاذبون" کا بدل سمجھتے ہیں۔

بعض اسے محذوف الخبر مبتداء خیال کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اس کی تقدیر اس طرح تھی:۔

من کفر باللہ من بعد ایمانہ فعلیھم غضب من اللہ ولھم عذابٌ عظیم

اور حقیقت میں یہ جزائے شرط محذوف ہے کیونکہ بعد والا جملہ اس پر دلالت کرتا ہے۔

اس سلسلے کے بارے میں چوتھا احتمال بھی ہے کہ جو سب سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس مبتداء کی خبر وہی ہے کہ جو خود آیت میں آئی ہے اور محذوف نہیں ہے اور " لکن من شرح بالکفر صدرًا " مبتداء کی نئے سرے سے توضیح ہے، کیونکہ جملہ استثنائیہ نے مبتداء اور خبر کے درمیان فاصلہ ڈال دیا ہے۔ ایسی تعبیرات دوسری زبانوں کے ادب میں بھی نظر آتی ہیں مثلاً فارسی زبان میں ہم کہیں گے۔

"جو شخص ایمان لانے کے بعد کافر ہو جائے البتہ ان افراد کے استثنا کے ساتھ کہ جو دباؤ کی وجہ سے ایسا کریں اور ان کا دل ایمان سے معمور ہو ———— جی ہاں! ایسے لوگ کہ جو اسلام کے بعد کافر ہوں ان پر اللہ کا غضب ہوگا۔" (غور کیجیے گا)

۱۱۲۔ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ○

۱۱۳۔ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ○

۱۱۴۔ فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ○

ترجمہ

۱۱۲۔ (جو لوگ کفرانِ نعمت کرتے ہیں ان کے لیے) اللہ نے ایک آباد علاقے کی مثال بیان کی ہے کہ جہاں امن وامان اور سکون واطمینان تھا اور ہمیشہ ہر جگہ سے وہاں وافر رزق پہنچ جاتا تھا لیکن انھوں نے کفرانِ نعمت کیا اور اللہ نے ان کے اعمال کے باعث انھیں بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا۔

۱۱۳۔ خود انھی میں سے ایک رسول ان کے پاس آیا لیکن انھوں نے اس کی تکذیب کی اور عذابِ الٰہی نے انھیں آجکڑا کہ وہ ظالم تھے۔

۱۱۴۔ جب یہ صورتِ حال ہے تو اللہ نے جو کچھ روزی تمھیں دی ہے اس میں سے حلال وپاکیزہ کھاؤ اور نعمتِ خدا کا شکر ادا کرو، اگر اس کے عبادت گزار ہو۔

تفسیر

جنھوں نے کفرانِ نعمت کیا اور گرفتارِ عذاب ہوئے

ہم کئی بار کہہ چکے ہیں کہ یہ سورت نعمتوں کے ذکر سے معمور ہے اس میں مختلف قسم کی روحانی اور مادی نعمتوں کا تذکرہ ہے

اس کی مناسبت سے بعض دیگر مباحث بھی آگئے ہیں۔ زیرِ نظر آیات میں نعماتِ الٰہی کے کفران کا نتیجہ ایک عینی مثال کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ نعماتِ الٰہی کی ناشکری کرتے ہیں اللہ نے ان کے لیے ایک آبادی کی مثال بیان کی ہے کہ جو بڑے امن و سکون میں تھی۔ (ضرب اللہ مثلاً قریة کانت اٰمنة)۔

یہاں ایسا امن و امان تھا کہ سب باسی اطمینان سے رہتے سہتے تھے۔ انھیں یہاں سے چلے جانے کی کوئی مجبوری نہ تھی (مطمئنة)۔

امن و امان اور سکون و اطمینان کی نعمت کے علاوہ مختلف قسم کے جس رزق کی انھیں ضرورت تھی وہ وافر مقدار میں ہر جگہ سے پہنچ جاتا تھا (یأتیها رزقها رغداً من کل مکان)۔

لیکن آخر کار اس آبادی کے باسیوں نے نعماتِ الٰہی کا کفران کیا اور اللہ نے ان کے اعمال کی وجہ سے انھیں بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا (فکفرت بانعم اللہ فاذاقها اللہ لباس الجوع والخوف بما کانوا یصنعون)۔

وہ نہ صرف مادی نعمتوں سے مالا مال تھے بلکہ انھیں روحانی نعمتیں بھی میسر تھیں ایک فرستادۂ الٰہی ان میں موجود تھا اور انھیں آسمانی تعلیمات میسر تھیں۔ انھی میں سے ایک رسول ان کی طرف آیا، اس نے انھیں دینِ حق کی دعوت دی، اور اتمامِ حجت کیا لیکن انھوں نے اس کی تکذیب شروع کر دی" (ولقد جاءهم رسول منهم فکذبوه)۔

اس موقع پر عذابِ الٰہی نے انھیں گھیر لیا کہ وہ ظالم و ستمگر تھے (فاخذهم العذاب وهم ظلمون)۔

جب تم نے ایسے زندہ اور واضح نمونے دیکھ لیے ہیں تو پھر ان غافلوں، ظالموں اور کفرانِ نعمت کرنے والوں کی راہ اختیار نہ کرنا" اللہ نے تمھیں جو رزق دیا ہے اس میں سے حلال اور پاکیزہ کھاؤ اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو، اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو (فکلوا مما رزقکم اللہ حلالاً طیباً واشکروا نعمت اللہ ان کنتم ایاه تعبدون)۔

چند اہم نکات:

۱۔ یہ مثال ہے یا تاریخی واقعہ؟ زیرِ بحث آیات میں ایک آباد اور پُر نعمت جگہ کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس آبادی کے لوگ کفرانِ نعمت کی وجہ سے خوف، بھوک اور بُرے انجام کا شکار ہوئے اس لیے لفظ "مثلاً" استعمال کیا گیا ہے۔ نیز اس میں جو فعل ذکر کیے گئے ہیں وہ فعلِ ماضی کی صورت میں ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا واقعہ عملاً رونما ہوا ہے۔

اس سلسلے میں مفسرین نے بحث کی ہے کہ کیا یہاں ایک عمومی مثال بیان کرنا مقصود ہے یا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ جو عملاً خارجی حیثیت رکھتا ہے جو لوگ دوسرے احتمال کے حامی ہیں انھوں نے پھر اس مسئلے پر بھی گفتگو کی ہے

کہ یہ علاقہ کہاں تھا ؟

بعض کا خیال ہے کہ یہ سرزمین مکہ کی طرف اشارہ ہے اور شاید یہ کہنا کہ "یأتیھا رزقھا رغداً من کل مکان" (اس آبادی کے لیے روزی فراوانی کے ساتھ ہر جگہ سے آتی ہے) اس احتمال کی تقویت کا باعث بنا ہے کیونکہ یہ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس علاقے میں ضرورت کی چیزیں پیدا نہیں ہوتی تھیں باہر سے اس کی طرف لائی جاتی تھیں اس سے قطع نظر سورۂ قصص کی آیہ ۵۷ میں ہے :۔

یجبی الیہ ثمرات کل شیٍٔ

ہر طرح کے پھل اس کی طرف لائے جاتے تھے ۔

یقیناً یہ جملہ اس علاقہ سے مراد سرزمین مکہ ہونے سے بہت مناسبت رکھتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ تاریخی لحاظ سے واضح طور پر اس قسم کا کوئی ایسا واقعہ نہیں کہ جو مکہ میں رونما ہوا ہو کہ ایک دن وہاں بہت امن و سکون ہو اور دوسرے دن قحط و بدامنی نے اسے سختی سے گھیر لیا ہو ۔

بعض دوسرے مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ داستان بنی اسرائیل کے ایک گروہ سے مربوط ہے یہ لوگ ایک آباد علاقے میں زندگی بسر کرتے تھے اور کفرانِ نعمت کی وجہ سے قحط و بدامنی میں گرفتار ہو گئے تھے ۔ اس بات کی شاہد وہ حدیث ہے جو امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

"بنی اسرائیل کا ایک گروہ بہت خوشحال زندگی گزار رہا تھا یہاں تک کہ وہ لوگ غذا سے چھوٹے چھوٹے مجسمے بناتے تھے اور بعض اوقات اپنے بدن (کی نجاست) کو بھی ان سے صاف کر لیتے تھے لیکن انجام کار ان کا معاملہ یہاں تک پہنچا کہ وہ مجبور ہو گئے کہ غلاظت سے آلودہ اسی غذا کو کھائیں اور یہی وہ چیز ہے کہ جس کے بارے میں اللہ قرآن میں فرماتا ہے :

ضرب اللہ مثلاً قریۃ کانت اٰمنۃ مطمئنۃ ۔۔۔۔[1]

اس جیسے مضمون کی اور روایات بھی امام صادق علیہ السلام اور تفسیر علی بن ابراہیم سے نقل ہوئی ہیں کہ جن کے اسناد پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ورنہ مسئلہ واضح تھا ۔[2]

یہ احتمال بھی ہے کہ مذکورہ آیت قوم سبا کے واقعے کی طرف اشارہ ہو کہ جو یمن کی آباد سرزمین میں زندگی بسر کرتی تھی ۔ قرآن نے سورۂ سبا کی آیت ۱۵ تا ۱۹ میں ان کی زندگی کی داستان بیان کی ہے کہ وہ لوگ بہت سرسبز علاقے میں رہتے تھے وہاں پھلوں سے لدے ہوئے باغات تھے ہر طرف امن و امان تھا ۔ پاک و پاکیزہ زندگی تھی وہ غرور، سرکشی اور کفرانِ نعمت کا شکار ہوئے جس کے باعث ان کا علاقہ ویران ہو گیا ۔ اور وہ لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہو کر ساری دنیا کے لیے سامانِ عبرت

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۹۱ (توجہ رہے کہ مندرجہ بالا حدیث تفسیر عیاشی سے لی گئی ہے اور اس کی احادیث مرسل ہیں)۔

[2] ایضاً ۔

بن گئے۔

"یأتیھا رزقھا رغدا من کل مکان" لازمی طور پر اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ علاقہ خود سرسبز و شاداب نہیں تھا بلکہ ہو سکتا ہے "کل مکان" سے مراد اسی علاقے اور شہر کے اطراف ہوں اور ہم جانتے ہیں کہ ایک وسیع علاقے کی پیداوار شہر یا مرکزی بستی کی طرف منتقل ہوتی ہے۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ کوئی مانع نہیں کہ زیر بحث آیت ان سب کی طرف اشارہ ہو بہرحال تاریخ میں ایسے بہت سے علاقوں کا ذکر ہے کہ جو اس انجام سے دوچار ہوئے لہٰذا آیت کی تفسیر کے بارے میں کوئی اہم مشکل باقی نہیں رہتی اگرچہ کسی ایک علاقے کے تعین کے بارے میں عدم اطمینان کے باعث بعض مفسرین نے اسے ایک عمومی مثال قرار دیا ہے۔ لیکن زیر نظر آیات کا ظاہری مفہوم اس تفسیر سے مناسبت نہیں رکھتا بلکہ اس کی سب تعبیرات ایک حقیقی واقعے پر دلالت کرتی ہیں۔

۲۔ **امن اور رزقِ فراواں:** زیر نظر آیات میں اس آباد اور پر برکت علاقے کی تین خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے پہلی خصوصیت امن و امان ہے۔ اس کے بعد اطمینانِ حیات کا ذکر ہے اور تیسری خصوصیت یہ ہے کہ فراواں رزق اس کی طرف آتا ہے یہ تینوں خصوصیات آیت میں موجود ترتیب کے لحاظ سے طبیعی ترتیب اور علت و معلول کے سلسلے کی حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ جب تک امن و امان نہ ہو کوئی شخص کسی جگہ اطمینان سے زندگی نہیں گزار سکتا اور جب تک یہ دونوں نہ ہوں کوئی شخص پیداوار کے حصول اور اقتصادی امور میں لگاؤ سے کام نہیں کر سکتا۔ یہ بات ہم سب کے لیے اور ان لوگوں کے لیے ایک درس ہے جو چاہتے ہیں کہ ان کی سرزمین آباد اور ہر لحاظ سے آزاد ہو۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے امن و امان کی ضرورت ہے اس کے بعد علاقے کے لوگوں کو اپنے مستقبل کے لیے پُر امید ہونا چاہیے اور اس کے بعد اقتصادی فعالیت کی باری آتی ہے۔

لیکن یہ تینوں مادی نعمتیں اس وقت کمال کو پہنچتی ہیں جب ایمان و توحید جیسی نعمتوں سے ہم آہنگ ہوں اسی لیے مندرجہ بالا آیات میں ان تینوں نعمتوں کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے:

ولقد جاءھم رسول منھم

ایک رسول کہ جو انھی کی نوع میں سے تھا اسے ان کی ہدایت کے لیے مامور کیا گیا[1]

۳۔ **بھوک اور بدامنی کا لباس:** یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ زیر بحث آیات میں کفرانِ نعمت کرنے والوں کا انجام بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اللہ نے انھیں بھوک اور خوف کا لباس چکھایا۔

یعنی ایک طرف تو بھوک اور خوف کو لباس سے تشبیہ دی گئی ہے اور دوسری طرف پہنانے کی بجائے چکھانے کا

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۱۲ ص ۳۸۸۔

ذکر ہے۔ اس تعبیر نے مفسّرین کو زیادہ غور و خوض پر اُبھارا ہے۔

البتہ ہوسکتا ہے بعض تشبیہات کا ہماری زبان میں معمول نہ ہو اور ہمیں ان پر تعجب ہو جبکہ یہی تعبیرات کسی دوسری زبان میں کوئی لطیف نکتہ بیان کر رہی ہوں مثلاً لباس کا چکھنا۔

ابن راوندی کے بقول اس سے ابن اعرابی نے پوچھا: کیا لباس بھی چکھا جاتا ہے؟

ابن راوندی نے کہا: فرض کیا تمھیں پیغمبر اسلام کی نبوت میں شک ہے لیکن تم اس پر شک نہیں کر سکتے کہ وہ ایک (فصیح) عرب تھے[5]

بہرحال یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ قحط اور بدامنی نے انھیں اس طرح سے گھیر رکھا تھا کہ جیسے لباس نے جسم کو گھیرا ہوتا ہے اور بدن کے ساتھ چپٹا ہوتا ہے دوسری طرف یہ قحط اور خوف اس طرح سے ان پر مسلّط تھا کہ گویا اسے وہ اپنی زبان سے چکھ رہے تھے یہ بات قحط کی انتہائی شدت اور بدامنی کی دلیل ہے۔

درحقیقت جیسے ابتداء میں امن و خوشحالی نے ان کے سارے وجود کو سرشار کر رکھا تھا بعدازاں کفرانِ نعمت کے باعث اسی طرح فقر و فاقہ اور بدامنی نے ان کے وجودِ حیات کو گھیر لیا۔

۴۔ **نعماتِ الٰہی کا ضیاع اور کفرانِ نعمت:** جیسا کہ ہم نے مذکورہ بالا روایت میں پڑھا ہے کہ خوشحالی میں یہ قوم اس طرح سے غرور و غفلت میں گرفتار ہوئی کہ مفید اور محترم غذا کو اپنے بدن کی غلاظت دور کرنے کے لیے استعمال کرنے لگی اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انھیں قحط اور خوف میں مبتلا کر دیا۔

یہ بات ان تمام افراد اور قوموں کے لیے ایک تنبیہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ جو نعماتِ الٰہی میں مستغرق ہیں تاکہ وہ جان لیں کہ ہر قسم کا اسراف، حدِ اعتدال سے تجاوز اور نعمتوں کا ضیاع جرم ہے ایسا جرم کہ جو بہت ہی سنگین ہے، یہ ان سب کے لیے تنبیہ ہے کہ جو ہمیشہ اپنی اضافی غذا کو کوڑا کرکٹ کی نذر کر دیتے ہیں یہ ان لوگوں کے لیے بھی تنبیہ ہے کہ جو تین چار مہمانوں کے لیے ۲۰ افراد کی ضرورت کے مطابق رنگا رنگ کھانے تیار کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اس میں سے جو کھانا بچ جاتا ہے وہ غریب بھوکے انسانوں کے بھی کام نہیں آتا۔

یہ ان لوگوں کے لیے بھی تنبیہ ہے کہ جو غذائی اشیاء ذخیرہ کر رکھتے ہیں تاکہ بعد میں انھیں مہنگے داموں بیچیں یہاں تک کہ اشیاء خراب ہوجاتی ہیں لیکن وہ اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے کہ انھیں سستے داموں یا مفت دے دیں۔

جی ہاں! ان سب امور پر خدا کے ہاں عذاب اور سزا ہے اور کم از کم سزا یہ ہے کہ نعمتیں سلب ہو جاتی ہیں۔

اس مسئلے کی اہمیت اس وقت زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب ہم جان لیں کہ روئے زمین پر موجود غذا اور اناج محدود نہیں ہے دوسرے لفظوں میں زمین کی جو پیداوار ہے اس کے مطابق ضرورت مند اور بھوکے افراد بھی موجود ہیں اور اس میں جو بھی افراط و تفریط کی جائے گی اس کا نتیجہ اس کے مطابق لوگوں کی محرومی ہو گا۔

۵۔ تفسیر فخرالدین رازی جلد ۲۰ ص ۱۲۸۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی روایات میں اس مسئلے کی طرف سختی سے توجہ دلائی گئی ہے یہاں تک کہ امام صادق علیہ السلام مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ۔

میرے والد تولیے سے غذا آلودہ ہاتھ صاف کرنے پر ناراض ہوتے تھے وہ غذا آلودہ ہاتھ کو احترام غذا میں چاٹ لیتے تھے۔ کوئی بچہ ان کے پاس ہوتا اور کوئی چیز اس کے برتن میں باقی رہ جاتی تو اس کے برتن کو خود صاف کر لیتے یہاں تک کہ آپ خود فرماتے کہ کبھی دسترخوان سے تھوڑی سی غذا گر جاتی ہے تو میں اسے تلاش کرتا رہتا ہوں اس حد تک کہ گھر کی خادمہ ہنستی ہے (کہ میں غذا کے تھوڑے سے ٹکڑے کو تلاش کرتا پھرتا ہوں) آپ مزید کہتے کہ تم سے پہلے بعض قومیں ایسی تھیں کہ جنھیں اللہ نے فراواں نعمت عطا کی لیکن انھوں نے ناشکری کی، غذا کو بلا وجہ ضائع کیا تو خدا نے اپنی برکتیں ان سے واپس لے لیں اور انھیں قحط میں مبتلا کر دیا۔[1]

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۹۱ (ہم نے حدیث کی تلخیص کر کے مفہوم بیان کیا ہے)۔

۱۱۵۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

۱۱۶۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ○

۱۱۷۔ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

۱۱۸۔ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○

۱۱۹۔ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

ترجمہ

۱۱۵۔ اللہ نے تم پر صرف مردار، خون، سؤر کا گوشت اور وہ جانور حرام کیے ہیں کہ جن کا سر غیر خدا کے نام پر کاٹا جائے البتہ جو لوگ مجبور ہو جائیں مگر حد سے تجاوز نہ کریں (اللہ انھیں سزا نہیں دے گا) کیونکہ اللہ غفور و رحیم ہے۔

۱۱۶۔ اور اللہ پر افتراء باندھتے ہوئے اپنی زبانوں سے غلط طور پر یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور وہ حرام ہے کیونکہ اللہ پر افتراء باندھنے والے فلاح نہیں پائیں گے۔

۱۱۷۔ ایسے لوگوں کو دنیا کا تھوڑا سا فائدہ تو مل جائے گا مگر دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

۱۱۸۔ جو چیزیں پہلے ہم نے تجھ سے بیان کی ہیں انھیں ہم نے یہودیوں پر حرام کیا ہے۔ ان پر ہم نے

کوئی ظلم نہیں کیا۔

۱۱۹۔ ـــــ لیکن جنھوں نے جہالت کے باعث بُرے کام کیے ہیں مگر بعدازاں انھوں نے توبہ کر لی ہے اور اصلاح کے لیے اقدام کیا ہے تو پھر تیرا پروردگار بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

جھوٹے کبھی فلاح نہیں پائیں گے:

گذشتہ آیات میں اللہ کی پاکیزہ نعمتوں اور ان کے شکرانے کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیات میں وہی سلسلہ کلام جاری ہے۔ اب ان چیزوں کا ذکر ہے کہ جو واقعاً حرام ہیں نیز جنھیں لوگوں نے دینِ خدا میں بدعت کے طور پر حرام قرار دے لیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: جانوروں سے مربوط غذاؤں میں سے اللہ نے چار چیزیں تم پر حرام قرار دی ہیں مردار، خون، سؤر کا گوشت اور وہ جانور کہ جن کا سر غیر اللہ کے نام پر کاٹا گیا ہے (انما حرم علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اهل لغیر الله بهٖ)۔[1]

مُردار، خون اور سؤر کا گوشت حرام ہونے کا فلسفہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲، اکی تفسیر میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا (پہلی جلد میں مذکورہ آیت کی طرف رجوع کریں)۔

دورِ حاضر میں کسی سے مخفی نہیں کہ یہ تینوں چیزیں کس قدر آلودگی کی حامل ہیں۔ مردار طرح طرح کے جراثیم کا منبع ہے۔ خون بھی بدن کے تمام اجزاء کی نسبت جراثیموں کے اعتبار سے زیادہ آلودہ ہے اور سؤر کا گوشت بھی کئی طرح کی خطرناک بیماریوں کے لیے عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان تمام سے قطع نظر جیسا کہ ہم نے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بیان کیا ہے خون اور سؤر کا گوشت کھانے سے جسمانی نقصانات کے علاوہ نفسیاتی اور اخلاقی قباحتیں بھی پیدا ہوتی ہیں اور یہ اپنے ہارمونز (Hormones) انسان کے وجود میں بطور یادگار چھوڑ جاتے ہیں۔

مردار بھی چونکہ ذبح نہیں کیا گیا ہوتا اس لیے اس سے خون باہر نہیں نکلتا لہٰذا اس کے کھانے سے دوسرے نقصان کے علاوہ خون کھانے کا نقصان بھی ہوتا ہے۔

رہے وہ جانور کہ جو غیر خدا کے نام پر ذبح ہوتے ہیں ـــــ (ہم جو آج بسم اللہ کہتے ہیں وہ اس کی بجائے بتوں کے نام لیتے تھے) ـــــ اس کی حرمت یقیناً صحت کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ یہ حکم اخلاقی اور روحانی پہلو رکھتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اسلام میں حلال و حرام کا ہر حکم صرف صحت کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ کچھ محرمات

---

[1] "اُهلّ" "اهلال" کے مادہ سے لیا گیا ہے اور یہ بھی در اصل "هلال" سے لیا گیا ہے یہ چاند دیکھتے وقت آواز بلند کرنے کے معنی میں ہے مشرکین جانور ذبح کرتے وقت بتوں کے نام بلند آواز سے لیتے تھے لہٰذا اسے "اهل" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

صرف روحانی پہلو رکھتی ہیں ان کا مقصد تہذیبِ نفس ہوتا ہے اور انھیں اخلاقی مسائل کے پیشِ نظر حرام کیا گیا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات صرف نظامِ معاشرہ کی حفاظت کے لیے بعض چیزیں حرام قرار دے دی گئی ہیں جو جانور نامِ خدا لیے بغیر ذبح کر دیئے جاتے ہیں ان کی حُرمت بھی اخلاقی پہلو سے ہے کیونکہ یہ حکم ایک طرف سے تو شرک اور بُت پرستی کے خلاف جنگ ہے اور دوسری طرف ان نعمتوں کے خالق کی طرف توجّہ کا باعث ہے۔

ضمنی طور پر اس آیت سے اور بعد کی آیات سے مجموعی طور پر یہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ گوشت استعمال کرنے کے سلسلے میں اسلام اعتدال کا راستہ معین کرتا ہے۔ اسلام اس سلسلے میں نہ ساگ پات کھانے والے ہندو مت کی طرح اس غذا کو بالکل حرام قرار دیتا ہے اور نہ دورِ جاہلیت اور ہمارے زمانے کے بعض بزعم خویش تہذیب یافتہ لوگوں کی طرح ہر قسم کا گوشت کھانے کی اجازت دیتا ہے (یہاں تک کہ بعض لوگ سوسمار، سرطان اور طرح طرح کے کیڑے مکوڑے تک کھا جاتے ہیں)۔

ایک سوال کا جواب:

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ:

زیرِ بحث آیت میں حکمِ حرمت صرف چار حرام چیزوں میں منحصر ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ اور بھی بہت سے حرام جانور ہیں مثلاً درندوں کا گوشت اور چھلکے والی مچھلی کے علاوہ طرح طرح کے دریائی جانور۔ یہاں تک کہ قرآن کی دوسری سورتوں میں بھی ان چار سے زیادہ حرام چیزوں کا ذکر ہے۔ مثلاً سورۂ مائدہ کی آیت ۳ دیکھیے۔ لہٰذا یہاں حکم چار چیزوں میں محدود کیوں ہے؟

اس سوال کا جواب ہم جلد ۴ میں سورۂ انعام کی آیہ ۱۴۵ کے ذیل میں بھی دے آئے ہیں ہم کہہ چکے ہیں کہ یہاں ایک نکتہ پنہاں ہے وہ یہ کہ اس مقام پر حصر اصطلاح کے مطابق "حصرِ اضافی" ہے یعنی "انما" جو کہ حصر کے لیے آتا ہے یہاں اس کا مقصد بدعتوں کی نفی ہے یہ بدعتیں مشرکین میں کچھ جانوروں کی حرمت کے بارے میں رائج تھیں۔ دراصل قرآن کہتا ہے: یہ حرام ہیں نہ کہ وہ جو تم کہتے ہو۔"

یہ احتمال بھی ہے کہ جن چار چیزوں کا یہاں قرآن ذکر کرتا ہے وہ اصلی اور بنیادی محرمات ہیں (مثلاً "منخنقة" یعنی جس جانور کا گلا گھونٹ دیا جائے یا اس قسم کا کوئی جانور جس کا ذکر سورۂ مائدہ کی آیہ ۳ میں آیا ہے وہ بھی انھی چار جانوروں میں داخل ہے کیونکہ یہ بھی مردار ہی ہے) اسی طرح جانوروں کے کچھ حرام اجزاء یا مختلف قسم کے حیوانات مثلاً درندے یہ سب دوسرے درجے کے محرمات ہیں اسی لیے ان کی حُرمت کا حکم سنتِ رسولؐ میں آیا ہے اس صورت میں آیت میں موجود حصر حقیقی حصر ہو سکتا ہے (غور کیجیے گا)۔

جیسا کہ قرآن کی سنت ہے، آیت کے آخر میں استثنائی مواقع کا ذکر ہے فرمایا گیا ہے: جو لوگ حرام گوشت کھانے پر مجبور ہو جائیں (مثلاً کسی بیابان میں ہوں جہاں کچھ اور کھانے کو نہ مل سکے اور ان کی جان خطرے میں ہو) اور صرف جان بچانے کی حد تک ان میں سے کچھ کھالیں اور حد سے تجاوز نہ کریں تو ان کے لیے کوئی حرج نہیں کیونکہ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے

(فمن اضطر غیر باغ و لا عاد فان اللہ غفور رحیم)۔

"باغ" یا "باغی" "بغی" کے مادہ سے طلب کے معنی میں ہے یہاں طلبِ لذت کے معنی میں یا حرام الٰہی کو حلال شمار کرنے کے مفہوم میں ہے۔

"عاد" یا "عادی" "عدو" کے مادہ سے تجاوز کرنے کے معنی میں ہے یہاں وہ شخص مراد ہے کہ جو بوقتِ ضرورت ان حرام کردہ چیزوں کو حدِ لازم سے بڑھ کر استعمال کرلے۔

البتہ اہلِ بیت علیہم السلام کی بعض روایات میں "باغی" "ظالم" کے معنی میں اور "عادی" "غاصب" کے معنی میں تفسیر ہوا ہے۔ یہاں تک کہ بعض روایات میں "باغی" کا مطلب امام کے خلاف قیام کرنے والا شخص اور "عادی" کا مطلب چور بیان کیا گیا ہے۔

ہوسکتا ہے یہ روایات اس طرف اشارہ ہوں کہ حرام گوشت کھانے کے لیے اضطراری کیفیت عموماً دورانِ سفر پیدا ہوتی ہے اب اگر کوئی شخص ظلم، غصب اور چوری کے لیے سفر کرے اور اس قسم کا گوشت کھائے اگرچہ اس کے لیے ضروری ہوجائے کہ اپنی جان بچانے کے لیے ایسا کرے لیکن اللہ تعالیٰ ایسے شخص کا یہ گناہ نہیں بخشے گا۔

بہرحال یہ تفسیریں آیت کے عمومی مفہوم کے منافی نہیں ہیں اور انھیں یکجا کرکے دیکھا جا سکتا ہے۔

مشرکین نے بے بنیاد طور پر جو چیزیں حرام قرار دے لی تھیں اور جن کا ذکر پہلے ہوچکا۔ اگلی آیت میں ان کے بارے میں صراحت سے فرمایا گیا ہے: اور اللہ پر افتراء باندھتے ہوئے اپنی زبانوں سے غلط طور پر یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور وہ حرام ہے (ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھٰذا حلال و ھٰذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب)[1]۔

یعنی یہ ایک واضح جھوٹ ہے کہ جو صرف تمھاری زبانوں سے ٹپکا ہے کہ تم خود سے کچھ چیزوں کو حلال بنا لیتے ہو اور کچھ کو حرام۔ (یہ ان چوپایوں کی طرف اشارہ ہے کہ مشرکین جن میں سے کچھ کو اپنے اوپر حرام کرلیتے تھے اور کچھ کو حلال اور ان میں سے بعض کو بتوں کے نام کر دیتے تھے)۔

کیا اللہ نے تمھیں ایسی قانون سازی کا حق دیا ہے؟ کیا یہ خدا پر افتراء نہیں؟ تمھیں تمھارے بے ہودہ افکار اور اندھی تقلید نے ان بدعتوں سے باندھ رکھا ہے۔

سورۂ انعام کی آیہ ۱۳۶ میں وضاحت کے ساتھ آیا ہے کہ وہ لوگ اس طرح کے حلال و حرام گھڑنے کے لیے اپنی

---

[1] "ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب" کی ترکیب اس طرح ہے:

اس میں لام، لامِ تعلیل ہے اور "لما تصف" میں "ما" ماءِ مصدریہ ہے اور "کذب"، "تصف" کا مفعول ہے جو مجموعی طور پر یوں ہوگا

لا تقولوا ھٰذا حلال و ھٰذا حرام لتوصیف السنتکم الکذب

اپنی زبانوں سے جھوٹی توصیف کرتے ہوئے نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور وہ حرام ہے۔

زرعی پیداوار کا ایک حصّہ اللہ کے نام پر وقف کر دیتے تھے اور ایک حصّہ بتوں کے نام ۔ تعجب کی بات ہے کہ وہ کہتے تھے کہ بتوں کے نام جو حصّہ کیا ہے وہ ہرگز اللہ کو نہیں پہنچ سکتا لیکن جو حصّہ خدا کے لیے وہ بتوں کو پہنچتا ہے لہٰذا اللہ کے حِصّے کو نقصان پہنچ جائے تو بتوں کے حِصّے سے اسے پورا نہیں کیا جاسکتا لیکن بتوں کا حصّہ کم ہوجائے تو اسے اللہ کے حِصّے سے پورا کر دیتے اس قسم کی اور بھی ان میں بہت سی خرافات تھیں ۔

سورۂ انعام کی آیت ۱۴۸ میں ہے :

سیقول الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما اشرکنا ولا اٰباءنا ولا حرمنا من شیء

مشرکین کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو نہ ہم لوگ شرک کرتے اور نہ ہمارے آباء اور نہ ہی ہم کوئی چیز اپنے اوپر حرام کرتے ۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ انھیں حق پہنچتا ہے کہ کچھ چیزوں کو حلال قرار دے لیں یا حرام ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ خدا بھی ان کی بدعتوں کا موافق ہے (یہی وجہ ہے کہ پہلے وہ کوئی بدعت ایجاد کرتے ، کسی چیز کو حلال یا حرام بناتے اور پھر اُسے خدا سے منسوب کر دیتے اور اس طرح ایک اور جھوٹ کے مرتکب ہوتے)[۱]

آیت کے آخر میں ایک حتمی خطرے کے الارم کے طور پر فرمایا گیا ہے : جو لوگ خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ کبھی نجات اور فلاح نہیں پائیں گے (ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون) ۔

اصولی طور پر جھوٹ کسی کے بارے میں بھی ہو بے ہی بدبختی اور عدمِ فلاح کا سبب ۔ چہ جائیکہ وہ خدائے بزرگ کے بارے میں ہو ۔ ظاہر ہے ایسے جھوٹ کا گناہ اور بُرے اثرات کئی گنا ہوں گے ۔

اگلی آیت میں عدمِ فلاح اور بدبختی کی اس طرح سے وضاحت کی گئی ہے : ایسے کاموں سے وہ اس دنیا سے تو تھوڑا سا فائدہ اٹھالیں گے لیکن اس کے مقابلے میں دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے (متاع قلیل ولھم عذاب الیم) ۔

یہ متاعِ قلیل ہوسکتا ہے شکمِ مادر میں مرجانے والے جانوروں کے بچوں کی طرف اشارہ ہو جنھیں وہ اپنے لیے حلال شمار کرتے تھے اور ان کا گوشت استعمال کرتے تھے یا ہو سکتا ہے ان کی خود غرضی اور پیٹ پرستی کی طرف اشارہ ہو کہ جو اُن کی بدعتوں کا باعث تھی یا یہ کہ ان کے اس طرزِ عمل کی طرف اشارہ ہو کہ وہ اس شرک اور بُت پرستی کو مضبوط کرتے اور لوگوں کو اس میں مشغول رکھتے تاکہ ان پر اس طرح سے زیادہ عرصہ تک حکومت کرتے رہیں ـــــــــ یہ سب کچھ "متاعِ قلیل" تھا کہ جس کا نتیجہ "عذابِ الیم" تھا ۔

ممکن ہے یہاں یہ سوال کیا جائے کہ چار چیزوں کا جن کا ان آیات میں ذکر ہے ۔ ان کے علاوہ جانور یہودیوں پر

---

[۱] اسی بنا پر زیرِ بحث آیت میں خدا پر افتراء کا ذکر جو لام کے ساتھ آیا ہے ، ان کی بدعتوں کا نتیجہ ظاہر کر رہا ہے (غور کیجیے گا) ۔

کیوں حرام کیے گئے تھے ؟

اگلی آیت گویا اس سوال کا جواب دے رہی ہے ، ارشاد ہوتا ہے : اور یہودیوں پر ہم نے وہ چیزیں حرام کردی تھیں جو تم سے پہلے بیان کر چکے ہیں (وعلی الذین هادوا حرمنا ما قصصنا علیك من قبل)۔

یہ ان چیزوں کی طرف اشارہ ہے کہ جن کا ذکر سورہ انعام کی آیہ ۱۴۶ میں اس طرح سے آیا ہے :

وعلی الذین هادوا حرمنا کل ذی ظفر ومن البقر و الغنم حرمنا علیهم شحومهما الا ما حملت ظهورهما او الحوایا او ما اختلط بعظم ذلك جزینا هم ببغیهم وانا لصادقون

یہودیوں پر ہم نے ہر ناخن دار حیوان حرام کر دیا ہے (یہ ان جانوروں کی طرف اشارہ ہے جو گھوڑے کے سُموں کی طرح یکپارچہ ہوتے ہیں) نیز گائے اور گوسفند کی پشت، انتڑیوں کے درمیان اور دونوں پہلوؤں یا ہڈی سے ملی ہوئی چربی کے علاوہ باقی چربی بھی حرام قرار دی ہے۔ یہ حرمت ان کے ظلم کی وجہ سے سزا کے طور پر ہے اور ہم سچ کہتے ہیں۔

درحقیقت حرمت کے یہ اضافی احکام یہودیوں کے مظالم اور ستم کاریوں پر عذاب اور سزا کے طور پر تھے۔ اسی لیے زیر بحث آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے :

وما ظلمناهم ولکن کانوا انفسهم یظلمون

ہم نے ان پر ستم نہیں کیا بلکہ خود انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔

سورہ نساء کی آیت ۱۶۰ اور ۱۶۱ میں ہے :

فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَیۡهِمۡ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ وَبِصَدِّهِمۡ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ کَثِیۡرًاۙ وَّ اَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَاَکۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ

یہودیوں کے ظلم کی وجہ سے کچھ پاکیزہ غذائیں جو ذاتاً حلال تھیں ہم نے ان پر حرام کردیں کیونکہ وہ لوگوں کو راہِ خدا سے روکتے تھے اور سود کھاتے تھے حالانکہ انھیں ان کاموں سے منع کیا گیا تھا اور وہ لوگوں کا مال باطل طور پر کھاتے تھے۔

لہٰذا یہودیوں پر کچھ گوشت انھیں سزا دینے کے لیے حرام قرار دے دیئے گئے اور مشرکین کو حق نہیں پہنچتا تھا وہ اس سے استدلال کریں۔

علاوہ ازیں جو چیزیں مشرکین نے حرام کی ہوئی تھیں نہ یہودیوں کے مذہب میں حرام تھیں اور نہ دینِ اسلام میں۔ وہ تو خرافات کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آنے والی بدعتیں تھیں۔

(ہوسکتا ہے زیر بحث آیت اس نکتے کی طرف بھی اشارہ ہو کہ تم نے ایسا کام کیا ہے کہ جو کسی آسمانی کتاب سے

مطابقت نہیں رکھتا)۔ (وماظلمنا هم ولکن کانوا انفسهم یظلمون)۔

زیر نظر آخری آیت میں قرآن اپنی روش کے مطابق فریب خوردہ یا پشیمان ہوجانے والے افراد کے لیے لوٹ آنے کا راستہ کھولتے ہوئے فرماتا ہے : تیرا پروردگار ان کے بارے میں کہ جنھوں نے جہالت کے باعث بُرے اعمال انجام دیئے ہیں اور پھر انھوں نے توبہ کر لی ہے اور اصلاح و تلافی کی ہے ——— جی ہاں! تیرا پروردگار توبہ و اصلاح کے بعد بخشنے والا مہربان ہے (ثم ان ربك للذين عملوا السوء بجهالة ثم تابوا من بعد ذلك واصلحوا ان ربك من بعدها لغفور رحيم)

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ———

اوّلاً ارتکابِ گناہ کی وجہ جہالت کو شمار کیا گیا ہے کیونکہ جہالت ہی بہت سے گناہوں کا حقیقی عامل ہے اور جو لوگ جہالت میں ارتکابِ گناہ کرتے ہیں وہی آگاہی کے بعد راہِ حق کی طرف لوٹتے ہیں نہ کہ وہ جنھوں نے جان بوجھ کر غرور و تکبر، تعصب یا ہٹ دھرمی کی وجہ سے غلط راستہ اختیار کیا ہو۔

ثانیاً قرآن یہاں توبہ کو فقط دل کی توبہ و ندامت تک محدود نہیں کرتا بلکہ اس کی عملی تاثیر پر تاکید کرتا ہے اور اصلاح و تلافی کے ساتھ توبہ کو مکمل شمار کرتا ہے یہ اس لیے ہے کہ ہم غلط فکری کو دل و دماغ سے باہر نکالیں کیونکہ ہزاروں گناہوں کا ازالہ "استغفر الله" کے ایک جُملے سے نہیں ہو سکتا۔ انسانی روح یا معاشرے کو جو نقصان گناہ سے پہنچتا ہے اس کی اصلاح و مرمت کی ضرورت ہوتی ہے یہی ہے حقیقی توبہ نہ کہ زبانی توبہ۔

ثالثاً اس مسئلے پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ "ان ربك من بعدها لغفور رحيم" (ایسا ہو جائے تو یقیناً تیرا رب بخشنے والا مہربان ہے) کہہ کر تاکید مزید کی گئی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رحمتِ الٰہی کا حصول توبہ و اصلاح کے بعد ہی ممکن ہے۔

بہ الفاظ دیگر یہ حقیقت ہے کہ توبہ کی قبولیت یقینی طور پر ندامت، تلافی اور اصلاح کے بعد ہے اور تین تعبیروں کے ذریعے ایک ہی آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے پہلے لفظ "ثم" آیا ہے پھر "من بعد ذلك" آیا ہے اور آخر میں "من بعدها" فرمایا گیا ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ وہ بُرے افراد جو مسلسل گناہ کرتے رہتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ ہم لُطفِ الٰہی اور اس کی بخشش و رحمت کے امیدوار ہیں، یہ سوچ اپنے دماغ سے نکال دیں۔

۱۲۰۔ اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيۡفًا ؕ وَلَمۡ يَكُ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۝

۱۲۱۔ شَاكِرًا لِّاَنۡعُمِهٖ ؕ اِجۡتَبٰهُ وَهَدٰٮهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۝

۱۲۲۔ وَاٰتَيۡنٰهُ فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝ؕ

۱۲۳۔ ثُمَّ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۝

۱۲۴۔ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبۡتُ عَلَى الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فِيۡمَا كَانُوۡا فِيۡهِ يَخۡتَلِفُوۡنَ ۝

ترجمہ

۱۲۰۔ ابراہیم (تنِ تنہا) ایک امت تھا، امرالٰہی کا مطیع تھا، ہر قسم کے انحراف سے مبرا تھا اور وہ ہرگز مشرکین میں سے نہ تھا۔

۱۲۱۔ وہ پروردگار کی نعمتوں کا شکرگزار تھا۔ اللہ نے اسے منتخب کیا اور اسے سیدھے راستے کی ہدایت کی

۱۲۲۔ اور دنیا میں ہم نے اسے ہمت نیک بخشی اور آخرت میں وہ صالحین میں سے ہے۔

۱۲۳۔ پھر ہم نے تیری طرف وحی کی کہ ابراہیم کے دین کی اتباع کر کہ جو ہر قسم کے انحراف سے پاک ہے اور مشرکین میں سے نہ تھا۔

۱۲۴۔ ہفتے کا روز (کہ جس روز یہودیوں پر کچھ چیزیں حرام تھیں) سزا کے طور پر تھا کہ اس میں بھی انھوں نے اختلاف کیا اور جن چیزوں میں وہ اختلاف کرتے تھے ان کے بارے میں تیرا رب قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔

تفسیر

ابراہیمؑ اپنی ذات میں ایک اُمت تھے :

ہم کہہ چکے ہیں کہ اس سورہ کا موضوع نعمتوں کا بیان ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے جذبۂ شکر گذاری کو بیدار کیا جائے تاکہ وہ یہ نعمتیں عطا کرنے والے کی معرفت کی جانب آئے۔

زیرِ نظر آیات میں خدا کی شکر گزاری ایک کامل مصداق یعنی مکتب توحید کے مجاہد ہیرو اور علمبردار حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے ان کا ذکر اس لحاظ سے بھی خصوصیت کا حامل ہے کہ مسلمان بالعموم اور عرب بالخصوص حضرت ابراہیمؑ کو اپنا پہلا پیشوا اور مقتداء سمجھتے ہیں۔

اس عظیم اور بہادر انسان کی صفات میں سے یہاں پانچ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

۱۔ پہلے فرمایا گیا ہے: ابراہیمؑ اپنی ذات میں ایک اُمت تھا (ان ابراھیم کان امۃ)۔

اس سلسلے میں حضرت ابراہیمؑ کو "امت" کیوں قرار دیا گیا ہے مفسرین نے مختلف نکات بیان کیے ہیں۔ ان میں سے چار قابلِ ملاحظہ ہیں:

(i) ابراہیم علیہ السلام انسانیت کے عظیم رہبر، مقتداء اور معلّم تھے۔ اسی بناء پر انھیں اُمت کہا گیا ہے کیونکہ "امت" اسمِ مفعول کے معنی میں اسے کہا جاتا ہے جس کی لوگ اقتداء کریں اور جس کی رہبری لوگ قبول کریں۔

(ii) ابراہیم علیہ السلام ایسی شخصیت کے مالک تھے کہ اپنی ذات میں ایک اُمت تھے۔ کیونکہ بعض اوقات کسی انسان کی شخصیت کا نور اتنی وسیع شعاعوں کا حامل ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت ایک دو یا بہت سے افراد سے زیادہ ہو جاتی ہے اور اس کی شخصیت ایک عظیم اُمت کے برابر ہو جاتی ہے۔

ان دونوں معانی میں ایک خاص روحانی تعلق ہے کیونکہ جو شخص کسی مِلّت کا سچا پیشوا ہوتا ہے وہ ان سب کے اعمال میں شریک اور حصہ دار ہوتا ہے اور گویا وہ خود اُمت ہوتا ہے۔

(iii) وہ ماحول کہ جس میں کوئی خدا پرست نہ تھا اور جس میں سب لوگ شرک و بت پرستی کے جوہڑ میں غوطہ زن تھے ـــــ اس میں ابراہیم تن تنہا موحد اور توحید پرست تھے پس آپ تنہا ایک امت تھے اور اس دور کے مشرکین ایک الگ اُمت تھے۔

(iv) ابراہیم علیہ السلام ایک اُمت کے وجود کا سرچشمہ تھے اس لیے آپ کو "امت" کہا گیا ہے۔

اس میں کوئی اشکال نہیں "امت" کا یہ چھوٹا سا لفظ اپنے دامن میں یہ تمام وسیع معانی لیے ہوئے ہو۔

جی ہاں! ابراہیمؑ ایک امت تھے۔

ـــــ وہ ایک عظیم پیشوا تھے۔

——— وہ ایک امت ساز جوانمرد تھے۔

——— جس ماحول میں کوئی توحید کا دم بھرنے والا نہ تھا وہ توحید کے عظیم علمبردار تھے۔[1]

ایک عرب شاعر کہتا ہے:

لیس علی الله بمستنکر

ان یجمع العالم فی واحد

اللہ سے بعید نہیں کہ سارے عالم کو ایک میں جمع کر دے۔

۲۔ ان کی دوسری صفت یہ تھی کہ وہ اللہ کے مطیع بندے تھے (قانتًا لله)۔

۳۔ وہ ہمیشہ اللہ کے سیدھے راستے اور طریق حق پر چلتے تھے (حنیفًا)۔

۴۔ وہ کبھی بھی مشرکین میں سے نہ تھے۔ ان کے فکر کے ہر پہلو میں، ان کے دل کے ہر گوشے میں اور ان کی زندگی کے ہر طرف اللہ ہی کا نور جلوہ گر تھا (ولم یك من المشرکین)۔

۵۔ ان تمام خصوصیات کے علاوہ وہ ایسے جواں مرد تھے کہ اللہ کی سب نعمتوں پر شکر گزار تھے (شاکرًا لانعمه)۔

ان پانچ صفات کو بیان کرنے کے بعد ان کے اہم نتائج بیان کیے گئے ہیں:

(i) اللہ نے ابراہیم کو نبوت اور دعوت کی تبلیغ کے لیے منتخب کیا (اجتبٰه)۔

(ii) اللہ نے انھیں راہِ راست کی ہدایت کی اور انھیں ہر قسم کی لغزش اور انحراف سے بچایا (وهداه الی صراط مستقیم)۔

ہم نے بارہا کہا ہے کہ خدائی ہدایت ہمیشہ لیاقت و اہلیت کی بنیاد پر ہوتی ہے کہ جس کا مظاہرہ انسان کی اپنی طرف سے ہوتا ہے۔ اس کی طرف سے کسی کو کوئی چیز استعداد اور کسی حساب کتاب کے بغیر نہیں دی جاتی۔ حضرت ابراہیمؑ کو بھی اسی بنیاد پر یہ ہدایت نصیب ہوئی۔

(iii) ہم نے دنیا میں انھیں "حسنہ" سے نوازا۔ (وآتیناه فی الدنیا حسنة)۔

وسیع معنی کے اعتبار سے "حسنہ" میں ہر قسم کی نیکی اور اچھائی کا مفہوم موجود ہے۔ اس میں مقام نبوت و رسالت سے

---

[1] حضرت عبدالمطلبؑ کے بارے میں مروی احادیث میں سے ایک کے الفاظ یوں ہیں:

یبعث یوم القیامة امة واحدة علیه بهاء الملوك وسیماء الانبیاء

عبدالمطلب (چونکہ شرک و بت پرستی کے ماحول میں توحید کے حامی و مددگار تھے اس لیے) قیامت کے دن ایک اُمت کی شکل میں مبعوث ہوں گے ان کی درخشندگی (عدل کے) نامداروں کی سی ہو گی اور ان میں انبیاء کی سی علامتیں ہوں گی۔ (سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۱۲۹)

لے کر اچھی اولاد وغیرہ تک کا مفہوم موجود ہے۔

(۱۷) اور آخرت میں وہ صالحین میں سے ہے (وانہ فی الاخرۃ لمن الصّٰلحین)۔
اس کے باوجود کہ ابراہیم صالحین کے سردار ہیں پھر بھی قرآن کہتا ہے کہ وہ صالحین میں سے ہیں اور یہ امر مقام صالحین کی عظمت کی نشانی ہے کہ ابراہیم اپنے ان تمام بلند مقامات کے باوجود ان میں سے ہیں ــــــــــ خود حضرت ابراہیم نے اللہ سے یہی تقاضا کیا تھا:

رب ھب لی حکما و الحقنی بالصّٰلحین

پروردگارا! مجھے نگاہِ صاحب عطا فرما اور مجھے صالحین میں سے قرار دے۔ (شعراء ۸۳)

(۷) ان صفات کے ساتھ ساتھ ایک اور امتیاز جو اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو عطا فرمایا وہ یہ ہے کہ ان کا مکتب و مذہب صرف ان کے اہلِ زمانہ کے لیے نہ تھا بلکہ ہمیشہ کے لیے تھا۔ خاص طور پر اسلامی اُمّت کے لیے بھی یہ ایک الہام بخش مکتب قرار پایا ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے پھر ہم نے تجھے وحی کی کہ دینِ ابراہیم کی اتباع کر کہ جو خالص توحید کا دین ہے (ثم اوحینا الیک ان اتبع ملۃ ابراھیم حنیفا)[1]۔

ایک مرتبہ پھر تاکید کی گئی ہے کہ ابراہیم مشرکین میں سے نہ تھے (وما کان من المشرکین)۔

ان آیات کی طرف توجہ کرنے سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر دینِ اسلام دینِ ابراہیم ہے اور بہت سے مسائل میں مسلمان سننِ ابراہیم کی پیروی کرتے ہیں اور ان میں روزِ جمعہ کا احترام کرنا بھی شامل ہے تو پھر یہودی روزِ ہفتہ کو کیوں عید قرار دیتے ہیں اور اس روز کیوں چھٹی کرتے ہیں۔

زیرِ نظر آخری آیت میں اس سوال کا جواب موجود ہے، ارشاد ہوتا ہے: ہفتے کا دن (اور ہفتے کے روز حرام قرار دی گئی چیزوں کا حکم) یہودیوں کے لیے سزا کے طور پر مقرر تھا اور پھر انھوں نے اس میں بھی اختلاف کیا ان میں سے بعض نے اس سزا کو قبول کر لیا اور اس روز کام کاج بالکل چھوڑ دیا اور بعض نے اس کے بارے میں اعتنائی سے کام لیا (انما جعل السبت علی الذین اختلفوا فیہ)۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا تھا کہ وہ روزِ جمعہ کا احترام کریں اور اس روز تعطیل کیا کریں یہ حکم دینِ ابراہیم کے مطابق تھا لیکن انھوں نے بہانے بنائے اور روزِ ہفتہ کو ترجیح دی تو اللہ نے ان کے لیے ہفتے کا دن مقرر کیا لیکن اس کے بارے میں سختی برتی گئی اور کئی حد بندیاں اور شرائط نافذ کر دیں لہٰذا فرمایا گیا ہے کہ روزِ ہفتہ کی تعطیل کے اس حکم کو تمھیں سند قرار نہیں دینا چاہیے کیونکہ یہ حکم تو بڑی سخت سزا کا پہلو رکھتا ہے اور اس سلسلے میں بہترین دلیل یہ ہے کہ

---

[1] "حنیف" ایسے شخص کو کہتے ہیں جو ٹیڑھے اور انحرافی راستے کو چھوڑ کر درست اور سیدھے راستے کی طرف متوجہ ہو دوسرے لفظوں میں "حنیف" وہ شخص ہے جو ٹیڑھے اور انحرافی دینوں اور راستوں سے منہ موڑ کر اللہ کے صراطِ مستقیم کا رُخ کرتا ہے ــــــــ صراطِ مستقیم کہ جو ایسا دین ہے جو فطرت سے ہم آہنگ ہے اور اس ہم آہنگی کی وجہ سے صراطِ مستقیم شمار ہوتا ہے لہٰذا لفظ "حنیف" میں توحید کے فطری ہونے کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ موجود ہے۔

یہودیوں نے خود اپنے اس انتخاب شدہ دن کے بارے میں بھی اختلاف کیا ہے ان میں سے بعض تو اس دن کی قدر و منزلت کے قائل ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں اور بعض اس کے احترام کو نظر انداز کرتے ہوئے کاروبار میں لگے رہتے ہیں اور عذاب الٰہی میں گرفتار ہوتے ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ زیر بحث آیت جانوروں کی غذا کے سلسلے میں مشرکین کی بدعتوں کے بارے میں ہو کیونکہ گزشتہ آیات میں جو گفتگو ہوئی ہے اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہودیوں میں جو محرمات تھے وہ اسلام میں کیوں نہیں ہیں تو جواب دیا گیا ہے کہ وہ محرمات سزا کے طور پر تھے۔

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے احکام یہودیوں میں کیوں تھے؟ مثلاً مچھلی کا شکار ہفتہ کے روز ان کے لیے حرام کیوں تھا جبکہ اسلام میں ایسا نہیں ہے پھر جواب یہی ہے ایسا ان کے لیے عذاب اور سزا کے طور پر تھا۔

بہرحال ان آیات کا تعلق سورۂ اعراف کی آیات ۱۶۲ تا ۱۶۶ سے ہے کہ جو "اصحاب السبت" کے بارے میں ہیں۔ اس سلسلے میں ہم تفسیر نمونہ کی جلد ۶ میں وضاحت کر چکے ہیں[۱]۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ وہ ہفتے کے روز کس طرح مچھلی شکار کرتے تھے اس حکم اور خدائی آزمائش کے بارے میں وہاں وضاحت موجود ہے اس کی مخالفت کرنے والے یہودیوں کو جو سخت سزا ملی اس کا بھی وہاں ذکر موجود ہے۔

ضمناً توجہ رہے کہ "سبت" دراصل آرام کے لیے کام سے تعطیل کرنے کے معنی میں ہے اور روزِ ہفتہ کو اس لیے "یوم السبت" کہتے ہیں کہ یہودی اس روز عام کاروبار سے تعطیل کرتے تھے بعد ازاں مسلمانوں میں بھی اس دن کا یہی نام باقی رہ گیا اگرچہ اسلام میں یہ تعطیل کا دن نہ تھا۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: جنھوں نے اختلاف کیا ہے ان کے بارے میں اللہ قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔ (وان ربك ليحكم بينهم يوم القيٰمة فيما كانوا فيه يختلفون)۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ قیامت کے روز ایک مقصد یہ حاصل کیا جائے گا کہ تمام معاملات کے بارے میں اختلافات ختم کر دیئے جائیں گے کیونکہ وہ یوم البروز اور یوم الظہور ہو گا اس روز تمام حقیقتیں ظاہر ہو جائیں گی پردے ہٹ جائیں گے ہر مسئلے اور ہر معاملے کے بارے میں حق آشکار ہو جائے گا۔

---

[۱] دیکھو صفحہ ۳۰۹ (اردو ترجمہ تفسیر نمونہ جلد ۴)

۱۲۵۔ اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَ جَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ وَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُہۡتَدِیۡنَ ۝

۱۲۶۔ وَ اِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِہٖ ؕ وَ لَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَہُوَ خَیۡرٌ لِّلصّٰبِرِیۡنَ ۝

۱۲۷۔ وَ اصۡبِرۡ وَ مَا صَبۡرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَ لَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا تَکُ فِیۡ ضَیۡقٍ مِّمَّا یَمۡکُرُوۡنَ ۝

۱۲۸۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّ الَّذِیۡنَ ہُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ ۝ ع

ترجمہ

۱۲۵۔ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دے اور ان سے بہترین انداز میں استدلال اور مباحثہ کر۔ تیرا پروردگار ہر شخص کے بارے میں بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کس نے ہدایت پائی ہے۔

۱۲۶۔ اور جب تم بدلا لینا چاہو تو صرف اتنی ہی سزا دو جتنی تم پر زیادتی ہوئی ہے اور اگر تم صبر کرو تو صبر کرنے والوں ہی کے لیے بہتر ہے۔

۱۲۷۔ صبر کر، اور تیرا یہ صبر اللہ کے لیے اور اس کی توفیق سے ہو اور ان کی حرکات پر رنجیدہ نہ ہو اور ان کی سازشوں اور چالبازیوں پر دل تنگ نہ ہو۔

۱۲۸۔ اللہ ان کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور جو نیکو کار ہیں۔

تفسیر

مخالفین کے مقابلے میں دس اہم اخلاقی احکام:

اس سورہ میں مختلف آیات مشرکوں، یہودیوں اور کُلّی طور پر تمام مخالف گروہوں کے بارے میں ہیں یہ گفتگو کبھی نرم انداز سے ہے اور کبھی تند و تیز لہجے میں۔ خصوصاً زیر نظر آخری آیات میں اس سلسلے میں زیادہ گہرائی اور شدت ہے۔

یہ سورۂ نحل کی آخری آیات ہیں ان میں اہم اخلاقی احکام ہیں ان میں منطقی اور استدلالی گفتگو اور طرز بحث اختیار کرنے کا حکم ہے مخالفین کو سزا دینے اور معاف کرنے کے بارے میں حکم ہے اور ان کی سازشوں کے مقابلے کی کیفیت اور طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ ان احکام سے ایک ہمہ گیر قانون کے طور پر ہر زمانے میں اور ہر مقام پر استفادہ کیا جا سکتا ہے یہاں ساری گفتگو دس اصولوں پر محیط ہے۔ ترتیب کچھ یوں ہے:

(۱) پہلے فرمایا گیا ہے: اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت سے دعوت دے (ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ)۔

"حکمت" علم و دانش اور منطق و استدلال کے معنی میں ہے۔ اصل میں یہ لفظ منع کرنے کے معنی میں ہے اور علم و دانش اور منطق و استدلال چونکہ فتنہ و فساد اور انحراف سے مانع ہیں لہٰذا انھیں حکمت کہا جاتا ہے بہرحال راہِ حق کی طرف دعوت دینے کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ صحیح منطق اور رچے تلے استدلال سے کام لیا جائے ——— دوسرے لفظوں میں لوگوں کی فکر و نظر کو دعوت دی جائے اور ان کی سوچ بچار کی صلاحیت کو ابھارا جائے اور عقلِ خوابیدہ کو بیدار کیا جائے۔

(۲) نیز یہ دعوت عمدہ نصیحت کے ساتھ ہو (والموعظۃ الحسنۃ)

راہِ خدا کی طرف دعوت کا یہ دوسرا اصول ہے۔ یہ درحقیقت انسانی جذبات اور فطری احساسات سے استفادہ کرنے کا انداز ہے کیونکہ وعظ و نصیحت دراصل جذب و احساس کو ابھارنے کے لیے ہوتی ہے۔ زیادہ تر عوام کو جذبات و احساسات کو ابھار کر حق کی طرف متوجہ کیا جا سکتا ہے۔

درحقیقت ——— حکمت انسان کے عقلی پہلو سے مربوط ہے اور "الموعظۃ الحسنۃ" انسانی جذب و احساس سے کام لینے کے لیے ہے[1] نیز "موعظۃ" کے ساتھ "حسنۃ" کی شرط شاید اس طرف اشارہ ہے کہ وعظ و نصیحت

---

[1] بعض مفسرین نے "حکمۃ"، "موعظہ حسنہ" اور "مجادلۂ احسن" کے درمیان فرق کے بارے میں کہا ہے کہ "حکمۃ" قطعی اور یقینی دلائل کی طرف اشارہ ہے "موعظۃ حسنۃ" ظنی دلائل کو کہتے ہیں اور "مجادلہ احسن" ایسے دلائل سے استفادہ کرنا ہے کہ جو مخالفین کے نزدیک قابلِ قبول ہوں (البتہ جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے وہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے)۔

اس صورت میں مؤثر ہوتی ہے کہ جب اس میں کسی قسم کی سختی، بڑائی، دوسرے کی تحقیر و تذلیل اور اس کی ہٹ دھرمی کی انگیخت وغیرہ نہ ہو۔ بہت سے لوگوں کے وعظ و نصیحت کا الٹا اثر نکلتا ہے کیونکہ اس میں دوسرے کی تحقیر و تذلیل پائی جاتی ہے یا اس میں وعظ و نصیحت کرنے والے کی بڑائی کا پہلو ہوتا ہے لہٰذا "موعظة" تبھی مؤثر ہوتا ہے جب "حسنة" ـــــــــ اچھا اور عمدہ ہو۔

(۳) اور مخالفین سے زیادہ اچھے طریقے سے مباحثہ کر (وجادلهم بالتی هی احسن)۔

یہ تیسرا قدم ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے کہ جن کے ذہن میں پہلے سے غلط مسائل اور نظریات سمائے ہوئے ہوں۔ مناظرے اور مباحثے کے ذریعے ان کا ذہن ان کے نظریات سے پاک کرنا چاہیے تاکہ وہ حق قبول کرنے کے قابل ہو سکیں۔

واضح ہے کہ مجادلہ اور مباحثہ بھی تبھی مؤثر ہوگا جب وہ "بالتی هی احسن" ہو۔ جب وہ حق، عدالت، درستی امانت اور صداقت کے ساتھ ہو جب اس میں کسی قسم کی تحقیر، توہین، غلط بیانی اور تکبر نہ ہو ـــــــــ مختصر یہ کہ اس میں تمام انسانی اقدار کا احترام ملحوظ رکھا گیا ہو۔

زیر نظر پہلی آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: تیرا رب ہر کسی سے بہتر جانتا ہے کہ کون لوگ اس کی راہ سے بھٹک گئے ہیں اور کن لوگوں نے ہدایت پائی ہے (ان ربك هو اعلم بمن ضل عن سبيله وهو اعلم بالمهتدين)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تمہاری ذمہ داری مذکورہ تین طریقوں کے مطابق حق کی طرف دعوت دینا ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ کون لوگ ہدایت پاتے ہیں اور کون لوگ گمراہی پر پڑے رہتے ہیں ـــــــــ انھیں خدا جانتا ہے اور بس۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس جملے میں مذکورہ بالا تین احکام کی دلیل بیان کی گئی ہو یعنی اللہ نے منحرفین اور کج رو افراد کے بارے میں یہ جو تین حکم دیئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتا ہے گمراہوں کے لیے کون سی بات مؤثر ہے اور ہدایت کے لیے کون سا ذریعہ مناسب ہے۔

(۴) اب تک تو اس بارے میں گفتگو تھی کہ مخالفین سے منطق، جذب و احساس اور معقول مباحثے کا طرزِ عمل اختیار کیا جائے لیکن معاملہ اگر اس سے بڑھ کر جھگڑے تک جا پہنچے اور مخالفین دستِ تجاوز دراز کریں اور انھیں سزا دینے کی نوبت آجائے تو پھر انھیں اتنی سزا دو جتنی انھوں نے زیادتی کی ہے اور اس سے زیادہ نہیں (وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به)۔

(۵) لیکن اگر صبر اختیار کرو اور عفو و درگزر سے کام لو تو صبر کرنے والوں کے لیے یہی بہتر طرزِ عمل ہے۔ (ولئن صبرتم لهو خير للصابرين)۔

بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت جنگِ احد کے دوران میں اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہؐ نے اپنے چچا حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کی شہادت کی دردناک کیفیت دیکھی۔ دشمن نے انھیں شہید کرنے پر بس نہیں کی تھی بلکہ ان کا سینہ اور پہلو بڑی بے دردی سے چیرے گئے ان کا جگر یا دل نکال لیا گیا ان کے کان اور ناک کاٹے گئے۔ یہ منظر دیکھ کر رسول اللہؐ بہت دکھی ہوئے اور فرمایا:

اللھم لک الحمد والیک المشتکی وانت المستعان علی ما اری

خدایا: حمد تیرے لیے ہے اور تیری ہی بارگاہ میں شکایت پیش کرتا ہوں اور جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اس پر تو ہی میرا مددگار ہے۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

لئن ظفرت لامثلن ولامثلن ولامثلن

اگر میں ان پر فتحیاب ہوگیا تو ان کا مثلہ کروں گا، ان کا مثلہ کروں گا، ان کا مثلہ کروں گا۔

ایک اور روایت کے مطابق آپؐ نے فرمایا:

ان کے ستر آدمیوں کا مثلہ کروں گا۔[1]

اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به ولئن صبرتم لهو خير للصٰبرين

رسول اللہؐ نے فوراً عرض کیا:

اصبر! اصبر!

خدایا! میں صبر کروں گا، میں صبر کروں گا۔[2]

شاید رسولِ اکرمؐ کی زندگی میں یہ لمحہ کرب ناک ترین تھا لیکن پھر بھی آپؐ کو اپنے اعصاب پر پورا کنٹرول تھا آپؐ نے عفو و درگزر کا راستہ اختیار کیا۔ فتح مکہ کے واقعہ میں ہے کہ جس دن آپؐ ان سنگدلوں پر فتح یاب ہوئے تو عام معافی کا حکم صادر فرمایا اور جنگِ اُحد کے موقع پر اللہ سے کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور سچی بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص عالی ظرفی اور انسانی جذبوں کا بہترین نمونہ دیکھنا چاہے تو واقعہ اُحد کو فتح مکہ کے واقعے کے ساتھ رکھ کر دیکھے اور ان دونوں کا آپس میں موازنہ کرے۔

شاید آج تک کسی کامیاب قوم نے کسی شکست خوردہ قوم کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا ہو کہ جو رسولؐ اللہ اور مسلمانوں نے کامیابی کے بعد مشرکین مکہ سے کیا وہ بھی ایسے ماحول میں کہ جہاں انتقام کے جذبے لوگوں کے رگ و پے میں اُترے ہوئے تھے اور نسل در نسل ان میں بغض و کینہ کے سلسلے میراث کے طور پر چلتے رہتے تھے اس معاشرے میں انتقام نہ لینا ایک بہت بڑا عیب سمجھا جاتا تھا۔

اس عالی ظرفی، عظمتِ کردار اور عفو و درگزر کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جاہل اور ہٹ دھرم قوم بہت متاثر ہوئی اور ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہاں تک کہ قرآن کے مطابق۔

---

[1] بعض روایات میں ہے کہ یہ جملہ بعض مسلمانوں نے کہا تھا کہ اگر ہم کامیاب ہوگئے تو اس سے زیادہ تعداد میں مثلہ کریں گے۔ تفسیر تبیان جلد ۶ ص ۴۴۰)

[2] تفسیر عیاشی اور تفسیر درالمنثور، زیربحث آیت کے ذیل میں (جیسا کہ تفسیر المیزان میں نقل کیا گیا ہے)۔

یدخلون فی دین اللہ افواجاً

وہ لوگ فوج در فوج دین خدا میں داخل ہو گئے۔

۶۔ اگر عفو و درگزر اور صبر و شکیبائی کسی توقع کے بغیر ہو تو یقینی طور پر اثر انداز ہوتی ہے ــــــــ یعنی صرف اللہ کی خاطر ہو ــــــــ لہٰذا قرآن مزید کہتا ہے: صبر اختیار کر اور تیرا یہ صبر صرف اللہ کے لیے ہو اور یہ اس کی توفیق کے بغیر نہیں ہو سکتا (واصبر وما صبرک الا باللہ)۔

کیا یہ انسان کے بس میں ہے کہ وہ ایسے جاں سوز مواقع پر قوتِ الٰہی اور روحانی جذبے کے بغیر صبر کرے جو اس کے تن بدن میں آگ لگا دیتے ہیں۔ توفیقِ الٰہی کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان روح کو اذیت پہنچانے والے واقعات اور مناظر کا سامنا کرے اور صبر کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ جی ہاں! یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ سب کچھ خدا کے لیے ہو اور اس کی توفیق سے ہو۔

(۷) تبلیغ اور دعوت الی اللہ کے راستے میں یہ تمام زحمات اٹھانے، عفو و درگذر کرنے اور صبر اختیار کرنے کے باوجود کوئی نتیجہ نہ نکلے تو بھی مایوس اور بددل نہیں ہونا چاہیے بلکہ جتنا زیادہ ممکن ہو سکے حوصلے کے ساتھ اور ٹھنڈے دل سے تبلیغ کا سلسلہ جاری و ساری رکھنا چاہیے۔ اسی لیے ساتواں حکم یہ دیا گیا ہے: ان کی حالت پر کبیدہ خاطر نہ ہو (ولا تحزن علیھم)۔

یہ حزن و ملال کہ یقیناً ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے سبب ہو سکتا ہے اس سے دو میں سے ایک نتیجہ پیدا ہو۔ یا تو انسان ہمیشہ کے لیے بددل ہو جائے یا وہ بے حوصلگی اور بے تابی کا اظہار کرے۔ لہٰذا حزن و ملال کی نہی درحقیقت دونوں کی نہی ہے۔ یعنی راہِ حق کی دعوت دیتے ہوئے نہ بیتاب و مضطرب ہونا چاہیے اور نہ ہی مایوس و نا امید۔

(۸) ان تمام اوصاف کے باوجود ہو سکتا ہے ہٹ دھرم دشمن سازش کا راستہ اپنالے اور خطرناک منصوبے بنائے توان حالات میں صحیح موقف وہی ہے کہ جو قرآن کہتا ہے: ان سازشوں پر پریشان اور تنگ دل نہ ہو (ولا تک فی ضیق مما یمکرون)۔

یہ سازشیں جس قدر بھی گہری، وسیع اور خطرناک ہوں تمہارا راستہ نہیں روک سکتیں تم یہ خیال نہ کرو ہمارا دائرہ تنگ ہو گیا ہے اور ہم ان سازشوں میں گھر چکے ہیں کیونکہ تمہارا سہارا خدا ہے تم ایمان و استقامت کی قوت سے اور عقل و دانش سے ان سازشوں کو ناکام کر سکتے ہو۔

زیر نظر آخری آیت سورۂ نحل کی بھی آخری آیت ہے۔ اس میں اس سلسلے کا نواں اور دسواں حکم بیان کیا گیا ہے۔

(۹) ارشاد ہوتا ہے: اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے کہ جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں (ان اللہ مع الذین اتقوا)

"تقویٰ" یہاں تمام جہات سے اور وسیع مفہوم میں ہے یہاں تک کہ دشمنوں کے مقابلے میں بھی تقویٰ ــــــــ یعنی

اپنے دشمنوں کے ساتھ اسلامی اصولوں کی پاسداری کے ساتھ برتاؤ کرنا۔ قیدیوں کے ساتھ اسلامی طرزِ عمل اختیار کرنا۔ کج رو اور منحرف افراد کے ساتھ انصاف اور ادب کے اصولوں کا لحاظ رکھنا اور جھوٹ اور تہمت سے پرہیز کرنا۔ یہاں تک کہ دورانِ جنگ بھی اسلامی اصولوں پر عمل کرنا، تقویٰ اور اسلامی قوانین کا پاس کرنا۔ جنگ کے دوران میں نہتے اور دفاع نہ کر سکنے والے افراد پر حملہ نہ کرنا، بچوں اور کمزور بوڑھوں سے تعرض نہ کرنا۔ چوپایوں کو ہلاک نہ کرنا، فصلوں کو تباہ نہ کرنا اور دشمن پر پانی بند نہ کرنا وغیرہ۔ مختصر یہ کہ دوست اور دشمن دونوں کے ساتھ تقویٰ کی بنیاد پر سلوک کرنا چاہیے (البتہ بہت کم استثنائی مواقع ایسے ہیں جو اس حکم سے خارج ہیں)۔

(۱۰) اور اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو نیکوکار ہیں (والذین ھم محسنون)۔

جیسا کہ قرآن نے اپنی دیگر بہت سی آیات میں بھی کہا ہے بعض اوقات بدی کا جواب نیکی سے دینا چاہیے اور اس طریقے سے دشمن کو شرمسار کرنا چاہیے کیونکہ یہ طریقہ ان دشمنوں کو کہ جن کا سینہ دشمنی سے پُر ہو اور "الد الخصام" کو مہربان اور مخلص دوست میں تبدیل کر دیتا ہے۔

احسان اور نیکی اگر برمحل اور برموقع ہو تو یہ جنگ کا ایک عمدہ طریقہ ہے تاریخِ اسلام میں اس حکمتِ عملی کے بہت سے مظاہر دکھائی دیتے ہیں فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو سلوک مشرکین مکہ کے ساتھ کیا، جو طرزِ عمل آپ نے حضرت حمزہؓ کے قاتل "وحشی" سے روا رکھا، جو مہربانی آپ نے بدر کے قیدیوں پر کی اور جو سلوک آپ نے ان یہودیوں کے ساتھ کیا جنہوں نے آپؐ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی تھیں وہ سب اس کردار کے مظاہر ہیں۔

ایسے ہی بہت سے واقعات حضرت علی علیہ السلام اور دیگر آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کی زندگی میں دکھائی دیتے ہیں ان واقعات سے اس اسلامی حکم کی وضاحت ہوتی ہے۔

نہج البلاغہ کا ایک مشہور خطبہ ہے جسے خطبہ ہمام کہا جاتا ہے۔ ہمام ایک عابد و زاہد اور دانا شخص تھا۔ اس نے امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے پرہیزگاروں کی صفات کے بارے میں ایک جامع حکم کا تقاضا کیا تو امام نے صرف یہ آیت تلاوت فرمائی اور کہا:

اتق اللہ واحسن ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون

تقویٰ الٰہی اختیار کرو اور نیکی کرو کیونکہ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو پرہیزگار اور نیکوکار ہیں۔

اگرچہ اس عاشقِ حق سائل کی پیاس اس مختصر سے جواب سے نہ بجھی اور پھر تقاضا کیا تو ناچار امام علیہ السلام نے وضاحت سے جواب دیا اور پرہیزگاروں کی صفات کے بارے میں نہایت جامع خطبہ دیا۔ اس میں پرہیزگاروں کی سو سے زیادہ صفات بیان کی گئی ہیں۔ تاہم امامؑ کے پہلے مختصر جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت دراصل پرہیزگاروں کی صفات کا اجمال ہے گویا یہ پرہیزگاروں کی کتابِ صفات کی فہرست ہے۔

یہ دس چیزیں مخالفین کے ساتھ طرزِ عمل کے اہتمام اصلی اور فرعی خطوط واضح کر دیتی ہیں ان میں غور و فکر کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں تمام منطقی، احساساتی اور نفسیاتی طریقے اختیار کرنے کو کہا گیا ہے کہ جو مخالفین پر اثر انداز ہو سکیں۔

اس کے باوجود اسلام ہرگز یہ نہیں کہتا کہ صرف منطق واستدلال پر قناعت کرو بلکہ اسلام بہت سے مواقع پر ضروری قرار دیتا ہے کہ دشمنوں کی سازشوں کے مقابلے میں ہم میدانِ عمل میں نکلیں اور ان کی سختی کے جواب میں ضرورت کی صورت میں سختی سے جواب دیں اور ان کی سازشوں کو باطل کرنے کے لیے ان کا کوئی توڑ اور سدباب کریں البتہ اس مرحلے میں بھی عدالت، تقویٰ اور اسلامی اخلاق کا اصول فراموش نہ کیا جائے۔ اگر مسلمان اپنے مخالفین کے مقابلے میں اس ہمہ گیر طریقہ کار کو اختیار کرتے تو شاید آج اسلام ساری دنیا یا اس کے زیادہ تر حصے پر چھایا ہوا ہوتا۔

نعمتوں کی سورت ـــــــ سورۂ نحل کے بارے میں آخری بات

جیسا کہ ہم نے اس سورہ کی ابتداء میں کہا ہے اس سورہ میں جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ خدا کی گوناگوں نعمات ہیں چاہے وہ مادی ہوں یا روحانی ظاہری ہوں یا باطنی اور انفرادی ہوں یا اجتماعی۔ اس سورہ کو جو نعمتوں کی سورت کہا جاتا ہے تو وہ اسی لحاظ سے ہے۔

اس سورہ کی آیات کے مطالعے اور تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں تقریباً چالیس چھوٹی بڑی مادی اور روحانی نعمتوں کا ذکر ہے ہم انھیں ذیل میں فہرست وار پیش کرتے ہیں۔ اور ہم تاکید کرتے ہیں کہ ان کا مقصد پہلے توحید اور عظمتِ خالق کی تعلیم ہے اور اس کے بعد ان نعمتوں کے خالق سے انسان کے میلان کو تقویت پہنچانا ہے اور احساسِ تشکر کو ابھارنا ہے۔

۱۔ تخلیقِ فلک (خلق السمٰوٰت)۔

۲۔ خلقتِ زمین (والارض)۔

۳۔ چوپایوں کی پیدائش (والانعام خلقها)۔

۴۔ ان کی اُون اور چمڑے کے ذریعے لباس کی تیاری (لکم فیها دفء)۔

۵۔ جانوروں کے دیگر فائدے (ومنافع)۔

۶۔ جانوروں کے گوشت سے استفادہ (ومنها تأکلون)۔

۷۔ استقلالِ اقتصادی کے حسن سے فائدہ اٹھانا (ولکم فیها جمال)۔

۸۔ نقل و حمل کے لیے جانوروں سے کام لینا (وتحمل اثقالکم ـــ والخیل والبغال والحمیر لترکبوها)۔

۹۔ صراطِ مستقیم کی ہدایت (وعلی الله قصد السبیل)۔

۱۰۔ آسمان سے بارش کا نزول اور اس سے پینے کے پانی کی دستیابی (هو الذی انزل من السماء ماء لکم منه شراب)۔

۱۱۔ اس سے چراگاہوں کی نشوونما (ومنه شجر فیه تسیمون)۔

۱۲۔ اس سے فصلوں، زیتون، کھجور، انگور اور طرح طرح کے پھلوں کا اُگنا (ینبت لکم به الزرع

والزیتون والنخیل والاعناب ومن کل الثمرات)۔

۱۳۔ رات اور دن کا مسخر ہونا (وسخر لکم الیل والنھار)۔

۱۴۔ سورج اور چاند کی تسخیر (والشمس والقمر)۔

۱۵۔ ستاروں کی تسخیر (والنجوم)۔

۱۶۔ گوناگوں مخلوق کہ جو زمین میں پیدا کی گئی ہے (وما ذرأ لکم فی الارض مختلفا الوانہ)۔

۱۷۔ سمندروں میں موجود جانوروں کے گوشت اور جواہرات سے استفادہ کے لیے سمندروں کی تسخیر (وھوالذی سخرالبحر لتأ کلوا منہ لحمًا طریًا وتستخرجوا منہ حلیۃ تلبسونھا)۔

۱۸۔ سینۂ آب پر کشتیوں کا چلنا (وتری الفلک مواخر فیہ)۔

۱۹۔ پہاڑوں کا پیدا کرنا کہ جو زمین کو ٹھہرائے ہوئے ہیں (والقٰی فی الارض رواسی ان تمید بکم)۔

۲۰۔ دریاؤں اور نہروں کا پیدا کرنا (وانھارا)۔

۲۱۔ آپس میں مربوط راستے پیدا کرنا (وسبلًا)۔

۲۲۔ راستے پہچاننے کے لیے علامات پیدا کرنا (وعلامات)۔

۲۳۔ رات کے وقت راستہ پہچاننے کے لیے ستاروں سے استفادہ کرنا (وبالنجم ھم یھتدون)۔

۲۴۔ آب باراں کے ذریعے مردہ زمینوں کو زندہ کرنا (واللہ انزل من السماء ماء فاحیا بہ الارض بعد موتھا)۔

۲۵۔ خالص اور عمدہ دودھ پیدا کرنا کہ جو خون اور ہضم شدہ غذا کے درمیان میں سے نکلتا ہے (نسقیکم مما فی بطونہ من بین فرث ودم لبنًا خالصًا سائغًا للشاربین)۔

۲۶۔ کھجور اور انگور سے حاصل شدہ چیزیں (ومن ثمرات النخیل والاعناب تتخذون منہ سکرًا ورزقًا حسنًا)۔

۲۷۔ شہد کہ جو شفابخش غذا ہے (فیہ شفاء للناس)۔

۲۸۔ انسان کے لیے اس کی اپنی نوع میں سے ہمسر اور شریک حیات پیدا کرنا (واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجًا)۔

۲۹۔ اولاد جیسی نعمت (وجعل لکم من ازواجکم بنین وحفدۃ)۔

۳۰۔ طرح طرح کا پاکیزہ رزق ـــــــ وسیع مفہوم کے اعتبار سے (ورزقکم من الطیبات)۔

۳۱۔ سماعت کی نعمت (وجعل لکم السمع)

۳۲۔ آنکھوں کی نعمت (والابصار)۔

۳۳۔ عقل و ہوش کی نعمت (والافئدۃ)۔

۳۴۔ ٹھہرے ہوئے مسکن اور گھر (واللہ جعل لکم من بیوتکم سکنًا)۔

۳۵۔ چلتے پھرتے گھر (خیمے)۔ (وجعل لکم من جلود الانعام بیوتًا)۔

۳۶۔ اسبابِ زندگی کہ جو اُون، کھال اور جانوروں کے بالوں سے بنائے جاتے ہیں (ومن اصوافها واوبارها واشعارها اثاثًا ومتاعًا الی حین)۔

۳۷۔ سایے کی نعمت (واللہ جعل لکم مما خلق ظلالًا)۔

۳۸۔ پہاڑوں میں قابلِ اطمینان پناہ گاہوں کی نعمت (وجعل لکم من الجبال اکنانًا)۔

۳۹۔ طرح طرح کے لباس جو انسان کو سردی اور گرمی سے بچاتے ہیں (وجعل لکم سرابیل تقیکم الحر)۔

۴۰۔ زرہ اور لباسِ جنگ جو دشمن کی ضربوں سے بچاتا ہے (وسرابیل تقیکم بأسکم)۔

اور نعمتوں کے اس سلسلے میں مزید فرمایا گیا ہے:

کذٰلک یتم نعمتہ علیکم لعلکم تسلمون

اس طرح سے اللہ اپنی نعمتیں تم پر تمام کرتا ہے تاکہ تم اس کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرو۔

نعمتوں کے ذکر کا مقصد:

یاد دہانی کی ضرورت نہیں ہے کہ اس سورہ میں اور قرآن کی دیگر مختلف آیات میں نعماتِ الٰہی کا ذکر احسان جتلانے اور نام حاصل کرنے جیسے امور کے لیے نہیں ہے کیونکہ اللہ ان تمام چیزوں سے بالاتر و برتر ہے اور ہر شخص اور ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ یہ سب کچھ تعمیری، تربیتی اور اصلاحی مقاصد کے لیے ہے وہ مقاصد کہ جو انسان کو مادی اور روحانی اعتبار سے آخری ممکن حد تک کمال و ارتقاء عطا کرنے کے لیے ہیں۔

اس امر کے لیے واضح ترین دلیل وہ جملے ہیں کہ جو گزشتہ بہت سی آیات کے آخر میں آئے ہیں یہ سب تنوع کے باوجود انسان کی نشوونما اور تربیت کے بارے میں ہیں۔ اسی سورہ کی آیہ ۱۴ میں سمندروں کی تسخیر کی نعمت بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

لعلکم تشکرون

شاید کہ تم شکر کرو۔

آیت ۱۵ میں پہاڑوں دریاؤں اور راستوں کی نعمت بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

لعلکم تھتدون

شاید کہ تم ہدایت پا جاؤ۔

آیت ۴۴ میں عظیم ترین روحانی نعمت یعنی آیاتِ قرآن کے نزول کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:۔

ولعلھم یتفکرون

اور شاید کہ وہ غور و فکر کریں۔

آیت ۷۸ میں بہت اہم نعمت ـــــ شناخت و معرفت کے وسائل (کان، آنکھ اور عقل) کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے:

لعلکم تشکرون

شاید کہ تم شکر کرو۔

آیت ۸۱ میں پروردگار کی نعمتوں کی تکمیل کی طرف اشارہ کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے:

لعلکم تسلمون

شاید کہ تم سرِ تسلیم خم کرو۔

آیت ۹۰ میں عدل و احسان کو اختیار کرنے، فحشاء، منکر اور ظلم کے خلاف جنگ کرنے کے احکام کے بعد فرمایا گیا ہے:

لعلکم تذکرون

شاید کہ تم تذکر حاصل کرو اور توجہ دو۔

درحقیقت ان چھ مواقع پر پانچ مقاصد کی طرف اشارہ ہوا ہے:

۱۔ تشکر

۲۔ ہدایت

۳۔ تفکر

۴۔ دعوتِ حق پر سرِ تسلیم خم کرنا

۵۔ تذکر و یاد آوری

یہ سب امور ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ انسان سب سے پہلے غور و فکر اور سوچ بچار کرتا ہے جب بھول جائے تو اسے یاد دلایا جاتا ہے اس کے بعد اس میں نعمت عطا کرنے والے کے لیے احساسِ تشکر بیدار ہوتا ہے اور وہ اس کے راستے کی ہدایت پاتا ہے اور آخر کار اس کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔

گویا یہ پانچ مقاصد انسانی کمال کی زنجیر کی کڑیاں ہیں بلاشبہ اگر یہ راستہ صحیح طور پر طے کر لیا جائے تو اس کے خاطر خواہ نتائج نکلتے ہیں اور شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ان نعمتوں کے اجتماعی یا انفرادی صورت میں تذکرے کا مقصد کمال کے سوا اور کچھ نہیں۔

پروردگارا! تیری بے پایاں نعمتیں ہمارے سارے وجود پر محیط ہیں ـــــ ہم تیری نعمتوں میں مستغرق لیکن ابھی ہم نے تجھے پہچانا نہیں۔

بارِالٰہا! ہمیں ایسا ادراک اور ایسی نگاہ عطا فرما کہ جو تیرے عشق کے راستوں کو ہمارے لیے واضح کر دے۔ اور ایسی توفیق بخش کہ جو تیرے عشق کے راستے سے پیچ و خم میں ہماری مددگار ہو

اور ہمیں شکرگذاروں کی منزلِ مقصود تک پہنچادے۔

خداوندا! تو ہماری احتیاج و نیاز کو ہر کسی سے بہتر جانتا ہے اور ہمارے ذاتی تقاضوں کو خود ہم سے بہتر پہچانتا ہے۔ ہمیں توفیق دے کہ ہم ایسے ہو جائیں جیسا تو چاہتا ہے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم اس سے بہتر ہو جائیں کہ جو لوگ ہمارے متعلق سوچتے ہیں۔

معبودا! اس وقت تیری عظیم آسمانی کتاب کا یہ حصہ ختم ہو رہا ہے۔ ماہِ شعبان کا آخر ہے اور ہم تیری رحمت کے مہینہ رمضان المبارک کے آستانے پر آپہنچے ہیں۔ اپنی خاص رحمت ہمارے شاملِ حال فرما اور ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم اس تفسیر کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں۔

انك سميع مجيب

سورۂ نحل کا اختتام

سورۂ بنی اسرائیل

- مکہ میں نازل ہوئی
- اس میں ۔ ۱۱۱ آیتیں ہیں

تفسیر نمونہ جلد ۶ ۴۷۳ پ ۱۵ بنی اسرائیل

نام اور مقام نزول

اس کا مشہور نام "سورۂ بنی اسرائیل" ہے البتہ دیگر چند نام بھی ہیں۔ مثلاً:

"سورۂ اسراء"

"سورۂ سبحان" وغیرہ[1]

ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر نام اس سورت میں موجود مطالب کے حوالے سے ہے۔ سورہ بنی اسرائیل اسے اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس سورت کی ابتداء اور اختتام کا ایک اچھا خاصا حصّہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہے۔

"اسراء" اسے اس کی پہلی آیت کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسراء (یعنی معراج) کے بارے میں گفتگو کرتی ہے اور سورہ سبحان اسے اس کے پہلے لفظ کی وجہ سے کہتے ہیں۔

البتہ جن روایات میں اس سورہ کی فضیلت بیان کی گئی ہے ان میں اسے صرف "بنی اسرائیل" کہا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مفسرین نے اس سورہ کے لیے یہی نام انتخاب کیا ہے۔

بہرحال مشہور یہ ہے کہ اس سورہ کی تمام آیتیں مکہ میں نازل ہوئی ہیں اور اس کے مفاہیم و مضامین بھی مکی سورتوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ تاہم بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس کی کچھ آیتیں مدینہ میں نازل ہوئی ہیں لیکن پہلے والا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

فضیلت

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام صادق علیہ السلام سے اس سورت کی تلاوت کرنے والے کے لیے بہت زیادہ اجر و ثواب منقول ہے۔ ان روایات میں سے ایک کہ جو امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے اس میں آپؑ فرماتے ہیں:

من قرء سورة بنی اسرائیل فی کل لیلة جمعه لم یمت حتّٰی یدرك القائم ویکون من اصحابه

جو شخص ہر شب جمعہ سورہ بنی اسرائیل کی تلاوت کرے گا وہ اس وقت تک دنیا سے

---

[1] تفسیر آلوسی ج ۱۵ ص ۲۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(۱) سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَاؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔

(۱) پاک و منزہ ہے وہ اللہ کہ جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے گیا کہ جس کا ماحول پُر برکت ہے، تاکہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں۔ یقیناً وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

تفسیر

معراجِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اس سورت کی پہلی آیت میں "اسراء" کا ذکر ہے۔ راتوں رات جو رسول اللہؐ نے مسجد الحرام سے مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدس) کا سفر کیا تھا اس میں اس کا ذکر ہے۔ یہ سفر معراج کا مقدمہ بنا۔ یہ سفر جو رات کے بہت کم وقت میں مکمل ہوگیا کم از کم اس زمانے کے حالات، راستوں اور معمولات کے لحاظ سے کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ یہ بالکل اعجاز آمیز اور غیر معمولی تھا۔

پہلے فرمایا گیا ہے: منزہ ہے وہ خدا کہ جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ کی طرف لے گیا (سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ)۔

رات کی یہ غیر معمولی سیر اس لیے تھی تاکہ ہم اسے اپنی عظمت کی نشانیاں دکھائیں (لنریہ من اٰیاتنا)۔

آخر آیت میں فرمایا گیا ہے: اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے (انہ ھو السمیع البصیر)۔

نام اور مقام نزول

اس کا مشہور نام "سورۂ بنی اسرائیل" ہے البتہ دیگر چند نام بھی ہیں ۔ شلاً :

"سورۂ اسراء"

"سورۂ سبحان" وغیرہ[1]

ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر نام اس سورت میں موجود مطالب کے حوالے سے ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل اسے اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس سورت کی ابتداء اور اختتام کا ایک اچھا خاصا حصہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہے ۔

"اسراء" اسے اس کی پہلی آیت کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسراء (یعنی معراج) کے بارے میں گفتگو کرتی ہے اور سورہ سبحان اسے اس کے پہلے لفظ کی وجہ سے کہتے ہیں ۔

البتہ جن روایات میں اس سورہ کی فضیلت بیان کی گئی ہے ان میں اسے صرف "بنی اسرائیل" کہا گیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مفسرین نے اس سورہ کے لیے یہی نام انتخاب کیا ہے ۔

بہرحال مشہور یہ ہے کہ اس سورہ کی تمام آیتیں مکہ میں نازل ہوئی ہیں اور اس کے مفاہیم و مضامین بھی مکی سورتوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں ۔ تاہم بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس کی کچھ آیتیں مدینہ میں نازل ہوئی ہیں لیکن پہلے والا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ۔

فضیلت

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام صادق علیہ السلام سے اس سورت کی تلاوت کرنے والے کے لیے بہت زیادہ اجر و ثواب منقول ہے ۔ ان روایات میں سے ایک کہ جو امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے اس میں آپؑ فرماتے ہیں :

من قرء سورة بنی اسرائیل فی کل لیلة جمعه لم یمت حتّٰی یدرك القائم ویکون من اصحابه

جو شخص ہر شب جمعہ سورہ بنی اسرائیل کی تلاوت کرے گا وہ اس وقت تک دنیا سے

---

[1] تفسیر آلوسی ج ۱۵ ص ۲ ۔

نہ جائے گا جب تک ۔ قائمؑ ۔ کو نہ دیکھ لے اور وہ آپ کے یار و انصار میں سے ہوگا ۔

ہم نے بارہا اس امر کا تکرار کیا ہے کہ قرآن پاک کی سورتوں کا جو اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے وہ ہرگز صرف زبانی پڑھ لینے کے لیے نہیں ہے بلکہ ان روایات میں پڑھنے سے مراد ایسا پڑھنا ہے کہ جس میں غور و فکر اور سوچ بچار شامل ہو اور اس کے نتیجے میں انسان اس قرأت اور فکر کے تقاضوں کے مطابق عمل بھی کرے ۔

خصوصاً اسی سورہ کی فضیلت سے مربوط ایک روایت میں ہے :

فرّق قلبه عند ذكر الوالدين

اس سورہ کا قاری جب اس میں موجود ماں باپ کے بارے میں اللہ کی نصیحتوں تک پہنچتا ہے تو اس کے احساسات میں تحریک پیدا ہوتی ہے اور ماں باپ سے محبت کا جذبہ اس میں فزوں تر ہو جاتا ہے ۔

لہٰذا وہ شخص ایسے اجر کا حامل ٹھہرتا ہے ۔

اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ قرآنی الفاظ محترم اور اہم ہیں لیکن ۔۔ یہ الفاظ تمہید ہیں معانی و مفاہیم کے لیے اور معانی مقدمہ ہیں عمل کے لیے ۔

مضامین ایک نگاہ میں

ہم کہہ چکے ہیں ، جیسا کہ مشہور ہے یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ، لہٰذا فطری امر ہے کہ اس میں مکی سورتوں کی خصوصیات موجود ہیں ۔ ان میں دعوتِ توحید بھی ہے ، معاد کی جانب بھی توجہ دلائی گئی ہے مفید نصیحتیں بھی ہیں اور شرک ظلم ، انحراف اور کج روی کے خلاف بھی اس میں بہت سارا مواد ہے ۔ کہا جا سکتا ہے کہ مجموعی طور پر اس سورت کی آیتیں ان امور پر مشتمل ہیں :

(۱) نبوت کے دلائل ۔۔ بالخصوص قرآن اور معراج کے حوالے سے ۔

(۲) معاد سے مربوط بحثیں ۔۔ انجام کار ، اجر و ثواب ، نامہ اعمال اور اس کے نتائج ۔

(۳) سورہ کے آغاز اور اختتام پر بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک حصّہ ۔

(۴) ارادہ و اختیار کی آزادی ۔۔ اور یہ کہ ہر قسم کے اچھے برے عمل کا نتیجہ خود انسان کو بھگتنا پڑتا ہے ۔

(۵) اس جہان کی زندگی کا حساب کتاب دوسرے جہان کے لیے نمونہ ہے ۔

(۶) ہر سطح پر حق شناسی ۔۔ خصوصاً اعزا و اقربا کے بارے میں اور ان میں سے بھی خاص طور پر ماں باپ کے بارے میں

(۷) فضول خرچی، کنجوسی، اولادکشی، زنا، مالِ یتیم کھانا، کم فروشی، تکبر اور خونریزی سب حرام ہیں۔

(۸) توحید اور خدا شناسی سے متعلق مباحث۔

(۹) پیشِ حق فہم کی ہٹ دھرمی کے خلاف مقابلہ اور یہ کہ گناہ انسان اور حق کے درمیان پردہ ڈال دیتے ہیں۔

(۱۰) انسان کا مقام اور دوسری مخلوقات پر اس کی فضیلت۔

(۱۱) ہر قسم کی اخلاقی اور اجتماعی بیماری کے علاج کے لیے تاثیرِ قرآن۔

(۱۲) اعجازِ قرآن اور اس کے مقابلے کی عدم توانائی۔

(۱۳) شیطانی وسوسے اور ان کے خلاف مومنین کو تنبیہ۔

(۱۴) مختلف اخلاقی تعلیمات۔

(۱۵) تاریخِ انبیاء کے بعض نشیب و فراز ـــ تمام انسانوں کے لیے عبرت کے درس۔

بہرحال مجموعی طور پر عقائد، اخلاق اور معاشرت کے حوالے سے راہنمائی پر مبنی یہ ایک جامع اور کامل سورت ہے اور یہ مختلف میدانوں میں انسان کے ارتقاء و کمال کا زینہ بن سکتی ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ یہ سورت تسبیحِ خدا سے شروع ہوتی ہے اس کی حمد و تکبیر پر تمام ہوتی ہے تسبیح نشانی ہے ہر قسم کے عیب و نقص سے دوری اور پاک رہنے کی اور حمد و ثنا نشانی ہے صفاتِ فضیلت سے آراستہ ہونے کے لیے اور تکبیر کمال و عظمت کی طرف بڑھنے کے لیے علامت ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔

(۱) پاک و منزہ ہے وہ اللہ کہ جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے گیا کہ جس کا ماحول پُر برکت ہے، تاکہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں۔ یقیناً وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

تفسیر

معراجِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اس سورت کی پہلی آیت میں "اسراء" کا ذکر ہے۔ راتوں رات جو رسول اللہؐ نے مسجد الحرام سے مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدس) کا سفر کیا تھا اس میں اس کا ذکر ہے۔ یہ سفر معراج کا مقدمہ بنا۔ یہ سفر جو رات کے بہت کم وقت میں مکمل ہو گیا کم از کم اس زمانے کے حالات، راستوں اور معمولات کے لحاظ سے کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ یہ بالکل اعجاز آمیز اور غیر معمولی تھا۔

پہلے فرمایا گیا ہے: منزہ ہے وہ خدا کہ جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ کی طرف لے گیا (سبحان الذی اسرٰی بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ)۔

رات کی یہ غیر معمولی سیر اس لیے تھی تاکہ ہم اسے اپنی عظمت کی نشانیاں دکھائیں (لنریہ من اٰیاتنا)۔

آخر آیت میں فرمایا گیا ہے: اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے (انہ ھو السمیع البصیر)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر اللہ نے اپنے پیغمبر کو اس افتخار کے لیے چنا ہے تو یہ بلاوجہ نہیں ہے کیونکہ رسولؐ کی گفتار اور ان کا کردار اس قابل تھا کہ یہ لباس اُن کے بدن کے لیے بالکل زیبا تھا۔ اللہ نے اپنے رسولؐ کی گفتار سنی، اس کا کردار دیکھا اور اس مقام کے لیے اس کی لیاقت تسلیم کرلی۔

اس جملے کے بارے میں بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس اعجاز کے منکرین کو تہدید کی جائے کہ اللہ ان کی باتیں سنتا ہے، ان کے اعمال دیکھتا ہے اور ان کی سازش سے آگاہ ہے۔

یہ آیت نہایت مختصر اور بچے تلے الفاظ پر مشتمل ہے تاہم اس رات کے معجزنما سفر کے بہت سے پہلو اس آیت سے واضح ہوجاتے ہیں:

(۱) لفظ "اسریٰ" نشاندہی کرتا ہے کہ یہ سفر رات کے وقت ہوا کیونکہ "اسراء" عربی زبان میں رات کے سفر کے معنی میں ہے جبکہ لفظ "سیر" دن کے سفر کے لیے بولا جاتا ہے۔

(۲) لفظ "لیلا" ایک تو "اسرا" کے مفہوم کی تاکید ہے اور دوسرے اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ یہ سارے کا سارا سفر ایک ہی رات میں ہوا اور اہم بات بھی یہی ہے کہ مسجد الحرام اور مسجد الاقصیٰ کے درمیان ایک سو فرسخ سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ اس زمانے میں یہ فاصلہ کئی دنوں بلکہ کئی ہفتوں میں طے کیا جاتا تھا جبکہ شب اسرا تھوڑے سے وقت میں یہ سفر مکمل ہوگیا۔

(۳) لفظ "عبد" نشاندہی کرتا ہے کہ یہ افتخار و اکرام رسول اللہؐ کے مقام عبودیت کی وجہ سے تھا کیونکہ انسان کے لیے سب سے بلند منزل یہی ہے کہ وہ اللہ کا سچا اور صحیح بندہ ہوجائے۔ اس کی بارگاہ کے سوا کہیں ماتھا نہ جھکائے، اس کے فرمان کے علاوہ کسی کے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرے، جو بھی کام کرے فقط خدا کے لیے ہو اور جو بھی قدم اٹھائے اُسی کی رضا مطلوب ہو۔

(۴) "عبد" کی تعبیر یہ واضح کرتی ہے کہ سفر عالم بیداری میں تھا اور یہ جسمانی سیر تھی نہ کہ روحانی کیونکہ سیر روحانی کا کوئی معقول معنی خواب یا خواب کی مانند حالت کے سوا نہیں ہے لیکن لفظ "عبد" نشاندہی کرتا ہے کہ جسم و روح پیغمبرؐ اس سفر میں شریک تھے۔ یہ اعجاز جن کی سمجھ میں نہیں آتا انہوں نے جو زیادہ سے زیادہ بات کی ہے یہ ہے کہ انہوں نے آیت کی توجیہ کے نام پر اسے روحانی کہہ دیا ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کہے کہ میں فلاں شخص کو فلاں جگہ سے لے گیا تو اس کا یہ مفہوم نہیں ہوگا کہ عالم خواب میں یا عالم خیال میں یا فکری طور پر لے گیا۔

(۵) اس سفر کا آغاز مکہ کی مسجد الحرام سے ہوا وہاں سے بیت المقدس میں موجود مسجد الاقصیٰ پہنچے (اور یہ سفر معراج آسمانی کا مقدمہ تھا کہ جس کے بارے میں ہم بعد میں دلائل پیش کریں گے)۔

البتہ تمام مکہ کو بھی چونکہ احترام کی وجہ سے مسجد الحرام کہا جاتا ہے لہٰذا مفسرین میں اس بات پر اختلاف

ہے کہ رسول اللہؐ کا یہ سفر خانہ کعبہ کے قریب سے شروع ہوا تھا یا کسی عزیز رشتہ دار کے گھر سے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ یہ سیر خانہ کعبہ سے شروع ہوئی۔

(۶) اس سیر کا مقصد یہ تھا کہ رسول اللہؐ عظمتِ الٰہی کی نشانیوں کا مشاہدہ کریں۔ آسمانوں کی سیر بھی اسی مقصد سے تھی کہ پیغمبر اکرمؐ کی باعظمت روح ان آیاتِ بینات کا مشاہدہ کر کے اور بھی عظمت و بزرگی پا لے اور انسانوں کی ہدایت کے لیے آپؐ خوب تیار ہو جائیں۔ یہ سفرِ معراج بعض کوتاہ فکر لوگوں کے خیال کے برعکس اس لیے نہ تھا کہ آپ خدا کو دیکھیں۔ ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ خدا آسمانوں میں رہتا ہے۔

بہرحال اگرچہ رسول اللہؐ عظمتِ الٰہی کو پہچانتے تھے اور اس کی خلقت کی عظمت سے بھی آگاہ تھے لیکن بقول : وَلٰی

شنیدن کے بود مانند دیدن

سورہ نجم کی آیات میں بھی اس سفر کے آخری حصے یعنی معراج آسمانی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی

اس سفر میں اس نے اپنے رب کی عظیم آیات دیکھیں۔

(۷) "بارکنا حولہ"۔ یہ مطلب واضح کرتا ہے کہ مسجدِ اقصیٰ علاوہ اس کے کہ خود مقدس ہے اس کے اطراف کی سرزمین بھی مبارک اور بابرکت ہے۔ ممکن ہے یہ اس کی ظاہری برکات کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ سرسبز و شاداب سرزمین ہے۔ درخت اس زمین پر سایہ فگن ہیں۔ پانی وہاں جاری رہتا ہے اور یہ ایک آباد علاقہ ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی روحانی برکات کی طرف اشارہ ہو کیونکہ یہ سرزمین ایک طویل عرصہ اللہ کے عظیم نبیوں اور نورِ توحید و خدا پرستی کا مرکز رہی ہے۔

(۸) جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں "انہ ھو السمیع البصیر" کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ رسول اللہؐ کو اس نعمت کی عطا بلا وجہ نہ تھی بلکہ اس اہلیت و لیاقت کے باعث تھی کہ جو آپ کی گفتار و کردار سے ہویدا تھی اور اللہ اس سے خوب آگاہ تھا۔

(۹) ضمنی طور پر لفظ "سبحان" اس بات کی دلیل ہے اور رسول اللہؐ کا یہ سفر بذاتِ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ ہر عیب و نقص سے پاک و منزہ ہے۔

(۱۰) "من اٰیاتنا" میں لفظ "من" نشاندہی کرتا ہے کہ آیاتِ عظمتِ الٰہی اس قدر زیادہ ہیں کہ اپنی تمام تر عظمت کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس باعظمت سفر میں صرف بعض کا ہی مشاہدہ کیا۔

مسئلہ معراج

علماء اسلام کے درمیان مشہور یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس وقت مکہ میں تھے تو ایک ہی رات میں آپ قدرتِ الٰہی سے مسجد الحرام سے مسجد اقصٰی پہنچے کہ جو بیت المقدس میں ہے۔ وہاں سے آپ آسمانوں کی طرف گئے آسمانی وسعتوں میں عظمتِ الٰہی کے آثار مشاہدہ کیے اور اسی رات مکہ واپس آگئے۔

نیز یہ بھی مشہور ہے کہ یہ زمینی اور آسمانی سیر جسم اور روح کے ساتھ تھی البتہ یہ سیر چونکہ بہت عجیب و غریب اور بے نظیر تھی لہٰذا بعض حضرات نے اس کی توجیہ کی اور اسے معراج روحانی قرار دیا اور کہا کہ یہ ایک طرح کا خواب تھا یا مکاشفہ روحی تھا لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ بات آیات کے ظاہری مفہوم کے بالکل خلاف ہے کیونکہ ظاہر آیات اس معراج کے جسمانی ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

بہر حال اس بحث سے بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں مثلاً:

۱۔ قرآن، حدیث اور تاریخ کی نظر سے معراج کی کیفیت کیا تھی؟

۲۔ شیعہ اور سُنی علماء اسلام کا اس سلسلے میں کیا عقیدہ ہے؟

۳۔ معراج کا مقصد کیا تھا؟

۴۔ دورِ حاضر کے علم اور سائنس کی رُو سے معراج کا کیا امکان ہے؟

ان تمام مسائل کا کما حقہ جائزہ پیش کرنا اگرچہ تفسیر کی حدود سے باہر ہے تاہم ہم کوشش کریں گے کہ مختصراً ان تمام مسائل کو قارئین محترم کے سامنے ذکر کریں۔

۱۔ **معراج ۔ قرآن وحدیث کی نظر میں:** قرآن حکیم کی دو سورتوں میں اس مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پہلی سورت ۔ یہی سورۂ بنی اسرائیل ہے۔ اس میں اس سفر کے ابتدائی حصے کا تذکرہ ہے ۔ یعنی مکہ کی مسجد الحرام سے بیت المقدس کی مسجد الاقصٰی تک کا سفر۔

اس سلسلے کی دوسری سورت ۔ سورۂ نجم ہے۔ اس کی آیت ۱۳ تا ۱۸ میں معراج کا دوسرا حصہ بیان کیا گیا ہے اور یہ آسمانی سیر کے متعلق ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۙ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۝ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۙ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝

ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ ۔

رسول اللہ نے فرشتۂ وحی جبریل کو اس کی اصل صورت میں دوسری مرتبہ دیکھا (پہلے

آپ اسے نزولِ وحی کے آغاز میں کوہِ حرا میں دیکھ چکے تھے) یہ ملاقات بہشت جاوداں کے پاس ہوئی۔ یہ منظر دیکھتے ہوئے رسول اللہؐ کسی اشتباہ کا شکار نہ تھے۔ آپؐ نے عظمتِ الٰہی کی عظیم نشانیاں مشاہدہ کیں۔

یہ آیات کہ جو اکثر مفسرین کے بقول، واقعۂ معراج سے متعلق ہیں یہ بھی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ واقعہ عالمِ بیداری میں پیش آیا خصوصاً "مازاغ البصر وما طغٰی"۔ اس امر کا شاہد ہے کہ رسول اللہؐ کی آنکھ کسی خطا، اشتباہ اور انحراف سے دوچار نہیں ہوئی۔

اس واقعے کے سلسلے میں مشہور اسلامی کتابوں میں بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں۔

علماء اسلام نے ان روایات کے تواتر اور شہرت کی گواہی دی ہے۔ ہم نمونے کے طور پر چند روایات ذکر کرتے ہیں:

۱۔ عظیم فقیہ و مفسر شیخ طوسی تفسیر تبیان میں زیر بحث آیت کے ذیل میں کہتے ہیں:

شیعہ علماء کا موقف ہے کہ جس رات اللہ اپنے رسولؐ کو مکہ سے بیت المقدس لے گیا اسی رات اس نے آپؐ کو آسمانوں کی طرف بلند کیا اور آپؐ کو اپنی عظمت کی نشانیاں دکھائیں اور یہ سب کچھ عالمِ بیداری میں تھا خواب میں نہ تھا۔

۲۔ بلند مرتبہ مفسر مرحوم طبرسی اپنی تفسیر مجمع البیان میں سورۂ نجم کی آیات کے ذیل میں کہتے ہیں:

ہماری روایات میں مشہور یہ ہے کہ اللہ اپنے رسولؐ کو اسی جسم کے ساتھ عالمِ بیداری و حیات میں آسمانوں پر لے گیا اور اکثر مفسرین کا یہی عقیدہ ہے۔

۳۔ مشہور محدث علامہ مجلسی بحار الانوار میں کہتے ہیں:

مسجد الحرام سے بیت المقدس کی طرف اور وہاں سے آسمانوں کی طرف رسولِ اسلامؐ کی سیر ایسی بات ہے جس پر آیاتِ قرآن اور شیعہ و سُنی متواتر احادیث دلالت کرتی ہیں۔ اس کا انکار یا اسے روحانی معراج کہنا یا عالمِ خواب کی بات قرار دینا۔ آئمہ ہدیٰؑ کی احادیث سے عدمِ اطلاع یا یقین کی کمزوری کے باعث ہے۔

اس کے بعد علامہ مجلسی مزید کہتے ہیں:

اگر ہم اس واقعے سے متعلقہ احادیث جمع کرنا چاہیں تو ایک ضخیم کتاب بن جائیگی[1]

۴۔ اہل سنت کے معاصر علماء میں سے الازہر کے منصور علی ناصف مشہور کتاب "التاج" کے مصنف ہیں۔ انہوں نے اس میں احادیث معراج کو جمع کیا ہے۔

---

[1] بحار الانوار، ج ۶ طبع قدیم صفحہ ۳۶۸۔

۵۔ مشہور مفسر فخرالدین رازی نے زیر بحث آیت کے ذیل میں واقعہ معراج کے امکان پر بہت سی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں۔ دلائل ذکر کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں :

> حدیث کے لحاظ سے احادیثِ معراج مشہور روایات میں سے ہیں کہ جو اہل سنت کی کتب صحاح میں نقل ہوئی ہیں اور ان کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ سے بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں کی سیر کی ۔

۶۔ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز ادارہ "بحوث علیہ و افتاء، دعوۃ و ارشاد" کے سربراہ ہیں وہ دورِ حاضر کے متعصب وہابی علماء میں سے ہیں۔ وہ اپنی کتاب "التحذیر من البدع" میں کہتے ہیں :

> اس میں شک نہیں ہے کہ معراج ان عظیم نشانیوں میں سے ہے جو رسولؐ کی صداقت اور بلند منزلت پر دلالت کرتی ہیں ۔

یہاں تک کہ وہ کہتے ہیں :

> رسول اللہؐ سے اخبار متواتر نقل ہوئی ہیں کہ اللہ انہیں آسمانوں پر لے گیا اور آپؐ پر آسمانوں کے دروازے کھول دیئے [1]

اس نکتے کا ذکر کرنا بھی انتہائی ضروری ہے کہ احادیث معراج میں بعض جعلی یا ضعیف ہیں کہ جو کسی طرح سے بھی قابل قبول نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عظیم مفسر طبرسی مرحوم نے اسی زیر بحث آیت کے ذیل میں احادیث معراج کو ان چار قسموں میں تقسیم کیا ہے :

(۱) وہ روایات جو متواتر ہونے کی وجہ سے قطعی ہیں مثلاً اصل واقعہ معراج ۔

(۲) وہ احادیث کہ عقلی لحاظ سے جنہیں قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں اور روایات میں اس امر کی تصریح کی گئی ہے۔ مثلاً صحن آسمان میں عظمتِ الٰہی کی بہت سی نشانیوں کا مشاہدہ کرنا ۔

(۳) وہ روایات جو ہمارے ہاں موجود اصول وضوابط پر تو پوری نہیں اترتیں البتہ ان کی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ مثلاً وہ احادیث جو کہتی ہیں کہ رسول اللہؐ نے آسمانوں میں ایک گروہ کو جنت میں اور ایک گروہ کو دوزخ میں دیکھا۔ کہنا چاہیئے کہ اہل جنت اور اہل دوزخ کی صفات دیکھیں (یا برزخ کی جنت اور دوزخ کی)۔

(۴) وہ روایات جو نامعقول اور باطل امور پر مشتمل ہیں اور ان کی کیفیت ان کے جعلی ہونے پر گواہ ہے۔ مثلاً وہ روایات جو کہتی ہیں کہ رسول اللہؐ نے خدا کو واضح طور پر دیکھا، اس کے ساتھ باتیں کیں اور اس کے پاس بیٹھے۔ ایسی احادیث کسی دلیل و منطق کے لحاظ سے درست نہیں ہیں اور بلاشبہ اس قسم کی روایات من گھڑت اور جعلی ہیں ۔

---

[1] التحذیر ص ۔

واقعۂ معراج کی تاریخ کے سلسلے میں اسلامی مورخین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ واقعہ بعثت کے دسویں سال ۲۷ رجب کی شب پیش آیا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ بعثت کے بارہویں سال ۱۷ رمضان المبارک کی رات وقوع پذیر ہوا جبکہ بعض اسے اوائل بعثت میں ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اس کے وقوع پذیر ہونے کی تاریخ میں اختلاف اصل واقعہ پر اختلاف میں حائل نہیں ہوتا۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ صرف مسلمان ہی معراج کا عقیدہ نہیں رکھتے، دیگر ادیان کے پیروکاروں میں بھی یہ عقیدہ کم و بیش موجود ہے۔ ان میں سے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں یہ عقیدہ عجیب تر صورت میں نظر آتا ہے جیسا کہ انجیل مرقس کے باب ۶، لوقا کے باب ۲۴ اور یوحنا کے باب ۲۱ میں ہے کہ:

> عیسیٰ مصلوب ہونے کے بعد دفن ہو گئے تو مُردوں میں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور چالیس روز تک لوگوں میں موجود رہے پھر آسمان کی طرف چڑھ گئے (اور ہمیشہ کے لیے معراج پر چلے گئے)۔

ضمناً یہ وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ بعض اسلامی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض گزشتہ انبیاء کو بھی معراج نصیب ہوئی تھی۔

معراج جسمانی تھی یا روحانی؟

شیعہ اور سنی علمائے اسلام کے درمیان مشہور یہ ہے کہ یہ واقعہ عالم بیداری میں صورت پذیر ہوا۔ سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت اور سورہ نجم کی مذکورہ آیات کا ظاہری مفہوم بھی اس امر کا شاہد ہے کہ یہ واقعہ بیداری کی حالت میں پیش آیا۔

تواریخ اسلامی بھی اس امر پر شاہد صادق ہیں۔ تاریخ کہتی ہے:

> جس وقت رسول اللہؐ نے واقعۂ معراج کا ذکر کیا تو مشرکین نے شدت سے اس کا انکار کر دیا اور اسے آپؐ کے خلاف ایک بات بنا لیا۔

یہ بات گواہی دیتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز خواب یا مکاشفۂ روحانی کے مدعی نہ تھے ورنہ مخالفین اس قدر شور و غوغا نہ کرتے۔

یہ جو حسن بصری سے روایت ہے کہ:

> کان فی المنام رؤیا رأھا
>
> یہ واقعہ خواب میں پیش آیا۔

اور اسی طرح جو حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ:

> واللہ ما فقد جسد رسول اللہ ولکن عرج بروحہ
>
> خدا کی قسم بدن رسول اللہؐ ہم سے جدا نہیں ہوا صرف آپؐ کی روح آسمانوں پر گئی۔

ایسی روایات ظاہراً سیاسی پہلو رکھتی ہیں ۔[1]

معراج کا مقصد

گزشتہ مباحث پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معراج کا مقصد یہ نہیں کہ رسول اکرمؐ دیدارِ خدا کے لیے آسمانوں پر جائیں، جیسا کہ سادہ لوح افراد خیال کرتے ہیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض مغربی دانشور بھی ناآگاہی کی بناء پر دوسروں کے سامنے اسلام کا چہرہ بگاڑ کر پیش کرنے کے لیے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک مسٹر "گیورگیو" بھی ہیں۔ وہ اپنی کتاب "محمدؐ وہ پیغمبر ہیں جنہیں پھر سے پہچاننا چاہیئے"[2] میں کہتے ہیں:

> محمدؐ اپنے سفرِ معراج میں ایسی جگہ پہنچے کہ انہیں خدا کے قلم کی آواز سنائی دی انہوں نے سمجھا کہ اللہ اپنے بندوں کے حساب کتاب میں مشغول ہے البتہ وہ اللہ کے قلم کی آواز تو سنتے تھے مگر انہیں اللہ دکھائی نہ دیتا تھا کیونکہ کوئی شخص خدا کو نہیں دیکھ سکتا خواہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔

یہ عبارت نشاندہی کرتی ہے کہ قلم لکڑی کا تھا، ایسا کہ کاغذ پر لکھتے وقت لرزتا تھا اور آواز پیدا کرتا تھا۔

اسی طرح کی اور بہت ساری خرافات اس میں موجود ہیں۔

جبکہ مقصدِ معراج یہ تھا کہ اللہ کے عظیم پیغمبر کائنات میں بالخصوص عالم بالا میں موجود عظمت الٰہی کی نشانیوں کا مشاہدہ کریں اور انسانوں کی ہدایت و رہبری کے لیے ایک نیا ادراک اور نئی بصیرت حاصل کریں۔

امام صادق علیہ السلام سے مقصدِ معراج پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

> أن الله لا یوصف بمکان، ولا یجری علیه زمان، ولکنه عز وجل اراد أن یشرف به ملائکته وسکان سماواته، ویکرمهم بمشاهدته، ویریه من عجائب عظمته مایخبر به بعد هبوطه۔

> خدا ہرگز کوئی مکان نہیں رکھتا اور نہ اس پر کوئی زمانہ گزرتا ہے لیکن وہ چاہتا تھا کہ فرشتوں اور آسمان کے باسیوں کو اپنے پیغمبر کی تشریف آوری سے عزت بخشے اور انہیں آپ کی زیارت کا شرف عطا کرے نیز آپ کو اپنی عظمت کے عجائبات دکھائے تاکہ واپس آکر آپ انہیں لوگوں سے بیان کریں[3]

---

[1] حسن بصری اور حضرت عائشہ سے مروی روایات بذاتِ خود محلِ اشکال ہیں کیونکہ واقعۂ معراج مکہ مکرمہ میں پیش آیا تھا۔ (ثاقب)

[2] مذکورہ کتاب کے فارسی ترجمے کا نام ہے "محمدؐ پیغمبری کہ از نو باید شناخت" صفحہ ۱۲۵ دیکھیے۔

[3] تفسیر برہان، ج ۲ صفحہ ۴۰۰۔

معراج اور دورِ حاضر کا علم اور سائنس

گزشتہ زمانے میں بعض فلاسفہ بطلیموس کی طرح یہ نظریہ رکھتے تھے کہ نو آسمان پیاز کے چھلکے کی طرح ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔ واقعہ معراج کو قبول کرنے میں ان کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ان کا یہی نظریہ تھا۔ ان کے خیال میں اس طرح تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ آسمان شگافتہ ہو گئے تھے اور پھر آپس میں مل گئے تھے[1]

لیکن بطلیموسی نظریہ ختم ہو گیا تو آسمانوں کے شگافتہ ہونے کا مسئلہ ہی ختم ہو گیا البتہ علم ہیئت میں جو ترقی ہوئی ہے اس سے معراج کے سلسلے میں نئے سوالات ابھرے ہیں مثلاً:

(۱) ایسے فضائی سفر میں پہلی رکاوٹ کشش ثقل ہے کہ جس پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے غیر معمولی وسائل و ذرائع کی ضرورت ہے کیونکہ زمین کے مدار اور مرکز ثقل سے نکلنے کے لیے کم از کم چالیس ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ رفتار کی ضرورت ہے۔

(۲) دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ زمین کے باہر خلا میں ہَوا نہیں ہے جبکہ ہَوا کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔

(۳) تیسری رکاوٹ ایسے سفر میں اُس حصے میں سورج کی جلا دینے والی تپش ہے کہ جس حصے پر سورج کی مستقیماً روشنی پڑ رہی ہے اور اسی طرح اس حصے میں مار ڈالنے والی سردی ہے کہ جس میں سورج کی روشنی نہیں پڑ رہی۔

(۴) اس سفر میں چوتھی رکاوٹ وہ خطرناک شعاعیں ہیں کہ جو فضائے زمین سے اوپر موجود ہیں مثلاً کاسمک ریز Cosmic Rays الٹراوائلٹ ریز Ultra Violet Rays اور ایکس ریز X-Rays۔ یہ شعاعیں اگر تھوڑی مقدار میں انسانی بدن پر پڑیں تو بدن کے آرگانزم Organism کے لیے نقصان دہ نہیں ہیں لیکن فضائے زمین کے باہر یہ شعاعیں بہت تباہ کن ہوتی ہیں۔ (زمین پر رہنے والوں کے لیے زمین کے اوپر موجود فضا کی وجہ سے ان کی تابش ختم ہو جاتی ہے)۔

(۵) ایک اور مشکل اس سلسلے میں یہ ہے کہ خلا میں انسان بے وزنی کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے اگرچہ تدریجاً بے وزنی کی عادت پیدا کی جاسکتی ہے لیکن اگر زمین کے باسی بغیر کسی تیاری اور تمہید کے خلا میں جا پہنچیں تو بے وزنی سے نمٹنا بہت ہی مشکل یا ناممکن ہے۔

(۶) آخری مشکل اس سلسلے میں زمانے کی مشکل ہے اور یہ نہایت اہم رکاوٹ ہے کیونکہ دورِ حاضر کے

---

[1] بعض قدیم فلاسفہ کا نظریہ تھا کہ آسمانوں میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اصطلاح میں وہ کہتے تھے کہ افلاک میں "خرق" (پھٹنا) اور "التیام" (ملنا) ممکن نہیں۔

سائنسی علوم کے مطابق روشنی کی رفتار ہر چیز سے زیادہ ہے اور اگر کوئی شخص آسمانوں کی سیر کرنا چاہے تو ضروری ہے کہ اس کی رفتار روشنی کی رفتار سے زیادہ ہو۔

ان امور کے جواب میں ان نکات کی طرف توجہ ضروری ہے:

(ا) ہم جانتے ہیں کہ فضائی سفر کی تمام تر مشکلات کے باوجود آخرکار انسان علم کی قوت سے اس پر دسترس حاصل کر چکا ہے اور سوائے زمانے کی مشکل کے باقی تمام مشکلات حل ہو چکی ہیں اور زمانے والی مشکل بھی بہت دور کے سفر سے مربوط ہے۔

(ii) اس میں شک نہیں کہ مسئلہ معراج عمومی اور معمول کا پہلو نہیں رکھتا بلکہ یہ اللہ کی لامتناہی قدرت و طاقت کے ذریعے صورت پذیر ہوا اور انبیاء کے تمام معجزات اسی قسم کے تھے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ معجزہ عقلاً محال نہیں ہونا چاہیئے اور یہ معجزہ بھی عقلاً ممکن ہے ۔ باقی معاملات اللہ کی قدرت سے حل ہو جاتے ہیں۔

جب انسان یہ طاقت رکھتا ہے کہ سائنسی ترقی کی بنیاد پر ایسی چیزیں بنا لے کہ جو زمینی مرکز ثقل سے باہر نکل سکتی ہیں، ایسی چیزیں تیار کر لے کہ فضائے زمین سے باہر کی ہولناک شعاعیں ان پر اثر نہ کر سکیں اور ایسے لباس تیار کر لے کہ جو اسے انتہائی زیادہ گرمی اور سردی سے محفوظ رکھ سکیں اور مشق کے ذریعے بے وزنی کی کیفیت میں رہنے کی عادت پیدا کر لے ۔ یعنی جب انسان اپنی محدود قوت کے ذریعے یہ کام کر سکتا ہے تو پھر کیا اللہ اپنی لامحدود طاقت کے ذریعے یہ کام نہیں کر سکتا؟

ہمیں یقین ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اس سفر کے لیے انتہائی تیز رفتار سواری دی تھی اور اس سفر میں درپیش خطرات سے محفوظ رہنے کے لیے انہیں اپنی مدد کا لباس پہنایا تھا ۔ ہاں یہ سواری کس قسم کی تھی اور اس کا نام کیا تھا۔ براق؟ رفرف؟ یا کوئی اور ...؟ یہ مسئلہ قدرت کا راز ہے، ہمیں اس کا علم نہیں۔

ان تمام چیزوں سے قطع نظر تیز ترین رفتار کے بارے میں مذکورہ نظریہ آج کے سائنسدانوں کے درمیان متزلزل ہو چکا ہے اگرچہ آئن سٹائن اپنے مشہور نظریے پر پختہ یقین رکھتا ہے۔

آج کے سائنسدان کہتے ہیں کہ امواج جاذبہ Rays of Attraction زمانے کی احتیاج کے بغیر آن واحد میں دنیا کی ایک طرف سے دوسری طرف منتقل ہو جاتی ہیں اور اپنا اثر چھوڑتی ہیں یہاں تک کہ یہ احتمال بھی ہے کہ عالم کے پھیلاؤ سے مربوط حرکات میں ایسے منظومے موجود ہیں کہ جو روشنی کی رفتار سے زیادہ تیزی سے مرکزِ جہان سے دور ہو جاتے ہیں (ہم جانتے ہیں کہ کائنات پھیل رہی ہے اور ستارے اور نظام ہائے شمسی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں) (غور کیجئے گا)۔

مختصر یہ کہ اس سفر کے لیے جو بھی مشکلات بیان کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی عقلی طور پر اس راہ میں حائل نہیں ہے اور ایسی کوئی بنیاد نہیں کہ واقعۂ معراج کو محالِ عقلی سمجھا جائے۔ اس راستے میں درپیش مسائل کو حل کرنے کے لیے جو وسائل درکار ہیں وہ موجود ہوں تو ایسا ہوسکتا ہے۔

بہرحال واقعۂ معراج نہ تو عقلی دلائل کے حوالے سے ناممکن ہے اور نہ دورِ حاضر کے سائنسی معیاروں کے لحاظ سے البتہ اس کے غیر معمولی اور معجزہ ہونے کو سب قبول کرتے ہیں لہٰذا جب قطعی اور یقینی نقلی دلیل سے ثابت ہو جائے تو اسے قبول کر لینا چاہیئے [1]

واقعۂ معراج کے سلسلے میں کچھ اور پہلو بھی ہیں جن پر انشاء اللہ سورہ نجم کی تفسیر میں گفتگو ہوگی۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے کتاب "ہمہ می خواہند بدانند" کی طرف رجوع فرمائیں۔ اس میں ہم نے معراج، شق القمر اور قطبین میں عبادت کے سلسلے میں بحث کی ہے۔

(۲) وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝

(۳) ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝

(۴) وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝

(۵) فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝

(۶) ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝

(۷) اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝

(۸) عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝

ترجمہ

(۲) ہم نے موسٰی کو (آسمانی) کتاب عطا کی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے

ہدایت کا ذریعہ قرار دیا اور ہم نے کہا کہ ہمارے غیر کو سہارا نہ بناؤ۔

(۳) اے ان لوگوں کی اولاد کہ جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی پر) سوار کیا تھا! وہ ایک شکر گزار بندہ تھا۔

(۴) ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب (تورات) میں بتا دیا تھا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد برپا کرو گے اور بڑی سرکشی کرو گے۔

(۵) جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقع آیا تو ہم تمہارے اوپر نہایت زور آور لوگ بھیجیں گے (تاکہ وہ تم سے سختی سے نمٹیں یہاں تک کہ مجرموں کو پکڑنے کے لیے) گھروں کی تلاشی لیں گے اور یہ وعدہ قطعی ہے۔

(۶) اس کے بعد تمہیں ان پر غلبہ دیں گے اور تمہارا مال اور اولاد بڑھا دیں گے اور تمہاری تعداد (دشمن سے) زیادہ کر دیں گے۔

(۷) اگر نیکی کرو گے تو اپنے آپ سے بھلائی کرو گے اور اگر بدی کرو گے تو بھی خود سے کرو گے اور جب دوسرے وعدے کا وقت آپہنچا (تو دشمن تمہارا یہ حال کرے گا کہ) تمہارے چہرے غمزدہ ہو جائیں گے اور وہ مسجد (اقصیٰ) میں یوں داخل ہوں گے جیسے پہلے دشمن داخل ہوئے تھے اور جو چیز بھی ان کے ہاتھ پڑے گی اسے درہم برہم کر دیں گے۔

(۸) ہو سکتا ہے تمہارا رب تم پر رحم کرے۔ جب تم پلٹ آؤ گے تو ہم بھی پلٹ آئیں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے سخت قید خانہ بنا رکھا ہے۔

تفسیر

دو عظیم طوفانی واقعات

اس سورت کی پہلی آیت میں رسول اللہ کے مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک کے اعجاز آمیز سفر کا ذکر تھا۔ ایسے واقعات کا عموماً مشرکین اور مخالفین انکار کر دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے درمیان میں سے ایک پیغمبر مبعوث ہو اور پھر اسے یہ سب اعزاز و اکرام حاصل ہو۔ لہٰذا زیر بحث آیات میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی کتاب کی طرف دعوت دی تھی تاکہ واضح ہو جائے کہ رسالت کا پروگرام کوئی نئی چیز نہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ بنی اسرائیل نے بھی ایسی مخالفت اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تھا جیسی اب یہ مشرکین کر رہے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب عطا کی (و اٰتینا موسی الکتاب)۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کے لیے وسیلۂ ہدایت قرار دیا (وجعلناہ ھدی لبنی اسرائیل)۔

اس میں شک نہیں کہ کتاب سے یہاں مراد "تورات" ہے کہ جو بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ پر نازل فرمائی تھی۔ اس کے بعد بعثتِ انبیاء کا بنیادی مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا: ان سے ہم نے کہا کہ میرے غیر کو سہارا نہ بناؤ (الا تتخذوا من دونی وکیلا)[1]

عمل میں توحید "عقیدے میں توحید" کی علامت ہے اور یہ امر توحید کی بنیادی باتوں میں سے ہے جو شخص عالم کائنات میں مؤثر حقیقی صرف اللہ کو جانتا ہے وہ اس کے غیر پر تکیہ نہیں کرے گا اور جو کسی اور کو سہارا بناتے ہیں یہ ان کے اعتقادِ توحید کی کمزوری کی دلیل ہے۔

آسمانی کتب کی عالی تجلیاتِ ہدایت دلوں کو نورِ توحید سے روشن کر دیتی ہے اور اس کے سبب انسان ہر غیر اللہ سے کٹ کر خدا سے وابستہ ہو جاتا ہے اور اسی پر تکیہ کرتا ہے۔

بنی اسرائیل کو جن نعماتِ الٰہی سے نوازا گیا بالخصوص کتابِ آسمانی کی صورت میں روحانی نعمت، اگلی آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاکہ ان کے احساساتِ تشکر کو ابھارا جائے۔ ارشاد ہوتا ہے: اے ان لوگوں کی اولاد کہ جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا (ذریۃ من حملنا مع نوح)[2]

---

[1] ترکیب نحوی کے اعتبار سے بعض مفسرین نے "الا تتخذوا من دونی وکیلا" کو تقدیر میں لئلا تتخذوا ... سمجھا ہے اور بعض نے "ان" کو زائد اور "وقلنا لھم" کو مقدر سمجھا ہے کہ جو مجموعی طور پر یوں ہوگا:

وقلنا لھم لا تتخذوا من دونی وکیلا

اور ہم نے ان سے کہا کہ میرے سوا کسی کو پناہ گاہ نہ بناؤ۔

[2] "ذریۃ من حملنا مع نوح" جملہ ندائیہ ہے اور تقدیر میں "یا ذریۃ من حملنا مع نوح" تھا۔ رہا یہ احتمال کہ "ذریۃ" "وکیلا" (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ بات مت بھولو کہ نوح ایک شکر گزار بندہ تھا "(انه کان عبدًا شکورًا)۔
تم کہ جو اصحاب نوح کی اولاد ہو اپنے با ایمان بزرگوں کی پیروی کیوں نہیں کرتے ہو؟ کیوں کفران نعمت کی راہ اپناتے ہو؟

"شکور" مبالغے کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے "زیادہ شکر گزار"۔
بنی اسرائیل کو اصحاب نوح کی اولاد شاید اس لیے کہا گیا ہے کہ مشہور تواریخ کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے۔ ان کے نام "سام"، "حام" اور "یافث" تھے۔ طوفانِ نوح کے بعد بنی نوع انسان انہی کی اولاد میں سے ہیں اور بنی اسرائیل بھی اس لحاظ سے انہی کی اولاد سے ہیں۔
اس میں شک نہیں کہ تمام انبیاء اللہ کے شکر گزار بندے تھے لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی کچھ ایسی خصوصیات احادیث میں مذکور ہیں کہ جن کے باعث انہیں خاص طور پر "عبدًا شکورًا" کے لفظ سے نوازا گیا ہے۔ ان کے بارے میں روایات میں ہے کہ جب وہ لباس پہنتے، پانی پیتے، کھانا کھاتے یا انہیں کوئی بھی نعمت نصیب ہوتی تو فوراً ذکرِ خدا کرتے اور شکرِ الٰہی بجالاتے۔

ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:
حضرت نوح ہر روز صبح اور عصر کے وقت یہ دعا پڑھتے تھے:

اللّٰھم انی اشھدک ان ما اصبح او امسی بی من نعمة فی دین او دنیا فمنک وحدک لا شریک لک، لک الحمد ولک الشکر بھا علیّ حتّٰی ترضیٰ، وبعد الرضا۔

خداوندا! میں تجھے گواہ بناتا ہوں کہ جو بھی نعمت مجھے صبح و شام پہنچتی ہے وہ نعمت دین ہو یا نعمت دنیا، وہ نعمت روحانی ہو یا نعمت مادی — سب تیری طرف سے ہے تو ایک اکیلا ہے، تیرا کوئی شریک نہیں، حمد و ثنا تیرے لیے مخصوص ہے اور شکر بھی تیرے ہی لیے ہے۔ میں تیرا اس قدر شکر کرتا ہوں کہ تو مجھ سے راضی ہو جا اور تیری رضا کے بعد بھی میں تیرا شکر کرتا ہوں۔

اس کے بعد امامؑ نے مزید فرمایا کہ: ....
ایسا تھا نوح کا شکر[1]

(بقیہ گزشتہ حاشیہ) کا بدل ہے یا "تتخذوا" کا مفعولِ ثانی ہے — یہ بہت بعید معلوم ہوتا ہے اور "انه کان عبدًا شکورًا" سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ (غور کیجیے گا)

[1] مجمع البیان زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کی داستان انگیز تاریخ کے ایک گوشے کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے،
ہم نے تورات میں بنی اسرائیل کو بتا دیا تھا کہ تم زمین میں دو دفعہ فساد کرو گے اور بڑی سرکشی کا ارتکاب کرو گے (وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتاب لتفسدن فی الارض مرتین ولتعلن علوًا کبیرًا)۔

"قضاء" کے اگرچہ بہت سے معانی ہیں لیکن یہاں یہ لفظ "بتانے" کے معنی میں آیا ہے۔
نیز بعد کی آیت کے قرینے سے لفظ "الارض" سے یہاں مراد فلسطین کی مقدس زمین ہے کہ جس میں مسجد الاقصیٰ واقع ہے۔

آئندہ آیات میں ان دو عظیم حوادث کا ذکر ہے جو اللہ کی طرف سے سزا کے طور پر رونما ہوئے، ارشاد ہوتا ہے: جب پہلے وعدے کا مرحلہ آپہنچا اور تم فساد، خونریزی اور ظلم کے مرتکب ہوئے تو ہم اپنے بندوں میں سے ایک جنگ آزما گروہ تمہاری طرف بھیجیں گے تاکہ وہ تمہارے اعمال کی سزا کے طور پر تمہاری سرکوبی کرے (فاذا جاء وعد اولٰهما بعثنا علیکم عبادًا لنا اولی بأس شدید)۔

یہ زور آور لوگ اس طرح سے تم پر حملہ کریں گے کہ تمہارے افراد کو پکڑنے کے لیے گھر گھر کی تلاشی لیں گے (فجاسوا خلال الدیار)۔

اور یہ ایک قطعی اور ناقابلِ تغیّر وعدہ ہے (وکان وعدًا مفعولًا)۔

اس کے بعد ایک مرتبہ پھر اللہ کا لطف و کرم تمہارے شاملِ حال ہوا اور ہم نے تمہیں اس حملہ آور قوم پر غلبہ عطا کیا (ثم رددنا لکم الکرۃ علیهم)۔

اور ہم نے تمہیں بہت مال و ثروت سے نوازا اور کثرتِ اولاد سے تمہیں تقویت بخشی (وامددناکم باموال وبنین)۔ اس قدر کہ تمہاری تعداد دشمن سے زیادہ ہوگئی (وجعلناکم اکثر نفیرًا) [1]

یہ الطافِ الٰہی تمہارے لیے اس لیے ہے کہ شاید تم ہوش میں آؤ، اپنی اصلاح کرو، برائیوں کو ترک کر دو اور نیکیوں کا راستہ اختیار کرو کیونکہ "اگر نیکی کرو گے تو اپنے آپ ہی سے بھلائی کرو گے اور اگر بدی کرو گے تو اپنے آپ ہی سے کرو گے (ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اسأتم فلها)۔

یہ ایک دائمی اصول ہے کہ نیکیاں اور برائیاں آخرکار خود انسان کی طرف لوٹتی ہیں۔ اگر کوئی ضرب لگاتا ہے تو دراصل وہ اپنے جسم پر لگاتا ہے اور اگر کوئی کسی کی خدمت کرتا ہے تو درحقیقت اپنی ہی خدمت کرتا ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ نہ اس سزا نے تمہیں بیدار کیا اور نہ بار دیگر نعماتِ الٰہی حاصل ہونے نے۔

---

[1] "نفیر" اسم جمع ہے۔ اس کا معنی ہے "لوگوں کا ایک گروہ" بعض کہتے ہیں کہ یہ "نفر" کی جمع ہے اور دراصل یہ "نفر" (بروزن "عفو") کے مادہ سے کوچ کرنے اور کسی چیز کو سامنے لانے کے معنی میں ہے، اسی وجہ سے اس گروہ کو "نفیر" کہتے ہیں کہ جو کسی چیز کی طرف حرکت کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔

تم پھر بھی سرکشی کرتے رہے اور راہِ ظلم و تجاوز اختیار کیے رہے۔ تم نے زمین پر بہت فساد بپا کر دیا اور غرور و تکبر میں حد سے گزر گئے۔

پھر اللہ کے دوسرے وعدے کی تکمیل کا مرحلہ آپہنچا تو ایک اور زبردست جنگجو گروہ تم پر مسلط ہو جائے گا اور وہ تمہارا یہ حال کرے گا کہ تمہارے چہرے غمزدہ ہو جائیں گے (فاذا جاء وعد الاخرة لیسوئوا وجوهكم)۔

یہاں تک کہ وہ تمہاری عظیم عبادت گاہ بیت المقدس کو تمہارے ہاتھ سے چھین لیں گے" اور اس مسجد میں داخل ہو جائیں گے جیسے پہلی مرتبہ دشمن اس میں داخل ہوئے تھے" (ولیدخلوا المسجد کما دخلوه اول مرة)۔

وہ اسی پر بس نہیں کریں گے بلکہ "ان کے سارے آباد شہر اور زمینیں اجاڑ کے رکھ دیں گے" (و لیتبروا ما علوا تتبیرًا)۔

اس کے باوجود توبہ اور خدا کی طرف بازگشت کے دروازے تم پر بند نہیں ہوئے پھر بھی "ممکن ہے اللہ تم پر رحم کرے" (عسٰی ربکم ان یرحمکم)۔

اور اگر ہماری طرف لوٹ آؤ تو ہم بھی اپنے لطف و کرم کا رُخ پھر تمہاری جانب کر دیں گے اور اگر تم نے فساد اور اکڑپن کو نہ چھوڑا تو پھر تمہیں ہم شدید عذاب میں مبتلا کر دیں گے (وان عدتم عدنا)۔

اور پھر یہ تو دنیا کی سزا ہے جبکہ "جہنم کو ہم نے کافروں کے لیے سخت قید خانہ قرار دیا ہے" (وجعلنا جهنم للكافرين حصيرًا)[1]

چند اہم نکات

۱۔ بنی اسرائیل کے دو تاریخی فسادات: زیرِ نظر آیات میں بنی اسرائیل کے دو اجتماعی انحرافات کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ یہ انحرافات فساد اور سرکشی پر منتج ہوتے۔ ان میں سے ہر ایک کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر سخت زور آور لوگوں کو مسلط کر دیا تاکہ وہ انہیں سخت سزا دیں اور کیفرِ کردار تک پہنچائیں۔

بنی اسرائیل کی تاریخ بہت داستان انگیز ہے۔ وہ تاریخ کے بہت سے نشیب و فراز سے گزرے ہیں کبھی انہیں کامیابی نصیب ہوئی اور کبھی وہ شکست سے دوچار ہوئے لیکن قرآن یہاں کن حوادث کی

---

[1] "حصیر" "حصر" کے مادہ سے "قید" کے معنی میں ہے اور ہر وہ جگہ جس سے نکلنے کی راہ نہ ہو اسے "حصیر" کہتے ہیں۔ چٹائی کو بھی حصیر اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے مختلف حصے باہم بُنے ہوتے اور محصور ہوتے ہیں۔

طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں ہم بطور نمونہ چند ایک کا ذکر کرتے ہیں :

(۱) بنی اسرائیل کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا شخص جس نے ان پر حملہ کیا اور بیت المقدس کو تباہ کر دیا وہ بخت النصر تھا۔ یہ بابل کا حکمران تھا۔ اس حملے کے بعد بیت المقدس ستر برس تک اسی طرح برباد رہا یہاں تک کہ پھر یہودی اٹھے اور انہوں نے اس کی تعمیر نو کی۔

دوسرا شخص جس نے ان پر حملہ کیا وہ قیصر روم "اسپیانوس" تھا۔ اس نے اپنے وزیر "طرطوز" کو اس کام پر مامور کیا۔ اس نے بیت المقدس کو تباہ کرنے اور بنی اسرائیل کو کمزور اور قتل کرنے میں پوری قوت صرف کر دی۔ یہ واقعہ تقریباً سو سال قبل مسیح پیش آیا۔

لہٰذا ممکن ہے کہ وہ دو واقعات جن کی طرف قرآن حکیم میں اشارہ کیا گیا ہے یہی ہوں کہ جو بنی اسرائیل کی تاریخ میں بھی آئے ہیں کیونکہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں پیش آنے والے دوسرے واقعات اس قدر سنگین اور شدید نہیں تھے کہ ان کی حکومت بالکل ملیا میٹ ہو گئی ہو۔ بخت النصر کے حملے نے ان کی طاقت و شوکت کو بالکل تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ "کورش" کے زمانے تک ان کی صورتِ حال اسی طرح رہی۔ اس کے بعد پھر بنی اسرائیل برسرِ اقتدار آئے۔ ان کی حکومت اسی طرح برقرار رہی یہاں تک کہ پھر قیصر روم نے ان پر حملہ کیا اور ان کی حکومت کو ختم کر دیا۔ پھر ایک طویل مدت وہ دربدر رہے (اور اب پھر کچھ عرصہ پیشتر ان لوگوں نے انسانیت کش سامراجی قوتوں کی مدد سے ایک حکومت قائم کی ہے اور اب وہ اس کی توسیع کے لیے کوشاں ہیں)۔[1]

(۲) طبرسی اپنی تفسیر میں نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا :

> پہلے فساد سے مراد زکریا اور بہت سے انبیاء کا قتل ہے اور پہلے وعدے سے مراد بخت النصر کے ذریعے اللہ کی طرف سے ان سے انتقام لینے کا وعدہ ہے اور دوسرے فساد سے مراد وہ شورش ہے جو انہوں نے "آزادی" کے بعد ایران کے ایک بادشاہ کی سرکردگی میں برپا کی اور یہ لوگ فساد اور خرابی کے مرتکب ہوئے جبکہ دوسرے وعدے سے مراد بادشاہِ روم "انطیاخوس" کا حملہ ہے۔

ایک حد تک تو یہ تفسیر پہلی تفسیر پر منطبق کی جا سکتی ہے لیکن اس کا راوی قابلِ اعتماد نہیں ہے نیز حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تاریخ کو بخت النصر اور اسپیانوس یا انطیاخوس کے زمانے پر منطبق نہیں کیا جا سکتا بلکہ بعض کے بقول بخت النصر، ارمیا، یا دانیال پیغمبر کا ہم عصر تھا اور یہ زمانہ حضرت

---

[1] تفسیر المیزان، ج ۱۳ ص ۴۱۔

یحییٰؑ کے دور سے تقریباً چھ سو برس پہلے کا ہے لہٰذا کیونکر ممکن ہے کہ بخت النصر نے حضرت یحییٰ کے خون کے انتقام کے لیے قیام کیا ہو؟

(۳) بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں ایک مرتبہ بیت المقدس تعمیر ہوا اور بخت النصر نے اسے تباہ و برباد کر دیا۔ یہی وہ پہلا وعدہ ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد بیت المقدس ہخامنشی بادشاہوں کے زمانے میں تعمیر ہوا۔ پھر اسے طیطوس رومی نے برباد کیا (توجہ رہے کہ ہو سکتا ہے یہ "طیطوس" وہی "طرطوز" ہو جس کا سطور بالا میں ذکر آچکا ہے)۔ اس شہر کی یہی حالت رہی، یہاں تک کہ خلیفہ ثانی کے زمانے میں اسے مسلمانوں نے فتح کیا۔[1]

یہ تفسیر بھی مندرجہ بالا دو تفسیروں سے کوئی زیادہ اختلاف نہیں رکھتی۔

(۴) مندرجہ بالا تفاسیر اور دیگر تفاسیر کہ جو کم و بیش ان سے ہم آہنگ ہیں، کے مقابلے میں ایک اور تفسیر بھی ہے۔ اس کا احتمال سید قطب نے اپنی تفسیر فی ظلال میں ذکر کیا ہے۔ یہ تفسیر مذکورہ تفسیروں سے بالکل مختلف ہے۔ اس تفسیر کے مطابق یہ واقعات گزشتہ زمانے میں اور نزولِ قرآن کے زمانے میں پیش نہیں آئے بلکہ ان کا تعلق نزولِ قرآن کے بعد کے زمانے سے ہے۔ احتمالاً اُن کا پہلا فساد آغازِ اسلام میں تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مسلمانوں کو ان کے خلاف قیام کا حکم دیا اور ان کا دوسرا فساد ہٹلر کے زمانے سے مربوط ہے کہ جب ہٹلر کی قیادت میں جرمن کے نازیوں نے یہودیوں کے خلاف قیام کیا۔[2]

لیکن — اس تفسیر میں یہ اشکال ہے کہ ان واقعات میں سے کسی واقعے میں بھی فتح مند قوم بیت المقدس میں داخل بھی نہیں ہوئی چہ جائیکہ بیت المقدس برباد ہوتا۔

(۵) ایک احتمال اور بھی بعض حضرات کی طرف سے ذکر ہوا ہے اور وہ یہ کہ یہ دونوں واقعات دوسری جنگِ عظیم کے بعد کے ہیں جبکہ صیہونزم کی بنیاد پڑی اور اسلامی ممالک کے قلب میں اسرائیل نامی حکومت تشکیل دی گئی۔ بنی اسرائیل کے پہلے فساد اور سرکشی سے یہی مراد ہے اور پہلے انتقام سے مراد یہ ہے کہ جب ابتدا میں اسلامی ممالک اِس سازش سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے اس کے مقابلے کے لیے قیام کیا نتیجتاً انہوں نے بیت المقدس اور فلسطین کے کچھ شہر اور قصبے یہودیوں کے چنگل سے آزاد کروا لیے اور مسجدِ اقصیٰ سے یہودی اثر و نفوذ بالکل ختم ہو گیا۔

دوسرے فساد سے مراد درندہ صفت سامراجی طاقتوں کے سہارے بنی اسرائیل کا وہ حملہ ہے جس

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی، ج ۷، حاشیہ ص ۲۰۹ از قلم عالم معظم شعرانی مرحوم۔

[2] تفسیر فی ظلال، ج ۵ ص ۳۰۳۔

کے نتیجے میں انہوں نے بہت سے اسلامی علاقوں پر قبضہ جما لیا اور بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کو اپنے زیر نگیں کر لیا۔

اس بنا پر مسلمانوں کو بنی اسرائیل پر دوسری کامیابی کا انتظار کرنا چاہیئے، مسجد اقصیٰ کو ان کے چنگل سے آزاد کروانا چاہیئے اور اسلامی سرزمین سے ان کے اثر و نفوذ کا پوری طرح خاتمہ کر دینا چاہیئے۔ ساری دنیا کے مسلمان اسی روز کے منتظر ہیں اور اللہ نے اسی کے لیے مسلمانوں سے فتح و نصرت کا وعدہ کیا ہے۔[1]

ان کے علاوہ بھی کچھ تفاسیر ہیں کہ جن کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں۔

چوتھی اور پانچویں تفسیر کے مطابق آیات میں جو ماضی کے صیغے استعمال ہوتے ہیں ان سب کو مضارع کی حالت میں ہونا چاہیئے۔ البتہ عربی ادب کے لحاظ سے جہاں فعل حروف شرط کے بعد آئے وہاں یہ معنی بعید نہیں ہے۔ بلکہ یہ آیت:

ثم رددنا لکم الکرۃ علیھم وامددناکم باموال وبنین وجعلناکم اکثر نفیرا

ظاہری اعتبار سے اس بات کی غماز ہے کہ کم از کم بنی اسرائیل کا پہلا فساد اور اس کا انتقام گزشتہ زمانے میں وقوع پذیر ہوا ہے۔

ان تمام چیزوں سے قطع نظر ایک اہم مسئلہ اس مقام پر لائق توجہ ہے۔ اس آیت پر غور کیجئے:

بعثنا علیکم عبادا لنا اولی باس شدید

ہم اپنے بندوں میں سے ایک زور آور گروہ تم پر مسلط کریں گے۔

ظاہراً یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ انتقام لینے والے افراد با ایمان بہادر تھے کہ جو "عباد" "لنا" اور "بعثنا" کے اہل تھے۔ یہ وہ بات ہے کہ جس کا ذکر بہت سی مذکورہ تفاسیر میں نہیں آیا۔

البتہ اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لفظ بعث (اٹھانا، ابھارنا) ہمیشہ انبیاء اور مومنین ہی کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ قرآن حکیم میں یہ لفظ ان کے علاوہ بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ہابیل اور قابیل کے واقعے میں ہے:

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِى الْاَرْضِ

اللہ نے ایک کوا بھیجا کہ جو زمین کو کرید تا تھا۔ (مائدہ - ۳۱)

نیز یہی لفظ زمین و آسمان کے عذاب کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ (انعام - ۶۵)

اسی طرح لفظ "عباد" اور "عبد" قابل مذمت افراد کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ

---

[1] مجلہ مکتب اسلام شمارہ ۱۲ سال ۱۷ و یک سال ۱۲ بحث تفسیر آقائی ابراہیم انصاری۔

فرقان کی آیت ۵۸ میں یہ لفظ گنہگاروں کے لیے استعمال ہوا ہے:

وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا

نیز سورہ شوریٰ کی آیت ۲۷ میں سرکشوں کے لیے یہ لفظ اس پیرائے میں استعمال ہوا ہے:

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ

اسی طرح سورہ مائدہ کی آیت ۱۱۸ میں خطا کاروں اور منکرینِ توحید کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ

لیکن — ان تمام چیزوں کے باوجود اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر یقینی قرینہ موجود نہ ہو تو زیرِ بحث آیات کا ظاہری اسلوب یہی کہتا ہے کہ انتقام لینے والے اہلِ ایمان ہیں۔

بہرحال مندرجہ بالا آیات اجمالاً ہم سے کہتی ہیں کہ بنی اسرائیل نے دو مرتبہ فساد برپا کیا اور سرکشی اختیار کی اور اللہ نے ان سے سخت انتقام لیا۔ اس بات کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بنی اسرائیل، ہم اور تمام انسان اس سے عبرت حاصل کریں اور یہ جان لیں کہ ظلم و ستم اور فساد انگیزی خدا کی بارگاہ میں سزا کے بغیر نہیں رہ سکتی اور جب ہمیں اقتدار یا قوت حاصل ہو تو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ دردناک حوادث ہمارے انتظار میں ہیں لہٰذا گزشتہ لوگوں کی تاریخ سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

۲۔ جو کام بھی کرو گے اپنے ساتھ ہی کرو گے: زیرِ بحث آیات میں اس بنیادی اصول کی نشاندہی کی گئی ہے کہ تمہاری اچھائیاں اور برائیاں خود تمہاری طرف لوٹتی ہیں۔ اگرچہ ظاہراً اس جملے کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں لیکن واضح ہے کہ اس مسئلے میں بنی اسرائیل کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے۔ یہ تو پوری تاریخِ انسانی کے لیے ایک دائمی قانون ہے اور خود تاریخ اس کی شاہد ہے۔[1]

بہت سے ایسے لوگ تھے جنہوں نے غلط اور بُرے کاموں کی بنیاد رکھی، ظالمانہ قوانین بنائے اور غیر انسانی بدعتوں کو رواج دیا اور آخرکار ان کا نتیجہ خود ان کے لیے اور ان کے ہواخواہوں کے حق میں برا نکلا اور وہ کنواں جو انہوں نے دوسروں کے لیے کھودا تھا خود اس میں جا گرے۔

خاص طور پر زمین پر فتنہ و فساد برپا کرنا، برتری جتانا اور اپنے تئیں بڑا سمجھنا (علوًّا کبیرًا) ایسے

---

[1] زیرِ بحث آیات میں ہم نے پڑھا ہے:

ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اسأتم فلھا

جبکہ قاعدتاً "علیھا" کہا جانا چاہیئے کیونکہ برائی کرنا انسان کے فائدے میں نہیں ہے بلکہ اس کے نقصان میں ہے۔ یہ تعبیر یا تو جملے کے دونوں حصوں میں ہم آہنگی کی بنا پر ہے اور یا اس لیے ہے کہ لام یہاں اختصاص کے لیے ہے نہ کہ فائدے کے معنی میں بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ لام یہاں "الیٰ" کے معنی میں ہے یعنی برائی اس کی طرف لوٹتی ہے۔

امور ہیں کہ جن کا اثر اسی جہان میں انسان کا دامن آپکڑتا ہے ۔ اسی بناء پر بنی اسرائیل بارہا سخت شکست سے دوچار ہوئے ، پراگندہ ہوئے اور انہیں رسوا کن انجام کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ انہوں نے زمین پر فتنہ و فساد برپا کیا ۔

اس وقت بھی صیہونی یہودیوں نے دوسروں کی زمین غصب کرنے ، دوسروں کو در بدر آوارہ وطن کرنے اور ان کی اولاد کو قتل و برباد کرنے کا عمل شروع کر رکھا ہے ۔ یہاں تک کہ انہوں نے اللہ کے گھر بیت المقدس کی حرمت کا بھی پاس نہیں کیا ۔ عالمی سطح پر ان کا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ کسی قانون اور اصول کی پرواہ نہیں کرتے ۔ اگر کوئی ایک فلسطینی مجاہد ان کی طرف رائفل کی ایک گولی چلاتا ہے تو اس کے بدلے وہ مہاجر کیمپوں بچوں کے اسکولوں اور ہسپتالوں پر وحشیانہ بمباری کرتے ہیں اور اپنے ایک شخص کے بدلے بعض اوقات سینکڑوں بے گناہوں کو خاک و خون میں تڑپا دیتے ہیں اور بہت سے گھروں کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں ۔

وہ اپنے آپ کو کسی بین الاقوامی قانون کا پابند نہیں سمجھتے اور اعلانیہ سب کو پاؤں تلے روندیتے ہیں ۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تمام تر قانون شکنی ، بے انصافی اور خلافِ انسانیت کردار اس لیے ہے کہ اسرائیل کو انسان کُش عالمی طاقت امریکہ کی سرپرستی حاصل ہے لیکن یہ امر بھی قابلِ تردید و شک نہیں کہ خود یہ قوم سراپا ظلم و بربریت ہے اور تمام تر انسانی اقدار کو پامال کرنے پر اپنی مثال آپ ہے ۔ ان کا یہ طرزِ عمل بذاتِ خود زمین پر فساد برپا کرنے ، بڑا بننے کی خواہش اور ظلم و استکبار کا مصداق ہے ۔ انہیں اب انتظار کرنا چاہیئے کہ پھر " عبادا لنا اولی بأس شدید " کے مصداق لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے اور ان پر غلبہ پائیں گے اور ان کے بارے میں اللہ کا قطعی وعدہ عملی شکل اختیار کرے گا ۔

۳ ۔ آیات کی تطبیق اسلامی تاریخ پر : متعدد روایات میں زیر نظر آیات کو مسلمانوں کی تاریخ میں پیش آنے والے حوادث پر منطبق کیا گیا ہے ۔ ان کے مطابق پہلا فساد اور ظلم حضرت علی علیہ السلام کی شہادت ہے اور دوسرا امام حسن علیہ السلام کی شہادت جبکہ " بعثنا علیکم عباداً لنا اولی بأس شدید " کے مصداق حضرت مہدی قائم علیہ السلام اور ان کے انصار ہیں ۔

بعض دوسری روایات کے مطابق یہ ایک ایسی قوم کی طرف اشارہ ہے جو حضرت مہدی علیہ السلام سے پہلے قیام کرے گی[1]

یہ واضح ہے کہ ان احادیث کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ زیر بحث آیات کی تفسیر اپنے لفظی مفہوم کے مطابق نہیں ہے کیونکہ یہ آیات پوری صراحت کے ساتھ بنی اسرائیل کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں بلکہ ان روایات سے مراد یہ ہے کہ اس امت میں بھی ایسے فسادات اور مظالم کی ایسی ہی سزا ہوگی ۔

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مذکورہ بالا طرزِ عمل اگرچہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہے لیکن یہ ایک عمومی قانون ہے جو تمام اقوام و ملل کیلئے ہے اور ساری تاریخ انسانی پر جاری و ساری ایک عمومی سنت ہے ۔

---

[1] نور الثقلین ج ۳ ص ۱۳۸ ۔

(۹) اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۙ○

(۱۰) وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ○

(۱۱) وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ○

(۱۲) وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ○

ترجمہ

(۹) یہ قرآن بالکل سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے اور اعمالِ صالح انجام دینے والے مومنین کو بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔

(۱۰) اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

(۱۱) اور انسان (جلد بازی کی وجہ سے) ایسے برائی طلب کرنے لگتا ہے جیسے بھلائی طلب کرنی چاہیے اور انسان ہمیشہ سے جلد باز ہے۔

(۱۲) اور ہم نے رات اور دن کو (توحید اور اپنی عظمت کی) دو نشانیاں قرار دیا

ہے پھر ہم نے رات کی نشانی کو محو کر دیا اور دن کی نشانی کو ضیا بخش بنایا تاکہ (اس روشنی میں) تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو (اور زندگی کی تگ و دو کیلئے اٹھ کھڑے ہو) اور سالوں کی گنتی اور حساب جان لو اور ہم نے ہر چیز کو مشخص کر کے (اور واضح طور پر) بیان کیا ہے۔

تفسیر

سعادت کا بالکل سیدھا راستہ

گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل، ان کی آسمانی کتاب تورات، ان کی طرف سے احکام الٰہی کی خلاف ورزی اور اس سلسلے میں ان کی سزاؤں سے متعلق گفتگو تھی۔ اب مسلمانوں کی آسمانی کتاب قرآن مجید کی طرف بات کا رخ موڑا گیا ہے کہ جو کتب آسمانی کی آخری کڑی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ قرآن لوگوں کو مستقیم ترین اور بالکل سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے (ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم)۔

"اقوم" "قیام" کے مادہ سے ہے اور چونکہ انسان جب کسی اہم کام کو انجام دینا چاہتا ہے تو قیام کرتا ہے اور کام شروع کر دیتا ہے اسی لحاظ سے احسن طریقے اور تندہی سے کام انجام دینے کے لیے "قیام" بطور کنایہ استعمال ہوا ہے۔

ضمناً یہ بھی کہہ دیا جائے کہ لفظ "استقامت" بھی اسی مادے سے ہے اور "قیم" بھی اسی مادے سے ہے جس کا معنی ہے صاف و شفاف، مستقیم، ثابت اور ٹھوس۔

"اقوم" چونکہ افعل التفضیل کا صیغہ ہے لہٰذا صاف تر، مستقیم تر اور بالکل سیدھا کے معنی میں ہے۔ اس لحاظ سے زیر بحث آیت کا مفہوم یہ ہوگا:

> قرآن ایسے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے جو زیادہ مستقیم، زیادہ صاف اور زیادہ محفوظ و مضبوط ہے۔

قرآن کے پیش کردہ عقائد صاف اور مستقیم ہیں، روشن و واضح ہیں، قابل ادراک ہیں، ہر قسم کے ابہام اور خرافات سے پاک ہیں۔ وہ عقائد کہ جو عمل کی دعوت دیتے ہیں انسانی صلاحیتوں کو مجتمع کرتے ہیں اور انسان اور عالم فطرت کے قوانین میں ہم آہنگی برقرار رکھتے ہیں۔

یہ قرآن زیادہ صاف اور زیادہ مستقیم ہے۔ اس لحاظ سے کہ ظاہر و باطن، عقیدہ و عمل، فکر و نظر اور طرز حیات کے درمیان یکجہتی پیدا کر کے سب کو اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔

یہ قرآن صاف تر اور مستقیم تر ہے ۔ سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظام اور قوانین کے اعتبار سے ۔ اس کا نظام تمام روحانی پہلوؤں کی بھی پرورش کرتا ہے اور مادی لحاظ سے بھی کمال وارتقاء آفرین ہے ۔

یہ قرآن عبادت میں بھی افراط و تفریط سے بچاتا ہے ۔

اسی طرح قرآن کا اخلاقی نظام بھی ہر طرح کے افراط و تفریط سے محفوظ رکھتا ہے ۔ حرص و طمع سے بھی بچاتا ہے، اسراف اور فضول خرچی سے بھی نجات دلاتا ہے، بخل اور کنجوسی سے بھی محفوظ رکھتا ہے، حسد سے بھی روکتا ہے کمزور بن جانے اور دوسروں کو کمزور کرکے خود بڑا بن بیٹھنے سے بھی بچاتا ہے ۔

یہ قرآن صاف تر اور مستقیم تر ہے ۔ اپنے پیش کردہ نظام حکومت کے لحاظ سے کہ جو عدل و انصاف پر مبنی ہے اور ظلم اور ظالموں کی سرکوبی کرتا ہے ۔

جی ہاں ! قرآن ایسے راستے کی ہدایت کرتا ہے جو ہر لحاظ سے زیادہ صاف ، زیادہ مستقیم ، زیادہ محفوظ اور زیادہ مضبوط ہے ۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ "افعل التفضیل" کا صیغہ یہ معنی دیتا ہے کہ دوسری اقوام کے مذاہب میں بھی استقامت اور عدالت کی خوبیاں موجود تھیں جبکہ قرآن میں ان کی نسبت زیادہ ہیں لیکن چند پہلوؤں کی طرف توجہ کرنے سے یہ مسئلہ واضح ہوجاتا ہے ۔ کیونکہ :

اولاً اگر موازنہ دوسرے آسمانی ادیان کے ساتھ ہو تو ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنے زمانے میں صاف ، مستقیم اور مضبوط دین تھا لیکن تکامل و ارتقاء کے مطابق جب ہم آخری مرحلے یعنی مرحلۂ خاتمیت تک پہنچیں گے تو ایسا دین موجود ہوگا کہ جو صاف تر، مستقیم تر اور مضبوط تر ہوگا ۔

ثانیاً اگر موازنہ دیگر آسمانی مذاہب کی بجائے دیگر مذاہب سے ہو تو بھی "افعل التفضیل" بامعنی ہوگا کیونکہ ہر مکتب و مذہب کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کم از کم ان خوبیوں کا لحاظ رکھیں لیکن ان میں موجود کوتاہیوں، خرابیوں اور انحرافوں کو مجموعی طور پر دیکھا جائے اور پھر قرآن سے ان کا موازنہ کیا جائے تو واضح ہوجائے گا کہ یہ دین زیادہ مستقیم، زیادہ صاف اور انسان کی روحانی و مادی ضروریات سے زیادہ ہم آہنگ ہے لہٰذا یہ زیادہ مضبوط اور زیادہ محفوظ ہے ۔

ثالثاً جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کرچکے ہیں کہ "افعل التفضیل" کا صیغہ ہمیشہ اس بات کی دلیل نہیں ہوتا کہ لازماً کسی چیز سے موازنہ کیا جارہا ہے اور لازماً دوسری طرف بھی کوئی چیز اس کے کچھ مفہوم کی حامل ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے :

اَفَمَنْ یَّهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّهْدٰى

جو شخص حق کی طرف دعوت دیتا ہے کیا رہبری کا وہ زیادہ حق رکھتا ہے اور زیادہ اہل

ہے یا وہ شخص جو حق کے راستے کا راہی ہی نہیں ۔ (یونس - ۳۵)

ضمنی طور پر اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ " اقوم " کا ایک معنی زیادہ ثابت اور زیادہ محفوظ و مضبوط ہے نیز آیت کی عبارت میں موازنے کے طور پر کسی دوسری چیز کا ذکر نہیں ہے جبکہ اصطلاح کے مطابق " متعلق کا حذف ہونا عمومیت و شمولیت کی دلیل ہے " ان امور کی طرف توجہ کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو اسلام اور رسولِ اسلام کی خاتمیت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں کیونکہ اس آیت کے مطابق یہ دین زیادہ ثابت ، زیادہ باقی ، زیادہ ٹھوس ، زیادہ مضبوط اور زیادہ محفوظ ہے ۔ (غور کیجئے گا) ۔

اس مستقیم الٰہی پروگرام سے لوگوں کا تعلق چونکہ دو طرح ہے لہٰذا اس کے بعد اس رابطے اور تعلق کے نتیجے کا انہی دو حوالوں سے ذکر کیا گیا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے : جن با ایمان لوگوں نے نیک عمل انجام دیئے ہیں قرآن انہیں خوشخبری دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے (و یبشر المؤمنین الذین یعملون الصالحات ان لھم اجراً کبیراً) ۔

اور وہ کہ جو آخرت اور اس کی عظیم عدالت پر ایمان نہیں رکھتے (اور اس لیے انہوں نے اعمالِ صالح انجام نہیں دیئے) انہیں آگاہ کر دیتا ہے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہم نے تیار کر رکھا ہے (و ان الذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ اعتدنا لھم عذاباً الیماً) ۔

مومنین کے لیے بشارت کی تعبیر تو واضح ہے لیکن بے ایمان اور سرکش افراد کے لیے درحقیقت یہ ایک قسم کا استہزاء ہے یا پھر مومنین کے لیے بشارت ہے کہ ان کے دشمنوں کا یہ انجام ہوگا[1]

اس طرف بھی نظر جاتی ہے کہ مومنین کے لیے اجمالاً " اجراً کبیراً " فرمایا گیا ہے جبکہ بے ایمان افراد کی سزا کے لیے صراحتاً " عذاباً الیما " فرمایا گیا ہے ۔ ان دونوں تعبیرات کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ معنوی ، مادی اور روحانی و جسمانی تمام پہلوؤں پر محیط ہے ۔

رہی یہ بات کہ دوزخیوں کی صفات میں سے صرف " آخرت پر ایمان نہ لانے " کی نشاندہی کی گئی ہے جبکہ ان کے اعمال کے بارے میں کوئی بات نہیں کی گئی ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس بناء پر ہو کہ اگر انسان اس عظیم عدالت پر ایمان رکھتا ہو تو گناہوں سے بچانے کے لیے یہ ایمان سب سے زیادہ مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے ۔ اس سے قطع نظر انکارِ قیامت کا مطلب انکارِ خدا بھی ہے کیونکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ عادل و حکیم خدا اس جہان کے لوگوں کو ان حالات میں کہ جو ہم دیکھ رہے ہیں ، ان کی حالت پر چھوڑ دے اور کوئی دوسرا

---

[1] سورہ نساء کی آیت ۱۳۸ کے ذیل میں ہم کہہ چکے ہیں کہ لفظ " بشارت " دراصل " بشرۃ " سے لیا گیا ہے اور " بشرۃ " کا معنی ہے چہرہ ۔ اور ہر وہ چیز جو انسان کے چہرے پر اثر انداز ہو ، اسے مسرور یا مغموم کر دے اسے " بشارت " کہتے ہیں ۔

جہان موجود نہ ہو۔ یہ امر نہ اس کی حکمت سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ اس کی عدالت سے۔ علاوہ ازیں آیت میں موجود جزا، سزا کے بارے میں گفتگو جاری ہے اور یہ گفتگو آخرت اور عدالتِ الٰہی کے مسئلے سے مناسبت رکھتی ہے اس لیے یہاں آخرت پر ان کے ایمان نہ لانے کا ذکر کیا گیا ہے۔

اگلی آیت میں گزشتہ بحث کی مناسبت سے بے ایمانی کی ایک اہم علت بیان کی گئی ہے اور وہ مختلف امور کے بارے میں درکار آگاہی کا نہ ہونا۔ ارشاد ہوتا ہے: جیسے انسان بھلائی کا خواہشمند ہوتا ہے اسی طرح جلد بازی کرتے ہوئے اور درکار آگاہی نہ ہونے کی وجہ سے برائی طلب کرنے لگتا ہے (و یدع الانسان بالشر دعاءہٗ بالخیر)۔

کیونکہ انسان ذاتی طور پر جلد باز ہے (وکان الانسان عجولاً)۔

اس مقام پر "دعا" کا ایک وسیع مفہوم ہے اور اس میں ہر قسم کی خواہش و طلب شامل ہے چاہے زبان سے ہو یا عمل سے۔

درحقیقت زیادہ سے زیادہ اور جلد از جلد منافع کے حصول کی تڑپ اس امر کا سبب بنتی ہے کہ مسائل کے تمام پہلوؤں کے بارے میں غور و فکر اور تحقیق و مطالعہ نہیں کرتا اور بسا ایسا ہوتا ہے کہ اس جلد بازی کے باعث انسان حقیقی فائدے اور منافع کی تمیز نہیں کر پاتا بلکہ خواہشات کی سرکشی اور بے تابی حقیقت کا چہرہ چھپا دیتی ہے اور انسان اپنی بھلائی کی بجائے برائی کے پیچھے چل نکلتا ہے۔ اس حالت میں جس طرح انسان اللہ سے بھلائی کا تقاضا کرتا ہے عدمِ معرفت اور غلط پہچان کے باعث برائیوں کا بھی تقاضا کرنے لگتا ہے اور جس طرح بھلائی کے لیے کوشش کرتا ہے برائی کے بھی پیچھے چل پڑتا ہے۔ یہ نوعِ انسانی کیلئے ایک بہت بڑی مصیبت ہے اور سعادت کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

کتنے ہی ایسے لوگ ہیں کہ جو جلد بازی کی وجہ سے خطرناک گڑھوں میں جا گرتے ہیں۔ اپنے تئیں وہ امن و خوشحالی کے راستے پر جا رہے ہوتے ہیں لیکن بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ منزلِ سعادت کے تصور میں برائیوں اور بدبختیوں میں جا پڑتے ہیں افتخار و عزت کی بجائے ذلت و رسوائی کے پانیوں میں جا گرتے ہیں ــ یہ بُرا نتیجہ عجلت پسندی اور جلد بازی کا ہے۔

جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آیت کا مفہوم نہ لفظی دعا میں منحصر ہے اور نہ عملی طلب میں ــ بلکہ یہ سب کچھ ایک جامع مفہوم میں موجود ہے۔ لہٰذا اگر بعض مفسرین نے اسے کسی ایک حصے میں محدود کیا ہے تو اس کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ نیز اگر بعض روایات میں صرف لفظی دعا کا ذکر ہے تو وہ در اصل ایک مصداق کی نشاندہی ہے نہ کہ پورے مفہوم کا ذکر ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

واعرف طریق نجاتک و ھلاککے، کی لا تدعوا اللہ بشیء عسی فیہ

ھلاکک ، وانت تظن ان فیہ نجاتک ، قال اللہ تعالیٰ و یدع الانسان بالشر دعاءہٗ بالخیر وکان الانسان عجولًا۔

اپنی نجات اور اپنی ہلاکت کے راستے کو خوب پہچان لے تاکہ تو اللہ سے کسی ایسی چیز کا مطالبہ نہ کر بیٹھے کہ جس میں تیری ہلاکت ہے جبکہ تیرا یہ گمان ہو کہ اسی میں تیری نجات ہے۔
اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ انسان جس طرح سے بھلائی کی دعا کرتا ہے اسی طرح برائی کی طلب کرنے لگتا ہے کیونکہ انسان جلد باز ہے[1]

لہٰذا خیر و سعادت تک پہنچنے کے لیے واحد راستہ یہ ہے کہ انسان جو بھی کام کرنا چاہے بڑے غور و خوض، سمجھداری اور جلد بازی سے بچتے ہوئے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر کرے اور اس سلسلے میں بے سوچے سمجھے فیصلوں سے بچے اور خواہشات نفسانی کی آلودگیوں سے اپنی رائے کو پاک رکھے پھر اللہ سے اس کام کیلئے مدد طلب کرے تاکہ منزل سعادت سے ہمکنار ہو سکے اور ہلاکت کے گڑھے میں نہ جا گرے۔

اگلی آیت میں خلقتِ شب و روز، ان کی برکات اور عالم میں ایک نظم و حساب کی موجودگی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے تاکہ توحید و معرفتِ الٰہی کی دلیل بھی بنے اور گزشتہ سے پیوستہ بحثِ قیامت کی بھی تکمیل ہو جائے اور اس کے علاوہ کاموں میں غور و خوض کرنے اور عجلت سے کام نہ لینے کے ضروری ہونے کے لیے بھی شاہد بن سکے۔ ارشاد ہوتا ہے : رات اور دن کو ہم نے اپنی نشانیوں میں سے دو نشانیاں قرار دیا ہے (وجعلنا اللیل والنھار اٰیتین)۔

پھر ہم نے رات کی نشانی کو محو کر دیا اور اس کی جگہ دن کی نشانی لے آئے کہ جو ضیاء بخش ہے (فمحونا اٰیۃ اللیل وجعلنا اٰیۃ النھار مبصرۃ)۔

اس سے ہمارے دو مقصد تھے۔ پہلا یہ کہ "تم اپنے رب کے فضل سے بہرہ ور ہو جاؤ" (لتبتغوا فضلًا من ربکم)۔ رات کو آرام کرو اور دن میں کام کاج اور بھاگ دوڑ کرو اور اس کے نتیجے میں نعماتِ الٰہی سے فائدہ اٹھاؤ۔

دوسرا یہ کہ اپنے کاموں کے نظم و حساب کے لیے سالوں کی تعداد اور مدت معین کرو اور وقت کا حساب کتاب اور تقسیم طے کر لو (ولتعلموا عدد السنین والحساب)۔

اور ہم نے سب کچھ مفصل اور واضح کر دیا ہے (وکل شیء فصلناہ تفصیلًا)۔ تاکہ کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہے۔

" اٰیۃ اللیل " اور " اٰیۃ النھار " سے مراد خود رات دن ہیں اور ان میں سے ہر ایک پروردگار

---

[1] نور الثقلین، ج ۳ ص ۱۴۱۔

کی ایک نشانی ہے یا "آیۃ اللیل" سے مراد چاند اور "آیۃ النہار" سے مراد سورج ہے۔ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے[1] لیکن آیت پر ہی غور و خوض کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ پہلی تفسیر ہی صحیح ہے۔

"وجعلنا اللیل والنہار اٰیتین" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں سے ہر ایک اثباتِ وجودِ خدا کے لیے دلیل، ایک نشانی ہے اور آیتِ شب محو ہونے سے مراد یہ ہے کہ رات کے تاریک پردے دن کے اجالے کی وجہ سے چھٹ جاتے ہیں اور رات کے وقت جو کچھ چھپ جاتا ہے دن کی روشنی میں آشکار ہو جاتا ہے۔

قرآن نے جو بعض دوسری آیات (یونس - ۵) میں سال اور مہینے کے حساب کے لیے سورج اور چاند کو پیمانہ اور ذریعہ قرار دیا ہے وہ ہمارے مذکورہ بیان کے منافی نہیں ہے کیونکہ انسانی زندگی میں نظم و حساب کے پیدا ہونے کو رات دن کی طرف بھی نسبت دی جا سکتی ہے اور چاند سورج کی طرف بھی چونکہ یہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ نہج البلاغہ کے خطبۂ اشباح میں عظمتِ الٰہی کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے امیرالمؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

وجعل شمسها اٰية مبصرة لنهارها، وقمرها، اٰية ممحوة من ليلها، واجراهما فى مناقل مجراهما، وقدر سيرهما فى مدارج درجهما، ليميز بين الليل والنهار بهما، وليعلم عدد السنين والحساب بمقاديرهما۔

سورج کو دن کی ضیاء بخش نشانی قرار دیا اور چاند کو رات کی محو کرنے والی نشانی بنایا اور ان دونوں کو رواں دواں کر دیا۔ ان کی حرکت کے مراحل مقرر کیے تاکہ رات اور دن کے درمیان فرق پیدا کرے اور دونوں سے حاصل کیے گئے حساب کتاب سے سالوں کا اندازہ لگایا جا سکے[2]

یہ تفسیر بھی مذکورہ بالا پہلی تفسیر کے منافی نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں سال کے حساب کتاب کو رات دن سے بھی منسوب کیا جا سکتا ہے اور چاند سورج سے بھی کیونکہ دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

---

[1] پہلی صورت میں "اضافت بیانیہ" اور دوسری صورت میں "اضافت اختصاصیہ" ہوگی۔

[2] نہج البلاغہ، خطبہ اشباح، خطبہ نمبر ۹۱۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا انسان ذاتی طور پر جلد باز ہے؟ زیر بحث آیت میں تو انسان کو جلد باز کہا گیا ہے لیکن ایسی آیات بھی ہیں جن میں انسان کو "ظلوم"، "جھول"، "کفور"، سرکش، کم ظرف اور مغرور وغیرہ کہا گیا ہے۔

ان تعبیروں سے بعض اوقات یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف یہ کہا گیا ہے اور دوسری طرف انسان کے پاک فطرت اور الہٰی روح کے حامل ہونے کا ذکر ہے ۔ ان دونوں کو کس طرح ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے؟

دوسرے لفظوں میں اسلامی تصورِ کائنات کے مطابق انسان ایک عالی مرتبہ موجود ہے، خلیفۃ اللہ اور زمین میں اللہ کی نمائندگی کے لائق ہے۔ انسان فرشتوں کا استاد اور ان سے برتر ہے ۔ یہ بات مذکورہ مذمت آمیز تعبیرات سے کیونکر ہم آہنگ ہے؟

اس سوال کا جواب ایک ہی جملے میں دیا جاسکتا ہے کہ انسان کا یہ تمام تر مقام، اہمیت اور قیمت سے مشروط ہے اور وہ شرط ہے، ہادیانِ الہٰی کے زیرِ نظر تربیت۔ اس صورت کے علاوہ انسان خود رو گھاس پھونس کی طرح پرورش پاتا ہے اور خواہشات و شہوات میں غوطے کھاتا رہتا ہے اور اپنی عظیم صلاحیتیں کھو دیتا ہے اور اس میں منفی پہلو آشکار ہو جاتے ہیں۔

اس بنا پر ۔ اگر مذکورہ شرط پوری ہو جائے تو وہ تمام مثبت صفات جو قرآن حکیم میں انسان کے بارے میں آئی ہیں وہ صورت پذیر ہو جائیں گی اور اگر یہ شرط پوری نہ ہوئی تو مذکورہ منفی صفات نمایاں ہو جائیں گی اسی لیے سورہ معارج کی آیہ ۱۹ تا ۲۲ میں ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۙ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۙ وَّ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۙ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۙ

انسان بہت کم ظرف پیدا ہوا ہے۔ جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بے تاب ہو جاتا ہے اور جب اسے کوئی اچھائی میسر آتی ہے تو بخل کرتا ہے سوائے ان نماز گزاروں کے کہ جو ہمیشہ اس طرزِ عمل پر باقی رہتے ہیں۔

اس سلسلے میں مزید تفصیل تفسیر نمونہ کی پانچویں جلد میں سورہ یونس کی آیت ۱۲ کے ذیل میں بیان کی جاچکی ہے۔

۲۔ جلد بازی ۔ ایک مصیبت: کسی چیز کو زیادہ پسند کرنا، سطحی اور محدود فکر، خواہشات کا انسان پر غلبہ اور کسی چیز کے بارے میں حد سے زیادہ اچھا گمان ۔ یہ سب جلد بازی کے عوامل ہیں۔ عام طور

پر سطحی مطالعہ اور ابتدائی آگاہی کسی امر کی حقیقت اور اس کے نفع و نقصان کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہوتے لہٰذا عموماً جلد بازی ندامت، نقصان اور پشیمانی کا موجب بنتی ہے۔ یہاں تک کہ زیر بحث آیات کے مطابق بعض اوقات عجلت کے باعث انسان غلط کاموں کے پیچھے ایسی تیزی سے چل پڑتا ہے جس تیزی سے اچھے کاموں کے پیچھے جاتا ہے۔

پوری تاریخ انسانی میں انسان کو جن تلخ کامیوں، شکستوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ان کا شمار ممکن نہیں اور خود ہم نے اپنی زندگی میں اس کے کئی نمونے دیکھے ہیں اور اس کے تلخ ثمرات چکھے ہیں۔

"عجلت" کے مقابل "تثبت" اور "تأنی" یعنی توقف کرنا، تفکر و تأمل کرنا اور کسی کام کے انجام دینے کے لیے اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

انما اھلک الناس العجلۃ ولو ان الناس تثبتوا لم یھلک احد

لوگوں کو ان کی جلد بازی نے مار ڈالا اگر لوگ تامل اور سوچ بچار سے کام انجام دیتے تو کوئی شخص ہلاک نہ ہوتا۔[1]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

مع التثبت تکون السلامۃ، ومع العجلۃ تکون الندامۃ

توقف و تأمل کرنے میں سلامتی ہے اور جلد بازی میں ندامت ہے۔[1]

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

ان الاناۃ من اللہ والعجلۃ من الشیطان

سوچ سمجھ کر کام کرنا اللہ کی طرف سے ہے اور عجلت شیطان کی جانب سے ہے۔[1]

البتہ اسلامی روایات میں "نیک کام جلدی کرنے کا باب" بھی موجود ہے۔ ان میں سے ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے، آپؐ فرماتے ہیں:

ان اللہ یحب من الخیر ما یعجل

اللہ کو پسند ہے کہ نیک کام میں جلدی کی جائے۔[2]

اس سلسلے میں بہت سی روایات ہیں۔ یہاں بے جا تاخیر، تساہل اور آج کل کرنے کے مقابل عجلت کا حکم ہے کیونکہ یہ طرز عمل عام طور پر کاموں میں مشکلیں اور رکاوٹیں پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے۔

---

[1] و[1] و[1] سفینۃ البحار، ج ۲، ص ۱۲۹۔

[2] اصول کافی، ج ۲، کتاب ایمان و کفر، باب "تعجیل فعل الخیر"۔

اس امر کی شاہد وہ حدیث ہے جو اسی باب میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے، آپؑ فرماتے ہیں :

من ھم بشیء من الخیر فلیعجله فان کل شیء فیه تأخیر فان للشیطان فیه نظرة

جو شخص کسی کارِ خیر کا ارادہ کرلے اسے چاہیئے کہ اس میں جلدی کرے کیونکہ جس کام میں تاخیر کروگے شیطان اس میں حیلے بہانے پیدا کردے گا۔[1]

اس بنا پر کہنا چاہیئے کہ کاموں میں سرعت اور مضبوط ارادہ تو ضرور ہونا چاہیئے لیکن جلد بازی نہیں۔

دوسرے لفظوں میں مذموم ایسی جلد بازی ہے کہ جس کے نتیجے میں کام بغیر تمام پہلوؤں کا جائزہ لیے اور بغیر تحقیق و شناخت کے صورت پذیر ہوجائے اور لائقِ تحسین ایسی سرعت ہے جو مصمم ارادہ کرلینے کے بعد تاخیر سے بچنے کے لیے ہو۔

روایات میں ہے کہ "نیک کام میں جلدی کرو" یعنی پہلے یہ جان لو کہ یہ کام۔ کارِ خیر ہے اور جب اس کا اچھا ہونا ثابت ہوجائے تو پھر اس میں تساہل نہ برتو۔

۲۔ کائنات میں نظم و حساب کا انسانی زندگی پر اثر : تمام تر نظامِ کائنات کسی حساب کتاب اور نظم و شمار پر قائم ہے۔ نظامِ عالم کی کوئی چیز بغیر کسی حساب کتاب کے نہیں ہے۔ فطری امر ہے کہ انسان کہ جو اس سارے نظام کا ایک جزو ہے کسی حساب کتاب کے بغیر زندگی بسر نہیں کرسکتا۔

اسی بنا پر قرآن کی مختلف آیات میں یہ فرمایا گیا ہے کہ چاند، سورج یا رات دن کا وجود انسان کے لیے نعماتِ الٰہی میں سے ہے کیونکہ یہ انسانی زندگی میں نظم و حساب پیدا کرنے کا ایک عامل ہے، کیونکہ بے نظم زندگی فنا اور نابودی کا سبب ہے۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ زیرِ مطالعہ آیات میں رات اور دن کی نعمت کے دو فائدے ذکر کیے ہیں :

ایک — "ابتغاء فضل الله" — کہ جو عام طور پر مفید اور تعمیری کام کے معنی میں ہے۔

دوسرا — سالوں کا حساب جاننا۔

---

[1] اصول کافی، ج ۲، کتاب ایمان وکفر، باب "تعجیل فعل الخیر"۔

ان دونوں کا اکٹھا ذکر شاید اس بات کی دلیل ہے کہ "ابتغاء فضل اللہ" "نظم و حساب" سے استفادہ کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔

گزشتہ زمانے میں شاید یہ بات اتنی واضح نہیں تھی لیکن آج کی دنیا تو اعداد و شمار کی دنیا ہے آج تو ہر اقتصادی، سماجی، سیاسی، فوجی، سائنسی اور ثقافتی ادارے میں شماریات کا شعبہ ہوتا ہے۔ ہر کارخانے میں یہ شعبہ ہوتا ہے۔ دورِ حاضر میں اس قرآنی اشارے کی گہرائی کی طرف توجہ کرنا چاہیئے اور یہ جاننا چاہیئے کہ قرآن نہ صرف یہ کہ زمانہ گزرنے سے پرانا نہیں ہوتا بلکہ جوں جوں وقت گزرتا ہے اس کی تازگی زیادہ نکھر کر سامنے آتی ہے [1]

---

[1] اس سلسلے میں ہم نے سورہ یونس کی آیت ۵ کے ذیل میں بھی تفصیلی بات کی ہے۔ اس سلسلے میں تفسیر نمونہ کی جلد ۵ میں مذکورہ آیت کی تفسیر کی طرف رجوع کیجئے۔

(۱۳) وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ○

(۱۴) اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا ○

(۱۵) مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ○

ترجمہ

(۱۳) اور ہر شخص کے اعمال کو ہم نے اس کے گلے کا ہار بنا دیا ہے اور روزِ قیامت اس کے لیے ہم ایک کتاب نکالیں گے کہ جسے وہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائے گا۔

(۱۴) (یہ اس کا نامۂ اعمال ہی ہو گا۔ ہم اس سے کہیں گے) اپنی کتاب پڑھ، آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے۔

(۱۵) جو شخص بھی ہدایت پاتے اس نے اپنے لیے ہدایت پائی اور جو شخص گمراہ ہو وہ اپنے ہی نقصان میں گمراہ ہوا (اس کا نقصان خود اسی کو پہنچے گا) اور کوئی شخص دوسرے کا بوجھ اپنے کندھے پر نہیں اٹھاتے گا ہم (لوگوں کو ان کی ذمہ داریاں بتانے کے لیے) پیغمبر مبعوث کیے بغیر کسی (شخص یا قوم) کو عذاب نہیں دیتے۔

تفسیر

چار اہم اسلامی اصول

گزشتہ آیات میں معاد و قیامت اور حساب و کتاب کے بارے میں گفتگو تھی۔ اسی مناسبت سے

زیر بحث آیات میں انسان کے اعمال کے حساب وکتاب کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ گفتگو قیامت میں اس معاملے کی کیفیت سے شروع ہوتی ہے ۔ارشاد ہوتا ہے : ہر شخص کے اعمال کو ہم نے اس کے گلے کا ہار بنا دیا ہے (وکل انسان الزمناه طائرہ فی عنقہ)۔

"طائر" پرندے کے معنی میں ہے لیکن عربوں کے درمیان معمول تھا کہ وہ پرندوں کے ذریعے نیک یا بد فال نکالتے تھے اور ان کی حرکت کی کیفیت سے نتیجہ نکالتے تھے ۔یہاں اس چیز کی طرف اشارہ ہے ۔مثلاً اگر ایک پرندہ ان کی دائیں طرف اڑ رہا ہوتا تو اسے نیک فال سمجھتے اور اگر بائیں طرف اڑ رہا ہوتا تو اسے بد فال خیال کرتے ۔اسی لیے یہ لفظ زیادہ تر فالِ بد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے حالانکہ "تفأل" زیادہ تر نیک فال کے لیے بولا جاتا ہے ۔

آیاتِ قرآن میں بھی بارہا "تطیر" فالِ بد کے معنی میں آیا ہے ۔مثلاً :

وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ

فرعون والوں کو کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو وہ اسے موسٰی اور ان کے ساتھیوں کی نحوست سمجھتے تھے ۔ (اعراف ۔ ۱۳۱)

نیز سورہ نمل کی آیت ۴۷ میں ہے :

قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ

قوم صالحؑ کے مشرکین کہنے لگے : ہم تجھے اور تیرے ساتھیوں کو نحس اور فالِ بد سمجھتے ہیں ۔

اسلامی احادیث میں "تطیر" سے منع کیا گیا ہے اور اس کے مقابلے میں "توکل علی اللہ" کی ہدایت فرمائی گئی ہے ۔

بہرحال زیر بحث آیت میں بھی "طائر" اس معنی کی طرف اشارہ ہے یا پھر یہ قسمت کے معنی میں ہے کہ جو نیک و بد فال کے قریب قریب ہے ۔

قرآن درحقیقت کہتا ہے کہ نیک و بد فال اور اچھی بری قسمت کوئی چیز نہیں ۔یہ تو تمہارے اعمال ہیں کہ جنہیں تمہاری گردن میں لٹکایا جائے گا ۔

"الزمناه" (ہم نے لازم قرار دیا ہے اس کو) اور "فی عنقہ" (اس کی گردن میں) کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کے اعمال اور ان کے نتائج دنیا اور آخرت میں اس سے جدا نہیں ہوتے اور ہر حالت میں اسے ان کا مسئول اور ذمہ دار ہونا چاہیئے ۔جو کچھ ہے عمل ہے باقی سب باتیں ہیں ۔

بعض مفسرین نے لفظ "طائر" کے انسانی اعمال پر اطلاق سے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ انسان

کے اچھے بُرے اعمال گویا ایک پرندے کی مانند ہیں کہ جو اس کے وجود سے پرواز کرتا ہے۔ اسی لیے ان پر "طائر" کا اطلاق ہوا ہے۔

زیر بحث آیت میں لفظ "طائر" اچھائی اور برائی سے انسان کے حصے کے معنی میں ہے یا دلیل اور رہنما کے معنی میں ہے یا نامۂ اعمال کے معنی میں ہے یا برکت و نحوست کے معنی میں ہے۔

ان میں سے بعض تفاسیر سے تو وہی مفہوم نکلتا ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں جبکہ بعض تفاسیر آیت کے مفہوم سے بہت دُور ہیں۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: روزِ قیامت ہم اس کے لیے کتاب نکالیں گے کہ جسے وہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائے گا (ونخرج له یوم القیامة کتابًا یلقاه منشورًا)۔

واضح ہے کہ "کتاب" سے مراد انسان کے نامۂ اعمال کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے۔ وہی نامۂ اعمال کہ جو اس دنیا میں بھی موجود ہے کہ جس میں اس کے اعمال ثبت ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یہاں وہ نامۂ اعمال پوشیدہ اور وہاں کھلا ہوا سامنے رکھا ہوگا۔ "نخرج" (نکالیں گے) اور "منشور" (کھلا ہوا) کی تعبیر اسی معنی کی طرف اشارہ ہے کہ جو اس جہان میں مخفی ہے وہاں آشکار اور کھلا ہوا ہوگا۔

نامۂ اعمال اور اس کی حقیقت کے بارے میں آئندہ صفحات میں ہم مزید گفتگو کریں گے۔

تو اُس وقت اس سے کہا جائے گا: اپنا نامۂ اعمال خود پڑھ لے (اقرأ کتابك)۔ اپنا حساب کتاب کرنے کے لیے آج تُو خود ہی کافی ہے (کفٰی بنفسك الیوم علیك حسیبًا)۔

یعنی مسائل اس قدر واضح ہیں کہ جائے کلام نہیں ہے۔ جو شخص بھی اس نامۂ اعمال کو دیکھے گا خود فیصلہ کر سکے گا، چاہے وہ خود مجرم ہی کیوں نہ ہو کیونکہ یہ نامۂ اعمال خود اس کے اعمال یا اعمال کے آثار کا مجموعہ ہے لہٰذا کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس کا انکار ہو سکے۔

اگر مَیں اپنی ریکارڈ شدہ آواز سنوں یا کوئی اچھا یا بُرا کام کرتے ہوئے کھینچی گئی اپنی تصویر دیکھوں تو کیا اس کا انکار کر سکتا ہوں۔ نامۂ اعمال کی کیفیت روزِ قیامت اس سے بھی زیادہ واضح اور باریک تفصیلات کے ساتھ ہوگی۔

اگلی آیت میں حساب اور جزاء کے بارے میں چار اصولی احکام بیان کیے گئے ہیں:

۱۔ جو شخص ہدایت پالے تو اس نے اپنے ہی فائدے میں ہدایت پائی ہے اور اس کا نتیجہ خود اسی کو حاصل ہوگا (من اهتدٰی فانما یهتدی لنفسه)۔

۲۔ اور جو شخص گمراہی کا راستہ اپنا لے تو وہ اپنے ہی نقصان میں گمراہ ہوا ہے اور اس کے بُرے نتائج خود اسی کے دامن گیر ہوں گے (ومن ضل فانما یضل علیها)۔

ان دو احکام کی نظیر اسی سورت کی ساتویں آیت میں بھی گزر چکی ہے۔

۳۔ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنے دوش پر نہیں اٹھائے گا اور کسی کو دوسرے کے جرم کی سزا نہیں دی جائے گی (ولا تزر وازرة وزر اخرٰی)۔

"وزر" کا معنی ہے "بھاری بوجھ" یہ لفظ مسئولیت اور جوابدہی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ روحانی اعتبار سے یہ بھی انسان کے کندھے پر ایک بھاری بوجھ کی مانند ہی ہے۔ "وزیر" کو بھی اسی لیے "وزیر" کہتے ہیں کہ سربراہِ مملکت یا عوام کی طرف سے اس کے کندھے پر ایک بھاری بوجھ ہوتا ہے۔

یہ ایک عمومی قانون ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا۔ البتہ یہ قانون سورہ نحل کی آیت ۲۵ کے مفہوم کے منافی نہیں ہے کہ جس میں ہے کہ گمراہ کرنے والے افراد سے ان لوگوں کے بارے میں بھی جوابدہی ہوگی جنہیں انہوں نے گمراہ کیا ہے کیونکہ دوسروں کو گمراہ کرنا بھی بذاتِ خود گناہ ہے یا گمراہ کرنے والے مثل فاعل شمار ہوں گے لہٰذا درحقیقت یہ ان کے اپنے گناہوں کا بوجھ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہاں "سبب" کام انجام دینے والے کے حکم میں ہے۔

متعدد روایات کے مطابق جو شخص اچھی یا بُری رسم کی بنیاد رکھے گا وہ جزا اور سزا میں اس رسم کی پیروی کرنے والوں کا شریک ہے۔ جو کچھ ہم نے سطورِ بالا میں کہا ہے یہ روایات اس سے متضاد نہیں ہیں کیونکہ کسی سنت یا رسم کی بنیاد رکھنے والا درحقیقت عمل کے بنیادی اسباب میں سے ہے اور عمل میں شریک ہے۔

۴۔ آخر میں چوتھا حکم یوں بیان کیا گیا ہے: ہم کسی شخص یا قوم کو اس وقت تک سزا نہیں دیتے جب تک ان کے لیے کوئی پیغمبر مبعوث نہ کریں تاکہ وہ پوری طرح انہیں ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرکے ان پر حجت تمام کردے (وما کنا معذبین حتّٰی نبعث رسولاً)۔

مفسرین میں اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ یہاں عذاب سے مراد ہر قسم کا دنیاوی یا اُخروی عذاب ہے یا خصوصیت سے "عذابِ استیصال" ہے (یعنی طوفانِ نوح کی طرح کا ہولناک عذاب)۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ آیت کا ظاہری مفہوم مطلق ہے اور اس میں ہر قسم کا عذاب شامل ہے۔

نیز اس بارے میں بھی مفسرین میں اختلاف ہے کہ یہ حکم شرعی مسائل کہ جنہیں نقلی دلائل سے معلوم کیا جاتا ہے کے لیے مخصوص ہے یا اصولی و فروعی اور عقلی و نقلی تمام مسائل سے مربوط ہے۔ البتہ اگر ہم آیت کے ظاہری مفہوم کو دیکھیں تو مطلق ہے۔ لہٰذا کہنا چاہیئے اصول و فروعِ دین سے مربوط تمام عقلی و نقلی احکام اس میں شامل ہے۔

آیت کے ظاہری مفہوم کے لحاظ سے اس گفتگو کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مسائل بھی جن کے بارے میں عقل مستقلاً اچھا یا بُرا ہونے کا فیصلہ رکھتی ہے (مثلاً عدل کا اچھا ہونا اور ظلم کا بُرا ہونا) اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے ان کے بارے میں بھی کسی کو اس وقت تک سزا نہیں دیتا جب تک خدا کے پیغمبر نہ آئیں اور

حکمِ نقل کے ذریعے حکمِ عقل کی تائید نہ کریں۔ (غور کیجئے گا)۔

لیکن یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ عقل جن امور کے بارے میں مستقل فیصلہ رکھتی ہے وہ بیانِ شرعی کے محتاج نہیں ہیں اور ایسے امور کے لیے حکمِ عقل اتمامِ حجت کے لیے کافی ہے لہٰذا ہمارے سیلے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم مستقلاتِ عقلی کو اس آیت سے مستثنیٰ سمجھیں اور اگر ایسا نہ سمجھیں تو پھر عذاب کے اس جملے میں عذابِ استیصال کا معنی لینا ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم کی وجہ سے ظالموں اور منحرفوں کو اس وقت تک نابود نہیں کرے گا جب تک انہیں سعادت کی تمام راہیں بتانے والا پیغمبر ان میں مبعوث نہ کرلے۔ وہ پیغمبران سے مستقلاتِ عقلی کے بارے میں بھی شرعی حکم بیان کرے گا اور عقل و نقل دونوں حوالوں سے اتمامِ حجت کرے گا (غور کیجئے گا)۔

چند اہم نکات

۱۔ **اچھی اور بُری فال:** کسی چیز یا کام سے نیک و بد فال لینا تمام قوموں میں تھا اور آج بھی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس کا سرچشمہ حقائق تک دسترس نہ ہونا اور واقعات کے اسباب وعلل سے لاعلمی ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ نیک یا بد فال کا کوئی طبیعی اثر نہیں ہے البتہ اس کا نفسیاتی اثر ہوتا ہے۔ نیک فال امید آفریں ہوتی ہے جبکہ بد فال یاس، ناامیدی اور کمزوری کا موجب بنتی ہے۔ اسلام چونکہ ہمیشہ اچھی چیزوں کا خیر مقدم کرتا ہے اس لیے اسلام نے نیک فال سے منع نہیں کیا، البتہ بد فال کی شدید مذمت کی ہے۔ یہاں تک کہ بعض روایات میں اسے سرحدِ شرک میں شمار کیا گیا ہے۔ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

الطیرة شرک

بُری فال لینا (اور خدا کے مقابلے میں اسے اپنی قسمت میں مؤثر جاننا) ایک قسم کا خدا کی ذات میں شرک کرنا ہے۔

اس سلسلے میں چوتھی جلد میں ہم سورہ اعراف کی آیت ۱۳۱ کے ذیل میں گفتگو کرچکے ہیں۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ صحیح اور اصلاحی پہلوؤں سے اس قسم کے تخیلاتی امور سے اسلام نے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔

مثلاً عموماً کہا جاتا ہے کہ فلاں دلہن خوش قدم تھی یا بد قدم تھی جس دن سے اس نے فلاں شخص کے گھر میں قدم رکھا ہے وہ ایسا ایسا ہوگیا ہے۔ یہ ایک فضول بات سے زیادہ نہیں ہے، لیکن اسلام نے اسے تعمیری اور اصلاحی شکل دی ہے۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

من شوم المرئة غلاء مهرها وشدة مؤنتها.....

عورت کی ایک نحوست یہ ہے کہ اس کا حق مہر زیادہ ہو اور اخراجات بھاری ہوں۔[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

اما الدار فشؤمها ضيقها وخبث جيرانها

منحوس گھر وہ ہے کہ جو تنگ و تاریک ہو اور جس کے ہمسائے برے لوگ ہوں۔[2]

خوب غور کریں کہ وہی الفاظ جنہیں لوگ غلط اور بے ہودہ مفاہیم کے لیے استعمال کرتے ہیں انہیں حقیقی اور اصلاحی مفاہیم کے لیے صرف کیا گیا ہے اور بے راہ روی کی طرف جانے والے خیال وافکار کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت کی گئی ہے۔

اس بحث کی مؤید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث پر ہم اپنی اس گفتگو کو ختم کرتے ہیں۔ آپؐ فرماتے ہیں:

اللّٰهم لا خير الا خيرك، ولا طير الا طيرك ولا رب غيرك

بارالہا! خیر وہی ہے جو تیری طرف سے ہو اور کوئی اچھی بری فال تیرے ارادے کے بغیر کچھ نہیں اور تیرے علاوہ کوئی رب نہیں۔

۲۔ **انسان کا عجیب اعمال نامہ:** قرآن حکیم کی بہت سی آیات اور روایات میں انسانوں کے نامۂ اعمال کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر ان آیات و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے تمام اعمال اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ ایک رجسٹر میں لکھے جاتے ہیں اور اگر انسان نیک ہوا تو روزِ قیامت اس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور اگر برا ہوا تو بائیں ہاتھ میں۔

سورۂ حاقہ میں ہے:

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا کِتٰبِیَهْ ۝

جسے اس کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں تھمایا جائے گا فخر سے کہے گا کہ آیئے اور ہمارا نامۂ اعمال پڑھیے۔ (حاقہ - ۱۹)

نیز یہ بھی فرمایا گیا ہے:

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ کِتٰبِیَهْ ۝

لیکن جسے اس کا نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں تھمایا جائے گا وہ کہے گا: اے کاش! میرا نامۂ اعمال مجھے نہ تھمایا جاتا۔ (حاقہ - ۲۵)

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۲ صفحہ ۱۰۴۔

[2] سفینۃ البحار، ج ۱ صفحہ ۶۵۸۔

سورہ کہف کی آیت ۴۹ میں ہے:

وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَا لِهَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا ۚ وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ○

بنی آدم کے اعمال نامے کھول دیئے جائیں گے تو تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اس کی تحریر سے خوف کھائیں گے اور کہیں گے! ہائے ہم پر افسوس! یہ کیسی کتاب ہے کہ اس میں کوئی چھوٹا بڑا گناہ شمار کیے بغیر نہیں چھوڑا گیا اور جو کچھ انہوں نے انجام دیا تھا اسے موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔

ایک حدیث میں زیر بحث آیت " اقرأ کتابك ...." کے ذیل میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

يذكر العبد جميع ما عمل، وما كتب عليه، حتى كانه فعله تلك الساعة، فلذالك قالوا يا ويلتنا ما لهذا الكتاب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة الا احصاها

جو کچھ انسان انجام دے چکا ہے اور جو اس کے نامۂ اعمال میں درج ہے سب کچھ اسے یاد آجائے گا اور اس طرح سے کہ جیسے اس نے ابھی ابھی انجام دیا ہے لہٰذا مجرمین پکاریں گے اور کہیں گے کہ یہ کیسی کتاب ہے کہ جس نے کوئی چھوٹا بڑا گناہ لکھے بنا نہیں چھوڑا [1]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نامۂ اعمال کیا ہے اور کیسا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ عام کتاب، یا رجسٹر یا فائل کی طرح کا تو نہیں ہوگا۔ اسی لیے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ نامۂ اعمال "روح انسان" کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے کہ جس میں تمام اعمال کے آثار ثبت ہیں [2] کیونکہ ہم جو بھی عمل انجام دیتے ہیں وہ لازمی طور پر ہماری روح پر اثر مرتب کرتا ہے۔ یا یہ کہ یہ نامۂ اعمال ہمارے جسم کے اعضا اور گوشت پوست اور اس کے گرد کی زمین، ہوا اور فضا ہے کہ جس میں ہم اعمال انجام دیتے ہیں کیونکہ ہمارے اعمال ہمارے جسم پر اثرات مرتب کرنے کے علاوہ ہوا اور زمین پر بھی اثر چھوڑتے ہیں اگرچہ اس دنیا میں ہم ان آثار کو محسوس کر نہیں سکتے لیکن بلاشبہ وہ موجود ہوتے ہیں اور روز قیامت کہ جب تمام

---

[1] نور الثقلین، ج ۳ ص ۱۴۴۔

[2] تفسیر صافی۔

ایک نئی قوتِ ادراک حاصل ہوگی، ہم انہیں دیکھ سکیں گے۔

سطورِ بالا میں جو تفسیر بیان ہوئی ہے اس کے بارے میں لفظ "اقرأ" (پڑھ) سے غلط فہمی پیدا نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ پڑھنے کا بھی ایک وسیع مفہوم ہے اور اس میں ہر قسم کا مشاہدہ شامل ہے۔ مثلاً روزمرہ کی گفتگو میں ہم کبھی کبھی کہتے ہیں: "مَیں نے اس کی آنکھوں سے پڑھ لیا ہے کہ اس کا ارادہ کیا ہے" یا "فلاں آدمی کے فلاں کام سے مَیں نے باقی بات پڑھ لی ہے"۔ اسی طرح بیماروں کے ایکس رے کو دیکھنے کے لیے بھی پڑھنے کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں ہے کہ اس کے نامۂ اعمال کے مندرجات کسی طرح بھی قابلِ انکار نہیں ہیں کیونکہ وہ خود عمل کے حقیقی اور تکوینی آثار ہیں۔ بالکل انسان کی ٹیپ شدہ آواز کی طرح یا اس کی تصویر کی طرح اور یا اس کی انگلی کے نشان کی طرح۔

۳۔ گنہگار کے ساتھ بے گناہ نہیں جلے گا: عوام میں مشہور ہے کہ جب آگ لگتی ہے تو خشک و تر سب کچھ جل جاتا ہے۔ لیکن منطق، عقل اور تعلیماتِ انبیاء کے مطابق کسی بے گناہ کو کسی دوسرے کے گناہ کی وجہ سے سزا نہیں ملے گی۔ قومِ لوط کے تمام شہروں میں صرف ایک گھر ایمان والوں کا تھا۔ جب اللہ نے اس منحرف اور غلیظ قوم پر عذاب نازل کیا تو اس ایک گھرانے کو بچا لیا۔

زیرِ بحث آیات میں بھی صراحت سے فرمایا گیا ہے:

ولا تزر وازرة وزر اخرٰی

کوئی شخص دوسرے کا بوجھ اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا۔

اس بناء پر اگر کچھ غیر معتبر روایات میں اسلام کے کلی قانون کے خلاف کچھ نظر آئے تو اسے لازمی طور پر ایک طرف پھینک دینا چاہیئے یا اس کی توجیہ کی جانا چاہیئے۔ مثلاً ایک روایت میں ہے:

مرجانے والے کو اس کے پسماندگان کی گریہ و زاری کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے۔

ہوسکتا ہے یہاں عذاب سے عذابِ الٰہی مراد نہ ہو بلکہ اس سے وہ ناراحتی اور دکھ مراد ہو کہ جو اس کی روح کو اپنے عزیزوں کی بے تابی و اضطراب سے آگاہ ہونے پر ہوتا ہے۔

نیز اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ کہ کافروں کی اولاد اپنے ماں باپ کے ساتھ جہنم میں جائے گی، ایک اسلامی عقیدہ نہیں ہے۔ کیونکہ اولاد کو ماں باپ کے گناہ کی سزا نہیں مل سکتی یہی وجہ ہے کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ غیر شرعی طور پر پیدا ہونے والی اولاد کا بھی ذاتی طور پر کوئی گناہ نہیں اور اگر وہ چاہے تو سعادت و نجات کے دروازے اس کے سامنے کھلے ہیں اگرچہ ایسی اولاد کے لیے تربیت کا مسئلہ بہت دشوار ہے۔

۴۔ برأت کا اصول اور آیت "ماکنا معذبین": علمِ اصول میں "برأت"

کی بحث میں زیر نظر آیت سے استدلال کیا گیا ہے کیونکہ آیت کا کم از کم مفہوم یہ ہے کہ جن مسائل کا عقل ادراک نہیں کر سکتی، انبیاء بھیجے بغیر یعنی احکام اور ذمہ داریاں بیان کیے بغیر خدا کسی کو سزا نہیں دے گا۔ یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ جن امور کے بارے میں کوئی حکم موجود نہیں ہے ان پر کوئی سزا نہ ہوگی۔ اسی کو قانونِ برأت کہتے ہیں یعنی حکم بیان کیے بغیر سزا صحیح نہیں ہے۔

باقی رہا یہ معاملہ کہ بعض نے کہا ہے کہ زیر نظر آیت میں عذاب سے مراد صرف عذاب استیصال ہے جیسا قوم نوح پر آیا تھا، تو اس کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں آیت مطلق ہے اور اس کے مفہوم میں ہر قسم کا عذاب اور سزا شامل ہے۔

(۱۶) وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ○

(۱۷) وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ○

ترجمہ

(۱۶) اور جب ہم کسی شہر کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اس کے "مترفین" (نفس پرستی میں مست دولت مندوں) سے اپنے اوامر بیان کرتے ہیں۔ پھر جب وہ مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور سزا کے مستحق ہو جاتے ہیں تو ہم شدت سے ان کی سرکوبی کرتے ہیں۔

(۱۷) اور ایسے کتنے ہی لوگ تھے جو نوح کے بعد کی صدیوں میں رہے اور (اسی سنت کے مطابق) ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور کافی ہے تیرا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں سے آگاہ اور ان کے لیے بینا ہے۔

تفسیر

عذابِ الٰہی کے چار مرحلے

گزشتہ آیات میں سے آخری میں بیان کیا گیا تھا کہ "ہم کسی فرد یا گروہ کو انبیاء بھیجنے اور اپنے احکام بیان کرنے کے بغیر ہرگز سزا نہیں دیتے"۔ اب زیر بحث پہلی آیت میں یہی بنیادی بات ایک اور پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب ہم کسی قوم کو ہلاک کرنے کا مصمم ارادہ کر لیتے ہیں تو پہلے ہم مترفین اور دولت کے نشے میں غرق لوگوں سے اپنے احکام بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد جب وہ اطاعت نہیں کرتے بلکہ

مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں تو ہم ان کی شدت سے سرکوبی کرتے ہیں اور انہیں ہلاک کر دیتے ہیں (واذا اردنا ان نهلك قرية امرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمرناها تدميرا)[1]

اس آیت کے مفہوم کے بارے میں بہت سے مفسرین نے متعدد احتمالات ذکر کیے ہیں لیکن ہماری نظر میں آیت اپنے ظاہری معنی کے اعتبار سے ایک سے زیادہ واضح تفسیر نہیں رکھتی۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اتمام حجت اور اپنے احکام بیان کرنے سے پہلے ہرگز کسی سے مواخذہ نہیں کرتا اور نہ کسی کو عذاب دیتا ہے بلکہ پہلے اپنے احکام بیان کرتا ہے اگر لوگ اطاعت کریں اور ان احکام کو اپنالیں تو خوب، اسی میں ان کی دنیا و آخرت کی سعادت ہے اور اگر وہ فسق و فجور کریں اور مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوں اور احکام کو پاؤں تلے روند ڈالیں تو یہ وہ مقام ہے جہاں وہ عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے بعد ان کے لیے ہلاکت ہے۔

اگر آیت میں صحیح طور پر غور و فکر کریں تو اس کام کے لیے چار مراحل واضح طور پر بیان ہوئے ہیں:

(۱) اوامر (و نواھی) کا مرحلہ

(۲) مخالفت اور فسق و فجور کا مرحلہ

(۳) عذاب کے استحقاق کا مرحلہ

(۴) ہلاکت کا مرحلہ

فاء تفریع کے ساتھ یہ تمام مرحلے ایک دوسرے پر عطف ہوتے ہیں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ صرف "مترفین"[2] کو حکم کیوں دیا گیا ہے۔

اس سوال کے جواب میں ایک نکتے کی طرف توجہ کی جائے تو معاملہ واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ بہت سے معاشروں (مراد غلط قسم کے معاشرے ہیں) میں معاشرے کی باگ ڈور مترفین ہی کے قبضے میں ہوتی ہے اور دوسرے لوگ ان کے تابع اور پیرو ہوتے ہیں علاوہ ازیں اس میں ایک اور نکتے کی طرف بھی اشارہ ہے وہ یہ کہ معاشرے کی زیادہ تر برائیوں کا سرچشمہ مترفین اور خدا کو بھولے ہوئے دولت مند ہی ہوتے ہیں جو ناز و نعمت، عیش و عشرت اور ہوا و ہوس میں مستغرق ہوتے ہیں۔ ہر اصلاحی، انسانی اور اخلاقی آواز انہیں بُری لگتی ہے۔ لہٰذا یہی لوگ انبیاء کے مقابلے میں پہلی صف میں ہوتے تھے اور ان کی دعوت کہ جو عدل و انصاف کیلئے اور مستضعفین کی حمایت میں ہوتی تھی اسے ہمیشہ اپنے برخلاف سمجھتے تھے۔ ان وجوہ کی بناء پر خصوصیت سے انہی کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ فساد اور برائی کی اصلی جڑ یہی لوگ ہیں۔

---

[1] "قول" کا اگرچہ وسیع معنی ہے لیکن ایسے مواقع پر حکم عذاب کے معنی میں ہے۔

[2] "مترفین" "ترفة" کے مادہ سے فراواں نعمت کے معنی میں ہے یعنی وہ نعمتوں کے پلے ہوئے اور دولت مند جو خدا سے بے خبر ہیں۔

ضمناً ــ "دمرنا" اور "تدمیر" "دمار" کے مادہ سے ہلاکت کے معنی میں ہیں ۔

بہرحال مندرجہ بالا آیت تمام اہلِ ایمان کے لیے تنبیہ ہے کہ وہ خبردار رہیں اور اپنی حکومت مترفین اور نفسانی خواہشوں میں سرمست دولت مندوں کے ہاتھ میں نہ دیں اور ان کے پیچھے نہ لگیں کیونکہ یہ لوگ آخرکار ان کے معاشرے کو ہلاکت و نابودی سے ہمکنار کر دیں گے ۔

اگلی بعد والی آیت میں اس مسئلے کے کئی ایک نمونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : کتنے ہی لوگ تھے جو نوح کے بعد کی صدیوں میں آئے اور (اسی سنت کے مطابق) ہلاک اور نابود ہو گئے (وکم اھلکنا من القرون من بعد نوح) ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی فرد یا گروہ کا ظلم اور گناہ علمِ خدا کی تیز بیں نگاہ سے مخفی رہ جائے " خدا اپنے بندوں کے گناہ سے کافی یعنی پورا آگاہ ہے ان کے لیے بینا ہے" (وکفی بربک بذنوب عبادہ خبیرًا بصیرًا) ۔

" قرون " " قرن " کی جمع ہے ۔ اس کا معنی ہے وہ لوگ جو ایک زمانے میں زندگی گزاریں ۔ بعد ازاں یہ لفظ ایک زمانے اور ایک دَور کے لیے استعمال ہونے لگا ۔

ایک " قرن " کتنے سال کا ہوتا ہے، اس سلسلے میں مختلف نظریات ہیں۔ بعض چالیس سال کا کہتے ہیں، بعض اَسّی سال کا، بعض سو سال کا اور بعض اس سے بھی زیادہ، ایک سو بیس سال کا کہتے ہیں۔ لیکن بنا کے واضح ہے کہ یہ ایک امر اعتباری ہے جو مختلف صورتوں میں مختلف ہوتا ہے البتہ ہمارے زمانے میں معمول یہ ہے کہ لفظ " قرن " کا اطلاق سو سال پر ہوتا ہے [1]

نیز یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد کے قرنوں کا خصوصی ذکر کیوں کیا گیا ہے ۔ ہو سکتا ہے یہ اس لیے ہو کہ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے انسانی زندگی انتہائی سادہ تھی ۔ یہ سب اختلافات خصوصاً معاشرے کی " مترف " اور " مستضعف " کی طبقاتی تقسیم بہت کم تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ بہت کم عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوتے ۔

" خبیر " و " بصیر " (آگاہ و بینا) کا اکٹھا ذکر اس طرف اشارہ ہے کہ " خبیر " نیت اور عقیدے سے آگاہ کے معنی میں ہے اور " بصیر " اعمال و کردار کو دیکھنے والے کے معنی میں ہے ۔ لہٰذا خدا تعالیٰ لوگوں کے اعمال کے باطنی وجود اور اسباب پر بھی مطلع ہے اور خود اعمال کو بھی جانتا ہے اور ایسی ہستی ہرگز کسی پر ظلم روا نہیں رکھتی اور اس کی حکومت میں کسی کا حق ضائع نہیں ہوتا ۔

---

[1] سورۂ یونس کی آیت ۱۳ کے ذیل میں بھی ہم نے اس موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے (تفسیر نمونہ ج ۸ صفحہ ۱۹۰ اردو ترجمہ) ۔

(۱۸) مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا ○

(۱۹) وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ○

(۲۰) كُلًّا نُمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ○

(۲۱) انْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ وَلَلْآخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا ○

ترجمہ

(۱۸) جو شخص (صرف) جلد گزر جانے والی (مادی دنیا) طلب کرتا ہے تو ہم اسے اس قدر دے دیتے ہیں، جو ہم چاہیں اور جس مقدار کا اسکے بارے میں ارادہ کریں اسکے بعد اس کے لیے دوزخ قرار دیں گے کہ وہ اس کی جلا دینے والی آگ میں جلے گا، جبکہ وہ درگاہِ الٰہی سے، راندہ اور مذموم ہوگا۔

(۱۹) اور جو شخص صرف آخرت کو چاہے اور اپنی سعی و کوشش اس کے لیے انجام دے اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو تو (خدا کی طرف سے) اسے اس کی سعی و کوشش پر جزا ملے گی۔

(۲۰) ان میں سے ہر گروہ کو تیرے پروردگار کی عطا میں سے حصّہ اور مدد ملے گی اور تیرے پروردگار کی عطا و بخشش کبھی کسی سے ممنوع قرار نہیں دی گئی۔

(۲۱) دیکھو کس طرح ہم نے بعض کو (دنیا میں ان کی سعی و کوشش کی وجہ سے) بعض دوسروں پر

برتری عطا کی ہے اور آخرت کے درجات اور اس کی فضیلتیں تو اس سے کہیں زیادہ ہیں۔

تفسیر

طالبانِ دنیا اور طالبانِ آخرت

گزشتہ آیات میں اوامرالٰہی کے مقابلے میں منکرین کی مخالفت اور پھر ان کی ہلاکت کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر نظر آیات میں اس سرکشی اور طغیان کے حقیقی سبب یعنی حُبِّ دنیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جن لوگوں کی نظر اسی زود گزر مادی دنیا پر ہے، ہم جس مقدار میں چاہتے ہیں اور اس کے لیے مناسب سمجھتے ہیں اسی زندگی میں اسے دے دیتے ہیں، اس کے بعد اس کے لیے ہم جہنم قرار دیں گے کہ جس کی آگ میں وہ جلے گا اس حالت میں کہ وہ رحمتِ الٰہی کی درگاہ سے راندہ اور مذموم ہوگا (من کان یرید العاجلة عجلنا له فیها ما نشاء لمن نرید ثم جعلنا له جهنم یصلٰها مذموما مدحورا)۔

"عاجلہ" کا معنی ہے جلد گزر جانے والی نعمتیں یا زود گزر دنیا۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص دنیا کے پیچھے جائے گا، وہ جو کچھ چاہے گا اس تک پہنچ جائے گا بلکہ اس کے لیے دو شرطیں بیان کی گئی ہیں پہلی یہ کہ وہ جو چاہے گا اس کا کچھ حصہ اسے ملے گا، اتنا ہی جتنا ہم چاہیں گے (ما نشاء)۔

دوسری یہ کہ سب لوگ بھی یہ حصہ نہیں پاسکیں گے بلکہ ان میں سے کچھ متاعِ دنیا کے ایک حصے تک پہنچیں گے وہی کہ جن کے بارے میں ہم چاہیں گے (لمن نرید)۔

اس طرح نہ تمام دنیا پرست دنیا تک پہنچیں گے اور نہ ہی پہنچ پانے والے اتنی دنیا حاصل کرسکیں گے جتنی وہ چاہیں گے۔

روزمرہ کی زندگی میں بھی ہم اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ کتنے لوگ شب و روز دوڑتے رہتے ہیں لیکن کہیں نہیں پہنچتے اور کتنے افراد ہیں جو اس دنیا میں بڑی بڑی آرزوئیں رکھتے ہیں مگر ان میں سے کچھ ہی کی تکمیل ہوتی ہے۔

یہ امر دنیا پرستوں کے لیے تنبیہ ہے کہ اگر تم خیال کرتے ہو کہ آخرت کو دنیا کے بدلے بیچ کر اپنا مقصد حاصل کرلو گے تو یہ تمہاری بہت بڑی غلطی ہے۔ ایسا کبھی نہ ہوسکے گا۔ مقصد کا کچھ حصہ ہی تمہیں ملے گا۔

ویسے بھی انسان کی آرزوؤں کا دامن اتنا وسیع ہے کہ محدود عالم مادہ میں وہ سب پوری نہیں ہوسکتیں۔ ایک شخص کو ساری دنیا مل جائے تو بھی اکثر وہ سیر نہیں ہوتا۔

رہے وہ لوگ کہ جو کوششیں کرتے ہیں مگر انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا، تو اس کی کئی وجوہ ہیں۔ یا تو اس لیے

کہ ابھی ان کی بیداری اور نجات کی امید ہوتی ہے اور خدا ان سے محبت کرتا ہے اور یا اس وجہ سے کہ اگر وہ کچھ حاصل کرلیں تو اس قدر سرکشی کریں گے کہ مخلوقِ خدا پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں گے۔

"یصلی" "صلی" کے مادہ سے آگ روشن کرنے اور آگ میں جلنے کے معنی میں ہے۔ یہاں دوسرا معنی مراد ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ سزا کے طور پر جہنم کی آگ کے ساتھ "مذموم" اور "مدحور" کے الفاظ بھی تاکید کے طور پر آتے ہیں۔ ان میں سے پہلی سزا سرزنش اور مذمت ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری خدا سے دور رہنے کے معنی میں ہے۔ درحقیقت جہنم کی آگ تو ان کے لیے جسمانی سزا ہے اور مذموم و مدحور ہونا ان کے لیے روحانی عذاب ہے۔ کیونکہ معاد جسمانی بھی ہے اور روحانی بھی، اس کا عذاب و ثواب اور سزا و جزا کے بھی دونوں پہلو ہیں۔

اس کے بعد دوسرے گروہ کے حالات بیان کیے گئے ہیں تاکہ قرآن کی روش کے مطابق تقابل سے مطلب زیادہ آشکار ہو جائے۔

ارشاد ہوتا ہے: باقی رہا وہ شخص جو آخرت طلب کرتا ہے اور اسی راستے میں سعی و کوشش کرتا ہے اور وہ صاحبِ ایمان ہے تو اس کی یہ سعی و کوشش بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوگی (ومن اراد الاٰخرۃ وسعٰی لھا سعیھا وھو مؤمن فاولٰئک کان سعیھم مشکورًا)۔

لہٰذا جاودانی سعادت اور دائمی خوش بختی تک پہنچنے کے لیے تین بنیادی شرائط ہیں:

(۱) انسانی ارادہ ــ ایسا ارادہ جو حیاتِ ابدی سے تعلق رکھتا ہو اور زود گزر لذات، ناپائیدار نعمات اور نرے مادی مقاصد سے تعلق نہ رکھتا۔ بلند ہمت اور اعلیٰ جذبہ اسے قوت دینے والا ہو۔ اور یہ جذبہ و ہمت اسے ہر غیر الٰہی وابستگی اور تعلق سے آزاد کر دے۔

(۲) یہ ارادہ فکر و نظر، تصور اور روح میں کمزور و ناتواں نہ ہو بلکہ ایسا ہو کہ وجودِ انسانی کے سب ذرات کو حرکت میں لائے اور انسان اپنی تمام تر کوشش صرف کر دے (توجہ رہے کہ لفظ "سعیھا" جو تاکید کے طور پر آیا ہے، نشاندہی کرتا ہے کہ وہ اپنی حتی کوشش کہ جو آخرت تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے، انجام دیتا ہے اور کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا)۔

(۳) یہ سب امور ایمان کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ ایسا ایمان کہ جو استوار اور پختہ ہو کیونکہ مصمم ارادہ اور کوشش جب ہی ثمر آور ہوگی جب اس کا سرچشمہ صحیح جذبہ ہو۔ اور صحیح جذبہ ایمان باللہ کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ آخرت کے لیے کوشش ایمان کے بغیر نہیں ہو سکتی اور ایمان کا مفہوم اس میں پوشیدہ ہے لیکن اس راہ میں چونکہ ایمان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے لہٰذا اس سلسلے میں دلالتِ التزامی پر قناعت نہیں کی گئی اور ایمان کو بالصراحت کے شرط کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ دنیا پرستوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان کے لیے ہم جہنم قرار دیں گے لیکن آخرت کے عاشقین کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ ان کی سعی و کوشش مشکور ہوگی یعنی پروردگار اس کا تشکر اور قدردانی کرے گا۔

اس کی نسبت کہ کہا جاتے "ان کی جزا بہشت ہوگی" یہ مذکورہ تعبیر بہت زیادہ جامع اور بلند تر ہے کیونکہ ہر شخص کے لیے تشکر اور قدردانی اس کی شخصیت کی وسعتِ وجودی کے مطابق ہوتی ہے نہ کہ عمل کی مقدار کے مطابق۔ اس لحاظ سے خدا کا تشکر اور قدردانی اس کی لامتناہی ذات کی مناسبت سے ہے۔ انواع و اقسام کی مادی و معنوی نعمتیں اور وہ سب کچھ جو ہمارے تصور میں آسکتا ہے، اس میں جمع ہے۔

بعض مفسرین نے "مشکور" کا معنی "کئی گنا اجر"[1] بیان کیا ہے اور بعض نے اس سے "مقبولیتِ عمل"[2] مراد لیا ہے لیکن واضح ہے کہ "مشکور" ان سے وسیع تر معنی رکھتا ہے۔

ممکن ہے یہاں یہ توہم ہو کہ دنیا کی نعمتیں دنیا پرست لوگوں کا حصہ ہیں اور طالبانِ آخرت اس سے محروم ہیں۔ اس توہم کو دُور کرنے کے لیے بعد والی آیت کہتی ہے: ہم اس گروہ کو یعنی ان میں سے ہر ایک کو اپنی عطا و بخشش کا حصہ دیں گے اور اس کی مدد کریں گے (کلا نمد ھٰؤلاء وھٰؤلاء من عطاء ربک)۔ کیونکہ پروردگار کی بخشش کسی سے ممنوع نہیں ہے۔ یہود و نصاریٰ، مومن و مسلمان سب اس کے خوانِ نعمت سے حصہ پاتے ہیں۔

"نمد" "امداد" کے مادہ سے زیادہ کرنے کے معنی میں ہے۔

اسکے بعد والی آیت اس سلسلے میں ایک بنیادی امر بیان کرتی ہے اور وہ یہ کہ جس طرح اس دنیا میں کوشش مختلف ہو تو نتیجہ مختلف ہوجاتا ہے اُخروی امور میں بھی پوری طرح یہی بنیاد کار فرما ہے۔ فرق یہ ہے کہ دنیا محدود ہے اور یہاں کا فرق بھی محدود ہے لیکن آخرت چونکہ لامحدود ہے لہٰذا وہاں فرق بھی لامحدود ہوگا۔

ارشاد ہوتا ہے: دیکھو کس طرح ہم ان میں سے بعض کو بعض دوسروں پر (ان کی کوشش میں اختلاف کی وجہ سے) برتری دیتے ہیں البتہ آخرت کے درجات زیادہ بڑے ہیں اور اس کی برتری و فضیلت بھی بہت زیادہ ہے (انظر کیف فضلنا بعضھم علیٰ بعض وللاٰخرۃ اکبر درجات و اکبر تفضیلاً)۔

ہوسکتا ہے کہا جائے کہ اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ افراد بغیر کسی کوشش کے بہت سے فوائد حاصل کرلیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ استثنائی مواقع ہیں۔ سعی و کوشش کو عمومی بنیاد کی حیثیت حاصل ہے اور یہی کامیابی

---

[1] تفسیر قرطبی، ج ۶ صفحہ ۳۸۵۲۔

[2] تفسیر صافی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

کی میزان ہے۔ اس کے مقابلے میں اُن استثنائی مواقع کی پرواہ نہیں کی جا سکتی اور نہ یہ استثنائی مسئلہ عمومی و کلی بنیاد کے منافی ہے۔

ضمنی طور پر توجہ رہے کہ کوشش سے مراد فقط اس کی مقدار نہیں ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تھوڑی سی کوشش بہت سی کوششوں کے مقابلے میں اپنی کیفیت کی وجہ سے زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا دُنیا و آخرت میں تضاد ہے؟: بہت سی آیات میں دنیا اور اس کے مادی وسائل کی تعریف کی گئی ہے بعض آیات میں مال دنیا کو "خیر" کہا گیا ہے (بقرہ۔ ۱۸۰)۔ بہت سی آیات میں مادی نعمتوں کو "فضل اللہ" کہا گیا ہے۔ مثلاً:

وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (جمعہ۔ ۱۰)

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ۔ ۲۹)

دُنیا کی تمام نعمتیں تمہارے لیے پیدا کی گئی ہیں۔

بہت سی آیات میں انہیں "سَخَّرَ لَكُمْ" (انہیں تمہارے لیے مسخر کیا گیا ہے) کے حوالے سے ان کا ذکر آیا ہے۔ اگر ہم ان آیات کو جمع کریں کہ جن میں مادی وسائل کی تعریف کی گئی ہے تو آیات کا اچھا خاصا ذخیرہ ہو جائے۔ لیکن مادی نعمات کو اس قدر اہمیت دینے کے باوجود ایسے الفاظ آیاتِ قرآن میں موجود ہیں جن میں ان کی تحقیر و تذلیل کی گئی ہے:

ایک مقام پر اسے متاعِ فانی شمار کیا گیا ہے:

تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (نساء۔ ۹۴)

ایک اور جگہ اسے غرور و غفلت کا سبب قرار دیا گیا ہے:

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (حدید۔ ۲۰)

ایک اور موقع پر اسے لہو و لعب اور کھیل کود کا ذریعہ شمار کیا گیا ہے:

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ (عنکبوت۔ ۶۴)

نیز ایک مقام پر اسے یادِ خدا سے غفلت کا سبب گردانا گیا ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور۔ ۳۷)

یہی دو قسم کی تعبیرات روایات اسلامی میں بھی نظر آتی ہیں۔ ایک رُخ سے دنیا آخرت کی کھیتی ہے، مردانِ خدا کا مرکزِ تجارت ہے، دوستانِ حق کی مسجد ہے، وحیِ پروردگار کے نزول کا مقام ہے اور پند و نصیحت کا گھر ہے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

مسجد احباء اللّٰہ و مصلی ملائکۃ اللّٰہ و مھبط وحی اللّٰہ و متجر اولیاء اللّٰہ [1]

جبکہ دوسری طرف اسے یادِ خدا سے غفلت کا سبب اور متاعِ غرور وغیرہ بھی قرار دیا گیا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ دو طرح کی آیات و روایات ایک دوسرے سے متضاد ہیں ؟۔

اس سوال کا جواب خود قرآن سے تلاش کیا جاسکتا ہے ۔کیونکہ قرآن جہاں دنیا اور اس کی نعمتوں کی مذمت کرتا ہے تو اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جن کا مقصد فقط یہی زندگی ہے ۔سورہ نجم کی آیہ ۲۹ میں ہے :

وَلَمۡ يُرِدۡ اِلَّا الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا

وہ لوگ کہ جو دنیاوی زندگی کے سوا کچھ نہیں چاہتے ۔

دوسرے لفظوں میں یہاں ان لوگوں کے بارے میں گفتگو ہے جو دنیا کے بدلے آخرت کو بیچ دیتے ہیں اور مادی خواہشات کی تکمیل کے لیے کسی قسم کی غلط کاری اور جرم سے نہیں چوکتے ۔

سورۂ توبہ آیہ ۳۸ میں ہے :

اَرَضِيۡتُمۡ بِالۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا مِنَ الۡاٰخِرَةِ

کیا تم آخرت کے بدلے دنیاوی زندگی قبول کرنے پر راضی ہو گئے ہو ؟۔

زیر بحث آیات خود اس دعویٰ کی شہادت دیتی ہیں ۔فرمایا گیا ہے :

مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡعَاجِلَةَ

یعنی ان کے پیش نظر یہی زود گزر مادی زندگی ہے ۔

اصولی طور پر کھیتی یا مرکزِ تجارت وغیرہ کے الفاظ خود اس امر پر زندہ شاہد ہیں ۔

مختصر یہ کہ مادی دنیا کی نعمتیں سب کی سب اللہ کی نعمتیں ہیں ۔ان کا وجود نظامِ خلقت میں یقیناً ضروری تھا اور ہے ۔اگر انسان ان سے سعادت اور روحانی کمال تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھ کر استفادہ کرے تو یہ ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہے ۔لیکن اگر وسیلے کی بجائے انہی کو مقصد سمجھ لیا جائے اور انہیں معنوی اور انسانی قدروں سے الگ کر لیا جائے تو فطرتاً یہ امر غرور ،غفلت ،طغیان ،سرکشی ،ظلم اور بیداد گری کا سبب ہوگا ۔ایسی دنیا یقیناً ہر قسم کی برائی کا محل قرار پائے گی اور قابلِ مذمت ٹھہرے گی ۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے اس پُر مغز اور مختصر سے جملے میں کیا خوب فرمایا ہے :

من ابصر بھا بصرتہ و من ابصر الیھا اعمتہ

---

[1] نہج البلاغہ ،کلمات قصار جملہ ۱۳۱ ۔

جو اس کے ذریعے چشمِ بصیرت سے دیکھے تو دنیا اسے آگہی بخشتی ہے اور خود دنیا کی طرف دیکھے تو یہ اسے اندھا کر دیتی ہے [۱]

درحقیقت مذموم اور ممدوح دنیا میں وہی فرق ہے جو "الیھا" اور "بھا" میں ہے۔ پہلی صورت میں دنیا مقصد ہے اور دوسری صورت میں دنیا وسیلہ ہے اور کسی اور تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

۲۔ کامیابی میں کوشش کا دخل: یہ کوئی پہلا موقع نہیں کہ قرآن کوشش کا ذکر کرتے ہوئے سست اور بیکار افراد کو تنبیہ کر رہا ہے اور انہیں بیدار کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ دوسرے جہان کی سعادت و خوش بختی صرف اظہارِ ایمان اور گفتار سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ سعادت و خوش بختی کا حقیقی عامل کوشش اور جستجو ہے۔

یہ حقیقت بہت سی قرآنی آیات سے معلوم ہوتی ہے۔ ذیل کی آیت میں انسان کو اپنے اعمال کا گیر دی قرار دیا گیا ہے:

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (مدثر - ۳۸)

ایک اور مقام پر فرمایا گیا ہے کہ انسان کا حصہ وہی کچھ ہے جو وہ کوشش کرتا ہے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰىۙ (النجم - ۳۹)

بہت سی آیاتِ قرآن میں ایمان کا ذکر کرنے کے بعد عمل صالح کا ذکر کیا گیا ہے۔ تاکہ یہ خیال خام ہر ذہن سے نکل جائے کہ کوشش کے بغیر بھی کسی مقام تک پہنچا جا سکتا ہے۔ جب مادی دنیا کی نعمات کوشش کے بغیر حاصل نہیں کی جا سکتیں تو کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ سعادتِ جاودانی اس کے بغیر ہاتھ لگ جائے گی۔

۳۔ امدادِ الٰہی: "نصد" "امداد" کے مادہ سے مدد دینے کے معنی میں ہے۔ مفردات میں راغب کہتا ہے:

لفظ "امداد" عام طور پر مفید اور مؤثر کمک کے لیے استعمال ہوتا ہے اور "مد" ناپسندیدہ کمک کیلئے۔

بہرحال زیرِ بحث آیات کے مطابق خدا تعالیٰ اپنی نعمتوں کا کچھ حصہ تو سب کو دیتا ہے اور نیک و بد سب اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ یہ نعمتوں کے اس حصے کی طرف اشارہ ہے جس پر دنیاوی زندگی کی بقا موقوف ہے اور جس کے بغیر کوئی باقی نہیں رہ سکتا۔

دوسرے لفظوں میں یہ خدا کا وہی مقام رحمانیت ہے جس کا فیض مومن و کافر سب کے لیے عام ہے لیکن اس کے علاوہ بھی ایسی لامتناہی نعمتیں ہیں جو صرف مومنین اور نیک لوگوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

---

[۱] نہج البلاغۃ، خطبہ ۸۲۔

(۲۲) لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ۟

(۲۳) وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۟

(۲۴) وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۭ۟

(۲۵) رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۟

ترجمہ

(۲۲) اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود قرار نہ دے ورنہ مذموم و رسوا ہو جائے گا۔

(۲۳) تیرے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو جب ان میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کی ذرہ بھر اہانت بھی نہ کرو اور انہیں جھڑکو نہیں اور کریمانہ انداز سے ان سے لطیف و سنجیدہ گفتگو کرو۔

(۲۴) اور لطف و محبت سے ان کے سامنے خاکساری کا پہلو جھکائے رکھو۔ اور کہو۔ پروردگارا! جیسے انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی ہے اسی طرح تو بھی ان پر رحم فرما۔

(۲۵) تمہارا پروردگار تمہارے دلوں کے نہاں خانہ سے آگاہ ہے ۔ اگر تم نے اس سلسلے میں

کوئی لغزش کی ہو اور پھر اس کی تلافی کر دی ہو تو وہ تمہیں معاف کر دے گا کیونکہ) اگر تم صالح اور نیک ہو گے تو وہ توبہ کرنے والوں کو بخش دیتا ہے۔

تفسیر

اہم اسلامی احکام کا سلسلہ

توحید اور ماں باپ سے حُسنِ سلوک

زیرِ نظر آیات اسلامی احکام کے ایک سلسلے کا آغاز ہیں یہ سلسلہ توحید اور ایمان سے شروع ہوتا ہے۔

توحید تمام مثبت اور اسلامی کاموں کے اسباب کا خمیر ہے۔ توحید سے احکام کے بارے میں گفتگو شروع کر کے ان آیات کا گزشتہ آیات سے تعلق باقی رکھا گیا ہے کیونکہ گزشتہ آیات میں ایمان، کوشش اور دارِ آخرت کا ارادہ رکھنے کے بارے میں گفتگو تھی۔

نیز یہ اس امر کی بھی تاکید ہے کہ قرآن صاف ترین اور بہترین راستے کی طرف دعوت دینے والا ہے۔

توحید کے ذکر سے بات شروع کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے : "اللہ" خدائے یگانہ کے ساتھ کوئی معبود قرار نہ دے (لاتجعل مع اللہ الٰهًا اٰخر)۔

قرآن یہ نہیں کہتا کہ خدا کے ساتھ دوسرے معبود کی پرستش نہ کرو بلکہ کہتا ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور کو معبود قرار نہ دو۔ یہ بات زیادہ وسیع مفہوم رکھتی ہے۔ یعنی عقیدے میں، عمل میں، دعاؤں اور پرستش میں۔ کسی حالت میں بھی اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود قرار نہ دو۔ اس کے بعد شرک کا ہلاکت انگیز نتیجہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: اگر تم اس کے لیے شریک کے قائل ہو گئے تو مذمت اور رسوائی میں ڈوب جاؤ گے (فتقعد مذمومًا مخذولًا)۔

لفظ "قعود" (بیٹھ جانا) یہاں ضعف و ناتوانی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ عربی ادب میں یہ لفظ ضعف کے لیے کنایہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

قعد به الضعف عن القتال

ناتوانی کی وجہ سے وہ دشمن سے جنگ کرنے سے بیٹھ گیا۔

مذکورہ بالا جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک انسان میں تین بہت بُرے اثر مرتب کرتا ہے۔

(۱) شرک ضعف و ناتوانی اور ذلت و زبوں حالی کا سبب ہے جبکہ توحید قیام، حرکت اور سرفرازی کا عامل ہے۔

(۲) شرک مذمت و سرزنش کا سبب ہے کیونکہ یہ ایک واضح انحرافی راستہ ہے، منطقِ عقل کا انکار ہے نعمتِ پروردگار کا واضح کفران ہے۔ جو شخص ایسا انحراف اختیار کرے وہ قابلِ مذمت ہے۔

(۳) شرک مشرک کو اس کے بناتے ہوئے معبودوں کے پاس چھوڑ دیتا ہے اور خدا اس کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ بناوٹی معبود بھی چونکہ کسی کی مدد کرنے کے قابل نہیں اور خدا بھی ان افراد کی مدد ترک کر دیتا ہے تو وہ "مخذول" یعنی بے یار و مددگار ہو کر رہ جاتے ہیں۔

قرآن کی دوسری آیات میں بھی یہی مفہوم کسی اور شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ سورہ عنکبوت کی آیہ ۴۱ میں ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○

غیرِ خدا کو اپنا معبود بنانے والوں کی مثال مکڑی کی سی ہے جس نے کمزور اور بے بنیاد گھر کو اپنا سہارا بنا رکھا ہے اور کمزور ترین گھر مکڑی کا ہے۔ کاش وہ جانتے ہوتے۔

توحید کے بعد اس پر تاکید کے ساتھ انبیاء کی انسانی تعلیمات میں سے ایک انتہائی بنیادی تعلیم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: "تیرے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ صرف اسی کی عبادت کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو" (وقضٰی ربك الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا)۔

"قضاء" "امر" کی نسبت زیادہ تاکید کا مفہوم رکھتا ہے اور قطعی و محکم فرمان کا معنی دیتا ہے۔ یہ لفظ اس مسئلے میں پہلی تاکید ہے۔

توحید — کہ جو اسلام کی عظیم ترین بنیاد ہے، ماں باپ سے نیکی کرنے کو اس کے ساتھ قرار دینا اس اسلامی حکم کی اہمیت کے لیے دوسری تاکید ہے۔

لفظ "احسان" یہاں مطلق ہے۔ اس میں ہر قسم کی نیکی کا مفہوم مضمر ہے۔ یہ اس معاملے پر تیسری تاکید ہے۔

اسی طرح لفظ "والدین" کا اطلاق مسلمان اور کافر دونوں پر ہوتا ہے۔ یہ اس مسئلے پر چوتھی تاکید ہے۔

لفظ "احسانا" یہاں نکرہ صورت میں ہے جو ایسے مواقع پر بیانِ عظمت کے لیے آتا ہے۔ یہ پانچویں تاکید ہے۔[1]

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ حکم عموماً امر اثباتی کے لیے ہوتا ہے حالانکہ یہاں نفی پر ہے (تیرے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو) ہو سکتا ہے یہ اس بناء پر ہو کر لفظ "قضیٰ" سے سمجھا

---

[1] بعض کا نظریہ ہے کہ "احسان" عام طور پر "الی" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ "احسن الیہ" (اس سے احسان کیا) اور کبھی "باء" کے ذریعے متعدی ہوتا ہے۔ یہ تعبیر شاید دیکھ بھال کرنے کا معنی دینے کے لیے ہو۔ یعنی تم ذاتی طور پر بغیر کسی واسطے کے ماں باپ سے حُسنِ سلوک اور احترام و محبت کا مظاہرہ کرو۔ یہ اس مسئلے کے لیے چھٹی تاکید ہے۔

جاتا ہے کہ دوسرا جملہ اثباتی شکل میں مقدر ہے اور معنی کے لحاظ سے اس طرح ہے:

تیرے پروردگار نے تاکیدی حکم دیا ہے کہ اس کی پرستش کرو اس کے غیر کی نہ کرو۔

یا یہ کہ نفی اور اثبات پر مشتمل یہ جملہ "الا تعبدوا الا ایاہ" ایک اثباتی جملے کی حیثیت رکھتا ہے یعنی پروردگار کے لیے عبادت منحصر ہے" کا اثبات۔

اس کے بعد ماں باپ سے حُسنِ سلوک کا ایک واضح مصداق بیان کیا گیا ہے: جب ان دونوں میں سے ایک یا دونوں تیرے پاس بڑھاپے تک پہنچ جائیں اور شکستہ سن ہو جائیں (اس طرح سے کہ انہیں تیری طرف سے مستقل دیکھ بھال کی احتیاج ہو) تو ان کے لیے کسی طرح سے محبت میں دریغ نہ کرنا اور ان کی تھوڑی سی بھی اہانت نہ کرنا یہاں تک کہ خفیف سا غیر مؤدبانہ لفظ "اُف" تک منہ سے نہ نکالنا (اما یبلغن عندك الکبر احدھما او کلاھما فلا تقل لھما اف)[1]

انہیں جھڑک نہ دینا اور ان کے سامنے بلند آواز سے نہ بولنا (ولا تنھرھما) بلکہ سنجیدہ، لطیف، کریمانہ اور شریفانہ انداز سے ان سے کلام کرنا (وقل لھما قولاً کریمًا)۔

اور انتہائی عجز و انکساری سے ان کے سامنے پہلو جھکائے رکھنا (واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ)۔

اور کہو: پروردگارا اپنی رحمت ان کے شاملِ حال کر جس طرح کہ انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی ہے (وقل رب ارحمھما کما ربّیٰنی صغیرًا)۔

ماں باپ کا انتہائی احترام

گزشتہ دو آیات میں اولاد کے لیے ماں باپ کا انتہائی ادب و احترام بیان کیا گیا ہے اس سلسلے میں مختلف پہلو قابلِ غور ہیں:

(۱) ایک تو ان کے عالمِ پیری کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب وہ زیادہ توجہ، محبت اور احترام کے محتاج ہوتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ ان سے ذرہ بھر اہانت آمیز بات نہ کرو کیونکہ ہو سکتا ہے بڑھاپے کی وجہ سے وہ اس عالم کو پہنچ چکے ہوں کہ اب دوسرے کی مدد کے بغیر چل پھر نہ سکتے ہوں اور نہ اپنی جگہ سے اٹھ سکتے ہوں یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ گندگی بھی اپنے سے دُور نہ کر سکتے ہوں۔ ایسی حالت میں اولاد کی بہت بڑی آزمائش شروع ہو جاتی

---

[1] "اما یبلغن" میں لفظ "اما" بعض کے بقول "ان" شرطیہ اور "ما" شرطیہ کا مرکب ہے جو کہ تاکید کے لیے یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ (تفسیر فخرالدین رازی)

بعض دوسروں کے بقول یہ "ان" شرطیہ اور "ما" [illegible] یہ مرکب ہے جو اس بات کی [illegible]

[illegible]

ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس حالت میں اولاد ماں باپ کے وجود کو رحمت سمجھتی ہے یا مصیبت۔ کیا ایسے میں کافی حوصلہ و صبر کے ساتھ ماں باپ کی پورے احترام سے نگہداشت کرتی ہے یا گھٹیا اور اہانت آمیز الفاظ کے ساتھ انہیں زبان کے نشتر چبھوتی ہے، یا یہاں تک کہ بعض اوقات خدا سے ان کی موت کا تقاضا کر کے انہیں اذیت پہنچاتی ہے۔

(۲) قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ اس موقع پر انہیں "اُف" تک نہ کہو یعنی ناراحتی، پریشانی اور تنفر کا اظہار نہ کرو۔ قرآن مزید کہتا ہے کہ ان سے بلند اور اہانت آمیز آواز سے بات نہ کرو۔ مزید تاکید کرتا ہے کہ ان سے کریمانہ اور شریفانہ لہجے میں کلام کرو۔

یہ سب چیزیں انتہائی ادب سے گفتگو کرنے کے بارے میں ہیں کیونکہ دل کی کلید زبان ہے۔

(۳) نیز قرآن عجز و انکساری کا حکم دیتا ہے۔ ایسی انکساری جس سے محبت اور لگاؤ ظاہر ہو نہ کہ کوئی اور چیز۔

(۴) آخر میں یہ تک کہتا ہے کہ جب بارگاہِ خداوندی کا رُخ کرو تو (وہ زندہ ہوں یا نہ) انہیں فراموش نہ کرو اور ان کے لیے رحمتِ پروردگار کا تقاضا کرو۔

اس تقاضے کے ساتھ خصوصیت سے یہ دلیل رکھو کہ خداوندا! جس طرح انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی تو بھی ویسے ہی اپنی رحمت ان کے شاملِ حال فرما۔

دیگر چیزوں کے علاوہ اس سے یہ اہم نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ماں باپ اس قدر ناتواں ہو جائیں کہ تنہا چلنے پھرنے کے قابل نہ رہیں اور گندگی اپنے سے دُور نہ کر سکیں تو پھر بھی انہیں فراموش نہ کرو کیونکہ تم بھی بچپن میں اسی طرح تھے اور وہ تمہاری حفاظت اور تجھ سے محبت میں کوئی دریغ نہ کرتے تھے لہٰذا ان کی محبت کا جواب ویسی ہی محبت سے دو۔

نیز ممکن ہے ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی، ان کا احترام اور ان کے سامنے انکساری کے معاملے میں اولاد سے جان بوجھ کر یا لاعلمی میں کچھ لغزشیں ہو جائیں لہٰذا زیر بحث آخری آیت میں قرآن کہتا ہے: جو کچھ تمہارے دل میں ہے پروردگار اس سے زیادہ آگاہ ہے (ربکم اعلم بما فی نفوسکم)۔

کیونکہ اس کا علم تمام پہلوؤں سے حضور، ثابت اور ازلی و ابدی ہے اور ہر طرح سے غلطی اور اشتباہ سے پاک ہے جبکہ تمہارا علم ان صفات کا حامل نہیں ہے لہٰذا اگر تم سے سرکشی کے ارادے کے بغیر حکم الٰہی کے خلاف ماں باپ کے احترام اور ان سے حُسنِ سلوک میں کوئی لغزش ہو جاتے اور تم فوراً پشیمان ہو کر توبہ و تلافی کا رُخ کرو تو یقیناً رحمتِ الٰہی تمہارے شاملِ حال ہوگی۔ اگر تم صالح اور نیک ہو اور توبہ کرتے ہو، کیونکہ خدا توبہ کرنے والوں کو بخشنے والا ہے۔ (ان تکونوا صالحین فانہ کان للاوابین غفورًا)۔

"اوّاب"، "اَوب" (بروزن "قوم") کے مادہ سے ہے۔ یہ اس بازگشت کو کہتے ہیں جس میں ارادہ شامل ہو جبکہ "رجوع" بھی بازگشت کو کہتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ارادہ بھی اس میں شامل ہو۔ اسی بنا پر

"توبہ" کو "اوبہ" کہاجاتا ہے کیونکہ توبہ درحقیقت خدا کی طرف ارادے کے ساتھ بازگشت ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ صیغہ مبالغہ کا ذکر خدا کی طرف بازگشت اور رجوع کے متعدد عوامل کی طرف اشارہ ہو کیونکہ:

(۱) پروردگار پر ایمان،

(۲) قیامت کی عدالت کی طرف توجہ،

(۳) بیداری ضمیر اور

(۴) گناہ کے عواقب و آثار کی طرف توجہ

یہ چاروں باہم مل کر انسان کو تاکید در تاکید کے ذریعے کجروی سے نکال کر خدا کی طرف لے جاتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ منطق اسلام میں والدین کا احترام: اگرچہ انسانی جذبات اور حق شناسی والدین کی احترام گزاری کیلئے کافی ہے لیکن اسلام ایسے امور میں بھی خاموشی روا نہیں رکھتا جن میں عقل، جذبات اور طبعی میلانات واضح رہنمائی کرتے ہیں بلکہ ایسے امور میں بھی اسلام تاکید کے طور پر ضروری احکام صادر کرتا ہے۔

والدین کے احترام کے بارے میں اسلام نے اس قدر تاکید کی ہے کہ اتنی تاکید بہت کم کسی مسئلے میں کی گئی ہے۔ نمونے کے طور پر ہم چند ایک پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

(۱) قرآن مجید میں چار سورتوں میں مسئلہ توحید کے فوراً بعد والدین سے حُسن سلوک کا حکم آیا ہے۔ ان دونوں مسائل کا اکٹھا بیان ہونا اس امر کو واضح کرتا ہے کہ اسلام کس حد تک ماں باپ کے احترام کا قائل ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۸۳ میں ہے:

لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

سورۂ نساء کی آیت ۳۶ میں ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

سورۂ انعام کی آیت ۱۵۱ میں ہے:

اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

اور زیر بحث آیات میں بھی ان دونوں کو ایک دوسرے کا ہم قرین قرار دیا گیا ہے:

وقضٰی ربک الّا تعبدوا الّا ایاہ وبالوالدین احسانا

(۲) اس مسئلے کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ قرآن میں بھی اور روایات میں بھی صراحت سے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ماں باپ کافر بھی ہوں تب بھی ان کا احترام بجا لانا ضروری ہے۔ سورۂ لقمان کی

آیت ۱۵ میں ہے :

وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا

اگر وہ تجھ سے اصرار کریں کہ تو مشرک ہو جا (اس کو شریک کر) جس کا تجھے علم نہیں، تو ان کی اطاعت نہ کر، لیکن دنیاوی زندگی میں ان سے اچھا سلوک کر۔

(۳) قرآن مجید میں ماں باپ کے سامنے اظہار تشکر کا ذکر نعمات الٰہی کے تشکر کے ساتھ آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

اَنِ اشْكُرْ لِىْ وَلِوَالِدَيْكَ (لقمان - ۱۴)

اگرچہ خدا کی نعمتوں کا تو اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ امر ماں باپ کے حقوق کی عظمت اور وسعت کی دلیل ہے۔

(۴) قرآن نے ماں باپ کی ذرہ بھر بے احترامی کی اجازت نہیں دی۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

لو علم الله شيئًا هو ادنى من اف لنهى عنه، وهو من ادنى العقوق، ومن العقوق ان ينظر الرجل الى والديه فيحد النظر اليهما۔

کوئی چیز اُف[1] سے بھی کم ہوتی تو خدا اس سے بھی روکتا اور یہ ماں باپ کی مخالفت کی کم از کم حد ہے اور ان کی طرف غضبناک نگاہ سے دیکھنا بھی بے احترامی میں شامل ہے[2]

(۵) باوجود یکہ جہاد ایک نہایت اہم اسلامی حکم ہے، جب تک واجب عینی نہ ہو یعنی اتنے افراد کافی تعداد میں موجود ہوں کہ جو اپنی خواہش سے جہاد پر جائیں تو جہاد کی نسبت ماں باپ کی خدمت میں رہنا زیادہ اہم ہے اور اگر جانا ان کی پریشانی اور بے آرامی کا سبب بنے تو ناجائز ہے۔

امام صادق علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں :

ایک شخص پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں آیا۔

اُس نے عرض کیا : میں ایک خوش و خرم اور طاقتور نوجوان ہوں میرا دل چاہتا ہے کہ جہاد میں حصّہ لوں لیکن میری ماں ہے جو اس سے ناراحت ہوتی ہے۔

اس کی اس بات پر رسول اللہؐ نے فرمایا :

---

[1] جیسا کہ ہم نے کہا ہے "اُف" ناراحتی کا معمولی سا اظہار ہے۔

[2] جامع السادات، ج ۲ صفحہ ۲۵۸۔

ارجع فکن مع والدتك فوالذی بعثنی بالحق لانسها بك لیلة خیر من جهاد فی سبیل الله سنة۔

لوٹ جاؤ اور اپنی ماں کے پاس رہو۔ قسم ہے اُس خدا کی جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے ایک رات کہ جس میں تیری ماں تجھ سے خوش رہے ایک سال جہاد سے بہتر ہے[1]

البتہ جس وقت جہاد وجوبِ عینی کی صورت اختیار کر لے اور اسلامی ملک خطرے میں ہو اور سب کا حاضر ہونا ضروری ہو تو پھر کوئی عذر قابلِ قبول نہیں یہاں تک کہ ماں باپ کی ناراضگی بھی لیکن واجباتِ کفائی کے موقع پر اسی طرح مستحبات میں مسئلہ اسی طرح ہے جیسا جہاد کے موقع پر کہا گیا ہے۔

(۶) پیغمبرِ اکرمؐ نے فرمایا:

ایاکم و عقوق الوالدین فان ریح الجنة توجد من مسیرة الف عام ولا یجدها عاق۔

اس سے بچو کہ ماں باپ تمہیں عاق کر دیں اور ان کے ناراض ہونے سے بچو کیونکہ جنت کی خوشبو ایک ہزار سال کی مسافت تک پہنچتی ہے لیکن ایسا شخص کبھی بھی یہ خوشبو نہیں سونگھ سکتا کہ جو ماں باپ کا عاق کردہ اور نافرمان ہو[2]

یہ تعبیر اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ایسے افراد نہ صرف جنت میں قدم نہیں رکھ سکیں گے بلکہ اس سے بہت دُور ہوں گے اور اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکیں گے۔

سید قطب اپنی تفسیر فی ظلال میں پیغمبرِ اکرمؐ سے یہ حدیث نقل کرتے ہیں:

ایک شخص طواف میں مشغول تھا۔ اس نے اپنی ماں کو کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا اور اسے طواف کروا رہا تھا۔ تو رسول اللہؐ نے اسے اس حالت میں دیکھا۔ اُس نے عرض کیا: کیا یہ کام کر کے مَیں نے اپنی ماں کا حق ادا کر دیا؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں، یہاں تک کہ تو نے (وضع حمل کے وقت کی) ایک آہ کا بدلہ بھی نہیں دیا۔[3]

اگر ہم قلم کو آزاد چھوڑ دیں تو گفتگو بہت لمبی ہو جائے گی اور بات تفسیر سے آگے بڑھ جائے گی لیکن ہم صراحت سے کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں جس قدر بھی گفتگو کریں تھوڑی ہے کیونکہ والدین انسان پر حقِ حیات رکھتے ہیں۔

---

[1] جامع السادات ج ۲ صفحہ ۲۶۰۔

[2] جامع السادات ج ۲ صفحہ ۲۵۷۔

[3] فی ظلال ج ۵ صفحہ ۳۱۸۔

اس بحث کے آخر میں ہم اس نکتے کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ماں باپ کوئی غیر منطقی یا خلافِ شریعت بات کرتے ہیں تو واضح ہے کہ کسی ایسے موقع پر ان کی اطاعت واجب نہیں رہتی لیکن ایسی صورت میں بھی بہترین طریقے سے ان کے سامنے منطقی دلیل پیش کی جائے اور امر بالمعروف کیا جائے۔

اس سلسلۂ گفتگو کو ہم امام کاظم علیہ السلام کی ایک حدیث پر تمام کرتے ہیں۔ امامؑ فرماتے ہیں:
کوئی شخص رسول اللہؐ کے پاس آیا اور اس نے باپ اور بیٹے کے حق کے متعلق سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا:

لا یسمیه باسمه، ولا یمشی بین یدیه، ولا یجلس قبله، ولا یستسب له۔

باپ کو اس کے نام سے نہ پکارے (بلکہ کہے: ابا جان، وغیرہ)، اس کے آگے آگے نہ چلے، اُس سے پہلے نہ بیٹھے اور کوئی کام ایسا نہ کرے کہ لوگ اس کے باپ کو گالیاں دیں اور بُرا بھلا کہیں۔ (یعنی یہ نہ کہیں کہ خدا تیرے باپ کو نہ بخشے کہ تُو نے یہ کام کیا ہے، وغیرہ)[1]

۲۔ **"قضاء" کے معنی کے بارے میں تحقیق:** "قضی"، "قضاء" کے مادہ سے کسی چیز کو عمل یا گفتگو سے جدا کرنے کے معنی میں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ دراصل کسی چیز کو ختم کرنے کے معنی میں ہے۔ یہ دونوں معانی قریب الافق ہیں۔

ختم کرنا اور جدا کرنا چونکہ وسیع مفہوم رکھتے ہیں لہٰذا یہ لفظ مختلف مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔

قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس کے چھ معانی ذکر کیے ہیں:

(۱) "قضاء" بمعنی حکم اور فرمان ــ مثلاً:

وقضٰی ربك الّا تعبدوا الّا ایّاه

تیرے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کر۔

(۲) "قضٰی"، خلق کرنے کے معنی میں ــ مثلاً:

فقضاهنّ سبع سماوات فی یومین

خدا نے جہان کو دو ادوار میں سات آسمانوں کی شکل میں خلق کیا۔ (حٰمٓ السجدہ ۔ ۱۲)

(۳) "قضاء" فیصلے کے معنی میں ــ مثلاً:

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ (طٰہٰ ۔ ۷۲)

---

[1] نور الثقلین، ج ۳ ص ۱۴۹۔

جو فیصلہ کرنا چاہتے ہو کرو۔

(۴) "قضاء" کسی چیز سے فراغت کے معنی میں۔ مثلاً:

قضی الامر الذی فیہ تستفتیان (یوسف - ۴۱)

جس کام کے بارے میں تم نظریہ یا فتویٰ دینا چاہتے تھے وہ ختم ہوگیا۔

(۵) "قضی" ارادہ کے معنی میں۔ مثلاً:

اذا قضٰی امراً فانما یقول لہ کن فیکون (آلِ عمران - ۴۷)

وہ جب کسی کام کا ارادہ کرے تو کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

(۶) "قضی" عہد و پیمان کے معنی میں۔ مثلاً:

اذ قضینا الی موسی الامر (قصص - ۴۴)[1]

جس وقت ہم نے موسیٰ سے عہد و پیمان لیا۔

نیز ابوالفتوح رازی نے "قضی" کا معنی خبر دینا اور اعلان کرنا بھی لکھا ہے مثلاً:

وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتاب

ہم نے بنی اسرائیل کو تورات میں خبر دی[2]

ان معانی میں مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ "قضاء" موت کے معنی میں بھی ہے مثلاً:

فوکزہ موسٰی فقضی علیہ (قصص - ۱۵)

موسیٰ نے اسے ضرب لگائی اور وہ مرگیا

یہاں تک کہ بعض مفسرین نے قرآن مجید میں "قضاء" کے تیرہ سے بھی زیادہ معانی سمجھے ہیں[3] لیکن ان سب کو لفظ "قضاء" کے مختلف معانی نہیں سمجھنا چاہیئے یہ سب ایک قدرِ مشترک رکھتے ہیں جس میں سب جمع ہیں۔ درحقیقت زیادہ تر معانی جو سطورِ بالا میں ذکر کیے گئے ہیں "اشتباہِ مصداق بمفہوم" کے قبیل سے ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک ایک کلّی اور جامع معنی کا مصداق ہے یعنی ختم کرنا اور الگ کرنا۔

مثال کے طور پر قاضی اپنے فیصلے کے ذریعے دعویٰ ختم کرتا ہے۔ پیدا کرنے والا اپنی تخلیق کے ذریعے کسی چیز کی خلقت کو اختتام تک پہنچاتا ہے۔ خبر دینے والا اپنی خبر کے ذریعے کسی چیز کا بیان آخر تک پہنچاتا ہے۔ عہد و پیمان کرنے والا اور حکم دینے والا اپنے عہد و پیمان اور حکم کے ذریعے مسئلے کو اس طرح تمام کرتا ہے کہ اب اس میں بازگشت ممکن نہیں ہے۔ البتہ اس بات کا انکار نہیں

---

[1] تفسیر قرطبی، ج ۹ صفحہ ۳۸۵۳۔

[2] تفسیر ابوالفتوح رازی، ج ۷، صفحہ ۱۸۸۔

[3] وجوہ القرآن از تفلیسی صفحہ ۲۳۵۔

کیا جا سکتا کہ ان بعض مصادیق میں یہ لفظ اس طرح سے استعمال ہوا ہے کہ ایک نیا سا معنی پیدا ہو گیا ہے مثلاً "قضاء" فیصلہ کرنے اور حکم دینے کے معنی میں۔

۴۔ "اُف" کے معنی کی تحقیق: راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "اُف" دراصل ہر کثیف اور آلودہ چیز کے معنی میں ہے اور توہین کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کا صرف رسمی معنی نہیں ہے بلکہ اس سے فعل بھی بنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں:

افففت بکذا

یعنی۔ مَیں نے فلاں چیز کو آلودہ سمجھا اور اس سے اظہارِ نفرت کیا۔

بعض مفسرین مثلاً قرطبی نے اپنی تفسیر میں اور طبرسی نے مجمع البیان میں کہا ہے کہ "اُف" اور "تف" اصل میں وہ میل کچیل ہے جو ناخن کے نیچے جمع ہو جاتی ہے جو آلودہ بھی ہوتی ہے اور حقیر بھی۔ یہاں تک کہ بعض نے "اُف" اور "تف" میں بھی فرق کیا ہے۔ انہوں نے پہلے کو گوشت کی میل کچیل اور دوسرے کو ناخن کی میل کچیل سمجھا ہے۔ بعد ازاں اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی اور ہر اس چیز کیلئے بولا جانے لگا جو ناراحتی اور تکلیف کا باعث ہو[1]۔

"اُف" سے اور معانی بھی مراد لیے گئے ہیں مثلاً تھوڑی سی چیز، ناراحتی، ملامت اور بدبو۔

بعض دیگر نے کہا ہے کہ اس لفظ کی بنیاد یہ ہے کہ جس وقت انسان کے بدن یا لباس پر مٹی یا تھوڑی سی راکھ بیٹھ جاتے اور وہ پھونک سے اسے اپنے سے دور کرے تو اس موقع پر انسان کے منہ سے جو آواز نکلتی ہے وہ "اوف" یا "اُف" کے مشابہ ہوتی ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ کی صورت میں ناراحتی اور تنفر کے اظہار کے لیے خصوصاً معمولی چیزوں کے بارے میں، استعمال ہونے لگا۔

جو کچھ اس سلسلے میں کہا گیا ہے اسے مجموعی نظر سے دیکھا جائے اور دیگر قرائن بھی ملحوظِ نظر رکھے جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اصل میں "اسم صوت" تھا (وہ آواز جو انسان نفرت، رنج اور تکلیف کے موقع پر نکالتا ہے یا کسی آلودہ چیز پر پھونک مارتے ہوئے اس کے منہ سے نکلتی ہے)۔ بعد ازاں یہ آواز لفظ کی صورت اختیار کر گئی۔ یہاں تک کہ اس سے الفاظ مشتق ہوتے اور یہ لفظ معمولی پریشانیوں یا چھوٹے چھوٹے مسائل پر اظہارِ تنفر کیلئے بولا جانے لگا۔ لہٰذا اوپر جو مختلف معانی بیان ہوتے ہیں یوں لگتا ہے کہ وہ اسی جامع اور کلی معنی کے مصداق ہیں۔

بہر حال آیت چاہتی ہے کہ ایک مختصر سی عبارت میں انتہائی فصاحت و بلاغت سے یہ بات کہے کہ ماں باپ کا احترام اس قدر زیادہ ہے کہ ان کے سامنے ذرا سی بھی ایسی بات نہ کی جائے جو انکی ناراحتی یا تنفر کا باعث ہو۔

---

[1] تفسیر فخرالدین رازی، ج ۲۰ صفحہ ۱۹۰ -

(٢٦) وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ○

(٢٧) اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ○

(٢٨) وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّیْسُوْرًا ○

(٢٩) وَلَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ○

(٣٠) اِنَّ رَبَّكَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرًۢا بَصِیْرًا ○

ترجمہ

(٢٦) اور نزدیکیوں کو ان کا حق دے اور (اسی طرح) مسکین اور مسافر کا اور ہرگز اسراف اور فضول خرچی نہ کر۔

(٢٧) کیونکہ اسراف کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان نے اپنے پروردگار (کی نعمتوں) کا کفران کیا۔

(٢٨) اور اگر تو ان (حاجت مندوں) سے اعراض کرے اور تم اپنے پروردگار کی رحمت کے انتظار میں ہو (کہ وہ تیرے کام میں کشائش کرے اور تو ان کی مدد کرے) تو ان سے تو

نرم اور لطف وکرم کے پیرائے میں بات کر۔

(۲۹) کبھی بھی اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کا حلقہ نہ بنا (اور انفاق وبخشش کو ترک نہ کر) اور نہ ہی اسے بالکل کھول دے کہ (آخرکار) تو ملامت زدہ اور بے کار ہوکر رہ جائے۔

(۳۰) تیرا پروردگار جسے چاہتا ہے اس کی روزی کشادہ کردیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس کی روزی تنگ کردیتا ہے وہ اپنے بندوں کے بارے میں آگاہ و بینا ہے۔

تفسیر

انفاق و بخشش میں اعتدال

ان آیات میں اسلام کے بنیادی احکام کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے۔ ان میں قریبیوں، حاجت مندوں اور مسکینوں کے حق کی ادائیگی کے بارے میں حکم ہے نیز انفاق میں فضول خرچی سے روکا بھی گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: قریبیوں اور نزدیکیوں کا حق انہیں دے (وآت ذاالقربیٰ حقہ) اسی طرح حاجت مندوں اور راہ میں رہ جانے والوں کا حق انہیں دے (والمسکین وابن السبیل)۔ لیکن اس طرح سے کہ ہرگز فضول خرچی نہ ہو (ولا تبذر تبذیرًا)۔

"تبذیر" اصل میں "بذر" کے مادہ سے بیج ڈالنے اور دانہ چھڑکنے کے معنی میں ہے لیکن یہ لفظ ایسے مواقع سے مخصوص ہے جہاں انسان اپنے اموال کو غیر منطقی اور غلط کام میں خرچ کرے۔ فارسی میں اس کا متبادل ہے "ریخت و پاش" دوسرے لفظوں میں "تبذیر" نامناسب مقام پر مال خرچ کرنے کو کہتے ہیں چاہے تھوڑا سا ہی کیوں نہ ہو۔ برمحل مقام پر خرچ کرنے کو "تبذیر" نہیں کہتے چاہے زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ تفسیر عیاشی میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے اس آیت کے بارے میں سوال کرنے والے کے جواب میں فرمایا:

من انفق شیئًا فی غیر طاعة اللہ فھو مبذر ومن انفق فی سبیل اللہ فھو مقتصد۔

جو شخص حکم الٰہی کی اطاعت کے خلاف کہیں خرچ کرے وہ "مبذر" (فضول خرچ) ہے اور جو شخص راہِ خدا میں خرچ کرے وہ مقتصد (میانہ رو) ہے[1]

[1] تفسیر صافی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

آپ ہی سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے حاضرین کے لیے تر و تازہ کھجوریں لانے کا حکم دیا۔ بعض لوگ کھجوریں کھاتے اور ان کی گٹھلیاں دور پھینک دیتے۔ آپ نے فرمایا: ایسا نہ کرو یہ "تبذیر" ہے اور خدا برائی کو پسند نہیں کرتا۔[1]

اسراف اور تبذیر کا معاملہ اتنا باریک ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک راستے سے گزر رہے تھے۔ آپ کے ایک صحابی سعد وضو کر رہے تھے اور پانی زیادہ ڈال رہے تھے۔ آپ نے فرمایا:

اسراف کیوں کرتے ہو؟

سعد نے عرض کیا:

کیا وضو کے پانی میں بھی اسراف ہے؟

آپ نے فرمایا:

نعم و ان کنت علی نهر جار

ہاں اگرچہ تم جاری دریا کے کنارے ہی کیوں نہ ہو۔[2]

اس سلسلے میں کہ "ذی القربیٰ" سے آنحضرتؐ کے سب رشتہ دار مراد ہیں یا مخصوص رشتہ دار (کیونکہ آیت میں مخاطب آنحضرتؐ ہی ہیں)، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

متعدد احادیث کہ جن کے بارے میں "چند اہم نکات" کے زیر عنوان بحث آئے گی، میں ہم پڑھیں گے کہ یہ آیت رسول اللہؐ کے "ذوی القربیٰ" سے تفسیر ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض احادیث میں ہے کہ یہ آیت آنحضرتؐ کی طرف سے حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کو فدک کا علاقہ بخشنے کے بارے میں ہے لیکن جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے ایسی تفاسیر آیات کے وسیع مفہوم کو محدود نہیں کرتیں۔ در اصل ان میں روشن اور واضح مصداق کا ذکر ہوتا ہے۔

"و آت" میں رسول اللہؐ سے خطاب کیا گیا ہے لیکن یہ بات اس امر کی دلیل نہیں کہ حکم آنحضرتؐ ہی سے مخصوص ہے۔ کیونکہ باقی احکام جو ان آیات میں آئے ہیں مثلاً فضول خرچی کی ممانعت، سائل اور مسکین سے نرمی یا بخل کی ممانعت سب رسولِ اکرمؐ سے خطاب کی صورت میں ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ احکام آپؐ سے مخصوص نہیں ہیں اور ان کا مفہوم پوری طرح عام ہے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرنے کے حکم کے

---

[1] تفسیر صافی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر صافی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

بعد فضول خرچی کی ممانعت اس طرف اشارہ ہے کہ کہیں انسان قرابت کے جذبات یا مسکین اور مسافر سے کسی جذباتی وابستگی کے زیرِ اثر نہ آجائے اور ان پر ان کے استحقاق سے زیادہ خرچ نہ کرے اور اسراف کی راہ اختیار نہ کرے کیونکہ اسراف اور فضول خرچی ہر مقام پر مذموم ہے۔

بعد والی آیت "تبذیر" کی ممانعت پر استدلال اور تاکید کے طور پر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اسراف کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں (ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین)۔

اور شیطان نے پروردگار کی نعمتوں کا کفران کیا تھا (وکان الشیطان لربه کفورًا)۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیطان نے پروردگار کی نعمتوں کا کیسے کفران کیا تو اس کا جواب واضح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے بہت زیادہ قوت و استعداد دے رکھی تھی۔ اس نے ان سب قوتوں کو غلط مقام پر صرف کیا یعنی لوگوں کو گمراہ کیا۔

رہا یہ کہ اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی کیسے ہیں؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی خدا داد نعمتوں کا کفران کرتے ہیں اور جہاں انہیں استعمال کرنا چاہیئے وہاں کی بجائے انہیں غلط مقام پر خرچ کرتے ہیں۔

"اخوان" (بھائی) یا اس بناء پر ہے کہ ان کے اعمال شیطانوں سے اس طرح ہم آہنگ ہیں جیسے بھائیوں کے کہ جو ایک جیسے عمل کرتے ہیں اور یا اس بناء پر کہ وہ دوزخ میں شیطانوں کے ہم نشین ہوں گے جیسا کہ سورہ زخرف آیہ ۳۹ میں شیطان کا گناہوں سے آلودہ انسانوں سے بہت نزدیکی تعلق بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ○

آج شیطان سے اظہارِ برأت اور علیحدگی کا تقاضا تمہارے لیے سود مند نہیں ہے کیونکہ تم سب عذاب میں مشترک ہو۔

رہا یہ کہ "شیاطین" یہاں جمع کی صورت میں ہے۔ ہوسکتا ہے یہ اس چیز کی طرف اشارہ ہو جو سورہ زخرف کی آیات سے معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص یادِ خدا سے منہ پھیر لے ایک شیطان کو اس کا ہمنشین قرار دیا جاتا ہے جو نہ صرف اِس جہان میں اُس کے ہمراہ ہوگا بلکہ اُس جہان میں بھی ساتھ ہوگا۔ قرآن کے الفاظ میں:

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ..... حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يَالَيْتَ بَيْنِىْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ (زخرف ۳۶ و ۳۸)

بعض اوقات کوئی مسکین کسی کے پاس آتا ہے لیکن اس کی ضرورت کے مطابق اس کی مدد کرنا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں اگلی آیت بتاتی ہے کہ ضرورت مندوں سے کیسا سلوک کرنا چاہیئے۔

ارشاد ہوتا ہے : "اگر تو ان ضرورت مندوں سے (وسائل نہ ہونے کی وجہ سے اور) رحمت کے انتظار میں ہونے کے باعث رُخ موڑے تو ایسا تحقیر، سختی اور بے حُرمتی سے نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ان سے نرم اور سنجیدہ گفتگو سے اور بڑی محبت سے پیش آنا چاہیئے" یہاں تک کہ اگر ہو سکے تو ان سے آئندہ کا وعدہ کرے تاکہ وہ مایوس نہ ہوں (واما تعرضن عنهم ابتغاء رحمة من ربك ترجوها فقل لهم قولًا ميسورًا)۔

"میسور" "یسر" کے مادہ سے راحت اور آسان کے معنی میں ہے۔ یہاں یہ لفظ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس میں ہر قسم کی اچھی گفتگو اور محبت آمیز برتاؤ کا مفہوم شامل ہے۔ لہٰذا اگر بعض نے اس کی تفسیر کسی خاص عبارت سے کی ہے یا آئندہ کا وعدہ کرنا مراد لیا ہے تو یہ مصداق کی حیثیت رکھتا ہے۔

روایات میں ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد جب کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ مانگتا اور آپؐ کے پاس دینے کو کچھ نہ ہوتا تو فرماتے :

يرزقنا الله واياكم من فضله

مَیں امید رکھتا ہوں کہ خدا ہمیں اور تمہیں اپنے فضل سے رزق دے گا[1]

ہمارے ہاں قدیمی طریقہ ہے کہ کوئی سائل گھر کے دروازے پر آتے اور اسے دینے کو کچھ نہ ہو تو کہتے ہیں : معاف کرو۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تیرے آنے سے ہمارے اوپر ایک حق عائد ہوگیا ہے اور تو اخلاقی طور پر ہم سے کچھ طلب کر رہا ہے۔ ہم تجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنا یہ اخلاقی حق ہمیں بخش دے کیونکہ ہم تمہارے حق کا تقاضا پورا نہیں کر سکتے۔

اعتدال چونکہ ہر چیز میں ضروری ہے یہاں تک کہ انفاق میں بھی، لہٰذا اگلی آیت میں اس بارے میں تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : اپنے ہاتھ کا گردن کے گرد حلقہ نہ بنا (ولا تجعل يدك مغلولة الى عنقك)۔

یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دینے والا ہاتھ تیرے پاس ہونا چاہیئے اسے بخیلوں کے ہاتھ کی طرح گردن کی زنجیر نہیں بن جانی چاہیئے کہ انسان مدد کرنے کے قابل نہ رہے۔

دوسری طرف یہ بھی ہے کہ "اپنا ہاتھ اتنا بھی کھلا نہ رکھ اور بخشش اتنی بھی بے حساب نہ کر کہ تو کام کاج سے رہ جائے اور کبھی اِس کی اور کبھی اُس کی ملامت سنتا رہے اور لوگوں سے جدا ہو جائے" (ولا تبسطها كل البسط فتقعد ملومًا محسورًا)۔

جیسے ہاتھ کا گردن کے لیے حلقۂ زنجیر بن جانا بخل کے لیے کنایہ ہے اسی طرح ہاتھ کا بالکل کھلا ہونا

---

[1] تفسیر مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

بے حساب بخشش کر کے بیٹھ رہنے اور بیکار ہو جانے کی طرف اشارہ ہے لفظ "تقعد" "قعود" کے مادہ سے بیٹھنے کے معنی میں ہے۔

لفظ "ملوم" اس طرف اشارہ ہے کہ بعض اوقات زیادہ انفاق اور بخشش نہ صرف انسان کی فعالیت ختم کر دیتی ہے اور اسے ضروریاتِ زندگی کا محتاج کر دیتی ہے بلکہ اسے لوگوں کی ملامت کا بھی شکار کر دیتی ہے۔

"محسور" "حسر" (بروزن "قَصر") کے مادہ سے دراصل لباس اتار کر کچھ حصہ برہنہ کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی بنا پر "حاسر" اس جنگجو کو کہتے ہیں جس کے بدن پر زرہ اور سر پر خود نہ ہو۔ نیز وہ جانور کہ جو زیادہ چلنے کی وجہ سے تھک کر رہ گئے ہوں انہیں بھی "حسیر" یا "حاسر" کہا جاتا ہے۔ گویا ان کی جسمانی طاقت کا لباس اتر جاتا ہے اور وہ برہنہ ہو جاتے ہیں۔ بعد ازاں اس لفظ کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی اور ہر اس شخص کو جو تھکا ماندہ ہو اور مقصد تک پہنچنے سے عاجز ہو "محسور" "حسیر" یا "حاسر" کہا جانے لگا۔

لفظ "حسرت" (بمعنی غم و اندوہ) بھی اسی مادہ سے لیا گیا ہے کیونکہ یہ حالت عام طور پر انسان پر ایسے عالم میں طاری ہوتی ہے جب وہ مشکلات کو ختم کرنے کی سکت نہ رکھتا ہو گویا اس کی طاقت کا جامہ اتر گیا ہو۔

انفاق میں بھی جب انسان حد سے گزر جائے اور اس میں اپنی تمام تر قوت ہاتھ سے دے بیٹھے تو فطری امر ہے کہ وہ اپنی کارکردگی کو جاری رکھنے اور زندگی کا ساز و سامان مہیا کرنے سے رہ جاتا ہے گویا اُس کی قوتیں برطرف ہو جاتی ہیں اور وہ غم و الم میں ڈوب جاتا ہے اور لوگوں سے بھی اس کا میل ملاپ منقطع ہو جاتا ہے۔

بعض روایات جو اس آیت کی شانِ نزول میں منقول ہیں۔ ان میں یہ مفہوم وضاحت سے نظر آتا ہے۔ ایک روایت میں ہے:

> رسول اللہ ایک گھر میں موجود تھے۔ اس گھر کے دروازے پر ایک سائل آیا۔ اسے دینے کے لیے کوئی چیز مہیا نہ تھی۔ اس نے قمیص مانگی تھی۔ رسول اللہ نے اپنی قمیص اتار کر اسے دے دی۔ اس وجہ سے آپ اس روز مسجد میں نماز کے لیے نہ جا سکے۔ کفار نے اس مسئلے کو اچھالا طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے کہا، محمد (ص) سو گیا ہے یا لہو و لعب میں مشغول ہے اور اس نے اپنی نماز بھلا دی ہے۔

اس طرح یہ کام دشمن کی ملامت و شماتت کا سبب بھی بنا اور دوستوں کی جدائی کا بھی۔ یعنی "ملوم و محسور" کا مصداق ہوا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور رسول اللہ سے کہا گیا کہ اس کام کا اعادہ نہ ہو۔

یہ مسئلہ ظاہراً جس موقع پر مسئلہ ایثار سے متضاد ہے، اس کے بارے میں ہم "چند اہم نکات" کے زیرِ عنوان بحث کریں گے۔

بعض نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ بعض اوقات رسول اللہؐ بیت المال میں جو کچھ ہوتا کسی ضرورت مند کو دے دیتے۔ بعد میں کوئی حاجت مند آتا تو پھر آپؐ کے پاس کچھ نہ ہوتا اور آپؐ کو شرمندگی محسوس ہوتی ایسے میں بسا اوقات ضرورتمند شخص ملامت کرنے لگتا اور پیغمبرِ اکرمؐ کے پاک دل کو آزردہ کرتا لہٰذا حکم دیا گیا کہ جو کچھ بیت المال میں ہو سارے کا سارا نہ دے دیا جائے اور نہ ہی سارا رکھ چھوڑا جائے تاکہ اس قسم کی مشکلات پیش نہ آئیں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اصلاً بعض لوگ محروم، نیاز اور مسکین کیوں ہیں کہ جن کی وجہ سے ان کے لیے خرچ کرنا ضروری ہے۔ کیا بہتر نہ تھا کہ خدا تعالیٰ خود انہیں جس چیز کی ضرورت ہے دے دیتا تاکہ وہ اس کے محتاج نہ ہوتے کہ ان پر خرچ کیا جائے۔

زیرِ نظر آخری آیت گویا اس سوال کا جواب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا اپنی روزی جس کیلئے چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کرتا ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں کے بارے میں آگاہ و بینا ہے (ان ربک یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر انہ کان بعبادہ خبیراً بصیراً)۔

یہ تمہارے لیے ایک آزمائش اور امتحان ہے ورنہ اس کے لیے تو ہر چیز ممکن ہے۔ وہ اس طرح سے تمہاری تربیت کرنا چاہتا ہے۔ وہ تم میں سخاوت اور فداکاری کے جذبے پروان چڑھانا چاہتا ہے وہ تمہارے اندر خودغرضی کا خاتمہ چاہتا ہے۔

علاوہ ازیں بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ اگر وہ بالکل بے نیاز ہو جائیں تو سرکشی کی راہ اختیار کرلیں۔ ان کے لیے مصلحت اسی میں ہے کہ ان کو محدود طور پر روزی ملے کہ جس سے وہ فقر و فاقہ میں بھی مبتلا نہ ہوں اور طغیان و سرکشی کی راہ بھی اختیار نہ کریں۔

ان تمام امور سے قطع نظر انسانوں میں (معلول، معذور اور مجبور افراد کے علاوہ) رزق کی تنگی اور وسعت ان کی سعی و کوشش سے وابستہ ہے اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ خدا جس کے لیے چاہتا ہے روزی کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، اس کا یہ چاہنا اس کی حکمت کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ جس شخص کی کوشش زیادہ ہے اُس کا حصّہ زیادہ ہو اور جس کی کوشش کم ہے اس کا حصّہ کم ہو۔

بعض مفسرین نے اس آیت کے گزشتہ آیات سے تعلق کے بارے میں ایک اور احتمال قبول کیا ہے وہ یہ کہ زیرِ نظر آخری آیت انفاق میں افراط و تفریط سے روکنے کے حکم کی دلیل کے طور پر آئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ یہاں تک کہ خدا اپنی اس قدرت و طاقت کے باوجود عطائے رزق میں اعتدال رکھتا ہے نہ اس طرح

سے بخشتا ہے کہ برائی اور سرکشی برپا ہو جائے اور نہ اس طرح تنگ کرتا ہے کہ لوگ زحمت و مصیبت میں پڑ جائیں یہ سب کچھ بندوں کے مفاد کے پیش نظر ہے لہٰذا حق یہی ہے کہ تم بھی خدائی اخلاق اپنا کر اعتدال کی راہ اختیار کرو اور افراط و تفریط سے پرہیز کرو۔[1]

چند اہم نکات

۱۔ "ذی القربیٰ" سے یہاں کون لوگ مراد ہیں؟ : لفظ "ذی القربیٰ" جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں وابستہ اور نزدیکی افراد کے معنی میں ہے۔ مفسرین نے اس بارے میں بحث کی ہے کہ یہ لفظ یہاں مخصوص افراد کے لیے ہے یا عام ہے۔

بعض کا نظریہ ہے کہ تمام مومنین و مسلمین مخاطب ہیں اور انہیں اپنے رشتہ داروں کا حق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ مخاطب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں اور آپؐ سے کہا گیا ہے کہ اپنے نزدیکیوں کو ان کا حق ادا کریں۔ مثلاً خمس غنائم اور خمس سے باقی متعلقہ چیزوں میں سے اور کلی طور پر بیت المال میں جو ان کے حقوق ہیں وہ ادا کریں۔

متعدد روایات جو شیعہ اور سنی طرق سے نقل ہوئی ہیں اُن کے مطابق جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کو بلایا اور فدک کی سرزمین آپؑ کو بخش دی۔[2]

اہل سنت کے منابع سے ایک حدیث مشہور صحابی رسول ابوسعید خدری سے منقول ہے :

لما نزل قوله تعالٰی : "وآت ذا القربٰی حقه" اعطی رسول الله فاطمة فدكًا۔

جب یہ آیت نازل ہوئی : "وآت ذالقربیٰ حقه" تو رسول اللہؐ نے فدک

---

[1] المیزان، ج ۱۳ ص۸۶۔

[2] فدک خیبر کے پاس اور مدینہ سے تقریباً ۱۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک آباد اور زرخیز زمین ہے۔ خیبر کے بعد حجاز کے یہودیوں کا یہ واحد سہارا شمار ہوتی تھی۔ (کتاب مراصد الاطلاع" کے مادہ "فدک" کی طرف رجوع کریں)۔

جب اس علاقے کے یہودیوں نے جنگ کے بغیر ہتھیار ڈال دیئے اور انہوں نے اپنے تئیں آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کر دیا تو معتبر اسناد اور تواریخ کے مطابق آنحضرتؐ نے یہ زمین حضرت فاطمہ زہراؑ کو بخش دی لیکن آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد مخالفین نے اسے غصب کر لیا۔ سالہا سال تک یہ علاقہ ایک سیاسی حربے کے طور پر ان کے ہاتھ میں رہا لیکن بعض خلفاء نے اسے اولاد فاطمہؑ کو واپس کر دیا۔

(بعض تواریخ کے مطابق فدک کا علاقہ تقریباً دس مرتبہ چھینا گیا اور واپس کیا گیا)

کا علاقہ فاطمہؑ کو دے دیا۔[1]

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تک کہ حضرت سجاد علیہ السلام نے اسیری کے دوران شام میں اسی آیت سے شامیوں کے سامنے استدلال کرتے ہوئے فرمایا:

> آیت «اٰت ذا القربیٰ حقه» سے مراد ہم ہیں کہ جن کے بارے میں خدا نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا ہے کہ ان کا حق انہیں ادا کرو (جبکہ شامیو! تم نے ہمارے سب حقوق ضائع کر دیئے ہیں)۔[2]

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ یہ دونوں تفاسیر ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں۔

سب لوگوں کا فرض ہے کہ ذی القربیٰ کا حق ادا کریں۔ رسول اللہؐ چونکہ اسلامی معاشرے کے رہبر ہیں لہٰذا اُن کی بھی ذمہ داری ہے کہ اس عظیم خدائی فریضہ پر عمل کریں۔

درحقیقت اہلِ بیتِ رسولؐ «ذی القربیٰ» کے واضح ترین مصداق ہیں اور رسول اللہؐ خود اس آیت کے روشن ترین مخاطب ہیں۔ لہٰذا پیغمبرِ اکرمؐ نے ذی القربیٰ کا حق کہ جو خمس، فدک یا اسی طرح دوسری چیزوں کی صورت میں تھا انہیں دے دیا کیونکہ زکوٰۃ کہ جو درحقیقت عمومی اموال میں شمار ہوتی ہے اس کا لینا ان کے لیے ممنوع تھا۔

۲۔ اسراف کے بُرے اثرات: اس میں شک نہیں کہ کرۂ ارض میں موجود نعمتیں اس میں رہنے والوں کے لیے کافی و وافی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ انہیں بے ہودہ اور فضول استعمال نہ کیا جائے بلکہ صحیح اور معقول طریقے سے ہر قسم کی افراط و تفریط سے بچ کر ان سے استفادہ کیا جائے ورنہ یہ نعمات اس قدر غیر محدود بھی نہیں کہ ان کے غلط استعمال کے مہلک نتائج نہ نکلیں۔

افسوس کا مقام ہے کہ اکثر اوقات زمین کے ایک علاقے میں اسراف اور فضول خرچی کے باعث دوسرا علاقہ محرومیت کا شکار ہو جاتا ہے یا ایک زمانے کے لوگوں کا اسراف آئندہ نسلوں کی محرومیت کا باعث بن جاتا ہے۔

جس زمانے میں آج کے دور کی طرح لوگوں کے پاس آبادی کے اعداد و شمار موجود نہ تھے اسلام نے خبردار کیا تھا کہ خدائی نعمتوں سے استفادہ کرتے ہوئے اسراف اور فضول خرچی نہ کرو۔

قرآن حکیم نے بہت سی آیات میں مسرفین کی بڑی شدت سے مذمت کی ہے۔

---

1. بزاز، ابو یعلیٰ، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے یہ حدیث ابو سعید سے نقل کی ہے (کتاب میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۸۸ اور کنز العمال ج ۲ ص ۱۵۸ کی طرف رجوع کریں) مجمع البیان میں اور اسی طرح درمنثور میں زیرِ بحث آیت کے ذیل میں شیعہ اور سنی طرق کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔
2. نور الثقلین، ج ۳ ص ۱۵۵

ایک جگہ فرماتا ہے:

وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

اسراف نہ کرو کہ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔(انعام۔۱۴۱، اعراف۔۳۱)۔

ایک اور مقام پر فرماتا ہے:

وَ اَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ

اور یقیناً مسرفین اصحاب دوزخ ہیں۔ (مومن۔۴۳)

ایک مقام پر مسرفین کی پیروی سے روکتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

اور مسرفین کے حکم کی اطاعت نہ کرو۔ (شعراء۔۱۵۱)

ایک اور جگہ فرماتا ہے:

مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝

مسرفین پر تیرے پروردگار کی طرف سے نشان لگا دیئے گئے ہیں۔(ذاریات۔۳۴)

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ ۚ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

شک نہیں کہ فرعون روئے زمین پر بڑا بن بیٹھا تھا اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ مسرفین میں سے تھا۔ (یونس۔۸۳)

ایک اور جگہ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝

یقیناً اللہ جھوٹے مسرف کو ہدایت نہیں کرتا۔ (مومن۔۲۸)

اور آخرکار ان کا انجام ہلاکت و نابودی بتایا گیا ہے:

وَ اَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۝

اور ہم نے مسرفین کو ہلاک کر ڈالا۔ (انبیاء۔۹)

نیز جیسا کہ ہم نے لکھا ہے کہ زیر بحث آیت میں مسرفین کو شیطان کا بھائی اور ہمنشین شمار کیا گیا ہے۔

"اسراف" اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے ہر قسم کے کام میں تجاوز کا مفہوم رکھتا ہے لیکن عام طور پر اخراجات میں حد سے تجاوز کے لیے بولا جاتا ہے۔

خود آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اسراف کنجوسی اور تنگی کا متضاد ہے۔

قرآن کہتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَ لَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝

وہ لوگ کہ جو خرچ کرتے وقت اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ میانہ روی سے کام لیتے ہیں۔(فرقان - ٦٧)

٣۔ "اسراف" اور "تبذیر" میں فرق : اس سلسلے میں مفسرین کی طرف سے کوئی واضح بحث نظر سے نہیں گزری لیکن ان دونوں الفاظ کے بنیادی معانی پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابلے پر ہوں تو اسراف حدِ اعتدال سے نکل جانے کے معنی میں ہے بغیر اس کے کہ ظاہراً کسی چیز کو ضائع کیا ہو۔ مثلاً یہ کہ ہم ایسا گراں قیمت لباس پہنتے ہیں کہ جو ہماری ضرورت کے لباس سے سوگنا زیادہ قیمت کا ہے یا اپنی ایسی گراں قیمت غذا تیار کرتے ہیں کہ جتنی قیمت سے بہت سے لوگوں کو عزت و آبرو سے کھانا کھلایا جا سکتا ہے ۔ ایسے موقع پر ہم حد سے تجاوز کر گئے ہیں لیکن ظاہراً کوئی چیز ختم اور ضائع نہیں ہوتی۔ جبکہ "تبذیر" اس طرح سے خرچ کرنے کو کہتے ہیں کہ جو اتلاف اور ضیاع کی حد تک پہنچ جائے مثلاً دو مہمانوں کے لیے دس افراد کا کھانا پکالیں جیسا کہ بعض نادان کرتے ہیں اور پھر اس پر فخر کرتے ہیں اور بچے ہوئے کھانے کو کوڑے کرکٹ میں پھینک کر ضائع کرتے ہیں۔

لیکن بنا کے واضح ہے کہ بہت سے مواقع پر دونوں الفاظ بالکل ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں یہاں تک کہ تاکید کے طور پر ایک دوسرے کے ساتھ آتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں :

الا ان اعطاء المال فی غیر حقه تبذیر واسراف وهو یرفع صاحبه فی الدنیا ویضعه فی الاٰخرة ویکرمه فی الناس ویهینه عندالله

خبردار! مال کو اس کے مقامِ استحقاق کے علاوہ خرچ کرنا تبذیر و اسراف ہے۔ ہو سکتا ہے یہ کام انسان کو دنیا میں بلند مرتبہ کردے لیکن آخرت میں وہ یقیناً پست و حقیر ہو گا۔ ہو سکتا ہے عام لوگوں کی نظر میں اسے عزت و اکرام حاصل ہو جائے مگر بارگاہِ الٰہی میں یہ کام انسان کی تنزلی اور سقوط کا سبب ہے۔

زیرِ بحث آیات کی تشریح میں ہم نے پڑھا ہے کہ احکامِ اسلامی میں اسراف و تبذیر کی اس قدر ممانعت کی گئی ہے کہ وضو کے لیے زیادہ پانی ڈالنے سے بھی منع کیا گیا ہے اگرچہ وضو کرنے والا لبِ دریا ہی کیوں نہ بیٹھا ہو۔ اسی طرح امامؑ نے خرمے کی گٹھلیاں تک دُور پھینکنے سے منع کیا ہے۔

آج کی دنیا میں بعض مواد کی کمی کے احساس نے اس امر کی طرف اتنی شدت سے توجہ دلائی ہے کہ اب ہر چیز سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ کوڑا کرکٹ سے کھاد تیار کی جا رہی ہے اور بھوک سے اشیائے ضرورت تیار کی جا رہی ہیں۔ استعمال شدہ گندے اور بچے ہوئے پانی سے زراعت کے لیے استفادہ کیا جا رہا ہے

کیونکہ آج لوگ محسوس کرتے ہیں کہ عالم طبیعی میں موجود مواد غیر محدود نہیں ہے کہ جس کے باعث اس امر سے آسانی سے صرف نظر کر لیا جائے بلکہ لوگ سمجھتے ہیں ہر چیز سے دوہرا استفادہ کرنا چاہیئے۔

۴۔ کیا میانہ روی ایثار کے منافی ہے؟ زیر بحث آیات کہ جو انفاق میں اعتدال ملحوظ رکھنے کا حکم دیتی ہیں ان سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ سورہ دہر اور دیگر قرآنی آیات میں اور اسی طرح روایات میں ایثار کرنے والوں کی تعریف و توصیف اور مدح وثنا کی گئی ہے یہاں تک کہ انتہائی مشکل حالات میں بھی اپنی ذات کو فراموش کرکے دوسروں کے لیے ایثار کرنے کی تشویق کی گئی ہے۔ لہٰذا یہ دونوں باتیں آپس میں کس طرح ہم آہنگ ہوسکتی ہیں؟

زیر بحث آیات کی شان نزول پر غور وخوض کرنے سے اور اسی طرح دیگر قرآن کو سامنے رکھنے سے مسئلہ واضح ہوجاتا ہے اور وہ یہ کہ اعتدال ملحوظ رکھنے کا حکم وہاں ہے جہاں زیادہ بخشش انسان کی اپنی بے سروسامانی کا سبب بن جائے اور اصطلاح کے مطابق وہ "ملوم ومحسور" ہوجائے۔ یا ایثار اس کی اولاد کے لیے ناراضی، پریشانی، دباؤ اور تنگی کا باعث ہوجائے اور اس کے اپنے گھر کا نظام خطرے میں پڑ جائے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو یقیناً ایسے میں ایثار بہترین راہ ہے۔

اس سے قطع نظر اعتدال ملحوظ رکھنے کا حکم عمومی ہے جبکہ ایثار ایک خاص حکم ہے جو معین مواقع سے مربوط ہے لہٰذا یہ دونوں حکم ایک دوسرے سے متضاد نہیں ہیں۔

(۳۱) وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝

(۳۲) وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝

(۳۳) وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝

(۳۴) وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۭ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝

(۳۵) وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝

ترجمہ

(۳۱) اور اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں اور تمہیں رزق دیتے ہیں انہیں قتل کرنا ایک بہت بڑا گناہ ہے۔

(۳۲) اور زنا کے قریب نہ جاؤ کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

(۳۳) اور جس شخص کا خون خدا نے حرام قرار دیا ہے اسے سوائے حق کے قتل نہ کرو اور جو شخص مظلوم مارا گیا ہے اس کے ولی کو ہم نے (حقِ قصاص) پر تسلط دیا ہے لیکن وہ قتل میں اسراف نہ کرے کیونکہ وہ مدد دیا گیا ہے۔

(۳۴) اور سوائے احسن طریقے کے مالِ یتیم کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ حدّ بلوغ کو پہنچ جائے اور اپنے عہد کو ایفا کرو کیونکہ عہد کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

(۳۵) اور جب تم ناپ تول کرو تو پیمانہ کا حق ادا کرو اور ترازو سے وزن صحیح کرو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام بہت اچھا ہے۔

تفسیر

چھ اہم احکام

گزشتہ آیات میں احکام اسلامی کے کچھ حصے آئے ہیں۔ ان کے بعد زیر نظر آیات میں کچھ مزید احکام پیش کیے گئے ہیں۔ چھ اہم احکام پانچ آیات میں بہت پُر معنی اور دلنشین پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) پہلے زمانۂ جاہلیت کے ایک بہت قبیح اور بُرے عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ انتہائی دردناک گناہوں میں سے تھا۔ ارشاد ہوتا ہے: اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے قتل نہ کرو (ولا تقتلوا اولادکم خشیة املاق)۔ ان کی روزی تمہارے ذمہ نہیں ہے بلکہ انہیں اور تمہیں ہم رزق دیتے ہیں (نحن نرزقهم وایاکم)۔ کیونکہ ان کا قتل ایک بہت بڑا گناہ تھا اور ہے (ان قتلهم کان خطأ کبیرًا)۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی اقتصادی حالت اتنی سخت اور پریشان کن تھی کہ وہ اپنی مالی حالت پتلی ہونے کی وجہ سے اپنی عزیز اولاد تک کو قتل کر دیتے تھے۔

مفسّرین میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا زمانۂ جاہلیت کے عرب فقر کے خوف سے صرف اپنی بیٹیوں کو مٹی میں دبا دیتے تھے یا بیٹوں کو بھی زندہ درگور کر دیتے تھے۔

بعض کا نظریہ ہے کہ یہ سب گفتگو بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ وہ لوگ ایسا دو وجوہ کی بنا پر کرتے تھے۔ ایک تو اس خیال کی بنا پر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی جنگ میں دشمنوں کی قید میں چلی جائیں اور اس طرح ان کی عزت و ناموس دوسروں کے ہاتھ آ جائے۔

دوسرا فقر و فاقہ کی وجہ سے اور اسباب زندگی مہیا کرنے کی طاقت نہ ہونے کے سبب وہ لڑکیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ کیونکہ اس زمانہ میں لڑکی مالی پیداوار کا ذریعہ نہ تھی بلکہ اکثر اوقات اخراجات کا سبب شمار ہوتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابتداً بیٹے بھی اخراجات ہی کا باعث تھے لیکن زمانۂ جاہلیت کے عرب ہمیشہ بیٹوں کو اہم سرمائے کے طور پر دیکھتے تھے اور انہیں گنوانے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔

بعض دوسروں کا نظریہ ہے کہ وہ دو طرح سے اولاد کو قتل کرتے تھے۔ ایک قتل وہ ناموس کی حفاظت کے غلط نام پر لڑکیوں کا کرتے تھے اور دوسرا فقر و فاقہ کے خوف سے بلا تخصیص بیٹے اور بیٹی کا۔

آیت کی ظاہری تعبیر کہ جو جمع مذکر (قتلھم اور نرزقھم) کی صورت میں آئی ہے، اس نظریے کی دلیل بن سکتی ہے کیونکہ عربی ادب کے لحاظ سے جمع مذکر کا اطلاق بیٹوں اور بیٹیوں پر مجموعی طور پر درست ہے لیکن خصوصیت سے اس کا بیٹیوں کے لیے ہونا بعید معلوم ہوتا ہے۔

البتہ یہ جو کہا گیا ہے کہ بیٹے پیداواری صلاحیت رکھتے تھے اور سرمایہ شمار ہوتے تھے، یہ بالکل صحیح ہے لیکن یہ اس صورت میں کہ جب اس تھوڑی مدت کے لیے وہ اخراجات برداشت کر سکتے۔ حالانکہ بعض اوقات تو وہ اس قدر تنگ دستی میں ہوتے کہ اس تھوڑی سی مدت کے لیے بھی اسباب زندگی مہیا کرنے کے قابل نہ ہوتے۔

لہٰذا دوسری تعبیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

بہرحال یہ بات ایک وہم و گمان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی کہ روزی دینے والے ماں باپ ہی ہیں۔ خدا تعالیٰ اعلان کر رہا ہے کہ اس شیطانی خیال کو دماغ سے نکال دو زیادہ سے زیادہ سعی و کوشش کیلئے اٹھ کھڑے ہو تو خدا بھی مدد کرے گا اور ان کی زندگی کا نظام چلا دے گا۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ ہم اس قبیح اور شرمناک جرم سے وحشت کرتے ہیں حالانکہ یہی جرم ہمارے زمانے میں ایک اور شکل میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ یہ کام بہت زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی انجام پاتا ہے اور وہ ہے اسقاطِ حمل۔ یہ کام بہت زیادہ بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام اور اقتصادی حالات کے نام پر کیا جا رہا ہے۔

(مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۳ سورہ انعام کی آیہ ۱۵۱ کی طرف رجوع کریں)

"خشیۃ املاق" بھی اس شیطانی وہم کی نفی کے لیے ایک لطیف اشارہ ہے کہ یہ صرف ایک خوف ہے جو تمہیں اس بہت بڑے جرم پر ابھارتا ہے ورنہ اس میں حقیقت نہیں ہے۔

ضمناً توجہ رہے کہ "کان خطأ کبیرًا" کہ جو فعل ماضی کے ساتھ آیا ہے اس امر کے لیے اشارہ اور تاکید ہے کہ اولاد کو قتل کرنا ایک بہت بڑا گناہ ہے کہ جو قدیم زمانے سے لوگوں میں موجود ہے اور اس کی قباحت اور برائی فطرت کی گہرائیوں میں موجود ہے لہٰذا یہ قباحت کسی زمانے سے مخصوص نہیں ہے۔

(۲) ایک اور عظیم گناہ کہ جس کی طرف اگلی آیت اشارہ کرتی ہے وہ زنا اور منافیٔ عفت عمل ہے۔ قرآن کہتا ہے: زنا کے قریب نہ جاؤ کیونکہ یہ بہت بُرا اور قبیح عمل ہے اور بہت بُری روش ہے (ولا تقربوا الزنا انه کان فاحشة وساء سبيلًا)۔

اس مختصر سے جملے میں تین نکات کی طرف اشارہ ہوا ہے:

الف - یہ نہیں فرمایا کہ زنا نہ کرو۔ بلکہ فرمایا کہ اس شرمناک کام کے قریب نہ جاؤ۔ یہ تعبیر اپنی گہرائی کے اعتبار سے اس حکم کے لیے تاکید ہے نیز یہ اس امر کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ اکثر اوقات اس گناہ کے کچھ تمہیدی اعمال بھی ہوتے ہیں جو تدریجاً انسان کو اس کے قریب کر دیتے ہیں۔ ہوا و ہوس کی نظر سے عورتوں کو دیکھنا بھی اس کا ایک مقدمہ ہے۔ بے پردگی اس کا دوسرا مقدمہ ہے۔ بُری تعلیم، بُری باتیں سکھانے والی کتابیں، گندی فلمیں، گھٹیا جرائد اور برائی کے مختلف مراکز بھی اس کام کا مقدمہ فراہم کرتے ہیں۔

اسی طرح نامحرم عورتوں کے ساتھ خلوت بھی اس کا ایک عامل ہے (یعنی ایک نامحرم مرد اور عورت کسی خالی مکان یا مقام پر ہوں تو وہ بھی اس کا عامل بن سکتا ہے)۔

اسی طرح جوان لڑکے اور لڑکی کی شادی نہ کرنا اور دونوں پر بلا وجہ سختیاں عائد کرنا بھی اس کا سبب بن جاتا ہے۔

یہ سب "زنا کے قریب جانے کے" عامل ہیں۔ مذکورہ آیت اپنے مختصر جملے میں ان سب سے روکتی ہے۔ اسلامی روایات میں ان مقدمات میں سے ہر ایک کی الگ الگ ممانعت کی گئی ہے۔

ب - "انه کان فاحشة" میں تین تاکیدیں موجود ہیں۔

ایک "ان" دوسری فعل ماضی اور تیسری "فاحشة"۔

ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گناہ کتنا بڑا ہے۔

ج - "ساء سبیلا" (یعنی زنا بہت بُری روش ہے)۔ یہ جملہ اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ یہ عمل معاشرے میں دیگر بُرائیوں کو بھی کھینچ لاتا ہے۔

حرمتِ زنا کا فلسفہ

(۱) اس سے خاندانی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ماں باپ اور اولاد کے درمیان رابطہ ختم ہو جاتا ہے جبکہ یہ وہ رابطہ ہے جو نہ صرف معاشرے کی شناخت کا سبب ہے بلکہ خود اولاد کی نشوونما کا موجب بھی ہے۔ یہی رابطہ ساری عمر محبت کے ستونوں کو قائم رکھتا ہے اور انہیں دوام دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ جس معاشرے میں غیر شرعی اور بے باپ کی اولاد زیادہ ہو اس کے اجتماعی روابط سخت تزلزل کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ ان روابط کی بنیاد خاندانی روابط ہیں۔

اس مسئلے کی اہمیت سمجھنے کے لیے لحظہ بھر اس امر پر غور کرنا کافی ہے کہ اگر سارے انسانی معاشرے میں زنا جائز اور مباح ہو جائے اور شادی بیاہ کا قانون ختم کر دیا جائے تو ان حالات میں غیر مشخص اور بے ٹھکانہ اولاد پیدا ہو گی۔ اس اولاد کو کسی کی مدد اور سرپرستی حاصل نہ ہو گی۔ اسے نہ پیدائش کے وقت کوئی پوچھے گا نہ بڑا ہو کر۔

اس سے قطع نظر برائیوں، سختیوں اور مشکلوں میں محبت کا اثر تسلیم شدہ ہے جبکہ ایسی اولاد اس محبت سے محروم ہو جائے گی اور انسانی معاشرہ پوری طرح تمام پہلوؤں سے حیوانی درندگی کی شکل اختیار کرے گا۔

(ب) یہ شرمناک اور قبیح عمل ہوس باز لوگوں کے درمیان طرح طرح کے جھگڑوں اور کشمکشوں کا باعث بنے گا۔ وہ واقعات کہ جو بعض افراد نے بدنام محلوں اور غلط مراکز کی داخلی کیفیت کے بارے میں لکھے ہیں ان سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جنسی بے راہ رویاں بدترین جرائم کو جنم دیتی ہیں۔

(ج) یہ بات علم اور تجربے نے ثابت کر دی ہے کہ زنا طرح طرح کی بیماریاں پھیلنے کا سبب بنتا ہے۔ اس کے آثارِ بد اور بُرے نتائج کی روک تھام کے لیے آج کے دَور میں بہت سے ادارے قائم ہیں اور بہت سے اقدامات کیے گئے ہیں مگر اعداد و شمار نشاندہی کرتے ہیں کہ کس قدر افراد اس راستے میں اپنی صحت و سلامتی گنوا بیٹھے ہیں۔

(د) اکثر اوقات یہ عمل اسقاطِ حمل، قتلِ اولاد اور انقطاعِ نسل کا سبب بنتا ہے کیونکہ ایسی عورتیں ایسی اولاد کی نگہداری کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتیں اور اصولاً اولاد ان کے لیے ایسا منحوس عمل جاری رکھنے میں بہت بڑی رکاوٹ ہوتی ہے لہٰذا وہ ہمیشہ اسے پہلے سے ختم کر دینے کی کوشش کرتی ہیں۔

یہ مفروضہ بالکل موہومی ہے کہ ایسی اولاد حکومت کے زیرِ کنٹرول اداروں میں رکھی جا سکتی ہے۔ اس مفروضے کی ناکامی عملی طور پر واضح ہو چکی ہے اور ثابت ہو چکا ہے کہ اس صورت میں بن باپ کی اولاد کی پرورش کس قدر مشکلات کا باعث ہے اور نتیجتاً بہت ہی نامرغوب اور غیر پسندیدہ ہے۔ ایسی اولاد سنگدل، مجرم، بے حیثیت اور ہر چیز سے عاری ہوتی ہے۔

(ہ) یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ شادی بیاہ کا مقصد صرف جنسی تقاضے پورے کرنا نہیں بلکہ تشکیلِ حیات میں اشتراک، روحانی محبت، فکری سکون، اولاد کی تربیت اور تمام حالاتِ زندگی میں ہمکاری شادی کے نتائج میں سے ہیں اور ایسا بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ عورت اور مرد باہم مخصوص ہوں اور عورتیں دوسروں پر حرام ہوں۔

امام علی بن ابی طالب علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

مَیں نے پیغمبرِ اکرمؐ سے سنا آپؐ نے فرمایا:

فی الزنا ست خصال:

ثلث فی الدنیا وثلث فی الاُخرة

فاما اللواتی فی الدنیا فیذهب بنور الوجه، ویقطع الرزق، ویسرع الفناء۔

واما اللواتی فی الاُخرة فغضب الرب وسوء الحساب والدخول فی النار، او الخلود فی النار۔

زنا کے چھ بُرے اثرات ہیں :
ان میں سے تین کا تعلق دنیا سے ہے
اور تین کا تعلق آخرت سے ہے ۔
دُنیاوی بُرے اثرات یہ ہیں کہ یہ عمل انسان کی نورانیت گنوا دیتا ہے ، روزی منقطع کر دیتا ہے
اور جلد فنا سے ہمکنار کر دیتا ہے ۔
اُخروی آثار یہ ہیں کہ یہ عمل پروردگار کے غضب ، حساب کتاب میں سختی اور آتشِ جہنم میں
دخول یا دوام کا سبب بنتا ہے [1]

(۳) اگلی آیت میں ایک اور حکم ہے ۔ یہ حکم انسانوں کے خون کے احترام کے بارے میں ہے اور قتلِ نفس کی انتہائی حرمت کا ترجمان ہے ۔ قرآن کہتا ہے : جس شخص کا خون خدا نے حرام قرار دیا ہے اسے سوائے حق کے قتل نہ کرو (ولا تقتلوا النفس التی حرم اللّٰہ الا بالحق) ۔

انسان کے خون کا احترام اور قتلِ نفس کی حرمت ایسے مسائل ہیں جن میں تمام آسمانی شریعتیں ، دین اور انسانی قوانین متفق ہیں اور اس قتل کو ایک بہت بڑا جرم اور گناہ شمار کرتے ہیں لیکن اسلام نے اس مسئلے کو بہت ہی زیادہ اہمیت دی ہے یہاں تک کہ ایک انسان کا قتل ساری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے ۔ قرآن کہتا ہے :

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا
جو کسی کو نہ جان کے بدلے اور نہ فساد فی الارض کی سزا میں قتل کر دے تو اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا ۔ (مائدہ ۔ ۳۲)

یہاں تک کہ قرآن کی بعض آیات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دائمی عذاب جہنم کہ جو کفار کے لیے مخصوص ہے قاتل کے لیے بھی بیان ہوا ہے اور ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ممکن ہے یہ تعبیر اس بات کی دلیل ہو کہ وہ افراد جن کے ہاتھ بے گناہ افراد کے خون سے رنگین ہوتے ہیں وہ دنیا سے ایمان کے ساتھ نہیں جائیں گے بہرحال قرآن کہتا ہے :

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا
جس کسی نے کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دیا تو اس کی جزا جہنم ہے کہ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا ۔ (نساء ۔ ۹۳)

یہاں تک کہ جو افراد لوگوں کے سامنے ہتھیار کھینچتے ہیں ان کے لیے اسلام میں محارب کی حیثیت

---

[1] تفسیر مجمع البیان ج ۶ ص ۴۱۴ ۔

سے سنگین سزا مقرر ہوئی ہے جس کی تفصیل فقہی کتب میں آئی ہے اس سلسلے میں ہم سورہ مائدہ آیہ ۳۲ کے ذیل میں اشارہ کر آئے ہیں۔

نہ صرف قتل کرنا بلکہ کسی شخص کو کم سے کم اور چھوٹے سے چھوٹا آزار پہنچانے پر بھی اسلام میں سزا موجود ہے۔

یہ بات بڑے اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ خون، جان اور انسان کے مقام کا یہ سب احترام جو اسلام میں ہے کسی اور دین و آئین میں موجود نہیں ہے۔

لیکن بالکل اسی وجہ سے کچھ ایسے مواقع آتے ہیں کہ خون کا احترام اٹھ جاتا ہے اور یہ ان افراد کیلئے ہے جو قتل یا اس جیسے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسی لیے زیر بحث آیت میں پہلے حرمت قتل نفس کا بنیادی اور عمومی قانون بیان کیا گیا اور اس کے فوراً بعد " الا بالحق " کہہ کر ایسے افراد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مشہور حدیث میں فرمایا ہے:

لا یحل دم امرء مسلم یشهد ان لا اله الا الله و ان محمداً رسول الله الا باحدی الثلاث: النفس بالنفس والزانی المحصن، والتارک لدینه المفارق للجماعة۔

کسی مسلمان کا خون کہ جو لا اله الا الله اور محمد رسول الله کی گواہی دیتا ہو حلال نہیں ہے مگر تین مواقع پر۔ ایک یہ کہ وہ قاتل ہو، زانی محصن ہو اور وہ کہ جو اپنا دین چھوڑ کر مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جائے[1]

قاتل کے بارے میں حکم تو واضح ہے۔ اس کے قصاص میں معاشرے کی حیات اور انسانوں کی حفظ جان کی ضمانت ہے۔ اگر اولیاء مقتول کو حق قصاص نہ دیا جائے تو قاتلوں کو شہ ملے گی اور معاشرے کا امن و امان تباہ ہو جائے گا۔

باقی رہا زانی محصن تو اس کا قتل ایک ایسے انتہائی قبیح گناہ کے بدلے میں ہے جو قتل کے برابر ہے۔

نیز مرتد کا قتل اسلامی معاشرے میں ہرج مرج کو روکتا ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ ایک سیاسی حکم ہے، تاکہ نظام اجتماعی کی حفاظت کی جا سکے کیونکہ ارتداد نہ صرف اجتماعی امن و امان کے لیے خطرہ ہے بلکہ خود نظام اسلام کے لیے بھی خطرہ ہے۔

اصولی طور پر اسلام کسی شخص کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ یہ دین قبول کرے۔ دوسرے ادیان سے اسلام منطق

---

[1] تفسیر فی ظلال ج ۵ صفحہ ۳۲۳ بحوالہ صحیح بخاری و صحیح مسلم۔

بنیاد پر معاملہ کرتا ہے اور آزاد بحث و مباحثہ کا قائل ہے لیکن اگر کسی نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لیا اور اسلامی معاشرے کا جزو بن گیا اور اس طرح مسلمانوں کے اسرار سے آگاہ ہو گیا۔ اب اگر وہ دین سے پلٹ جانا چاہے اور عملی طور پر نظامِ اسلام کی بنیاد کمزور کرنا چاہے اور اسلامی معاشرے کے ستون گرانا چاہے تو یقیناً یہ عمل ناقابلِ برداشت ہے اور ان شرائط کے ساتھ اس کی سزا قتل ہے[1]

البتہ اسلام میں انسانوں کے خون کا احترام مسلمانوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ غیر مسلمان جو مسلمانوں سے برسرِ جنگ نہیں ہیں اور ان سے امن و سلامتی کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کی جان و مال اور ناموس بھی محفوظ ہے اور ان پر تجاوز کرنا حرام اور ممنوع ہے۔

اس کے بعد قرآن اولیاءِ مقتول کے حقِ قصاص کے بارے میں کہتا ہے: جو شخص مظلوم مارا جاتے اس کے دل کو ہم نے (قاتل سے قصاص لینے کا) تسلط دیا ہے (ومن قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیہ سلطاناً)۔

لیکن اسے بھی نہیں چاہیئے کہ ان حالات میں وہ اپنے حق سے زیادہ کا مطالبہ کرے اور قتل میں اسراف کرے کیونکہ وہ مدد دیا گیا ہے (فلا یسرف فی القتل انہ کان منصوراً)۔

جی ہاں! اولیاءِ مقتول جب تک حدِ اسلام کے اندر رہتے ہیں اور اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتے وہ نصرتِ الٰہی کے زیرِ سایہ ہیں۔ یہ جملہ ان اعمال کی طرف اشارہ ہے جو زمانۂ جاہلیت میں تھے اور بعض اوقات آج کل بھی ہوتے ہیں۔ کبھی ایک شخص کے قتل ہو جانے پر مقتول کا قبیلہ دوسرے قبیلے کے کئی قتل کر ڈالتا ہے یا ایک شخص کے قتل کے بدلے قاتل کے علاوہ اور بہت سے بے گناہ افراد قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ جیسے زمانۂ جاہلیت کی رسوم میں تھا کہ جب کسی قبیلے کا کوئی معروف آدمی قتل ہو جاتا تو مقتول کا قبیلہ قاتل کے قتل پر قناعت نہ کرتا بلکہ ضروری سمجھتا کہ قاتل کے قبیلے کا سردار یا دوسرا معروف شخص قتل کرے چاہے اس قتل میں اس کا کوئی حصہ نہ ہو[2]

ہمارے زمانے میں بھی بعض اوقات ایسے جرائم ہوتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ خصوصاً غاصب اسرائیل کا یہی کردار ہے۔ جب کوئی فلسطینی مجاہد ان میں سے کسی کو قتل کر دے تو وہ فوراً فلسطینی بچوں اور عورتوں پر بم برسانے لگتے ہیں اور بعض اوقات ایک شخص کے بدلے بیسیوں بے گناہ افراد کو خاک و خون میں تڑپا دیتے ہیں۔

عراق کی بعث پارٹی کی طرف سے ہمارے اسلامی ملک پر مسلط کردہ جنگ میں بھی یہی صورتِ حال

---

[1] ارتداد اور اسکی سخت سزا کے بارے میں سورہ نحل آیہ ۱۰۶ کے ذیل میں تفسیر نمونہ جلد ۷ میں ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

[2] تفسیر روح المعانی از آلوسی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

دیکھتے ہیں۔ آئندہ تاریخ ان کے بارے میں فیصلہ کرے گی ہم یہ معاملہ اسی کے سپرد کرتے ہیں۔

اسلام میں عدالت کی اس قدر اہمیت ہے کہ اسے قاتل تک کے لیے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام اپنی وصیتوں میں فرماتے ہیں:

یا بنی عبد المطلب لا الفینکم تخوضون دماء المسلمین خوضًا تقولون قتل امیرالمؤمنین، الا لا تقتلن بی الا قاتلی، انظروا اذا انا مت من ضربته هذه فاضربوه، ضربة بضربة، ولا تمثلوا بالرجل۔

اے اولادِ عبدالمطلب! مبادا میری شہادت کے بعد مسلمانوں کا خون بہانے لگو اور کہو کہ امیرالمؤمنین مارے گئے ہیں اور اس بہانے سے لوگوں کا خون بہانے لگو۔ آگاہ رہو کہ صرف میرا قاتل (عبدالرحمن بن ملجم مرادی) قتل ہوگا۔ پوری طرح غور کرنا کہ جب میں اس ضرب سے شہید ہو جاؤں کہ جو مجھ پر لگائی گئی ہے تو اسے صرف ایک ضرب کاری لگانا اور قتل کے بعد اس کا مثلہ نہ کرنا (ناک کان وغیرہ نہ کاٹنا)[1]

(۴) اگلی آیت میں اس سلسلۂ احکام کا چوتھا حکم ہے۔ پہلے یتیموں کے مال کی حفاظت کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ اس میں وہی لب و لہجہ اختیار کیا گیا ہے جو منافیٔ عفت عمل کے بارے میں گزشتہ آیات میں اختیار کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: یتیموں کے مال کے قریب نہ جاؤ (ولا تقربوا مال الیتیم)۔

نہ صرف یہ کہ یتیموں کا مال نہ کھاؤ بلکہ اس کے حریم و حدود کو بھی محترم سمجھو۔ لیکن ممکن تھا کہ ناآگاہ لوگ اس حکم کو منفی حوالے سے دیکھتے اور یتیموں کا مال بے سرپرست چھوڑنے کے لیے اسے سند بنا لیتے اور یوں یتیموں کا مال حوادث کے رحم و کرم پر رہ جاتا لہٰذا فوراً بلا فاصلہ استثناء فرمایا گیا ہے: مگر نہایت اچھے طریقے سے (الا بالتی ھی احسن)۔

اس جامع اور واضح تعبیر کے مطابق یتیموں کے اموال میں ہر ایسا تصرف جائز ہے جو ان کی حفاظت، اصلاح اور اضافے کی نیت سے ہو اور جس میں قبل ازیں ان کے ضروری پہلوؤں کا اتلاف نہ ہونے کی منصوبہ بندی کر لی گئی ہو بلکہ ایسا تصرف ان یتیموں کی ایک خدمت ہے جو اپنے مفادات کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ البتہ یہ کیفیت یتیم کے فکری و اقتصادی رُشد تک پہنچنے کے وقت تک ہونا چاہیے، جیسا کہ زیرِ بحث آیت جاری رکھتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اس زمانے تک کہ اُن میں یہ طاقت پیدا ہو جائے (حتی یبلغ اشدّہ)۔

"اشدّ" مادہ "شدّ" (بروزن "عقد") سے محکم گرہ کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو

---

[1] نہج البلاغہ، حصہ مکتوبات نمبر ۴۷۔

گئی اور اب یہ لفظ ہر قسم کے جسمانی و روحانی استحکام کے لیے بولا جاتا ہے۔

یہاں "اشد" سے مراد حدِ بلوغ کو پہنچنا ہے لیکن جسمانی بلوغت کافی نہیں بلکہ فکری و اقتصادی بلوغت ہونا چاہیئے۔ اس طرح سے کہ یتیم اپنے اموال کی حفاظت کر سکے یہ تعبیر اسی لیے منتخب کی گئی ہے کہ یقینی طور پر آزما کر دیکھ لیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ ہر معاشرے میں مختلف حوادث کے باعث یتیم موجود ہوتے ہیں۔ انسانی اقدار اور دیگر حوالوں سے ضروری ہے کہ یہ یتیم تمام پہلوؤں سے معاشرے کے خیر خواہ افراد کی سرپرستی میں ہوں۔ اسی لیے اسلام نے اس مسئلے کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس کا کچھ حصہ ہم سورہ نساء کی آیہ ۲ کے ذیل میں ذکر کر آئے ہیں (تفسیر نمونہ جلد ۲ کی طرف رجوع فرمائیں)۔

جس چیز کا یہاں اضافہ کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ بعض روایات میں یتیم وسیع تر معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ان افراد کو بھی یتیم کہا گیا ہے جو اپنے امام اور پیشوا سے جدا ہو چکے ہیں اور آوازِ حق ان کے کانوں تک نہیں پہنچتی۔ یہ در اصل یتیم کے مفہوم میں ایک وسعت ہے اور ایک مادی حکم سے معنوی استفادہ کیا گیا ہے۔

(۵) اس کے بعد ایفائے عہد کا مسئلہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اپنا عہد وفا کرو کیونکہ ایفائے عہد کے بارے میں سوال کیا جائے گا (واوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولا)۔

بہت سے معاشرتی روابط، اقتصادی نظام اور سیاسی مسائل عہد و پیمان کے گرد گھومتے ہیں۔ اگر عہد و پیمان متزلزل ہو جائے اور اعتماد اٹھ جائے تو معاشرے کا نظام تیزی سے درہم برہم ہو جائے اور اس پر وحشتناک ہرج مرج مسلط ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنی آیات میں ایفائے عہد پر بہت زور دیا گیا ہے۔

عہد و پیمان کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس میں افراد کے درمیان جو اقتصادی اور کاروباری پیمان ہوتے ہیں وہ بھی شامل ہیں اور شادی بیاہ وغیرہ کے پیمان بھی شامل ہیں۔ ان میں وہ معاہدے بھی شامل ہیں جو اقوام و ملل اور حکومتوں کے درمیان ہوتے اور ان سے بڑھ کر خدائی پیمان اور آسمانی رہبروں کے اپنی اُمتوں سے کیے گئے پیمان یا امتوں کی طرف سے ان سے باندھے گئے پیمان بھی اس میں شامل ہیں۔[1]

(۶) آخری زیرِ بحث آیت میں آخری حکم ناپ تول میں عدالت کے بارے میں ہے۔ اس کے ذریعے حقوق الناس کی حفاظت اور کم فروشی کا سدِ باب مقصود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب کسی پیمانہ سے کوئی چیز ناپو تو اس کا حق ادا کرو (واوفوا الكيل اذا كلتم)۔ اور صحیح اور سیدھے ترازو سے وزن کرو (وزنوا بالقسطاس المستقيم)۔ کیونکہ یہ کام تمہارے فائدے میں ہے اور اس کا انجام سب سے بہتر ہے (ذلك خير و

---

[1] ایفائے عہد اور قسم پوری کرنے کی اہمیت کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۱ سورہ نحل آیہ ۹۱ تا ۹۴ کے ذیل میں ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

احسن تاویلا)۔

چند اہم نکات

۱۔ کم فروشی کا نقصان: پہلا نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیئے یہ ہے کہ قرآن مجید میں بارہا کم فروشی، وزن میں کمی اور دھوکا بازی کے خاتمے پر زور دیا گیا ہے۔ ایک مقام پر یہ مسئلہ وسیع عالم ہستی کے نظامِ خلقت کے ہم پلہ رکھا گیا ہے:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۙ اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ ۝

خدا نے آسمان بلند کیا اور ہر چیز میں میزان اور حساب و کتاب رکھا تاکہ تم وزن اور حساب و کتاب میں سرکشی نہ کرو۔ (رحمٰن - ۷، ۸)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ناپ تول پورا رکھنا کوئی کم اہم مسئلہ نہیں بلکہ اصل عدالت اور اس آفرینش کے نظم و ضبط کا حصہ ہے جو پورے عالم ہستی پر حکم فرما ہے۔

ایک اور مقام پر شدید اور دھمکی آمیز لہجے میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۖ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۗ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۙ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۙ

وائے اور ہلاکت ہے کم فروشی کرنے والوں کے لیے کہ جو خریدتے وقت اپنا حق پورا پورا لیتے ہیں اور بیچتے وقت وزن میں کمی کرتے ہیں کیا وہ یہ گمان نہیں کرتے کہ قیامت کے عظیم دن عدلِ الٰہی کی بارگاہ میں مبعوث ہوں گے۔ (مطففین - ۱ تا ۵)

یہاں تک کہ قرآن مجید میں بعض انبیاء کے حالات میں ہے کہ ان کے شدید مبارزہ کا رُخ شرک کے بعد کم فروشی کی طرف تھا مگر ان کی ظالم قوم نے پرواہ نہ کی اور خدا کے شدید عذاب میں گرفتار ہو کر نابود ہو گئی۔ (تفسیر نمونہ جلد ۴ دیکھیے۔ سورہ اعراف کی آیہ ۸۵ کے ذیل میں مدین میں حضرت شعیبؑ کی تبلیغ کے ضمن میں تفصیلات ذکر کی گئی ہیں)۔

اصولی طور پر حق و عدالت، نظم و ضبط اور حساب و کتاب ہر چیز میں اور ہر جگہ بنیادی اور حیاتی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ یہ وہ روح ہے جو تمام عالم ہستی پر حکم فرما ہے۔ لہٰذا اس بنیادی مسئلے سے کسی بھی قسم کا انحراف خطرناک اور بد انجام ہو گا خصوصاً کم فروشی اعتماد و اطمینان کا سرمایہ ختم کر دیتی ہے کہ جو مبادلات کا اہم رکن ہے۔ یہ کام اقتصادی نظام کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

بہت ہی افسوس کا مقام ہے کہ بعض اوقات ہم دیکھتے ہیں اس اصول کو اپنانے میں غیر مسلم بعض فرض شناس مسلمانوں سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ دنیا کی منڈیوں میں اسی وزن کے مطابق اجناس پہنچائیں

جو اُن پر لکھا ہوا ہے تاکہ دوسروں کا اعتماد حاصل کر سکیں۔

جی ہاں! وہ جانتے ہیں کہ انسان اہلِ دنیا بھی ہو تو اس کا راستہ یہی ہے کہ معاملہ میں خیانت نہ کرے۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ حقوق کے اعتبار سے کم فروش خریداروں کے مقروض ہیں۔ لہٰذا ان کی توبہ یہ حقوق ادا کیے بغیر نہیں ہو سکتی جو انہوں نے غصب کیے ہیں، یہاں تک کہ اگر وہ ان حقوق کے مالکوں کو نہیں پہچانتے تب بھی انہیں چاہیئے کہ ان کے برابر۔ ردِّ مظالم کے طور پر اصلی مالکوں کی طرف سے فقرا اور مساکین کو دیں۔

۲۔ **کم تولنے کے مفہوم کی وسعت:** بعض اوقات کم فروشی کا مفہوم وسعت اختیار کر جاتا ہے اور اس میں عمومیت آجاتی ہے۔ اس طرح سے کہ ہر قسم کی کوتاہی اور فرائض کی انجام دہی میں کمی اس کے مفہوم میں شامل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ کاریگر جو اپنے کام میں کچھ کمی چھوڑ دیتا ہے، وہ استاد جو ٹھیک طرح سے درس نہیں دیتا وہ مزدور جو بر وقت کام پر حاضر نہیں ہوتا اور دل جمعی سے کام نہیں کرتا۔ اس حکم کے مخاطب ہیں اور اس کی خلاف ورزی کے نتائج کے حصہ دار ہیں۔

البتہ زیرِ بحث آیت کے الفاظ براہِ راست اس عمومیت کیلئے نہیں ہیں بلکہ مفہوم کی یہ وسعت عقلی ہے لیکن سورہ رحمٰن میں جو تعبیر آئی ہے وہ اس عمومیت اور وسعت کی طرف اشارہ کرتی ہے:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۙ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝

۳۔ **"قسطاس" کا مفہوم:** قاف کے نیچے زیر اور پیش کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے (بروزن "مقیاس" اور کبھی بروزن "قرآن") اس کا معنی ہے ترازو۔ بعض اسے رومی زبان کا لفظ سمجھتے ہیں اور بعض عربی کا۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اصل میں یہ دو لفظوں کا مرکب ہے۔ "قسط" بمعنی عدل و انصاف اور "طاس" بمعنی ترازو کا پلڑا۔ بعض کہتے ہیں کہ "قسطاس" بڑے ترازو کو اور "میزان" چھوٹے ترازو کو کہتے ہیں۔[1]

بہرحال "قسطاس" سے مراد مستقیم اور صحیح سالم ترازو ہے جو بے کم و کاست عادلانہ وزن کرے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام اس لفظ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

هو الميزان الذی له لسان

ترازو وہ میزان ہے جس کی زبان (دو پلڑوں کا توازن بتانے والی سوئی) ہو۔[2]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جو ترازو اس سوئی کے بغیر ہوتے ہیں وہ دو پلڑوں کی حرکات اور توازن کو پوری طرح واضح نہیں کرتے لیکن اگر ترازو میں یہ معیاری سوئی ہو تو پلڑوں کی تھوڑی سی حرکت بھی اس سے ظاہر ہو جائے گی اور عدالت پوری طرح ملحوظ رکھی جا سکے گی۔

---

[1] تفسیر المیزان، تفسیر فخرالدین رازی و تفسیر مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر صافی، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

(۳۶) وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ○

(۳۷) وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ○

(۳۸) كُلُّ ذَٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا ○

(۳۹) ذَٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۗ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَتُلْقَىٰ فِي جَهَنَّمَ مَلُومًا مَدْحُورًا ○

(۴۰) أَفَأَصْفَاكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِينَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِنَاثًا ۚ إِنَّكُمْ لَتَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا ○

ترجمہ

(۳۶) اس کی پیروی نہ کر جس کا تجھے علم نہ ہو کیونکہ کان، آنکھ اور دل سے سوال کیا جائے گا۔

(۳۷) زمین پر تکبر سے نہ چل، تو زمین کو چیر نہیں سکتا اور تیرے قد کی لمبائی ہرگز پہاڑوں تک نہیں پہنچ سکتی۔

(۳۸) ان سب کے گناہ تیرے پروردگار کے ہاں لائق نفرت قرار پائے ہیں۔

(۳۹) یہ احکام ان حکمتوں میں سے ہیں جو تجھے تیرے پروردگار نے وحی کے ذریعے دی ہیں اور اللہ کے ساتھ ہرگز کسی کو معبود قرار نہ دے کہ تو جہنم میں جا گرے گا اس حالت میں کہ درگاہ خدا سے ملامت شدہ اور راندہ ہوگا۔

(۴۰) کیا خدا نے بیٹے تم سے مخصوص کر دیئے ہیں اور خود ملائکہ میں سے بیٹیاں لے لی ہیں۔ تم بہت بڑی (اور انتہائی غلط) بات کہتے ہو۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں ہم نے اسلام کی کچھ انتہائی بنیادی تعلیمات پڑھی ہیں۔ یہ سلسلہ توحید سے شروع ہوتا ہے کہ جس سے ان تمام تعلیمات کا خمیر اٹھتا ہے اور پھر وہ احکام ہیں کہ جو انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے مربوط ہیں۔ زیر نظر آیات میں ہم ان احکام کے آخری حصے تک پہنچ جاتے ہیں یہاں چند مزید اہم احکام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(۱) صرف علم کی پیروی کرو: پہلے تمام چیزوں میں تحقیق کو ضروری قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کی پیروی نہ کر (ولا تقف ما لیس لک بہ علم)۔ نہ اپنے ذاتی عمل میں علم کے بغیر عمل کر اور نہ دوسروں کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت بغیر علم کے شہادت دے اور نہ ہی علم کے بغیر کوئی عقیدہ و نظریہ قائم کر۔

گویا غیر علم کی پیروی سے یہ ممانعت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے۔ اس میں اعتقادی امور بھی شامل ہیں، شہادت، قضاوت اور عمل بھی۔ یہ جو بعض مفسرین نے اسے کچھ امور میں محدود کر دیا ہے اس کی کوئی واضح دلیل نہیں ہے کیونکہ "تقف"، "قفو" (بروزن "عفو") کے مادہ سے کسی چیز کے پیچھے لگنے کے معنی میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ غیر علم کے پیچھے لگنا وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اور اس میں تمام مذکورہ چیزیں شامل ہیں۔ لہٰذا ہر چیز کی شناخت کا معیار علم و یقین ہے اور اس کے علاوہ ظن و گمان ہو، حدس و تخمین ہو یا شک و احتمال کچھ بھی قابل اعتماد نہیں ہے۔ جو لوگ ان امور کی بنیاد پر اعتقاد کر لیتے ہیں یا فیصلے کی مسند پر بیٹھ جاتے ہیں یا شہادت دیتے ہیں یا یہاں تک کہ اپنے ذاتی عمل میں ان کی بنیاد پر قدم اٹھاتے ہیں وہ اس صریح حکم اسلامی کے خلاف عمل کرتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں نہ شہرت پانے والی چیزیں قضاوت، شہادت اور عمل کی بنیاد بن سکتی ہیں نہ قرائن ظنی اور غیر یقینی خبریں کہ جو غیر مؤثق ذرائع سے ہم تک پہنچتی ہیں۔

آیت کے آخر میں اس ممانعت کی دلیل اس طرح بیان کی گئی ہے: "کان، آنکھ اور دل سب کے سب مسئول ہیں" اور جو کچھ وہ انجام دیتے ہیں اس کے بارے میں ان سے پوچھا جائے گا (ان السمع والبصر والفؤاد کل اولٰئک کان عنہ مسئولا)۔

یہ ذمہ داری اس بناء پر ہے کہ جو باتیں انسان علم و یقین کے بغیر کہتا ہے وہ یا تو اس نے غیر مؤثق افراد

سے سنی ہوتی ہیں، یا وہ کہتا ہے کہ میں نے دیکھا ہے جبکہ اس نے دیکھا نہیں ہوتا، یا وہ اپنے فکر و خیال کی بنیاد پر بے بنیاد فیصلے کرتا ہے کہ جو حقیقت پر منطبق نہیں ہوتے۔ اسی بنا پر اُس کی آنکھ، کان اور فکر و عقل سے سوال کیا جائے گا کہ کیا واقعاً تم ان امور کے بارے میں یقین رکھتے تھے کہ تم نے ان کے بارے میں گواہی دی یا فیصلہ کیا یا ان کے معتقد ہوئے اور ان کے مطابق عمل کیا۔

اگرچہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ان اعضاء و جوارح سے سوال کرنے سے مراد یہ اعضاء رکھنے والوں سے سوال کرنا ہے لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن دیگر آیات (مثلاً فصلت - ۲۱) میں تصریح کرتا ہے کہ روزِ قیامت انسانی جسم کے اعضاء یہاں تک کہ بدن کی کھال بھی بات کرے گی اور یہ اعضاً حقائق بیان کریں گے، تو کوئی دلیل موجود نہیں کہ ہم آیت کے ظاہری مفہوم کو چھوڑ دیں اور یہ نہ کہیں کہ خود ان اعضاء سے سوال ہوگا۔

رہا یہ سوال کہ حواسِ انسانی میں سے صرف آنکھ اور کان کا ذکر کیوں کیا گیا ہے، تو اس کی دلیل اور وجہ واضح ہے کیونکہ انسان کی حسی معلومات کا ذریعہ عام طور پر دو ہی ہیں اور باقی حواس ان کے تحت ہیں۔

نظمِ معاشرہ کے لیے ایک اہم درس

مذکورہ بالا آیت اجتماعی زندگی کے ایک انتہائی اہم اصول کی طرف اشارہ کرتی ہے جسے نظرانداز کر دینے کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہوگا کہ معاشرہ حرج مرج کا شکار ہو جائے گا انسانی روابط ختم ہو جائیں گے اور احساسات کے رشتے ٹوٹ جائیں گے۔

اور اگر یہ قرآنی پروگرام تمام انسانی معاشروں میں پوری طرح سے جاری ہو جائے تو بہت سی بدنظمیاں، بے اعتدالیاں اور مشکلات ختم ہو جائیں کہ جن کا سرچشمہ جلد بازی کے فیصلے، بے بنیاد گمان، مشکوک اور جھوٹی خبریں ہوتی ہیں۔

اگر قرآن کا یہ حکم رائج نہ ہو تو معاشرہ پر حرج مرج اور فتنہ و فساد کی فضا چھا جائے گی اور کوئی شخص دوسرے کی بدگمانی سے نہیں بچ سکے گا، کسی کو کسی پر اطمینان نہیں ہوگا اور تمام افراد کی عزت و آبرو اور مقام ہمیشہ خطرے میں رہے گا۔

بہت سی دیگر قرآنی آیات اور اسلامی روایات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے۔ مثلاً:

(۱) وہ آیات کہ جو ظن و گمان کی پیروی کرنے کی وجہ سے بے ایمان افراد کی شدید مذمت کرتی ہیں۔ مثلاً:

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ۚ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا

ان میں سے اکثر اپنے فیصلوں میں صرف ظن و گمان کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ ظن و گمان انسان کو کسی طرح بھی حق و حقیقت تک نہیں پہنچا سکتے۔ (یونس - ۳۶)

(ii) ایک اور مقام پر پیروی ظن کو ہوائے نفس کی پیروی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ

وہ صرف گمان اور ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ (نجم۔ ۲۳)

(iii) ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

ان من حقیقة الایمان ان لا یجوز منطقك علمك

ایمان کی حقیقت میں سے یہ ہے کہ تیری گفتگو تیرے علم سے زیادہ نہ ہو اور جتنا تو جانتا ہے تو اس سے زیادہ بات نہ کرے[1]

(iv) ایک اور حدیث میں امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے مروی ہے، آپ اپنے آباؤ اجداد سے نقل کرتے ہیں:

لیس لک ان تتکلم بما شئت، لان الله عزوجل یقول ولا تقف ما لیس لک به علم

تو جو چاہے نہیں کہہ سکتا کیونکہ خدا کہتا ہے: جس کا تجھے علم نہیں اس کی پیروی نہ کر[2]

(v) ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے، آپ فرماتے ہیں:

ایاکم والظن فان الظن اکذب الکذب

گمان سے پرہیز کرو کیونکہ گمان بدترین جھوٹ ہے[3]

(vi) ایک شخص امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا۔ اس نے عرض کی:

میرے کچھ ہمسائے ہیں۔ ان کے پاس گانے بجانے والی کنیزیں ہیں۔ وہ گاتی بجاتی ہیں۔ بعض اوقات میں بیت الخلاء میں جاتا ہوں تو زیادہ دیر بیٹھا رہتا ہوں تاکہ ان کے گیت سن سکوں حالانکہ میں اس مقصد کے لیے نہیں جاتا۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

کیا تو نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا:

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ○

(یقیناً کان، آنکھ اور دل سب سے سوال ہوگا)

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۸ ص ۱۶۔

[2] وسائل الشیعہ، ج ۱۸ ص ۱۶۔

[3] وسائل الشیعہ، ج ۱۸ ص ۳۸۔

اس نے عرض کیا :

مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ آیت میں نے ہرگز کبھی کسی عرب یا عجم سے نہیں سُنی۔ میں ابھی سے یہ کام چھوڑتا ہوں اور بارگاہِ الٰہی میں توبہ کرتا ہوں [1]

بعض مصادرِ حدیث میں اس روایت کے ذیل میں ہے کہ امامؑ نے اسے حکم دیا :

جاؤ اور غسل توبہ کرو اور جس قدر ہو سکے نماز پڑھو کیونکہ تم نے بہت بُرا کام کیا۔ اگر تُو اس حالت میں مرجاتا تو تجھے عظیم جواب دہی کا سامنا کرنا پڑتا۔

یہ آیات اور پیغمبرِ اکرمؐ اور آئمہ ہُدیٰؑ سے منقول احادیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کس طرح انسان کی آنکھ اور کان کو مسئول قرار دیتا ہے۔ اسلام کا تقاضا ہے کہ انسان جب تک نہ دیکھے نہ کہے، جب تک نہ سنے فیصلہ نہ کرے اور تحقیق، علم اور یقین کے بغیر کسی چیز کا اعتقاد نہ رکھے، نہ عمل کرے اور نہ قضاوت کرے۔ گمان، تخیّنے، اندازے اور سُنی سنائی باتوں کی پیروی کرنا اور علم و یقین کے بغیر کسی چیز کے پیچھے لگنا فرد اور معاشرے کے لیے بہت بڑے خطرات پیدا کرتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے بہت زیادہ نقصانات ہیں، مثلاً :

(۱) غیرِ علم پر بھروسہ کرنا لوگوں کے حقوق کی پامالی اور غیر مستحق افراد کو کسی کا حق دینے کا سرچشمہ ہے۔

(۲) غیرِ علم کی پیروی آبرومند افراد کی عزت و آبرو کو خطرے میں ڈال دیتی ہے اور خدمت گزاروں کو بددل کر دیتی ہے۔

(۳) غیرِ علم پر اعتماد پراپیگنڈا، افواہوں اور جعل سازیوں کا بازار گرم کر دیتا ہے۔

(۴) غیرِ علم کی پیروی انسان میں تحقیق و جستجو کا جذبہ ختم کر دیتی ہے اور اسے ایک جلد باور کرنے والا اور احمق شخص بنا دیتی ہے۔

(۵) غیرِ علم کی پیروی گھر، بازار، کاروبار غرض ہر جگہ پر سے گرم جوشی اور دوستی کے روابط ختم کر دیتی ہے اور لوگوں کو ایک دوسرے کے بارے میں بدگمان بنا دیتی ہے۔

(۶) غیرِ علم کی پیروی ہمارے استقلالِ فکری کو ختم کر دیتی ہے اور ہماری روح کو ہر قسم کا زہریلا پراپیگنڈا قبول کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

(۷) غیرِ علم کی پیروی ہر شخص اور ہر چیز کے بارے میں جلد بازی سے فیصلہ کرنے کا سرچشمہ ہے اور یہ خود طرح طرح کی ناکامیوں اور پشیمانیوں کا سبب ہے۔

---

[1] نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۱۶۴۔

گمان کی طرف میلان کا سدِّ باب

اب جو سوال باقی رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اس بُری اور منحوس عادت اور اس کے دردناک انجام سے کس طرح اپنے آپ کو اور معاشرے کو نجات دلا سکتے ہیں۔ اس سوال کے جواب کے لیے ایک طویل بحث کی ضرورت ہے البتہ ہم یہاں مختصر اور جچے تُلے نکات کی صورت میں ایک دستور العمل پیش کرتے ہیں۔

(ا) اس عمل کے دردناک نتائج اور انجام سے لوگوں کو پیہم آگاہ کرنا چاہیئے اور ان سے تقاضا کرنا چاہیئے کہ وہ غیر علم کے منحوس نتائج پر غور و فکر کریں۔

(ب) اسلامی طرزِ تفکر اور اسلام کے اندازِ جہاں بینی کو لوگوں میں زندہ کرنا چاہیئے تاکہ وہ جان سکیں کہ خدا ہر حالت میں لوگوں پر نگران ہے۔ وہ سمیع و بصیر ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہمارے افکار و نظریات سے بھی آگاہ ہے۔

قرآن کہتا ہے:

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ○

وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے اور جو کچھ سینوں میں چھپاتے ہیں اس سے بھی وہ آگاہ ہے۔ (المؤمن - ۱۹)

ہم جو بات بھی کرتے ہیں اور جو قدم بھی اٹھاتے ہیں ہمارے حساب میں لکھا جاتا ہے اور ہم اپنے تمام اعمال، فیصلوں اور اعتقادات کے جوابدہ ہیں۔

(ج) رشدِ فکری کی سطح بلند کرنا چاہیئے کیونکہ غیر علم کی پیروی عام طور پر ناآگاہ اور بے علم عوام کرتے ہیں کہ جو ایک بے بنیاد خبر سن کر فوراً اس سے چمٹ جاتے ہیں اور فیصلہ کر لیتے ہیں اور اسی کے مطابق پھر اقدام کرتے ہیں۔

۲۔ متکبر نہ بنو

اگلی آیت غرور و تکبر کے خلاف ہے۔ اس میں مومنین کو زندہ اور روشن تعبیر سے غرور کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

رسول اللہؐ کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: روئے زمین پر غرور و تکبر سے نہ چلو (ولا تمش فی الارض مرحاً)[1] کیونکہ تم ہرگز زمین کو چیر نہیں سکتے اور تمہارا لمبا قد پہاڑوں تک نہیں پہنچ سکتا (انك لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولاً)۔

---

[1] "مَرَح"، (بروزن "فَرَح") ایک باطل اور بے بنیاد بات پر بہت زیادہ خوشی کے معنی میں ہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ مغرور لوگ عام طور پر چلتے وقت زمین پر زور زور سے پاؤں پٹختے ہیں تاکہ لوگوں کو بتائیں کہ ہم آرہے ہیں۔ گردن اوپر اکڑا کر رکھتے ہیں تاکہ اہل زمین پر بزعم خود اپنی برتری جتا سکیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ تم بھی زمین پر کیسے ہی اپنے پاؤں پٹخو، کیا اسے چیر سکو گے جبکہ اس کرۂ خاکی پر تمہارا وجود بالکل ناچیز ہے۔ یہ تو بالکل اس چیونٹی کی طرح ہے جو بہت بڑے پتھر پر چل رہی ہو اور اپنا پاؤں اس پر پٹخے تو پتھر اس کی حماقت اور کم ظرفی پر ہنسے گا ہی۔

تُو اپنی گردن کو جتنا بھی اکڑائے کیا پہاڑوں کا ہمطراز ہو سکتا ہے۔ اس طرح تُو زیادہ سے زیادہ چند سنٹی میٹر اپنے تئیں اونچا کر سکتا ہے جبکہ اس زمین کے بلند ترین پہاڑوں کی چوٹی بھی اس کرہ کے مقابلے میں کوئی قابلِ ذکر حیثیت نہیں رکھتی اور خود زمین پوری کائنات کے مقابلے میں ایک ذرہ بے مقدار ہے۔

پس تیرا یہ غرور و تکبر چہ معنی دارد!

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ غرور و تکبر ایک خطرناک باطنی بیماری ہے لیکن قرآن نے براہِ راست اس پر بحث نہیں کی بلکہ اس کے ظاہری آثار میں سے بھی سادہ ترین اثرات کی نشاندہی کی ہے اور خود پسند بے مغز متکبروں اور مغروروں کی چال کے بارے میں بات کی ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تکبر و غرور اپنے کمترین آثار کی سطح پر بھی مذموم، ناپسندیدہ اور شرمناک ہے۔ نیز یہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان کی اندرونی صفات جو بھی ہوں وہ چاہے نہ چاہے ان کی جھلک اس کے اعمال میں ضرور نظر آجاتی ہے۔ اس کی چال ڈھال میں، اس کے دیکھنے کے انداز میں، اس کی بات کرنے کے طریقے میں اور اس کے تمام کاموں میں اس کی داخلی صفات جھلکتی ہیں۔ لہٰذا اگر ان صفات کا کچھ بھی اثر اعمال میں نظر آئے تو ہمیں متوجہ ہونا چاہیئے کہ خطرہ نزدیک آگیا ہے اور ہمیں فکر کرنا چاہیئے کہ اس مذموم عادت نے ہماری روح میں گھونسلا بنا لیا ہے لہٰذا ہمیں اس کے خلاف مقابلے کے لیے اٹھ کھڑا ہونا چاہیئے۔

ضمنی طور پر ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ زیر بحث آیت میں (اسی طرح سورہ لقمان میں اور قرآن کی دوسری سورتوں میں) قرآن کا ہدف یہ ہے کہ غرور و تکبر کی کلی طور پر مذمت کی جائے نہ کہ اس کے کسی خاص موقع کی یعنی چلنے پھرنے کے انداز کی۔

کیونکہ غرور و تکبر خدا فراموشی، خود فراموشی، فیصلے میں اشتباہ، راہِ حق سے گمراہی، شیطان کے راستے سے وابستگی اور طرح طرح کے گناہوں سے آلودگی کا سرچشمہ ہے۔

حضرت علی علیہ السلام خطبہ "ہمام" میں پرہیزگاروں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ومشیھم التواضع

اور ان کی چال ڈھال میں انکساری ہوتی ہے [1]

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۳۔

نہ صرف کوچہ و بازار میں چلتے ہوئے ان میں انکساری ہوتی ہے بلکہ زندگی کے تمام امور میں یہاں تک کہ مطالعاتِ فکری میں اور نظریات و افکار کے سفر میں انکساری ان کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔

ہادیانِ اسلام کی اپنی زندگی اس سلسلے میں ہر مسلمان کے لیے بہت ہی سبق آموز اور نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں ہم پڑھتے ہیں کہ آپؐ ہرگز اجازت نہیں دیتے تھے کہ جس وقت آپؐ سوار ہوں تو کچھ لوگ پیادہ آپؐ کے ہمرکاب چلیں بلکہ فرماتے تھے:

تم فلاں جگہ پہنچو، میں بھی آجاؤں گا۔ وہاں ملاقات ہوگی پیادہ شخص کا سوار کے ساتھ چلنا سوار کے غرور اور پیادہ کی ذلت کا سبب بنتا ہے۔

نیز ہم پڑھتے ہیں کہ پیغمبرِ اکرمؐ زمین پر بیٹھتے، غلاموں کی سی سادہ غذا کھاتے، بکری کا دودھ دوہتے اور گدھے کی ننگی پشت پر سوار ہوتے۔

یہاں تک کہ جب آپؐ کے اقتدار کا زمانہ تھا مثلاً فتح مکہ کے دن بھی اسی طرح کے کام انجام دیتے تھے تاکہ لوگ یہ گمان نہ کریں کہ کسی مقام پر پہنچنے سے غرور پیدا ہوگیا ہے اور آپؐ کوچہ و بازار کے لوگوں اور مستضعفین سے الگ رہنے لگے ہیں اور محنت کش عوام سے بیگانہ ہوگئے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کے حالات میں بھی ہے کہ آپؑ گھر کے لیے خود پانی بھرتے اور بعض اوقات گھر میں جھاڑو دیتے۔

امام حسن مجتبیٰؑ کے حالات میں ہے کہ کئی سواریاں آپؑ کے پاس تھیں اس کے باوجود آپؑ بیس مرتبہ پا پیادہ بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ آپؑ فرماتے تھے:

میں ایسا بارگاہِ الٰہی میں عجز و انکساری کے لیے کرتا ہوں[1]

اگلی آیت میں گزشتہ آیات میں بیان کیے گئے احکام پر تاکید کی گئی ہے۔ شرک، قتلِ نفس، زنا، قتلِ اولاد، مالِ یتیم میں تصرف اور ماں باپ کو آزار پہنچانے کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ان تمام کا گناہ تیرے پروردگار کے نزدیک قابلِ نفرت ہے (کل ذٰلک کان سیئہ عند ربک مکروھا)[2]

اس تعبیر سے واضح ہو جاتا ہے کہ مکتبِ جبر کے پیروکاروں کے قول کے برخلاف خدا نے ہرگز ارادہ نہیں کیا کہ کسی سے گناہ سرزد ہو اگر اس نے ایسا ارادہ کیا ہوتا تو اس آیت میں اس سے کراہت اور ناراضگی مناسب نہ تھی۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۴ میں بھی غرور و تکبر کے نقصان کے بارے میں گفتگو کر چکے ہیں۔

[2] "سیئہ" کی ضمیر "ذٰلک" یا "کل" کی طرف لوٹتی ہے اور یہ ان الفاظ کے مفرد ہونے کی وجہ سے مفرد ہے اگرچہ یہاں جمع کے معنی رکھتی ہے۔

ضمناً واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کی زبان میں بہت بڑے گناہوں کے لیے بھی لفظ مکروہ استعمال ہوا ہے۔

(۳) مشرک نہ بنو

تاکید مزید کے لیے اور اس لیے کہ ان تمام حکیمانہ احکام کا سرچشمہ وحیِ الٰہی ہے فرمایا گیا ہے: یہ سب حکمت آمیز احکام ہیں کہ جن کی تیرے پروردگار نے تیری طرف وحی کی ہے (ذٰلك مما اوحٰی الیك ربك من الحکمة)۔

"حکمت" کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ ان آسمانی احکام کا سرچشمہ وحیَ الٰہی ہے، اس کے علاوہ یہ میزانِ عقل پر بھی بالکل پورے اترتے ہیں اور عقل کے مطابق قابلِ ادراک ہیں۔

کون شخص شرک، قتلِ نفس یا ماں باپ کو آزار پہنچانے کی قباحت کا انکار کر سکتا ہے۔ اسی طرح کون زنا تجبر، یتیموں پر ظلم اور پیمان شکنی کے منحوس نتائج کا انکار کر سکتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں' یہ احکام حکمتِ عقل کے ذریعے بھی ثابت شدہ ہیں اور وحیَ الٰہی کے ذریعے سے بھی' اور تمام احکامِ الٰہی کے اصول اسی طرح ہیں اگرچہ عقل کے کم فروغ چراغ سے ان کی تفصیلات کو اکثر اوقات مشخص نہیں کیا جا سکتا اور صرف وحیَ الٰہی کے طاقتور نور ہی سے انہیں پہچانا جا سکتا ہے۔

بعض مفسرین نے حکمت کی تعبیر سے یہ استفادہ بھی کیا ہے کہ متعدد احکام جو گزشتہ آیات میں گزرے ہیں ثابت، مستحکم اور ناقابلِ تنسیخ ہیں اور یہ تمام آسمانی ادیان میں تھے۔ مثلاً شرک، قتلِ نفس، زنا، پیمان شکنی ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ جو کسی بھی مذہب میں جائز شمار ہوتی ہوں۔ پس یہ احکام محکمات اور قوانینِ ثابت کا حصہ ہیں۔

اس کے بعد جس طرح ان احکام کی ابتداء تحریمِ شرک سے کی گئی ہے حرمتِ شرک کی تاکید کے ساتھ ان کا اختتام ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے: خدائے یگانہ کے ساتھ ہرگز شریک کا قائل نہ ہونا اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود قرار نہ دینا (ولا تجعل مع الله الٰهًا اٰخر)۔

کیونکہ اس امر کے سبب تو دوزخ میں جا گرے گا جبکہ مخلوقِ خدا کی ملامت بھی تجھے دامن گیر ہو گی اور بارگاہِ الٰہی سے بھی تو دھتکارا جائے گا اور اس کا قہر و غضب بھی تجھے لاحق ہو گا (فتلقٰی فی جهنم ملومًا مدحورًا)۔

درحقیقت تمام انحرافات، جرائم اور گناہوں کا خمیر شرک اور دوگانہ پرستی سے اٹھتا ہے۔ اسی لیے اسلام کے اساسی احکام کا یہ سلسلہ حرمتِ شرک سے شروع ہوتا ہے اور تحریمِ شرک پر ہی تمام ہوتا ہے۔

آخری زیرِ بحث آیت میں مشرکین کی ایک بیہودہ خرافاتی فکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کے پایۂ منطق اور سطحِ فکر کو واضح کیا گیا ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں حالانکہ خود بیٹی کا نام سن کر شرم محسوس کرتے تھے اور اپنے گھر میں اس کی ولادت کو بدبختی کا باعث خیال کرتے تھے قرآن مجید خود انہی کی منطق کی زبان میں انہیں جواب دیتا ہے: کیا تمہارے پروردگار نے بیٹے صرف تمہارے

حصے میں دے دیئے ہیں اور خود اپنے لیے اس نے فرشتوں میں سے بیٹیاں لے لی ہیں (افاصفاکم ربکم بالبنین واتخذ من الملائکۃ اناثاً)۔

اس میں شک نہیں کہ بیٹیاں بھی بیٹوں کی طرح نعماتِ الٰہی ہیں اور انسانی قدر و قیمت کے لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہیں۔ اصولی طور پر بقائے نسل انسانی ان دونوں میں سے کسی ایک کے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا زمانۂ جاہلیت میں لڑکیوں کو جو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا وہ بیہودہ، فضول اور خرافاتی فکر تھی۔ اس کا پس منظر کیا تھا، اس کے بارے میں ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں [1]

لیکن قرآن کا مقصد یہ ہے کہ انہیں ان ہی کی منطق کے ذریعے مغلوب کرے کہ تم کیسے نادان لوگ ہو کہ اپنے پروردگار کے لیے ایسی چیز کا نظریہ رکھتے ہو جس سے خود تم عار محسوس کرتے ہو۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں ایک قاطع اور یقینی حکم کی صورت میں فرمایا گیا ہے: تم بہت بڑی اور کفر آمیز بات کرتے ہو (انکم لتقولون قولاً عظیماً)۔ ایسی بات جو کسی منطق سے مناسبت نہیں رکھتی اور کئی حوالوں سے بے بنیاد ہے۔ مثلاً:

۱۔ خدا کی اولاد ہونے کا اعتقاد اس کی ساحتِ مقدس میں ایک بہت بڑی اہانت ہے کیونکہ نہ وہ جسم ہے نہ عوارضِ جسمانی رکھتا ہے اور نہ بقائے نسل کا محتاج ہے۔ لہٰذا اس کے لیے اولاد کا اعتقاد صرف اس کی پاکیزہ صفات کو نہ پہچاننے کی وجہ سے ہے۔

۲۔ تم خدا کی ساری اولاد بیٹیوں میں منحصر کیوں سمجھتے ہو جبکہ بیٹی کے لیے بہت پست قدر و منزلت کے قائل ہو۔ تمہارے خیالات کے لحاظ سے یہ احمقانہ اعتقاد خدا کی بارگاہ میں ایک اور اہانت ہے۔

۳۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر یہ عقیدہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کے مقام کی بھی توہین ہے، جبکہ وہ فرمانِ حق پر قائم ہیں اور مقربِ بارگاہِ الٰہی ہیں۔ خود بیٹی کے نام سے گھبرا جاتے ہو لیکن ان سب مقربانِ الٰہی کو بیٹی فرض کرتے ہو۔

ان امور کی جانب توجہ سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بات ایک بہت بڑی بات ہے۔ واقعات سے انحراف کے لحاظ سے بڑی ہے، گناہ اور سزا کے لحاظ سے بڑی ہے اور خود تمہارے معمول اور عادت کے لحاظ سے بھی بڑی ہے [illegible] تم بیٹیوں کی تحقیر و تذلیل کرتے ہو اور ان کے احترام میں کمی کرتے ہو۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرکینِ عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کیوں خیال کرتے تھے۔ اسی طرح زمانۂ جاہلیت کے عرب بیٹیوں کو زندہ درگور کیوں کرتے تھے اور ان کے نام سے وحشت کیوں کرتے تھے نیز دوسری طرف اسلام نے عورت کو کیا مقام و منزلت عطا کیا اور کس طرح سے صنفِ عورت کی تذلیل کے نظریات کا مقابلہ کیا۔ ان تمام امور پر تفصیلی بحث تفسیر نمونہ جلد ۶، نحل آیات ۵۷ تا ۵۹ کے ذیل میں آچکی ہے۔

---

[1] تفسیرِ نمونہ، ج ۶ سورہ نحل کی آیات ۵۸ و ۵۹ کے ذیل میں دیکھیے۔

(۴۱) وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوا وَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا نُفُورًا ○

(۴۲) قُل لَّوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَّابْتَغَوْا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا ○

(۴۳) سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا ○

(۴۴) تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ ۚ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ۗ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ○

ترجمہ

(۴۱) ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے مؤثر طور پر بیان کیا تاکہ وہ کسی طرح سمجھیں لیکن (جن کے دل اندھے تھے) ان میں نفرت کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا۔

(۴۲) کہہ دو: اگر اس کے ساتھ اور خدا ہوتے، جیسا کہ تمہارا خیال ہے تو وہ کوشش کرتے کہ مالکِ عرش خدا کی طرف کوئی راہ نکالیں۔

(۴۳) جو کچھ یہ کہتے ہیں وہ اس سے پاک و برتر ہے، بہت ہی برتر۔

(۴۴) سات آسمان اور زمین اور جو اس میں ہیں، سب اس کی تسبیح کرتے ہیں اور ہر موجود اس کی تسبیح اور حمد کرتا ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ وہ حلیم اور بخشنے والا ہے۔

تفسیر

وہ حق سے کیونکر فرار کرتے ہیں؟

گزشتہ آیات میں گفتگو مسئلہ توحید پر تمام ہوئی۔ زیر بحث آیات میں واضح اور قاطع انداز میں اسی مسئلے پر تاکید کی جارہی ہے۔

پہلے تو توحید کے مختلف دلائل کے سامنے ایک گروہ مشرکین کی انتہائی ہٹ دھرمی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے اس قرآن میں بہت سے استدلال پیش کیے اور طرح طرح سے مؤثر طور پر بیان کیا تاکہ وہ سمجھیں اور راہِ حق میں قدم اٹھائیں لیکن ان سب استدلال اور بیانات پر انہوں نے فرار ہی کیا اور ان کی نفرت کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا (ولقد صرفنا فی ھٰذا القراٰن لیذکروا ومایزیدھم الا نفورًا)۔

«صرّف» مادہ «تصریف» سے تبدیل کرنے اور دگرگوں کرنے کے معنی میں ہے۔ خصوصاً اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ باب تفعیل سے ہے، کثرت کا مفہوم اس میں پنہاں ہے۔

قرآن میں توحید کے اثبات اور شرک کی نفی کے لیے کبھی منطقی استدلال پیش کیا گیا ہے، کبھی برہان فطرت سے کام لیا گیا ہے۔ کبھی تہدید کی صورت اپنائی گئی ہے اور کبھی تشویق کی راہ اختیار کی گئی ہے خلاصہ یہ کہ مشرکین کو بیدار اور آگاہ کرنے کے لیے کلام کے مختلف طریقوں اور فنون سے استفادہ کیا گیا ہے لہٰذا «صرفنا» کی تعبیر اس مقام پر بہت ہی مناسب ہے۔

اس تعبیر کے ذریعے قرآن کہتا ہے: ہم ہر دروازے سے وارد ہوتے اور ہم نے ہر راستے سے استفادہ کیا تاکہ ان کے اندھے دلوں میں توحید کا چراغ روشن کر دیں لیکن ان میں سے ایک گروہ اس قدر ہٹ دھرم، متعصب اور سخت ہے کہ نہ صرف ان بیانات سے وہ حقیقت کے قریب نہیں ہوتے الٹا ان کی نفرت اور دوری میں اضافہ ہوا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان بیانات کا الٹا نتیجہ نکلتا ہے تو پھر ان کے ذکر کا فائدہ؟

جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ قرآن ایک فرد یا ایک خاص گروہ کے لیے نازل نہیں ہوا بلکہ یہ سارے انسانی معاشرے کے لیے ہے اور مسلّم ہے کہ سب انسان تو ایسے نہیں ہیں۔ بہت سے ایسے بھی ہیں کہ وہ یہ دلائل سنتے ہیں تو راہِ حق ان پر آشکار ہو جاتی ہے۔ ان تشنگانِ حقیقت کا ہر دستہ قرآن کے کسی ایک طرح کے بیان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور بیدار ہو جاتا ہے اور ان آیات کے نزول کا یہی اثر کافی ہے اگرچہ کوردل اس سے الٹا اثر لیتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس متعصب اور ہٹ دھرم گروہ کا راستہ اگرچہ غلط ہے اور یہ خود بدبخت ہیں لیکن حق طلب

افراد ان سے اپنا موازنہ کرکے راہِ حق کو بہتر طور پر پاسکتے ہیں کیونکہ نور و ظلمت کے مقابلے سے نور کی قیمت بیشتر معلوم ہوتی ہے یہاں تک کہ بے ادبوں سے بھی ادب سیکھا جا سکتا ہے۔

ضمنی طور پر اس آیت سے تربیتی اور تبلیغی مسائل کے سلسلے میں یہ درس لیا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ تربیتی اہداف و مقاصد تک پہنچنے کے لیے صرف ایک ہی طریقے سے استفادہ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ مختلف اور طرح طرح کے وسائل سے استفادہ کیا جانا چاہیئے کیونکہ مختلف لوگوں کا ذوق اور استعداد مختلف ہوتی ہے۔ ہر ایک پر اثر انداز ہونے کے لیے خاص انداز ہونا چاہیئے۔ فنونِ بلاغت میں سے ایک یہ اسلوب ہے۔

دلیل تمانع

اگلی آیت توحید کی ایک دلیل کی طرف اشارہ کرتی ہے جو علماء اور فلاسفہ کی زبان میں "دلیل تمانع" کے نام سے مشہور ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اے رسول! ان سے کہہ دو: اگر خداوند قادر متعال کے ساتھ اور بھی خدا ہوتے جیسا کہ تمہارا خیال ہے، تو وہ خدا کوشش کرتے کہ خدائے عظیم صاحبِ عرش تک پہنچنے کی کوئی راہ نکالیں اور اس پر غلبہ حاصل کرلیں (قل لو کان معه اٰلهة کما یقولون اذا لابتغوا الیٰ ذی العرش سبیلا)۔

"اذا لابتغوا الیٰ ذی العرش سبیلا" کا مفہوم اگرچہ یہ ہے کہ "وہ صاحبِ عرش کی طرف راہ نکالتے" لیکن طرزِ بیان نشاندہی کرتا ہے کہ مراد اس پر غلبہ حاصل کرنے کی کوئی سبیل پیدا کرنا ہے خصوصاً "اللہ" کی بجائے "ذی العرش" کی تعبیر اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہے یعنی وہ بھی چاہتے کہ عرشِ اعلیٰ کے مالک بن جائیں اور سارے جہانِ ہستی پر حکومت کریں۔ لہٰذا اس کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔*

بہرحال یہ امر فطری اور طبیعی ہے کہ ہر صاحبِ قدرت چاہتا ہے کہ اپنے اقتدار کو زیادہ کامل کرے اور اپنے قلمرو حکومت کو توسیع دے اور اگر سچ مچ کوئی اور خدا موجود ہوتے تو توسیع حکومت کا یہ تنازع اور تمانع ان میں رونما ہوتا۔[1]

ممکن ہے کہا جائے کہ کونسا مانع ہے اور کیا حرج ہے کہ متعدد خدا ایک دوسرے کے ساتھ ہمکاری

---

* بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس جملے کا معنی یہ ہے کہ دوسرے خدا کوشش کرتے کہ اپنے آپ کو "اللہ" کی بارگاہ میں مقرب بنائیں یعنی یہ تمہارے بُت اور خدا جب خود اللہ کا تقرب حاصل نہیں کرسکتے تو تمہارے تقرب کا وسیلہ کیسے بن سکتے ہیں۔

لیکن اس آیت کی تعبیرات اور بعد کی آیت اس تفسیر سے ہرگز مناسبت نہیں رکھتیں۔

اور تعاون کرتے ہوئے اس عالم پر حکومت کریں اور کیا ضروری ہے کہ وہ آپس میں جھگڑیں۔

اس سوال کے جواب میں اس حقیقت کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ اگرچہ ہر موجود کے لیے تکامل اور توسیعِ اقتدار سے لگاؤ فطری اور طبیعی ہے اور یہ بھی کہ جن خداؤں کا مشرکین عقیدہ رکھتے تھے وہ بہت سی بشری صفات کے حامل تھے کہ جن میں سے حکومت و قدرت سے لگاؤ ایک زیادہ واضح صفت ہے لیکن ان سب امور سے قطع نظر اختلاف تعددِ وجود کا لازمہ ہے کیونکہ اگر کسی رویئے، پروگرام اور دیگر پہلوؤں سے کوئی اختلاف نہ ہو تو تعدد کا کوئی معنی ہی نہیں اور دونوں ایک چیز ہوں گے (غور کیجئے گا)۔

اس بحث کی نظیر سورہ انبیاء کی آیت ۲۲ میں بھی موجود ہے۔ جہاں فرمایا گیا ہے:

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا

اگر زمین و آسمان میں "اللہ" کے علاوہ اور خدا ہوتے تو نظامِ جہاں دگرگوں اور فاسد ہو جاتا۔

اشتباہ نہیں ہونا چاہیئے، یہ دونوں بیان بعض جہات سے اگرچہ ایک دوسرے کے مشابہ ہیں لیکن دو مختلف دلیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایک کی خداؤں کے تعدد کی وجہ سے نظامِ جہاں کے فساد کی طرف بازگشت ہے اور دوسری نظامِ جہاں سے قطع نظر متعدد خداؤں کے درمیان وجود تمانع و تنازع کے بارے میں گفتگو کرتی ہے۔

(سورہ انبیاء کی آیہ ۲۲ کے ذیل میں بھی ہم انشاء اللہ اس سلسلے میں بحث کریں گے)

چونکہ مشرکین کہتے ہیں کہ خدائے بزرگ نے ایک طرف نزاع کی حد سے تنزل کیا ہے لہٰذا اگلی آیت میں بلا فاصلہ فرمایا گیا ہے: جو کچھ وہ کہتے ہیں خدا اس سے پاک اور منزہ ہے اور جو کچھ وہ سوچتے ہیں خدا اس سے بہت برتر اور بالاتر ہے (سبحانہ و تعالیٰ عما یقولون علوًّا کبیرًا)۔

اس مختصر سے جملے میں درحقیقت اللہ تعالیٰ نے چار مختلف تعبیروں سے ناروا نسبتوں سے اپنے دامنِ کبریائی کی پاکیزگی بیان کی ہے:

۱۔ خدا ان نقائص اور ناروا نسبتوں سے منزہ ہے (سبحانہ)

۲۔ جو کچھ یہ کہتے ہیں وہ اس سے بالاتر ہے (و تعالیٰ عما یقولون)

۳۔ لفظ "علوًّا" مفعول مطلق ہے اور تاکید کے لیے آیا ہے۔

۴۔ اور آخر میں "کبیرًا" کہہ کر مزید تاکید کی گئی ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ "عما یقولون" (جو کچھ وہ کہتے ہیں) ۔ ایک وسیع معنی رکھتا ہے۔ اس میں ان کی تمام ناروا نسبتیں اور ان کے لوازم شامل ہیں (غور کیجئے گا)۔

اس کے بعد پروردگار کا مقامِ عظمت بیان کیا گیا ہے کہ وہ مشرکین کے وہم و خیال سے برتر ہے۔ فرمایا

گیا ہے کہ موجودات جہاں اس کی ذاتِ مقدس کی تسبیح کرتی ہیں ۔ ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب خدا کی تسبیح کرتے ہیں (تسبح له السموات السبع والارض ومن فیهن)۔ اس کے باوجود وہ حلیم وغفور ہے (انه کان حلیما غفورًا)۔

تمہارے کفر اور شرک پر اللہ تمہارا فوری مؤاخذہ نہیں کرتا بلکہ کافی مہلت دیتا ہے اور تمہارے لیے توبہ کے دروازے کھلے رکھتا ہے تاکہ اتمام حجت ہو جائے۔

دوسرے لفظوں میں تم یہ صلاحیت رکھتے ہو کہ عالم کے تمام ذرات میں سے سن سکو کہ موجودات تسبیح الٰہی کا نغمہ گنگنا رہے ہیں اور تم اس قابل ہو کہ خدائے یگانہ قادرِ متعال کی معرفت حاصل کر سکو لیکن تم کوتاہی کرتے ہو اور اس کوتاہی کے باوجود وہ فوراً مواخذہ اور عذاب نہیں کرتا اور تمہیں زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کرتا ہے کہ تم توحید کی شناخت کر سکو اور راہِ شرک ترک کر سکو۔

موجودات عالم کی عمومی تسبیح

قرآن کی مختلف آیات میں یہ بات آئی ہے کہ عالمِ ہستی کے موجودات خدائے عظیم کی تسبیح اور حمد کرتے ہیں۔ ان سب آیات میں سے شاید زیادہ صریح زیرِ بحث آیت ہے۔ اس آیت کے مطابق عالمِ ہستی کے تمام موجودات بلا استثناء مصروفِ تسبیح ہیں۔ اس کے مطابق زمین، آسمان، ستارے، کہکشاں، انسان، حیوان، نباتات یہاں تک کہ ایٹم کے چھوٹے چھوٹے ذرات بھی اس عمومی تسبیح و حمد میں شریک ہیں۔

قرآن کہتا ہے عالمِ ہستی سرتاپا زمزمہ و نغمہ ہے۔ ہر موجود ایک طرح سے حمد و ثنائے حق میں مشغول ہے۔ بظاہر خاموش عالمِ ہستی کے صحن میں مسلسل ایک غلغلہ برپا ہے۔ بے خبر لوگ اسے سننے کی توانائی نہیں رکھتے لیکن وہ صاحبانِ فکر و نظر جن کا قلب و روح نورِ ایمان سے زندہ اور روشن ہے ہر طرف سے کان اور جان سے یہ صدا سن رہے ہیں۔ بقولِ شاعر:

۱۔ گر ترا از غیب چشمی باز شد	با تو ذراتِ جہان ہمراز شد
۲۔ نطقِ آب و نطقِ خاک و نطقِ گل	ہست محسوسِ حواسِ اہلِ دل!
۳۔ جملہ ذرات در عالم نہان	با تو می گویند روزان و شبان
۴۔ ما سمیعیم و بصیریم و باہشیم	با شما نامحرمان ما خامشیم!
۵۔ از جمادی سوی جان جان شوید	غلغل اجزای عالم بشنوید!
۶۔ فاش تسبیح جمادات آیدت	وسوسہ ی تاویلها بزد ایدت

۱۔ اگر تجھے نگاہِ غیب حاصل ہو جائے تو ذراتِ عالم تجھ سے باتیں کرنے لگیں۔

۲۔ پانی، خاک اور مٹی کا بولنا اہلِ دل محسوس کرتے ہیں۔
۳۔ سارے عالم کے موجودات چپکے چپکے شب و روز تجھ سے کہتے ہیں۔
۴۔ ہم سنتے ہیں، دیکھتے ہیں اور باہوش ہیں البتہ تم نامحرموں سے بات نہیں کرتے۔
۵۔ ایک جمادِ بے جاں سے جانِ جاں ہو جاؤ تو اجزائے عالم کا غلغلہ سنو۔
۶۔ جمادات کی تسبیح تمہیں صاف سنائی دے گی اور تاویلوں کا وسوسہ کم کر دے گی۔

اس حمد و تسبیح کی حقیقت کے بارے میں فلاسفہ اور مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے بعض نے اسے "حالی" کہا ہے اور بعض نے "قالی"۔ ہمارے نزدیک ان کے جو قابلِ قبول نظریات ہیں، ذیل میں ان کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔

۱۔ ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ اس جہان کے سب ذرّات انہیں ہم عاقل سمجھیں یا غیر عاقل ایک قسم کے ادراک اور شعور کے حامل ہیں اگرچہ ہم میں یہ قدرت نہیں کہ اُن کے ادراک و احساس کی کیفیت سمجھ سکیں اور ان کی حمد و تسبیح سُن سکیں۔

وہ مختلف آیات اپنے نظریے کا شاہد قرار دیتے ہیں، مثلاً

وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ

بعض پتھر خوفِ خدا سے پہاڑوں کی چوٹی سے نیچے گر جاتے ہیں۔ (بقرہ - ۷۴)

فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ

اللہ نے آسمان و زمین سے فرمایا طوعاً یا کرہاً میرے فرمان کی طرف آؤ تو انہوں نے کہا کہ ہم اطاعت کا راستہ اپنائیں گے۔ (حٰم السجدہ - ۱۱)

۲۔ بہت سوں کا نظریہ ہے کہ یہ تسبیح اور حمد وہی چیز ہے جسے ہم "زبانِ حال" کہتے ہیں۔ یہ تسبیح حقیقی ہے نہ کہ مجازی لیکن زبانِ حال سے ہے نہ کہ زبانِ قال سے (غور کیجئے گا)۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کے چہرے اور آنکھوں سے تکلیف، رنج و غم اور بے خوابی نمایاں ہو تو ہم کہتے ہیں کہ اگرچہ تم اپنی تکلیف اور رنج و غم کے بارے میں زبان سے کچھ نہیں کہتے لیکن تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ تم کل رات نہیں سوئے اور تمہارا چہرہ کہہ رہا ہے کہ تم کسی جان کاہ رنج و غم سے گزر رہے ہو۔ یہ زبانِ حال کبھی اس قدر قوی ہوتی ہے کہ زبانِ قال سے انکار چھپانے کی کوشش بھی کی جائے تو حقیقت چھپ نہیں سکتی۔ بقول شاعر:

گفتم کہ با مکر و فسوں پنہاں کنم رازِ دروں
پنہاں نمی گردد کہ خوں از دیدگانم می رود

مَیں نے چاہا کہ کسی حیلے سے رازِ دروں چھپا لوں۔

لیکن وہ نہیں چھپتا کیونکہ میری آنکھوں سے خون جاری ہے ۔

یہی بات حضرت علی علیہ السلام اپنے مشہور جملے میں فرماتے ہیں :

ما اضمر احد شیئًا الا ظهر فی فلتات لسانه وصفحات وجهه

کوئی شخص اپنے دل کا بھید نہیں چھپاتا مگر یہ کہ لاعلمی میں اس کی گفتگو کے دوران اور اس کے چہرے کے صفحہ پر آشکار ہو جاتا ہے [1]

اسی طرح کیا اس بات سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ایک بہت ہی خوبصورت منظر جو کسی کے ہنر کا سچا شاہکار ہے نقاش اور مصور کے ذوق اور مہارت پر گواہی دیتا ہے اور اسے زبانِ حال سے خراجِ تحسین پیش کرتا ہے ۔

کیا انکار کیا جا سکتا ہے کہ عظیم نامور شعراء کا دیوان ان کے ذوق اور ادراک اور طبیعت عالی کی حکایت کرتا ہے اور ہمیشہ صاحب دیوان کی تعریف کرتا ہے۔ کیا انکار کیا جا سکتا ہے کہ عظیم عمارتیں اور بڑے بڑے کارخانے اور پیچیدہ کمپیوٹر وغیرہ زبانِ بے زبانی سے اپنے موجد کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی حد تک اپنے موجد کی ستائش کرتا ہے۔

لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یہ عجیب و غریب عالمِ ہستی اپنے عجیب نظام، اسرار، خیرہ کن عظمت اور حیرت انگیز باریکیوں کے ساتھ خدا کی تسبیح و حمد کرتا ہے ۔

کیا ۔ تسبیح ۔ عیوب سے پاک شمار کرنے کے علاوہ کچھ اور ہے؟ اس عالمِ ہستی کی ساخت اور اس کا نظم و نسق کہتا ہے کہ اس کا خالق ہر قسم کے نقص و عیب سے مبرا و منزہ ہے ۔

کیا حمد و ثنا صفاتِ کمال بیان کرنے کے علاوہ کچھ اور ہے؟ جہانِ آفرینش کا نظام ــ اللہ کی صفاتِ کمال، اس کے بے پایاں علم، بے انتہا قدرت اور وسیع و ہمہ گیر حکمت کی حکایت کرتا ہے ۔

خصوصاً سائنس اور علم و دانش کی پیش رفت سے اور اس وسیع عالم کے اسرار کے بعض گوشوں سے پردہ اٹھنے سے موجوداتِ عالم کی یہ عمومی حمد و تسبیح زیادہ آشکار ہوئی ہے۔

اگر ایک دن کوئی نکتہ پرداز شاعر سبز درختوں کے ہر پتے کو معرفتِ پروردگار کا ایک دفتر سمجھتا تھا تو آج کے ماہرینِ نباتات اور سائنس دانوں نے ایک دفتر نہیں بلکہ کئی کتابیں لکھی ہیں۔ آج ان ماہرین نے پتوں کے چھوٹے سے چھوٹے اجزاء کی حیرت انگیز ساخت پر بحث کی ہے۔ پتوں کے اجزائے حیات Cellules سے لے کر ان کی سات تہوں، ان کے تنفس کے نظام، آب و غذا کے حصول کے لیے ان کے رشتے ناتوں پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کئی پیچیدہ پتوں کی خصوصیات پر بھی ایسی کتابوں میں بحث

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار ۲۶۔

کی گئی ہے۔

لہٰذا ہر پتہ شب و روز زمزمۂ توحید گنگناتا ہے۔ پتوں کی تسبیح کی دلنشیں آواز باغوں، کساروں اور دروں کے پُر پیچ راستوں میں گونج رہی ہے لیکن بے خبر لوگوں کو کچھ سمجھ نہیں آتا وہ انہیں خاموش اور گونگا سمجھتے ہیں۔

موجودات کی عمومی تسبیح و حمد کا یہ مفہوم پوری طرح قابلِ فہم ہے اور ضروری نہیں کہ ہم اس بات کے قائل ہوں کہ عالمِ ہستی کے تمام ذرات ادراک و شعور رکھتے ہیں کیونکہ اس بات کے لیے ہمارے پاس کوئی قطعی دلیل نہیں ہے اور زیادہ احتمال یہی ہے کہ مذکورہ آیات اسی "زبانِ حال" کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر تسبیح و حمد سے مراد یہ ہے کہ نظامِ آفرینش خدا کی پاکیزگی، عظمت، قدرت اور صفاتِ ثبوتیہ و سلبیہ کی حکایت و ترجمانی کرتا ہے تو پھر قرآن کیوں کہتا ہے کہ تم ان کی حمد و تسبیح نہیں سمجھتے کیونکہ بعض لوگ نہیں سمجھتے تو کم از کم علماء اور دانشمند تو سمجھتے ہیں۔

اس سوال کے دو جواب ہیں:

پہلا یہ کہ روئے سخن لوگوں کی نادان اکثریت خصوصاً مشرکین کی طرف ہے اور صاحبِ ایمان علماء کہ جو اقلیت میں ہیں اس عموم سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ہر عام میں استثناء ہے۔

دوسرا یہ کہ اسرارِ عالم میں سے جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ اس کے مقابلے میں کہ جسے ہم نہیں جانتے سمندر کے مقابلے میں قطرے کی مانند ہے اور عظیم پہاڑ کے مقابلے میں ذرے کی طرح ہے۔ اگر اس میں صحیح طور پر غور و فکر کیا جائے تو اسے علم و دانش کا نام بھی نہیں دیا جا سکتا۔

تا بدانجا رسید دانشِ من   کہ بدانستی کہ نادانم!

میرا علم یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ میں نہیں جانتا۔

اس بناء پر اگر ہم عالم بھی ہوں تو بھی ان موجودات کی حمد و تسبیح نہیں پہچانتے کیونکہ جو کچھ ہم سن رہے ہیں وہ ایک عظیم کتاب کا ایک لفظ ہے۔ اس لحاظ سے ایک عمومی حکم کے طور پر یہ سب لوگوں سے خطاب ہے کہ عالمِ ہستی کی موجودات زبانِ حال سے جو تسبیح و حمد کرتے ہیں تم انہیں نہیں سمجھتے کیونکہ جو کچھ تم سمجھتے ہو وہ اس قدر ناچیز اور حقیر ہے کہ کسی حساب شمار ہی میں نہیں آتا۔

۳۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہاں موجودات کی عمومی تسبیح و حمد زبانِ حال اور زبانِ قال دونوں کا مرکب ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ تسبیح "تسبیح تکوینی" بھی ہے اور "تسبیح تشریعی" بھی کیونکہ بہت

سے انسان اور تمام فرشتے ادراک و شعور کے ساتھ اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور باقی تمام موجودات کے ذرے بھی اپنی زبانِ حال سے خالق کی عظمت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

یہ دونوں قسم کی حمد و تسبیح اگرچہ آپس میں فرق رکھتی ہے لیکن حمد و تسبیح کے وسیع مفہوم میں دونوں مشترک ہیں لیکن جیساکہ واضح ہے دوسری تفسیر اس تشریح کے ساتھ کہ جو ہم نے بیان کی ہے سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔

اہلِ بیتؑ سے چند روایات

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام سے جو روایات اس سلسلے میں ہم تک پہنچی ہیں ان میں جاذب نظر تعبیرات دکھائی دیتی ہیں۔

امام صادق علیہ السلام کا ایک صحابی کہتا ہے: میں نے آیہ "وان من شیء الا یسبح بحمدہ" کی تفسیر کے متعلق سوال کیا تو امامؑ نے جواب میں فرمایا:

كل شيء يسبح بحمده وانا لنرى ان ينقض الجدار وهو تسبيحها

جی ہاں ہر چیز خدا کی تسبیح و حمد کرتی ہے۔ یہاں تک کہ جب دیوار گر رہی ہوتی ہے اور اس کے گرنے کی آواز ہمیں سنائی دے رہی ہوتی ہے تو وہ بھی تسبیح ہوتی ہے۔[1]

امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

نهى رسول الله عن ان توسموا البهائم في وجوهها، وان تضرب وجوهها لانها تسبح بحمد ربها

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جانوروں کے منہ نہ داغو اور ان کے منہ پر تازیانہ نہ مارو کیونکہ وہ خدا کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔[2]

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

ما من طير يصاد في بر ولا بحر ولا شيء يصاد من الوحش الا بتضييعه التسبيح

کوئی پرندہ صحرا و دریا میں شکار نہیں ہوتا اور کوئی جانور دام صیاد میں نہیں پھنستا مگر تسبیح ترک کرنے سے۔[3]

---

[1] نور الثقلین ج ۳ ص ۱۶۸۔

[2] نور الثقلین ج ۳ ص ۱۶۸۔

[3] نور الثقلین ج ۳ ص ۱۶۸۔

امام باقر علیہ السلام نے چڑیا کی آواز سنی تو فرمایا:

جانتے ہو یہ کیا کہتی ہیں؟

ابو حمزہ ثمالی جو آپ کے خاص اصحاب میں سے تھے نے عرض کیا: نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا:

یسبحن ربھن عزوجل و یسئلن قوت یومھن

یہ خدائے عزوجل کی تسبیح کرتی ہیں اور اس سے دن کی روزی مانگتی ہیں[1]

ایک اور حدیث میں ہے:

ایک روز رسولِ اکرمؐ حضرت عائشہ کے پاس آئے۔ فرمایا: میرے یہ دونوں کپڑے دھو ڈالو۔ کہنے لگیں: یا رسول اللہؐ! کل میں نے انہیں دھویا تھا۔

رسول اللہؐ نے فرمایا:

اما علمت ان الثوب یسبحن فاذا اتسخ انقطع تسبیحہ

کیا جانتی نہیں ہو کہ کپڑے تسبیح کرتے ہیں اور جب میلے ہو جائیں تو ان کی تسبیح رُک جاتی ہے[2]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

للدابة علی صاحبھا ستة حقوق لا یحملھا فوق طاقتھا، ولا یتخذ ظھرھا مجلسا یتحدث علیھا، و یبدء بعلفھا اذا نزل، ولا یسمھا فی وجھھا، ولا یضربھا فانھا تسبح و یعرض علیھا الماء اذا مربھا۔

جانور اپنے مالک پر چھ حق رکھتا ہے:

۱۔ اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار نہ لادے۔

۲۔ اس کی پشت کو باتیں کرنے کی مجلس نہ بنائے (بلکہ جب کسی سے سرِ راہ ملاقات ہو جائے اور اس سے باتیں کرنا چاہے تو سواری سے اتر کر باتیں کرے اور بات چیت ختم ہو جائے تو سوار ہو کر چل دے)۔

۳۔ جس منزل پر پہنچے اسے پہلے چارہ مہیا کرے۔

۴۔ اس کے منہ کو نہ داغے۔

۵۔ اور نہ اس کے منہ پر مارے کیونکہ وہ خدا کی تسبیح کرتا ہے۔

---

[1] تفسیر المیزان، بحوالہ حلیۃ الاولیاء، از ابونعیم اصفہانی۔

[2] تفسیر المیزان، بحوالہ حلیۃ الاولیاء، از ابونعیم اصفہانی۔

۷۔ اور جب چشمہ آب یا ایسی کسی جگہ سے گزرے تو اسے پانی کے پاس لے جائے (تاکہ اگر وہ پیاسا ہے تو پانی پی لے)۔[1]

مجموعی طور پر یہ روایات کہ جن میں سے بعض دقیق اور باریک معانی کی حامل ہیں، نشاندہی کرتی ہیں کہ موجودات کی تسبیح والا عام حکم بلا استثناء سب چیزوں پر محیط ہے اور یہ سب چیزیں مذکورہ بالا دوسری تفسیر (تفسیر تکوینی اور زبان حال کے معنی میں تسبیح) سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہیں اور یہ جو ان روایات میں ہے کہ جس وقت لباس کثیف ہو جاتا ہے تو اس کی تسبیح رک جاتی ہے، ممکن ہے یہ اس طرف اشارہ ہو کہ جب تک موجودات طبیعی حالت میں اور پاک صاف ہوں تو انسان کو یاد الٰہی میں ڈالتی ہیں۔ لیکن جب طبیعی حالت میں اور پاک صاف نہ ہوں تو پھر یاد کا یہ سلسلہ باقی نہیں رہتا۔

---

[1] تفسیر المیزان، بحوالہ کافی۔

(۴۵) وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝

(۴۶) وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ۝

(۴۷) نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝

(۴۸) اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝

ترجمہ

(۴۵) اور جب تُو قرآن پڑھتا ہے تو ہم تیرے اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے درمیان ایک غیر محسوس حجاب پیدا کر دیتے ہیں۔

(۴۶) اور ہم ان کے دلوں پر غلاف چڑھا دیتے ہیں تاکہ وہ اسے نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی (پیدا کر دیتے ہیں) اور جب تُو قرآن میں اپنے پروردگار کو تنہا یاد کرتا ہے تو وہ پشت کر لیتے ہیں اور تجھ سے پیٹھ پھیر لیتے ہیں۔

(۴۷) اور ہم جانتے ہیں کہ وہ کیوں تیری باتیں کان لگا کر سنتے ہیں اور جب وہ آپس میں کانا پھوسی کرتے ہیں جبکہ ظالم کہتے ہیں کہ تم تو بس ایک سحر زدہ شخص کی پیروی کرتے ہو۔

(۴۸) دیکھ! یہ تجھ پر کیسی پھبتیاں کستے ہیں اور اسی بنا پر یہ گمراہ ہو گئے ہیں اور یہ (حق کا) راستہ پا ہی نہیں سکتے۔

شانِ نزول

مجمع البیان میں طبرسی نے، تفسیر کبیر میں فخرالدین رازی نے اور بعض دیگر مفسرین نے مندرجہ بالا آیات کی شانِ نزول کے بارے میں کہا ہے کہ ان میں سے پہلی آیت مشرکین کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جب رات کے وقت آپؐ قرآن کی تلاوت کرتے اور خانۂ کعبہ کے پاس نماز پڑھتے تو یہ لوگ آپؐ کو اذیت پہنچاتے۔ آپؐ کو پتھر مارتے اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے سے روکتے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے ایسا کیا کہ وہ آپؐ کو اذیت نہ دے سکیں (اور شاید یہ اس طرح سے تھا کہ ان کے دلوں میں آپؐ کا رعب ڈال دیا تھا)[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ جس وقت رسول اللہؐ قرآن پڑھتے تو مشرکین میں سے دو آدمی دائیں طرف اور دو آدمی بائیں طرف کھڑے ہو جاتے۔ تالیاں بجاتے، سیٹیاں بجاتے اور بلند آواز سے شعر پڑھتے تاکہ آپؐ کی آواز لوگوں کے کانوں تک نہ پہنچے۔[2]

ابنِ عباس کہتے ہیں کہ کبھی کبھار ابوسفیان اور ابوجہل رسول اللہؐ کے پاس آتے اور آپؐ کی باتیں سنتے۔ ایک دن ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: مجھے سمجھ نہیں آتا کہ محمدؐ کیا کہتا ہے۔ صرف یہ نظر آتا ہے کہ اس کے لب ہلتے ہیں۔

ابوسفیان نے کہا: میں سوچتا ہوں کہ اس کی بعض باتیں حق ہیں۔

ابوجہل نے اظہار کیا: وہ دیوانہ ہے۔

ابولہب نے مزید کہا: وہ کاہن ہے۔

ایک اور نے کہا: وہ شاعر ہے۔

ان غیر موزوں اور ناروا باتوں اور تہمتوں کے بعد مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں۔[3]

۱۔ مجمع البیان،
۲۔ تفسیر کبیر، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔
۳۔ تفسیر کبیر، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

تفسیر

جاهل مغرور

گزشتہ آیات کے بعد بہت سے لوگوں کے سامنے یہ سوال ابھرتا ہے کہ مسئلہ توحید اس قدر واضح ہے کہ تمام موجوداتِ عالم اس کی گواہی دیتے ہیں تو پھر مشرکین اس حقیقت کو کیوں قبول نہیں کرتے، وہ یہ گویا اور رسا آیاتِ قرآن سننے کے باوجود بیدار کیوں نہیں ہوتے؟

ہوسکتا ہے زیر بحث آیات اس سوال کے جواب کی طرف اشارہ ہوں۔ پہلی آیت کہتی ہے:
اے رسولؐ! جس وقت تُو قرآن پڑھتا ہے ہم تیرے اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے درمیان پردہ حائل کر دیتے ہیں" (و اذا قرأت القرآن جعلنا بینك و بین الذین لا یؤمنون بالاٰخرة حجابًا مستورًا)۔

یہ حجاب دراصل ہٹ دھرمی، تعصب، خود پرستی، غرور و تکبر اور جہالت ہی تھی کہ جو ان کی فکر و نظر سے حقائقِ قرآن چھپا دیتی تھی اور انہیں اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ توحید و معاد، دعوتِ پیغمبرؐ کی صداقت اور اس قسم کے دیگر حقائق کا ادراک کر سکیں۔

لفظ "مستور" یہاں "حجاب" کی صفت ہے یا ذاتِ پیغمبرؐ کی یا حقائقِ قرآن کی، اس بارے میں مفسرین نے مختلف آراء پیش کی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ان آیات کی تفسیر کے آخر میں بحث کریں گے۔
اسی طرح خدا کی طرف سے اس حجاب کے پیدا ہونے کی کیفیت کے بارے میں بھی وہیں پر بحث آئے گی۔

اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: "ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ وہ قرآن کو نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی اور بوجھ ہے" (و جعلنا علیٰ قلوبھم اکنة ان یفقھوه و فی اٰذانھم وقرًا)۔ اسی لیے جب تو اپنے پروردگار کو قرآن میں تنہا یاد کرتا ہے تو وہ پیٹھ پھیر لیتے ہیں (و اذا ذکرت ربك فی القراٰن وحده ولوا علیٰ ادبارھم نفورا)۔

واقعاً حق سے فرار کیسی عجیب بات ہے یعنی سعادت و نجات سے فرار، خوش بختی اور کامیابی سے فرار اور فہم و شعور سے فرار۔ اس معنی کی نظیر سورہ مدثر کی آیات ۵۰ اور ۵۱ میں بھی ہے:

كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۝ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ۝

گویا وہ خوفزدہ گدھے ہیں کہ جو غضبناک شیر سے بھاگ رہے ہیں۔

مزید فرمایا گیا ہے: ہم جانتے ہیں کہ وہ کیوں تمہاری باتیں کان دھر کر سنتے ہیں (نحن اعلم بما یستمعون به اذ یستمعون الیك) اور جب وہ آپس میں سرگوشیاں اور کان پھوسیاں کرتے ہیں (و اذ ھم نجوٰی)۔

جس وقت ظالم لوگ مومنین سے کہتے ہیں کہ صرف تم ایسے شخص کی پیروی کرتے ہو جو سحر زدہ ہے اور ساحروں نے جس کی عقل و ہوش کو ختم کر دیا ہے (اذ یقول الظالمون ان تتبعون الا رجلا مسحورا)۔

یہ لوگ دراصل ادراکِ حقیقت کے لیے تیرے پاس نہیں آتے اور تیری باتیں دل کے کانوں سے نہیں سنتے بلکہ ان کا مقصد تو یہ ہے کہ وہ آکر مخل ہوں اور اگر ہو سکے تو مومنین کو راستے سے بھٹکا دیں۔ اصولی طور پر جس کے دل پر پردہ پڑا ہو اور جس کے کان ایسے بوجھل ہوں کہ وہ حق بات سن ہی نہ سکے وہ مردانِ حق کی باتیں ایسے مقاصد کے علاوہ نہیں سنتے۔

زیر بحث آخری آیت میں پیغمبر اکرمؐ کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے مختصر سی عبارت میں ان گمراہوں کو دندان شکن جواب دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: دیکھ! تیرے بارے میں کیسی کیسی پھبتیاں کستے ہیں (کوئی تجھے جادوگر کہتا ہے، کوئی سحرزدہ، کوئی کاہن اور کوئی مجنون)، یہی وجہ ہے کہ وہ گمراہ ہوتے ہیں اور راہِ حق پانے کی سکت نہیں رکھتے (انظر کیف ضربوا لک الامثال فضلوا فلا یستطیعون سبیلا)۔

ایسا نہیں کہ راستہ واضح نہیں ہے اور حق کا چہرہ چھپ گیا ہے بلکہ ان کے پاس چشمِ بینا نہیں ہے اور وہ بغض و جہالت، تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اپنی عقل و خرد گنوا بیٹھے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ ان آیات کا مجموعی جائزہ: زیرِ نظر آیات میں گمراہ لوگوں کی حالت اور شناختِ حق کی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کا عمدہ نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ آیات کہتی ہیں کہ حق کی پہچان میں ان کے لیے تین بڑی رکاوٹیں موجود ہیں۔ وہ نہ ہوں تو ان کے لیے حق کا چہرہ دیکھنا آسان ہو جائے۔

پہلی یہ کہ قرآن رسول اللہ سے کہتا ہے کہ تیرے اور ان کے درمیان ایک حجاب حائل ہے یہ حجاب سوائے بغض، کینے، حسد اور عداوت کے کچھ اور نہیں کہ جو اُن کے سینوں میں تیرے لیے موجود ہے۔ اسی وجہ سے وہ تیری بلند شخصیت کو نہیں دیکھ پاتے اور تیری گفتار و رفتار کی عظمت کو نہیں سمجھ پاتے۔ یہاں تک کہ اچھائیاں بھی انہیں برائیاں معلوم ہوتی ہیں۔

دوسری یہ کہ وہ رسول اللہؐ سے کینہ اور حسد ہی نہ رکھتے تھے بلکہ ان کے دلوں پر جہالت اور اندھی تقلید کے پردے بھی پڑے ہوئے تھے یہاں تک کہ وہ کسی شخص سے حق بات سننے کے لیے بھی تیار نہ تھے۔

تیسری رکاوٹ شناختِ حق میں یہ حائل تھی کہ ان کے آلاتِ شناخت ہی حق قبول کرنے کیلئے آمادہ نہ تھے۔ مثلاً ان کے کان ہی حق بات سے ایسی نفرت کرتے تھے کہ گویا حق بات کو دفع کرتے تھے اور اس کے سامنے گویا بہرے ہو جاتے تھے جبکہ اس کے برعکس باطل کی باتیں انہیں پسند تھیں۔ باطل ان کے لیے لذت بخش تھا اور ان پر فوری اثر کرتا تھا۔

خصوصاً یہ بات تو تجربے سے ثابت ہوئی ہے کہ جن باتوں کی طرف انسان رغبت نہ رکھتا ہو انہیں مشکل ہی سے سنتا ہے اور جن کی طرف میلان رکھتا ہے انہیں خاص تیزی کے ساتھ سنتا اور سمجھتا ہے گویا اندرونی میلانات بھی انسان کے ظاہری حواس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔

ان تین موانع کا نتیجہ یہ تھا کہ:

اولاً وہ کلمۂ حق سننے سے بھاگتے تھے خصوصاً جب اللہ کی وحدانیت کے بارے میں گفتگو ہوتی کہ جو ان کے تمام مشرکانہ عقائد کی بنیاد ہی سے متصادم تھی تو وہ تیزی سے بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔

ثانیاً وہ اپنے انحرافی خط کو صحیح ثابت کرنے کے لیے رسول اللہؐ اور اُن کے ارشادات کے بارے میں غلط توجیہیں کرتے تھے اور آپ پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے کوئی ساحر کہتا اور کوئی شاعر، کوئی آپ کو مجنون قرار دیتا اور کوئی دیوانہ۔

تمام دشمنانِ حق کہ جن کے اعمال و صفاتِ رذیلہ ان کے لیے حجاب ہیں، کی یہی حالت ہے۔ اسی مقام پر ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص راہِ حق اور صراطِ مستقیم پر چلنا چاہتا ہے اور انحراف و گمراہی سے بچنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اسے اپنی اصلاح کی کوشش کرنا چاہیئے۔ دل کو بغض و کینہ اور حسد و عناد سے پاک کرنا چاہیئے۔ روح کو غرور و نخوت سے پاک کرنا چاہیئے بخلاصہ یہ کہ اپنے وجود کو صفاتِ رذیلہ سے پاک کرنا چاہیئے چونکہ جب دل کا آئینہ ان رذائل سے پاک صاف ہو کر صیقل ہو جائے گا تو پھر تمام حقائق اس پر اپنا پَرتو ڈال سکیں گے یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات بے علم پاک دل افراد حقائق کو سمجھ لیتے ہیں لیکن غیر تہذیب یافتہ عالم نہیں سمجھ پاتے۔

۲۔ **خدا کی طرف نسبت کا مفہوم:** دوسری بہت سی آیات کی طرح زیرِ بحث آیات میں بھی حجابوں کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے:

ہم ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔

تیرے اور ان کے درمیان ہم حجاب حائل کر دیتے ہیں اور ان کے کانوں میں سنگینی قرار دیتے ہیں۔

ہو سکتا ہے ایسی تعبیرات سے جاہل افراد مکتبِ جبر کا مفہوم لیں حالانکہ یہ تو ان کے اعمال ہی کے آثار اور نتائج ہیں۔ درحقیقت وہ خود ہی ہیں جو اپنے گناہوں اور بُری صفات کے ذریعے یہ حجاب پیدا کرتے ہیں لیکن چونکہ ہر چیز کی خاصیت خدا کی طرف سے ہے اور عملِ قبیح اور صفاتِ رذیلہ میں خدا نے یہ تاثیر پیدا کی ہے لہٰذا اس خاصیت اور حجاب کی نسبت خدا کی طرف بھی دی جا سکتی ہے۔ اس بارے میں گزشتہ مباحث میں ہم بارہا گفتگو کر چکے ہیں اور اس سلسلے میں قرآن سے بھی بہت سے شواہد پیش کیے جا چکے ہیں۔

۳۔ **حجابِ مستور کیا ہے؟:** اس سلسلے میں مفسرین کی کئی مختلف آراء ہیں۔ مثلاً:

(۱) بعض "مستور" کو "حجاب" کی صفت سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن کی تعبیر کا ظہور یہ ہے کہ حجاب

نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ درحقیقت کینہ و عداوت اور حسد و بغض کے حجاب ایسے نہیں ہیں جو آنکھ سے دکھائی دیں جبکہ ان کے باعث جس سے حسد اور کینہ ہوتا ہے اُس کے اور اِس کے درمیان ایک ضخیم پردہ حائل ہو جاتا ہے۔

(ب) بعض دیگر مفسرین "مستور" کو "ساتر" کے معنی میں سمجھتے ہیں (کیونکہ اسم مفعول بعض اوقات فاعل کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ آیاتِ مذکورہ میں بھی بعض مفسرین "مستور" کو "ساتر" کے معنی میں سمجھتے ہیں[1]

(ج) بعض "مستور" کو "حجاب" کی مجازی توصیف سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مراد یہ نہیں ہے کہ یہ حجاب مستور ہے بلکہ وہ حقائق جو اِس حجاب کے ماوراء ہیں وہ مستور ہیں (مثلاً پیغمبر اکرمؐ کی شخصیت، آپؐ کی دعوت کی عظمت اور آپؐ کے ارشادات کی عظمت)۔

لیکن ان تینوں تفسیروں میں غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ پہلی تفسیر ظاہر آیت سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ بعض روایات میں بھی ہے کہ بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سخت ترین دشمن آپؐ کی طرف آتے جبکہ آپؐ اپنے اصحاب کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہوتے لیکن وہ آپؐ کو نہ دیکھ پاتے گویا آپؐ کی خیرہ کن عظمت کے باعث یہ دل کے اندھے آپؐ کو نہ دیکھ پاتے اور نہ پہچان پاتے لہٰذا آپؐ ان کی طرف سے اذیت سے محفوظ رہتے۔

۴۔ "اکنہ" اور "وقر" کیا چیز ہے؟ : "اکنہ" "کنان" (بروزن "زبان") کی جمع ہے۔ یہ در اصل ہر قسم کی ڈھانپنے والی چیز کے معنی میں ہے کہ جس سے کسی چیز کو ڈھانپتے اور مستور کرتے ہیں لیکن "کن" (بروزن "جن") اس برتن کو کہتے ہیں جس میں کسی چیز کو محفوظ رکھا جاتا ہے۔ "کن" کی جمع "اکنان" ہے۔ بعد ازاں اس معنی میں وسعت پیدا ہوگئی اور ہر چیز کہ جو مستور ہونے کا سبب بننے کے لیے بولا جانے لگا۔ مثلاً پردہ، گھر اور وہ اجسام کہ جن کے پیچھے انسان اپنے آپ کو چھپاتے۔

"وقر" (بروزن "جبر") سنگینی کے معنی میں ہے کہ جو کان میں پیدا ہو جائے اور "وقر" (بروزن "رزق") بارِ سنگین کے معنی میں ہے۔

۵۔ "ما یستمعون بہ" کی تفسیر : اس کی مفسرین نے دو تفسیریں کی ہیں :

طبرسی نے مجمع البیان میں اور فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں اور بعض دیگر مفسرین نے اسے "بسبب استماع" کے معنی میں لیا ہے یعنی ہم جانتے ہیں کہ وہ تیری باتیں کیوں کان لگا کر سنتے ہیں، ادراکِ حق کے لیے؟ نہیں بلکہ

---

[1] اخفش سے منقول ہے کہ وہ کہتا ہے :

"اسم مفعول کبھی اسم فاعل کے معنی میں ہوتا ہے۔ مثلاً "میمون" "یامن" کے معنی میں اور "مشؤوم" "شائم" کے معنی میں۔

استہزاء اور جوڑ توڑ لگانے اور الٹی سیدھی توجیہات کرنے کے لیے، مختصر یہ کہ گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے کیلئے۔

علامہ طباطبائی نے المیزان میں اور بعض دیگر مفسرین نے اسے "وسیلۂ استماع" کے معنی میں لیا ہے یعنی ہم جانتے ہیں کہ وہ کن کانوں سے تیری باتیں کان لگا کر سنتے ہیں اور ہم ان کے دلوں اور ان کی سرگوشیوں سے آگاہ ہیں۔

(پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے)۔

۶۔ **وہ پیغمبر اکرمؐ کو "مسحور" کیوں کہتے تھے؟** "مسحور" کا معنی ہے سحر شدہ اور "ساحر" کا معنی ہے سحر کرنے والا۔

دشمنِ رسول اللہؐ کو "مسحور" یا تو اس بناء پر کہتے تھے کہ وہ اس طرح آپؐ کی طرف جنون کی نسبت دینا چاہتے تھے اور کہنا چاہتے تھے کہ جادوگروں نے آپؐ کی فکر و عقل پر اثر کیا ہے اور ساحروں نے (معاذاللہ) آپؐ کے حواس مختل کر دیئے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ "مسحور" یہاں "ساحر" کے معنی میں ہے (کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اسم مفعول کبھی اسم فاعل کے معنی میں بھی آتا ہے)۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ رسول اللہؐ کا غیر معمولی کلام جادو ہے جو لوگوں کے دلوں پر اثر کرتا ہے۔ ضمنی طور پر یہ بات کہہ کر وہ آپؐ کے کلام کی عجیب تاثیر کا اعتراف کرتے تھے۔

۷۔ **توحید کی آواز پر مشرکین کا خوف:** زیر بحث آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ مشرکین خاص طور پر توحید کی آواز سن کر سخت خوف میں مبتلا ہو جاتے تھے اور بھاگ کھڑے ہوتے تھے کیونکہ ان کی تمام تر زندگی کی بنیاد شرک اور بت پرستی تھی اور ان کے معاشرے پر مشرکانہ نظام حکمران تھا۔ اگر توحید کی بنیاد پڑ جاتی تو نہ صرف ان کے مذہبی عقائد پر ضرب پڑتی تھی بلکہ ان کا معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، ثقافتی اور تمدنی نظام بھی جو شرک پر مبنی تھا تباہ ہو کر رہ جاتا، اس طرح حکومت پسے ہوئے مستضعف لوگوں کے ہاتھ آ جاتی۔ مستکبرین کا خاتمہ ہو جاتا، اور استعمار اور لوٹ کھسوٹ کہ جو مشرکانہ نظاموں کا نتیجہ ہے ختم ہو جاتا، اور طبقاتی تفاوت ختم ہو جاتا تھا۔ لہٰذا جن کے اقتدار کا انحصار شرک پر تھا ان کی سخت کوشش تھی کہ توحید کی پکار کسی کے کان تک پہنچنے پائے لیکن جیسا کہ زیر بحث آیات اشارہ کرتی ہیں وہ ظالم اور ستمگر لوگ تھے کہ جو مستضعف عوام پر بھی ظلم کرتے تھے اور اپنے آپ پر بھی۔ کیونکہ ہر ظالم مخرف اپنی قبر آپ کھودتا ہے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ مشرکین چاہتے تھے کہ انہیں فسق و فجور اور گناہ جاری رکھنے کا کوئی جواز ہاتھ آ جائے لہٰذا بار بار پوچھتے تھے کہ قیامت کا دن کب آئے گا:

بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۚ یَسْئَلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ ؕ

بلکہ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ ہمیشہ بُرائی کرتا رہے۔ (جبھی تو) پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آئیگا۔
(قیامت - ۵، ۶)

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ بھی ذمہ داری اور جوابدہی سے فرار کے لیے ایک بہانہ سازی تھی۔

(۴۹) وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ○

(۵۰) قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ○

(۵۱) اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ○

(۵۲) يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ○

ترجمہ

(۴۹) اور انہوں نے کہا کہ جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے اور بکھر جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ نئی خلقت حاصل کریں گے؟

(۵۰) کہہ دو: تم پتھر یا لوہا ہو جاؤ۔

(۵۱) یا جو مخلوق تمہاری نظر میں ان سے بھی زیادہ سخت ہو (اور جس میں زندگی کے دُور دُور تک کوئی آثار نہ ہوں۔ پھر بھی خدا قادر ہے کہ تمہیں نئی زندگی کی طرف پلٹا دے)۔ عنقریب وہ کہیں گے کون ہمیں دوبارہ پلٹائے گا۔ کہہ دو: وہی جس نے پہلے تمہیں پیدا کیا تھا۔ وہ (تعجب اور انکار سے) تیرے سامنے اپنے سر جھکاتے ہیں اور کہتے ہیں:

ایسا کس وقت ہوگا۔ کہہ دو: شاید نزدیک ہو۔

(۵۲) وہی دن کہ جب وہ تمہیں (تمہاری قبروں سے) بُلائے گا تم بھی جواب دوگے اس حالت میں کہ اُس کی حمد کر رہے ہوگے اور خیال کروگے کہ تم تھوڑی سی مدت ہی (عالم برزخ میں) رہے ہو۔

تفسیر

قیامت یقینی ہے

گزشتہ آیات توحید سے متعلق اور شرک کے خلاف مبارزہ کے بارے میں تھیں لیکن زیر نظر آیات میں معاد اور قیامت کے بارے میں گفتگو ہے اور ہر مقام پر اس گفتگو سے مسئلہ توحید کی تکمیل ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ عقائد اسلامی میں سے بنیادی ترین مبداء و معاد کا عقیدہ ہے یہی عقیدہ انسان کی عملی اور اخلاقی طور پر تربیت کرتا ہے۔ یہ عقیدہ آلودگی اور گناہ سے بچاتا ادائیگی فرض کی دعوت دیتا ہے اور انسان کو تکامل و ارتقاء کے راستے پر لے جاتا ہے۔

ان آیات میں منکرین معاد کے تین سوالات یا تین اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: انہوں نے کہا کہ جب ہم ہڈیوں میں تبدیل ہوگئے اور یہ ہڈیاں بھی بوسیدہ ہو کر منتشر ہوگئیں تو کیا ہمیں نئے سرے سے تخلیق کیا جائے گا (وقالوا ءاذا کنا عظاما و رفاتا ءانا لمبعوثون خلقا جدیدا)۔[1]

کیا اصولی طور پر اس بات کا امکان ہے کہ بوسیدہ اور ذرہ ذرہ ہو کر بکھر جانے والی ہڈیاں نئے سرے سے جمع ہوں اور اس کے بعد پھر انہیں لباس حیات عطا ہو جائے۔ بوسیدہ اور پراگندہ ہڈیاں کہاں اور ایک زندہ طاقتور اور عقلمند انسان کہاں۔

معاد کے بارے میں قرآن کی دیگر بہت سی تعبیرات کی طرح یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ رسول اللہ اپنی گفتگو میں ہمیشہ معاد جسمانی کی بات کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ بکھر جانے کے بعد یہ جسم پھر پلٹ آئے گا۔ ورنہ اگر معاد روحانی کی بات ہوتی تو مخالفین کے ایسے اعتراضات کے کوئی معنی نہ تھے۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: کہہ دو: کہ بوسیدہ اور خاک شدہ ہڈی سے لباس حیات عطا کرنا تو آسان کام ہے "تم پتھر یا لوہا بن جاؤ" تو پھر بھی خدا قادر ہے کہ تمہارے بدن کو لباس حیات پہنا دے (قل

---

[1] رفات۔ بروزن کرات۔

کونوا حجارۃ او حدیدًا)۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مخلوق پتھر اور لوہے سے بھی سخت تر ہو اور زندگی سے بہت دُور ہو اور اس لحاظ سے تمہاری نظر میں زیادہ بڑا کام ہو تو بھی خدا قادر ہے کہ اس کے بدن پر جامۂ حیات پہنا دے (او خلقًا مما یکبر فی صدورکم)۔

واضح ہے کہ ہڈیاں بوسیدہ ہو کر خاک ہو جاتی ہیں اور مٹی میں ہمیشہ آثارِ حیات ہوتے ہیں۔ نباتات خاک ہی سے اُگتے ہیں۔ زندہ موجودات خاک ہی میں پرورش پاتے ہیں اور انسانی وجود کی اصل بھی خاک ہے۔ مختصر یہ کہ خاک زندگی کا دروازہ ہے لیکن پتھر، لوہا یا وہ موجودات جو ان سے زیادہ سخت ہیں ان کا فاصلہ زندگی سے بہت زیادہ ہے۔ نباتات کبھی پتھر اور لوہے سے نہیں پھوٹتے مگر قرآن کہتا ہے کہ قدرتِ خدا کے سامنے یہ بات اہم نہیں، تم جو کچھ بھی ہو اور جو کچھ بھی ہو جاؤ تمہاری طرف زندگی لوٹا دینا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں۔

پتھر بوسیدہ ہو کر خاک میں بدل جاتے ہیں اور پھر مٹی کے پسینے سے زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ لوہا بھی بوسیدہ ہو کر پراگندہ ہو جاتا ہے اور پھر اس کرۂ خاکی کے دوسرے موجودات سے مل کر مبداءِ حیات بن جاتا ہے۔

اس زمین میں ہم جس موجود کا بھی تصور کریں، وہ معدنیات میں سے ہو یا معدنیات سے مشابہ کسی چیز سے انسانی بدن کی عمارت میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ چیز نشاندہی کرتی ہے کہ اس عالم کے تمام ذرات میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ موجودِ زندہ میں تبدیل ہو جائے اگرچہ ان میں سے بعض کسی مرحلے میں زندگی سے زیادہ قریب ہوتے ہیں مثلاً مٹی اور بعض نسبتاً دور ہوتے ہیں مثلاً پتھر اور لوہا۔

ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ اچھا اگر ہم مان لیں کہ یہ بوسیدہ اور منتشر ہڈیاں پھر زندگی حاصل کر سکتی ہیں تو یہ کام انجام دینے کی قدرت کس میں ہے؟ وہ یہ اس لیے کہتے تھے کیونکہ وہ اس تبدیلی کو ایک نہایت پیچیدہ اور مشکل امر سمجھتے تھے۔ "وہ کہتے تھے کون انہیں پلٹائے گا" (فسیقولون من یعیدنا)۔

اس سوال کا جواب قرآن اس طرح دیتا ہے: ان سے کہو کہ وہی جس نے پہلی مرتبہ تمہیں پیدا کیا تھا (قل الذی ـــــ فطرکم اول مرۃ)۔

اگر "قابل" کی قابلیت میں تمہیں شک ہے تو سوچو کہ تم پہلے بھی تو خاک تھے، پھر اب کیا رکاوٹ ہے کہ پھر خاک بننے کے بعد تمہیں زندگی دے دی جائے؟ اگر "فاعل" کی فاعلیت میں شک ہے تو وہی خدا جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا وہ پھر بھی یہ کام کر سکتا ہے کیونکہ:

حکم الامثال فیما یجوز وفیما لا یجوز واحد

ہم مثل چیزوں کے جائز اور ناجائز کا فیصلہ ایک جیسا ہوتا ہے۔

آخر میں ان کا تیسرا اعتراض بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ تعجب اور انکار کرتے ہوئے اپنا سر ہلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قیامت کب برپا ہو گی (فسینغضون الیک رءوسھم ویقولون متٰی ھو)۔

* سینغضون۔ "انغاض" کے مادہ سے کسی مقابل شخص کی جانب تعجب سے سر ہلانے کے معنی میں ہے۔

اس اعتراض سے ان کی مراد یہ تھی کہ فرض کریں یہ مادۂ خاکی انسان میں تبدیل ہونے کے قابل ہے اور یہ بھی مان لیں کہ خدا میں یہ قدرت ہے لیکن یہ تو ایک ادھار والے وعدے سے زیادہ بات نہیں ہے اور معلوم نہیں کہ قیامت کب واقع ہوگی، اگر ہزاروں یا لاکھوں سال بعد ہوئی تو ہماری آج کی زندگی میں اس کا کیا اثر ہوگا، نقد بات کرو ادھار کی بات چھوڑو۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: ان سے کہہ دو: اس کا زمانہ قریب ہے (قل عسٰی ان یکون قریبا)۔ قیامت کی گھڑی قریب ہی ہے کیونکہ اس عالم کی مجموعی عمر کتنی ہی کیوں نہ ہو دوسرے جہان کی بے پایاں زندگی کے مقابلے میں تو جلدی گزر جانے والے ایک لمحے سے زیادہ نہیں ہے۔

اس سے قطع نظر اگر قیامت ہمارے چھوٹے اور محدود معیار کے مطابق دور بھی ہو تو بھی قیامت کا آستانہ ـــ یعنی موت ـــ ہم سب کے قریب ہے۔ کیونکہ موت قیامت صغریٰ ہے:

اذا مات الانسان قامت قیامته

جب انسان کو موت آجاتی ہے تو اس کے لیے قیامت واقع ہو جاتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ موت قیامت کبریٰ نہیں ہے لیکن اس کی یاد تو دلاتی ہے۔

ضمنی طور پر "عسٰی" کی تعبیر شاید اس طرف اشارہ ہو کہ کوئی شخص دقیقاً قیامت کی تاریخ نہیں جانتا اور یہ ان علوم میں سے ہے جو ذات پروردگار سے مخصوص ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی بھی اس سے آگاہ نہیں۔

اگلی آیت میں قیامت کی متعین تاریخ ذکر کیے بغیر اس کی بعض خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: زندگی کی طرف یہ بازگشت اس دن ہوگی جب دن تمہیں تمہاری قبروں سے پکارا جائے گا اور تم چاہو یا نہ چاہو اس کی دعوت پر لبیک کہو گے اور خدا کی حمد و ثنا کرتے ہوئے زندگی کی طرف پلٹ آؤ گے (یوم یدعوکم فتستجیبون بحمده)۔

اور وہ ایسا دن ہے کہ تم موت اور قیامت کے درمیان کے فاصلہ (دور برزخ) کو کم سمجھو گے اور خیال کرو گے کہ برزخ میں تو تم تھوڑی سی مدت ہی رہے ہو (وتظنون ان لبثتم الا قلیلا)۔ اگرچہ یہ طولانی ہو لیکن عالم بقاء کی بے انتہا عمر کے مقابلے میں چند جلدی سے گزر جانے والے لمحات سے زیادہ نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ دنیا میں توقف کی طرف اشارہ ہے یعنی وہ دن کہ جب تم جان لو گے کہ دنیاوی زندگی کوئی زیادہ طولانی نہ تھی چند مختصر سی زود گزر گھڑیاں تھیں۔

(۵۳) وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ○

(۵۴) رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۭ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ○

(۵۵) وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰي بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ○

(۵۶) قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ○

(۵۷) اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ○

ترجمہ

(۵۳) میرے بندوں سے کہہ دو: ایسی بات کریں کہ جو زیادہ اچھی ہو کیونکہ شیطان (ناموزوں باتوں کے ذریعے) ان کے درمیان فتنہ و فساد کھڑا کر دیتا ہے۔ شیطان ہمیشہ انسان کا کھلا دشمن رہا ہے۔

(۵۴) تمہارا پروردگار (تمہاری نیتوں اور اعمال کو) تم سے زیادہ جانتا ہے اگر وہ چاہے (اور تمہیں اس لائق سمجھے) تو اپنی رحمت تمہارے شاملِ حال کر دے اور اگر چاہے

تو عذاب دے اور ہم نے تجھے ان پر وکیل نہیں بنایا (کہ تیرے لیے لازم ہو کہ وہ جبراً ایمان لے آئیں)۔

(۵۵) وہ تمام لوگ کہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں ان کے حالات سے تیرا پروردگار زیادہ آگاہ ہے (اور اگر ہم نے تجھے دوسروں پر فضیلت بخشی ہے تو وہ تیری اہلیت کی وجہ سے ہے)۔ ہم نے بعض نبیوں کو بعض دوسرے نبیوں پر فضیلت عطا کی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی ہے۔

(۵۶) ان سے کہہ دو: تم نے خدا کے علاوہ جو (اپنے معبود) بنا رکھے ہیں انہیں پکار کر دیکھو، وہ تمہاری کوئی مشکل حل نہیں کرسکتے اور نہ اس میں کوئی تبدیلی لاسکتے ہیں۔

(۵۷) وہ تو وہ ہیں جو خود اپنے پروردگار سے (تقرب کا) وسیلہ طلب کرتے ہیں، ایسا وسیلہ جو زیادہ قریب ہو اور یہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ سب تیرے پروردگار کے عذاب سے بچنے کی فکر میں اور وحشت زدہ ہیں۔

تفسیر

تمام مخالفین سے منطقی طرزِ عمل

گزشتہ آیات میں مبداء و معاد کے بارے میں گفتگو تھی اور ان دو اہم عقائد کے بارے میں دلائل پیش کیے گئے تھے۔ زیر بحث آیات میں مخالفین خصوصاً مشرکین کے ساتھ گفتگو اور استدلال کے آداب سکھائے گئے ہیں کیونکہ مکتب جتنا بھی عالی ہو اور منطق جتنی بھی قوی ہو اگر بحث و گفتگو صحیح طریقے اور لطف و محبت کی بجائے خشونت و سختی پر مبنی ہوگی تو بے اثر ہو کر رہ جائے گی۔

لہٰذا پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: میرے بندوں سے کہہ دو کہ ایسی گفتگو کریں جو بہت اچھی ہو (و قل لعبادی یقولوا التی ھی احسن)۔ ان کی گفتگو مضمون کے لحاظ سے، طرزِ بیان کے لحاظ سے، اخلاق کے حوالے سے انسانی آداب کے حوالے سے بہترین ہو۔

کیونکہ اگر انہوں نے "قولِ احسن" کو ترک کر دیا اور کلام میں خشونت، سختی اور ہٹ دھرمی ہوئی تو شیطان ان کے درمیان فتنہ و فساد اُٹھا دے گا (ان الشیطان ینزغ بینھم)۔

اور یہ بات کبھی فراموش نہ کرو کہ شیطان کمین لگائے بیٹھا ہے اور چین سے نہیں بیٹھا، کیونکہ شیطان شروع ہی سے نوعِ انسان کا کُھلا دشمن ہے" (ان الشیطان کان للانسان عدوًّا مبینًا)۔

اس آیت میں لفظ "عباد" سے کون لوگ مراد ہیں، اس سلسلے میں مفسرین میں دو مختلف نظریے ہیں۔ بعض قرائن سے ان میں سے ہر ایک کی تائید ہوتی ہے۔

۱۔ "عباد" سے مراد مشرک بندے ہیں اگرچہ انہوں نے غلط راہ اختیار کر رکھی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے انسانی جذبات کی تحریک کے لیے انہیں "عبادی" (میرے بندے) سے یاد کیا ہے اور انہیں دعوت دی ہے کہ وہ "احسن" یعنی توحید اور نفیِ شرک کا راستہ اختیار کریں اور شیطانی وسوسوں سے خبردار رہیں۔

گویا ان آیات کا مقصد یہ ہے کہ توحید و معاد کے دلائل پیش کرنے کے بعد مشرکین کے دلوں کو اپیل کی جائے تاکہ ان میں سے جو تھوڑی بہت آمادگی رکھتے ہیں وہ بیدار ہو جائیں اور راہِ راست پر آجائیں۔

یہ سورہ مکی ہے اور اُس وقت ابھی جہاد کا حکم نازل نہیں ہوا تھا اور اس صورت میں منطق و استدلال کے علاوہ ان سے مقابلے کا اور کوئی راستہ نہ تھا اس حوالے سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔

۲۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ لفظ "عبادی" مومنین کی طرف اشارہ ہے اور انہیں دشمنوں سے بحث کرنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے کیونکہ بعض اوقات نووارد مومنین اپنے پہلے والے طرزِ عمل ہی کا مظاہرہ کرتے، اپنے عقیدے کے ہر مخالف سے سخت رویہ اختیار کرتے، انہیں صراحت سے اہلِ جہنم، اہلِ عذاب، بدبخت اور گمراہ کہتے پھرتے اور اپنے تئیں اہلِ نجات قرار دیتے۔ اس سے رسول اللہؐ کی دعوت کے بارے میں مخالفین میں ایک منفی ردِّعمل جنم لیتا۔

اس سے قطع نظر بعض اوقات مخالفین رسول اللہؐ کے بارے میں جو توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے اس پر بھی مومنین بے اختیار ہو کر انہیں سخت سست کہتے تھے۔ جیسا کہ گزشتہ آیات میں گزر چکا ہے۔ مخالفین رسول اللہؐ کے لیے مسحور، مجنون، کاہن اور شاعر جیسے الفاظ کہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ بعض مومنین بھی ان سے جھگڑ پڑتے اور جو منہ میں آتا کہہ ڈالتے۔ قرآن مومنین کو اس طرزِ عمل سے روکتا ہے اور انہیں دعوت دیتا ہے کہ نرمی و لطافت سے جواب دیں اور بحث و گفتگو میں بہترین الفاظ استعمال کریں تاکہ شیطانی نقصان سے بچ جائیں۔

اس تفسیر کے مطابق لفظ "بینھم" (ان کے درمیان)، کا مفہوم یہ ہوگا کہ شیطان کوشش کرتا ہے کہ مومنین اور مخالفین کے درمیان فتنہ و فساد پیدا کر دے یا کوشش کرتا ہے کہ مومنین میں غیر محسوس طور پر نفوذ کرے اور انہیں فتنہ و فساد پر ابھارے۔ کیونکہ "ینزغ" "نزغ" کے مادہ سے فساد کروانے کی نیت

سے کسی کام میں مداخلت کرنے کے معنی میں ہے۔

لیکن تمام قرآن کو ملحوظ نظر رکھا جائے تو دوسری تفسیر ظاہر آیت سے زیادہ میل کھاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کیونکہ عام طور پر لفظ "عبادی" قرآن میں مومنین کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں بعض مفسرین نے اس آیت کی جو شان نزول نقل کی ہے اس میں ہے کہ مکہ میں مشرکین اصحاب رسولؐ کو اذیت دیتے تھے تو گاہے دل تنگی کے عالم میں اصحاب رسول اللہؐ سے اصرار کرتے تھے کہ ہمیں جہاد کی اجازت دی جائے (یا پھر گفتگو میں سخت کلامی اور جیسا سوال ویسا جواب کی اجازت دی جائے) اس پر رسول خدا فرماتے تھے کہ ابھی تک مجھے ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ اس موقع پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انہیں حکم دیا گیا کہ صرف منطقی گفتگو سے جواب دینے کا اسلوب جاری رکھیں [1]

بعد والی آیت مزید کہتی ہے: تمہارا پروردگار تمہارے حالات سے زیادہ آگاہ ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنی رحمت تمہارے شامل حال کردے اور اگر چاہے تو تمہیں سزا دے (ربکم اعلم بکم ان یشأ یرحمکم او ان یشأ یعذبکم)۔

پہلی آیت کی دو تفسیروں کے پیش نظر اس آیت کی بھی دو تفسیریں ممکن ہیں:

پہلی یہ کہ اے مشرکین اور اے تہی از ایمان لوگو! تمہارا خدا وسیع رحمت بھی رکھتا ہے اور دردناک عذاب بھی۔ تمہیں وہ جس لائق سمجھے گا وہ سلوک کرے گا۔ کیا ہی بہتر ہے کہ تم اس کی وسیع رحمت کے سائے میں آجاؤ اور اس کے عذاب سے بچو۔

دوسری یہ کہ اے اہل ایمان! یہ گمان نہ کرو بس تمہی اہل نجات ہو اور دوسرے سب اہل جہنم ہیں۔ خدا تمہارے اعمال اور قلوب سے زیادہ آگاہ اور باخبر ہے اگر چاہے تو تمہارے گناہوں کے سبب تمہیں عذاب دے اور چاہے تو اپنی رحمت تمہارے شامل حال کردے۔ اپنی حالت پر غور و فکر کرو اور اپنے اور دوسروں کے درمیان عدل و انصاف سے فیصلہ کرو۔

بہرحال آیت کے آخر میں روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے۔ آپؐ کی دلجوئی کی گئی ہے اور مشرکین کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے آپؐ کے انتہائی رنج کو دور کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: ہم نے تجھے ان پر وکیل نہیں بنایا کہ تم یہ سمجھو کہ انہیں لازمی طور پر ایمان لانا چاہیئے (وما ارسلناك علیھم وکیلا)۔ تیری ذمہ داری تو یہ ہے کہ انہیں نیکی بندوں حق کی طرف دعوت دو اور اپنی جدوجہد جاری رکھو۔ اگر وہ ایمان لے آئیں تو بہت خوب ورنہ تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تو نے تو اپنا فریضہ ادا کردیا۔

اس جملے میں مخاطب اگرچہ رسول اللہؐ کی ذات ہے لیکن بعید نہیں کہ قرآن کے ایسے دیگر بہت سے

---

[1] مجمع البیان اور تفسیر قرطبی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

مقامات کی طرح مراد تمام مومنین ہوں۔ یہ بات دوسری تفسیر کی تائید میں ایک اور قرینہ ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ تم مسلمانوں کی ذمہ داری حق کی طرف دعوت دینا ہے چاہے وہ ایمان لائیں یا نہ لائیں لہٰذا گفتگو میں سختی اور توہین و ہتک کا طریقہ اختیار کرنے اور اس طرح حد سے زیادہ جوش و خروش دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اگلی آیت اس سے بھی بڑھ کر بات کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ، خدا تمہارے ہی حالات سے آگاہ نہیں بلکہ ، تیرا پروردگار آسمان اور زمین کے سب باسیوں کی نسبت زیادہ آگاہ ہے اور زیادہ علم رکھتا ہے (وربك اعلم بمن فی السماوات والارض)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : ہم نے بعض نبیوں کو بعض دیگر نبیوں پر فضیلت بخشی ہے اور داؤد کو زبور عطا کی ہے (ولقد فضلنا بعض النبیین علی بعض واتینا داوُد زبورًا)۔

یہ جملہ درحقیقت مشرکین کے ایک اعتراض کا جواب ہے۔ وہ نہایت تحقیر انداز میں کہتے تھے کہ کیا خدا کے پاس اور کوئی شخص نہ تھا کہ اس نے ایک یتیم محمد کو نبوت کے لیے انتخاب کیا اور اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ اسے تمام انبیاء کا سردار اور خاتم النبیین قرار دے دے۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے ، خدا ہر شخص کے انسانی مقام اور قدر و قیمت سے آگاہ ہے اور انہی عام لوگوں میں سے اپنے انبیاء کو منتخب کرتا ہے اور اس نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ کسی کو خلیل کے اعزاز سے نوازا ، کسی کو کلیم اللہ کا مقام عطا کیا ، کسی کو روح اللہ قرار دیا اور پیغمبر اسلام کو حبیب اللہ کی حیثیت سے چن لیا۔ خلاصہ یہ کہ اس نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور یہ فضیلت اس نے ان معیاروں کے مطابق عطا کی ہے جنہیں وہ خود جانتا ہے اور جو اس کی حکمت کے مطابق ہیں۔

رہا یہ سوال کہ سب انبیاء میں سے یہاں صرف حضرت داؤد کو زبور عطا کرنے کی بات کیوں کی گئی ہے ، ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ پہلو ہوں :

۱۔ کتبِ انبیاء میں حضرت داؤد کی زبور کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ تمام تر مناجات ، دعاؤں اور پند و نصیحت پر مشتمل ہے اور تمام تر "قولِ احسن" اور اچھی گفتگو کا نمونہ ہے کہ جس کا حکم پہلی آیات میں دیا گیا ہے یہ کتاب اس حکم سے سب سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

۲۔ زبور داؤد میں صالحین اور نیک بندوں کی حکومت کی خبر دی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ اگرچہ وہ لوگ ظاہراً تہی دست ، فقیر اور یتیم ہوں گے[1]

---

[1] [illegible] زبور داؤد [illegible] اور دسترس میں ہے اس کے مزمور ۳۷ میں ہے :
..... کیونکہ شریر منقطع ہو جائیں گے لیکن اللہ پر توکل کرنے [illegible] وارث ہوں گے۔ [illegible] ایک عرصے بعد شریر باقی نہ [illegible]
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور یہ بات رسول اللہؐ اور سچے مومنین کی دعوت سے بالکل ہم آہنگ ہے کہ جو بہت تہی دست تھے اور یہ مشرکین کے اعتراض کا جواب ہے۔

۳۔ حضرت داؤد علیہ السلام اگرچہ وسیع حکومت کے مالک تھے لیکن خدا تعالیٰ اس بات کو ان کے لیے اعزاز و افتخار قرار نہیں دیتا بلکہ کتاب زبور کو ان کے لیے اعزاز شمار کرتا ہے تاکہ مشرکین جان لیں کہ ایک انسان کی عظمت کا معیار مال و دولت اور ظاہری اقتدار و حکومت نہیں ہے لہٰذا یتیم اور غریب ہونا تحقیر و تذلیل کی دلیل نہیں ہے۔

۴۔ یہودی کہتے تھے کہ موسیٰ کے بعد کسی کتاب کا نازل ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس پر قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ جبکہ ہم نے داؤد کو زبور عطا کی تو تم نزولِ قرآن کے بارے میں کیوں تعجب کرتے ہو (البتہ حضرت داؤد علیہ السلام کی کتاب احکام کی کتاب نہ تھی بلکہ اخلاق کی کتاب تھی لیکن جو کچھ بھی تھی تورات کے بعد اور خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھی)۔

بہرحال کوئی مانع نہیں کہ زیر بحث آیت میں تمام انبیاء اور تمام کتب میں سے حضرت داؤدؑ اور زبور کا انتخاب ان مذکورہ چاروں پہلوؤں کی بناء پر ہو۔

بعد والی آیت میں پھر مشرکین کے بارے میں گفتگو ہے۔ گزشتہ مباحث کو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اکرمؐ سے فرمایا گیا ہے: ان سے کہو کہ خدا کے علاوہ جن معبودوں کو لائق پرستش سمجھتے ہیں انہیں صدا دیں۔ نہ ان کے بس میں یہ ہے کہ وہ تمہاری مشکلات اور مصائب دور کر سکیں اور نہ ہی ان میں کوئی تغیر و تبدل پیدا کر سکتے ہیں (قل ادعوا الذین زعمتم من دونه فلا یملکون کشف الضر عنکم ولا تحویلاً)۔

درحقیقت یہ آیت قرآن کی دیگر بہت سی آیات کی طرح مشرکین کے عقیدے اور منطق کو اس حوالے سے باطل قرار دیتی ہے کہ معبودوں کی پرستش یا تو حصولِ مفاد کے لیے ہے یا دفعِ نقصان کے لیے جبکہ ان کے تو بس میں نہیں کہ کسی کی مشکل کو ٹال سکیں یہاں تک کہ وہ تو کسی مشکل میں کوئی تبدیلی بھی پیدا نہیں کر سکتے یعنی اس کی شدت میں کمی بھی نہیں کر سکتے کہ جس سے ان کی کوئی قدرت ظاہر ہو سکے۔ لہٰذا "فلا یملکون کشف الضر" کے بعد "ولا تحویلاً" اس طرف اشارہ ہے کہ وہ نہ تو مشکلات کی پوری تاثیر برطرف کر سکتے ہیں نہ ان میں تغیر کر کے کچھ تھوڑی تاثیر کم کر سکتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ: رہے گا تو اس کے بارے میں سوچ بچار کرے گا اور وہ نہیں ہو گا لیکن اہلِ حکمت (صالحین) زمین کے وارث ہوں گے۔

اسی مزمور کے بائیسویں اور انتیسویں جملے میں اس سے بالکل مشابہ تعبیرات موجود ہیں۔ یہی بات قرآن مجید کی سورہ انبیاء کی آیہ ۱۰۵ میں ہے:

ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثها عبادی الصالحون

ہم نے زبور میں یہ بات رقم کی ہے کہ کچھ موعظے بعد ہمارے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے۔

"زعمتم" "زعم" کے مادہ سے ہے اور عام طور پر غلط خیال و تصور کو کہا جاتا ہے۔ اسی لیے ابن عباس سے منقول ہے کہ جہاں کہیں قرآن میں لفظ "زعم" استعمال ہوا ہے جھوٹ اور کذب (اور بے بنیاد عقیدہ) کے معنی میں ہے۔

مفردات میں راغب کہتا ہے:

الزعم حکایة قول یکون مظنة للکذب ....

زعم نقلِ قول (یا عقیدہ) ہے کہ جس میں جھوٹ کا احتمال ہو یہ قرآن میں جن جن مواقع پر استعمال ہوا ہے وہاں مذمت و سرزنش کا پہلو لیے ہوتے ہے۔

لفظ "کشف" اصل میں کسی چیز سے پردہ، لباس یا ایسی کسی چیز کو ہٹانے کے معنی میں ہے اور یہ جو "کشف الضر" غم و اندوہ، بیماری یا پریشانی برطرف ہونے کے موقع پر بولا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ غم و اندوہ، بیماری یا پریشانی انسانی بدن اور روح پر گویا پردے کی طرح آگرتی ہے اور آسائش، آرام اور سکون کہ جو حقیقی چہرہ ہے، اسے چھپا دیتی ہے لہٰذا غم، دکھ اور پریشانی کے دور ہونے کو "کشف الضر" کہا جاتا ہے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ اس آیت میں "الذین" کی تعبیر یہ بات بیان کرتی ہے کہ مراد اللہ کے علاوہ سب معبود نہیں ہیں بلکہ فرشتے، حضرت عیسیٰ اور ان جیسے معبود مراد ہیں (کیونکہ "الذین" عام طور پر ذوی العقول کی جمع کے لیے بولا جاتا ہے)۔

بعد والی آیت درحقیقت پہلی آیت میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کے لیے دلیل ہے۔ یہ آیت کہتی ہے: جانتے ہو کہ تمہاری مشکلوں کو اذن پروردگار کے بغیر ٹالنے پر کیوں قادر نہیں ہیں، اس لیے کہ وہ تو خود اپنی مشکلات بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتے ہیں۔ وہ خود کوشش کرتے ہیں کہ اس کی پاک ذات کا تقرب حاصل کریں اور وہ جو کچھ بھی چاہتے ہیں اسی سے چاہتے ہیں" وہ ایسے افراد ہیں جو خدا کو پکارتے ہیں اور اس کے تقرب کے لیے اس کی اطاعت کو وسیلہ بناتے ہیں" (اولٰئک الذین یدعون یبتغون الٰی ربھم الوسیلة)۔ "ایسا وسیلہ جو قریب ترین ہو" (ایھم اقرب)۔ "اور اس کی رحمت کے امیدوار ہیں" (ویرجون رحمته)۔" اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں" (ویخافون عذابه)۔ "کیونکہ تیرے پروردگار کا عذاب اس قدر شدید ہے کہ سب اس سے بچتے ہیں اور وحشت زدہ ہیں" (ان عذاب ربك كان محذورًا)۔

اسلام کے عظیم مفسرین نے "ایھم اقرب" کی مختلف تفسیریں کی ہیں:

بعض کہتے ہیں: یہ اولیاء خدا فرشتے ہوں یا انبیاء، ان میں سے جسے بھی معبود سمجھا گیا جتنا وہ اللہ کے زیادہ نزدیک ہے اتنا ہی مزید بارگاہ الٰہی میں تقرب کے درپے ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے پاس اپنی طرف سے کچھ نہیں ہے جو کچھ بھی ہے خدا کی طرف سے ہے اور ان کا مقام و منزلت جتنا بلند ہوتا جاتا ہے ان

کی طرف سے اطاعت و بندگی اتنی ہی زیادہ ہوتی جاتی ہے [1]

بعض کا نظریہ ہے کہ جملے کا مفہوم یوں ہے: وہ کوشش کرتے ہیں کہ تقرب پروردگار میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں۔ گویا اطاعتِ پروردگار اور تقربِ الٰہی کے راستے میں وہ ایک روحانی مقابلے میں شریک ہیں اور ہر ایک کی کوشش ہے کہ اس میدان میں دوسرے پر بازی لے جائے۔ وہ لوگ جو ایسے ہوں کیا وہ معبود ہو سکتے ہیں اور کیا وہ خدا سے ہٹ کر کوئی ذاتی حیثیت رکھتے ہیں؟ [2]

رہی یہ تفسیر کہ وہ ہر اُس وسیلہ سے تقرب الٰہی چاہتے ہیں جو خدا کے زیادہ قریب ہو، بہت بعید احتمال ہے کیونکہ "ایھم" میں "ھم" کی ضمیر کہ جو عام طور پر جمع مذکر کے لیے ہوتی ہے اس معنی سے مناسبت نہیں رکھتی بلکہ اس طرح تو "ایھا" ہونا چاہیئے تھا۔ [3]

"وسیلہ" کیا ہے؟

لفظ "وسیلہ" قرآن مجید میں دو مواقع پر استعمال ہوا ہے۔ ایک آیاتِ بالا میں اور دوسرا سورہ مائدہ کی آیہ ۳۵ میں۔

جیسا کہ ہم سورہ مائدہ کی آیہ ۳۵ کے ذیل میں کہہ چکے ہیں "وسیلہ" قرب حاصل کرنے کے معنی میں یا اُس چیز کے معنی میں جو قرب کا باعث بنے استعمال ہوتا ہے یا پھر اس کا مطلب ہے وہ نتیجہ جو قرب سے حاصل ہو۔

اس طرح سے "وسیلہ" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں ہر اچھا کام اور ہر اچھی صفت شامل ہے کیونکہ یہ سب چیزیں قربِ پروردگار کا موجب ہیں۔

نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۱۰ میں اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام کے اشتیاق پر معنز جملے ہیں:

> بہترین وسیلہ کہ جس سے بندے قربِ خدا چاہتے ہیں خدا پر ایمان، قیام نماز، ادائیگی زکوٰۃ، ماہِ رمضان کے روزے، حج و عمرہ، صلۂ رحمی، راہِ خدا میں پنہاں و آشکار انفاق اور تمام نیک اعمال ہیں کہ جو انسان کو زوال اور پستی سے

---

[1] اس تفسیر کے مطابق "ایھم" "یبتغون" کی ضمیر کا بدل ہے یا کسی محذوف کا مبتدا ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا:
"ایھم اقرب ھو اکثر دعاءً وابتغاءً للوسیلۃ"

[2] اس صورت میں "ایھم" صرف "یبتغون" کی ضمیر کا بدل ہی ہو سکتا ہے۔

[3] اس سے قطع نظر "ایھم اقرب" [illegible] معنی کے مطابق مفعول کی صورت میں یا مفعول سے جمل کی شکل میں ہونا چاہیئے۔ (غور کیجئے گا)۔

نجات دیں [1]

اسی طرح نبیوں، خدا کے نیک بندوں اور اس کی بارگاہ کے مقرب لوگوں کی شفاعت بھی اس کے تقرب کا ایک وسیلہ ہے اور اس شفاعت کو آیاتِ قرآن میں صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔

غلط فہمی نہ ہو — بارگاہِ پروردگار کے مقرب لوگوں سے توسل سے یہ مراد نہیں کہ انسان نبی یا امام سے مستقلاً تقاضا کرے یا اس مفہوم میں ان سے کسی مشکل کا حل چاہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کے راستے پر چلے، اُن کے پروگراموں سے ہم آہنگ ہو جائے اور ان کے مقام و منزلت کا واسطہ دے کر خدا کو پکارے تاکہ خدا شفاعت و سفارش کی اجازت دے بخشے [2]

---

[1] تلخیص خطبہ ۱۱۰ نہج البلاغہ۔ اس کی تشریح ہم تفسیر نمونہ جلد ۴ صفحہ ۲۷۹ (اُردو ترجمہ) پر کر چکے ہیں۔

[2] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۴ صفحہ ۲۷۴ (اُردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

۵۸ وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ○

۵۹ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ○

۶۰ وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ۭ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ○ ع

ترجمہ

۵۸ قیامت سے پہلے ہم ہر شہر اور آبادی کو ہلاک کریں گے یا (اگر گنہگار ہیں تو) انہیں سخت عذاب میں گرفتار کریں گے، یہ کتاب الٰہی (لوح محفوظ) میں ثبت ہے۔

۵۹ ہمارے لیے کوئی امر مانع نہیں کہ ہم (بہانہ ساز لوگوں کے تقاضوں پر) یہ معجزات بھیجتے سوائے اس کے کہ گزرے ہوئے لوگوں نے (کہ جو اسی قسم کے تقاضے کرتے تھے اور انہی جیسے تھے انہوں نے) ان کی تکذیب کی۔ (انہی میں سے) ثمود کو ہم نے ناقہ دیا (اور وہ ایسا معجزہ تھا کہ) جو واضح اور روشن تھا لیکن انہوں نے اس پر ظلم کیا اور ناقہ کو ہلاک کر دیا) ہم معجزات صرف ڈرانے (اور اتمام حجت) کیلئے بھیجتے ہیں۔

۶۰ وہ وقت یاد کر جب ہم نے تجھ سے کہا کہ تیرا پروردگار لوگوں پر پوری طرح محیط ہے (اور ان کی کیفیت سے پوری طرح آگاہ ہے)۔ ہم نے جو خواب تجھے دکھایا تھا وہ صرف لوگوں کی آزمائش کے لیے تھا۔ اسی طرح جس شجرِ ملعونہ کا ہم نے قرآن میں ذکر کیا ہے، ہم انہیں ڈراتے (اور تنبیہ کرتے) ہیں لیکن ان کے طغیان و سرکشی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں ہوتا۔

تفسیر

بہانہ سازوں کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرو

پہلے مشرکین سے توحید و معاد کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیرِ بحث پہلی آیت میں بیدار کرنے کے انداز میں انہیں پند و نصیحت کی گئی ہے۔ اس میں ان کی نگاہِ عقل کے سامنے اس دنیا کے فانی ہونے کو مجسم کیا گیا ہے تاکہ وہ جان لیں کہ یہ دنیا سرائے فانی ہے اور سرائے بقا کوئی دوسری جگہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال کے نتائج کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرلیں۔ ارشاد ہوتا ہے: روئے زمین پر کوئی ایسی آبادی نہیں جسے روزِ قیامت سے قبل ہم ہلاک نہ کردیں یا اسے عذابِ شدید میں گرفتار نہ کریں (وان من قریة الا نحن مھلکوھا قبل یوم القیامة او معذبوھا عذابًا شدیدًا)۔ ستمگروں، بدکاروں اور سرکش باغیوں کو عذابِ شدید کے ذریعے ہلاک کردیں گے اور دوسرے طبعی موت یا عام حوادث کا سامنا کریں گے۔

آخرکار یہ دنیا ختم ہو جائے گی اور سب راہِ فنا اختیار کریں گے اور یہ ایک تسلیم شدہ اور قطعی اصول ہے کہ جو کتابِ الٰہی میں ثبت ہے (کان ذٰلک فی الکتاب مسطورًا)۔ یہ کتاب وہی لوحِ محفوظ، پروردگار کا علمِ بے پایاں اور عالمِ ہستی میں اس کے ناقابلِ تغیّر قوانین کا مجموعہ ہے۔ اس قطعی اور ناقابلِ تغیر کتابِ الٰہی کی طرف توجہ کرتے ہوئے گمراہوں، ستمگروں اور آلودہ مشرکین کو ابھی سے اپنے اعمال کے انجام کا اندازہ کرلینا چاہیئے۔ انہیں جان لینا چاہیئے کہ اگر وہ اس جہان کے اختتام تک بھی زندہ رہے تو بھی آخرکار ان کے لیے فنا ہے اور اس کے بعد انہیں حساب اور جزا و سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یہاں مشرکین کا ایک اعتراض باقی رہ جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اچھا، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہم ایمان لے آئیں گے لیکن ایک شرط کے ساتھ اور وہ یہ کہ ہم جس معجزے کی فرمائش کریں پیغمبرِ اسلام وہ پیش کریں اور

درحقیقت ہمارے عذر بہانوں کے سامنے سر جھکا دیں۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: اس چیز میں ہمارے لیے کوئی امر مانع نہیں کہ ہم اس قسم کے معجزات بھیجیں، سوائے اس کے کہ گزشتہ لوگوں نے ان معجزات کی تکذیب کی تھی (وما منعنا ان نرسل بالاٰیات الا ان کذب بھا الاولون)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ معجزات جو صداقت پیغمبر کی دلیل ہیں کافی مقدار میں بھیجے جا چکے ہیں اور اب تمہارے من پسند کے معجزات اور تقاضے ایسے نہیں کہ جن سے موافقت کی جائے کیونکہ تم شاہدٌ کے بعد بھی ایمان نہیں لاؤ گے۔ اگر تم پوچھو کہ اس کی دلیل کیا ہے تو اس کی دلیل ان گزشتہ امتوں کا طرزِ عمل ہے جن کی حالت بالکل تم جیسی تھی وہ بھی بہانے تراشتے اور طرح طرح کے تقاضے کرتے تھے لیکن بعد میں وہ ایمان نہ لائے۔

اس کے بعد قرآن اس کی ایک واضح مثال پیش کرتا ہے: ہم نے قوم ثمود کو ایک ناقہ دیا کہ جو واضح کرنے والا تھا (واٰتینا ثمود الناقۃ مبصرۃ)۔

یہ وہی اونٹنی تھی جو حکم الٰہی سے پہاڑ سے برآمد ہوئی تھی کیونکہ انہوں نے ایسا ہی معجزہ طلب کیا تھا۔ یہ ایک واضح اور واضح کرنے والا معجزہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ ایمان نہ لائے۔ "انہوں نے اس ناقہ پر ظلم کیا" اور اسے قتل کر دیا (فظلموا بھا)۔

اصولی طور پر ہمارا یہ پروگرام نہیں کہ جو شخص بھی کسی معجزے کی فرمائش کرے ہمارا پیغمبر اسے قبول کرلے ہم تو لوگوں کو سوائے متنبہ کرنے اور ان پر اتمام حجت کرنے کے، آیات و معجزات نہیں بھیجتے (وما نرسل بالاٰیات الا تخویفا)۔ ہمارے انبیاء معجزہ گر لوگ نہیں کہ بیٹھ جائیں اور جو شخص بھی کوئی فرمائش معجزہ کرے اسے پورا کرتے رہیں۔ ان کا فریضہ بس یہ ہے کہ لوگوں تک دعوتِ الٰہی پہنچائیں، تعلیم و تربیت کریں اور حکومتِ عدل قائم کریں البتہ خدا سے اپنے رابطے کے اثبات کے لیے اس قدر معجزے پیش کریں کہ جو کافی ہوں اور بس۔

اس کے بعد دشمنوں کی سختی اور ہٹ دھرمی کے مقابلے میں، خدا تعالیٰ اپنے رسولؐ کی دلجوئی کرتا ہے اور کہتا ہے: تیری باتیں سُن کر اگر یہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ایمان نہیں لاتے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ وہ وقت یاد کر جب ہم نے تجھ سے کہا تھا کہ تیرا پروردگار لوگوں کی کیفیت سے بخوبی آگاہ ہے اور ان پر احاطۂ علمی رکھتا ہے (واذ قلنا لک ان ربک احاط بالناس)۔

ہمیشہ یہ ہوا کہ انبیاء کی دعوت سُن کر کچھ پاک دل لوگ ایمان لے آئے جبکہ متعصب اور ہٹ دھرم لوگ بہانہ تراشی، مخالفت اور دشمنی کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ گزشتہ زمانے میں بھی ایسا ہی تھا اور اب بھی ویسا ہی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : ہم نے جو خواب تجھے دکھایا وہ صرف لوگوں کی آزمائش کے طور پر تھا (وما جعلنا الرء یا التی اریناک الا فتنة للناس)۔

اسی طرح جس شجرِ ملعونہ کی طرف ہم نے قرآن میں اشارہ کیا ہے وہ بھی لوگوں کی آزمائش کے لیے ہے (والشجرة الملعونة فی القراٰن)۔

آخر میں مزید فرمایا گیا ہے : ان دل کے اندھے اور ہٹ دھرم لوگوں کو ہم مختلف طریقوں سے ڈراتے ہیں لیکن اصلاحی اور تربیتی پروگرام ان کی سرکشی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتے (ونخوفهم فما یزیدهم الاطغیانا کبیرًا)۔

کیونکہ انسان کا دل قبولِ حق کے لیے آمادہ نہ ہو تو نہ صرف یہ کہ حق بات اس پر اثر نہیں کرتی بلکہ عام طور پر اس کا الٹا نتیجہ نکلتا ہے اور ان کی سختی و اصرار کی وجہ سے ان کی گمراہی اور ہٹ دھرمی بڑھ جاتی ہے (غور کیجئے گا)۔

چند اہم نکات

۱۔ رسول اللہؐ کا خواب اور شجرہ ملعونہ : اس " رؤیا " کے بارے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے :

الف۔ کچھ مفسرین کا کہنا ہے کہ " رؤیا " یہاں خواب کے معنی میں نہیں ہے بلکہ آنکھ کا واقعی مشاہدہ ہے۔ ان مفسرین نے اسے واقعۂ معراج کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جس کا ذکر اسی سورہ کی ابتداء میں آیا ہے۔

اس تفسیر کے مطابق قرآن کہتا ہے : معراج کا واقعہ لوگوں کے لیے آزمائش تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب دن چڑھا تو رسول اللہؐ نے لوگوں کو واقعۂ معراج سنایا۔ اس پر بہت شور اٹھا۔ دشمن اس کا مذاق اڑانے لگے۔ کمزور ایمان والے اس پر شک کرنے لگے اور حقیقی مومنین نے اسے مکمل طور پر قبول کر لیا۔ کیونکہ قدرتِ الٰہی کے سامنے یہ سب مسائل معمولی ہیں۔

اس تفسیر پر ایک ہی اہم اعتراض ہے اور وہ یہ کہ لفظ " رؤیا " عام طور پر خواب کے معنی میں ہے نہ کہ جاگتے ہوئے دیکھنے کے معنی میں۔

ب۔ ابنِ عباس سے منقول ہے کہ " رؤیا " اس خواب کی طرف اشارہ ہے جو آپ نے (ہجرت کے چھٹے برس) حدیبیہ کے سال میں مدینہ میں دیکھا تھا اور لوگوں کو بشارت دی تھی کہ تم جلد ہی قریش پر فتح پاؤ گے اور بڑے امن و آرام سے مسجد الحرام میں داخل ہو جاؤ گے لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس سال اس خواب نے عملی صورت اختیار نہ کی بلکہ دو سال بعد فتح مکہ کے موقع پر صورت پذیر ہوا لیکن اتنی تاخیر کی وجہ سے مومنین آزمائش میں سے گزرے اور کمزور ایمان والے شک میں پڑ گئے حالانکہ رسول اللہؐ نے ان سے بالصراحت

فرمایا کہ میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم اس سال مکہ جاؤ گے بلکہ میں نے کہا تھا کہ جلد ایسا ہوگا (اور اسی طرح ہوا) ۔

اس تفسیر پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ سورۂ بنی اسرائیل مکی سورتوں میں سے ہے اور حدیبیہ کا واقعہ ہجرت کے چھٹے سال میں ہوا۔

ج ۔ بعض سُنی اور شیعہ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ یہ ایک مشہور خواب کی طرف اشارہ ہے جس میں رسول اللہؐ نے دیکھا کہ بندر آپؐ کے منبر پر اُچھل کود رہے ہیں۔ اس پر آپؐ بہت غمگین ہوئے اور اس واقعہ کے بعد آپؐ بہت کم ہنستے تھے ۔

(ان بندروں سے بنی امیہ مراد لی گئی ہے ۔ وہ یکے بعد دیگرے رسول اللہؐ کی جگہ اور منبر پر بیٹھے ۔ انہوں نے اس میں ایک دوسرے کی تقلید کی ۔ وہ بے حیثیت افراد تھے ۔ وہ اسلامی حکومت اور خلافتِ رسول اللہؐ کو تباہی کی طرف لے گئے) ۔

یہ تفسیر فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں ، اہل سنت کے مشہور مفسر قرطبی نے تفسیر الجامع میں ، طبرسی نے مجمع البیان میں اور متعدد دیگر مفسرین نے نقل کی ہے ۔

مرحوم فیض کاشانی تفسیر صافی میں کہتے ہیں کہ یہ روایت عامہ اور خاصہ میں مشہور روایات میں سے ہے ۔

البتہ یہ تینوں تفسیریں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں ، ہو سکتا ہے یہ تینوں آیت میں جمع ہوں لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے دوسری تفسیر سورہ کے مکی ہونے سے مناسبت نہیں رکھتی ۔

" شجرۂ ملعونہ " کے بارے میں بھی اسی طرح متعدد تفاسیر ہیں :

۱ ۔ قرآن میں جس " شجرۂ ملعونہ " کا ذکر ہے وہ " شجرۂ زقوم " ہے ۔ یہ وہ درخت ہے جو سورۂ صافات کی آیہ ۶۴ کے مطابق جہنم کی بنیاد میں اُگے گا ۔ اس کا پھل ناگوار اور رنج آور ہوگا ۔ قرآنی الفاظ میں :

اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ۝

یہ وہ درخت ہے جو جہنم کی بنیاد سے اٹھے گا ۔

سورہ دخان کی آیات ۴۶ اور ۴۷ کے مطابق یہ درخت گنہگاروں کی خوراک ہے ۔ یہ اس دنیا کے کھانوں کی طرح نہیں ہے بلکہ یہ پگھلی ہوئی دھات کی طرح دل میں جوش مارے گا ۔ اس کی مکمل تفسیر انشاء اللہ سورہ دخان کی آیات کے ذیل میں آئے گی ۔

اس میں شک نہیں کہ " شجرۂ زقوم " اس دنیا کے درختوں سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا ۔ اسی بناء پر آگ کے اندر سے اُگے گا ۔

واضح ہے کہ اس قسم کے مسائل کہ جو دوسرے جہان سے مربوط ہیں ہمارے لیے تو ایک خیالی تصویر کی طرح

ہیں جیسے دور سے دیکھا جائے تو بس سیاہی سی معلوم ہوتی ہے۔

مشرکین قریش قرآن کی اس تعبیر کا مذاق اڑاتے تھے۔ ابوجہل کہتا تھا:

محمدؐ تمہیں ایسی آگ کی دھمکی دیتاہے جو پتھروں کو جلاتے گی اور اس کا خیال ہے کہ دوزخ میں درخت اُگے گا۔

نیز یہ بھی منقول ہے کہ وہ تمسخر کے طور پر کھجوریں اور مکھن منگواتا، انہیں کھاتا اور اپنے ساتھیوں سے کہتا:

اسے کھاؤ۔ یہی زقوم ہے[1]

اسی بنا پر قرآن زیر بحث آیات میں شجرۂ ملعونہ کا لوگوں کی آزمائش کے ذریعے کے طور پر تعارف کرواتا ہے کیونکہ ہٹ دھرم مشرک اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور سچے مومنین سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

ممکن ہے سوال کیا جائے کہ یہ درخت قرآن میں "شجرہ ملعونہ" کے نام سے نہیں آیا۔ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے مراد کھانے والوں پر لعنت ہو۔ علاوہ ازیں لعنت رحمت خدا سے دوری کے علاوہ کچھ نہیں اور واضح ہے کہ ایسا درخت رحمت پروردگار سے بہت دور ہے۔

ب۔ "شجرۂ ملعونہ" سے مراد سرکش یہودی قوم ہے۔ وہ ایسے درخت کی طرح ہیں جس کی بہت شاخیں اور پتے ہیں لیکن بارگاہِ الٰہی سے دھتکارے ہوئے ہیں۔

ج۔ بہت سی شیعہ اور سُنی تفاسیر میں منقول ہے کہ شجرہ ملعونہ بنی امیہ ہیں۔ فخر رازی نے مشہور اسلامی مفسر ابن عباس سے اس سلسلے میں اپنی تفسیر میں ایک روایت نقل کی ہے۔

یہ تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خواب کے بارے میں مذکورہ بالا روایت سے بھی مناسبت رکھتی ہے۔ نیز اس حدیث سے بھی مناسبت رکھتی ہے جو حضرت عائشہ سے منقول ہے، انہوں نے مروان کی طرف منہ کر کے کہا:

لعن اللہ اباک وانت فی صلبہ فانت بعض من لعنہ اللہ

اللہ نے تیرے باپ پر لعنت کی جبکہ تُو اس کی صلب میں تھا لہٰذا تُو اس کا ایک حصہ ہے جس پر خدا نے لعنت کی ہے[2]

یہاں پھر ایک سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن میں کہاں بنی امیہ کے شجرہ پر لعنت ہوئی ہے۔ جواب یہ ہے کہ سورہ ابراہیم کی آیہ ۲۶ میں، جہاں شجرۂ خبیثہ کا ذکر آیا ہے۔ اگر شجرۂ خبیثہ کے وسیع مفہوم کی طرف نظر رکھی جائے اور اس آیت کی تفسیر میں وارد روایات کہ جن میں بنی امیہ کو شجرۂ خبیثہ قرار دیا گیا ہے کی طرف توجہ کی جائے اور

۱۔ تفسیر روح المعانی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۔ تفسیر قرطبی ج ۶ صفحہ ۳۹۲ اور تفسیر فخر رازی ج ۲۰ صفحہ ۲۳۷

یہ دیکھا جائے کہ لفظ "خبیثہ" معنی کے لحاظ سے لفظ "ملعونہ" کے ساتھ لازم و ملزوم ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں بنی امیہ کے شجرۂ خبیثہ پر لعنت ہوئی ہے [1]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ یہ تمام تر یا زیادہ تر تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں ممکن ہے ہر منافق خبیث اور درگاہِ الٰہی سے راندہ ہوا شجرہ ملعونہ کے مفہوم میں شامل ہو اور خصوصاً بنی امیہ، سنگدل، ہٹ دھرم یہودی اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے تمام لوگ اس سے مراد ہوں اور ہو سکتا ہے شجرۂ زقوم دوسرے جہان میں انہی شجراتِ خبیثہ کی تجسیم ہو اور یہ سب شجرات خبیثہ اس جہان میں سچے مومنین کی آزمائش اور امتحان کا باعث ہوں۔

وہ یہودی کہ جو آج کل حساس اسلامی مراکز پر غاصبانہ طور پر مسلط ہیں اور ہر لمحہ دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں آگ لگا رہے ہیں اور طرح طرح کے جرائم اور بے انصافیاں کر رہے ہیں، اسی طرح وہ منافقین جن کے ان سے سیاسی یا غیر سیاسی روابط ہیں اور تمام آمر حکمران کہ جنہوں نے اسلام کا راستہ چھوڑ کر اسلامی ممالک میں بنی امیہ کا راستہ اپنا رکھا ہے اور معاشرے کے منظر سے نیک لوگوں کو دور کر رکھا ہے، جنہوں نے پست اور کمینے افراد کو عوام کے سروں پر مسلط کر رکھا ہے، وہ کہ جو دوستانِ حق پر مظالم ڈھا رہے ہیں اور سچے مجاہدین کو شہید کر رہے ہیں، وہ کہ جنہوں نے ایسے افراد کے ہاتھ میں معاشرے کی باگ ڈور دے رکھی ہے جو دورِ جاہلیت کی یادگار ہیں۔ یہ سب "شجرۂ ملعونہ" کے شاخ و برگ ہیں اور لوگوں کے لیے آزمائش اور امتحان کا باعث ہیں۔

۲۔ **منکرینِ اعجاز کی عذر تراشیاں:** ہمارے زمانے کے بعض بے خبر افراد یہ راگ الاپتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا قرآن کے علاوہ کوئی معجزہ نہ تھا۔ اپنی اس بات کے لیے وہ کئی طرح کے بہانے تراشتے ہیں۔ وہ "وما منعنا ان نرسل بالاٰیات ..." کو بھی اس بات کی دلیل بناتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے گزشتہ انبیاء کے برخلاف کوئی معجزہ پیش نہیں کیا لیکن تعجب کی بات ہے کہ وہ آیت کے ابتدائی حصے کا تو ذکر کرتے ہیں لیکن آخری حصے کو چھوڑ دیتے ہیں جس میں ہے کہ،

وما نرسل بالاٰیات الا تخویفاً

ہم آیات صرف مخالفین کو ڈرانے کے لیے بھیجتے ہیں۔

یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ معجزات دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم ان معجزات کی ہے جو دعوتِ رسولؐ کی صداقت ثابت کرنے کے لیے، اہلِ ایمان کی تشویق کے لیے اور منکرین کو ڈرانے کے لیے ضروری ہیں۔ جبکہ دوسری قسم ان من پسند کے معجزات کی ہے جن کا تقاضا لوگ بہانہ جوئی کے طور پر کرتے تھے۔ تاریخ انبیاء میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ انبیاء نے ایسے معجزات منکرین کے سامنے پیش کیے لیکن وہ ہرگز ایمان نہ لائے۔

---

[1] نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۱۸۰۔

اسی لیے وہ لوگ خدائی عذاب میں گرفتار ہوتے کیونکہ ان کے مجوزہ معجزات کے ظہور پذیر ہونے کے باوجود وہ ایمان نہ لاتے لہٰذا فوری عذاب کے مستحق قرار پاتے۔ اس بناء پر مندرجہ بالا آیت میں قرآن جس چیز کی پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں نفی کر رہا ہے وہ صرف دوسری قسم کے معجزات ہیں نہ کہ پہلی قسم کے معجزات کی کیونکہ ان کا وجود دعوئ نبوت کے ثبوت کے لیے ناگزیر ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ قرآن خود تنہا ایک واضح اور جاوداں معجزہ ہے اور اگر اس کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی اور معجزہ نہ بھی ہوتا تب بھی آپ کی دعوت کی صداقت ہمارے لیے ثابت ہو سکتی تھی لیکن اس میں شک نہیں کہ قرآن آپ کا روحانی اور معنوی معجزہ ہے لہٰذا اہل فکر و نظر کے لیے یہ بہترین شاہد ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس معجزے کو اگر دوسرے محسوس مادی معجزات کے ساتھ ملا دیا جائے تو عامۃ الناس کے لیے انتہائی اہم ہو جاتے بالخصوص جبکہ قرآن نے دیگر انبیاء کے ایسے معجزات کا بار بار ذکر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان معجزات کا ذکر اس بات کا سبب ہے کہ لوگ آپ سے تقاضا کریں کہ آپ کیسے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ سب انبیاء الٰہی سے افضل اور آخری پیغمبر ہیں جبکہ ان سے ... ت میں سے چھوٹا سا معجزہ بھی پیش نہیں کر سکتے۔

یقیناً اس سوال کا مطمئن کرنے والا جواب اس کے علاوہ نہ تھا کہ پیغمبر اکرمؐ انبیائے سلف کے معجزات کا نمونہ پیش کریں اور متواتر اسلامی تاریخ بھی کہتی ہے کہ رسول اللہؐ نے ایسے معجزات دکھائے۔

قرآن کی متعدد آیات میں ان معجزات کے نمونے موجود ہیں مثلاً آئندہ کے واقعات کے بارے میں مختلف پیش گوئیاں، دشمن کے خلاف فرشتوں کا لشکر اسلام کی مدد کرنا اسی طرح دیگر معجزات خصوصاً وہ معجزات جو اسلامی جنگوں میں وقوع پذیر ہوتے۔

۲۔ گزشتہ لوگوں کے انکار کا آئندہ لوگوں سے تعلق؟ : مندرجہ بالا آیات میں قرآن کہتا ہے کہ گزشتہ لوگوں نے چونکہ معجزات کا مطالبہ کیا تھا اور ان کے ظہور پذیر ہونے کے باوجود انہوں نے تکذیب کی لہٰذا اس سلسلے میں اب تمہارے مطالبے تسلیم نہیں کیے جا سکتے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا گزشتہ لوگوں کی تکذیب بعد کی نسلوں کی محرومیت کا سبب بن سکتی ہے؟۔

جو کچھ سطور گزشتہ میں کہا گیا ہے اس سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ یہ ایک رائج طریقہ ہے کہ شاید ہم کہتے ہیں کہ ہم تمہاری بہانہ سازیوں کو نہیں مانتے۔ اگر دوسرا پوچھے کہ کیوں؟ تو ہم کہتے ہیں کہ پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے کہ لوگوں نے ایسے تقاضے کیے تھے مگر بعد میں حق کو تسلیم نہیں کیا تمہاری کیفیت بھی انہی جیسی ہے۔ اس کے علاوہ تم ان کی روش کی تائید کرتے ہو اور عملی طور پر تم نے ثابت کیا ہے کہ تمہارا مقصد تحقیق و جستجو نہیں ہے بلکہ تم تو صرف بہانے تراشتے ہو اور پھر ہٹ دھرمی، ڈھٹائی اور انکار پر باقی رہتے ہو لہٰذا تمہارے تقاضوں کا کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا۔

یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہؐ نے خبر دی کہ جہنم کی گہرائیوں میں ایک درخت اُگے گا کہ جوان اوصاف کا حامل ہوگا اور اس سے اہل دوزخ کو غذا حاصل ہوگی، تو وہ فوراً تمسخر اڑانے لگے۔ کبھی کہتے کہ "زقوم" کھجور اور مکھن کے علاوہ کچھ نہیں، آؤ یہ میٹھی اور روغنی غذا "زقوم" کی یاد میں کھائیں اور کبھی کہتے کہ جس دوزخ کے پتھروں میں سے اُگے گی اس میں درخت کیسے اُگے گا حالانکہ واضح تھا کہ وہ درخت اس جہان کے درختوں کی مانند نہیں ہے۔

(۶۱) وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ

(۶۲) قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۫ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ○

(۶۳) قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ○

(۶۴) وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ○

(۶۵) اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ○

ترجمہ

(۶۱) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ان سب

نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے کہ جس نے کہا کہ کیا ایسے کو سجدہ کروں جسے تُو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔

(۶۲) (پھر) اس نے کہا یہ شخص جسے تُو نے مجھ پر ترجیح دی ہے اگر تو نے مجھے قیامت تک زندہ رکھا تو تھوڑے سے افراد کے سوا اس شخص کی ساری اولاد کو گمراہ کروں گا اور ان کی بیخ کنی کروں گا۔

(۶۳) فرمایا: نکل جا، ان میں سے جو شخص بھی تیری اتباع کرے گا اس کی سزا جہنم ہے اور یہ بہت سخت سزا ہے۔

(۶۴) ان میں سے جس پر تیرا بس چلے اسے آواز دے کر ابھار اور اپنے سوار اور پیادہ لشکر کو ان پر لگا دے اور مال اور اولاد میں ان کے ساتھ شریک ہو اور ان سے (جھوٹے) وعدے کر لیکن شیطان کا وعدہ سوائے جھوٹ اور فریب کے کچھ نہیں ہے۔

(۶۵) (لیکن جان لے) تُو ہرگز میرے بندوں پر تسلط حاصل نہیں کر سکے گا (اور وہ کبھی تیرے دام میں گرفتار نہیں ہوں گے) یہی کافی ہے کہ تیرا پروردگار ان کا محافظ و وکیل ہے۔

تفسیر

شیطان کے جال

یہ آیات ابلیس کی رُوگردانی کے بارے میں ہیں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اس نے انکار کر دیا۔ علاوہ ازیں اس میں اس کے بُرے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے نیز اس واقعے کے بعد کے کچھ امور کا بھی ذکر ہے۔

قبل ازیں ہٹ دھرم مشرکین سے متعلق مباحث تھیں۔ ان کے بعد شیطان کے بارے میں یہ آیات

اس طرف اشارہ ہیں کہ شیطان استکبار اور کفر و عصیان کا مکمل نمونہ تھا۔ دیکھو کہ اس کا کیا انجام ہوا لہٰذا تم کہ جو اُس کے پیروکار ہو تمہارا بھی وہی انجام ہوگا۔

علاوہ ازیں یہ آیات اس طرف بھی اشارہ کرتی ہیں کہ یہ دل کے اندھے مشرکین کہ جو خلافِ حق راستے پر ڈٹے ہوئے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ شیطان کئی طریقوں سے انہیں گمراہ کرنے کے درپے ہے اور درحقیقت وہ اپنے اس پروگرام پر عمل پیرا ہے کہ جس کا اعلان اس نے ان الفاظ میں کیا تھا:

مَیں اکثر اولادِ آدم کو گمراہ کروں گا۔

پہلے ارشاد فرمایا گیا ہے: وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب سجدہ ریز ہوگئے (واذ قلنا للملائکۃ اسجدوا لاٰدم فسجدوا الّا ابلیس)۔

جیسا کہ خلقتِ آدمؑ سے مربوط آیات کی تفسیر میں ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہ سجدہ ایک طرح کا خضوع اور اظہارِ احترام تھا اور اس سے خلقتِ آدمؑ کی عظمت اور دیگر مخلوقات کی نسبت ان کے امتیازی مقام کے اظہار کے طور پر تھا اور یا یہ عبادت کے طور پر خدا کو سجدہ تھا کہ اُس نے ایسی عجیب و غریب مخلوق پیدا کی ہے۔

ہم یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ اگرچہ یہاں ابلیس کا ذکر فرشتوں کے ساتھ آیا ہے لیکن قرآن کی شہادت کے مطابق ان میں سے نہیں تھا بلکہ بندگیٔ خدا کے باعث ان کی صف میں جا پہنچا تھا۔ وہ جنات میں سے تھا اور اس کی خلقت مادی تھی۔ ابلیس کے سر پر غرور و تکبر سوار تھا۔ خودغرضی و خودبینی نے اس کی عقل و ہوش پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ اسے گمان تھا کہ مٹی آگ سے بہت کم حیثیت کی حامل ہے جبکہ مٹی تمام برکات کا منبع اور سرچشمۂ حیات ہے۔ اس نے اعتراض کے لہجے میں بارگاہِ خداوندی میں کہا: کیا مَیں ایسے شخص کو سجدہ کروں جسے تو نے گیلی مٹی سے پیدا کیا ہے (قال ءاسجد لمن خلقت طینا)۔

جس وقت اس نے دیکھا کہ فرمانِ خدا کے سامنے غرور و تکبر اور سرکشی کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لیے اس کی بارگاہِ مقدس سے دھتکار دیا گیا ہے تو اس نے عرض کیا، اگر تُو مجھے روزِ قیامت تک مہلت دے تو جسے تُو نے مجھ پر ترجیح دی ہے اور اعزاز بخشا ہے مَیں تھوڑے سے افراد کے سوا اس کی ساری اولاد کو گمراہ کر دوں گا اور اس کی بیخ کنی کر دوں گا (قال اَرءیتک ھذا الذی کرمت علیّ لئن اخرتن الی یوم القیامۃ لاحتنکن ذریتہ الّا قلیلا)[1]

---

[1] بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "ارءیتک" کا کاف حرفِ زائد یا حرفِ خطاب ہے کہ جو تاکید کے طور پر آیا ہے اور "ارءیتک" کا معنی "اخبرنی" (مجھے خبر دے) ہے جس کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر میں اس طرح تھا:

(باقی اگلے صفحہ پر)

"احتنکن" "احتناك" کے مادہ سے کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے معنی میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ٹڈی دل زراعت کو بالکل کھا جائے تو عرب کہتے ہیں:

احتنك الجراد المزرع

لہٰذا مذکورہ گفتگو کا مفہوم یہ ہے کہ میں معدود چند افراد کے سوا ساری اولادِ آدم کو تیرے جادۂ اطاعت سے ہٹا دوں گا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "احتنکن" "حنك" کے مادہ سے زیر گلو اور زیر حلق کے معنی میں ہو جس وقت جانور کی گردن میں رسی یا لگام ڈالتے ہیں تو عرب اسے

حنتك الدابہ

کہتے ہیں۔

اس بنا پر مذکورہ گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کہتا ہے کہ میں سب کی گردن میں وسوسے کی رسی ڈال دوں گا اور انہیں گناہ کے راستے کی طرف کھینچ لے جاؤں گا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے شیطان کو مہلت دے دی گئی تاکہ ساری اولادِ آدم کے لیے میدانِ امتحان معرضِ وجود میں آجائے اور حقیقی مومنین کی تربیت کا وسیلہ فراہم ہو جائے کیونکہ حوادث کی بھٹی میں انسان ہمیشہ پختہ تر ہوتا ہے اور طاقتور دشمن کے مقابلے میں دلیر ہو جاتا ہے۔ فرمایا: نکل جا، ان میں سے جو لوگ تمہاری پیروی کریں گے ان کی سزا جہنم ہوگی اور یہ بہت سزا ہے (قال اذهب فمن تبعك منهم فان جهنم جزاؤكم جزاءً موفورًا)

اس ذریعے سے آزمائش کا اعلان کیا گیا ہے اور آخر میں اس عظیم خدائی آزمائش میں کامیابی اور شکست کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اس کے بعد شیطان کے ان ہتھکنڈوں، حربوں اور وسائل کا ذکر کیا گیا جن سے وہ کام لیتا ہے۔ اس سلسلے میں بہت واضح اور جاذبِ توجہ انداز میں فرمایا گیا ہے: ان میں سے ہر ایک کو اپنی آواز کے ذریعے تحریک کر سکتا ہے اور وسوسے میں ڈال سکتا ہے (واستفزز من استطعت منهم بصوتك) اور اپنی پکار کے ذریعے اپنے سوار اور پیادہ لشکر کو ان کی طرف ہانک سکتا ہے (واجلب عليهم بخيلك ورجلك)۔ وہ ان کے اموال اور اولاد میں شریک ہو جاتا ہے (و

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) اور مجموعی طور پر اس کا یہ معنی ہو:۔

جسے تُو نے ترجیح دی ہے کیا اُس شخص کو تُو نے دیکھا ہے؟ اگر مجھے زندہ رہنے دیا تو تُو دیکھے گا کہ میں اس کی اکثر اولاد کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا

دوسرا احتمال آیت کی ترکیب اور معنی کے لحاظ سے زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

شارکھو فی الاموال والاولاد) اور اپنے جھوٹے وعدوں کے ذریعے انہیں فریب دیتا ہے (وعدھم)۔

اس کے بعد قرآن خبردار کرتا ہے: شیطان فریب، دھوکا اور غرور پر مبنی وعدوں کے علاوہ کچھ نہیں دیتا (وما یعدھم الشیطان الا غرورًا)۔

پھر خدا اس سے کہتا ہے: لیکن جان لے کہ "میرے بندوں پر تیرا کچھ بس نہ چلے گا" (ان عبادی لیس لک علیھم سلطان)۔ اتنا ہی کافی ہے کہ تیرا پروردگار ان بندوں کا ولی و حافظ ہے (و کفی بربک وکیلا)۔

چند اہم نکات

۱۔ چند الفاظ کا مفہوم: "استفزز" "استفزاز" کے مادہ سے تحریک کرنا اور ابھارنا کے معنی میں ہے۔ اس میں سریع اور سادہ تحریک کا مفہوم پنہاں ہے لیکن در اصل یہ لفظ قطع و برید کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے جب کوئی کپڑا یا لباس پھٹ جائے تو عرب کہتے ہیں:

تفزز الثوب

تحریک پانے اور برانگیختہ ہونے کے معنی حق سے قطع ہونے اور باطل کی طرف ملتفت ہو جانے کی وجہ سے ہے۔

"اجلب" "اجلاب" کے مادہ در اصل "جلبہ" یعنی سخت قسم کی چیخ و پکار کے معنی میں ہے۔ "اجلاب" کا معنی ہے شور و غل مچا کر ہانکنا اور چلانا۔ بعض روایات میں "جلب" سے منع کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ جمع کرنے پر مامور شخص حق شرعی لینے کے لیے چراگاہ میں جائے تو چلائے نہیں کہ کہیں چراگاہ کے چوپائے دہشت زدہ ہو جائیں یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ گھڑسواری کے مقابلے میں شریک کوئی بھی دوسرے کے گھوڑے کے سامنے غل غپاڑہ نہ کرے تاکہ وہ خود دوڑ لگاتے ہیں[1]

"خیل" دو معانی میں آیا ہے۔ گھوڑوں کے معنی میں اور گھڑسواروں کے معنی میں۔ یہاں البتہ دوسرے معنی میں ہے اور سوار لشکر کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے برعکس "رجل" پیادہ لشکر کے معنی میں ہے۔

البتہ شیطان کا سوار اور پیادہ لشکر کسی باقاعدہ فوج کے مفہوم میں نہیں ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ خود اس کی اپنی جنس میں سے اور انسانوں میں سے بہت سے افراد گمراہی اور بے راہ روی پھیلانے کے لیے اس کے

---

[1] مفردات راغب اور مجمع البیان کی طرف رجوع کریں۔

مددگار اور ساتھی ہیں۔ اس کے ان مددگاروں میں بعض زیادہ تیز اور زیادہ طاقتور ہیں کہ جو سوار لشکر کی طرح ہیں اور بعض نسبتاً سست ہیں کہ جو پیادہ لشکر کی طرح ہیں۔

۲۔ وسوسے کے لیے شیطانی ذرائع: مندرجہ بالا آیات میں اگرچہ مخاطب شیطان ہے اور خدا تعالیٰ تہدید آمیز لہجے میں اس سے کہتا ہے کہ تجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے کر لے مختلف ذرائع سے بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ لیکن یہ درحقیقت تمام انسانوں کے لیے تنبیہ اور بیداری کا الارم ہے۔ انہیں شیطانی ہتھکنڈوں سے آگاہ کیا گیا ہے اور انہیں بتایا گیا ہے کہ وہ کس طرح وسوسے پیدا کرتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں شیطانی ذرائع کے چار اہم اور بنیادی حصوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور انسانوں سے فرمایا گیا ہے کہ وہ ان سے خبردار رہیں:

ا۔ شیطان کا پہلا ہتھکنڈا پراپیگنڈا ہے: ابھی ہم نے پڑھا ہے:

واستفزز من استطعت منهم بصوتك

بعض مفسرین نے اس جملے سے صرف ہوس انگیز گانوں اور موسیقی کا مفہوم لیا ہے لیکن اس کا مفہوم وسیع تر ہے۔ اس میں سمعی اور صوتی ذرائع سے کیا جانے والا تمام تر گمراہ کن پراپیگنڈا شامل ہے۔ آج کی دنیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی دنیا ہے۔ آج کی دنیا وسیع سمعی و بصری کی دنیا ہے۔ آج کی دنیا میں آواز کے ذریعے گمراہ کرنے کا مفہوم زیادہ واضح ہے۔ کیونکہ مشرق و مغرب میں شیطان اور شیطانی گروہ اس مؤثر ذریعے کو استعمال کر رہے ہیں۔ یہ لوگ بہت زیادہ دولت اسی راستے پر خرچ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو راہِ حق سے گمراہ کر سکیں، وہی راہِ حق کہ جو حریت و استقلال اور ایمان و تقویٰ کی راہ ہے۔ وہ انسانوں کو بے ارادہ اور کمزور غلاموں میں بدل دینا چاہتے ہیں۔

ب۔ شیطان کا دوسرا ہتھکنڈا فوجی قوت کا استعمال ہے: شیطان کا یہ طرزِ عمل صرف ہمارے زمانے ہی میں نہیں۔ فوجی طاقت ہمیشہ سے ظالموں اور جابروں کا اہم اور خطرناک ہتھیار رہا ہے۔ جب بھی وہ ضرورت محسوس کرتے ہیں فوری طور پر اپنی مسلح طاقتوں کو پکارتے ہیں اور ان علاقوں کی طرف روانہ کر دیتے ہیں جہاں وہ محسوس کرتے ہیں کہ لوگوں میں آزادی اور استقلال کی تڑپ پیدا ہو رہی ہے اور خطرہ ہے کہ وہ پھر سے آزادی حاصل نہ کر لیں۔

خود آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ سریع الحرکت فوج تیار کی گئی ہے جو بالکل "اجلاب" کا مفہوم رکھتی ہے۔[1]

---

[1] امریکہ نے ایران کے خلاف یہ فوج تیار کی تھی اسے انگریزی میں Rapid Deployed Army کا نام دیا گیا تھا۔ (مصحح)۔

اسی طرح مغرب کی بعض دیگر طاغوتی طاقتوں نے بھی خاص فوج تیار کی ہے تاکہ دنیا کے جس کسی حصے میں بھی ان کے غیر شرعی شیطانی مفادات کو خطرہ ہو اسے وہاں بھیج سکیں اور حق کی ہر آواز اور حرکت کو دبا سکیں۔ یہ قوتیں اپنی سریع الحرکت فوج پہنچنے سے پہلے اپنے ماہر جاسوسوں کے ذریعے زمین ہموار کرتی ہیں۔ یہ جاسوس درحقیقت ان کا پیادہ لشکر ہے۔ یہ طاقتیں اس بات سے غافل ہیں کہ خدا کا اپنے سچے بندوں سے وعدہ ہے کہ شیطان اور اس کی فوج ہرگز ان پر غلبہ حاصل نہیں کرسکے گی۔

ج۔ اقتصادی ہتھکنڈا: یہ ظاہراً انسانی طرزِ عمل معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت شیطانی اثر و نفوذ کے لیے مالی و اقتصادی امور میں شرکت کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔

بعض مفسرین نے اموال میں شرکت سے صرف سود اور اولاد میں شرکت سے صرف غیر شرعی اولاد مراد لیا ہے[1] حالانکہ ان کا مفہوم بہت وسیع ہے جس میں ہر طرح کا حرام مال اور ہر طرح کی غیر شرعی اولاد وغیرہ [illegible] ہے۔

ہم خود اپنے اس زمانے میں دیکھتے ہیں کہ عالمی شیطانی سامراجی انسان دشمن قوتیں کس کس طرح سرمایہ لگاتی ہیں۔ یہ طاقتیں اقتصادی کمپنیاں قائم کرتی ہیں کہ [illegible] ملکوں میں مختلف قسم کے کارخانے لگاتی ہیں اور پیداوار کے مراکز قائم کرتی ہیں اور پھر ان کے ذریعے طرح طرح کے خطرناک کھیل کھیلتی ہیں۔ یہ طاقتیں فنی اور اقتصادی ماہرین کے نام پر ان ملکوں میں اپنے جاسوس بھیجتی ہیں اور ہمدرد بن کر ان ملکوں کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیتی ہیں۔ یہ طاقتیں ان ملکوں میں ان ذرائع سے اقتصادی ترقی، استقلال اور خود مختاری پر ضرب لگاتی ہیں اور انہیں آگے نہیں بڑھنے دیتیں۔

اسی طرح یہ شیطانی قوتیں اسکولوں، کالجوں، لائبریریوں، ہسپتالوں اور سیاحت کے راستے ان کی اولاد میں شرکت کرتی ہیں۔ ان ممالک میں بعض افراد کو اپنی طرف مائل کر لیتی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات بڑی سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے کچھ افراد کو اپنے ہاں اعلیٰ تعلیم کے نام پر بلاتی ہیں اور ان ملکوں کے جوانوں کو اپنی تمدن و ثقافت کے رنگ میں پوری طرح رنگ لیتی ہیں اور اس طرح ان کے افکار و نظریات میں شریک ہو جاتی ہیں۔

یہ شیطان برائی کے مراکز بھی قائم کرتے ہیں۔ انٹرنیشنل ہوٹلوں، جدید تفریحی کلبوں، سینماؤں اور گمراہ کن فلموں

---

[1] ان آیات کے بارے میں وارد روایات میں بھی شیطان کے شریک اولاد ہونے کا مفہوم۔ غیر شرعی اولاد یا وہ اولاد جن کا نطفہ مالِ حرام سے بنا اور یا نطفہ ٹھہرتے وقت جن کے ماں باپ یادِ خدا سے غافل تھے، بیان کیا گیا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے اس قسم کی تفاسیر بعض واضح مصادیق کو بیان کرتی ہیں البتہ آیت کا مفہوم انہی میں منحصر نہیں ہے۔ تفسیر نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۱۸۴ کی طرف رجوع کریں۔

کے ذریعے قوموں کا اخلاق تباہ کرتے ہیں۔ صرف ان ذرائع سے برائیوں ہی کو جنم نہیں دیتے بلکہ غیر شرعی اولاد میں بھی اضافے کا باعث بنتے ہیں بلکہ ان ذرائع سے یہ شیطان ایک بھٹکی ہوئی، بے راہ رو، بے ارادہ، اوباش اور ہوس پرست نسل کو پروان چڑھاتے ہیں۔

ان کے طور طریقوں پر ہم جتنا گہرا غور کریں گے اتنا زیادہ ان کے خطرناک شیطانی وسوسوں کی گہرائی سے آشنا ہوں گے۔

د۔ **نفسیاتی تباہی کے شیطانی پروگرام**: مغرور کرنے والے اور طرح طرح کے پُر فریب وعدے، شیطانوں کا ایک اور چلن ہیں۔ انہوں نے لوگوں کو فریب دینے کے لیے بڑے بڑے ماہرین نفسیات رکھے ہوتے ہیں۔ ان کا کام لوگوں کو حقائق سے غافل کرنا ہے۔ کبھی یہ کہتے ہیں کہ عظیم تمدن کا دروازہ تم سے چند قدم دور ہے۔ کبھی سمجھاتے ہیں کہ تم جلد ہی ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہو جاؤ گے۔ کبھی کہتے ہیں کہ تمہاری قوم بڑی عظیم ہے جو اس پروگرام پر عمل کر کے اوج عظمت تک جا پہنچے گی۔ وہ پسماندہ قوموں اور لوگوں کو انہی تصورات میں لگائے رکھتے ہیں اور یہ سب کام " وعدھم " کا مصداق ہیں۔

کبھی وہ اس کے برعکس دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ تحقیر و تضعیف کرتے ہیں۔ چھوٹے اور کمزور ملکوں سے کہتے ہیں کہ تم بڑی عالمی طاقتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمہارے اور ترقی یافتہ ممالک میں سینکڑوں سالوں کا فرق ہے۔ اس طرح یہ شیطان انہیں ہمت و کوشش سے روکتے ہیں۔

یہ قصہ بہت طویل ہے۔ شیطان اور اس کے لشکروں کے نفوذ کا کوئی ایک طریقہ نہیں۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں " عباد اللہ " اور خدا کے سچے بندے ہمت نہیں ہارتے، ان کے وہ جذبے اسی طرح سلامت رہتے ہیں کہ جو وہ ان آیات سے حاصل کرتے ہیں۔ ان آیات میں وہ خدا کا قطعی وعدہ دیکھتے ہوئے ان شیطانوں کے خلاف جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ان سے ذرہ بھر خوف نہیں کھاتے۔ وہ جانتے ہیں کہ شیطانوں کا شور و غل جتنا زیادہ ہو اتنا ہی بے معنی اور کھوکھلا ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ قوت ایمان اور توکل علی اللہ سے ان سب پر کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے اور ان کے منصوبوں کو نقش بر آب کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وکفٰی بربک وکیلاً

خدا ان کا بہترین محافظ، نگہبان اور یار و مددگار ہے

۴۔ **خدا نے شیطان کو کیوں پیدا کیا؟**: اس بارے میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۳۴ کی تفسیر میں ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ اسی طرح مختلف طرح کے شیطانی وسوسوں اور لفظ شیطان کے سلسلہ میں ج ۴ صفحہ ۶ اور ج ۱ صفحہ ۱۶۲ پر بحث کی جا چکی ہے۔ (اردو ترجمہ)

(۶۶) رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ○

(۶۷) وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ ۖ فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ ۚ وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا ○

(۶۸) أَفَأَمِنْتُمْ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ وَكِيلًا ○

(۶۹) أَمْ أَمِنْتُمْ أَنْ يُعِيدَكُمْ فِيهِ تَارَةً أُخْرَىٰ فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِنَ الرِّيحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهِ تَبِيعًا ○

ترجمہ

(۶۶) تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے لیے دریا میں کشتی چلاتا ہے تاکہ تم اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ وہ تمہارے لیے مہربان ہے۔

(۶۷) اور جس وقت تمہیں دریا میں کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے تو اس کے سوا ہر ایک کو بھول جاتے ہو لیکن جس وقت وہ تمہیں بچا کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو منہ پھیر لیتے ہو اور انسان (نعمتوں کا) کفران کرنے والا ہے۔

(۶۸) کیا تم اس سے مامون ہو کہ وہ خشکی پر (ایک شدید زلزلے کے ذریعے) تمہیں زمین

میں دھنسا دے یا تم پر سنگریزوں کا طوفان بھیج دے اور (تمہیں اس میں دفن کر دے اور) پھر تمہیں کوئی محافظ (اور مددگار) نہ ملے۔

(۶۹) یا کیا تم اس سے مامون ہو کہ وہ پھر تمہیں دریا کی طرف پلٹا دے، تمہاری طرف شدید آندھی بھیج دے اور تمہیں تمہارے کفر کی وجہ سے غرق کر دے یہاں تک کہ کسی ایسے شخص کو بھی پیدا نہ کرے کہ جو تمہارے خون کا مطالبہ کرے۔

تفسیر

نعمتوں کے باوجود کفران کیوں؟

اس سے قبل توحید کے بارے میں اور شرک کے خلاف بحث ہو چکی ہے۔ زیر نظر آیات بھی اس بحث کا تسلسل ہیں۔ ان آیات میں اس موضوع پر دو حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ ایک استدلال و برہان کے حوالے سے اور دوسرے وجدان و ضمیر کے حوالے سے۔

پہلا توحید استدلالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تمہارا پروردگار وہ ہے کہ جو دریا میں کشتی کو حرکت عطا کرتا ہے، ایک مسلسل اور دائمی حرکت (ربکم الذی یزجی لکم الفلك فی البحر)۔

واضح ہے کہ دریا یا سمندر میں کشتیوں کے چلنے کے لیے بہت سے باہم پیوستہ نظام موجود ہیں۔ ایک طرف پانی کو خاص ترکیب کی طرح پیدا کیا گیا ہے۔ دوسری طرف بعض چیزوں کا مخصوص وزن پانی سے بہت ہلکا ہے، اس طرح سے کہ وہ پانی کے اوپر رہ سکیں یا پھر انہیں ایسی شکل میں بنایا جا سکتا ہے کہ عملی طور پر ان کا وزن پانی سے کم ہو جاتے بلکہ یہاں تک کہ بھاری بوجھ اور بہت سے انسانوں کو اٹھا سکیں تیسری طرف کشتی کو حرکت دینے والی قوت کی ضرورت ہے۔ پرانے زمانے میں یہ ضرورت منظم ہوائیں پورا کرتی تھیں۔ یہ ہوائیں سمندروں پر ایک خاص نظم کے ساتھ چلتی ہیں۔ ملاح اُن سے آشنائی حاصل کر کے ان کے ذریعے بادبانی کشتیوں کو چلاتے ہیں اور بھاپ بھی ہوا کی بہن ہی ہے۔ چوتھی طرف راستے سے آگاہی ضروری ہے۔ گزشتہ زمانے میں راہوں کو پہچاننے کے لیے سورج اور ستاروں سے مدد لیتے تھے اور آج کے دور میں قطب نما اور نقشوں سے۔

بہرحال اگر یہ چاروں امور باہم مربوط نہ ہوتے اور کشتیوں کو چلانے کے لیے آپس میں ہم آہنگ نہ ہوتے تو انسان نقل وحمل کے اس انتہائی اہم وسیلے سے محروم ہوتا۔

آپ جانتے ہیں کہ کشتیاں ہمیشہ سے انسان کے لیے نقل و حمل اور آمد و رفت کا ایک انتہائی اہم وسیلہ رہی ہیں۔ آج تو ایسے ایسے بحری جہاز ہیں جو اپنے آپ میں ایک چھوٹے سے شہر کے برابر ہوتے ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اور یہ سب کچھ اس لیے ہے تاکہ تم فضلِ خدا سے بہرہ مند ہو (لتبتغوا من فضله)۔ اپنی آمد و رفت کے لیے، مالِ تجارت کی نقل و حمل کے لیے اور دین و دنیا میں تمہاری مدد کیلئے کیونکہ پروردگار تم پر مہربان ہے" (انه كان بكم رحيما)۔

نظامِ خلقت کے ایک چھوٹے سے گوشے کے حوالے سے یہ توحیدِ استدلالی کے بارے میں بات تھی۔ اس میں خالق کے علم، قدرت اور حکمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اب بات کا رُخ استدلالِ فطری کی طرف مڑتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کہیں بھول نہ جانا کہ جب کبھی تم کسی دریا یا سمندر میں ہوتے ہو اور تمہیں پریشانیاں اور مشکلات آگھیرتی ہیں (اور تم وحشت ناک طوفانی لہروں میں گھر جاتے ہو) تو وہ تمام معبود تمہیں بھول جاتے ہیں جنہیں تم خدا کے علاوہ پکارتے ہو اور وہی ایک تمہارا سہارا رہ جاتا ہے (واذا مسكم الضر في البحر ضل من تدعون الا اياه)۔ اور ایسے میں انہیں کھو ہی جانا چاہیئے کیونکہ طوفانی حوادث میں جب تقلید و تعصب کے پردے فطرتِ انسانی کے چہرے سے ہٹتے ہیں تو نورِ فطرت چمکنے لگتا ہے، وہی نورِ فطرت کہ جو نورِ توحید، نورِ خدا پرستی اور نورِ یگانہ پرستی ہے۔ جی ہاں! ایسے لمحات میں تمام تصوراتی، خیالی معبود کہ جنہیں انسانی توہم نے وجود بخشا ہوتا ہے ذہن سے محو ہو جاتے ہیں، اس طرح سے جیسے تیز دھوپ میں برف پانی ہو جاتی ہے۔

یہ ایک عمومی قانون ہے کہ جس کا تقریباً ہر شخص نے تجربہ کیا ہے کہ مصائب و آلام کی شدت میں جب جان پر بن جاتی ہے، اس وقت تمام ظاہری اسباب بیکار ہو جاتے ہیں اور مادی امداد ناتواں ہو جاتی ہے۔ ایسے میں انسان علم و قدرت کے عظیم مبداء کو یاد کرتا ہے کہ جو سخت ترین مشکلات کو حل کرنے پر قادر ہے۔

ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ اس مبداء کا نام کیا رکھتے ہیں۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ امید کا ایک دریچہ دل کی طرف کھل جاتا ہے اور ایک لطیف و طاقتور نور دل کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ انسانی رُوح و قلب کے اندر خدا شناسی کا یہ ایک بہت ہی نزدیکی راستہ ہے۔[1]

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: لیکن تم ایسے مردود فراموش ہو کہ "ادھر دستِ قدرتِ الٰہی تمہیں ساحل تک پہنچاتا ہے اور اُدھر تم اس سے منہ پھیر لیتے ہو اور انسان دراصل سے ہی کفران کرنے والا" (فلما نجاكم الى البر اعرضتم وكان الانسان كفورا)۔

ایک بار پھر غرور، غفلت، اندھی تقلید اور تعصب کے پردے اس نورِ الٰہی کو چھپا دیتے ہیں اور گناہ و

---

[1] توحیدِ فطری کی تفصیل "آفریدگارِ جہاں" میں مطالعہ کیجئے۔ نیز سورہ نحل کی آیہ ۵۳ کی تفسیر میں بھی ہم اس مسئلے کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

نافرمانی کا غبار اور مادی زندگی کی سرگرمیاں اس کا تابناک چہرہ پنہاں کر دیتی ہیں۔

لیکن کیا تمہارا خیال ہے کہ خدا خشکی اور صحرا میں تمہیں عذاب شدید میں مبتلا نہیں کر سکتا۔ کیا تم اس سے مامون ہو کہ اس کے حکم سے زمین پھٹ جائے اور تم اس میں دھنس جاؤ (افامنتم ان یخسف بکم جانب البر)۔ اور کیا تم اس سے مامون ہو کہ تم پر پتھروں کی بارش ہو اور تم پتھروں کے نیچے دفن ہو جاؤ (جبکہ یہ ایسا عذاب ہے کہ جو غرقاب ہونے سے کئی گنا سخت تر ہے)، اور پھر تمہیں کوئی محافظ و نگہبان بھی نہ ملے (او یرسل علیکم حاصبا ثم لا تجدوا لکم وکیلا)۔

صحرانورد اس بات سے خاص طور پر آشنا تھے کہ کبھی کبھی بیابان میں ایسے طوفان آتے ہیں کہ ریت اور سنگریزوں کے انبار اٹھائے ہوتے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے نئے ٹیلے بن جاتے ہیں اور بعض اوقات تو اونٹوں کی قطار کی قطار ان کے نیچے دفن ہو جاتی ہے۔ قرآن کی اس دھمکی کو یہ بیاباں نورد زیادہ سمجھ سکتے تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اے بھول جانے والو! کیا تمہارا خیال ہے یہ تمہارا آخری بحری سفر تھا۔ کیا اس سے مامون ہو کہ تمہیں تمہاری ضرورتیں پھر سمندر میں نکلنے پر مجبور کریں اور وہاں خدا تباہ کن تیز ہواؤں کو حکم دے کہ تمہیں تمہارے کفر اور کفران نعمت کے باعث غرق کر دیں اور اس وقت پھر یہ عالم ہو گا کہ کوئی تمہارے خون کا مطالبہ کرنے والا نہ ہو گا، کوئی نہ ہو گا جو کہے کہ ایسا کیوں ہوا (ام امنتم ان یعیدکم فیہ تارۃ اخری فیرسل علیکم قاصفا من الریح فیغرقکم بما کفرتم ثم لا تجدوا لکم علینا بہ تبیعا)۔

چند اہم نکات

۱۔ **کم ظرف انسان**: بہت سے لوگ یہ کرتے ہیں کہ مشکلات میں تو خدا کو یاد کرتے ہیں لیکن راحت و آرام میں اسے بھول جاتے ہیں۔ یہ لوگ حقائق زندگی پر توجہ نہیں دیتے لہٰذا انہیں بھول جانے کی عادت پڑ چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی ان کی توجہ خدا اور حقائق زندگی کی طرف ہو تو یہ ان کی ایک استثنائی حالت ہوگی کہ جس کے لیے انتہائی شدید عوامل کی ضرورت ہے۔ جب تک ان عوامل کے تحت کوئی غیر معمولی صورت حال باقی رہے گی انہیں خدا یاد رہے گا لیکن جونہی وہ گھڑی ٹلے گی یہ لوگ اپنی انحرافی کیفیت کی طرف پلٹ آئیں گے اور اللہ کو بھول جائیں گے۔ خلاصہ یہ کہ ایسے لوگ بہت کم ملیں گے جو سنگین و وسیع مشکلات میں اللہ کی باعظمت بارگاہ میں سر نہ جھکائیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس اضطراری بیداری اور توجہ کی کوئی قیمت نہیں۔ صاحبان ایمان اور سچے مسلمان وہ ہیں جو راحت و مشکل میں، سلامتی و بیماری میں، خوشحالی و قحط میں، اقتدار و زندان میں ــ غرض ہر حالت میں اس کی یاد میں رہتے ہیں اور اصولی طور پر حالات کی تبدیلی ان پر ہرگز کوئی اثر نہیں کرتی۔ ان کی روح اس قدر عظیم ہے کہ سب کچھ ان کے اندر سما جاتا ہے جیسے حضرت علی علیہ السلام کی

مثال ہے۔ ان کی عبادت، ان کا زہد اور ان کی دردمندوں کی خبرگیری تخت و اقتدار پر بھی ایسی ہی تھی جیسی گوشۂ تنہائی میں تھی، جیساکہ آپ خود پرہیزگاروں کی صفات کے بارے میں فرماتے ہیں :

نزلت انفسهم منهم فی البلاء کالتی نزلت فی الرخاء

خوشی اور غمی میں ان کی ایک سی حالت رہتی ہے [1]

مختصر یہ کہ ایمان، توجہ الی اللہ، توسل، عبادت، توبہ اور اللہ کے حضور سر تسلیم خم کی تبھی کوئی قدر و قیمت ہے جب یہ دائمی اور پائیدار ہوں۔ باقی رہا موسمی ایمان، موسمی توبہ اور موسمی عبادتیں کہ جو اضطراری حالت میں انجام دی جائیں یا اس حالت میں کہ جب ذاتی مفادات کا تقاضا ہو تو یہ سب بے فائدہ یا انتہائی کم قیمت ہیں۔ آیاتِ قرآنی میں ایسے لوگوں کی بارہا مذمت کی گئی ہے۔

۲۔ خدا کی حدود حکومت سے فرار ممکن نہیں : بعض لوگ مثلاً زمانۂ جاہلیت کے بت پرست — صرف اس وقت خدا کی طرف رُخ کرتے تھے جب کسی مشکل میں گرفتار ہوتے تھے۔ مثلاً کبھی وسط سمندر میں طوفان میں گھر جانے پر یا کسی خطرناک گھاٹی پر یا کسی شدید بیماری میں، حالانکہ اگر صحیح طرح سے سوچا جائے تو ہر حالت میں اور ہر جگہ انسان کے لیے خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔

دریا ہو یا صحرا، سلامتی ہو یا بیماری، ہلاکت کے گڑھے کا سامنا ہو یا کوئی اور موقع — درحقیقت سب برابر ہیں۔ ہو سکتا ہے زلزلے کا ایک مختصر سا جھٹکا ہمارے خانۂ امن و امان کو وحشت ناک ویرانے میں تبدیل کر دے۔ خون کا ایک چھوٹا سا ذرہ ہمارے دل کی شرگ کو بند کر سکتا ہے۔ دل یا دماغ کے ایک ثانیے کے سکتے کی وجہ سے موت آسکتی ہے۔ ان امور کی طرف توجہ کی جائے تو واضح ہوگا کہ خدا سے غفلت اور اس کی پاک ذات کو فراموش کر دینا کس قدر جاہلانہ ہے۔

وہ لوگ کہ جو اس مفروضے کے حامی ہیں کہ مذہب کی بنیاد خوف ہے، ہو سکتا ہے اس بات کو دستاویز کے طور پر پیش کریں کہ مختلف طبیعی عوامل کا خوف انسان کو خدا کے تصور کی طرف لے جاتا ہے اور ایسے خیالات کو تقویت پہنچاتا ہے۔

قرآنی آیات نے ایسے اوہام کا جواب دیا ہے کیونکہ قرآن نے خداشناسی کی بنیاد کبھی اس مسئلے پر نہیں رکھی بلکہ اس کی بنیاد نظام خلقت کے مطالعے اور اس مطالعے کے ذریعے اس کی پاک ذات تک پہنچنے کو قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ زیر بحث آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ توحید فطری سے پہلے ایمان استدلالی کے بارے میں بات کی گئی ہے اور درحقیقت ان حوادث کو خدا یاد دلانے والے شمار کیا گیا ہے نہ کہ اس کی شناخت و معرفت کا موجب کیونکہ حق طلب افراد کے لیے اس کی شناخت و معرفت طریق استدلال سے

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۳۔

بھی واضح ہے اور راہِ فطرت سے بھی آشکار ہے ۔

۳۔ چند الفاظ کا مفہوم : " یزجی " جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں " ازجاء " کے مادہ سے کسی چیز کو مسلسل حرکت دینے کے معنی میں ہے ۔

" حاصب " ایسی ہوا کو کہتے ہیں کہ جو سنگریزوں کو اپنے ہمراہ اٹھا لاتے اور ان کے ٹیلے بنا دے۔ یہ لفظ دراصل " حصباء " سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے " سنگریزہ " ۔

" قاصف " توڑنے والے کے معنی میں ہے ۔ یہاں ایسی شدید آندھی کی طرف اشارہ ہے کہ جو ہر چیز کو درہم برہم کر کے رکھ دے ۔

" تبیع " " تابع " کے معنی میں ہے ۔ یہاں ایسے شخص کی طرف اشارہ ہے کہ جو خون یا خونبہا کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑا ہو اور اس کا پیچھا کرے ۔

(٧٠) وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيٓ ءَادَمَ وَحَمَلۡنَٰهُمۡ فِي ٱلۡبَرِّ وَٱلۡبَحۡرِ وَرَزَقۡنَٰهُم مِّنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَفَضَّلۡنَٰهُمۡ عَلَىٰ كَثِيرٖ مِّمَّنۡ خَلَقۡنَا تَفۡضِيلٗا ○

(٧١) يَوۡمَ نَدۡعُواْ كُلَّ أُنَاسِۭ بِإِمَٰمِهِمۡۖ فَمَنۡ أُوتِيَ كِتَٰبَهُۥ بِيَمِينِهِۦ فَأُوْلَٰٓئِكَ يَقۡرَءُونَ كِتَٰبَهُمۡ وَلَا يُظۡلَمُونَ فَتِيلٗا ○

(٧٢) وَمَن كَانَ فِي هَٰذِهِۦٓ أَعۡمَىٰ فَهُوَ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ أَعۡمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلٗا ○

ترجمہ

(٧٠) ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور خشکی و دریا میں انہیں سواریاں عطا کیں، طرح طرح کے پاکیزہ رزق میں سے انہیں روزی دی اور انہیں اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت عطا کی۔

(٧١) وہ دن یاد کرو کہ جب ہر گروہ کو ہم اس کے امام کے ساتھ پکاریں گے۔ پس جس کا نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں ہوگا وہ اسے (بڑی مسرت سے) پڑھیں گے اور ان پر رائی برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔

(٧٢) لیکن وہ لوگ جو اس دنیا میں (چہرۂ حق کو دیکھ کر بھی) اندھے بنے رہے وہ وہاں بھی اندھے رہیں گے بلکہ گمراہ تر۔

تفسیر

انسان گلشنِ حیات کا بہترین پھول

تربیت و ہدایت کا ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو ان کی عظمت اور مقام یاد دلایا جائے۔ قرآن مجید بھی یہ

طریقہ اختیار کرتا ہے۔ گزشتہ آیات میں مشرکین اور منحرف افراد کے بارے میں گفتگو تھی۔ اب زیر نظر آیات میں نوع انسانی کے بلند مقام کا تذکرہ ہے نیز اس کو عطا ہونے والی نعمات الٰہی کا بیان ہے تاکہ وہ اپنے اس انتہائی اعلیٰ مقام کی طرف توجہ کرے اور اپنے مقام گراں بہا کو ضائع نہ کر دے اور اپنے تئیں کسی حقیر سی قیمت پر نہ بیچ ڈالے۔

ارشاد ہوتا ہے: ہم نے اولاد آدم کو عزت و تکریم بخشی اور اسے گرامی قدر بنایا (ولقد کرمنا بنی اٰدم)۔

اس کے بعد انسانوں کو عطا ہونے والی تین طرح کی نعمات الٰہی کا ذکر کیا گیا ہے:

پہلی نعمت: ہم نے انہیں خشکی و دریا میں سواریاں عطا کی ہیں۔ (وحملناھم فی البر والبحر)۔

دوسری نعمت: پاکیزہ رزق میں سے ہم نے انہیں روزی دی ہے۔ (ورزقناھم من الطیبات)۔

لفظ "طیب" کے مفہوم میں ہر پاکیزہ موجود شامل ہے۔ اس مفہوم پر توجہ کی جائے تو اس عظیم خدائی نعمت کی وسعت واضح ہو جاتی ہے۔

تیسری نعمت: ہم نے انہیں اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی ہے۔ (وفضلناھم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلاً)۔

چند اہم نکات

۱۔ سواری۔ انسان کے لیے اولین نعمت: یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نعمتیں عطا کی ہیں ان میں سے سب سے پہلے خشکی اور دریا میں اس کی آمد و رفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ممکن ہے یہ اس بناء پر ہو کہ طیبات اور مختلف قسم کے رزق سے حرکت اور سفر کے بغیر فائدہ اٹھانا ممکن نہیں اور صفحۂ زمین پر اس سفر کے لیے انسان کو سواری کی ضرورت ہے۔ یہ بجا کہا جاتا ہے کہ حرکت میں برکت ہے۔

یا پھر یہ اس بناء پر ہے کہ خدا تعالیٰ اس تمام وسیع زمین پر انسانی حکمرانی کو بیان کرنا چاہتا ہے۔ دریا ہو یا صحرا انسان کا اقتدار موجود ہے۔ اس زمین پر دیگر موجود کا تسلط محدود اور ایک حصے پر ہے۔ یہ صرف انسان ہے جو پورے کرۂ خاکی پر حکومت کرتا ہے۔ دریا، صحرا، اونچائی، اُترائی اور ہوا سب میں انسان کی حکومت ہے۔

۲۔ خدا کی طرف سے انسان کی عزت و تکریم: مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے

کہ ہم نے انسان کو عزت بخشی ۔ یہ ایک سربستہ سی بات ہے ۔ اللہ نے انسان کو کس چیز سے عزت بخشی اس سلسلے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں ۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس اعطاء سے مراد عقل و نطق کی قوت ، مختلف استعدادیں اور ارادے کی آزادی ہے ۔

بعض سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد انسان کی موزوں جسامت اور قامت راست ہے ۔

بعض کہتے ہیں کہ اس اعطاء سے انگلیاں مراد ہیں جن کے ذریعے انسان بہت سے ظریف اور دقیق کام انجام دے سکتا ہے اور اسی طرح لکھنے کی قدرت رکھتا ہے ۔

بعض کا خیال ہے کہ اس سے انسان کی اس صلاحیت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ وہ تقریباً واحد موجود ہے جو اپنی غذا اپنے ہاتھ سے کھا سکتا ہے ۔

بعض سمجھتے ہیں کہ یہ انسان کی اس سربلندی کی طرف اشارہ ہے کہ وہ روئے زمین کی تمام موجودات پر تسلط رکھتا ہے ۔

بعض کا خیال ہے کہ اس اعطاء کی طرف اشارہ ہے کہ انسان معرفت الٰہی پر اور اس کے فرمان کی اطاعت پر قدرت رکھتا ہے ۔

لیکن یہ واضح ہے کہ یہ سب نعمتیں انسان میں جمع ہیں اور ان میں سے کوئی دوسرے کے متضاد نہیں ہے ۔

لہٰذا اس عظیم مخلوق کو خدا نے جو گرامی قدر بنایا اور عزت عطا کی ہے وہ ان تمام نعمات اور ان کے علاوہ دیگر نعمات کی بنیاد پر ہے ۔ مختصر یہ کہ انسان دیگر مخلوقات پر بہت سے امتیازات رکھتا ہے اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بلند تر اور جاذب نظر ہے ۔

انسان کے جسمانی امتیازات کے علاوہ انسان ایسی روح کا حامل ہے جو کمال حاصل کرنے کے لیے اعلیٰ صلاحیتیں اور بہت توانائی رکھتی ہے ۔

۳ ۔ "کرّمنا" اور "فضّلنا" میں فرق : اس سلسلے میں مختلف نظریات بیان کیے گئے ہیں :

بعض کا کہنا ہے کہ "کرّمنا" ان نعمات کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ذاتاً انسان کو دی ہیں جبکہ "فضّلنا" ان فضائل کی طرف اشارہ ہے جو انسان نے توفیقِ الٰہی سے کسب کیے ہیں ۔

یہ احتمال بھی بہت صحیح معلوم ہوتا ہے کہ "کرّمنا" مادی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہو اور "فضّلنا" روحانی پہلوؤں کی طرف کیونکہ لفظ "فضّلنا" عام طور پر قرآن میں اسی معنی میں آیا ہے ۔

۴ ۔ آیت میں "کثیر" کا مفہوم : بعض مفسرین کا خیال ہے کہ زیر بحث آیت تمام اولادِ آدم پر

فرشتوں کی برتری کی دلیل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ قرآن اس آیت میں کہتا ہے کہ ہم نے انسانوں کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت و برتری عطا کی ہے۔ لہٰذا اس کا واضح مطلب ہے کہ ایک گروہ ایسا ہے کہ جس سے انسان افضل نہیں ہے اور یہ گروہ فرشتوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

لیکن خلقتِ آدمؑ اور فرشتوں کا ان کے سامنے سجدہ و خضوع کرنے اور آدمؑ کی طرف سے انہیں علم اسماء کی تعلیم کی طرف توجہ کی جائے تو اس امر میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ انسان فرشتوں سے افضل و برتر ہے لہٰذا "کثیر" یہاں "جمیع" کے معنی میں ہوگا۔

عظیم مفسر طبرسی نے مجمع البیان میں کہا ہے کہ قرآن میں عرب محاورات میں بہت معمول ہے کہ یہ لفظ "جمیع" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ طبرسی کہتے ہیں کہ اس جملے کا معنی یہ ہوگا:

"انا فضلناهم علی من خلقناهم وهم کثیر"

ہم نے انسان کو ان سب پر فضیلت عطا کی ہے جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے اور یہ مخلوقات کثیر ہیں۔

شیاطین کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

وَاَکْثَرُهُمْ کٰذِبُوْنَ (شعراء — ۲۲۳)

واضح ہے کہ شیطان تو سب جھوٹے ہیں نہ کہ ان میں سے اکثر۔

بہرحال اس معنی کو خلاف ظاہر سمجھیں تو بھی خلقتِ انسان کے بارے میں موجود آیات ہماری مذکورہ بات کے لیے واضح قرینہ ہیں۔

۵۔ انسان کیوں افضل ہے؟: اس سوال کا جواب کوئی پیچیدہ نہیں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان ہی وہ واحد موجود ہے جس میں مختلف مادی و معنوی اور جسمانی و روحانی قوتیں اور توانائیاں موجود ہیں۔ یہی انسان متضاد چیزوں میں رہ کر پرورش پا سکتا ہے۔ صرف انسان ہی ہے جو کمال و ارتقاء اور پیش رفت کی لامحدود صلاحیت رکھتا ہے۔

حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام سے منقول ایک مشہور حدیث بھی اس مدعا پر ایک گواہ ہے آپؑ فرماتے ہیں:

اللہ نے عالم کو تین قسم کا پیدا کیا ہے۔ فرشتے، حیوان اور انسان۔ فرشتے عقل رکھتے ہیں اور ان میں شہوت و غضب کی قوت نہیں ہے۔ حیوان شہوت و غضب کا مجموعہ ہیں لیکن انسان دونوں کا مجموعہ ہے تاکہ معلوم ہو کہ کونسی قوت غالب آتی ہے۔ اگر اس کی عقل شہوت پر غالب آجائے تو یہ فرشتوں سے افضل ہے اور اگر اس کی شہوت اس کی عقل پر غالب آجائے تو

یہ حیوانات سے پست تر ہے[1]

یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ کیا تمام انسان فرشتوں سے افضل ہیں جبکہ بہت سے لوگ بے ایمان، شریر اور ستمگر ہیں اور ایسے لوگ مخلوقِ خدا میں سے پست ترین شمار ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کیا زیرِ بحث آیت میں لفظ "بنی آدم" سب انسانوں کے لیے ہے یا ان میں سے صرف ایک گروہ کے لیے۔

اس سوال کا جواب ایک جملے میں دیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ:

جی ہاں! تمام انسان برتر ہیں لیکن بالقوۃ و استعداد کے لحاظ سے ــــ یعنی سب یہ مقام اور اہلیت رکھتے ہیں۔ البتہ اگر وہ اس سے استفادہ نہ کریں اور اپنے مقام سے گر جائیں تو یہ کام خود ان سے مربوط ہے۔

انسان کی تمام موجودات پر برتری اگرچہ روحانی اور انسانی حوالے سے ہے تاہم نامناسب نہیں کہ ہم علماء کے بقول بعض حوالوں سے جسمانی قوت کے لحاظ سے بھی اسے افضل جانیں۔ (اگرچہ بعض پہلوؤں سے انسان کمزور نظر آتا ہے)۔

کتاب "انسان موجودِ ناشناختہ" کا مؤلف الیکسز کارل کہتا ہے:

انسانی بدن غیر معمولی استحکام اور قابلیت کا حامل ہے۔ یہ ہر قسم کے حادثے میں استقامت دکھاتا ہے۔ اسی طرح بھوک، بے خوابی، تکان، بہت زیادہ غصے، درد، بیماری، دکھ، مشقت اور روح و بدن میں موجود حیرت انگیز اعتدال کی حفاظت کے مواقع پر بہت عجیب و غریب تحمل اور قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام حیوانات میں سے انسان میں باقی رہنے اور جدوجہد کی زیادہ صلاحیت ہے۔ اپنی اسی عجیب و غریب فکری و جسمانی توانائی ہی کی وجہ سے وہ صنعت و تمدن میں اس مقام پر آپہنچا ہے اور تمام جانداروں پر اپنی برتری ثابت کرچکا ہے[2]

اگلی آیت میں انسان کے لیے ایک اور خدائی نعمت کی طرف اشارہ ہے۔ نیز اس نعمت کے بعد انسان پر جو سنگین ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

پہلے مسئلہ رہبری اور انسانی سرنوشت میں اس کی تاثیر کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قیامت کے دن ہم ہر گروہ کو اس کے امام اور رہبر کے ساتھ پکاریں گے (یوم ندعوا

---

[1] نور الثقلین ج ٣ صفحہ ١٨٥۔

[2] "انسان موجودِ ناشناختہ" صفحہ ٤٢ و صفحہ ٤٣۔

کل اناس باما مھم)۔

یعنی وہ لوگ کہ جنہوں نے ہر زمانے میں انبیاء اور ان کے اوصیاء کی رہبری کو قبول کیا ہے وہ اپنے ان پیشواؤں کے ساتھ ہوں گے اور جنہوں نے شیطان، آئمہ ضلال اور جابر و ظالم پیشواؤں کی رہبری کو اختیار کیا ہے وہ ان کے ساتھ ہوں گے۔

خلاصہ یہ کہ رہبری اور پیروی کا جو رشتہ اِس جہان میں ہوگا وہ پوری طرح اُس جہان میں منعکس ہوگا۔

اسی بنیاد پر اہلِ نجات اور اہلِ عذاب ایک دوسرے سے جُدا ہو جائیں گے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے چاہا ہے کہ یہاں "امام" کا مطلب صرف "انبیاء" لیں۔ نیز بعض نے اس کی تفسیر آسمانی کتب بیان کی ہے اور بعض نے علماء۔

لیکن واضح ہے کہ "امام" کا یہاں وسیع مفہوم ہے اور اسی میں ہر پیشوا شامل ہے چاہے وہ انبیاء ہوں یا آئمہ ہدیٰ یا علماء اور کتاب و سنت اور اسی طرح آئمہ کفر و ضلال بھی۔ لہٰذا وہاں ہر شخص اس رہبر کی صف میں ہوگا جس کا اس نے یہاں طریقہ اپنایا ہوگا۔

انسان کے کمال وارتقاء کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہ تعبیر سب انسانوں کے لیے ایک تنبیہ بھی ہے اور اسے خبردار کرتی ہے کہ رہبر کے انتخاب میں بہت زیادہ غور و فکر سے کام لے اور اپنی فکر و نظر اور زندگی کی مہار ہر کسی کے سپرد نہ کر دے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ وہاں لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے، "جن کا نامۂ اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ افتخار اور سرور کے ساتھ اپنا نامۂ اعمال پڑھیں گے اور ان پر ذرہ بھر ظلم نہ ہوگا" (فمن اوتی کتابه بیمینه فاولٰئک یقرء ون کتابھم ولا یظلمون فتیلاً)[1]

لیکن جو لوگ اِس جہان میں کور دل تھے وہ آخرت میں بھی اندھے ہوں گے۔ (ومن کان فی هٰذه اعمیٰ فهو فی الاٰخرة اعمیٰ) اور فطری امر ہے کہ دل کے یہ اندھے سب سے زیادہ گمراہ ہوں گے (واضل سبیلاً)۔ وہ نہ اِس دنیا میں راہِ ہدایت پائیں گے اور نہ آخرت میں بہشت و سعادت کی راہ — کیونکہ انہوں نے خود سے اپنی آنکھیں تمام حقائق کے سامنے بند کر رکھی ہیں۔ انہوں نے حق کا چہرہ دیکھنے کے لیے آنکھیں نہ کھولیں۔ آیاتِ خدا اور جو کچھ باعثِ ہدایت و عبرت تھا اُس سے آنکھیں چرائے رکھیں اور

---

[1] "فتیل" اس باریک اور نازک تار کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے شگاف کے اندر ہوتی ہے۔ جبکہ کھجور کی گٹھلی کی پشت پر جو نار ہوتی ہے اسے "نقیر" کہتے ہیں جبکہ "قطمیر" اس نازک چھلکے کو کہتے ہیں جس نے کھجور کی گٹھلی کو چھپا رکھا ہوتا ہے اور یہ تمام الفاظ بہت چھوٹی اور حقیر چیز کے لیے کنائے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے انہوں نے اپنے آپ کو محروم رکھا اور دارِ آخرت چونکہ اس جہان کا عکس العمل ہے تو کیا تعجب کی بات ہے کہ یہ کور دل وہاں عرصۂ محشر میں نابینوں کی صورت میں پیش ہوں۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ انسانی زندگی پر رہبری کا اثر: انسان کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کو رہبری کے مسئلے سے جدا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کسی بھی گروہ کے حقیقی راستے کو واضح کرنے کے لیے ہمیشہ رہبر اور پیشوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اصولی طور پر کمال وارتقاء وجودِ رہبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ انبیاء اور اوصیاء کے بھیجے جانے اور انتخاب کا یہی راز ہے۔

علم عقائد و کلام میں بھی قاعدہ لطف سے استفادہ کرتے ہوئے اور معاشرے کے نظم و نسق کے حصول اور انحراف سے بچانے میں رہبر کی ضرورت کے حوالے سے بعثتِ انبیاء اور ہر زمانے میں وجودِ امام کا ضروری ہونا ثابت کیا گیا ہے لیکن ایک خدائی رہبر اور عالم و صالح انسان کی رہبری انسان کے لیے اصلی ہدف تک رسائی کو جیسے آسان اور تیز تر کر دیتی ہے ایسے ہی آئمہ کفر و ضلال کی رہبری کو قبول کرنے سے انسان بدبختی اور بدانجامی کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں متعدد احادیث اسلامی مصادر میں موجود ہیں۔ ان کے مطالعے سے مفہوم آیت اور ہدفِ امامت واضح ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث شیعہ اور سُنّی حضرات نے امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے صحیح اسناد کے ساتھ نقل کی ہے۔ اس میں ہے کہ امامؑ نے اپنے آباؤ اجداد کے واسطے سے رسول اکرمؐ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل فرمایا:

> یدعی کل اناس بامام زمانهم وکتاب ربهم وسنة نبیهم
>
> اس روز ہر قوم کو اس کے زمانے کے امام، اس کی کتابِ الٰہی اور اس کے پیغمبر کی سنت کے ساتھ پکارا جائے گا[1]

نیز امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

> الا تحمدون اللّٰه اذا کان یوم القیامة فدعا کل قوم الی من یتولونه ودعانا الی رسول اللّٰه وفزعتم الینا فالی این ترون یذهب بکم الی الجنة ورب الکعبة — قالها ثلاثاً۔

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

کیا تم اللہ کی حمد و ثنا بجا نہیں لاتے کہ جب قیامت کا دن ہوگا، خدا ہر گروہ کو اس شخص کے ساتھ پکارے گا جس کی اس نے ولایت قبول کی ہوگی، ہمیں رسول اللہ کے ساتھ پکارے گا اور تمہیں ہمارے ساتھ۔ تم سوچتے ہو کہ ایسے میں تمہیں کدھر لے جائیں گے۔ رب کعبہ کی قسم! بہشت کی طرف — پھر امام نے اس جملے کو تین مرتبہ دہرایا۔[1]

۲۔ بنی آدم کا شرف : "بنی آدم" عموماً قرآن میں انسان کے لیے ایک ایسا عنوان ہے جس میں مدح و ستائش اور احترام شامل ہے جبکہ لفظ انسان کی توصیف "ظلوم"، "جہول"، "ہلوع" (کم ظرف)، "ضعیف" نافرمان اور ناسپاس کے الفاظ سے کی گئی ہے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ لفظ "بنی آدم" تربیت یافتہ انسانوں کی طرف اشارہ کرتا ہے یا کم از کم یہ انسان کی مثبت صلاحیتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ (حضرت آدمؑ کا افتخار و اعزاز اور فرشتوں پر ان کی فضیلت کہ جو اس لفظ "بنی آدم" میں پنہاں ہے یہ بھی اس معنی کی ایک مؤید ہے)۔ جبکہ لفظ "انسان" اس کے مطلق معنی کے لحاظ سے ہے اور کبھی کبھی انسان کے منفی پہلوؤں کی طرف اشارے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اسی لیے زیر بحث آیات کہ جن میں انسان کے شرف و فضیلت کا ذکر ہے یہاں لفظ "بنی آدم" استعمال ہوا ہے۔

قرآن مجید میں انسان کے معنی کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۵ صفحہ ۵۱ پر ہم نے تفصیلی بحث کی ہے۔

۳۔ رہبری — اسلام کی نظر میں : امام باقر علیہ السلام سے ایک مشہور حدیث منقول ہے۔ اس میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ اسلام کے بنیادی ارکان کے بارے میں گفتگو فرما رہے تھے۔ اس وقت آپ نے پانچواں رکن ولایت (رہبری) کو قرار دیا اور اس کا تعارف اہم ترین رکن کی حیثیت سے کروایا۔ جبکہ اس حدیث کے مطابق نماز کہ جو خالق و مخلوق کے مابین تعلق کا مظہر ہے، روزہ کہ جو شہوات سے مقابلے کا راز ہے زکوٰۃ کہ جو انسان سے انسان کے تعلق کا اظہار ہے اور حج کہ جو اسلام کے اجتماعی پہلوؤں کا ترجمان ہے دیگر چار بنیادی رُکن ہیں۔

بعد میں امامؑ نے مزید فرمایا:

کسی چیز کو ولایت کی سی اہمیت حاصل نہیں ہے (کیونکہ دیگر ارکان کا اجراء اسی کے سائے میں ہوگا)۔[2]

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] حدیث کی عبارت یوں ہے:

قال الباقر (ع): بنی الاسلام علی خمس علی الصلوٰۃ والزکوٰۃ والصوم والحج والولایۃ ولم ینادبشیء کما نودی بالولایۃ (اصول کافی ج ۲ صفحہ ۱۵)۔

یہی وجہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ کی ایک مشہور حدیث میں منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

من مات بغیر امام مات میتة الجاهلية

جو شخص اس دنیا سے امام و رہبر کے بغیر چلا جائے گا وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔[1]

تاریخ میں ایسے بہت سے مواقع دکھائی دیتے ہیں کہ کبھی ایک ملت ایک عظیم اور لائق قیادت و رہبری کی بدولت دنیا کی قوموں میں پہلی صف میں آ کھڑی ہوتی اور کبھی وہی ملت اسی افرادی قوت اور انہی وسائل کے باوجود کمزور اور نالائق قائد و رہبر کی بدولت ایسی گری کہ شاید کوئی باور نہ کرے کہ یہ وہی ملت ہے۔

کیا زمانۂ جاہلیت کے عرب نہ تھے کہ جو جہالت، بدبختی، فتنہ و فساد، ذلت و نکبت اور انتشار و انحطاط میں غوطہ ور تھے کیونکہ ان کا کوئی قابل قائد نہ تھا لیکن جب الٰہی رہبر یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ظہور فرمایا تو اس قوم نے وہ ترقی و کمال اور عظمت حاصل کی کہ پوری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

جی ہاں ــ یہ ہے رہبر کی تاثیر ــ اُس زمانے میں، اس زمانے میں اور ہر زمانے میں۔

البتہ خدا تعالیٰ نے ہر زمانے کے انسانوں کی نجات و ہدایت کے لیے رہبر مقرر کیے ہیں کیونکہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ فرمانِ سعادت ضامن کے بغیر جاری نہ ہو۔

لیکن یہ بات بہت اہم ہے کہ لوگ اپنے رہبر کو پہچانیں اور گمراہ و فاسد اور مفسد رہبروں کے دام فریب میں گرفتار نہ ہوں کیونکہ پھر ان کے چنگل سے نجات مشکل ہے۔

شیعوں کا اعتقاد ہے کہ ہر زمانے میں ایک معصوم امام ہوتا ہے۔ اس اعتقاد کا بھی یہی فلسفہ ہے۔ جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

اللّٰهم بلٰى لا تخلوا الارض من قائم لله بحجة، اما ظاهراً مشهوراً واما خائفاً مغموراً، لئلا تبطل حجج الله وبيناته

جی ہاں! بخدا زمین کبھی ایسے رہبر سے خالی نہیں ہوتی کہ جو حجتِ الٰہی کے ساتھ قیام کرے، چاہے وہ ظاہر و آشکار ہو یا (درکار پیروکار نہ ہونے کی وجہ سے) مخفی و پنہاں ہو۔ ایسے رہبر کا وجود اس لیے ضروری ہے کہ خدا کی نشانیاں اور اس کے فرمان کے دلائل ختم نہ ہونے پائیں۔[2]

مفہوم امامت اور جہانِ انسانیت کے لیے اس کی ناگزیر ضرورت کے بارے میں ہم پہلی جلد میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۲۴ کے ذیل میں بھی بحث کر چکے ہیں۔

۴۔ دل کے اندھے : مشرکوں اور ظالموں کے بارے میں زیر بحث آیت میں قرآن نے ایک

---

[1] نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۱۹۲ اور دیگر بہت سی کتابیں۔

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار، ۱۴۷۔

نہایت عمدہ تعبیر استعمال کی ہے اور وہ ہے "اعمیٰ" (اندھے)۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ حق کا چہرہ ہر جگہ آشکار ہوتا ہے البتہ چشم بینا کی ضرورت ہے۔ ایسی آنکھ کہ جو اس وسیع کائنات میں آیاتِ الٰہی کو دیکھ سکے، وہ آنکھ کہ جو صفحاتِ تاریخ میں سے درسِ عبرت کا مطالعہ کر سکے اور ایسی آنکھ کہ جو ظالموں اور جابروں کے انجام کا مشاہدہ کر سکے۔ خلاصہ یہ کہ ایسی کھلی آنکھ کی ضرورت ہے کہ جو حق کو دیکھ سکے۔

لیکن جب جہالت، غرور، تعصب، ہٹ دھرمی، شہوت اور ہَوا و ہوس کے موٹے موٹے پردے انسان کی آنکھ کے سامنے پڑ جائیں تو پھر وہ دیکھنے کے قابل نہیں رہتی۔ جمالِ حق تو حجاب میں نہیں ہوتا مگر ایسی آنکھ اس کے مشاہدے سے عاجز ہوتی ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک حدیث امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

من لم یدلہ خلق السمٰوات والارض، واختلاف اللیل والنهار و دوران الفلک والشمس والقمر والاٰیات العجیبات علیٰ ان وراء ذٰلک امر اعظم منہ، فهو فی الاٰخرة اعمیٰ واضل سبیلا۔

جس شخص کو زمین و آسمان کی خلقت، روز و شب کی آمد و شد، سورج چاند ستاروں کی گردش اور اس کی عجیب و غریب نشانیاں اس عالم کے ماوراء چھپی ہوئی عظیم حقیقت سے آگاہ نہ کریں، وہ آخرت میں اندھا ہوگا اور بہت زیادہ گمراہ[1]

نیز متعدد روایات میں اس آیت کی تفسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ اس سے وہ شخص مراد ہے کہ جو حج کی استطاعت رکھنے کے باوجود آخر عمر تک حج پر نہ جائے[2]

اس میں شک نہیں کہ ایسا شخص اس آیت کا ایک مصداق ہے نہ کہ آیت کا مفہوم اسی میں منحصر ہے شاید اس مصداق کا ذکر اس بناء پر ہو کہ مراسم حج میں شرکت سے، اس عظیم اسلامی سیمینار میں حاضری سے اور اس میں پنہاں عبادی و سیاسی اسرار کے مشاہدے سے انسان کی آنکھ بینا ہو جاتی ہے اور اسے بہت سے حقائق دکھائی دینے لگتے ہیں۔

بعض دیگر روایات میں بدترین اندھاپن دل کے اندھے پن کو قرار دیا گیا ہے:

شر العمی عمی القلب

بدترین نابینائی دل کا اندھاپن ہے[3]

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۱۹۶

[2] و [3] تفسیر نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۱۹۶ و صفحہ ۱۹۷

بہرحال جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ عالمِ قیامت ہمارے اس عالم کے عقائد و اعمال کا عکس العمل ہے۔ اسی بنا پر سورہ طٰہٰ کی آیہ ۱۲۴ سے لے کر ۱۲۶ تک میں ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝

جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرے گا وہ سخت زندگی سے دوچار ہوگا اور روزِ قیامت اندھا محشور ہوگا۔ اس وقت کہے گا: پروردگارا! مجھے تُو نے کیوں اندھا محشور کیا ہے حالانکہ پہلے تو (دنیا میں) میں بینا تھا۔ وہ فرمائے گا: اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آتی تھیں اور تُو ان سے آنکھیں بند کرلیتا تھا اور انہیں بھلا رکھا تھا آج تجھے بھی بھلا دیا جائے گا۔

۷۳ وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِیَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ○

۷۴ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ○

۷۵ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ○

ترجمہ

۷۳ قریب تھا کہ ہم نے تجھے جو وحی کی ہے اس کے بارے میں (اپنے وسوسوں کے ذریعے) تجھے فریب دیں تاکہ تُو اس کی بجائے کسی اور کی ہماری طرف نسبت دے اور اس صورت میں وہ تجھے اپنا دوست قرار دے لیں۔

۷۴ اگر ہم تجھے ثابت قدم نہ رکھتے (اور تُو مقامِ عصمت کی وجہ سے انحراف سے محفوظ نہ ہوتا) تو قریب تھا کہ تُو کچھ اُن کی طرف مائل ہو جاتا۔

۷۵ اور اگر تُو ایسا کرتا تو ہم تجھے (مشرکین کی نسبت) دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دوگنی سزا کا مزہ چکھاتے پھر ہمارے مقابلے میں تجھے کوئی مددگار نہ ملتا۔

شانِ نزول

ان بحث انگیز آیات کے بارے میں مفسرین نے مختلف شانِ نزول نقل کی ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ایسی ہیں جو ان آیات کی تاریخِ نزول سے مطابقت نہیں رکھتیں لیکن چونکہ بعض منحرف لوگوں نے انہیں دستاویز بنا لیا ہے لہٰذا ہم ان سب کا ذکر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں پانچ مختلف

اقوال نقل کیے ہیں :

۱۔ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا :

ہم تجھے اس وقت تک حجرِ اسود کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دے سکتے جب تک کم از کم تُو ہمارے خداؤں کو احترام کی نظر سے نہ دیکھے ۔

رسول اللہؐ نے دل میں خیال کیا کہ خدا تو جانتا ہے کہ مَیں ان بتوں سے متنفر ہوں لہٰذا اس میں کیا حرج ہے کہ مَیں ان کی طرف دیکھ لوں تاکہ یہ لوگ مجھے حجرِ اسود کو ہاتھ لگانے دیں ۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کام سے منع کیا گیا ۔

۲۔ قریش نے تجویز کیا :

ہمارے خداؤں کو بُرا کہنا چھوڑ دے ۔ ہمیں کم عقل کہنے سے باز آجا اور ان حقیر غلاموں کو اپنے سے دُور کر دے کہ جن سے ہمیں بدبو آتی ہے تاکہ ہم تیری مجلس میں حاضر ہوں اور تیری باتیں سنیں ۔

اس امید پر کہ شاید یہ لوگ مسلمان ہو جائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوچا کہ (چاہے وقتی طور پر ہی سہی) ان کی بات مان لی جائے ۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور آپ کو اس کام سے روکا گیا ۔

۳۔ رسول اللہؐ نے بتوں کو مسجد حرام سے نکال باہر پھینکا تو قریش نے تقاضا کیا کہ آپ اجازت دیں کہ جو بُت خانہ کعبہ کے نزدیک کوہِ مروہ پر تھا اسے وہیں رہنے دیا جائے ۔

پہلے تو پیغمبر اکرمؐ نے سیاسی مقاصد کے پیشِ نظر ارادہ کیا کہ ان کی بات مان لی جائے لیکن بعد ازاں اس ارادے کو ترک کر دیا اور حکم دیا کہ یہ بُت بھی توڑ دیا جائے ۔

اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں ۔

۴۔ ثقیف قبیلے کے کچھ نمائندے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ انہوں نے عرض کیا :

ہم آپ کی بیعت کرنے کو تیار ہیں لیکن ہماری تین شرطیں ہیں ۔ پہلی یہ کہ ہم نماز میں رکوع و سجود کے لیے نہیں جھکیں گے ۔ دوسری یہ کہ ہم اپنے بتوں کو اپنے ہاتھ سے نہیں توڑیں گے بلکہ آپ خود توڑیں ۔ تیسری یہ کہ آپ اجازت دیں کہ ‹لات› کو ایک سال تک باقی رہنے دیا جائے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

وہ دین جس میں رکوع و سجود نہ ہو وہ کسی کام کا نہیں ۔ رہا تمہارے بتوں کو تمہارے اپنے ہاتھ سے توڑنا تو اگر چاہو تو اپنے ہاتھ سے توڑ دو اگر تمہارا دل نہیں چاہتا تو ہم خود توڑ دیں گے ۔

رہی "لات" کے بارے میں تمہاری بات تو میں تمہیں اس قسم کی اجازت نہیں دیتا۔
اس موقع پر رسول اللہؐ کھڑے ہوگئے اور وضو کیا تو حضرت عمر نے لوگوں کی طرف رُخ کیا اور کہا :
رسول کو کیوں اذیت دیتے ہو وہ ہرگز اجازت نہیں دیں گے کہ سرزمین عرب میں بُت
باقی رہیں۔
لیکن وہ لوگ یہی تقاضا کرتے رہے یہاں تک کہ مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں۔
۵۔ قبیلہ "ثقیف" کے چند نمائندے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔
وہ کہنے لگے :
ہمیں ایک سال کے لیے اجازت دیجئے کہ لوگ بتوں کے لیے جو ہدیے اور تحفے لاتے
ہیں وہ ہم لے لیں۔ اس کے بعد ہم خود بتوں کو توڑ دیں گے اور اسلام لے آئیں گے۔
رسول اللہؐ اس سوچ میں تھے کہ بعض پہلوؤں کے پیش نظر انہیں یہ مہلت دے دیں کہ مذکورہ بالا
آیات نازل ہوئیں اور اس امر سے شدت کے ساتھ منع کیا گیا۔
ان کے علاوہ بھی ان سے ملتی جلتی کچھ شان نزول نقل ہوئی ہیں لیکن شاید وضاحت کی ضرورت نہ
ہو کہ ان میں سے اکثر کا غلط ہونا خود انہی میں پوشیدہ ہے کیونکہ رسول اللہؐ کی خدمت میں قبائل کے
نمائندوں کا آنا جانا اور آپؐ سے تقاضا کرنا یا بتوں کو مسجدالحرام سے باہر پھینکنا اور انہیں توڑنا یہ سب
فتح مکہ کے بعد ہجرت کے آٹھویں سال کے واقعات ہیں جبکہ یہ سورت بنیادی طور پر ہجرت سے پہلے نازل
ہوئی اور اس زمانے میں ظاہری طور پر پیغمبر اکرمؐ کو ایسا اقتدار حاصل نہ تھا کہ مشرکین آپؐ کے سامنے
ایسی انکساری کرتے۔
اس سے قطع نظر بعض دیگر شان نزول کا بے بنیاد ہونا تفسیر کے ضمن میں پیش کی جانے والی توضیحات
سے واضح ہوجائے گا۔

تفسیر

شرک کیلئے تھوڑے سے جھکاؤ کی سزا

گزشتہ آیات میں شرک اور مشرکین کے بارے میں بحث تھی۔ زیر نظر آیات میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ
وآلہٖ وسلم کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ ان لوگوں کے وسوسوں سے بچیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ شرک و بت پرستی کے
خلاف معرکے میں تھوڑی سی بھی کمزوری پیدا ہوجائے لہٰذا ضروری ہے کہ مکمل قاطعیت کے ساتھ یہ
معرکہ جاری رہے۔
پہلے فرمایا گیا ہے، قریب تھا کہ ان کے وسوسے تیرے دل پر اثر انداز ہوتے اور ہم نے جو تجھے وحی

کی ہے اس کے بارے میں تجھے فریب دیتے تاکہ تُو اس کی بجائے کسی اور کی ہماری طرف نسبت دے اور پھر وہ تجھے اپنا دوست مان لیتے (وان کادوا لیفتنونک عن الذی اوحینا الیک لتفتری علینا غیرہ واذًا لاتخذوك خلیلًا)۔

اور اگر ہم تیرے دل کو حق و حقیقت پر ثابت قدم نہ رکھے ہوتے (اور نورِ عصمت کے باعث تُو ثابت قدم نہ ہوتا) تو قریب تھا کہ تُو تھوڑا سا ان پر اعتماد کرتا اور ان کی طرف مائل ہو جاتا (ولولا ان ثبتناك لقد کدت ترکن الیهم شیئًا قلیلًا)۔

اور اگر تُو ایسا کر لیتا تو ہم تجھے مشرکین کی دنیاوی اور اُخروی سزا سے دوگنی سزا چکھاتے اور پھر ہمارے مقابلے میں تیرا کوئی مددگار نہ ہوتا (اذًا لاذقناك ضعف الحیٰوة وضعف الممات ثم لا تجد لك علینا نصیرًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا یہ کشادہ دلی تھی؟: بعض بہانہ سازوں نے انبیاء کے غیر معصوم ہونے کے بارے میں اپنے عقیدے کے لیے مندرجہ بالا آیات کو دستاویز بنانا چاہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان آیات اور ان کے بارے میں منقول شانِ نزول سے ظاہر ہوتا ہے کہ بُت پرستوں کے وسوسوں کے سامنے رسول اللہؐ نے کچھ میلان ظاہر کیا اور فوراً اللہ نے ان سے مواخذہ کیا۔

لیکن زیرِ بحث آیات تو اس قدر واضح اور منہ بولتا ثبوت ہیں کہ اس طرزِ فکر کے بطلان کے لیے ہمیں دیگر شواہد پیش کرنے سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ زیرِ بحث دوسری آیت صراحت سے کہتی ہے: "اگر ہم نے تجھے ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو قریب تھا کہ تُو اُن کی طرف مائل ہو جاتا"۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ "تثبیتِ الٰہی" یعنی اللہ کی طرف سے ثباتِ قدم جسے ہم "مقامِ عصمت" سے تعبیر کرتے ہیں اس میلان میں رکاوٹ بن گیا نہ یہ کہ رسول اللہؐ مائل ہو چکے تھے اور خدا نے انہیں منع کیا اور اُن کا مواخذہ کیا۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ پہلی اور دوسری آیت میں درحقیقت رسول اللہؐ کی دو مختلف حالتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پہلی حالت کہ جو بشری اور ایک عام انسان کی حالت ہے، اس کی طرف پہلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اور یہ حالت ہے دشمنوں کے وسوسوں کی اثر اندازی خصوصاً جبکہ اس میلان میں ظاہراً مصلحتیں بھی دکھائی دیں۔ مثلاً اس میلان کے بغیر سردارانِ قریش کے اسلام لانے کی امید یا خوں ریزی اور زیادہ مشکلات سے بچت، ہر عام آدمی چاہے وہ جتنا بھی قوی ہو ایسے وسوسوں کی اثر خیزی کا احتمال ہوتا ہے۔

لیکن دوسری آیت روحانی پہلو، عصمت الٰہی اور پروردگار کا لطف خاص بیان کرتی ہے وہ لطف خاص کہ جو انبیاء، اور خصوصاً پیغمبر اسلامؐ کے بحرانی لمحات میں شاملِ حال تھا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ طبیعت بشری کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، ان وسوسوں کو قبول کرنے کے قریب تو ہوئے لیکن تائیدِ الٰہی نے انہیں بچالیا اور ان کی حفاظت کی۔

یہ بعینہٖ وہی تعبیر ہے جو سورۂ یوسف میں ہے کہ انتہائی بحرانی لمحات میں برہانِ الٰہی نے اُن کا رُخ کیا اور اگر اس برہان کا مشاہدہ نہ ہوتا تو عزیزِ مصر کی بیوی کے انتہائی قوی وسوسوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے۔ قرآنی الفاظ میں :

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۚ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۚ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝ (یوسف ـ ۲۴)

ہمارے نظریے کے مطابق زیرِ بحث آیات نہ صرف یہ کہ نفیِ عصمت کے لیے دلیل نہیں ہیں بلکہ عصمت پر دلالت کرنے والی آیات میں سے ہیں کیونکہ مسلماً یہ تثبیتِ الٰہی (افکار و میلانات اور عملی اقدامات کے لحاظ سے خدا کی طرف سے ثباتِ قدم) صرف اسی موقع پر نہ تھا کیونکہ اس سے مشابہ مواقع پر بھی اس کی دلیل موجود ہے۔ لہٰذا یہ انبیاء اور ہادیانِ الٰہی کے معصوم ہونے پر ایک شاہد زندہ ہے۔

رہی تیسری آیت کہ جو کہتی ہے : اگر تیرا میلان ان کی طرف ہوجاتا تو تجھے شدید عذاب ہوتا ـــ تو یہ اسی چیز کی دلیل ہے جو عصمتِ انبیاء سے مربوط مباحث میں آئی ہے کہ ان کا معصوم ہونا اضطراری پہلو نہیں رکھتا بلکہ ایک قسم کی خود آگہی کے ساتھ ہے کہ جو اختیار اور ارادے کی آزادی کے ساتھ انجام پاتی ہے لہٰذا ایسی حالت میں ارتکابِ گناہ عقلاً محال نہیں ہے بلکہ آگہی و ایمان کے اعلیٰ درجے کی وجہ سے عملاً یہ حضرات ہرگز گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ فرض کریں اگر وہ گناہ کرتے تو ان پر بھی خدائی عذاب ہوتا (غور کیجئے گا)[1]

۲۔ دوگنا عذاب کیوں ؟ : واضح ہے کہ علم و آگہی، معرفت و ایمان اور ایقان کے لحاظ سے انسان کا مقام جس قدر بلند ہوگا اس کے نیک اعمال اتنے ہی گہرے اور زیادہ قدر و قیمت کے ہوں گے۔ ظاہر ہے ثواب و جزا بھی زیادہ ہوگی۔ اسی لیے بعض روایات میں ہے :

ان الثواب علی قدر العقل

ثواب انسان کی عقل کے حساب سے دیا جائے گا[2]

---

[1] اس بات کی مزید تفصیل کتاب "رہبرانِ بزرگ" میں پڑھیں۔

[2] اصول کافی ج۱ کتاب "العقل والجہل" حدیث ۸

عذاب اور سزا بھی اسی نسبت سے ہوگی۔ ایک اَن پڑھ ضعیف الایمان انسان گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہو تو زیادہ غیر متوقع نہیں ہے لہذا اسے سزا بھی کم ملے گی لیکن اگر ایک باایمان، صاحبِ علم جس کا ماضی روشن ہو وہ کوئی چھوٹا سا گناہ بھی انجام دے تو بہت تعجب ہوگا اور ہوسکتا ہے کہ اس چھوٹے گناہ پر اس کی سزا اس عام اَن پڑھ آدمی کے گناہِ کبیرہ کی سزا سے شدید تر اور سنگین تر ہو۔

اسی بنا پر قرآن مجید میں پیغمبر اکرمؐ کی بیویوں کے بارے میں ہے:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ○ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ○

اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کوئی واضح بُرا اور ناپسندیدہ عمل انجام دے گی اس کے لیے دوگنا عذاب ہوگا اور خدا کے لیے یہ امر آسان ہے اور تم میں سے جو خدا اور اس کے رسول کے سامنے خضوع کرے گی اور عمل صالح انجام دے گی ہم اسے دوگنی جزا دیں گے اور اس کے لیے ہم نے آبرومندانہ رزق تیار کر رکھا ہے۔ (احزاب - ۳۰، ۳۱)

روایات میں بھی ہے:

يغفر للجاهل سبعون ذنبا قبل ان يغفر للعالم ذنب واحد[1]

خدا جاہل کے ستّر گناہوں سے درگزر کر دے گا اس سے پہلے کہ عالم کے ایک گناہ سے درگزر کرے۔

مندرجہ بالا آیات بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ یہ پیغمبرؐ سے کہہ رہی ہیں کہ اگر تم نے شرک و مشرکین کی طرف میلان کیا تو تمہاری دنیا و آخرت کی سزا دوگنی ہوگی۔

۲۔ "ضعف" کا مفہوم: اس نکتے کی طرف بھی پوری توجہ ضروری ہے کہ عربی زبان میں "ضعف" صرف دوگنا کے معنی میں نہیں ہے بلکہ دوگنا اور کئی گنا کے معنی میں ہے۔

آٹھویں صدی کا مشہور لغت شناس فیروز آبادی کتاب "قاموس" میں کہتا ہے:

کبھی "ضعف فلان شیئ" کہا جاتا ہے اور اس کا مطلب دوگنا یا تین گنا ہوتا ہے کیونکہ یہ لفظ لاحدود اضافے کے معنی میں آتا ہے۔

اس بات کا شاہد یہ ہے کہ آیاتِ قرآن میں "حسنات" کے بارے میں ہے:

اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا

اگر عمل حسنہ ہو تو خدا اسے کئی گنا کر دیتا ہے۔ (نساء - ۴۰)

---

[1] اصول کافی جلد اول صفحہ ۳۷

اور کبھی قرآن کہتا ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا

جو کوئی ایک نیکی انجام دے گا اسے اس کے دس گنا جزا ملے گی۔ (انعام - ۱۶۰)

روایات اسلامی میں امام صادق علیہ السلام سے سورہ بقرہ کی آیہ ۲۶۱ کی تفسیر میں مروی ہے:

اذا احسن المؤمن عمله ضاعف الله عمله بكل حسنة سبع مأة ضعف،
وذلك قول الله والله يضاعف لمن يشاء۔

جس وقت کوئی صاحب ایمان کوئی نیک عمل انجام دیتا ہے تو اللہ ہر نیک عمل کے بدلے سات سو کا اضافہ کر دیتا ہے اور خدا کے اس قول کا یہی مطلب ہے جس میں وہ فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ

خدا جس کے عمل کو چاہتا ہے کئی گنا کر دیتا ہے[1]

لیکن یہ بات اس سے مانع نہیں کہ اس لفظ کے تثنیہ یعنی "ضعفان" یا "ضعفین" کا معنی دوگنا ہوتا ہے یا جس وقت اضافت کے ساتھ ہو تو تین گنا کا معنی ہوتا ہے مثلاً ہم کہیں "ضعف الواحد" (غور کیجئے گا)۔

۴۔ "اذا لا تخذوك خليلا" کی تفسیر: مفسرین میں اس کا یہ معنی مشہور ہے:

اگر تو مشرکین کی خواہشات کی طرف مائل ہوتا تو وہ تجھے اپنا دوست قرار دیتے۔

لیکن بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ اس جملے کا معنی یہ ہے:

اگر تو مشرکین کی خواہشات کی طرف مائل ہوتا تو وہ تجھے فقیر اور اپنا نیازمند قرار دیتے۔

پہلی صورت میں "خلیل" "خلہ" (بروزن "قلہ") سے دوست کے معنی میں ہے۔

دوسری صورت میں "خلیل" "خلہ" (بروزن "غلہ") نیازمند و فقیر کے معنی میں ہے۔

لیکن واضح ہے صحیح وہی پہلی تفسیر ہے۔

۵۔ خدایا! ہمیں ہمارے سپرد نہ کر: منابع اسلامی میں ہے کہ جس وقت زیر نظر آیات نازل ہوئیں تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا:

اللهم لا تكلنى الى نفسى طرفة عين ابداً

خدایا! مجھے پلک جھپکنے کے برابر بھی میرے اپنے سپرد نہ کر۔

---

[1] تفسیر المیزان ج ۲ صفحہ ۴۲۲ بحوالہ تفسیر عیاشی - ۸

رسول اللہ کی یہ معنی خیز دعا ہم سب کو ایک اہم درس دیتی ہے اور وہ یہ کہ ہمیں ہر حالت میں خدا کی بارگاہ میں پناہ لینی چاہیئے اور اس کے لطف و کرم کا سہارا لینا چاہیئے۔ کیونکہ معصوم انبیاء بھی اس کی مدد کے بغیر لغزشوں سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے چہ جائیکہ ہم کہ جو شیطانی وسوسوں میں گھرے رہتے ہیں۔

(۷۶) وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ○

(۷۷) سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ○

ترجمہ

(۷۶) قریب تھا کہ وہ تجھے مکر و فریب اور شاطرانہ سازش کے ذریعے اس سرزمین سے باہر نکال دیتے لیکن اگر وہ ایسا کرتے تو (سخت عذابِ خدا میں گرفتار ہو جاتے اور) تیرے بعد زیادہ دیر باقی نہ رہتے۔

(۷۷) (ہماری) یہ سنت ان انبیاء کے بارے میں ہے کہ جنہیں ہم نے تجھ سے پہلے بھیجا ہے اور تو ہماری سنت میں ہرگز کوئی تغیر نہیں پائے گا۔

شانِ نزول

مشہور ہے کہ زیرِ نظر آیات اہلِ مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ انہوں نے رسول اللہ کو مکہ سے نکال دینے کے لیے آپس میں گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ بعد میں ان کا پروگرام بدل گیا۔ اب انہوں نے ارادہ کیا کہ رسول اللہ کو قتل کر دیں۔ انہوں نے آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ آپ اس محاصرے میں سے اعجاز آمیز طریقے سے باہر آ گئے اور مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے ۔۔۔ یہاں سے آپ کی ہجرت

کی ابتدار ہوتی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ آیات مدینہ کے یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئیں جنھوں نے آپؐ کو مدینہ سے نکالنے کے لیے ایک سازش تیار کی۔ اس کے تحت وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کہنے لگے: یہ سرزمین تو انبیار کی سرزمین نہیں ہے۔ انبیار کا علاقہ تو شام ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپؐ کی دعوت ترقی کرے تو وہاں چلے جائیے۔

لیکن۔ یہ دیکھتے ہوتے کہ یہ سورت مکّی ہے، دوسری شانِ نزول درست معلوم نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں جیسا کہ ہم تفسیر میں دیکھیں گے زیرِ نظر آیات کے الفاظ بھی اس شانِ نزول سے مناسبت نہیں رکھتے۔

تفسیر

ایک اور منحوس سازش

گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ مشرکین طرح طرح کے وسوسوں کے ذریعے رسولِ اکرمؐ پر اثر انداز ہونا چاہتے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ آپؐ کو جادۂ مستقیم سے اِدھر اُدھر کر دیں لیکن لطفِ الٰہی نے نبی کریمؐ کی مدد کی اور مشرکوں کی سازشیں نقش بر آب ہوگئیں۔

اس واقعہ کے بعد زیرِ بحث آیات بتاتی ہیں کہ انھوں نے رسول اللہؐ کی دعوت کو ناکام بنانے کے لیے ایک پلان تیار کیا۔ اس کے مطابق ان کا پروگرام تھا کہ آپؐ کو آپؐ کے پیدائشی وطن سے دُور کسی ایسی جگہ جلاوطن کر دیں کہ جو ویران، غیر متحرک اور دور افتادہ ہو۔ ان کا یہ منصوبہ بھی لطفِ الٰہی سے ناکام ہوگیا۔

زیرِ نظر پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: قریب تھا کہ وہ ایک شاطرانہ سازش کے ذریعے تجھے اس سرزمین سے باہر نکال دیں (وان کادوا لیستفزونك من الارض لیخرجوك منھا)۔

"یستفزون" کا مادہ "استفزاز" ہے یہ کبھی بیخ کنی کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی سرعت اور مہارت کے ساتھ کسی کو کسی کام پر ابھارنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس مادہ کے ان معانی کی طرف توجہ کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین نے بڑی سوچ بجھ کے ایک سازش تیار کی تھی کہ حالات ایسے پیدا کر دیئے جائیں کہ جنھیں رسول اللہؐ گوارا نہ کر سکیں یا سادہ لوح افراد کو رسول اللہؐ کے خلاف اس قدر بھڑکا دیا جائے کہ وہ آپؐ کو مکہ سے نکال کر دم لیں۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی طاقت سے بالاتر خدائے بزرگ و برتر کی قدرت ہے اور وہ اس کے ارادے کے مقابلے میں بہت ہی ناتواں ہیں۔

اس کے بعد قرآن انہیں خبردار کرتا ہے کہ "اگر وہ اس قسم کا کام انجام دیتے تو تیرے بعد زیادہ دیر تک باقی نہ رہ سکتے (واذا لا یلبثون خلافک الا قلیلاً)۔

اور وہ بہت جلد نابود ہو جاتے کیونکہ یہ بہت ہی بڑا گناہ ہے کہ لوگ اپنے ہمدرد اور نجات بخش رہبر کو اپنے شہر سے نکال دیں اور اس طرح سے خدا کی سب سے بڑی نعمت کا کفران کریں۔ لوگ ایسے کام کے بعد زندہ رہنے کا حق نہیں رکھتے اور خدا کا نابود کن عذاب ان کے پاس آکے رہے گا۔

یہ بات صرف مشرکین عرب سے مربوط نہیں ہے۔ یہ اُن انبیاء کے ساتھ سنت رہی ہے جنہیں ہم نے تجھ سے پہلے بھیجا اور ہماری سنت کبھی نہیں بدلتی" (سنة من قد ارسلنا قبلك من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحویلاً)۔

اس سنت کا سرچشمہ ایک واضح منطق ہے اور وہ یہ کہ اس قسم کی ناشکری قوم کہ جو اپنے چراغ ہدایت کو خود بجھا دے جو اپنی نجات کے نشے کو خود گنوا دے اور اپنے ایسے طبیب کو آزار پہنچائے جو ان کے جانکاہ امراض کا علاج کرنے والا ہو۔ یقیناً ایسی قوم رحمتِ الٰہی کے لائق نہیں اور اسے عذاب آلے گا۔

ہم جانتے ہیں کہ ایسے نہیں ہو سکتا کہ خدا اپنے بندوں میں تبعیض و امتیاز کا قائل نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی ایک عمل پر بعض کو تو سزا دے اور بعض کو چھوڑ دے۔ ایک جیسے حالات میں ایک جیسے اعمال پر ایک جیسی سزا دیتا ہے۔ یہ ہے پروردگار کی سنت کا تبدیل نہ ہونا۔ جبکہ خود غرض انسانوں کے طور طریقے اور اصول ہر روز ان کے مفادات کی روشنی میں بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ آج ایک چیز ان کے لیے سود مند ہے تو آج کی سنت اور ہے اور کل اگر ان کا مفاد کسی اور میں ہے تو کل ان کا اصول کوئی اور ہوگا، یہاں تک کہ ایک ہی سانس میں متضاد طور طریقے اختیار کر لیتے ہیں۔

انسانی معاشرے میں سنن اور طور طریقے یا تو مجہول معاملات کی وجہ سے بدل جاتے ہیں۔ اس طرح سے کہ مجہول معاملات وقت گزرنے کے ساتھ واضح ہو جاتے ہیں جس سے یہ کھلتا ہے کہ ماضی میں لوگ اشتباہات میں تھے یا پھر مخصوص مفادات اور حالات کے تقاضے بدل جاتے ہیں یا پھر ایسا خود غرضی کی بناء پر ہوتا ہے جبکہ خدا کی پاک ذات میں ان مسائل کی کوئی گنجائش نہیں اس نے حکمت کی بناء پر جو سنت مقرر کی ہوتی ہے ان حالات کے لیے وہ ہمیشہ جاری رہتی ہے۔

(۷۸) اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيۡلِ وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ‌ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ كَانَ مَشۡهُوۡدًا ○

(۷۹) وَمِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنۡ يَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ○

(۸۰) وَقُلْ رَّبِّ اَدۡخِلۡنِىۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِىۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّاجۡعَلۡ لِّىۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ سُلۡطٰنًا نَّصِيۡرًا ○

(۸۱) وَقُلۡ جَآءَ الۡحَـقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ‌ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ كَانَ زَهُوۡقًا ○

ترجمہ

(۷۸) نماز قائم کر زوالِ خورشید سے لے کر (نصف) شب کی انتہائی تاریکی تک اور اسی طرح قرآنِ فجر (نمازِ فجر) کیونکہ قرآنِ فجر کا (رات اور دن کے فرشتے) مشاہدہ کرتے ہیں۔

(۷۹) رات کے ایک حصے میں نیند سے اٹھ کھڑا ہو اور قرآن (نماز) پڑھ یہ تیرے لیے ایک اضافی فریضہ ہے تاکہ تیرا پروردگار تجھے مقامِ محمود کی بلندی عطا کرے۔

(۸۰) اور کہہ دے: پروردگار! مجھے (ہر کام میں) سچے طریقے سے داخل کر اور سچے طریقے سے نکال اور اپنی طرف سے کسی کو میرا سلطان و مددگار قرار دے۔

(۸۱) اور کہہ دے: حق آگیا اور باطل نابود ہوگا اور (اصولاً) باطل ہے ہی

نابود ہونے والا۔

تفسیر

باطل کا انجام نابودی ہے

گزشتہ آیات میں توحید و شرک کے مسائل پر گفتگو تھی، مشرکوں کی سازشوں اور وسوسوں کا ذکر تھا۔ زیرِ نظر آیات میں نماز توجہ اِلی اللہ، عبادت خدا اور اس کے حضور میں تضرع و زاری کا ذکر ہے۔ یہ سب کچھ شرک کے مقابلے کے لیے مؤثر عامل ہے اور انسانی قلب و روح سے ہر قسم کے شیطانی وسوسے دور کرنے کا ذریعہ ہے۔

جی ہاں! نماز ہی ہے جو انسان کو خدا کی یاد دلاتی ہے، انسانی قلب و روح سے غبارِ گناہ کو صاف کرتی ہے اور شیطانی وسوسوں کو دُور کرتی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: زوالِ خورشید سے نصف شب تک نماز قائم کر اور اسی طرح قرآنِ فجر (یعنی نمازِ فجر) کیونکہ یہ وہ نماز ہے جس پر رات اور دن کے فرشتوں کی توجہ ہے (اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل وقرآن الفجر ان قرآن الفجر کان مشهودًا)۔

"دلوک الشمس" کا معنی نصف النہار سے زوالِ آفتاب ہے کہ جو نمازِ ظہر کا وقت ہے۔ یہ "دلک" کے مادہ سے لیا گیا ہے اس کا معنی ہے "مَلنا" کیونکہ اس موقع پر سورج کی شدتِ تپش کے باعث انسان اپنی آنکھوں کو مَلتا ہے یا پھر یہ ترکیب "دلک" سے مائل ہونے اور جھکنے کے معنی میں ہے چونکہ سورج اس موقع پر مقامِ نصف النہار سے مغرب کی طرف جھکتا ہے یا یہ کہ انسان اپنے ہاتھ کو سورج کے سامنے حائل کرتا ہے گویا اس کی روشنی کو اپنی آنکھوں سے دور کرتا ہے اور آنکھ کو دوسری طرف مائل کرتا ہے۔

بہرحال مصادرِ اہلِ بیتؑ سے پہنچنے والی روایت میں "دلوک" کا معنی زوالِ آفتاب ہی کیا گیا ہے۔

امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت مروی ہے۔ آپؑ سے عبید بن زرارہ نے اسی آیت کی تفسیر پوچھی تو امامؑ نے فرمایا:

> خدا نے مسلمانوں پر چار نمازیں واجب کی ہیں جن کی ابتداء زوالِ آفتاب ہے اور انتہا نصف شب ہے[1]

ایک اور روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ عظیم شیعہ محدث زرارہ نے اس آیت کی

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۱۱۵۔

تفسیر کے متعلق سوال کیا تو امام نے فرمایا :

دلوکہا زوالہا، غسق اللیل الی نصف اللیل، ذٰلک اربع صلوات وضعهن رسول اللہ (ص) و وقتهن للناس وقرآن الفجر صلوة الغداة

"دلوک الشمس" زوالِ آفتاب کے معنی میں ہے اور "غسق اللیل" آدھی رات کے معنی میں ہے۔ یہ چار نمازیں ہیں کہ جو رسول اللہ نے لوگوں کے لیے واجب قرار دی ہیں اور ان کا وقت معین کیا ہے اور "قرآن الفجر" نمازِ صبح کی طرف اشارہ ہے [1]

البتہ بعض مفسرین نے "دلوک" کے معنی کے بارے میں کچھ اور احتمالات بھی ذکر کیے ہیں جو قابلِ ملاحظہ نہیں ہیں۔

باقی رہا "غسق اللیل" تو اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "غسق" کا معنی انتہائی تاریکی ہے اور رات کی انتہائی تاریکی نصف شب کے وقت ہوتی ہے، یہ آدھی رات کے معنی میں ہے۔

"قرآن" کا معنی ہے وہ چیز جسے پڑھا جائے۔ لہٰذا "قرآن الفجر" بھی نتیجتاً نمازِ فجر کی طرف اشارہ ہے۔

ان مفاہیم کے پیشِ نظر زیرِ بحث آیت ان آیات میں سے ہے جن میں پنجگانہ نمازوں کی طرف اجمالی طور پر اشارہ کیا گیا ہے۔ اسے دیگر متعلقہ آیات کے ساتھ باہم ملا کر دیکھا جائے تو اس سے نمازوں کے اوقات معین ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو بہت سی روایات مروی ہیں ان میں وضاحت سے پنجگانہ نماز کا وقت بتایا گیا ہے۔

یہاں اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ قرآن کی بعض آیات صرف ایک نماز کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مثلاً :

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى

اپنی نماز کی حفاظت کرو اور نمازِ وسطیٰ کی (بقرہ - ۲۳۸)

صحیح تفسیر کے مطابق "صلوٰۃ وسطیٰ" سے مراد نمازِ ظہر ہے۔

کبھی پنجگانہ نمازوں میں سے تین کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً :

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ (ہود - ۱۱۴)

اس آیت میں "طرفی النھار" نمازِ صبح اور نمازِ مغرب کی طرف اشارہ ہے اور "زلفاً من اللیل" نمازِ عشاء کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۲۰۵۔

کبھی قرآن میں پنجگانہ نمازوں کے اوقات اجمالی طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ اس کی مثال زیرِ بحث آیت ہے۔ (اس سلسلے میں مزید تفصیل ہم تفسیرِ نمونہ جلد ۵ میں سورہ ہود کی آیہ ۱۱۴ کی تفسیر کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں)۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ ان آیات میں پنجگانہ نمازوں کے اوقات کی تفصیل بیان نہیں ہوئی بلکہ دیگر اسلامی احکام کی طرح صرف کلیات بیان کرنے پر اکتفاء کی گئی ہے۔ ان کی تشریح و تفصیل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے پیچھے جانشین آئمہ علیہم السلام کی سنت میں آئی ہے۔

ایک اور نکتہ جو اس جگہ باقی رہ جاتا ہے یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت کہتی ہے:

"ان قرآن الفجر کان مشہودًا"

نمازِ صبح کو دیکھا جاتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کون اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔

آیت کے اس حصے کی تفسیر میں جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ان کے مطابق شب و روز کے فرشتے اس نماز کو دیکھتے ہیں کیونکہ ابتدائے صبح کے وقت رات کے فرشتے جو بندگانِ خدا کے نگران و محافظ ہوتے ہیں وہ دن کے فرشتوں کو اپنی جگہ سونپتے ہیں اور جب نمازِ صبح اسی طلوعِ سحر کے آغاز میں ادا کی جاتی ہے تو رات کو جانے والے اور دن کے آنے والے فرشتوں کے دونوں گروہ اس کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس پر گواہی دیتے ہیں۔ ایسی روایات شیعہ علماء نے بھی نقل کی ہیں اور سُنّی علماء نے بھی۔

تفسیر روح المعانی میں احمد، نسائی، ابنِ ماجہ، ترمذی اور حاکم کے حوالے سے ایک روایت رسولِ اکرم سے نقل کی ہے۔ آپؐ نے اس جملے کی تفسیر میں فرمایا:

تشھدہ ملائکۃ اللیل وملائکۃ النھار

رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے اسے دیکھتے ہیں۔[1]

اہلِ سنت کے مشہور محدث بخاری اور مسلم نے بھی اپنی اپنی صحیح میں اس کا یہی معنیٰ نقل کیا ہے۔[2]

اس تعبیر سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ نمازِ فجر کی ادائیگی کا بہترین موقع طلوعِ سحر کے ابتدائی لمحات ہیں۔

پنجگانہ واجب نمازوں کے ذکر کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: رات کے کچھ حصے میں نیند سے اٹھ کھڑا ہو اور قرآن پڑھ (ومن اللیل فتھجد بہ)۔[3]

---

[1] و [2] تفسیر روح المعانی ج ۱۵ ص ۱۲۶۔

[3] جیسا کہ مفردات میں راغب نے کہا ہے "تھجد"، "ھجود" کے مادہ سے اصل میں نیند کے معنی میں ہے لیکن جب یہ لفظ باب تفعل میں استعمال ہوگا تو نیند اُڑ جانے اور بیداری کی حالت میں لوٹ آنے کے معنی دے گا۔ نیز "تھجد بہ" کی ضمیر قرآن کی طرف لوٹتی ہے۔ یعنی رات کے

(باقی اگلے صفحہ پر)

مشہور اسلامی مفسرین نے اس تعبیر کو نوافلِ شب (نمازِ تہجد) کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ ان نوافل کی روایات میں بہت فضیلت بیان ہوئی ہے۔ آیت میں اگرچہ صراحت نہیں ہے لیکن ہمارے پاس موجود مختلف قرائن کے پیشِ نظر یہ تفسیر بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: تیرے لیے یہ واجب نمازوں کے علاوہ ایک اضافی ذمہ داری ہے (نافلۃ لک)۔

بہت سے علماء نے اس جملے کو اس امر کی دلیل جانا ہے کہ نمازِ شب رسول اللہؐ پر واجب ہے کیونکہ "نافلۃ" کا معنی ہے "زیادہ"۔ گویا یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ اضافی فریضہ صرف تجھ سے مربوط ہے۔

بعض دیگر علماء نے سورۂ مزمل کی آیات کے قرینے سے کہا ہے کہ نمازِ تہجد رسول اللہؐ پر پہلے سے واجب تھی البتہ زیرِ نظر آیت نے پہلے حکم کو منسوخ کرکے اس کے مستحب ہونے کا اعلان کیا ہے۔ لیکن یہ تفسیر کمزور معلوم ہوتی ہے کیونکہ لفظ "نافلہ" یہاں آج کے اصطلاحی معنی یعنی "مستحب نماز" کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اضافے کے معنی میں ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ نمازِ شب اگر رسول اللہؐ کے لیے واجب قرار دی گئی ہے تو یہ فرائضِ یومیہ پر اضافہ ہے۔

بہرحال آیت کے آخر میں اس الٰہی، روحانی اور قلب و روح کو پاک کرنے والے کام کا نتیجہ یوں بیان کیا گیا ہے: قریب ہے کہ اس عمل کے باعث خدا تجھے مقامِ محمود پر فائز کر دے (عسیٰ ان یبعثک ربک مقاما محمودا)۔

اس میں شک نہیں کہ "مقامِ محمود" ایک بہت بڑا، اعلیٰ اور لائقِ ستائش مقام ہے کیونکہ "محمود" "حمد" کے مادہ سے ستائش و تعریف کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ یہاں چونکہ مطلق کے طور پر آیا ہے لہٰذا اشارہ ہے کہ اولین و آخرین سب تیرے مداح خواں ہیں۔

اسلامی روایات چاہے اہلِ بیتؑ سے مروی ہوں یا برادرانِ اہلِ سنت کی کتابوں میں، ان میں "مقامِ محمود" کی تفسیر "مقامِ شفاعتِ کبریٰ" کے طور پر کی گئی ہے کیونکہ پیغمبرِ اکرمؐ دوسرے جہان میں سب سے بڑے شفیع ہیں اور جو لوگ شفاعت کے لائق ہوں گے انہیں یہ عظیم شفاعت میسر آئے گی۔

بعد والی آیت میں اسلام کے ایک اصولی حکم کی طرف اشارہ ہے۔ ایسا اصولی حکم جس کا سرچشمہ روحِ ایمان و توحید ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کہہ دے: پروردگار! ہر کام میں ہمیں سچائی کے ساتھ داخل کر اور سچائی کے ساتھ نکال (وقل رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی

بقیہ گزشتہ: حاشیہ کا ایک حصہ میں بیدار رہ کر قرآن پڑھ۔ بعد ازاں یہ لفظ اہلِ شرع کی زبان میں نمازِ شب (نمازِ تہجد) کے لیے استعمال ہونے لگا اور "متہجد" نمازِ شب پڑھنے والے کو کہا جانے لگا۔

مخرج صدق)[1] کوئی کام ایسا نہ ہو جسے میں سچائی اور صدق سے شروع نہ کروں اور اسی طرح کوئی کام ایسا نہ ہو جسے میں سچائی اور صدق پر تمام نہ کروں۔ سچائی، صداقت، راستی اور امانت ہی میرا اصل راستہ ہو اور ہر کام کا آغاز و انجام اسی سچائی کے ساتھ ہو۔

بعض مفسرین نے کوشش کی ہے کہ اس آیت کے وسیع مفہوم کو ایک یا کئی ایک مصادیق میں محدود کر دیا جائے، مگر پوری طرح واضح ہے کہ زیر بحث آیت کی یہ جامع تعبیر اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہر کام اور ہر پروگرام میں صادقانہ طور پر داخل ہوا جائے اور صادقانہ طور پر نکلا جائے۔

کامیابی کی اصل رمز در حقیقت اسی میں پوشیدہ ہے۔ انبیاء الٰہی اور اولیاء اللہ کی روش یہی تھی۔ ان کی فکر، ان کی گفتار اور ان کا عمل ہر قسم کی ملاوٹ، مکر و فریب اور دھوکے سے پاک تھا۔ ہر وہ چیز جس میں صدق و راستی نہ ہو اس کا ان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اصولی طور پر وہ بہت سی بدبختیاں اور مسائل جو ہم آج دیکھ رہے ہیں اور جو افراد کو بھی دامن گیر ہیں اور اقوام و ملل کو بھی، اسی اصول سے انحراف کی وجہ سے ہیں۔ کہیں تو انہوں نے اپنے کام کی بنیاد ہی جھوٹ اور مکر و فریب پر رکھی ہے اور کہیں وہ کاموں کا آغاز تو سچائی کے ساتھ کرتے ہیں لیکن آخر تک اس سچائی پر باقی نہیں رہتے۔ ان کی ناکامی کا یہی عالم ہے۔

دوسری بات جو آیت کے آخر میں بیان کی گئی ہے وہ در اصل شجر توحید کا ثمر ہے اور دوسرے حوالے سے کاموں میں سچائی کے ساتھ داخل ہونے اور نکلنے کا نتیجہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خداوندا! اپنی طرف سے سلطان و مددگار قرار دے (واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا)۔ کیونکہ میں اکیلا ہوں اور تنہا کوئی کام انجام نہیں دے سکتا۔ خود اپنی طاقت کے بھروسے پر ان مشکلات کے مقابلے میں کامیابی حاصل نہیں کر سکوں گا۔ تو میری مدد کر اور تو میرے لیے مددگار فراہم کر۔

اس راستے میں مجھے طاقتور منطق، دشمن کے مقابل دندان شکن دلائل، جانباز دوست، قوی ارادہ، روشن فکری اور رشاد عقل مرحمت فرما تاکہ یہ تمام چیزیں میری مددگار ہوں۔ تو ہی یہ سب کچھ عطا فرما کیونکہ تیرے علاوہ یہ کام کسی کے بس کا نہیں۔

صدق و توکل کے بعد حتمی کامیابی کی امید بذات خود کامیابی کا ایک عامل ہے لہٰذا زیر نظر آخری آیت میں خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر سے کہتا ہے: کہہ دے: حق آگیا اور باطل نابود ہوگیا (وقل جاء الحق وزھق الباطل)[2]

---

[1] "مدخل" اور "مخرج" یہاں داخل ہونے اور نکلنے کے مصدری معنی میں ہیں۔

[2] "زھق" "زھوق" کے مادہ سے ہلاکت و نابودی کے معنی میں ہے اور "زھوق" (بروزن "قبول") مبالغے کا صیغہ ہے اس کا معنی ہے ایسی چیز جو پوری طرح محو اور نابود ہو جائے۔

اور اصولی طور پر باطل ہے ہی نابود ہونے والا (ان الباطل کان زھوقاً)۔
باطل بہت زور دکھاتا ہے لیکن اس کے لیے دوام و بقا نہیں ہے۔ کامیابی آخر کار حق اور اہل حق کے لیے ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ نمازِ تہجد ایک عظیم روحانی عبادت ہے: دن بھر کا شور مختلف حوالوں سے انسان کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے اور انسانی افکار کو طرح طرح کی وادیوں میں لیے پھرتا ہے۔ ایسے میں دل جمعی اور حضورِ قلب بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن — رات کی تاریکی میں وقت سحر جب مادی زندگی کا ہنگامہ نہیں ہوتا اور کچھ دیر سو جانے کے بعد جب انسانی جسم و روح کو سکون ملتا ہے۔ اس وقت انسان نشاط اور توجہ کی ایک خاص بے مثل کیفیت میں ہوتا ہے۔ ریا سے پاک، خود نمائی سے دور اور حضورِ قلب کے اس ماحول میں انسان کی آمادگی کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو بہت زیادہ روح پرور اور کمال آفریں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دوستانِ خدا اور محبانِ خدا ہمیشہ رات کے پچھلے پہر عبادت کے ذریعے روح کی پاکیزگی، دل کی زندگی، ارادے کی تقویت اور خلوص کی تکمیل کے لیے قوت حاصل کرتے ہیں۔

ابتدائے اسلام میں بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی روحانی طریقہ سے استفادہ کرتے ہوئے مسلمانوں کی تربیت کی اور ان کی شخصیت کو اتنا بلند کر دیا کہ وہ پہلے والے انسان معلوم ہی نہ ہوتے تھے گویا آپ نے ان کے اندر سے نئے انسان پیدا کر دیئے۔ وہ انسان جن کا ارادہ پختہ تھا۔ جو بہادر، باایمان، پاکباز اور باخلوص تھے اور شاید۔ مقامِ محمود، کہ جس کا ذکر زیر بحث آیات میں نمازِ شب کے نتیجے کے طور پر ہے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہو۔

نمازِ تہجد کی فضیلت میں مروی روایات بھی اسی حقیقت کو واضح کرتی ہیں۔ ہم ذیل میں چند مثالیں ذکر کرتے ہیں:

(۱) پیغمبرِ اسلامؐ فرماتے ہیں:

خیرکم من اطاب الکلام و اطعم الطعام وصلی باللیل والناس نیام

تم میں سے بہترین وہ شخص ہے جو بات بڑے ادب سے اور پاکیزگی سے کرے، بھوکوں کو کھانا کھلائے اور رات جب لوگ سو رہے ہوں وہ اٹھ کر نماز پڑھے[۱]

(۲) امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[۱] بحار الانوار ج ۸۷ صفحہ ۱۴۲ تا صفحہ ۱۴۸۔

قیام اللیل مصحة للبدن و مرضاة للرب عزوجل و تعرض للرحمة وتمسك باخلاق النبیین

رات کو اٹھ کر تہجد پڑھنا صحت بدن اور خوشنودیٔ خدا اور اس کی رحمت کا وسیلہ ہے اس عبادت سے انسان نبیوں کے اخلاق سے وابستہ ہوجاتا ہے [1]

(۳) امام صادق علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا:

لاتدع قیام اللیل فان المغبون من حرم قیام اللیل

نمازِ شب کے لیے اٹھنا ترک نہ کرو۔ وہ شخص خسارے میں ہے جو قیامِ شب سے محروم ہے [2]

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

من صلی باللیل حسن وجهه بالنهار

جو شخص نمازِ شب پڑھتا ہے دن کے وقت اس کی صورت (وسیرت) اچھی ہوگی [3]

(۵) ایک شخص حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کی خدمت میں آیا۔ اس نے عرض کی: میں نمازِ شب سے محروم ہوگیا ہوں۔

آپؑ نے فرمایا:

انت رجل قد قيدتك ذنوبك

تجھے تیرے گناہوں نے گرفتار کرلیا ہے [4]

(۶) امام صادق علیہ السلام سے ایک حدیث ان الفاظ میں منقول ہے:

ان الرجل ليكذب الكذبة ويحرم بها صلٰوة الليل فاذا حرم بها صلٰوة الليل حرم بها الرزق

انسان کبھی ایسا جھوٹ بولتا ہے کہ اس کی وجہ سے نمازِ تہجد سے محروم ہوجاتا ہے اور جب نمازِ شب سے محروم ہوتا ہے تو روزی (اور مادی و روحانی نعمتوں) سے بھی محروم ہوجاتا ہے [5]

(۷) ہم جانتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کبھی نمازِ شب ترک نہیں کرتے تھے لیکن اس نماز کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے باوجود پیغمبر اکرمؐ نے اپنی وصیتوں میں ان سے فرمایا:

اوصيك فى نفسى بخصال فاحفظها

ثم قال: اللّٰهم اعنه ..... وعليك بالصلٰوة الليل، وعليك بالصلٰوة

---

[1]، [2]، [3] بحار الانوار ج ۸۰ صفحہ ۱۴۲ تا صفحہ ۱۴۸۔

[4]، [5] بحار الانوار ج ۸۰ صفحہ ۱۴۲ تا صفحہ ۱۴۸۔

اللیل، وعلیك بالصلوة اللیل

میں تمہیں چند امور کی وصیت کرتا ہوں ان کی حفاظت کرنا

....

یہاں تک کہ فرمایا:

تیرے لیے نمازِ شب ضروری ہے، تیرے لیے نمازِ شب ضروری ہے، تیرے لیے نمازِ شب ضروری ہے [1]

(٨) پیغمبرِ اسلامؐ نے جبرئیل سے فرمایا کہ مجھے کوئی نصیحت کرو تو انہوں نے کہا:

یا محمد عش ماشئت فانك میت، واحبب ماشئت فانك مفارقه، واعمل ماشئت فانك ملاقیه، واعلم ان شرف المؤمن صلوته باللیل، وعزه کفه عن اعراض الناس

یا محمدؐ! جتنا چاہو جی لو آخر مرنا ہے، جس سے چاہو محبت کرلو آخر اس سے بچھڑنا ہے، جو کام چاہو کرلو آخر اپنے عمل کو دیکھنا ہے اور یہ بھی جان لو کہ مومن کا شرف اس کی نمازِ شب میں ہے اور اس کی عزت دوسروں کو بے عزت کرنے سے بچنے میں ہے [2]

جبرئیلؑ کی یہ ملکوتی نصیحتیں کہ جو بہت سوچی سمجھی اور جچی تلی ہیں، نشاندہی کرتی ہیں کہ نمازِ تہجد انسان کی تربیت، روحانیت اور ایمان افزودی میں اس قدر پُر تاثیر ہے کہ اس کے شرف اور اس کی آبرو کا سرمایہ بن جاتی ہے جیسا کہ لوگوں کی آبرو سے مزاحم نہ ہونا اس کی عزت کا سبب بنتا ہے۔

(٩) امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ثلاثة من فخر المؤمن وزینة فی الدنیا والاٰخرة، الصلوة فی اٰخر اللیل ویأسه مما فی ایدی الناس و ولایة الامام من اٰل محمد

تین چیزیں مومن کے لیے باعثِ افتخار ہیں اور دنیا و آخرت کی زینت ہیں:

١۔ آخر شب کی نماز

٢۔ لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے اعتنائی کرنا اور

٣۔ آلِ محمدؐ میں سے امام برحق کی حکومت و ولایت۔

(١٠) امام صادق علیہ السلام ہی سے منقول ہے، فرمایا:

---

[1] وسائل الشیعہ ج ٥ صفحہ ٢٦٨۔

[2] وسائل الشیعہ ج ٥ صفحہ ٢٦٩۔

ایک باایمان شخص جو کوئی بھی نیک کام انجام دیتا ہے، اس کی جزاو ثواب کا قرآن میں صراحت سے ذکر ہے، سوائے نمازِ تہجد کے۔ کیونکہ اس کی انتہائی زیادہ اہمیت کے پیشِ نظر اس کا ثواب صراحت سے بیان نہیں کیا گیا اور صرف اسی قدر فرمایا گیا ہے:

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (السجدہ-۱۶،۱۷)

وہ رات کے وقت اپنے بستروں سے اٹھتے ہیں اور اپنے رب کو خوف و امید کی ملی جلی کیفیت میں پکارتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں لیکن کوئی شخص نہیں جانتا کہ خدا نے ان کے لیے کیسی کیسی جزا رکھی ہے۔ ایسی جزا کہ جو اُن کی آنکھوں کو ٹھنڈا کردے گی[1]

البتہ۔ نمازِ شب کے بہت سے آداب ہیں۔ مناسب ہوگا اس کی اجمالی کیفیت ہم یہاں بیان کردیں تاکہ اس روحانی عمل کے پیچھے عاشق اس سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔

انتہائی سادہ شکل میں نمازِ تہجد کی گیارہ رکعتیں ہیں، ان کے مندرجہ ذیل تین حصے ہیں:

ا۔ دو دو کر کے آٹھ رکعتیں۔ انہیں نافلہ شب کہتے ہیں۔

ب۔ دو رکعت۔ نافلہ شفع۔

ج۔ ایک رکعت جسے "نافلہ وتر" کہتے ہیں۔

انہیں بالکل نمازِ صبح کی طرح ادا کرنا ہے۔ البتہ ان میں اذان و اقامت نہیں ہے نیز نمازِ وتر کے قنوت کو جتنا طول دیا جا سکے بہتر ہے[2]

۲۔ **"مقامِ محمود" کیا ہے؟** : جیسا کہ الفاظ بتا رہے ہیں، مقامِ محمود ایک وسیع معنی رکھتا ہے۔ اس میں ہر وہ مقام شامل ہے جو لائق تعریف و ستائش ہے لیکن مسلّم ہے کہ یہاں ایسے ممتاز اور انتہائی اعلیٰ مقام کی طرف اشارہ ہے کہ جو پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عبادتِ شب، آہِ سحرگاہی اور دعائے نیم شب سے حاصل ہوا۔

مفسرین میں مشہور ہے اور ہم بھی پہلے کہہ چکے ہیں یہ آپؐ کے لیے مقامِ شفاعت کبریٰ ہے۔

متعدد روایات میں بھی یہ تفسیر بیان ہوئی ہے۔ تفسیر عیاشی میں ہے کہ امام باقر علیہ السلام یا امام صادق علیہ السلام نے اس آیت "عسٰی ان یبعثک ربک مقامًا محمودًا" کی تفسیر میں فرمایا:

---

[1] بحار الانوار ج ۸۷ ص ۱۲۸۔

[2] کچھ فقہاء نے یہ احتیاط بیان کی ہے کہ شفع میں قنوت نہ پڑھا جائے یا پھر قصد رجاء سے پڑھا جائے۔

محمودا ـــــ الشفاعة

یہ شفاعت ہی ہے۔۔

بعض مفسرین نے کوشش کی ہے کہ خود آیت کے مفہوم سے یہ حقیقت اخذ کریں۔ ان کا خیال ہے عسیٰ ان یبعثک "اس بات کی دلیل ہے کہ یہ وہ مقام ہے جو خدا تجھے عطا کرے گا ایسا مقام کہ جو سب کو تعریف پر ابھارے گا کیونکہ سب کو اس سے فائدہ پہنچے گا (کیونکہ زیر بحث جملے میں لفظ "محمود" مطلق طور پر آیا ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی قید یا شرط نہیں ہے)۔

علاوہ ازیں تعریف و ثنا ایک اختیاری عمل پر ہوتی ہے اور ان صفات کی حامل چیز رسول اللہؐ کے عمومی مقام شفاعت کے سوا اور کوئی نہیں[1]

یہ احتمال بھی ہے کہ مقام محمود پروردگار کے انتہائی قرب کا نام ہو کہ جس کے آثار میں سے ایک شفاعت کرنا بھی ہے (غور کیجئے گا)۔

اس آیت میں اگرچہ ظاہراً رسول اللہؐ مخاطب ہیں لیکن اس حکم کو ایک لحاظ سے عمومیت دی جاسکتی ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ تمام با ایمان افراد کو جو تلاوت شب اور نماز شب کے الٰہی روحانی کام کو انجام دیتے ہیں "مقام محمود" سے اپنا حصہ لیں گے اور اپنے ایمان و عمل کے حساب سے بارگاہِ قرب الٰہی تک رسائی حاصل کریں گے اور اسی نسبت سے راستے بھولے بھٹکوں کے شفیع اور دستگیر ہوں گے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر مومن اپنے ایمان کی شعاع کے اعتبار سے مقام شفاعت سے ہمکنار ہوگا لیکن اس آیت کا اتم و اکمل مصداق پیغمبر اکرمؐ کی ذات گرامی ہے۔

۳۔ کامیابی کے تین عوامل: حق و باطل کے معرکوں میں باطل کا لشکر عام طور پر مقدار اور ساز و سامان کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود کم تعداد اور کم وسائل کے ہوتے ہوئے حق کا لشکر حیران کن کامیابیاں حاصل کرتا ہے۔ بدر، احزاب اور حنین کی جنگیں اس کی مثالیں ہیں۔ خود ہمارے زمانے میں ہم نے دیکھا کہ مستضعف حلقوں نے سُوپر طاقتوں کے خلاف اپنی انقلابی جدوجہد میں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

یہ اس لیے ہے کہ حامیانِ حق خاص روحانی طاقت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہی طاقت ایک "انسان" سے ایک "امت" بناتی ہے۔

زیر بحث آیات میں کامیابی کے تین اہم عوامل بتائے گئے ہیں۔ مسلمانوں نے آج کل ان عوامل سے زیادہ تر دُوری اختیار کر رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ متکبر دشمنوں سے مسلسل ہزیمتیں اٹھا رہے ہیں۔

---

[1] المیزان ج ۱۵ ص ۱۸۱۔

یہ تین عوامل یہ ہیں :

۱ و ۲ : کاموں میں سچائی کے ساتھ داخل ہونا اور نکلنا اور یہ طرزِ عمل مسلسل اختیار کیے رکھنا ،

رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق

۳- قدرتِ الٰہی پر بھروسہ اور خود اعتمادی نیز دوسروں سے ہر قسم کی وابستگی اور انحصار کا خاتمہ ،

واجعل لی من لدنک سلطانًا نصیرًا

لہٰذا کامیابی کے لیے سچائی کی سیاست سے زیادہ موثر کوئی چیز نہیں اور استقلال ، غیر پر عدم انحصار ۔ اور توکل علی اللہ سے بہتر و برتر کوئی سہارا نہیں ۔مسلمان ان دشمنوں کے خلاف کیونکر کامیابی حاصل کر سکتے ہیں جنھوں نے ان کے وسائلِ حیات لوٹ لیے ہیں جبکہ وہ فوجی ، اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے خود انہی دشمنوں سے وابستہ ہیں ۔ اور انہی پر انحصار کرتے ہیں ۔ وہ ہتھیار جو ہم نے ایک دشمن سے خریدا ہے اس کی مدد سے اس دشمن پر ہم کیسے کامیابی حاصل کر سکتے ہیں — یہ کیسا خام خیال اور غلط اندازِ فکر ہے ۔

۴- کامیابی حق کے لیے اور نابودی باطل کے لیے : مندرجہ بالا آیات میں ایک اور کلی اور بنیادی اصول اور خدا کی ایک دائمی سنت کا تذکرہ ہے ۔ یہ وہ اصول اور سنت ہے جو حق کے تمام پیروکاروں کے لیے ولولہ انگیز ہے ۔ وہ یہ ہے کہ آخرکار حق کامیاب اور باطل قطعی طور پر نابود ہونے والا ہے ۔

باطل صولت و دولت کا مظاہرہ کرتا ہے ، کرو فر دکھاتا ہے ، کڑکتا اور گرجتا ہے لیکن اس کی عمر مختصر ہے اور آخرکار نابودی کے گھاٹ اتر جاتا ہے ۔

یا پھر قرآن کے بقول — باطل پانی کے اوپر کی جھاگ کی مانند ہے ، آنکھ مچولی کرتا ہے ، شور و غوغا برپا کرتا ہے اور پھر خاموش ہو جاتا ہے اور پانی کہ جو سببِ حیات ہے باقی رہ جاتا ہے — قرآنی الفاظ ہیں :

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ (رعد - ۱۷)

اس بات کی دلیل خود لفظ « باطل » میں پنہاں ہے کیونکہ باطل سے مراد ایسی چیز ہے جو عالمِ خلقت کے قوانین سے ہم آہنگ نہیں ہے اور جس کا واقعیت اور حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ۔ اس کا وجود بناوٹی ، پُرفریب ، بے اصل اور بے بنیاد ہے ۔ یہ اندر سے کھوکھلا ہے ۔ مسلّم ہے جس چیز کی یہ صفات ہوں وہ زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتی ۔

لیکن ۔ « حق » عین واقعیت ہے ، راستی و درستی پر مبنی ہے ، اس کی اصل اور بنیاد ہے ، اس میں گہرائی ہے اور یہ قوانینِ آفرینش سے ہم آہنگ ہے ۔

اور ایسی چیز کو بہرحال باقی رہنا چاہیئے ۔

حق کے پیروکار ایمان کے ہتھیار سے لیس ہوتے ہیں ۔ وہ ایفائے عہد کی منطق پر یقین رکھتے ہیں صدقِ حدیث ، فداکاری اور سرفروشی ان کی خصوصیات ہیں ۔ وہ شہادت تک جانبازی دکھاتے رہنے پر آمادہ ہوتے

ہیں۔ علم و آگہی کے نور نے ان کا دل روشن کر رکھا ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور اس کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کرتے۔ یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔

۵۔ آیت "جاء الحق ..." اور قیام مہدیؑ: بعض روایات میں "جاء الحق وزھق الباطل" کے جملے کی تفسیر قیام حضرت مہدی علیہ السلام کے حوالے سے کی گئی ہے۔

امام باقر علیہ السلام نے فرمایا:

خدا کے اس کلام کا مفہوم یہ ہے کہ:

اذا قام القائم ذھبت دولة الباطل

جس وقت امام قائم قیام کریں گے باطل کی حکومت ختم ہو جائے گی[1]

ایک اور روایت میں:

جب مہدی پیدا ہوئے تو ان کے بازو پر کندہ تھا:

جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا[2]

مسلّم ہے کہ ان احادیث کا مطلب یہ نہیں کہ آیت کا مفہوم اسی ایک مصداق میں منحصر ہے بلکہ ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قیام مہدی اس آیت کے واضح ترین مصادیق میں سے ہے کہ جب پوری دنیا میں باطل پر حق کو آخری فتح حاصل ہو گی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات میں ہے کہ فتح مکہ کے روز آپ مسجد الحرام میں داخل ہوئے وہاں عرب قبائل کے ۳۶۰ بُت خانۂ کعبہ کے گرد رکھے ہوئے تھے۔ آپ اپنے عصائے مبارک سے ہر ایک کو یکے بعد دیگرے سرنگوں کرتے تھے اور مسلسل فرما رہے تھے:

جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا

آگیا حق اور مٹ گیا باطل

باطل کو تو مٹنا ہی تھا۔

مختصر یہ کہ یہ اللہ کا ایک کلی قانون اور خلقت کا غیر متبدل اصول ہے۔ ہر دور میں اس کا اپنا مصداق ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کے قیام اور شرک و بت پرستی کے لشکر پر آپ کی کامیابی اس کا ایک روشن رُخ ہے اور اسی طرح عالمی ستمگروں اور جابروں کے خلاف قیام مہدیؑ (ارواحنا له الفداء) اس کا ایک اور تابناک مصداق ہے۔

اسی طرح قانون الٰہی ہے کہ وہ راہ حق کے راہیوں کو مشکلات میں پُر امید، قوی اور پُر استقامت رکھتا ہے اور اسلام کے لیے ہماری کاوشوں پر ہمیں نشاط اور قوت بخشتا ہے۔

---

[1] و [2] نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۲۱۲ و صفحہ ۲۱۳۔

(۸۲) وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ○

ترجمہ

(۸۲) ہم قرآن نازل کرتے ہیں کہ جو مومنین کے لیے شفاء اور رحمت ہے اور اس سے ستمگروں کے لیے نقصان و زیاں کے سوا کچھ اضافہ نہیں ہوتا۔

تفسیر

قرآن شفا بخش نسخہ ہے

گزشتہ آیات میں توحید اور حق کے بارے میں گفتگو تھی نیز شرک اور باطل کے خلاف جدوجہد کے بارے میں بات تھی۔ زیر بحث آیت میں قرآن کی انتہائی اثرانگیزی اور تعمیری تاثیر کے بارے میں بات کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم قرآن نازل کرتے ہیں کہ جو مومنین کے لیے شفا اور رحمت کا سبب ہے (وننزل من القرآن ماھو شفاء ورحمة للمؤمنین)۔ لیکن ظالم (جیسا کہ ان کا ہمیشہ سے وطیرہ ہے اس وسیلۂ ہدایت سے فائدہ اٹھانے کی بجائے) اس سے اپنی زیاں کاری میں اضافہ کے سوا کچھ نہ پائیں گے (ولا یزید الظالمین الا خسارًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ "من القرآن" میں لفظ "من" کا مفہوم: ہم جانتے ہیں کہ لفظ "من" ایسے مواقع پر ایک حصہ کے مفہوم میں آتا ہے لیکن چونکہ شفا اور رحمت ہونا قرآن کے کسی ایک حصے سے مخصوص نہیں ہے یہ تمام آیات قرآن کا قطعی اثر ہے لہٰذا بزرگ مفسرین نے لفظ "من" کو یہاں تبعیضیہ کی بجائے بیانیہ سمجھا ہے۔

لیکن بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ "من" یہاں بھی تبعیض کے مفہوم میں ہے اور یہ قرآن کے تدریجی نزول کی طرف اشارہ ہے (خصوصاً جبکہ "ننزل" فعل مضارع ہے) اس صورت میں جملے کا معنی تقریباً یہ ہوگا:

ہم قرآن نازل کرتے ہیں اور اس کا جو حصہ بھی نازل ہو وہ خود سے شفاء اور رحمت کا سبب ہے۔ (غور کیجئے گا)۔

۲۔ "شفاء" اور "رحمت" میں فرق: ہم جانتے ہیں کہ شفاء عام طور پر امراض، عیوب اور نقائص کے مقابلے میں ہوتی ہے۔ لہٰذا انسانوں کے لیے قرآن کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ فرد اور معاشرے کو فکری و اخلاقی ہر طرح کی بیماریوں سے پاک کرتا ہے۔

اس کے بعد "رحمت" کا مرحلہ آتا ہے۔ یہ دراصل انسانی اخلاق کو اخلاق الٰہی کے سانچے میں ڈھالنے کا مرحلہ ہے۔ اس مرحلے میں قرآن انسانی وجود میں اعلیٰ انسانی فضائل کے شگوفوں کی پیوندکاری کرتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں "شفاء" پاکسازی کی طرف اور "رحمت" تعمیر نو کی طرف اشارہ ہے یا فلاسفہ اور عرفاء کی اصطلاح میں پہلے مقام "تخلیہ" اور پھر مقام "تحلیہ" کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔ ظالموں پر اُلٹا اثر کیوں ہوتا ہے؟: صرف اسی آیت میں نہیں بلکہ قرآن کی بہت سی دوسری آیات میں بھی ہم پڑھتے ہیں کہ دشمنانِ حق نورِ آیاتِ الٰہی سے اپنا قلب و روح منور کرنے کی بجائے اور اپنی تاریکیاں کم کرنے کی بجائے ان پر الٹا اثر لیتے ہیں۔ ان سے ان کی جہالت اور شقاوت میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔

یہ اس لیے ہے چونکہ کفر، ظلم اور نفاق کے باعث ان کا ضمیر ہی دوسری شکل اختیار کر چکا ہوتا ہے لہٰذا جہاں کہیں وہ نورِ حق دیکھتے ہیں اس سے جنگ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور حق کے خلاف ان کی یہ معرکہ آرائی ان کی ناپاکیوں اور غلاظتوں میں اضافہ ہی کرتی ہے اور ان کے سرکشی کے جذبے اور قوی ہو جاتے ہیں۔

ایک مقوی غذا اگر کسی عالم مجاہد اور دانشمند مبارز کو دی جائے تو وہ اس سے تعلیم و تربیت یا راہِ خدا میں جہاد کے لیے قوت حاصل کرے گا لیکن یہی مقوی غذا اگر کسی ظالم کو دیں تو وہ زیادہ ظلم کے لیے اس سے استفادہ کرے گا۔ یہاں غذا میں فرق نہیں بلکہ مزاج اور طرزِ فکر میں اختلاف ہے۔

قرآنی آیات بارش کے قطروں کی مانند ہیں۔ باغ میں یہ قطرے گل و لالہ اگاتے ہیں اور شور زمین میں خس و خاشاک۔

لہٰذا قرآن سے استفادہ کے لیے پہلے آمادگی کی ضرورت ہے، استعدادِ قبولیت کی حاجت ہے بااصطلاح میں کہتے ہیں فاعل کی فاعلیت کے ساتھ ساتھ محل کی قابلیت بھی شرط ہے۔

اسی بحث سے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ قرآن کہ جو سبب ہدایت ہے وہ ان افراد کو ہدایت کیوں نہیں کرتا ــ کیونکہ ــ قرآن بلاشبہ گمراہوں کی ہدایت کا باعث ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ

حق کی تلاش میں ہوں ــ لہٰذا وہ اسی جذبے سے دعوتِ قرآن کی طرف آئیں گے اور حق فہمی کے لیے اپنی عقل و فکر استعمال کریں گے۔

لیکن ہٹ دھرم، متعصب اور سوگند کھائے ہوئے حق کے دشمن قرآن کی طرف سو فیصد منفی حالت میں آئیں گے۔ ظاہر ہے اس طرح وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھائیں گے بلکہ ان کے عناد اور کفر میں اضافہ ہوگا کیونکہ غلط عمل کے تکرار سے انسانی روح میں یہ اور گہرا ہو جاتا ہے۔

۴۔ معاشرتی اور اخلاقی بیماریوں کے لیے ایک مؤثر دوا: اس میں شک نہیں کہ انسان کی روحانی و اخلاقی بیماریاں اس کی جسمانی بیماریوں سے بہت مشابہت رکھتی ہیں۔ دونوں طرح کی بیماریاں انسان کی دشمن ہیں دونوں کے لیے طبیب، علاج اور پرہیز کی ضرورت ہے۔ دونوں طرح کی بیماریاں ایک سے دوسرے کو لگ سکتی ہیں۔ دونوں کا بنیادی سبب جاننا چاہیئے اور دونوں کی اصل جڑ کو معلوم کر کے علاج کرنا چاہیئے۔

دونوں طرح کی بیماریاں بعض اوقات ایسے مرحلے پر پہنچ جاتی ہیں کہ انسان کو لاعلاج کر دیتی ہیں البتہ اکثر مواقع پر یہ قابلِ علاج ہوتی ہیں۔

یہ کیسی جاذب، عمدہ اور معنی آفرین تشبیہ ہے۔

* جی ہاں! قرآن حیات بخش نسخہ ہے۔

ان کے لیے جو جہالت، تکبر، حسد اور نفاق کے خلاف جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔

* جی ہاں! قرآن شفا بخش دوا ہے۔

زبوں حالیوں، پس ماندگیوں، بے اتفاقیوں اور بے بنیاد خطرات کے علاج کے لیے۔

* جی ہاں! قرآن شفا بخش علاج ہے۔

اس کے لیے جو دنیا کے عشق میں مبتلا ہو، جو مادیات میں گھر گیا ہو اور جو شہوتوں کے سامنے بے بس ہو گیا ہو۔

* جی ہاں! قرآن آرام بخش نسخہ ہے۔

اس دنیا کے لیے کہ جس کے ہر طرف جنگوں کی آگ بھڑک رہی ہے، اسلحے کے انباروں تلے جس کی کمر جھک گئی ہے۔ جس کے سب سے زیادہ اقتصادی و انسانی سرمائے کو جنگ اور اسلحے کے دیو اپنے قدموں تلے پامال کر رہے ہیں۔

* جی ہاں! قرآن شفا بخش نسخہ ہے۔

اس کے لیے جس کی خواہشوں اور ہَوا و ہوس کے تاریک پردے اس کے لیے قربِ الٰہی کے راستے میں حائل ہو گئے ہوں۔

سورہ یونس کی آیت ۵۷ میں ہے :

قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ

یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی شفا بن کر آیا ہے ۔

سورہ فصلت کی آیت ۴۴ میں بھی ہے :

قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ

ان سیاہ دل ہٹ دھرموں سے کہو کہ یہ قرآن اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور شفاء کا سرچشمہ ہے ۔

حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں اپنی ایک گفتگو میں اس حقیقت کو انتہائی خوبصورتی سے بیان فرمایا ہے :

فاستشفوه من ادوائکم واستعینوا به علی لاوائکم، فان فیه شفاء من اکبر الداء ، وهو الکفر والنفاق والغی والضلال

اس عظیم آسمانی کتاب سے اپنی بیماریوں کی شفا حاصل کرو ۔ اپنی مشکلات حل کرنے کے لیے اس سے مدد لو کیونکہ یہ وہ کتاب ہے جس میں سب سے بڑی بیماری کی شفا ہے ۔ وہی بیماری جسے کفر، نفاق، گمراہی اور ضلالت کہتے ہیں [1]

قرآن کے بارے میں ایک اور عبارت حضرت علی علیہ السلام ہی سے منقول ہے ۔ آپ فرماتے ہیں :

الا ان فیه علم ما یأتی والحدیث عن الماضی ودواء دائکم و نظم ما بینکم ۔

آگاہ رہو کہ اس میں آئندہ کی خبریں اور علم ہے ۔ اس میں گزشتہ قوموں کا ذکر ہے ۔ اس میں تمہارے درد کی دوا ہے اور یہ تمہاری اجتماعی زندگی کو منظم کرنے کا پروگرام ہے [2]

ایک اور مقام پر اسی بزرگ امامؑ سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

وعلیکم بکتاب الله فانه الحبل المتین والنور المبین والشفاء النافع، والری الناقع، والعصمة للمتمسك والنجاة للمتعلق، لا یعوج فیقام ، ولا یزیغ فیستعتب ، ولا تخلقه کثرة الرد و ولوج السمع ، من قال به صدق ومن عمل به سبق ۔

1۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶ ۔

2۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵۸ ۔

کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھام لو کیونکہ یہ محکم رسّی ہے، نورِ مبین ہے، شفا بخش اور بابرکت دوا ہے اور یہ وہ آبِ حیات ہے جو تشنگانِ حق کی پیاس بجھاتی ہے۔ جو شخص اس سے وابستہ ہو جائے یہ اس کی حفاظت کرتی ہے۔ جو اس کا دامن تھام لے اسے نجات بخشتی ہے۔ اس میں انحراف کے لیے کوئی راہ نہیں کہ اسے سیدھا کرنے کی ضرورت پڑے۔ یہ کبھی خطا نہیں کرتی کہ اسے اپنے قاریوں سے عذر خواہی کرنا پڑے۔ اس کے تکرار سے کہنگی نہیں ہوتی اور اسے بار بار سُن کر کان ناراحت نہیں ہوتے (اسے جس قدر پڑھتے جائیں اس کی شیرینی اور دلپذیری اس قدر ہی بڑھتی رہتی ہے)۔ قرآن سے بات کرنے والے کو سچا جواب ملتا ہے اور اس پر عمل کرنے والا سب پر سبقت لے جائے گا[1]

یہ رسا اور منہ بولتی تعبیریں کہ جن کی نظیر پیغمبر اکرمؐ، حضرت علیؑ اور دیگر آئمہ ہدیٰؑ کے ارشادات میں کم نہیں، اچھی طرح ثابت کرتی ہیں کہ قرآن ایسا نسخہ ہے کہ جس کے ذریعے تمام تر بدحالیاں دور ہو سکتی ہیں۔ یہ فرد اور معاشرے کو ہر طرح کی اخلاقی اور اجتماعی بیماریوں سے نجات دلانے کے لیے آیا ہے۔

اس حقیقت کے اثبات کے لیے بہترین دلیل زمانۂ جاہلیت کے عربوں کا ابتدائے اسلام میں مکتب رسالت کے تربیت یافتگان سے موازنہ ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ خونخوار، جاہل اور نادان قوم کہ جسے سرتاپا طرح طرح کی اجتماعی اور اخلاقی بیماریوں نے گھیر رکھا تھا اس شفا بخش نسخے کی بدولت نہ صرف اس کا علاج ہو گیا بلکہ وہ اتنی بڑی طاقت بن کر ابھری کہ عالمی جابروں اور سُوپر طاقتوں نے ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔

یہ وہ حقیقت ہے جسے دَورِ حاضر کے مسلمان فراموش کر چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ موجودہ حالات میں گرفتار ہیں کہ جس کے ہم اور آپ شاہد ہیں۔ آج مسلمان تفرقہ بازی اور اختلاف کا شکار ہیں۔ عالمی غارتگر طاقتیں ان کے وسائل اور دولت پر مسلط ہو چکی ہیں۔ آج ان کی تقدیر کا فیصلہ دوسرے کرتے ہیں۔ مختلف حوالوں سے غیروں سے ان کی وابستگیاں اور عدمِ استقلال نے انہیں کمزوری، زبوں حالی اور ذلت سے دوچار کر دیا ہے۔

وہ لوگ جن کے گھر میں شفا بخش نسخہ موجود ہو وہ اپنے علاج کے لیے ایسے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں کہ جو ان سے زیادہ بیمار ہوں ـ ان کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔

قرآن نہ صرف شفا بخشتا ہے بلکہ صحت یابی کے بعد نقاہت کے زمانے میں انہیں مختلف پیغامات کے ذریعے تقویت عطا کرتا ہے۔ کیونکہ قرآن "شفا" اور "رحمت" ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵۶۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ جسمانی بیماریوں کی دوائیں عموماً اعضاء بدن پر ناپسندیدہ اثرات چھوڑتی ہیں یہاں تک کہ ایک مشہور حدیث میں ہے :

ما من دواء الا و یھیج داء

کوئی ایسی دوائی نہیں کہ جو کسی دوسری بیماری کا سرچشمہ نہ ہو[1]

لیکن قرآن ـ وہ شفا بخش دوا ہے جو انسانی روح و فکر اور قلب و نظر پر ہرگز کوئی غیر مطلوب اثر مرتب نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ سارے کا سارا خیر و برکت ہے ۔

نہج البلاغہ کی ایک عبارت میں ہے :

شفاء لاتخشی اسقامہ

قرآن ایسی شفا بخش دوا ہے کہ جس سے کوئی بیماری پیدا نہیں ہوتی[2]

اگر ہم ایک ماہ کے لیے بھی اس شفا بخش نسخے پر عمل کرنے کا عہد کریں اور اس عہد کی پاسداری کریں، اس کے حکم کو علم و آگہی، عدل و انصاف، تقویٰ و پرہیزگاری، اتحاد و اخلاص اور فداکاری و جانبازی میں اپنائیں تو ہم دیکھیں گے ہماری بدحالیاں خوشیوں میں بدل جائیں گی ۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ یہ نسخہ دوسرے نسخوں کی طرح اسی وقت مؤثر ہو سکتا ہے جب اس پر عمل کیا جائے ورنہ کسی بہترین شفا بخش نسخے کو ہم ہزار بار پڑھیں، سر پہ رکھیں، آنکھوں سے لگائیں اور اس کے بوسے لیں، اس پر عمل نہ کریں تو اس سے ہمیں کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا

---

۱ سفینۃ البحار ۔

۲ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۸ ۔

۸۳ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ○

۸۴ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۭ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ○

ترجمہ

۸۳ جس وقت ہم انسان کو کوئی نعمت بخشتے ہیں تو وہ (حق سے) منہ پھیر لیتا ہے اور تکبر کے عالم میں دور ہو جاتا ہے لیکن اگر اُسے کوئی چھوٹی سی بُرائی پہنچتی ہے تو (ہر چیز سے) مایوس ہو جاتا ہے۔

۸۴ کہہ دو: ہر شخص اپنی روش (اور خُلق و عادت) کے مطابق عمل کرتا ہے جن کی روش زیادہ اچھی ہے تمہارا پروردگار انہیں بہتر طور پر پہچانتا ہے۔

تفسیر

ہر شخص اپنی فطرت کی راہ لیتا ہے

زیرِ نظر آیات سے غیر تربیت یافتہ انسانوں کی ایک نہایت گہری اخلاقی بیماری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جس وقت ہم انسان کو کوئی نعمت بخشتے ہیں تو (اس میں نخوت و غرور پیدا ہو جاتا ہے اور) وہ اپنے پروردگار سے منہ موڑ لیتا ہے اور عالمِ تکبر میں اس سے دور ہو جاتا ہے (واذا انعمنا علی الانسان اعرض و نأبجانبہ)۔

لیکن جب اس سے نعمت سلب کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ اُسے چھوٹی سی پریشانی لاحق ہو جاتی ہے تو سرتاپا اس پر نا امیدی چھا جاتی ہے (واذا مسّہ الشر کان یئوسا)۔

"اعرض" "اعراض" کے مادہ سے منہ پھیرنے کے معنی میں ہے۔ یہاں مراد اللہ اور حق سے

منہ پھیرنا ہے۔

"نأی" "نأی" (بروزن "رأی") کے مادہ سے دور ہونے کے معنی میں ہے۔ لفظ "بجانبہ" کا اضافہ غرور وتکبر اور دشمنی کی وجہ سے ایک طرف ہو جانے کے معنی دیتا ہے۔

اس پورے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ بے ایمان یا کمزور ایمان کے انسانوں کو جب نعمتیں میسر آتی ہیں تو ایسے مغرور ہوتے ہیں کہ منعم کو بالکل بھول جاتے ہیں، نہ فقط بھول جاتے ہیں اس سے بے اعتنائی کرتے ہیں اس سے منہ موڑ لیتے ہیں اور عالم تکبر میں آجاتے ہیں۔

"مسہ الشر" تھوڑی سی تکلیف اور پریشانی کی طرف اشارہ ہے یعنی وہ اس قدر کم ظرف ہیں کہ ذرہ بھر پریشانی کی صورت میں ہمت ہار بیٹھتے ہیں اور سوچنے سمجھنے سے عاری ہو جاتے ہیں اور یاس و ناامیدی کے سائے ان کے پورے وجود پر چھا جاتے ہیں۔

دوسری آیت میں رسول اللہ کی طرف روئے سخن ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کہہ دو: ہر شخص اپنی روش، خلق اور عادت کے مطابق عمل کرتا ہے (قل کل یعمل علی شاکلتہ)۔

مومنین آیاتِ قرآن سے شفا طلب کرتے ہیں اور رحمت کسب کرتے ہیں جبکہ ظالم و ستمگر سوائے نقصان کے ان سے کچھ نہیں پاتے۔ کم ظرف انسان کہ جنہیں نعمت ملے تو مغرور ہو جاتے ہیں اور مشکل پڑے تو مایوس و بدحال ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق کرتے ہیں۔ یہ طبیعت اور مزاج انسان کے بار بار کے عمل کے زیر اثر بنتا ہے۔

ایسی حالت میں خدا سب کے حالات پر شاہد و ناظر ہے۔ جی ہاں! تمہارا رب ان لوگوں کی کیفیت سے زیادہ آگاہ ہے جن کی روش بہتر اور ہدایت کے اعتبار سے زیادہ پُر بار ہے (فربکم اعلم بمن ھو اھدٰی سبیلا)۔

چند اہم نکات

۱۔ تکبر اور مایوسی ــ دو خطرناک اخلاقی بیماریاں: ہم نے یہ جملہ بار بار دوسروں سے سُنا ہے یا ہم خود دوسروں سے کہتے ہیں:

فلاں شخص اب خدا کا بندہ نہیں رہا کیونکہ اب وہ دولت مند ہو گیا ہے۔

نیز ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ جنہیں نئی نئی دولت ملتی ہے وہ خدا کو بھول جاتے ہیں لیکن جب یہ دولت جاتی رہتی ہے یا وہ مشکلات میں پھنستے ہیں تو ایسے مضطرب اور مایوس ہوتے ہیں کہ انسان کو یقین نہیں آتا کہ یہ وہی پہلے والے آدمی ہیں۔

جی ہاں! تمام کوتاہ فکر، بے ایمان اور کم ظرف لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے جبکہ اس کے برعکس دوستانِ خدا

اور اولیاء اللہ کو حوادث درپیش ہوں تو وہ ان سے نمٹنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں فرمانِ الٰہی کے سامنے ان کی حالت تنکے کی سی ہوتی ہے۔ انہیں ساری دنیا دے دیں تو وہ کھو نہیں جاتے اور ساری دنیا ان سے لے لو تو ان کے ماتھے پر شکن نہیں پڑتی۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ خود باختہ اور کم ظرف لوگ مشکل کے عالم میں خدا پرست بن جاتے ہیں اور فطرتِ الٰہی ان میں جاگ اٹھتی ہے اور وہ اپنے آپ میں واپس آجاتے ہیں لیکن ادھر طوفانِ مصیبت تھمتا ہے اور ادھر یہ ایسے بدلتے ہیں گویا انہوں نے ہرگز کبھی خدا کا نام سنا تک نہیں۔ قرآن نے انسان کی یہ حالت متعدد مقامات پر بیان کی ہے (مثلاً: یونس ـ ۱۲، لقمان ـ ۳۲، فجر ـ ۱۴ و ۱۵، حٰمٓ السجدۃ ـ ۴۸، ۴۹)۔

یہ ایک بہت بڑی مصیبت ہے کیونکہ اس کے سبب انسان زندگی میں کبھی صحیح مقام حاصل نہیں کرسکتا۔ اس بیماری کا واحد علاج یہ ہے کہ انسان علم اور ایمان کے ذریعے اپنی سطحِ فکر بلند کرے، اپنے آپ کو مادیات کے چنگل سے نکالے اور اصلاحی و تعمیری زہد اختیار کرے۔

ضمنی طور پر اس بیان سے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ زیر بحث آیات میں ایسے افراد کو مشکلات میں ناامید کہا گیا ہے جبکہ دوسری آیات (مثلاً ـ عنکبوت ـ ۶۵) میں انہیں "مخلصین لہ الدین" کہا گیا ہے اور یہ جملہ تو خدا کی طرف انتہائی توجہ کی حکایت کرتا ہے، یہ فرق کیوں ہے؟

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں آپس میں کوئی تضاد نہیں رکھتیں بلکہ ان میں سے ایک دوسری کی تمہید ہے۔ ایسے افراد کو جب مشکلات کا سامنا ہوتا ہے تو وہ اپنی زندگی سے بالکل مایوس ہو جاتے ہیں اور یہی ناامیدی سبب بنتی ہے کہ ان کے چہرۂ فطرت سے پردے ہٹ جاتے ہیں اور وہ بارگاہِ خداوندی کا رُخ کرتے ہیں لیکن یہ اضطراری توجہ نہ ان کے لیے عزّ و شرف کا باعث ہے اور نہ ان کی بیداری کی دلیل ہے کیونکہ اُدھر یہ مشکلات دُور ہوتی ہیں اور اِدھر یہ اپنی پہلی حالت پر لوٹ آتے ہیں وہی حالت جو اَب ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہوتی ہے۔

لیکن ـ اولیائے حق اور خدا کے سچے بندے مشکلات کا چہرہ دیکھ کر مایوس نہیں ہو جاتے بلکہ حوادث تو ان کی استقامت اور پامردی میں اضافہ کرتے ہیں۔ وہ خدا پر بھروسے اور اپنی خود اعتمادی کے باعث مشکلات پر گویا حملہ آور ہوتے ہیں کیونکہ یاس و ناامیدی کے لیے ان کے وجود میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ وہ خدا کو صرف مشکلات میں نہیں پہچانتے بلکہ ہر حالت میں اس کی یاد میں بسر کرتے ہیں اس کی پاک ذات پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس کا نورِ رحمت ان کے دل پر سایہ فگن رہتا ہے۔

۲۔ "شاکلۃ" سے کیا مراد ہے؟

"شاکلۃ" دراصل "شکل" کے مادہ سے جانور کو لگام دینے کے معنی میں ہے۔ "شکال" خود مہار کو کہتے ہیں اور چونکہ ہر انسان کو اس کی طبیعت، جذبات اور عادتیں کسی خاص روّیے میں مقیّد کر دیتے ہیں لہٰذا اسے "شاکلہ" کہتے ہیں۔ سوالات، ضروریات اور تمام مسائل

کے لیے یہ جو لفظ "اشکال" بولا جاتا ہے یہ بھی اس لحاظ سے ہے کہ یہ ایک لحاظ سے انسان کو مقید کر دیتے ہیں[1]

اس گفتگو سے ظاہر ہوا کہ "شاکلۃ" کا مفہوم انسان کی ذاتی طبیعت کے لیے مخصوص نہیں۔ اسی لیے علامہ طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں اس کے دو معانی ذکر کیے ہیں:

۱۔ طبیعت و خلقت

۲۔ طریقہ، مذہب اور سنت

کیونکہ ان میں سے ہر ایک انسان کو عمل کے لحاظ سے کسی طرح مقید کرتا ہے۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ کس قدر اشتباہ اور غلط فہمی میں مبتلا ہیں جو زیر بحث آیت کو صفات ذات کی انسان پر حکومت اور جبر و اکراہ کی دلیل خیال کرتے ہیں اور یہاں تک کہ تربیت و تزکیہ پر اعتقاد نہیں رکھتے یہ طرز فکر مختلف سیاسی، معاشرتی اور نفسیاتی اسباب کے باعث پیدا ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے جبر و اختیار کی بحثوں میں وضاحت کی ہے۔ بہت سی قوموں کے ادب میں یہ فکر غالب نظر آتی ہے۔ لوگ اپنی کوتاہ اور غلط باتوں کی توجیہ کے لیے اس کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ وہ خطرناک ترین نظریہ ہے جو معاشرے کو ذلت و خواری اور پسماندگی کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اور سالہا سال یا صدیوں تک کے لیے اسے اس پسماندگی کے گڑھے میں ڈالے رکھتا ہے۔

ذیل کے اشعار اس طرز فکر کی کامل نمائندگی کرتے ہیں:

درختی کہ تلخ است اندر سرشت گرش بر نشانی بہ باغ بہشت
و از جوی خلدش بہ ہنگام آب بہ بیخ انگبین ریزی و شہد ناب
سرانجام گوہر بہ کار آورد ہمان میوۂ تلخ بار آورد

یعنی۔

جس درخت کی سرشت میں ہی تلخی ہے اگر اسے جنت میں بھی لگا دیا جائے۔

اور جنت سے اسے پانی دیتے وقت اس میں شہد ملا دیا جائے۔

لیکن آخرکار اس کی سرشت اپنا کام دکھائے گی اور وہ جو پھل دے گا وہ کڑوا ہی ہوگا۔

اگر تربیتی اور اجتماعی مسائل کی بنیاد واقعاً اس منطق کو قرار دیا جائے تو تعلیم و تربیت کو لازمی طور پر فضول ماننا پڑے گا۔

اسی بناء پر ہمارا عقیدہ ہے کہ مسلک جبر ہمیشہ استعماری حکومتوں کے ہاتھ میں ایک دستاویز اور حربے کے طور پر رہا ہے تاکہ وہ اس ذریعے سے کسی انقلابی تحریک کو روک سکیں اور جواں مرد انقلابیوں

---

[1] مفردات از راغب، مادہ "شکل"۔

کو بیڑیاں پہنا سکیں ۔

مشہور جملہ ہے :

الجبر والتشبیہ امویان والعدل والتوحید علویان

عقیدۂ جبر اور خدا کو موجودات کے ساتھ تشبیہ دینا بنی امیہ کے عقائد میں سے ہے اور عدل و توحید کا عقیدہ مکتب علوی کی بنیاد ہے ۔

یہ جملہ بھی اسی حقیقت کو بیان کرتا ہے :

خلاصہ یہ کہ "شاکلہ" ہرگز ذاتی طبیعت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی عادت، طریقہ، روش اور مذہب جو انسان کی زندگی کو ایک جہت اور سمت دے دے اسے "شاکلہ" کہتے ہیں۔ اسی بنا پر عادات و سنن جنہیں اختیاری عمل کے تکرار سے انسان اپنا لیتا ہے اور اسی طرح عقائد و نظریات جو استدلال یا تعصب کی وجہ سے قبول کر لیتا ہے یہ سب انسانی زندگی پر گہرا اثر مرتب کرتے ہیں اور انہیں "شاکلہ" کہا جاتا ہے ۔

اصولی طور پر انسانی ملکات و جذبات عموماً اختیاری ہوتے ہیں کیونکہ جب انسان کسی عمل کا تکرار کرتا ہے تو اس کی پہلی اسٹیج کو "حالت" کہتے ہیں، دوسری کو "عادت" اور تیسری کو "ملکہ" ۔ یہ عمل آہستہ آہستہ تدریجی طور پر ہوتا ہے ۔ یہی ملکات ہیں جو انسان کے اعمال کو ایک خاص شکل دیتے ہیں اور اس کی راہِ حیات کو معین کرتے ہیں ۔ حالانکہ یہ ملکات اختیاری عوامل سے پیدا ہوتے ہیں اور اختیاری عوامل ہی انہیں پروان چڑھاتے ہیں ۔

بعض روایات میں "شاکلۃ" سے "نیت" مراد لیا گیا ہے ۔ اصول کافی میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت ہے، آپ فرماتے ہیں :

النیۃ افضل من العمل الا وان النیۃ ھی العمل، ثم تلا قولہ عزوجل،

"قل کل یعمل علی شاکلتہ" یعنی علی نیتہ ۔

نیت عمل سے افضل ہے بلکہ اصلاً نیت ہی عمل ہے ۔

اس کے بعد آپؑ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی ،

قل کل یعمل علی شاکلتہ

اور ساتھ ہی فرمایا :

"شاکلہ" سے مراد نیت ہے [1]

---

[1] نور الثقلین ، ج ۲ ص ۱۱۳ ۔

اس تفسیر میں ایک جاذب نظر اور عمدہ نکتہ پنہاں ہے اور وہ یہ کہ انسان کی نیت کہ جو اس کے عقائد و نظریات سے ابھرتی ہے اسی سے اس کا عمل جنم لیتا ہے اور اصولاً خود نیّت " شاکلہ " کی ایک قسم ہے یعنی مقید کرنے والا امر ہے۔ اسی لیے بعض اوقات نیت ہی کو عمل قرار دیا گیا ہے اور کبھی اسے عمل سے برتر گردانا گیا ہے۔ کیونکہ بہرحال عمل وہی راستہ اختیار کرتا ہے جو نیّت کی روش ہوتی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ امام صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا،

کیا یہودیوں کی عبادت گاہوں اور نصاریٰ کے گرجوں میں نماز پڑھی جا سکتی ہے؟

آپ نے فرمایا:

ہاں تم ان میں نماز پڑھ سکتے ہو۔

کسی نے پوچھا:

اگر وہ ان میں نماز پڑھ رہے ہوں ہم پھر بھی ان میں نماز پڑھ لیں؟

فرمایا:

ہاں ۔ کیا تم نے قرآن میں نہیں پڑھا کہ اللہ فرماتا ہے:

قل کل یعمل علی شاکلته فربکم اعلم بمن هو اهدیٰ سبیلاً

اس کے بعد مزید فرمایا:

تم اپنے قبلہ کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھو اور انہیں رہنے دو (وہ جو بھی کر رہے ہوں)[1]

---

[1] نورالثقلین، ج ۳ ص ۲۱۲

۸۵ وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ○

ترجمہ

۸۵ تجھ سے "روح" کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو: "روح" میرے رب کے امر میں سے ہے اور تمہیں تو بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔

تفسیر

رُوح کیا ہے؟

گزشتہ آیات کے بعد اب مشرکین یا اہلِ کتاب کے بعض اہم سوالات کے جوابات دیئے جا رہے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: تجھ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو: روح میرے رب کے فرمان میں سے ہے اور تمہیں بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے (ویسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً)۔

گزشتہ اور موجودہ دَور کے عظیم مفسّرین نے "روح" کے معنی اور اس آیت کی تفسیر کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔ ہم پہلے لغت کے حوالے سے "روح" کے معنی کے بارے میں بات کریں گے۔ اس کے بعد قرآن میں یہ لفظ جہاں جہاں آیا ہے اسے دیکھیں گے اور اس سلسلے میں وارد شدہ روایات بیان کریں گے۔

۱۔ **لغت کے حوالے سے:** لغت کے لحاظ سے "روح" دراصل "نفس" اور "دوڑنے" کے معنی میں ہے۔ بعض نے تصریح کی ہے کہ "روح" اور "ریح" (ہوا) ایک ہی معنی سے مشتق ہیں اور روحِ انسان کہ جو مستقل اور مجرد گوہر ہے اسے اس نام سے اس لیے موسوم کیا گیا ہے کہ یہ تحرک، حیات آفرینی اور ظاہر نہ ہونے کے لحاظ سے نفس اور ہوا کی طرح ہے۔

۲۔ **قرآنی آیات کے حوالے سے:** قرآن حکیم میں یہ لفظ مختلف اور متنوع صورتوں میں آیا ہے۔ کبھی یہ لفظ انبیاء و مرسلین کو ان کی رسالت کی انجام دہی میں تقویت پہنچانے والی روحِ مقدس کے معنی میں آیا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ کی آیہ ۲۵۳ میں ہے:

وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۚ

ہم نے عیسیٰ کو واضح دلائل دیئے اور روح القدس کے ذریعے اسے تقویت بخشی۔

کبھی یہ لفظ مومنین کو تقویت بخشنے والی اللہ کی روحانی و معنوی قوت کے مفہوم میں آیا ہے

جیساکہ سورہ مجادلہ کی آیت ۲۲ میں ہے :

أُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ

وہ ایسے لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ہے اور روح کے ذریعے انہیں تقویت بخشی ہے ۔

اور کبھی وحی کے خاص فرشتے کے مفہوم میں یہ لفظ استعمال ہوئے :

"امین" کے لفظ سے اس کی توصیف کی گئی ہے ۔ مثلاً سورہ شعراء کی آیہ ۱۹۳-۱۹۴ میں ہے :

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝

یہ قرآن روح الامین نے تیرے دل پر اتارا تاکہ تُو ڈرانے والوں میں سے ہو ۔

کبھی یہ لفظ خدا کے خاص فرشتوں میں سے ایک عظیم فرشتے یا فرشتوں سے برتر ایک مخلوق کے معنی میں آیا ہے ۔ مثلاً :

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ ۝

شب قدر میں ملائکہ اور روح اپنے پروردگار کے امر کے ساتھ تقدیر امور کے لیے نازل ہوتے ہیں ۔ (قدر - ۴)

نیز سورہ نباء کی آیہ ۳۸ میں بھی ہے :

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا

روز قیامت روح اور ملائکہ ایک ہی صف میں قیام کریں گے ۔

کبھی یہ لفظ قرآن اور وحی آسمانی کے معنی میں آیا ہے ۔ مثلاً :

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا

اور اس طرح ہم نے تیری طرف روح کو وحی کیا کہ جو ہمارے امر میں سے ہے (شوریٰ ۵۲)۔

کبھی یہ لفظ روح انسانی کے معنی میں آیا ہے جیساکہ خلقت آدم سے متعلقہ آیات میں ہے :

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ

اس کے بعد خلقت آدم کو نظام بخشا اور اس میں اپنی رُوح پھونکی ۔ (سجدہ - ۹)

اسی طرح سورہ حجر آیہ ۲۹ میں ہے :

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ۝

پس ہم نے خلقت آدم کو عملی صورت دے دی اور اس میں اپنی رُوح پھونک دی تو اس کیلئے سجدہ کرو[1]

---

[1] ہم کہہ چکے ہیں کہ یہاں روح کی اضافت خدا کی طرف اظہار عظمت کے لیے ہے اور مراد یہ ہے کہ خدا نے انسانوں کو ایک عظیم اور الٰہی مقدس روح بخشی ہے ۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت میں روح سے کیا مراد ہے۔ یہ کس روح کا تذکرہ ہے کہ جس کے بارے میں کچھ لوگوں نے رسول اکرمؐ سے سوال کیا ہے اور آپؐ نے ان کے جواب میں فرمایا ہے کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تمہیں تھوڑے سے علم کے سوا کچھ پتہ نہیں۔

آیت کے داخلی و خارجی قرائن سے ایسا لگتا ہے کہ سوال کرنے والوں نے انسان کی روح سے متعلق سوال کیا ہے۔ وہی عظیم روح کہ جو انسان کو حیوانات سے جُدا کرتی ہے۔ جو ہمارا افضل ترین شرف ہے اور جو ہماری تمام تر طاقت اور فعالیت کا سرچشمہ ہے۔ جس کی مدد سے ہم زمین و آسمان کو اپنی جولان گاہ بنائے ہوئے ہیں۔ جس کے ذریعے ہم علمی اسرار کی گتھیاں سلجھاتے ہیں۔ جس کے ذریعے ہم موجودات کی گہرائیوں تک پہنچنے کا راستہ پاتے ہیں۔ چاہتے تھے کہ عالم آفرینش کے اس عجوبہ کی حقیقت معلوم کریں۔

روح کی ساخت مادہ کی ساخت سے مختلف ہے۔ وہ اصول جو اس پر حاکم ہیں وہ مادہ پر حاکم اصول اور طبیعاتی اور کیمیائی خواص سے مختلف ہیں لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایک مختصر اور پُرمعنی جملہ کہیں کہ۔ روح عالم اَمر میں سے ہے۔ یعنی اس کی خلقت اسرار آمیز ہے۔

اس کے بعد اِس بنا پر کہ انہیں اس جواب پر تعجب نہ ہو مزید فرمایا کہ تمہارا علم بہت ہی کم ہے۔ لہٰذا کون سے تعجب کی بات ہے کہ تم روح کے اسرار نہ جان سکو اگرچہ وہ ہر چیز کی نسبت تم سے زیادہ قریب ہے۔

روایات کے حوالے سے: تفسیر عیاشی میں امام باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے آیہ "یسئلونک عن الروح" کی تفسیر کے سلسلے میں فرمایا:

انما الروح خلق من خلقه له بصر و قوة و تأييد، يجعله في قلوب الرسل والمؤمنين

روح مخلوقات خدا میں سے ہے اور یہ بینائی کی قوت، رکھتی ہے۔ خدا اسے انبیاء اور مومنین کے دلوں میں قرار دیتا ہے[1]

ایک اور حدیث انہی دو بزرگوار آئمہ میں سے ایک سے منقول ہے، اس میں ہے:

هي من الملكوت من القدرة

روح عالم ملکوت اور خدا کی قدرت میں سے ہے[2]

شیعہ اور سُنی کتب کی متعدد روایات میں ہے کہ مشرکین قریش نے یہ سوال علماء اہل کتاب سے حاصل کیا۔ وہ اس کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آزمانا چاہتے تھے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ اگر (محمدؐ) نے روح کے بارے میں تمہیں بہت کچھ بتا دیا تو یہ اس کی عدم صداقت کی دلیل ہوگا۔ جبکہ آپؐ نے ایک مختصر

---

[1] و [2]۔ نور الثقلین، ج ۳ صفحہ ۲۱۶

اور پُر معنی جواب دے کر انہیں حیران کر دیا۔

لیکن کچھ اور روایات جو طرقِ اہل بیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں ان میں روح کو ایک ایسی مخلوق بتایا گیا ہے کہ جو جبرائیل اور میکائیل سے افضل ہے اور جو انبیاء اور آئمہ کے ساتھ ہوتی ہے اور انہیں ان کے کام میں انحراف سے باز رکھتی ہے[1]

آیت کی تفسیر کے بارے میں جو کچھ ہم نے کہا ہے یہ روایات نہ فقط اس کے منافی نہیں ہیں بلکہ اس سے ہم آہنگ ہیں کیونکہ انسانی روح کے مختلف درجے اور مراتب ہیں۔ انبیاء اور آئمہ کی روح کا مرتبہ غیر معمولی اور بہت بلند ہے اور گناہ و خطا سے معصوم ہونا جس کے آثار میں سے ہے۔ نیز بہت زیادہ علم و آگاہی بھی اس کے آثار میں سے ہے اور مسلّم ہے کہ روح کا یہ مرتبہ تمام فرشتوں سے افضل ہوگا، یہاں تک کہ جبرئیل اور میکائیل سے بھی (غور کیجئے گا)۔

رُوح کی اصالت و استقلال

علم انسان کی تاریخ شاہد ہے کہ روح، اس کی ساخت اور اس کی اسرار آمیز خصوصیات کا مسئلہ ہمیشہ علماء کے غور و فکر کا عنوان رہا ہے۔ ہر عالم نے اپنی بساط بھر کوشش کی ہے کہ روح کی وادیٔ اسرار میں قدم رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ روح کے بارے میں علماء کے نظریات بہت زیادہ اور متنوع ہیں۔ ہو سکتا ہے ہمارا آج کا علم بلکہ آئندہ آنے والوں کا علم بھی روح کے تمام اسرار و رموز تک پہنچنے کے لیے کافی نہ ہو اگرچہ ہماری روح اس دنیا کی ہر چیز سے ہمارے قریب تر ہے اگرچہ اس کا گوہر ہر چیز سے بالکل مختلف ہے جس سے ہمیں اس عالم مادہ میں سابقہ پڑتا ہے۔

اس پر زیادہ تعجب بھی نہیں کرنا چاہیئے کہ ہم اس عجوبۂ روزگار اور مافوق مادہ مخلوق کے اسرار اور حقیقت تک نہیں پہنچ سکے۔ بہر حال یہ صورتِ حال اس سے مانع نہیں کہ ہم روح کے دور سے نظر آنے والے منظر کو عقل کی تیز بین نگاہ سے دیکھ سکیں۔ اس پر حکم فرما اصول اور عمومی نظام سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ اس سلسلے میں اہم ترین روح کی اصالت و استقلال کا مسئلہ ہے، جسے جاننا چاہیئے۔

مادہ پرست روح کو مادی اور دماغ کے مادی خواص اور نسوں کے خلیوں Nerve Cells میں سے سمجھتے ہیں ان کی نظر میں روح اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہم یہاں زیادہ تر اسی نکتے پر بحث کریں گے بجائے روح کی بحث اور تجرد کامل یا تجرد مکتبی کی گفتگو کا انحصار اسی مسئلے پر ہے۔ لیکن پہلے اس نکتے کا ذکر ضروری ہے کہ انسانی بدن سے روح کا تعلق ایسا نہیں جیسا بعض نے گمان کر رکھا ہے۔ روح نے بدن میں

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۳ صفحہ ۲۱۵

حلول نہیں کر رکھا اور نہ یہ مشک میں ہوا کی طرح انسانی جسم میں موجود ہے بلکہ بدن اور روح کے مابین ایک قسم کا ارتباط ہے اور یہ ارتباط روح کی بدن پر حاکمیت، تصرف اور اس کی تدبیر کی بنیاد پر ہے۔ بعض نے اس ارتباط کو لفظ اور معنی کے مابین تعلق سے تشبیہ دی ہے۔ جب ہم استقلال روح کے مسئلہ پر بحث کریں گے، یہ بات بھی واضح ہو جائے گی۔

اب ہم اصل گفتگو کی طرف آتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان پتھر اور لکڑی سے مختلف ہے کیونکہ ہم اچھی طرح سے محسوس کرتے ہیں کہ ہم بے جان موجودات بلکہ نباتات سے بھی مختلف ہیں۔ ہم سوچتے ہیں، ارادہ کرتے ہیں، محبت اور نفرت کرتے ہیں وغیرہ۔

لیکن پتھر اور نباتات میں یہ احساسات نہیں ہیں۔ لہٰذا ہمارے اور ان کے درمیان ایک اصولی فرق موجود ہے اور اس کی وجہ روح انسانی ہے۔

مادہ پرست یا کوئی اور نفس اور روح کے وجود کے منکر نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علم نفسیات Psychology اور Psychoanalism کو ایک مثبت علم سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں علم اگرچہ کئی ایک جہات سے اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہے ہیں تاہم دنیا کی بڑی سے بڑی یونیورسٹیوں میں اساتذہ اور طلبہ اس کے بارے میں مطالعہ و تحقیق میں مصروف ہیں۔

جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ نفس اور روح دو الگ حقائق نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو مختلف مراحل ہیں۔ جہاں جسم سے روح کے ارتباط کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے اور ان دونوں کی متقابل تاثیر بیان ہوتی ہے وہاں "نفس" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور جہاں جسم سے الگ روح سے ظاہر ہونے والے اثرات پر گفتگو ہوتی ہے وہاں لفظ "روح" استعمال ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ کوئی شخص انکار نہیں کرتا کہ ہم میں روح اور نفس کے نام کی ایک حقیقت موجود نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مادہ پرستوں (Materialists) اور ماوراء الطبیعت کے فلاسفہ اور روحیوں Spirtulists کے درمیان جنگ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ علماء الہیون اور فلاسفہ روحیوں کا نظریہ ہے کہ جس مواد سے انسانی جسم بنتا ہے اس کے علاوہ اس میں ایک اور حقیقت اور گوہر مخفی ہے کہ جو مادہ نہیں ہے لیکن انسانی بدن بلاواسطہ اس کے زیر اثر ہے۔ دوسرے لفظوں میں روح ایک ماوراء الطبیعاتی Metaphysical حقیقت ہے۔ اس کی ساخت اور فعالیت مادی دنیا کی ساخت اور فعالیت سے مختلف ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ ہمیشہ مادی دنیا سے مربوط رہتی ہے لیکن یہ خود مادہ یا خاصیت مادہ نہیں ہے۔

ان کے مدمقابل مادیت کے فلاسفہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے وجود میں روح نام کا مادہ کے علاوہ

کوئی مستقل وجود نہیں اور مادہ سے ہٹ کر روح نام کی کوئی چیز نہیں جو کچھ ہے یہی مادہ جسمانی ہے اور یا اس کے طبیعاتی اور کیمیائی Physical and Chemical آثار ہیں۔ ہمارے اندر دماغ اور اعصاب نام کی ایک مشینری ہے کہ جو ہماری زندگی کے اعمال کا ایک اہم حصہ ہے اور یہ بھی باقی مادی بدن کی مشینریوں کی طرح ہے اور مادی قوانین کے تحت کام کرتی ہے۔

ہماری زبان کے نیچے کچھ غدودیں ہیں جنہیں غدود ہائے بزاق Sliva Glands[1] کہا جاتا ہے یہ طبیعاتی عمل بھی کرتی ہیں اور کیمیائی بھی۔ جس وقت غذا منہ میں جاتی ہے تو یہ خود کار کنوئیں[2] خود بخود کام شروع کر دیتے ہیں۔ یہ حساب کے اس قدر ماہر ہیں کہ پانی کی بالکل اتنی مقدار جتنی غذا کو چبانے اور نرم کرنے کے لیے ضروری ہے اس پر چھڑکتے ہیں۔ پانی والی غذا، کم پانی والی غذا یا خشک غذا، ہر ایک اپنی ضرورت کے مطابق آب دہان سے اپنا حصہ لیتی ہے۔

تیزابی مواد، خصوصاً جس وقت زیادہ سخت ہو ان غدودوں کی کارکردگی بڑھا دیتا ہے تاکہ اسے زیادہ مقدار میں پانی ملے اور یہ خوب پتلا ہو جائے اور معدے کی دیواروں کو نقصان نہ پہنچے۔

جس وقت انسان غذا کو نگل لیتا ہے ان کنوؤں کا عمل خود بخود رُک جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ان ابلنے والے چشموں پر ایک عجیب و غریب نظام حکم فرما ہے۔ ایسا نظام کہ اگر اس کا توازن بگڑ جاتے یا ہمیشہ لعابِ دہن ہمارے منہ سے گرتا رہے یا پھر ہماری زبان اور حلق کس قدر خشک ہو جائے تو لقمہ ہمارے حلق میں پھنس جائے۔

یہ لعاب دہن کا طبیعاتی کام ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کا زیادہ اہم کام کیمیائی ہے۔ اس میں مختلف طرح کا مواد مخلوط ہوتا ہے اور یہ غذا سے مل کر نئی ترکیب کو جنم دیتا ہے جس سے معدے کی زحمت کم ہو جاتی ہے۔

مادہ پرست (Materialists) کہتے ہیں کہ ہمارے اعصاب اور مغز کا سلسلہ لعاب دہن کے غدودوں کی مانند ہے اور یہ اسی طرح کے طبیعاتی اور کیمیائی عمل کا حامل ہے کہ جسے مجموعی طور پر طبیعاتی کیمیائی Physico Chemical کہا جاتا ہے اور یہی طبیعاتی کیمیائی فعالیتیں ہیں جنہیں ہم آثارِ روح یا رُوح کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ہم سوچ رہے ہوتے ہیں تو ایک خاص برقی سلسلہ ہمارے دماغ سے اٹھتا ہے۔ دورِ حاضر میں مشینوں کے ذریعے ان لہروں کو کاغذ پر ثبت کر دیا جاتا ہے خصوصاً نفسیاتی بیماریوں کے ہسپتالوں میں ان لہروں کے مطالعے سے نفسیاتی بیماریوں کی تشخیص اور علاج کیا جاتا ہے۔ یہ ہمارے دماغ کی فیزیکل Physical فعالیت ہے۔

---

[1] لعاب دہن کی غدودیں۔

[2] Artesiens -

اس کے علاوہ غور و فکر کرتے وقت اور نفسیاتی فعالیت کے موقع پر ہمارے دماغ کے سیل Cells ایک کیمیائی فعالیت بھی کرتے ہیں لہٰذا روح اور آثار روح ہمارے دماغ اور اعصاب کے خلیوں کے کیمیائی فعل و انفعالات کے طبیعاتی خواص کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔

اس بحث سے مادیین یہ نتیجہ نکالتے ہیں :

(۱) جیسے لعاب دہن کی غدودوں کی فعالیت اور ان کے مختصر اثرات بدن سے پہلے نہ تھے اور نہ اس کے بعد ہوں گے اسی طرح ہماری روح کی کارکردگی بھی دماغ اور اعصاب کی مشینری کے پیدا ہونے سے وجود میں آتی ہے اور اس کے مرنے سے مر جاتی ہے۔

(۲) روح جسم کے خواص میں سے ہے۔ لہٰذا وہ مادی شئے ہے اور ماورائے طبیعت کا پہلو نہیں رکھتی۔

(۳) روح پر بھی وہی قوانین حکم فرما ہیں جو جسم پر حکومت کرتے ہیں۔

(۴) روح بدن کے بغیر کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی اور نہ ہی رکھ سکتی ہے۔

روح کے عدم استقلال پر مادیین کے دلائل : مادیین کا نظریہ ہے کہ روح و فکر اور روح کے تمام آثار مادی ہیں یعنی دماغ اور اعصاب کے خلیوں کے طبیعاتی اور کیمیائی خواص ہیں۔ انہوں نے اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے کچھ شواہد پیش کیے ہیں، مثلاً :

(۱) آسانی سے نشاندہی کی جا سکتی ہے کہ مراکز کا ایک حصہ یا اعصاب کا ایک سلسلہ بیکار ہو جاتے تو آثار روح کا ایک حصہ معطل ہو جاتا ہے[1] مثلاً تجربہ کیا گیا ہے کہ کبوتر کے مغز کا ایک خاص حصہ الگ کر لیا جائے تو کبوتر مرتا نہیں لیکن اس کی معلومات کا بہت سا حصہ ختم ہو جاتا ہے۔ اگر اسے غذا کھلائیں تو کھاتا اور ہضم کرتا ہے اور اگر کھلائیں نہیں صرف دانہ اس کے سامنے ڈال دیں تو نہیں کھاتا اور بھوک سے مر جاتا ہے۔

اسی طرح اگر انسان کے دماغ پر کچھ ضربیں لگائی جائیں یا بعض بیماریوں کی وجہ سے اس کے دماغ کا کچھ حصہ بیکار ہو جائے تو دیکھا گیا ہے کہ انسان کو بہت سی چیزیں بھول جاتی ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا ہم نے جرائد اور اخبارات میں پڑھا کہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان کو اہواز کے قریب ایک حادثہ پیش آیا۔ اس حادثے میں اس کے دماغ پر ضرب آئی۔ وہ اپنی زندگی کے تمام گزشتہ واقعات بھول گیا یہاں تک کہ وہ اپنے ماں باپ تک کو نہیں پہچانتا تھا۔ اسے اس کے گھر لے جایا گیا۔ وہ اسی گھر میں پلا بڑھا تھا مگر وہ وہاں اپنے آپ کو بالکل اجنبی محسوس کر رہا تھا۔

ایسے واقعات نشاندہی کرتے ہیں کہ دماغ کے خلیوں کی فعالیت اور آثار روح کے درمیان ایک قریبی ربط ہے۔

---

[1] Phychology از ڈاکٹر اراتی صفحہ ۲۳

(۲) غور و فکر کرتے وقت دماغ کی سطح پر مادی تغیرات زیادہ ہوتے ہیں، دماغ زیادہ غذا لیتا ہے اور فاسفورس واپس کرتا ہے۔ سوتے وقت جبکہ دماغ فکری کام نہیں کرتا تھوڑی غذا لیتا ہے۔ یہ امر آثارِ فکری کے مادی ہونے کی دلیل ہے[1]

(۳) مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ غور و فکر کرنے والوں کے دماغ کا وزن عام لوگوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ اوسطاً مردوں کے دماغ کا وزن ۱۴۰۰ گرام ہے اور عورتوں کے دماغ کا وزن اوسطاً اس سے کچھ کم ہوتا ہے۔ یہ امر بھی نشاندہی کرتا ہے کہ روح مادی شے ہے۔

(۴) اگر قوائے فکری اور مظاہر روح 'روح کے ایک مستقل وجود ہونے کی دلیل ہیں تو یہ بات ہمیں حیوانات کے لیے بھی ماننا چاہیئے کیونکہ وہ بھی اپنی حد تک ادراک رکھتے ہیں۔

مختصر یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہماری روح موجود مستقل نہیں ہے اور انسان شناسی کے علم نے جو ترقی کی ہے وہ بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہے۔

ان دلائل سے یہ مجموعی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسانی اور حیوانی فزیالوجی کی ترقی اور وسعت روز بروز اس حقیقت کو زیادہ واضح کر رہی ہے کہ آثار روح اور دماغی خلیوں کے درمیان قریبی تعلق ہے۔

مادی استدلال کے کمزور پہلو: اس استدلال میں مادیین کو ایک بہت بڑا اشتباہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے آلات کار کو کام کا فاعل سمجھ لیا ہے۔

یہ واضح کرنے کے لیے کہ انہوں نے آلات کو فاعل کیسے سمجھ لیا ہے اجازت دیجئے کہ ہم ایک مثال پیش کریں۔ اس مثال پر غور کیجئے گا:

گیلیلیو کے بعد آسمانوں کی وضع و کیفیت کے مطالعہ میں ایک انقلاب پیدا ہوا ہے۔ اطالوی گیلیلیو ایک عینک ساز کی مدد سے ایک چھوٹی سی دُوربین بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ اس پر بہت خوش ہوا جب اُس نے رات کے وقت اس کی مدد سے آسمانی ستاروں کا مطالعہ شروع کیا تو اسے حیرت انگیز منظر معلوم ہوا۔ ایسا منظر اس سے پہلے کسی انسان نے نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے سمجھا کہ مَیں نے ایک اہم انکشاف کیا ہے۔ اس طرح اس دن کے بعد انسان عالم بالا کے اسرار کا مطالعہ کرنے کے قابل ہو گیا۔

اس وقت تک انسان ایک ایسے پروانے کی طرح تھا کہ جس نے فقط اپنے اردگرد کی چند شاخیں دیکھی تھیں لیکن جب اس نے دُوربین کے ذریعے جھانکا تو اسے فطرت کا ایک عظیم جنگل دکھائی دیا۔

اس سلسلے میں ترقی و کمال جاری رہا یہاں تک کہ ستاروں کو دیکھنے کے لیے بڑی بڑی دُوربینیں ایجاد ہو

---

[1] کتاب "بشر از نظر مادی" از ڈاکٹر ارانی صفحہ ۔

گئیں کہ جن کے عدسی کا قطر پانچ میٹر یا اس سے بھی زیادہ تھا۔ انہیں پہاڑوں کی ایسی بلند چوٹیوں پر نصب کیا گیا کہ جو صاف و شفاف ہُوا کے اعتبار سے مناسب تھیں۔ ایسی ایسی دُور بینیں بنیں کہ جو کئی منزلہ عمارت کے برابر تھیں۔ ان کے ذریعے انسان کو عالم بالا میں کئی جہان دکھائی دیئے۔ ایسے ایسے جہان کہ عام نظر سے انسان کو ہزارواں حصہ بھی نظر نہ آتا تھا۔

اب آپ سوچیں کہ اگر ایک دن ٹیکنالوجی اتنی ترقی کر جائے کہ انسان ایسی دُور بین بنا لے کہ جس کے عدسی کا قطر ایک سو میٹر کے برابر ہو اور جس کا ساز و سامان اور وسعت ایک شہر کی مانند ہو تو ہم پر کتنے جہان منکشف ہو جائیں گے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ دُور بینیں ہم سے لے لی جائیں تو یقینی طور پر آسمان کے بارے میں ہماری معلومات اور مشاہدات کا ایک حصہ معطل ہو جائے گا لیکن کیا حقیقی طور پر دیکھنے والے ہم ہیں یا دُور بینیں؟

کیا ٹیلی سکوپ ہمارے لیے آلات کار ہے یا خود فاعلِ کار اور خود دیکھنے والی؟

دماغ کے بارے میں بھی کوئی شخص انکار نہیں کرتا کہ دماغ کے سیل Cells کے بغیر غور و فکر نہیں کیا جا سکتا لیکن کیا دماغ روح کے کام کا آلہ ہے یا خود روح؟؟

مختصر یہ کہ مادیین نے جو تمام تر دلائل پیش کیے ہیں وہ صرف یہ ثابت کرتے ہیں کہ دماغ کے سیل اور ہمارے ادراک کے درمیان ربط موجود ہے لیکن ان میں سے کوئی دلیل یہ ثابت نہیں کرتی کہ دماغ خود غور و فکر کرتا ہے نہ کہ ادراک کا آلہ ہے (غور کیجئے گا)۔

یہاں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مُردے اگر کچھ نہیں سمجھتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ روح کا بدن سے ربط ختم ہو گیا ہے نہ یہ کہ روح فنا ہو گئی ہے۔ یہ بات بالکل اسی طرح ہے جیسے کسی بحری یا ہوائی جہاز کا وائرلیس خراب ہو جائے اور وہ ساحل یا ایئر پورٹ سے رابطہ نہ کر سکے کیونکہ رابطے کا ذریعہ منقطع ہو گیا ہے۔

استقلالِ رُوح کے دلائل

بات یہ ہو رہی تھی کہ مادیین کا اصرار ہے کہ روح سے ظاہر ہونے والے آثار و افعال دماغی سیلوں کے خواص سمجھنا چاہیئے اور فکر، حافظہ، ایجاد، محبت، نفرت، غصہ اور علم و دانش سب کو ایسے امور میں سے سمجھنا چاہیئے جنہیں تجربہ گاہ میں دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے اور انہیں بھی عالم مادہ کے قوانین کے تحت سمجھنا چاہیئے۔ اس کے برعکس استقلالِ روح کے فلاسفہ اس کی نفی پر زوردار دلائل رکھتے ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ روح کے کام خارجی پہلو رکھتے ہیں: پہلا سوال جو مادیین سے کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ

روح کے افکار و آثار دماغ کے طبیعیاتی کیمیائی Physico Chemical خواص ہیں تو پھر دماغ، معدہ، دل اور جگر وغیرہ کے کاموں میں کوئی اصولی فرق نہیں ہونا چاہیئے۔

مثلاً معدے کا کام طبیعیاتی اور کیمیائی کارکردگی کا مرکب ہے۔ معدہ اپنی خاص حرکات کے ذریعے اور تیزابوں کے ترشح سے غذا کو ہضم اور بدن میں اس کے جذب کے لیے تیار کرتا ہے۔ اسی طرح جیسا کہ کہا گیا ہے لعاب دہن کا کام طبیعیاتی اور کیمیائی عمل کی ترکیب ہے حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ روح کے کام ان سب سے مختلف ہیں۔

بدن کی تمام مشینریوں کے کام ایک دوسرے سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتے ہیں لیکن دماغ کی کیفیت استثنائی ہے۔ تمام مشینریوں کے کام داخلی پہلو رکھتے ہیں جبکہ روح سے ظاہر ہونے والے کام خارجی پہلو رکھتے ہیں اور ہمیں ہمارے وجود سے باہر کی کیفیت سے آگاہ کرتے ہیں۔

اس گفتگو کی وضاحت کے لیے چند نکات کی طرف توجہ کرنا چاہیئے:

پہلا یہ کہ کیا ہمارے وجود سے باہر کوئی جہان ہے یا نہیں؟ مسلّم ہے کہ باہر بھی ایک جہان ہے۔ آئیڈیالسٹ حضرات Idealists خارجی جہان کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے بس ہم ہی ہیں۔ اور ہمارے تصورات اور خارجی جہان بالکل ان مناظر کی طرح ہیں کہ جنہیں ہم عالم خواب میں دیکھتے ہیں اور سب کچھ تصورات ہی ہیں اور کچھ نہیں۔

یہ لوگ سخت غلطی پر ہیں۔ ہم نے متعلقہ بحث میں ان کے اشتباہ کو ثابت کیا ہے کہ کس طرح سے آئیڈیالسٹ عمل میں رئیلسٹ (Realists) ہو جاتے ہیں اور جو کچھ وہ کتابی دنیا میں سوچتے ہیں اسے کوچہ و بازار اور عام زندگی کے ماحول میں قدم رکھتے ہی بھول جاتے ہیں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کیا ہم اپنے وجود سے باہر کے جہان سے آگاہ ہیں یا نہیں؟ یقیناً اس سوال کا جواب بھی مثبت ہے کیونکہ ہم اپنے وجود سے باہر کے جہان کے بارے میں بہت سا علم اور آگاہی رکھتے ہیں اور ان موجودات کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں کہ جو ہمارے آس پاس سے بہت دُور ہیں۔

اس وقت یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا خارجی جہان ہمارے وجود میں آسکتا ہے؟ مسلّم ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا نقشہ ہمارے پاس ہے اور ہم واقع نمائی کی خاصیت سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے وجود سے باہر کے جہان کو معلوم کرسکتے ہیں۔ یہ واقع نمائی دماغ کے صرف طبیعیاتی کیمیائی Physico Chemical عمل کے خواص نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ خواص بیرونی دنیا کے بارے میں ہمارے تاثرات کی پیداوار ہیں یعنی ان کے معلول ہیں۔ جیسے غذا ہمارے معدے پر اثرات چھوڑتی ہے تو کیا غذا کی معدے پر تاثیر اس کا طبیعیاتی و کیمیائی فعل و انفعال سبب بن سکتا ہے کہ معدہ غذا کے بارے میں آگاہی رکھتا ہو؟ تو پھر کس طرح ہمارا دماغ اپنے سے باہر کی دنیا سے باخبر ہوسکتا ہے؟

دوسرے لفظوں میں خارجی اور عینی موجودات سے آگاہی کے لیے ان پر ایک قسم کا احاطہ ضروری ہے اور یہ احاطہ کرنا دماغ کے سیلوں کا کام نہیں ہے۔ دماغ کے سیل تو صرف خارج سے متاثر ہوتے ہیں اور یہ تاثر بدن کی مشینوں کی طرح ہے کہ جو خارجی کیفیت سے ان پر مرتب ہوتا ہے۔ یہ بات ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

اگر خارجی جہان سے متاثر ہونا خارج کے بارے میں آگاہی کی دلیل ہوتا تو پھر ضروری تھا کہ ہم اپنے معدے اور زبان کے ذریعے بھی آگاہی حاصل کرتے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ ہمارے ادراکات کی استثنائی کیفیت اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں کوئی اور حقیقت چھپی ہوئی ہے کہ جس کا نظام طبیعاتی اور کیمیائی نظام سے بالکل مختلف ہے (غور کیجئے گا)۔

۲۔ وحدت شخصیت: استقلال روح کے بارے میں جو دوسری دلیل ذکر کی جا سکتی ہے وہ انسان کی پوری زندگی میں وحدت شخصیت کا مسئلہ ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہم ہر چیز میں شک و تردد رکھتے ہیں تب بھی اس بات میں شک نہیں رکھتے کہ "ہم وجود رکھتے ہیں"۔

"میں ہوں" اور اپنی ہستی کے بارے میں مجھے کوئی شک نہیں ہے اور اپنے وجود کے بارے میں میرا علم حضوری ہے حصولی نہیں یعنی میں اپنے آپ کے سامنے حاضر ہوں اور اپنے آپ سے جدا نہیں ہوں۔

بہرحال اپنے آپ سے آگاہی ہماری واضح ترین معلومات میں سے ہے اور اس کے لیے کسی استدلال کی احتیاج نہیں۔ مشہور فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ نے اپنے وجود کے لیے جو معروف استدلال کیا ہے وہ یہ ہے:

میں سوچ رہا ہوں پس میں ہوں۔

یہ ایک اضافی اور غیر صحیح استدلال نظر آتا ہے کیونکہ اس نے اپنے وجود کو ثابت کرنے سے پہلے دو مرتبہ اپنے وجود کا اعتراف کیا ہے۔ ایک مرتبہ "میں" کہہ کر اور دوسری مرتبہ "رہا ہوں" کہہ کر۔

دوسری طرف دیکھا جائے تو یہ "میں" ابتدائے عمر سے آخر عمر تک ایک اکائی سے زیادہ نہیں ہے۔ آج کا "میں" وہی کل کا "میں"، وہی بیس سال پہلے کا "میں"۔ بچپن سے لے کر اب تک ایک شخص سے زیادہ کچھ نہیں ہوں۔ "میں" وہی شخص ہوں کہ جو پہلے تھا اور آخر عمر تک یہی شخص رہوں گا نہ کہ کوئی اور شخص۔ البتہ "میں" نے تعلیم حاصل کی اور "میں" پڑھا لکھا ہو گیا، "میں" نے کمال و ترقی کی منزل طے کی اور پھر بھی کروں گا لیکن "میں" کوئی دوسرا آدمی نہیں ہو گیا۔ لہٰذا سب لوگ ابتدائے عمر سے لے کر آخر عمر تک مجھے ایک ہی آدمی جانتے ہیں میرا ایک ہی نام ہے اور وہی اسی شخص کا شناختی کارڈ وغیرہ۔

اب ہم سوچیں اور دیکھیں کہ یہ موجود واحد کہ جس میں ہماری ساری عمر پوشیدہ ہے، کیا ہے؟ کیا یہ ہمارے بدن کے ذرات اور خلیوں یا دماغی سیلوں اور ان کے فعل و انفعالات کا مجموعہ ہے؟ یہ تو ہماری زندگی میں بارہا

بدلتے رہتے ہیں اور تقریباً ہر سات سال کے بعد ایک مرتبہ تمام سیل بدل جاتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ایک روز و شب میں ہمارے بدن کے لاکھوں سیل مرتے ہیں اور ان کی جگہ نئے سیل لے لیتے ہیں۔ جیسے کسی پرانی عمارت کی پرانی اینٹیں نکالتے رہیں اور ان کی جگہ نئی اینٹیں لگاتے رہیں تو ایک عرصے بعد یہ عمارت بالکل بدل جائے گی اگرچہ عام لوگوں کو اس کا اندازہ نہ ہو۔ جیسے کسی ایک بڑے تالاب کا پانی ایک تالاب سے نکلتا رہتا ہے اور دوسری طرف سے تازہ پانی داخل ہوتا رہتا ہے۔ واضح ہے کچھ عرصے بعد سارا پانی بدل جائے گا اگرچہ ظاہر بیں افراد توجہ نہ کریں اور اسے پہلے والا ہی سمجھتے رہیں۔

کلی طور پر ہر موجود جو غذا حاصل کرتا ہے اور غذا کا مصرف رکھتا ہے اس کی تعمیرِ نو کا سلسلہ جاری رہے گا اور وہ بدل جائے گا۔

لہٰذا ایک ستر سالہ انسان کے تمام اجزائے بدن تقریباً دس مرتبہ بدل چکے ہوتے ہیں۔ اگر ہم مادیین کی طرح انسان کو وہی جسم اور وہی دماغ و اعصاب اور وہی اس کے طبیعاتی و کیمیائی خواص سمجھیں تو یہ ۔ ہیں۔ تو ستر سال کی عمر میں دس مرتبہ بدل چکا ہوگا اور یہ وہی پہلے والا شخص نہیں ہوگا حالانکہ کوئی عقل اس بات کو قبول نہیں کرے گی۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مادی اجزاء کی بجائے کوئی اور ایک واحد ثابت حقیقت ہے جو ساری عمر میں موجود رہتی ہے کہ جو مادی اجزاء کی طرح بدلتی نہیں اور وہی در اصل بنیادِ وجود ہے۔ وہی ہماری شخصیت کی وحدت کا عامل و باعث ہے۔

ایک اشتباہ سے اجتناب

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دماغ کے سیل نہیں بدلتے۔ وہ کہتے ہیں کہ فزیالوجی کی کتابوں کے مطابق دماغ کے سیلوں کی تعداد آغازِ عمر سے آخرِ عمر تک ایک ہی رہتی ہے یعنی وہ بالکل کم یا زیادہ نہیں ہوتے البتہ بڑے ہو جاتے ہیں لیکن یہ نہیں ہوتا کہ اُن جیسے اور سیل پیدا ہوتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں کوئی نقصان پہنچے تو ان کی جگہ نئے سیل پیدا نہیں ہوتے۔ لہٰذا ہمارے بدن میں ایک "واحدِ ثابت" موجود رہتا ہے اور یہ دماغ کے سیل ہیں۔ یہی ہماری شخصیت کی وحدت کے محافظ ہیں۔

یہ خیال ایک بہت بڑا اشتباہ ہے کیونکہ یہ بات کرنے والوں نے دو مسئلوں کو آپس میں خلط ملط کر دیا ہے۔ دَورِ حاضر کی سائنس نے جو کچھ ثابت کیا ہے یہ ہے کہ دماغ کے سیل آغاز سے آخر تک تعداد کے لحاظ سے اتنے ہی رہتے ہیں اور ان کی تعداد میں کمی بیشی نہیں ہوتی نہ یہ کہ ان سیلوں کے ذرات نہیں بدلتے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ انسانی بدن کے تمام سیلوں کو ہمیشہ غذا کی احتیاج رہتی ہے نیز پرانے سیل مرتے رہتے ہیں، جیسے کوئی شخص ایک طرف کماتا رہتا ہے اور دوسری طرف خرچ کرتا رہتا ہے مسلّم ہے

کہ اس شخص کا سرمایہ آہستہ آہستہ بدل جائے گا اگرچہ اس کی مقدار نہ بدلے۔ جیسے کسی تالاب سے ایک طرف پانی نکلتا رہے اور دوسری طرف سے نیا پانی آتا رہے۔ ایک عرصے بعد اس کا سارا پانی بدل جائے گا اگرچہ اس کی مقدار اتنی ہی رہے۔

(فزیالوجی کی کتابوں میں بھی اس بات کا ذکر موجود ہے۔ نمونے کے طور پر کتاب "بچہ مونہا" صـ۱۱ اور کتاب "فیزیولوژی حیوانی" از ڈاکٹر محمود بہزاد اور ان کے ہمکار صـ۳۲ کی طرف رجوع کریں)۔

لہٰذا دماغ کے سیل بھی باقی نہیں رہتے اور دیگر سیلوں کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔

۲۔ بڑے کو چھوٹے پر منطبق نہیں کیا جا سکتا: فرض کریں کہ ہم دریا کے ایک خوبصورت کنارے پر بیٹھے ہیں۔ چند چھوٹی چھوٹی کشتیاں پانی کی موجوں پر تیر رہی ہیں۔ ایک بڑی کشتی بھی ہے۔ ایک طرف سورج غروب ہو رہا ہے اور دوسری طرف چاند طلوع ہو رہا ہے۔ خوبصورت آبی پرندے پانی پر آکر بیٹھتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔ ایک طرف بہت بڑا پہاڑ ہے۔ اس کی چوٹی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔

ہم ساحل پر بیٹھے چند لمحوں کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ جو کچھ دیکھا ہے اسے اپنے ذہن پر مجسم کر لیتے ہیں۔ وہی بڑا سا پہاڑ، دریا کی وہی وسعت، وہی بڑی سی کشتی — سب ہمارے صفحۂ ذہن پر ابھر آتے ہیں یعنی جیسے ایک بہت بڑا منظر ہماری روح کے سامنے یا ہماری روح کے اندر موجود ہو۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس منظر کی جگہ کہاں ہے۔ کیا چھوٹے سے دماغ کے سیلوں میں اتنا بڑا نقشہ سما جاتا ہے۔ یقیناً نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے وجود کا ایک اور حصہ ہو کر جو اس جسمانی مادہ سے ماوراء ہو اور اس قدر وسیع ہو کہ یہ تمام مناظر اور نقشے اس میں سما سکیں۔

کیا ایک ۵۰۰ مربع میٹر عمارت کا نقشہ اسی لمبائی چوڑائی کے ساتھ چند مربع ملی میٹر زمین پر بنایا جا سکتا ہے؟ مسلم ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے کیونکہ کوئی بہت بڑا موجود اپنی اسی وسعت کے ساتھ کسی چھوٹے سے موجود پر منطبق نہیں ہو سکتا۔ انطباق کے لیے ضروری ہے کہ جسے منطبق کرتا ہے وہ، اس کے مساوی ہو یا اس سے چھوٹا۔

لہٰذا ہم انتہائی بڑے بڑے ذہنی نقشوں کو اپنے دماغ کے چھوٹے چھوٹے خلیوں میں جگہ کیسے دے سکتے ہیں۔ کرۂ زمین تقریباً چار کروڑ مربع میٹر ہے اس کی ہم اپنے ذہن میں ترسیم کر سکتے ہیں۔ کرۂ آفتاب زمین سے بارہ لاکھ گنا ہے اور کہکشائیں ہمارے آفتاب کی نسبت کئی ملین گنا ہیں، انہیں ہم اپنی فکر میں تصویر کشی کر سکتے ہیں لیکن اگر ہم چاہیں کہ اپنے دماغ کے چھوٹے چھوٹے خلیوں میں یہ نقشے اسی وسعت کے ساتھ بنائیں تو بڑے کے چھوٹے پر منطبق نہ ہو سکنے کے قانون کے مطابق ممکن نہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اس جسم سے مافوق ایک وجود کا اعتراف کریں کہ جس میں یہ بڑے بڑے نقشے سما سکیں۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

ہو سکتا ہے کہا جاتے کہ ہمارے ذہنی نقشے مائیکرو فلم یا جغرافیائی نقشوں کی طرح ہیں مثلاً ......۱/۱ یا ......۱/۱ (یعنی ایک سنٹی میٹر برابر ہے ۱۰ لاکھ سنٹی میٹر وغیرہ)۔ جغرافیائی نقشوں یا مائیکرو فلموں میں ہم اس طرح کا تناسب معین کر لیتے ہیں، یہ سکیل Scale ہمیں بتاتی ہے کہ اس نقشے کو ہم اسی نسبت کے ساتھ بڑا کریں گے تو اصل پیمائش ہمیں میسر آجائیں گی۔ نیز ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ کسی دیو پیکر جہاز کی ایک تصویر سے ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کتنا بڑا ہے لہٰذا اس کی تصویر کھینچنے سے پہلے کسی انسان کو اس کے عرشے پر کھڑا کر کے دونوں کی تصویر کھینچتے ہیں تاکہ موازنے سے اندازہ ہو جائے کہ جہاز کتنا بڑا ہے۔

ہو سکتا ہے کہا جاتے کہ ہمارے ذہنی نقشے بھی چھوٹی چھوٹی تصویریں ہیں جنہیں معین سکیل کے تحت چھوٹا کیا گیا ہے اور اگر انہیں اسی نسبت سے بڑا کر دیا جائے تو ایک حقیقی نقشہ مل جائے گا اور مسلّم ہے کہ یہ چھوٹے نقشے دماغ کے سیلوں میں بن سکتے ہیں (غور کیجئے گا)۔

اب ہم اس سوال کے جواب کی طرف آتے ہیں۔

اہم بات یہی ہے کہ مائیکرو فلموں کو عام طور پر پروجیکٹروں کے ذریعے بڑا کر کے پردہ سکرین پر منعکس کرتے ہیں۔ اسی طرح جغرافیائی نقشوں میں دی گئی سکیل کے مطابق ہم نقشے کو ضرب دے کر اپنے ذہن میں منعکس کرتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بڑا پردہ جس پر ہماری بڑی بڑی ذہنی فلمیں منعکس ہوتی ہیں کہاں ہے؟

کیا وہ بڑا پردہ دماغ کے خلیے ہیں؟ وہ تو قطعاً نہیں اور وہ چھوٹا جغرافیائی نقشہ کہ جسے ہم بڑے عدد سے ضرب دے کر بڑے نقشے میں تبدیل کرتے ہیں یقیناً اس کے لیے کوئی جگہ چاہیئے۔ کیا دماغ کے چھوٹے چھوٹے خلیے اس کی جگہ بن سکتے ہیں؟

زیادہ واضح عبارت میں ۔ مائیکرو فلم اور جغرافیائی نقشے میں جو کچھ خارج میں ہے وہ تو وہی چھوٹی فلم اور نقشہ ہے لیکن ہمارے ذہنی نقشوں میں تو بعینہ وہ نقشے اپنے خارجی وجود کی مقدار کے مطابق ہیں۔ لہٰذا انہیں تو جگہ چاہیئے خود انہیں کے برابر اور انہی کی مقدار کے مطابق اور ہم جانتے ہیں کہ دماغ کے خلیے اس سے کہیں چھوٹے ہیں کہ انہیں اسی مقدار کے مطابق ان پر منعکس کیا جا سکے ۔ مختصر یہ کہ ان ذہنی نقشوں کو ہم ان کے خارجی وجود کے مطابق تصور کرتے ہیں اور یہ بڑی تصویر چھوٹے سے خلیوں میں منعکس نہیں ہو سکتی لہٰذا ان کے لیے کسی جگہ کی ضرورت ہے۔ یہیں سے ہم سیلوں سے مافوق ایک حقیقی وجود کا سراغ پاتے ہیں۔

۴۔ **روح کے مظاہر مادی کیفیات کی مانند نہیں:** ایک اور دلیل جو ہمیں استقلالِ روح اور اس کے غیر مادی ہونے کی طرف رہنمائی کر سکتی ہے یہ ہے کہ مظاہر روح میں کچھ خواص و کیفیات ایسی دکھائی دیتی ہیں جو مادی موجودات کے خواص و کیفیات سے کوئی مشابہت نہیں رکھتیں ۔ کیونکہ:

اولاً موجودات کے لیے زمانہ درکار ہے اور وہ تدریجی پہلو رکھتے ہیں۔
ثانیاً وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ وہ کہنہ اور فرسودہ ہو جاتے ہیں۔
ثالثاً ان کا متعدد اجزاء میں تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

لیکن ــ ذہنی موجودات اور اس میں پیدا ہونے والی چیزوں میں یہ آثار و خواص نہیں ہیں۔ ہم موجود جہان جیسا ایک جہان اپنے ذہن میں ترسیم کر سکتے ہیں، بغیر اس کے کہ زمانہ گزرے اور اس کے لیے تدریجی پہلو کی ضرورت ہو۔

اس سے قطع نظر، وہ مناظر کہ مثلاً جو بچپن میں ہمارے مغز ذہن پر نقش ہو گئے تھے زمانہ گزرنے کے باوجود پرانے اور فرسودہ نہیں ہوتے اور ان کی شکل اسی طرح محفوظ ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے انسان کا دماغ کہنہ ہو گیا ہو لیکن اس شکل سے وہ گھر کہ جس کا نقشہ بیس سال قبل ہمارے ذہن میں ثبت ہوا تھا اسی طرح رہتا ہے۔ اس میں ایک طرح کا ثبات رہتا ہے کہ جو ماورائے مادہ جہان کی خاصیت ہے۔

نقشوں اور تصویروں کے بارے میں ہماری روح عجیب و غریب صلاحیت رکھتی ہے۔ ہم لوگ بغیر کسی تمہید کے بغیر ہر قسم کا نقشہ اپنے ذہن میں کھینچ سکتے ہیں۔ مثلاً آسمانی کرّے، کہکشائیں یا زمینی موجودات دریا، پہاڑ وغیرہ ان سب کا تصور ہمارے ذہن میں آنِ واحد میں ابھر سکتا ہے۔ یہ خاصیت ایک مادی موجود کی نہیں ہے بلکہ مافوق مادہ موجود کی نشانی ہے۔

اس کے علاوہ ہم جانتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ ۲ × ۲ = ۴ کی مساوات میں مساوات کی ہر طرف کو ہم جزو جزو کر سکتے ہیں یعنی ۲ کا تجزیہ کریں یا ۴ کا لیکن اس مساوات کا تجزیہ نہیں کر سکتے اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ مساوات دو آدھے رکھتی ہے اور ہر آدھا دوسرے آدھے کے غیر ہے۔ مساوات کا ایک ہی مفہوم ہے کہ جو قابلِ تجزیہ نہیں ہے۔ یعنی ۲ × ۲ = ۴ یا ہے یا نہیں ہے اسے دو نیم ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس قسم کے ذہنی مفاہیم قابلِ تقسیم و تجزیہ نہیں ہیں اسی بناء پر وہ مادی نہیں ہو سکتے کیونکہ اگر وہ مادی ہوتے تو ان کا تجزیہ ہو سکتا اور انہیں تقسیم کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری روح کہ جو ایسے غیر مادی مفاہیم کا مرکز ہے مادی نہیں ہو سکتی اس لیے وہ مافوق مادہ ہے (غور کیجئے گا)[1]

---

[1] کتاب "معاد و جہان پس از مرگ" کے حصہ "استقلالِ روح" کی تلخیص۔

(۸۶) وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا ۝

(۸۷) اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا ۝

ترجمہ

(۸۶) اور اگر ہم چاہیں تو جو کچھ وحی کی صورت میں تجھے دیا گیا ہے وہ تجھ سے لے لیں۔ پھر تو ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی نہ پائے گا۔

(۸۷) مگر یہ کہ تیرے رب کی رحمت (تیرے شامل حال) ہو کیونکہ تیرے رب کا فضل تجھ پر بہت زیادہ ہے۔

تفسیر

تجھے جو کچھ حاصل ہے اُس کی رحمت سے ہے

گزشتہ آیات میں قرآن کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر نظر دو آیات میں بھی اسی سلسلے میں بات کی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے، ہم اگر چاہیں تو جو کچھ وحی کی صورت میں تجھے دیا گیا ہے وہ تجھ سے لے لیں (ولئن شئنا لنذھبن بالذی اوحینا الیك)۔ اور ایسا ہو جائے تو پھر تو ہمارے مقابلے میں، کوئی حمایتی نہ پائے گا (ثم لا تجد لك به علینا وکیلا)۔

ہم ہی نے تجھے یہ علوم بخشے ہیں تاکہ تُو لوگوں کا ہادی و رہبر بنے اور ہم ہی اگر مصلحت سمجھیں تو یہ تجھ سے واپس لے لیں اور اس میں کسی شخص کو کوئی دخل اور تصرف نہیں ہے۔

گزشتہ آیات سے ان آیات کے ربط کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کے علاوہ یہ احتمال بھی ہے کہ گزشتہ بحث کے آخری جملے میں ہے:

تمہیں صرف تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔

زیر بحث آیت میں ہے کہ خدا نے علم کا جو حصہ پیغمبر کو دیا ہے اگر چاہے تو وہ بھی واپس لے سکتا ہے لہٰذا تمہاری ہر چیز یہاں تک کہ تمہارا علم اور آگہی بھی اُسی کی طرف سے ہے۔

بعد والی آیت استثناء کی صورت میں آئی ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے: اگر یہ علم ہم تجھ سے واپس نہیں لیتے تو یہ تیرے رب کی رحمت ہے (الّا رحمة من ربك)۔ خود تیری ہدایت و نجات کیلئے بھی رحمت ہے اور عالم بشریت کی ہدایت و نجات کے لیے بھی۔ یہ رحمت درحقیقت اسی رحمتِ خلقت کا تسلسل ہے۔

وہ خدا کہ جس نے اپنی عام اور خاص رحمت کے تقاضے کے مطابق انسانوں کو پیدا کیا اور انہیں لباسِ ہستی عطا کیا، کیا وہ لباس کہ جو تکامل و ارتقاء کے لیے بہترین ہے، اسی خدا نے راہِ حیات طے کرنے کے لیے اپنی رحمت کے تقاضے پر اُن کو نہیں دیا۔ آگاہ، معصوم، انتھک، ہمدرد، مہربان اور با استقامت رہبران کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے۔ یہی رحمت ہے کہ جس کا تقاضا ہے کہ روئے زمین کبھی حجت خدا سے خالی نہ رہے۔

آیت کے آخر میں تاکید کے طور پر یا گزشتہ بات کی دلیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے: تیرے رب کا فضل تجھ پر بہت زیادہ ہے (ان فضله كان عليك كبيرًا)۔

ایک طرف تو تیری عبادت، تہذیبِ نفس اور جہاد نے تیرے دل کی آبیاری کی اور یہ اس کے فضل کا سبب بنی اور دوسری طرف ایک رہبر کے لیے انسانوں کی ناگزیر احتیاج کے تقاضے پر تجھ پر خدا کا انتہائی فضل ہوا۔ اس نے علم کے دروازے تیرے لیے وا کیے، تجھے انسانی ہدایت کے اسرار سے آگاہ کیا اور تجھے خطاؤں سے محفوظ رکھا تاکہ تُو اختتامِ جہان تک لوگوں کے لیے اسوہ نمونہ بن جائے۔

ضمناً اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ مندرجہ بالا جملہ استثنائیہ قبل کی آیت سے مربوط ہے اور مستثنیٰ و مستثنیٰ منہ کا مفہوم اسی طرح ہے:

> اگر ہم چاہیں تو تجھ پر بھیجی گئی وحی واپس لے لیں لیکن ہم ایسا نہیں کریں گے کیونکہ رحمتِ الٰہی تیرے اور لوگوں کے شاملِ حال ہے[1]

واضح ہے کہ ایسا استثناء اس امر کی دلیل نہیں کہ ہو سکتا ہے خدا عملی طور پر کسی دن یہ رحمت اپنے پیغمبر سے واپس لے لے بلکہ اس بات کی دلیل ہے کہ پیغمبر کے پاس بھی اپنی طرف سے کچھ نہیں ہے اس کا علم اور آسمانی وحی سب خدا کی طرف سے ہیں اور اس کی مشیّت سے وابستہ ہیں۔

---

[1] درحقیقت جملے کا مفہوم اس طرح ہے:

ولكن لا نشاء ان نذهب بالذى اوحينا اليك رحمة من ربك

لیکن ہم نہیں چاہتے کہ تیری طرف جو کچھ وحی کیا گیا ہے اسے واپس لے لیں کیونکہ یہ تیرے رب کی رحمت ہے۔

(۸۸) قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝

(۸۹) وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝

ترجمہ

(۸۸) کہہ دو: اگر انسان اور جن مل کر اس قرآن کی مثل لانا چاہیں تو اس کی مثل نہیں لا سکیں گے اگرچہ اس کام میں وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں۔

(۸۹) اس قرآن میں ہم نے لوگوں کے سامنے طرح طرح کی مثالیں اور نمونے پیش کیے ہیں لیکن اکثر لوگ انکارِ حق کے سوا کچھ نہیں کرتے

تفسیر

قرآن کی مثل کبھی نہیں لائی جا سکتی

قبل اور بعد کی آیات قرآن کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں جبکہ زیرِ بحث آیات صراحت کے ساتھ اعجازِ قرآن کے متعلق بات کر رہی ہیں: اس لحاظ سے زیرِ نظر آیات کا گزشتہ اور بعد کی آیات سے ربط محتاجِ بیان نہیں ہے۔

علاوہ ازیں آئندہ آیات میں مشرکین کی بہانہ تراشیوں کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے کہ وہ طرح طرح کے من پسند معجزات کا تقاضا کرتے تھے۔ اس حوالے سے زیرِ نظر آیات آئندہ کی بحث کے لیے مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان بہانہ تراش لوگوں پر واضح کرتی ہیں کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی حقانیت کا اعلیٰ ترین، زندہ اور جاوداں معجزہ یہی قرآن ہے کہ جو تاریخ میں ہمیشہ چمکتا رہے گا اور اس کے ہوتے ہوئے بہانہ سازیاں بے جا ہیں۔

بعض نے ان آیات کا تعلق گزشتہ آیات سے اس پہلو سے بیان کیا ہے کہ روح کے اسرار آمیز ہونے

کا موازنہ قرآن کے اسرار آمیز ہونے سے کیا گیا ہے۔[1] البتہ جس ربط کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ واضح نظر آتا ہے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ یہاں روئے سخن اپنے رسول کی جانب کرتے ہوئے کہتا ہے: ان سے کہو: اگر تمام انسان اور جن مل کر قرآن کی مثل لانا چاہیں تو بھی وہ اس جیسا کلام لانے پر قادر نہیں ہو سکتے اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں (قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یأتوا بمثل ھذا القرآن لا یأتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرًا)۔

یہ آیت پوری صراحت کے ساتھ پورے عالم کو چیلنج کرتی ہے۔ سب لوگ چاہے چھوٹے ہوں یا بڑے عرب ہوں یا غیر عرب حتیٰ کہ انسان ہوں یا غیر انسان ذوی العقول موجودات، علماء، فلاسفہ، ادباء، مورخین نابغ یا غیر نابغ غرض یہ کہ قرآن بلا استثناء سب کو مقابلے کی دعوت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر تمہارا خیال ہے کہ قرآن خدا کا کلام نہیں ہے اور انسانی دماغ کی ایجاد ہے تو تم بھی انسان ہو، اس کی مثل لے آؤ اور اگر مشترکہ کاوش کے باوجود اپنے آپ کو ناتواں پاؤ تو یہ اعجاز قرآن کی بہترین دلیل ہے۔

عقائد اور کلام کے علماء مقابلے کی اس دعوت کو "تحدی" (چیلنج) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ تحدی ہر معجزے کا ایک رکن ہے، جہاں کہیں اس قسم کی تعبیر آئے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ امر معجزات میں سے ہے۔

آیت کے چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ یہ چیلنج عام ہے اور سب انسانوں اور دیگر ذوی العقول موجودات پر محیط ہے۔

۲۔ یہ تحدی اور دعوت دائمی ہے کیونکہ اس میں زمانے کی شرط نہیں۔ اس طرح سے یہ دعوت جس طرح رسول اللہؐ کے زمانے میں تھی آج بھی ہے اور کل بھی ہوگی۔

۳۔ "اجتمعت" کی تعبیر مل جل کر، ہم فکر ہو کر اور باہمی تعاون سے مقابلے کے لیے آنے کی دعوت کا اظہار کر رہی ہے اور یہ بات مسلّم ہے کہ اس طرح سے قوت میں سینکڑوں گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔

۴۔ "ولو کان بعضھم لبعض ظھیرًا" (اگرچہ ایک گروہ دوسرے کی مدد کرے) یہ جملہ ہم فکر ہونے اور باہمی تعاون کے لیے تاکید مزید ہے نیز ضمناً یہ مقاصد و اہداف کی پیش رفت میں ہم فکری و تعاون کی اہمیت و تاثیر کے لیے ایک سربستہ اشارہ ہے۔

۵۔ "مثل ھذا القرآن" ایک جامع تعبیر ہے جو ہر لحاظ سے مثل و مشابہ ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے، مضامین و مفاہیم کے لحاظ سے، انسان سازی کے حوالے سے،

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۵ ص ۳۵۰ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

علمی مباحث کے پہلو سے، حیات بخش معاشرتی قانون کے لحاظ سے، خرافات سے پاک تاریخ کے اعتبار سے، پیش گوئیوں کے لحاظ سے اور دیگر تمام پہلوؤں کے اعتبار سے۔ اس کی مثل ہو۔

۶۔ سب انسانوں کو دعوت دینا اس بات کی دلیل ہے کہ مسئلہ اعجاز میں صرف الفاظ قرآن اور فصاحت و بلاغت کا پہلو ملحوظ نظر نہیں ہے کیونکہ ایسا ہوتا تو عربی زبان سے ناآشنا لوگوں کو دعوت دینا بے فائدہ تھا۔

۷۔ ایک منہ بولتا اور رسا معجزہ وہ ہے جس کے لانے والا مخالفین کو نہ صرف مقابلے کی دعوت دے بلکہ مختلف طریقوں سے اس کام کی تحریک کرے اور تشویق دلائے۔ بالفاظ دیگر غیرت دلائے تاکہ اس کام کے لیے جو کچھ ان کے بس میں ہو وہ کریں۔ پھر جب وہ ایسا نہ کر سکیں تو اعجاز کی عظمت اور گہرائی واضح ہو جائے زیر بحث آیت میں عملی طور پر بالکل ایسا ہی کیا گیا ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو سب انسانوں کو دعوت دی گئی ہے اور "لا یأتون بمثلہ" کہہ قرآن کے عجز کی تصریح کی گئی ہے اور اس طرح انہیں اکسایا گیا ہے اور دوسری طرف "ولو کان بعضہم لبعض ظہیرا" کہہ کر مزید تحریک دلائی گئی ہے۔

بعد والی آیت درحقیقت اعجاز قرآن کے ایک اور پہلو کو بیان کرتی ہے اور وہ ہے اس کی جامعیت۔ ارشاد ہوتا ہے: اس قرآن میں ہم نے تمام طرح کے معارف کا نمونہ بیان کیا ہے (ولقد صرفنا للناس فی ھذا القراٰن من کل مثل)۔ لیکن اس کے باوجود اکثر جاہل و نادان لوگوں نے نہ صرف انکار حق ہی کیا ہے بلکہ ان کا ردعمل ایسا ہے گویا انہوں نے دلائل ہدایت کو پہچانا تک نہیں (فابٰی اکثر الناس الا کفورا)۔

"صرفنا"۔ "تصریف" کے مادہ سے ہے۔ یہ تغیر یا تبدل اور ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنے کے معنی میں آیا ہے۔

"کفور" انکار حق کے معنی میں آیا ہے۔

واقعاً مضامین قرآن کا یہ تنوع اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے ذریعے کہ جس نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا ہو، عجیب و غریب ہے کیونکہ اس آسمانی کتاب میں عقائد کے بارے میں متین اور پختہ عقلی دلائل بھی ہیں اور نوع بشر کی تمام ضروریات کی بنیاد پر متین و استوار احکام بھی ہیں۔ تاریخ کے بارے میں بھی اس کی گفتگو بے نظیر، جذبوں کو ابھارنے والی، بیدار کن، دلچسپ، ہلا دینے والی خرافات سے پاک ہے۔ نیز اس کی اخلاقی مباحث بھی دلوں پر وہی تاثرات مرتب کرتی ہیں جو ابر بہار بے جان زمین پر۔ اسی طرح اس کے علمی مسائل ایسے حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں جن کی کم از کم اس زمانے میں علماء کو خبر نہ تھی۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کی ہر وادی حسین ترین اور عالی ترین ہے۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ انسان کی معلومات محدود ہیں، جیسا کہ گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے

اور خصوصاً اس ماحول پر نظر کریں کہ جس میں پیغمبرِ اسلامؐ پروان چڑھے کہ جب اس محدود علم کی بھی لوگوں کو خبر نہ تھی اس کے باوجود قرآن نے توحید، اخلاق، معاشرت، سیاست اور انتظامی امور پر ایسے متنوع مضامین پیش کیے ہیں، کیا یہ امر اس بات کی دلیل نہیں کہ اسے انسانی دماغ نے نہیں تراشا بلکہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر جن و انس مل کر اس کی مثل لانا چاہیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

فرض کریں کہ دورِ حاضر کے علماء، دانشور اور مختلف علوم کے ماہرین جمع ہو جائیں اور وہ ایک انسائیکلوپیڈیا تیار کریں اور اسے بہترین قالب میں ڈھالیں تو ہو سکتا ہے کہ یہ آج کے زمانے کے لحاظ سے تو جامعیت رکھتا ہو لیکن مسلّم ہے کہ پچاس سال بعد نہ صرف یہ ناقص اور نارسا معلوم ہوگا بلکہ اس کی کہنگی کے آثار بھی نمایاں ہوں گے جبکہ قرآن جس زمانے میں بھی پڑھا جائے گا خصوصاً ہم نسلے دورِ حاضر کے حوالے سے دیکھا تو ایسا لگتا ہے جیسے آج ہی اور آج کے لیے نازل ہوا ہے اس پر مرورِ زمانہ کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔

۹۰ وَقَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ

۹۱ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ

۹۲ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ

۹۳ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۟

ترجمہ

۹۰ اور انہوں نے کہا کہ ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک تو ہمارے لیے اس (خشک اور بنجر) زمین سے ایک چشمہ جاری نہ کر دے۔

۹۱ یا تیرے لیے کھجور اور انگور کا باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں جاری کر دے۔

۹۲ یا جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے تو آسمان سے (پتھروں کے) ٹکڑے ہمارے سروں پر گرا دے یا اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آ۔

۹۳ یا تیرے لیے سونے کا ایک مزین گھر ہو یا تو آسمان پر چڑھ جائے (لیکن) ہم

تیرے آسمان پر چڑھ جانے پر بھی ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک تو ہمارے لیے کوئی ایسا نامہ نہ لے آئے جسے ہم پڑھیں۔ ان سے کہہ دے میرا رب (ان بے قیمت مہمل باتوں سے) پاک ہے جبکہ میں اس کے فرستادہ ایک انسان کے سوا کچھ نہیں ہوں۔

شان نزول

اسلامی روایات میں اور مختلف مفسرین کی تفسیروں میں مندرجہ بالا آیات کے بارے میں مختلف عبارتوں میں شان نزول نقل ہوئی ہے۔ ان کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:

بعض مشرکین مکہ کہ جن میں ولید بن مغیرہ اور ابوجہل بھی تھا خانہ کعبہ کے پاس جمع ہوتے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے رسول اللہ کے بارے میں گفتگو کی۔ آخرکار نتیجۂ بحث یہ نکالا گیا کہ محمد (ص) کے پاس بھیجا جائے جو یہ پیغام دے کہ تیرے قبیلہ قریش کے اشراف جمع ہوئے ہیں، وہ تجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں لہٰذا تم ہمارے پاس آؤ۔

پیغمبر اکرم کو امید ہوئی کہ شاید نور ایمان ان کے دلوں میں چمک اٹھا ہو اور وہ حق کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوئے ہوں لہٰذا وہ فوراً ان کے پاس تشریف لے گئے۔

جب آپؐ اُن کے پاس پہنچے تو انہوں نے ایسی باتیں کیں:

"اے محمدؐ! ہم نے تمہیں اتمام حجت کے لیے بلایا ہے۔ ہم کسی ایسے شخص کو نہیں جانتے کہ جس نے اپنے قوم وقبیلہ کو اتنی تکلیف پہنچائی ہو جتنی تم نے پہنچائی ہے۔ تم نے ہمارے خداؤں کو گالیاں دیں، ہمارے دین کا مذاق اڑایا، ہماری عقل کو حماقت قرار دیا اور اتحاد میں نفاق کا بیج بویا۔ ہمیں بتاؤ آخر تم چاہتے کیا ہو۔ تمہیں دولت کی ضرورت ہے تو ہم اتنی دولت دیں گے کہ تم بے نیاز ہو جاؤ گے۔ مقام ومنصب چاہتے ہو تو ہم تمہیں بہت بڑا منصب دینے کو تیار ہیں۔ تم بیمار ہو (اور تمہیں کوئی نفسیاتی تکلیف ہے) تو ہم تمہارے علاج کے لیے بہترین طبیب لے آتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

ان میں سے کوئی بھی مسئلہ نہیں۔ خدا نے مجھے تمہاری طرف بھیجا ہے اور آسمانی کتاب مجھے دی ہے۔ اگر اسے قبول کرو تو اس میں تمہاری دنیا و آخرت کی بھلائی ہے اور اگر تم قبول نہ کرو

گے تو میں صبر کروں گا یہاں تک کہ خدا تمہارے اور میرے درمیان فیصلہ کر دے۔

وہ کہنے لگے:

بہت اچھا، یہ بات ہے تو ہمارے شہر جیسا تنگ کوئی اور شہر نہیں ہے (مکہ کے اطراف میں پہاڑیاں ہیں) اپنے پروردگار سے سوال کرو کہ ان پہاڑوں کو پیچھے کر دے اور شام و عراق کی طرح یہاں دریا جاری کر دے تاکہ یہ خشک و بے آب وگیاہ زمین سیراب ہو جائے نیز اس سے یہ بھی تقاضا کرو کہ ہمارے بڑوں کو زندہ کر دے البتہ ان میں قصی بن کلاب ضرور ہو کیونکہ وہ راست گو بزرگ تھا، تاکہ ہم اس سے پوچھیں کہ تو جو کچھ کہتا ہے وہ حق ہے یا باطل۔

رسول اللہؐ نے بے اعتنائی سے فرمایا:

میں ان کاموں پر مامور نہیں ہوں۔

وہ کہنے لگے:

اگر ایسا نہیں کرتے تو کم از کم اپنے خدا سے کہو کہ کوئی فرشتہ بھیج دے کہ جو تیری تصدیق کرے۔ علاوہ ازیں ہمیں باغات، خزانے اور سونے کے محلات دے دے۔

آپؐ نے فرمایا:

میں ان امور کے لیے مبعوث نہیں ہوا میں خدا کی طرف سے ایک دعوت لے کر آیا ہوں۔ اگر قبول کرتے ہو تو خوب ورنہ خدا میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے گا۔

وہ کہنے لگے:

پھر جیسا کہ تیرا گمان ہے کہ تیرا خدا جب چاہے ہمارے سروں پر پتھر گرا سکتا ہے، یہ آسمانی پتھر ہمارے سروں پر برسا۔

آپؐ نے فرمایا:

یہ کام خدا سے متعلق ہے۔ وہ چاہے گا تو کرے گا۔

ان میں سے ایک کہنے لگا:

تو یہ کام کر بھی دکھائے تب بھی ہم ایمان نہیں لائیں گے۔ ہم تو اس وقت ایمان لائیں گے جب تو خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آئے گا۔

رسول اللہؐ نے یہ فضول باتیں سنیں تو اٹھ کھڑے ہوئے اور اس مجلس سے جانے لگے اور ان میں سے بعض افراد آپؐ کے پیچھے آئے اور کہنے لگے:

اے محمدؐ! تیری قوم نے تیرے سامنے جو بھی تجویز رکھی ہے تو نے قبول نہیں کی۔ پھر انہوں نے کچھ امور کہ جو ان سے متعلق تھے ان کی خواہش کی، تو نے وہ بھی پوری نہیں کی۔ آخرکار

انہوں نے تجھ سے اس عذاب کی خواہش کی ہے کہ جس کی تو دھمکی دیتا رہتا ہے کہ ان پر لائے گا۔ خدا کی قسم! ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ تو یہ نہ کرے کہ آسمان کی طرف ایک سیڑھی لگائے اور اس کے ذریعے تو ہمارے سامنے اوپر جائے اور واپسی پر اپنے ساتھ چند فرشتے لے کر آئے اور ساتھ ہی تیرے پاس ایک خط بھی ہو کر جو تیرے دعوی کی صداقت کی گواہی دے۔

ابوجہل کہنے لگا:

چھوڑ دو اسے۔ یہ تو ہمارے بتوں کو گالیاں دینے کے علاوہ کچھ نہیں جانتا اور میں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ جس وقت یہ سجدے میں ہو گا ایک بہت بڑا پتھر اٹھا کر اس کے دماغ پر دے ماروں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں سے اس حالت میں لوٹے۔ اس قوم کی جہالت، ہٹ دھرمی اور غرور کے باعث آپ کا دل غم و اندوہ سے معمور تھا۔ اس موقع پر زیر نظر آیات نازل ہوئیں [1]

تفسیر

طرح طرح کے بہانے

گزشتہ آیات میں قرآن حکیم کی عظمت اور اعجاز کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ اب زیر نظر آیات میں مشرکین کے کچھ بہانوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ ایسی بہانہ تراشیاں کرتے تھے کہ جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کافروں کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ رسول اللہ کی حیات آفریں دعوت کے جواب میں ہٹ دھرمی، عناد، سرکشی اور غرور کا مظاہرہ کریں کیونکہ وہ پیغمبر اکرمؐ کی منطقی بات اور زندہ سند کے جواب میں نہایت نامعقول تقاضے کرتے تھے۔

مندرجہ بالا آیات میں ان کے چھ مختلف تقاضے بیان ہوتے ہیں:

۱۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: اور انہوں نے کہا کہ ہم اس وقت تک تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک تو اس زمین سے پانی کا چشمہ نہ جاری کر دکھائے (وقالوا لن نؤمن لک حتی تفجر لنا من الارض ینبوعا)۔

"فجور" اور "تفجیر" شگافتہ کرنے اور چیرنے کے معنی میں ہے، چاہے زمین کو چشمہ کے ذریعے شگافتہ کیا جائے یا نور سحر کے ذریعے افق کو۔ البتہ "تفجیر" "فجور" کی نسبت زیادہ

---

[1] تفسیر مجمع البیان زیر نظر آیات کے ذیل میں، در المنثور میں بھی ان آیات کے ذیل میں کچھ اختلاف کے ساتھ شان نزول بیان ہوئی ہے۔

مبالغے کو ظاہر کرتا ہے۔

"ینبوع" "نبع" کے مادہ سے ہے۔ یہ پانی کے جوش مارنے اور پھوٹنے کی جگہ کے معنی میں ہے بعض کہتے ہیں کہ "ینبوع" پانی کے اس چشمے کو کہتے ہیں کہ جو کبھی خشک نہ ہوتا ہو۔

۲۔ یا تمہارے پاس کھجور اور انگور کا باغ ہو کہ جس کے درختوں کے درمیان تو نہریں جاری کرے (او تکون لك جنة من نخیل و عنب فتفجر الانهار خلالها تفجیرًا)۔

۳۔ یا جیسا کہ تو کہتا ہے آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے سروں پر گرا دے (او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفًا)۔

۴۔ یا اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آ (او تأتی باللّٰه والملائکة قبیلًا)۔

"قبیل" کا معنی بعض اوقات کفیل اور ضامن کیا گیا ہے اور کبھی یہ اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے سامنے ہو۔ بعض نے اسے "قبیلة" کی جمع سمجھا ہے جس کا معنی ہے جماعت۔

پہلے معنی کے مطابق آیت کی تفسیر اس طرح ہوگی:

تو اللہ اور فرشتوں کو اپنی بات کی صداقت کے ضامن کے طور پر لے آ۔

دوسرے معنی کے مطابق تفسیر یوں ہوگی:

تو اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آ۔

تیسرے معنی کے مطابق آیت کا مفہوم یہ ہوگا:

گروہ گروہ کر کے ہمارے پاس لے آ۔

توجہ رہے کہ ان تینوں مفاہیم کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب مفاہیم آیت میں جمع ہوں کیونکہ ہمارے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایک لفظ ایک سے زیادہ معانی کے ساتھ استعمال ہو۔

۵۔ یا پھر تیرے پاس سونے کا گھر ہو، نقش و نگار سے مزین گھر (او یکون لك بیت من زخرف)۔

"زخرف" اصل میں زینت کے معنی میں ہے اور چونکہ سونا مشہور زینت بخش دھاتوں میں سے ہے لہٰذا اسے "زخرف" کہا جاتا ہے۔ نقش و نگار سے مزین گھروں کو بھی "زخرف" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح دلفریب اور پُرفریب باتوں کو بھی "مزخرف" کہتے ہیں۔

۶۔ یا پھر آسمان پر چڑھ کر دکھاؤ لیکن ہم تمہارے صرف آسمان پر چڑھنے سے ایمان نہیں لائیں گے بلکہ اپنے ساتھ واپسی پر کوئی خط بھی لے کر آؤ جسے ہم پڑھیں (او ترقیٰ فی السماء ولن نؤمن لرقیك حتّٰی تنزل علینا کتابًا نقرؤه)۔

ان آیات کے آخر میں ہے کہ خدا نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ ان ایک دوسرے کی ضد، مہمل اور

مضحکہ خیز تجاویز کے جواب میں کہو: میرا پروردگار ان اوہام سے پاک اور منزہ ہے (قل سبحان ربی) کیا میں خدا کے فرستادہ ایک انسان کے سوا کچھ اور ہوں! (ھل کنت الا بشرا رسولا)۔

چند اہم نکات

۱۔ **بہانہ تراشیوں کا جواب:** جیسا کہ شان نزول کے علاوہ خود مندرجہ بالا آیات کا لب و لہجہ گواہی دیتا ہے کہ مشرکین کے ان عجیب و غریب تقاضوں کی بنیاد حق جوئی نہ تھی بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ بت پرستی اور شرک کا مذہب باقی رہ جائے کیونکہ اس مذہب سے مکہ کے روٴسا کی قدرت و طاقت وابستہ تھی اور وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح رسول اللہ کو راہ توحید کا سفر جاری رکھنے سے روک سکیں۔

لیکن رسول اکرمؐ نے انہیں دو منطقی، واضح اور مختصر جوابات دیئے۔

پہلا یہ کہ میرا پروردگار ان امور سے منزہ ہے۔ وہ اس سے منزہ ہے کہ کبھی اِس کا حکم مانے اور کبھی اِس کا۔ وہ فضول، جھل اور بے بنیاد تقاضوں کے سامنے سر جھکانے سے منزہ ہے (سبحان ربی)۔

دوسرا یہ کہ اس سے قطع نظر اصولی طور پر معجزات بھیجنا اس کا کام ہے اور معجزات اسی کے ارادے اور فرمان کے تحت انجام پاتے ہیں، میں تو یہاں تک بھی حق نہیں رکھتا کہ ان کا خود تقاضا ہی کروں۔ وہ جس وقت ضروری سمجھے گا اپنے رسول کی دعوت کی صداقت کے لیے جو معجزہ ضروری ہوگا بھیج دے گا (ھل کنت الا بشرا رسولا)۔

یہ صحیح ہے کہ یہ دونوں جواب ایک دوسرے سے مربوط ہیں تاہم دو جواب شمار ہوتے ہیں۔ ایک یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ کام انسان کے بس کا نہیں اور دوسرا انسان کے خدا کا ان من پسند کے معجزات کی خواہش قبول کرنے سے منزہ ہونا ثابت کرتا ہے۔

اصولی طور پر رسول کوئی معجزہ گھڑنے والا انسان نہیں ہے کہ وہ کسی جگہ بیٹھ جاتے اور جو شخص بھی آتے اور اپنی پسند کا کوئی بھی معجزہ طلب کر لے اور یہ پسند نہ ہو تو کوئی دوسری تجویز پیش کر دے یعنی خلقت کے قوانین اور سنتیں کھیل تماشہ بن جائیں اور پھر بھی دل چاہے تو معجزہ طلب کرنے والے قبول کر لیں اور نہ چاہے تو انکار کر دیں۔

نبی کی ذمہ داری ہے کہ معجزے کے ذریعے خدا سے اپنا تعلق ثابت کرے اور جب درکار ضرورت کے مطابق معجزہ پیش کر دے تو پھر اس ضمن میں اس کی کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہتی۔ ممکن ہے وہ نزولِ معجزہ کا وقت بھی نہ بتا سکے۔ وہ خدا سے صرف اس موقع پر معجزے کا تقاضا کرتا ہے جب اسے معلوم ہو کہ خدا اس امر پر راضی ہے۔

۲۔ **کوتاہ فکری اور نامعقول تقاضے:** ہر شخص اپنی فکر کی حد تک بات کرتا ہے یہی وجہ

ہے کہ ہر شخص کی باتیں اس کی سطح فکر کی غماز ہوتی ہیں۔ وہ لوگ کہ جنہیں مال و مقام کے علاوہ کسی اور چیز کا خیال ہی نہیں وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ہر شخص اسی فکر میں غلطاں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قریش کے کوتاہ فکر سردار بعض اوقات رسول اکرمؐ کو مال کی پیش کش کرتے تھے اور کبھی مقام و منصب کی تاکہ آپؐ اپنی دعوت سے دستبردار ہو جائیں۔ وہ پیغمبر اکرمؐ کی عظیم روح کو اپنی فکر کے محدود پیمانے سے ماپتے تھے۔

یہاں تک کہ ان کا خیال تھا کہ اگر کسی شخص کی کوشش مال و مقام کے لیے نہیں تو وہ پاگل ہے اور اس کے علاوہ کوئی چوتھی چیز نہیں ہے۔

لہٰذا انہوں نے کہا کہ اگر نہ تُو مال چاہتا ہے اور نہ مقام تو پھر تیسری بات مان لے اور ہمیں اجازت دے کہ ہم تیرے لیے طبیب لے آئیں۔

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے کہ جو بہت چھوٹے سے کمرے میں قید ہو۔ اس نے کھلے وسیع آسمان، چمکتے سورج، پہاڑوں، دریاؤں اور صحراؤں کو نہ دیکھا ہو اور اسے عالم ہستی کی عظمت کا اندازہ نہ ہو۔

وہ رسول اللہؐ کی عظیم اور ناپیدا کنار روح کو اپنے پیمانوں سے ماپنا چاہتے تھے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر وہ رسول اللہؐ سے کون سی ایسی چیز کی خواہش کرتے تھے کہ جو اسلام میں نہ تھی۔ وہ سرسبز زمینوں، پانی سے لبریز چشموں، کھجور اور انگور کے باغوں اور مزین و خوشحال گھروں کی فرمائش کرتے تھے اور ہم جانتے ہیں کہ اپنی پیش رفت کے پروگرام میں اسلام ہر چیز سے مالا مال تمدن کا حامل تھا۔ ایسا تمدن کہ جس میں ہر قسم کی اقتصادی ترقی کا امکان تھا۔ اور ہم نے دیکھا کہ مسلمان اسی قرآن اور پروگرام کے سائے میں اس سے کہیں آگے بڑھ گئے کہ جس کی مشرکین عرب اپنی ناقص فکر سے تمنا کرتے تھے۔

اگر ان کی آنکھ حقیقت بیں ہوتی تو وہ اس دین میں روحانی کمال بھی دیکھتے، مادی ارتقاء بھی۔ کیونکہ ہر دو کے لیے سعادت کا ضامن ہے۔

ہم ان بچگانہ یا احمقانہ تقاضوں سے صرف نظر کرتے ہیں کہ ــ وہ کبھی کہتے کہ ہمارے لیے خدا کا عذاب لے آؤ اور آسمانی پتھر ہمارے سروں پر برساؤ۔ یا یہ کہ سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جاؤ اور تجھ پر قرآن، وہاں سے کوئی خط ہمارے لیے لے آؤ یا یہ کہ خدا اور فرشتوں کو ٹولیوں میں ہمارے سامنے لے آؤ۔

یہاں تک کہ یہ نہیں کہا کہ ہمیں ان کے پاس لے جا۔

یہ انسان عجیب جہالت، غرور اور تکبر کے مظاہرے کرتا ہے۔

۳۔ معجزے کے منکرین کی ایک اور دستاویز: زیر بحث آیات کا مفہوم کوئی پیچیدہ نہیں

ہے اور یہ واضح ہے کہ مشرکین مکہ رسول اللہ سے کیوں اور کس طرح کے تقاضے کرتے تھے اور یہ بھی واضح ہے کہ رسول اکرمؐ نے انہیں منفی جواب کیوں دیا مگر اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے بعض بہصر عذر تراش افراد کا اصرار ہے کہ یہ آیات پیغمبر اسلامؐ سے ہر قسم کے معجزے کی نفی کرتی ہیں۔ وہ ان آیات کو پیغمبر اکرمؐ سے معجزے کی نفی کرنے والی بہت واضح آیات[1] شمار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان آیات کے مطابق مخالفین نے آپؐ سے چھ قسم کے معجزوں کا مطالبہ کیا۔ ان میں زمین و آسمان سے کچھ فوائد کے حصول سے متعلق معجزوں کا تقاضا بھی ہے اور مرگ آفرین معجزات کا بھی۔ لیکن آپؐ نے ان میں سے کوئی تجویز بھی قبول نہ کی اور صرف یہی جواب دیا:

میرا خدا پاک ہے۔ میں تو خدا کے فرستادہ ایک بشر کے علاوہ کچھ نہیں ہوں۔

ہمارے زمانے کے یہ بہانہ ساز عہد پیغمبرؐ کے اپنے بہانہ ساز دوستوں کی طرح نہ ہوں تو انہیں ان کا جواب خود انہی آیات میں مل جائے گا۔ کیونکہ:

۱۔ ان چھ تقاضوں میں سے بعض اصولی طور پر مضحکہ خیز اور نامعقول تھے۔ مثلاً خدا اور فرشتوں کو حاضر کرنا یا آسمان پر سے ان کے نام پر خصوصی نامہ لے کر آنا۔

بعض دوسرے تقاضے بے سوچے سمجھے تھے، ایسے کہ اگر ان پر عمل کیا جاتا تو خود تقاضا کرنے والوں کا نام و نشان ہی باقی نہ رہتا، تو وہ ایمان کہاں لاتے۔ مثلاً ان پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسنا۔

ان کے باقی تقاضے تو دنیاوی عیش و عشرت اور مال و دولت سے متعلق تھے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ انبیاء ان کاموں کے لیے نہیں آتے۔

بالفرض اگر ان تقاضوں میں یہ اشکالات نہ بھی ہوتے تو وہ تو بہانہ سازی ہی کر رہے تھے جیسا کہ ان آیات میں موجود قرینوں سے ظاہر ہو رہا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ نبی کا فریضہ یہ نہیں ہے کہ وہ بہانہ تراش لوگوں کے تقاضوں کے سامنے سر جھکا دے بلکہ ان کی ذمہ داری معجزہ دکھانا ہے، صرف اس قدر کہ ان کی دعوت ثابت ہو جائے، اس سے زیادہ ان کے ذمہ نہیں ہے۔

۲۔ ان ہی آیات کی کچھ تعبیرات صراحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ یہ تقاضے کرنے والے کس قدر بہانہ ساز اور ہٹ دھرم تھے۔ جب انہوں نے رسول اللہ سے آسمان پر چڑھ کے دکھانے کا تقاضا کیا تو ساتھ ہی کھل کر کہا کہ اگر تم آسمان پر چڑھ بھی جاؤ تو بھی ہم ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ آسمان سے ہمارے نام کوئی خط لے کر نہ آؤ۔

اگر واقعاً انہیں معجزے کی طلب تھی تو کیوں کہتے تھے کہ تمہارا آسمان پر چڑھنا بھی ہمارے لیے کافی نہیں۔ ان کے غیر منطقی ہونے پر کیا اس سے زیادہ واضح کوئی قرینہ ہو سکتا ہے؟

۳۔ ان سب چیزوں سے قطع نظر ہم جانتے ہیں کہ معجزہ فعل خدا ہے نہ کہ فعل نبی جبکہ ان بہانہ تراشوں

کا لب و لہجہ واضح کر رہا ہے کہ وہ معجزے کو فعل پیغمبر سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام افعال کی نسبت پیغمبر کی طرف دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے

تم اسے چیر کر دکھاؤ۔

تم اس میں نہریں جاری کرو

تم آسمان کے پتھر ہمارے سروں پر برساو۔

تم خدا اور فرشتوں کو ہمارے پاس لے آؤ۔

حالانکہ نبی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ذہن میں یہ خیال نہ ہو اور وہ ان پر ثابت کرے کہ "میں نہ خدا ہوں اور نہ اس کا شریک، معجزہ صرف اسی کا کام ہے، میں تو دیگر انسانوں کی طرح بشر ہوں فرق یہ ہے کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے اور جس قدر معجزے کی ضرورت ہے وہ خدا مجھے عطا کر چکا ہے اس سے بڑھ کر میں کچھ نہیں کر سکتا"۔

خصوصاً "سبحان ربی" کا جملہ اسی معنی کا شاہد ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقام پروردگار ہر قسم کے شریک اور شبیہ سے پاک ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اگرچہ متعدد معجزات کی حضرت عیسیٰؑ کی طرف نسبت دی گئی ہے، مثلاً مُردوں کو زندہ کرنا، ناقابلِ علاج بیماروں کو شفا دینا یا مادر زاد اندھوں کو بینا کرنا وغیرہ لیکن اس کے باوجود تمام مواقع پر "باذنی" یا "باذن اللہ" آیا ہے جو واضح کرتا ہے کہ یہ کام صرف حکمِ خدا سے ہوئے ہیں اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ معجزات اگرچہ حضرت عیسیٰؑ کے دستِ مبارک پر ظاہر ہوتے لیکن یہ خود حضرت عیسیٰؑ کی طرف سے نہیں تھے بلکہ سارے کے سارے حکمِ خدا سے ظہور میں آتے تھے[1]

۴۔ کونسی عقل باور کرتی ہے کہ ایک انسان نبوت کا دعویٰ کرے، یہاں تک کہ اپنے آپ کو خاتم الانبیاء اور خاتم المرسلین سمجھے اور اپنی کتاب آسمانی میں گزشتہ انبیاء کے معجزات کا ذکر کرے لیکن خود کسی قسم کا معجزہ پیش کرنے سے قاصر ہو؟ کیا لوگ اس سے کہیں گے نہیں کہ تم کس قسم کے نبی ہو کہ کوئی ایسا معجزہ پیش نہیں کر سکتے کہ جو دوسروں کو قائل کر سکے جبکہ تمہیں تو دعویٰ ہے کہ تم سب گزشتہ انبیاء سے برتر ہو اور ان کے سردار ہو اور حالت یہ ہے کہ ان کا شاگرد ہونے کا ثبوت بھی پیش نہیں کر سکتے ہو۔

ان کا یہ نہ کہنا خود اس امر کی دلیل ہے کہ آپؐ ضروری مواقع پر معجزات پیش کرتے تھے لہٰذا واضح ہو جاتا ہے کہ اگر رسول اللہؐ نے ان آیات میں بیان کیے گئے ان کے تقاضوں کو نہیں مانا تو یقیناً یا یہ تقاضے بے بنیاد ہیں یا پھر عذر تراشی پر مبنی ہیں ورنہ آپؐ منطقی اور معقول بات تو تسلیم کرتے تھے۔

---

[1] مائدہ - ۱۱۰ اور آل عمران ۴۹ کی طرف رجوع کریں۔

(۹۴) وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ○

(۹۵) قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ○

ترجمہ

(۹۴) ہدایت آنے کے بعد وہ تنہا چیز جس نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا یہ تھی کہ (نادانی اور جہالت کی بناء پر) انہوں نے کہا کہ کیا اللہ نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیج دیا ہے۔

(۹۵) کہہ دو اگر روئے زمین پر فرشتے (بھی زندگی بسر کر رہے ہوتے) اور اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم آسمان سے فرشتے کو رسول بنا کر ان کے پاس بھیجتے (کیونکہ ہر نوع کا رہبر انہی کی نوع سے ہونا چاہیئے)۔

تفسیر

پھر وہی بہانے

گزشتہ آیات میں توحید کے بارے میں مشرکین کی بہانہ تراشیوں کے حوالے سے گفتگو کی گئی تھی۔ زیر بحث آیات میں بھی ان سے ملتے جلتے ایک بہانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہدایت آجانے کے بعد وہ تنہا چیز جو لوگوں کے ایمان لانے میں حائل ہوتی یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ خدا نے انسان کو نبی بنا کر کیوں بھیجا ہے (وما منع الناس ان یؤمنوا اذ جاءھم الھدٰی الا ان قالوا ابعث اللہ بشرًا رّسولًا)۔

وہ کہتے کہ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ بلند مقام اور بہت اہم منصب کسی انسان کے سپرد

کیا جائے۔ یہ عظیم رسالت کسی افضل مخلوق مثلاً فرشتوں کے سپرد کیوں نہ ہو تاکہ وہ اس سے اچھی طرح سے عہدہ برآ ہوں۔ خاکی انسان کہاں اور رسالتِ الٰہی کہاں۔ اس مقام کے اہل افلاک کے باسی ہیں نہ کہ خاکی انسان۔

یہ کمزور سی منطق کسی ایک یا دو گروہوں نے ہی پیش نہیں کی بلکہ پوری تاریخ میں اکثر بے ایمان افراد نے انبیاء کے سامنے یہی بات کی۔

قوم نوح، اس عظیم پیغمبر کی مخالفت میں کہتی تھی:

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ

یہ تو تمہاری طرح کا ایک انسان ہے۔ (مومنون۔ ۲۴)

حضرت ہود علیہ السلام کی بے ایمان قوم کہتی تھی:

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ٥

یہ تو تمہاری طرح کا ایک انسان ہے جو کچھ تم کھاتے ہو یہ بھی کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو یہ بھی پیتا ہے۔ (مومنون۔ ۳۳)

یہاں تک کہ وہ یہ بھی کہہ گزرتے:

وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ٥

اگر تم نے اپنے جیسے بشر کی اطاعت کی تو نقصان اٹھاؤ گے۔ (مومنون۔ ۳۴)

بعینہٖ یہی اعتراض پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی کیا جاتا تھا۔ مخالفین کہتے تھے:

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۚ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ٥

یہ رسول کھاتا پیتا کیوں ہے اور بازاروں میں کیوں چلتا پھرتا ہے۔ کم از کم اس کے ساتھ ایک فرشتہ کیوں نازل نہیں ہوا کہ جو اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا۔ (فرقان۔ ۷)

قرآن ایک نہایت مختصر سا معنی خیز اور واضح جواب دیتا ہے: کہہ دو! اگر روئے زمین پر فرشتے ہوتے کہ جو آرام و سکون سے رہ رہے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے فرشتے کو پیغمبر کے طور پر نازل کرتے (قل لوکان فی الارض ملائکۃ یمشون مطمئنین لنزلنا علیھم من السماء ملکا رسولا)۔

یعنی رہبر ہمیشہ اس نوع میں سے ہونا چاہیئے جس میں اس کے پیروکار ہوں۔ انسان انسانوں کے لیے اور فرشتہ فرشتوں کے لیے۔ رہبر اور پیروکاروں کے ایک جیسے ہونے کی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ کسی رہبر کی تبلیغ کا اہم ترین حصہ اس کی عملی تبلیغ ہے۔ اسی کو نمونہ اور اسوہ ہونا چاہیئے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ وہی احساسات و جذبات اور طبیعت و فطرت رکھتا ہو اور اس کی جسمانی و روحانی ساخت

بھی وہی ہو۔ ایک فرشتہ کہ جو شہوت جنسی سے پاک ہوتا ہے۔ جسے مکان کی ضرورت ہے نہ لباس کی اور جو غذا کی احتیاج بھی نہیں رکھتا اور جس میں انسانی مزاج اور عوارض کی باقی چیزیں بھی موجود نہیں وہ انسانوں کے لیے نمونہ اور اسوہ کیسے بن سکتا ہے بلکہ وہ رہبر ہو تو لوگ کہیں کہ اسے ہمارے دل کی کیا خبر؟ اسے کیا معلوم کہ ہماری روح پر شہوت اور غضب کس طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ تو صرف اپنے دل کی بات کرتا ہے۔ اس کے احساسات وجذبات ہماری طرح کے ہوتے تو وہ ہم جیسا ہی ہوتا یا ہم سے بھی برتر۔ لہٰذا اس کی باتوں کی کیا اہمیت ہے۔

لیکن جب حضرت علیؑ جیسا ہادی کہے:

انما ھی نفسی اروضھا بالتقوی لتاتی اٰمنة یوم الخوف الاکبر[1]

میرا نفس بھی تمہاری طرح کا ہے لیکن میں نے اسے تقویٰ کی لگام دی ہے تاکہ روز قیامت امن میں رہے۔

دوسری طرف رہبر ایسا ہونا چاہیئے کہ جو اپنے پیروکاروں کی مشکلات، احتیاجات اور خواہشات کو اچھی طرح سے سمجھ سکے تاکہ ان کے حل اور انہیں پورا کرنے کے لیے آمادہ رہے۔ اور اس مصرعے کا مصداق نہ بنے:

آگہ نئی از حال من مشکل ہمین است

مشکل یہ ہے کہ تجھے میری حالت کی خبر ہی نہیں۔

خاص طور پر یہی وجہ ہے کہ انبیاء عام انسانوں میں سے تھے اور انہوں نے عموماً نہایت مشکل اور کٹھن زندگی گزاری ہوتی تھی۔ یہ اس لیے تھا تاکہ وہ زندگی کی تمام تلخیوں کو چکھیں اور دردناک حقیقتوں کو چھوئیں اور ان کے حل کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں۔

چند اہم نکات

۱۔ "وما منع الناس" کا مفہوم: یہ جملہ کہتا ہے کہ ان کے ایمان کے لیے واحد رکاوٹ ان کی یہی بہانہ جوئی تھی البتہ یہ تعبیر انحصار کی دلیل نہیں ہے بلکہ مسئلے کی اہمیت کے اظہار کے لیے اور تاکید کے طور پر ہے۔

۲۔ "ملائکة یمشون مطمئنین" کا مفہوم: اس کے بارے میں مفسرین نے بحث کی ہے اور انہوں نے اس کی متعدد تفسیریں بیان کی ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ، نامہ ۴۵۔

بعض نے اسے زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی گفتگو کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم اس جزیرہ میں رہتے تھے اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ محمد (ص) آیا اس نے ہمارا امن و سکون تباہ کر دیا۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر فرشتے بھی اس طرح کے امن و سکون سے زمین میں رہ رہے ہوتے تو ہم انہی کی نوع میں سے ان کے لیے پیغمبر بھیجتے۔

بعض دیگر نے کہا ہے کہ اس سے مراد دنیا اور اس کی لذات پر مطمئن ہونا ہر دین و مذہب سے لاتعلق ہونا ہے۔

بعض نے اس سے زمین میں "سکونت و توطن" مراد لیا ہے۔

البتہ یہ احتمال قوی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر فرشتے بھی زمین میں بس رہے ہوتے اور زندگی تصادم، دشمنی اور کشمکش سے پاک ہوتی پھر بھی ان کی اپنی نوع سے ایک رہبر کی ضرورت ہوتی کیونکہ انبیاء کو فقط بے سکونی اور بے اطمینانی ختم کرنے کے لیے اور آرام و سکون پیدا کرنے کے لیے نہیں بھیجا جاتا بلکہ یہ سب کچھ تو تکامل و ارتقاء کا مقدمہ ہے اور مختلف پہلوؤں سے روحانی و انسانی تربیت کی تمہید ہے اصل اس کام کے لیے خدائی رہبر کی ضرورت ہے۔

۴۔ **لفظ "ارض" سے ایک استفادہ:** زیر نظر آیت میں جو لفظ "ارض" آیا ہے اس سے استفادہ کرتے ہوئے علامہ طباطبائی تفسیر المیزان میں لکھتے ہیں:

> روئے زمین پر مادی زندگی کا مزاج وجود پیغمبر کا محتاج ہے اور اس کے بغیر زندگی ہرگز پنپ نہیں سکتی۔

علاوہ ازیں علامہ طباطبائی اس لفظ کو زمین کی کشش ثقل کی طرف ایک لطیف اشارہ سمجھتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر امن سکون و اطمینان سے چلا پھرا نہیں جا سکتا۔

(۹۶) قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۚ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ○

(۹۷) وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۚ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۚ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ○

ترجمہ

(۹۶) کہہ دو: یہی کافی ہے کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں کے بارے میں آگاہ اور بینا ہے۔

(۹۷) جسے خدا ہدایت دے وہی حقیقی ہدایت یافتہ ہے اور جس شخص کو (اس کے اعمال کے باعث) وہ گمراہی میں ڈال دے، ایسے لوگوں کے لیے تو اللہ کے سوا کسی کو ہادی و سرپرست نہیں پائے گا اور روزِ قیامت ان لوگوں کو ہم اوندھے منہ محشور کریں گے اس حال میں کہ وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور جس وقت اس کی آگ بجھنے لگے گی ہم اسے اور بھڑکا دیں گے۔

تفسیر

حقیقی ہدایت یافتہ

قبل ازیں آیات توحید و نبوّت اور مخالفین سے گفتگو کے بارے میں تھیں۔ زیر بحث آیات میں

ان گزشتہ مباحث کا ایک طرح سے اختتام ہو رہا ہے اور نتیجۂ بحث پیش کیا جا رہا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: اگر وہ توحید و نبوت اور معاد و قیامت کے بارے میں تیرے واضح دلائل قبول نہیں کرتے تو انہیں بتادو اور "کہو کہ یہی کافی ہے کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں کے حالات سے آگاہ ہے اور ان کے کام کو دیکھتا ہے (قل کفٰی باللّٰہ شھیدًا بینی و بینکم انہ کان بعبادہ خبیرًا بصیرًا)۔[1]

یہ بات کہتے ہوئے دراصل دو مقصد پیشِ نظر تھے۔ پہلا یہ کہ متعصب اور ہٹ دھرم مخالفین کو تہدید کی جائے کہ خدا آگاہ و بینا ہے اور ہمارے تمہارے اعمال پر گواہ ہے۔ یہ خیال نہ کرو کہ تم اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نکل جاؤ گے یا تمہارے اعمال میں سے کوئی چیز اس پر مخفی رہ جائے گی۔

دوسرا یہ کہ یہ بات کہہ کر رسول اللہ خدا کے بارے میں اپنے ایمانِ قاطع کا اظہار کر دیں کیونکہ کہنے والے کی اپنی بات میں قاطعیت سننے والے پر گہرا نفسیاتی اثر مرتب کرتی ہے۔ ہو سکتا تھا کہ یہ محکم اور قاطع تعبیر کہ جس میں ایک قسم کی تہدید چھپی ہوئی ہے ان پر اثر انداز ہوتی، ان کے دل اور فکر کو بیدار کرتی اور انہیں راہِ مستقیم کی طرف دعوت دیتی۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: وہی شخص ہدایت پاتا ہے کہ جس کے دل میں اللہ نورِ ہدایت ڈال دے (ومن یھد اللّٰہ فھو المھتد) لیکن جنہیں وہ (ان کے اعمال کے باعث) گمراہ کر دے تو ان کے لیے تو خدا کے علاوہ کوئی سرپرست و راہنما نہیں پائے گا (ومن یضلل فلن تجد لھم اولیاء من دونہ)۔

لوٹ آنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ وہ خدا کی طرف رجوع کریں اور اس سے نورِ ہدایت طلب کریں۔

یہ دو جملے درحقیقت اس طرف اشارہ ہیں کہ قوی اور زبردست دلائل ہی ایمان لانے کے لیے کافی نہیں ہیں بلکہ جب تک کسی میں توفیقِ الٰہی شاملِ حال نہ ہو اور ہدایت کے لیے اہلیت پیدا نہ ہو، محال ہے کہ وہ ایمان لائے۔

اس کی مثال یوں ہے کہ ہم چند لوگوں کو ایک اہم کارِ خیر انجام دینے کی دعوت دیتے ہیں اور اس کی اہمیت کے لیے بہت دلائل دیتے ہیں لیکن ان میں سے بعض قبول کر لیتے ہیں اور بعض مخالفت کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ سب لوگ اس کام کی اہلیت نہیں رکھتے۔

---

[1] ترکیب کے لحاظ سے "کفٰی باللّٰہ" میں "با" زائدہ ہے اور "اللّٰہ" "کفٰی" کا فاعل ہے اور "شھیدًا" تمیز ہے جبکہ بعض کے بقول حال ہے۔

نطفۂ پاک بباید کہ شود قابلِ فیض ورنہ ہر سنگ و گلی لؤلؤ و مرجان نشود

پاک مٹی ہی فیض دے سکتی ہے ورنہ ہر پتھر اور مٹی موتی اور مونگے نہیں ہوتے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر دل نورِ حق کی لیاقت نہیں رکھتا اور ہر دل میں اس کا عشق پیدا نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں تحریک کرنے والے کے اندازِ بیان کا اثر سننے والے پر ہوتا ہے اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سننے والا اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لیے ہٹ دھرمی چھوڑ کر حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیتا ہے۔

یہ بات بھی ہم نے بارہا کہی ہے کہ خدا کی طرف سے کبھی بھی جبری ہدایت یا گمراہی نہیں ہوتی بلکہ یہ خود انسان کے اعمال کا براہِ راست اثر ہوتی ہے۔

وہ لوگ کہ جو اس کی راہ میں جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور حصولِ حق کے لیے ہر قسم کی قربانی پیش کریں یقیناً اس بات کے لائق ہیں کہ ہدایت ان کے شاملِ حال ہو۔ لہٰذا قرآن فرماتا ہے،

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

جو لوگ ہماری خاطر جہاد کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ (عنکبوت۔ ۶۹)

لیکن وہ لوگ کہ جو عناد، ہٹ دھرمی، گناہ، ظلم اور فساد کی راہ اپنائے ہوتے ہیں انہوں نے اپنی اہلیت کو خود ذبح کر دیا ہے اور وہ سلبِ توفیق اور گمراہی کے مستحق ہوتے ہیں۔ مسلّم ہے کہ ایسے افراد کو وہ گمراہی میں سرگرداں کرے گا۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ

اللہ ظالموں کو گمراہ کرتا ہے۔ (ابراہیم۔ ۲۷)

یہ بھی ارشاد ہے:

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ

وہ تو صرف فاسقوں کو بھٹکاتا ہے۔ (بقرہ۔ ۲۶)

یہ بھی فرمایا گیا ہے:

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ

جو حد سے گزر جانے والا شاکی ہو خدا اسے یونہی گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔ (مومن۔ ۳۴)

رہا یہ مسئلہ کہ "اولیاء" جمع کی صورت میں کیوں ذکر ہوا ہے تو ہو سکتا ہے یہ فرضی خداؤں کے تعدد کی طرف اشارہ ہو یا ان وسائل و اسباب کے تنوع کی طرف کہ جن کی وہ پناہ لیتے تھے۔ یعنی ان وسائل و اسباب سے انسانوں اور غیر انسانوں میں سے اور خیالی و فرضی خداؤں میں سے کوئی ان کی فریاد کو نہیں پہنچ سکتا۔ ان میں سے کوئی انہیں گمراہی اور بدبختی سے نجات نہیں دے سکتا۔

اس کے بعد ایک قاطع اور شدید تہدید کے انداز میں قیامت کے ایک منظر کی نشاندہی کی گئی ہے

وہ منظر کہ جو ان کے اعمال کا قطعی نتیجہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: روزِ قیامت ہم انہیں اوندھے منہ محشور کریں گے (ونحشرھم یوم القیامة علیٰ وجوھھم)۔ اس روز وہ سیدھے نہیں چل رہے ہوں گے بلکہ عذاب کے فرشتے انہیں اوندھے منہ زمین پر کھینچیں گے۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ان گنہگاروں میں چونکہ وہاں چلنے کی طاقت نہیں ہوگی لہٰذا بے دست و پا جانوروں کی مانند اوندھے منہ گھسٹتے ہوئے جائیں گے اور انتہائی دردناک اور ذلت آمیز حالت میں آگے بڑھیں گے۔

جی ہاں! وہ پاؤں سے چلنے کی سی عظیم نعمتوں سے محروم ہوں گے کیونکہ اس دنیا میں انہوں نے ان چیزوں سے راہ سعادت کے لیے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ راہِ گناہ میں انہیں استعمال کیا۔ نیز اللہ کی عظیم عدالت میں اس حالت میں پیش ہوں گے کہ وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے (عمیا وبکما وصما)۔

اس مقام پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مجرمین اور اہل جہنم دیکھیں گے، سنیں گے اور باتیں کریں گے[1] تو پھر زیر نظر آیت کیونکر کہتی ہے کہ وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے۔ اس سوال کے جواب میں مفسرین نے متعدد تفاسیر کی ہیں۔ ان میں سے ذیل کی دو تفاسیر بہتر ہیں:

۱۔ قیامت کے مختلف مراحل ہیں۔ ان میں سے بعض مراحل میں وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے اور یہ بجائے خود ان کے لیے ایک قسم کی سزا اور عذاب ہے (کیونکہ انہوں نے دنیا میں اللہ کی ان عظیم نعمتوں سے صحیح استفادہ نہیں کیا)۔ لیکن بعض دیگر مراحل میں ان کی آنکھ دیکھتی ہوگی،

---

[1] سورہ کہف کی آیہ ۵۳ میں ہے:

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ

مجرمین آتشِ جہنم کو دیکھیں گے۔

سورہ فرقان کی آیہ ۱۳ میں ہے:

دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا

دوزخی ہلاکت کے مارے چیخیں گے۔

نیز سورہ فرقان ہی کی آیہ ۱۲ میں ہے:

سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا

مجرمین اس آگ کی آواز سنیں گے کہ جو بہت وحشت ناک ہوگی۔

ان کے کان سنتے ہوں گے اور زبان باتیں کرتی ہوگی تاکہ وہ عذاب کے مناظر دیکھیں، ملامت کرنے والوں کی آواز سُنیں ۔اور پھر اپنی بے بسی پر واویلا کریں اور یہ بھی بجائے خود ایک عذاب و سزا ہے۔

۲۔ مجرمین ایسی چیز نہ دیکھ سکیں گے جس سے انہیں سرور و راحت ملے، ایسی آواز نہیں سن سکیں گے کہ جو ان کے لیے باعث نشاط و سکون ہو اور ایسی بات نہیں کر سکیں گے کہ جو باعثِ نجات ہو۔ اس کے برعکس وہ ایسی چیز دیکھیں گے جو اُن کے لیے باعث رنج ہو۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ان کا دائمی ٹھکانا جہنم ہے (ماْوٰیھم جھنم)۔ لیکن یہ گمان نہ کرنا کہ آتشِ جہنم دنیا کی آگ کی طرح آخرکار بجھ جائے گی۔ نہیں بلکہ، جب اس کی تپش کم ہوگی تو پھر سے اسے بھڑکا دیا جائے گا اور اس کی تپش میں اضافہ کر دیا جائے گا (کلما خبت زدنا ھم سعیرًا)۔

۹۸ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝

۹۹ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ۝

۱۰۰ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۝

ترجمہ

۹۸ یہ ان کی سزا ہے کیونکہ وہ ہماری آیات کے منکر ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں اور پراگندہ خاک ہو جائیں گے کیا اس وقت ہماری تخلیقِ نو ہوگی؟

۹۹ کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ ان جیسے اور بھی پیدا کرنے پر قادر ہے (اور انہیں حیاتِ نو عطا کر سکتا ہے) اور اس نے ان کے لیے قطعی مدت مقرر کی ہے لیکن اہلِ ستم سوائے کفر و انکار کے کچھ نہیں کرتے۔

۱۰۰ ان سے کہہ دو: اگر تمہارے پاس میرے رب کی رحمت کے خزانے بھی ہوتے تو بھی تنگ دلی کی وجہ سے تم انہیں روکے رکھتے اس خوف سے

کہ کہیں خرچ کرنے سے تم تنگ دست نہ ہو جاؤ اور انسان ہے ہی بہت تنگ دل۔

تفسیر

معاد کیونکر ممکن ہے؟

گزشتہ آیات میں بتایا گیا ہے کہ دوسرے جہان میں کیسا بُرا انجام مجرموں کے انتظار میں ہے، ایسا انجام کہ جو ہر عقلمند انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ زیر نظر آیات میں اس کی علت کو ایک اور حوالے سے واضح کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: یہ ان کی سزا ہے، کیونکہ انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا کہ جس وقت ہم بوسیدہ ہڈیوں میں بدل چکے ہوں گے اور ہمارا جسم پراگندہ مٹی کی صورت اختیار کر چکا ہوگا کیا اس وقت ہماری خلقت نو ہوگی (ذلک جزاؤھم بانھم کفروا بأیاتنا وقالوا ءاذا کنا عظاما ورفاتا ءانا لمبعوثون خلقا جدیدا)۔

جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے: "رفات" گھاس کے تنکوں کو کہتے ہیں جو ٹوٹتے نہیں اور بکھر جاتے ہیں۔

بنا کے واضح ہے کہ تو زمین پہلے انسان بوسیدہ ہڈیوں میں تبدیل ہوتا ہے اور پھر خاک میں بدل جاتا ہے اور خاک کے یہ ذرے بھی بکھر جاتے ہیں۔

جو لوگ معادِ جسمانی کے مسئلہ پر تعجب کرتے ہیں یا اسے ناممکن سمجھتے ہیں قرآن حکیم نے فوراً ہی انہیں جواب دیا ہے، کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ ان کی نظیر بھی پیدا کر سکتا ہے (اولم یروا ان اللہ الذی خلق السموات والارض قادر علی ان یخلق مثلھم)۔

لیکن انہیں جلدی نہیں کرنا چاہیئے، قیامت اگرچہ دیر سے آئے مگر آ کے رہے گی۔ خدا نے ان کے لیے ایک قطعی مدت مقرر کی ہے اور جب تک وہ وقت معین نہ آ جائے قیامت برپا نہیں ہوگی (وجعل لھم اجلا لا ریب فیہ)۔ لیکن اہل ستم یہ باتیں سننے کے باوجود اپنی ہٹ دھرمی پر باقی رہتے ہیں اور کفر و انکار کے سوا کوئی راستہ اختیار نہیں کرتے (فابی الظالمون الا کفورا)۔

انہیں اصرار تھا کہ رسول کو نوعِ بشر میں سے نہیں ہونا چاہیئے لہٰذا یہ باور کرنے میں انہیں کچھ حسد اور کم ظرفی مانع تھی کہ ہو سکتا ہے خدا یہ نعمت کسی انسان کو عطا کرے، لہٰذا زیرِ بحث آخری آیت

میں فرمایا گیا ہے: ان سے کہہ دو: اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے بھی تمہارے ہاتھ میں ہوتے تو بھی اپنی تنگ دلی کی وجہ سے تم انہیں روکے رکھتے کہ انہیں خرچ کرنے میں تم تنگ دست نہ ہو جاؤ (قل لو انتم تملکون خزائن رحمة ربی اذًا لامسکتم خشیة الانفاق)، اور انسان طبعاً بخیل ہے (وکان الانسان قتورًا)۔

"قتور" کا مادہ "قتر" (بروزن "قتل") ہے۔ یہ خرچ کرنے میں بخل سے کام لینے کے معنی میں ہے اور "قتور" چونکہ مبالغہ کا صیغہ ہے لہٰذا سخت تنگ دلی کا معنی دیتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **معادِ جسمانی:** زیر نظر آیات معادِ جسمانی کے اثبات کے لیے نہایت واضح آیات میں سے ہیں کیونکہ مشرکین اس بات پر تعجب کرتے تھے کہ کیسے ممکن ہے کہ خدا بوسیدہ اور خاک شدہ ہڈیوں کو پھر حیاتِ نو سے آراستہ کرے۔ قرآن جواب بھی اسی حوالے سے دیتا ہے اور کہتا ہے:

وہ خدا کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے یہ قدرت رکھتا ہے کہ انسان کے منتشر اجزاء کو جمع کرکے اسے حیاتِ نو عطا فرما دے۔

معلوم نہیں کہ ان واضح آیات کے باوجود اور ان جیسی اور بہت سی آیات کے ہوتے ہوئے اسلام کے بعض دعویدار معاد کو معادِ روحانی میں کیوں منحصر سمجھتے ہیں۔

ضمناً مسئلۂ معاد کے اثبات کے لیے اللہ کی ہمہ گیر قدرت کے حوالے سے قرآن نے بارہا استدلال کیا ہے۔ سورۂ یٰسین کے آخر میں معادِ جسمانی کے لیے جو چند دلیلیں پیش کی گئی ہیں ان میں سے بھی ایک یہی اللہ کی ہمہ گیر قدرت ہے[1]

۲۔ **"آیات" سے مراد:** اس سلسلے میں کہ "کفروا بایاتنا" میں "آیات" سے مراد آیاتِ توحید ہیں یا دلائلِ نبوت یا معاد سے مربوط آیات؟ اس بارے میں مختلف احتمالات ذکر کیے گئے ہیں لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ جملہ معاد کی بحث میں آیا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ معاد کی آیات کی طرف اشارہ ہے اور درحقیقت منکرینِ معاد کو جواب دینے کے لیے تمہید کے طور پر آیا ہے۔

۳۔ **"مثلھم" کا مفہوم:** قاعدتاً کہنا چاہیئے کہ اللہ اپنی قدرت کے ذریعے ان انسانوں کو روزِ قیامت پھر سے زندگی عطا کر سکتا ہے جبکہ زیر بحث آیات میں ہے کہ وہ ان کی "مثل" خلق کرے گا۔ اس تعبیر سے بعض لوگوں کو اشتباہ ہوتا ہے یا کم از کم ان کے ذہن میں سوال ابھرتا ہے کہ کیا قیامت والے

---

[1] مزید تشریح کے لیے اس سلسلے کی کتاب "معاد و جہان پس از مرگ" کا مطالعہ کیجئے۔

انسان ہی نہیں ہوں گے؟

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "مثل" سے یہاں "عین" مراد ہے کیونکہ بعض اوقات ہم کہتے ہیں:

تیری مثل (تجھ جیسے) کو یہ کام نہیں کرنا چاہیئے۔

حالانکہ ہماری مراد یہ ہے کہ "تجھے یہ کام نہیں کرنا چاہیئے"۔

لیکن یہ تفسیر بہت ہی بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ ایسے جملے ہم اور مواقع پر استعمال کرتے ہیں کہ جو ہمارے زیر بحث موقع سے مناسبت نہیں رکھتے۔

ظاہری مفہوم کے اعتبار سے زیر بحث آیت میں "مثل" سے مراد وہی اعادہ اور تجدید حیات ہے کیونکہ دوسری خلقت مسلماً پہلی خلقت کا "عین" نہیں ہے کیونکہ اور نہیں تو کم از کم دوسرے زمانے اور دوسرے حالات میں وجود میں آئی ہے اگرچہ مادہ وہی پرانا پہلے والا ہے۔ جیسے ہم کسی ریزہ ریزہ ہوجانے والی اینٹ کو نئے سرے سے نئے قالب میں ڈھالیں، کہ جو پہلے قالب کی طرح ہو تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ بعینہٖ وہی اینٹ ہے اگرچہ اس کی غیر بھی نہیں ہے بلکہ اس کی "مثل" ہے۔

یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ قرآن کی تعبیرات کس قدر گہری اور دقیق ہیں۔ (غور کیجئے گا)

البتہ تسلیم شدہ ہے کہ انسان کی شخصیت اس کی روح کے ساتھ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہی پہلی روح روز قیامت قبروں سے اٹھنے کے وقت پلٹ آئے گی لیکن معاد جسمانی کا تقاضا ہے کہ روح اسی پہلے قالب میں ہوگی یعنی وہی بکھرے ہوئے اجزائے مادہ جمع ہوکر وجود پائیں گے اور روح اس کے ساتھ ہم آہنگ ہوگی۔ معاد کی بحث میں ہم نے یہ بات ثابت کی ہے کہ اصولی طور پر انسانی روح کسی ایک شکل میں متشکل ہونے کے بعد کسی اور بدن کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوسکتی سوائے اپنے اصلی بدن کے کہ جس کے ساتھ اس نے پرورش پائی ہے۔ قبا صرف اسی بدن پر فٹ آتی ہے اور اسی کے لیے موزوں ہے اور یہ بدن اسی قبا کے لیے موزوں ہے۔ جسم اور روح کے اکٹھا اٹھنے کے ضروری ہونے کا یہی راز ہے (اسی سے معاد جسمانی وروحانی ثابت ہوتی ہے)۔

۴۔ اجل کیا ہے؟: ہم جانتے ہیں کہ "اجل" کسی چیز کی عمر کی حد کو کہتے ہیں لیکن کیا زیر بحث آیات میں "اجل" انسان کی عمر کے خاتمے کی طرف اشارہ ہے یا دنیا کی عمر کے خاتمے اور قیامت کی ابتداء کی طرف اشارہ ہے؟

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گفتگو معاد کے بارے میں ہے دوسری بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

بعض بزرگ مفسرین نے کہا ہے کہ یہ بات "لاریب فیہ" سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ معاد کے منکرین مسلماً معاد کے بارے میں شک رکھتے ہیں۔ لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ ایسی تعبیرات

کا مفہوم یہ ہے کہ اس قسم کے مسئلہ میں شک نہیں کرنا چاہیئے اور اصولی طور پر اس میں جائے تردّد نہیں ہے ۔ نہ یہ کہ اس میں کسی کو شک نہیں ہے ۔

لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ خدا کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے یقیناً انسانوں کو دوبارہ لباس حیات عطا کر سکتا ہے البتہ اگر یہ کام جلدی نہ ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سنت الٰہی نے اس کیلئے ایک قطعی وقت مقرر کیا ہے کہ جس میں جائے تردّد نہیں ہے ۔ نتیجہ گفتگو یہ ہے کہ یہاں منکرین معاد کے سامنے وہی قدرت الٰہی کے حوالے سے دلیل پیش کی گئی ہے ۔

باقی رہا ۔ جعل لھم اجلاً لا ریب فیہ ۔ کا جملہ تو یہ ایک سوال کا جواب ہے کہ جو تاخیر قیامت کے بارے میں کیا جاتا تھا (غور کیجئے گا) ۔

۵ ۔ زیر نظر آیات کا باہمی ربط : زیر نظر آیات کے مطالعے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخری زیر بحث آیت میں انسان کے بخیل ہونے کا ذکر آیا ہے ۔ اس بات کا گزشتہ مباحث سے کیا تعلق ہے ؟

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ جملہ ایک مطلب کی طرف اشارہ ہے جو قبل کی چند آیات میں بت پرستوں کے حوالے سے ذکر کیا گیا تھا اور وہ یہ کہ ان کا تقاضا تھا کہ رسول اسلام سرزمین مکہ کو چشموں اور باغات سے مالا مال کر دیں ۔ قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے کہ اگر تمہیں تمام خدائی خزانے بھی دے دیئے جائیں پھر بھی تم بخل کو ترک نہیں کرو گے ۔

لیکن یہ تفسیر بہت بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہ ان باغوں اور چشموں کی ملکیت کے بارے میں بات نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ معجزے کا تقاضا کر رہے تھے ۔

مفسرین نے اس ارتباط کے بارے میں ایک تفسیر اور بھی کی ہے اور وہ صحیح بھی معلوم ہوتی ہے اور وہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے ۔ یعنی بخل اور تنگ دلی کی بناء پر انہیں اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ کسی انسان کو نبوت عطا کی گئی ہے ۔ یہ آیت درحقیقت انہیں جواب دیتی ہے کہ تمہاری تنگ دلی تو ایسی ہے کہ اگر تم سارے جہان کے بھی مالک بن جاؤ تو بھی اپنی بُری روش کو ترک نہیں کرو گے ۔

۶ ۔ کیا سب انسان بخیل ہیں : ہم نے بارہا دیکھا کہ قرآن کی بہت سی آیات میں مطلق طور پر انسان کی مختلف حوالے سے ملامت کی گئی ہے ۔ اس کے لیے بخل ، جہل ، ظلم ، عجلت اور ان جیسی کئی صفات بیان کی گئی ہیں لیکن یہ تعبیر اس بات کے منافی نہیں کہ مومنین اور تربیت یافتہ افراد ان صفات کی بالکل مخالف جہت میں ہیں ۔ یہ تعبیرات اس طرف اشارہ ہیں کہ انسان کی طبیعت ایسی ہوتی ہے ۔ اگر انسان ہادیان الٰہی سے تربیت حاصل نہ کرے اور گھاس پھونس کی طرح اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو انسان

یہ تمام منفی صفات قبول کر سکتا ہے نہ یہ کہ وہ ذاتاً اس طرح پیدا کیا گیا ہے اور نہ یہ کہ سب کا انجام یہی ہوگا۔[1]

۷۔ "خشیۃ الانفاق" کا مفہوم: یہ تعبیر فقر سے خوف کے معنی میں ہے، وہ فقر کہ جو ان کے خیال میں کثرتِ انفاق کا نتیجہ ہوگا۔

(۱۰۱) وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِذْ جَاۗءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ○

(۱۰۲) قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَاۗىِٕرَ ۚ وَاِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ○

(۱۰۳) فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ○

(۱۰۴) وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ○

ترجمہ

(۱۰۱) ہم نے موسٰی کو نو واضح معجزات عطا کیے۔ اب تم بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ جس وقت یہ (نو معجزات) ان کی مدد کے لیے آئے (تو ان کی کیا حالت تھی) اور فرعون کہنے لگا: اے موسٰی! مجھے تو یہ گمان ہے کہ تو پاگل ہے (یا ساحر ہے)۔

---

[1] گزشتہ مباحث میں بھی اس سلسلے میں تفصیل گفتگو کر چکے ہیں۔

۱۰۲ اس نے جواب دیا: (اے فرعون) یقیناً تو جانتا ہے کہ دلوں کو روشن کرنے کے لیے یہ معجزات رب السماوات والارض کے سوا کسی نے نہیں بھیجے اور اے فرعون! میں سمجھتا ہوں کہ تو نابود ہو جائے گا۔

۱۰۳ اس (فرعون نے) ارادہ کر لیا کہ زمین سے ان سب کی بیخ کنی کر دے گا لیکن ہم نے اسے اور اس کے سب ساتھیوں کو غرق کر دیا۔

۱۰۴ اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا: (مصر و شام کے) اس علاقے میں رہو سہو لیکن جب وعدہ آخرت کا وقت پورا ہو جائے گا ہم تم سب کو اکٹھا (اس عدالت میں) لاکھڑا کریں گے۔

تفسیر

ان نشانیوں کے باوجود وہ ایمان نہ لائے

پہلے کی چند آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ مشرکین پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیسے عجیب و غریب تقاضے کرتے تھے۔ خود ان کی اپنی باتوں سے ظاہر تھا کہ ان کا مقصد تلاش حق نہیں ہے بلکہ وہ رسول اللہؐ کے سامنے ہٹ دھرمی اور عذر تراشی کا مظاہرہ کرتے تھے۔

زیر بحث آیات میں درحقیقت گزشتہ امتوں کی تاریخ سے اسی صورت حال کا ایک نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے کیسے کیسے معجزات دیکھے مگر پھر بھی بہانے تراشے اور انکار کا راستہ ترک نہ کیا۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: ہم نے موسٰی کو نو آیات اور واضح نشانیاں دیں (ولقد اٰتینا موسٰی تسع اٰیات بینٰت)۔

یہ نو آیتیں کیا تھیں — اس سلسلے میں ہم اسی بحث کے آخر میں گفتگو کریں گے۔

مزید تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: تیرے مخالفین اگر اس بات کا بھی انکار کر دیں تو اتمام حجت کے لیے۔ بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ جب یہ نشانیاں ان کے پاس آئیں تو کیا صورت حال تھی" (فسئل بنی اسرائیل اذ جاءھم)۔

لیکن مغرور سرکش اور جابر فرعون نے نہ صرف ان کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا بلکہ موسیٰ کو جادوگر یا دیوانہ ہونے کا الزام دیا اور کہا ، اے موسیٰ! میرا گمان ہے کہ تو جادوگر ہے یا دیوانہ (فقال له فرعون انی لاظنك یا موسٰی مسحورًا)۔

"مسحور" کے معنی کے حوالے سے مفسرین نے دو تفسیریں کی ہیں۔

بعض نے اسے ساحر و جادوگر کے معنی میں لیا ہے اور اس کے لیے قرآن حکیم کی ان آیات کو شاہد کے طور پر پیش کیا ہے جو کہتی ہیں کہ فرعون اور اس کے حواری ہر کہیں انہیں ساحر ہونے کا الزام دیا کرتے تھے۔ اور اسم مفعول کہ جو فاعل کے معنی میں آیا ہے لغت عرب میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً "مشئوم" "مشائم" کے معنی میں (یعنی وہ شخص جو بدبختی کا باعث ہو)۔ اور "میمون" "یامن" کے معنی میں (یعنی وہ شخص جو خوش بختی کا باعث ہو)۔

جبکہ بعض دیگر مفسرین نے "مسحور" کو اسی مفعول کے معنی میں لیا ہے یعنی وہ شخص جس پر جادو نے اثر کیا ہو۔ جیسا کہ سورہ ذاریات کی آیہ ۳۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ کو جادو کا الزام بھی دیا اور جنون کا بھی۔

بہرحال متکبرین کا ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ نظام بدلنے کے لیے مردانِ حق کی جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کے لیے اس طرح کا پراپیگنڈا کیا کرتے تھے۔ مردانِ حق جب فاسد معاشرے کے خلاف قیام کرتے اور معجزات پیش کرتے تو یہ لوگ کبھی انہیں جادوگر کہتے اور کبھی دیوانہ تاکہ سادہ لوح لوگوں کو بھٹکا سکیں اور انہیں انبیاء کے پاس سے دور کر سکیں۔

اس ناروا تہمت پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سکوت نہیں کیا اور پورے اعتماد اور یقین سے کہا، اے فرعون! تُو خوب جانتا ہے کہ ان نور بخش آیات کو آسمانوں اور زمین کے رب کے علاوہ کسی نے نازل نہیں کیا (قال لقد علمت ما انزل هٰؤلاء الا رب السمٰوٰت والارض بصائر)۔

لہٰذا تُو علم و آگہی کے باوجود حقائق کا انکار کرتا ہے۔ تُو اچھی طرح سے جانتا ہے کہ یہ معجزات و آیات خدا کی طرف سے ہیں اور مجھے بھی علم ہے کہ تُو جانتا ہے۔ یہ "بصائر" ہیں ، آشکار و واضح دلائل ہیں کہ جن کے ذریعے لوگ راہِ حق تلاش کر لیتے ہیں اور جادۂ حق کو طے کرنے کے لیے جن سے بصیرت حاصل کرتے ہیں لہٰذا تُو چونکہ شناخت حق کے باوجود انکار کرتا ہے "اے فرعون! میں سمجھتا ہوں کہ آخرکار تُو ہلاک ہو کر رہے گا (وانی لاظنك یا فرعون مثبورًا)۔

"مثبور" "ثبور" کے مادہ سے ہلاکت کے معنی میں ہے۔

فرعون چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دندان شکن دلائل کی تاب نہیں لا سکتا تھا لہٰذا اس نے اسی چیز کا سہارا لیا کہ جس کا ہر دور میں بے منطق طاغوت سہارا لیتے آئے ہیں۔ "اس نے ارادہ کر لیا کہ

انہیں اس علاقے سے باہر نکال دے گا لیکن ہم نے اسے اور اس کے سب ساتھیوں کو غرق کر دیا
(فاراد ان یستفزھم من الارض فاغرقناہ ومن معہ جمیعًا)۔
"یستفز" "استفزاز" کے مادہ سے زور اور سختی کے ساتھ باہر دھکیلنے کے معنی میں ہے۔
اس عظیم کامیابی کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا: (مصر و شام کے) اس علاقے میں رہو سہو (و
قلنا من بعدہ لبنی اسرائیل اسکنوا الارض)۔
لیکن جب وعدہ آخرت کا وقت آ پہنچے گا تو ہم تم سب کو میزان حساب کے پاس اکٹھا حاضر کریں
گے (فاذا جاء وعد الاٰخرۃ جئنا بکم لفیفًا)۔
"لفیف" "لف" کے مادہ سے پیچ و خم دینے کے معنی میں ہے اور یہاں وہ لوگ مراد ہیں
کہ جو ایک دوسرے کے ساتھ بالکل اس طرح گھلے ملے ہوں کہ ان کی انفرادیت اور قبیلہ نہ پہچانا
جاتا ہو۔

چند اہم نکات

۱۔ حضرت موسیٰ کے نو معجزات: قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بہت
سے معجزوں کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً:
۱۔ آپ کا عصا بہت بڑے اژدھا میں تبدیل ہو گیا اور اس نے جادوگروں کے آلات کو
نگل لیا۔ جیسا کہ سورہ طٰہٰ کی آیت ۲۰ میں ہے:
فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى
۲۔ آپ کا دوسرا بڑا معجزہ "ید بیضاء" کا تھا۔ آپ کا ہاتھ اس طرح سے چمک اٹھا کہ
جیسے کوئی منبع نور ہو۔
وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ
اٰيَةً اُخْرٰى۔
اور اپنا ہاتھ اپنی بغل میں لے جا کر نکالو تو تم دیکھو گے کہ کسی خرابی کے بغیر کیسا چمکتا
دمکتا نکلتا ہے اور یہ دوسرا معجزہ ہوگا۔ (طٰہٰ۔ ۲۲)
۳۔ تباہ کن طوفان ـــ آپ کا تیسرا اہم معجزہ تھا۔ سورہ اعراف کی آیت ۱۳۳ میں ہے:
فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ
پس ان پر ہم نے طوفان بھیجا۔
۴۔ ٹڈی دل کہ جو ان کی فصلوں اور درختوں پر مسلط ہو گیا اور ان کے لیے آفت و مصیبت

بن گیا۔

وَالْجَرَادَ (اعراف - ۱۳۳)

۵۔ نباتات پر آنے والی جوؤں کی آفت کہ جو فصلوں کو نابود کر دیتی تھی:

وَالْقُمَّلَ (اعراف - ۱۳۳)

۶۔ دریائے نیل سے نکلنے والے مینڈک کہ جن کی نسل اتنی بڑھی کہ فرعونیوں کی زندگی اجیرن ہوگئی:

وَالضَّفَادِعَ (اعراف - ۱۳۳)

۷۔ "دم" یعنی خون کی مصیبت۔ انہیں خون کی نکسیر پھوٹنے لگی یا دریائے نیل کا پانی خون رنگ ہوگیا اور اس کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ پینے کے قابل رہا نہ کھیتی باڑی کے۔

وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ (اعراف - ۱۳۳)

۸۔ دریا میں راستے بن گئے اور بنی اسرائیل ان میں سے گزر کر پار اتر گئے:

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ (بقرہ - ۵۰)

۹۔ بنی اسرائیل پر من وسلویٰ نازل ہوا۔ اس کی تفصیل سورہ بقرہ کی آیہ ۵۰ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ قرآنی الفاظ میں:

وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى (بقرہ - ۵۰)

۱۰۔ پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ارشاد قرآنی ہے:

فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا

ہم نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا عصا پتھر پر مارو۔ پس اس میں سے بارہ چشمے جاری ہو گئے۔ (بقرہ - ۶۰)

۱۱۔ پہاڑ کا ایک حصہ الگ ہو کر سائبان کی طرح ان کے سروں پر آکھڑا ہو گیا۔

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ

اور جب ہم نے ان کے سروں پر پہاڑ کو اس طرح سے لٹکا دیا کہ جیسے سائبان ہو۔ (اعراف - ۱۷۱)

۱۲۔ آل فرعون کو قحط اور خشک سالی نے آلیا۔ یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں سے تھا۔ قرآن کہتا ہے:

وَلَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ

اور بے شک ہم نے آل فرعون کو برسوں تک قحط اور پھلوں کی کمی کے عذاب میں گرفتار کیے رکھا۔ (اعراف - ۱۳۰)

۱۳۔ اس مقتول کو پھر سے زندگی مل گئی کہ جس کا قتل بنی اسرائیل میں اختلاف کا باعث بن گیا تھا۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى

پس ہم نے کہا : اس گائے کا کوئی ٹکڑا اسے کر اس کی لاش پر مارو۔ یوں خدا مردے کو زندہ کرتا ہے۔ (بقرہ - ۷۳)

۱۴- بیابان میں بنی اسرائیل سخت گرمی میں مبتلا تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بادلوں کا سائبان عطا فرما دیا۔ یہ بھی ایک معجزہ تھا۔ ارشاد الٰہی ہے :

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ

اور ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کر دیا۔ (بقرہ - ۵۷)

لیکن زیر نظر آیت میں تو نو آیات کا ذکر ہے۔ اس سے پھر کون سے نو معجزات مراد ہیں؟

ان آیات میں جو تعبیرات آئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں وہ معجزات مراد ہیں کہ جو فرعون اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں ظہور پذیر ہوئے نہ وہ کہ جو صرف بنی اسرائیل پر مربوط ہیں، مثلاً من و سلویٰ کا نزول، پتھر سے چشموں کا پھوٹنا وغیرہ۔

اگر غور کیا جائے تو سورہ اعراف میں بیان کیے گئے پانچ معجزات یعنی طوفان، نباتاتی آفت، ٹڈی دل، مینڈک اور خون ہی خون نظر آنا، ان نو معجزات میں شامل ہیں۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دو مشہور معجزے یعنی عصا، اور ید بیضا بھی یقیناً ان میں شامل ہیں خصوصاً جبکہ سورۂ نمل کی آیت ۱۰ تا ۱۲ میں ان دو عظیم معجزوں کے ذکر کے بعد تسع آیات (نو آیات) کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔ اس طرح یہ کل سات معجزے ہوئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اور دو کون سے معجزات ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ فرعونیوں کی غرقابی اور اس قسم کے دیگر امور ان معجزات میں شامل نہیں ہو سکتے کیونکہ یہاں جن نو معجزات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان کا مقصد فرعونیوں کی ہدایت ہے نہ کہ ان کی تباہی۔

سورۂ اعراف میں بہت سے معجزات کا ذکر ہے۔ ان میں غور و خوض کیا جائے تو یہ دو معجزات خشک سالی اور مختلف پھلوں کا قحط ہے کیونکہ عصا اور ید بیضا کے معجزے کا ذکر کرنے کے بعد اور ٹڈی دل وغیرہ مذکورہ پانچ معجزات سے پہلے فرمایا گیا ہے :

ولقد اخذنا اٰل فرعون بالسنین ونقص من الثمرات لعلھم یذکرون

ہم نے بنی اسرائیل کو خشک سالی اور مختلف قسم کے پھلوں کی کمی میں مبتلا کیا کہ شاید وہ بیدار ہو جائیں۔ (اعراف - ۱۳۰)

ممکن ہے بعض یہ خیال کریں کہ خشک سالی پھلوں کی کمی سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ اس طرح یہ ایک ہی آیت شمار ہوگی لیکن جیسا کہ ہم سورہ اعراف کی اس آیت کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ ہو سکتا

ہے محدود خشک سالی سے درختوں پر تھوڑا اثر مرتب ہو لیکن خشک سالی جب طول کھینچ جائے تو اس سے درخت تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا پھلوں کی تباہی صرف خشک سالی سے نہیں ہوتی۔

اس ساری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ جن نو معجزات کی طرف زیر بحث آیت میں اشارہ ہوا ہے وہ یہ ہیں:

(i) عصا

(ii) ید بیضاء۔

(iii) طوفان

(iv) ٹڈی دل

(v) "قمل" نامی ایک نباتاتی آفت

(vi) مینڈکوں کی کثرت

(vii) خون

(viii) خشک سالی

(ix) پھلوں میں کمی

سورہ اعراف کی مذکورہ آیات میں ان نو معجزات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

"یہ نو آیات دیکھ کر بھی جب وہ ایمان نہ لائے تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور انہیں غرق دریا کر دیا کیونکہ انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی اور ان سے غفلت برتی تھی" (اعراف۔ ۱۳۶)

ہمارے منابع حدیث میں اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں کچھ روایات نقل ہوئی ہیں لیکن ان روایات میں آپس میں اختلاف ہے — لہٰذا انہیں فیصلے کے لیے معیار قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ ان سے اطمینان ہو سکتا ہے۔

۲۔ کیا سوال کرنے والے پیغمبر اکرمؐ تھے؟ زیر بحث آیات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل سے حضرت موسیٰؑ کے نو معجزات کے بارے میں سوال کریں کہ آل فرعون نے کس طرح سے معجزات دیکھنے کے باوجود بہانے بناتے اور حضرت موسیٰؑ کی حقانیت قبول نہ کی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جیسی صاحب علم و عقل ہستی کو ایسے سوال کی ضرورت نہ تھی، بعض سمجھتے ہیں کہ سوال کرنے کے لیے دوسرے مخاطبین کو حکم دیا گیا تھا۔

لیکن — اگر ہم اس امر کی طرف توجہ کریں کہ پیغمبر اکرمؐ کو یہ سوال اپنے لیے نہیں کرنا تھا بلکہ اس لیے تھا کہ مشرکین یہ بات مان لیں لہٰذا اس میں کوئی مانع نہیں کہ سوال خود نبی کریم صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ہو تاکہ مشرکین جان لیں کہ اگر پیغمبر اکرمؐ ان کے طرح طرح کے تقاضے قبول نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تقاضے حق طلبی کے لیے نہ تھے بلکہ ہٹ دھرمی، تعصب اور عناد پر مبنی تھے جس کی مثال حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے واقعے میں موجود ہے۔

۳۔ آیت میں "ارض" سے کیا مراد ہے؟ زیر نظر آیات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ دشمن پر کامیابی کے بعد اب تم اس زمین پر رہو سہو جس کے بارے میں تم سے عہد لیا گیا ہے۔

کیا اس سے مراد مصر کی سرزمین ہے؟

(قبل کی آیت میں یہی لفظ مصر کی سرزمین کے لیے آیا ہے۔ مذکورہ آیت کہتی ہے کہ فرعون انہیں اس سرزمین سے نکالنا چاہتا تھا اور دوسری آیات بھی کہتی ہیں کہ بنی اسرائیل فرعونیوں کے وارث ہوئے)۔

یا پھر کیا "ارض" یہاں فلسطین کی مقدس سرزمین کی طرف اشارہ ہے؟

کیونکہ — اس واقعے کے بعد بنی اسرائیل فلسطین کی طرف گئے اور انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اس سرزمین میں داخل ہوں۔

ہم بعید نہیں سمجھتے کہ یہاں دونوں علاقے مراد ہوں کیونکہ قرآن کے مطابق بنی اسرائیل آل فرعون کی زمینوں کے بھی وارث ہوئے اور سرزمین فلسطین کے بھی مالک بنے۔

۴۔ "وعد الاٰخرۃ" سے کیا مراد ہے؟ کیا "وعد الاٰخرۃ" زیر بحث آیات میں دار آخرت کے معنی میں ہے؟

اس سوال کا جواب ظاہراً مثبت ہے کیونکہ "جئنا بکم لفیفا" (یعنی۔ ہم تمہیں اکٹھے ایک دوسرے سے ملے جلے ہوئے لائیں گے) اس امر کے لیے قرینہ ہے۔

لیکن بعض بزرگ مفسرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ "وعد الاٰخرۃ" اس سورہ کے آغاز کی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ:

اللہ نے تم بنی اسرائیل سے دو کامیابیوں اور دو شکستوں کا وعدہ کیا تھا۔

ایک کو "وعد اولیٰ" اور دوسری کو "وعد الاٰخرۃ" کہا گیا ہے۔

مگر — "جئنا بکم لفیفا" کی طرف توجہ کی جائے تو یہ احتمال بہت ہی بعید معلوم ہوتا ہے (غور کیجئے گا)۔

(۱۰۵) وَبِالْحَقِّ أَنْزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ۗ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ○

(۱۰۶) وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا ○

(۱۰۷) قُلْ آمِنُوا بِهِ أَوْ لَا تُؤْمِنُوا ۚ إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا ○

(۱۰۸) وَيَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ○

(۱۰۹) وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا ○

ترجمہ

(۱۰۵) اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے اور تجھے ہم نے سوائے اس کے کسی کام کے لیے نہیں بھیجا کہ تو بشارت دینے والا اور متنبہ کرنے والا ہو۔

(۱۰۶) ہم نے قرآن تجھ پر جدا جدا آیتوں کی صورت میں اتارا ہے تاکہ تو اسے لوگوں کے سامنے تدریجاً اور سکون کے ساتھ پڑھے (اور یہ دلوں میں اُتر جائے) اور یقیناً یہ قرآن ہم ہی نے نازل کیا ہے۔

(۱۰۷) ان سے کہہ دو، تم مانو یا نہ مانو جنہیں قبل ازیں علم عطا کیا گیا ہے یہ آیات جب ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں وہ زمین پر سجدے میں جا گرتے ہیں۔

۱۰۸ اور کہتے ہیں : پاک ہے ہمارا رب کہ جس کے وعدے حتماً پورے ہو کے رہتے ہیں ۔

۱۰۹ وہ (بے اختیار) زمین پر گر جاتے ہیں (اور سجدہ ریز ہو جاتے ہیں) اشک بہاتے ہیں اور ہر لحہ ان کا خشوع و خضوع بڑھتا ہی رہتا ہے ۔

تفسیر

عاشقانِ حق

ان آیات میں ایک مرتبہ پھر قرآن کی عظمت و اہمیت واضح کی گئی ہے اور مخالفین کے بعض اعتراضات اور بہانہ سازیوں کا جواب دیا گیا ہے ۔

ارشاد ہوتا ہے : ہم نے قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے (و بالحق انزلناہ) ۔

ساتھ ہی مزید فرمایا گیا ہے : اور یہ حق ہی کے ساتھ نازل ہوا ہے (و بالحق نزل) اور تجھے ہم نے صرف بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے ۔ (وما ارسلناك الا مبشرًا و نذیرًا) ۔

یہ جو پہلے فرمایا گیا ہے ۔ و بالحق انزلناہ ، اور ساتھ ہی فرمایا گیا ہے ۔ و بالحق نزل" ان دونوں جملوں میں کیا فرق ہے ؟

اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں ، مثلاً :

۱۔ پہلے جملے سے مراد یہ ہے کہ ہم نے مقدر کیا ہے کہ قرآن حق کے ساتھ نازل ہو اور دوسرا جملہ کہتا ہے کہ اس فیصلے پر عمل در آمد ہو گیا ہے ۔ اس بنا پر ایک جملہ تقدیر کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا اس پر عملدر آمد کی طرف [1]

۲۔ پہلے جملے سے مراد یہ ہے کہ قرآن کا مواد ، مضمون اور مفہوم حق ہے اور دوسرے جملے سے مراد یہ ہے کہ اس کا نتیجہ اور ثمرہ بھی حق ہے [2]

۳۔ پہلے جملے سے مراد یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا اور دوسرا جملہ کہتا ہے کہ رسول اللہ چونکہ اس میں دخل و تصرف کا حق نہیں رکھتے تھے لہٰذا یہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے ۔

---

[1] تفسیر قرطبی ، ج ٦ ص ۳۹۵۵ ۔

[2] تفسیر فی ظلال القرآن ، زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

لیکن — یہاں ایک اور احتمال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جو مذکورہ بالا تفاسیر کی نسبت واضح تر ہے اور وہ یہ کہ بعض اوقات انسان ایک کام شروع کرتا ہے لیکن اس کی طاقت چونکہ محدود ہے اس لیے وہ اسے آخر تک اسی صحیح طریقے سے نبھا نہیں سکتا مگر جو تمام چیزوں سے آگاہ ہے اور تمام چیزوں پر قدرت رکھتا ہے وہ ابتدا بھی صحیح طریقے سے کرتا ہے اور اختتام پر بھی اس کام کو مکمل طور پر اور صحیح طرح انجام دیتا ہے ۔

مثلاً کوئی شخص کسی ایک مقام سے صاف و شفاف پانی جاری کرتا ہے لیکن اسے راستے کی آلودگیوں سے محفوظ نہیں رکھ پاتا لہٰذا استعمال کرنے والوں کو وہ صاف و شفاف پانی میسر نہیں آتا لیکن جو اپنے کام پر پوری گرفت رکھتا ہے وہ ابتدائی طور پر بھی پاک و صاف پانی نکالتا ہے اور اسے پیاسوں کے برتنوں تک بھی پاک و صاف حالت میں پہنچا دیتا ہے ۔

قرآن بھی بالکل ایک ایسی کتاب ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے اور ابلاغ کے سارے راستے میں صحیح اور محفوظ رہی ہے ۔ اُس مرحلے میں بھی کہ جب جبرائیل اس کا واسطہ تھے اور اس مرحلے میں بھی کہ جب رسول اللہ اسے لینے والے تھے، یہاں تک کہ زمانہ گزرنے کے باوجود ہر قسم کی تحریف سے پاک اور محفوظ رہی ہے جیسا کہ اس آیت کا تقاضا ہے :

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ

یقیناً ہم ہی نے اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں ۔ (الحجر - ۹)

یہ کتاب ہر لحاظ سے محفوظ ہے کیونکہ اس کی حفاظت اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے ۔ لہٰذا یہ وحی الٰہی کا صاف و شفاف پانی دورِ نبوی سے لے کر اختتامِ عالم تک محفوظ ہے اور ہر قسم کی دست اندازی سے پاک دلوں کی تشنگی کو سیراب کرتا ہے ۔

اگلی آیت میں مخالفین کی بہانہ سازیوں میں سے ایک کا جواب دیا گیا ہے ۔ وہ کہتے تھے کہ قرآن ایک ہی مقام پر سارے کا سارا رسول اللہ پر کیوں نازل نہیں ہوگیا اور اس کی روش بالکل تدریجی کیوں ہے ؟ (جیسا کہ سورہ فرقان کی آیہ ۳۲ میں اس اعتراض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے)۔

ارشاد ہوتا ہے : " ہم نے الگ الگ آیتوں کی صورت میں تجھ پر قرآن نازل کیا ہے تاکہ تُو اسے لوگوں کے سامنے اطمینان کے ساتھ تدریجی طور پر پڑھے ۔ اور یہ دل و دماغ میں اچھی طرح سے اتر جائے اور پوری طرح عملی شکل بھی اختیار کرلے (وقرآناً فرقناہ لتقراہ علی الناس علٰی مکث) [1]

---

[1] بہت سے مفسرین کے مطابق " قرآناً " کہ جو مندرجہ بالا آیت میں منصوب صورت میں آیا ہے ایک فعل مقدر کے ذریعے ہیں ۔ " فرقناہ " اس کی تفسیر کر رہا ہے اور تقدیر میں یوں تھا :

" وفرقنا قرآناً "

مزید تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یقیناً یہ سارا کا سارا قرآن ہم نے نازل کیا ہے (و نزلناہ تنزیلاً)۔

سطحی نظر رکھنے والے خصوصاً بہانہ ساز لوگوں کی نظر میں بے شک نزولِ قرآن کی یہ کیفیت قابلِ اعتراض ہوگی۔ وہ کہیں گے کہ یہ کتاب کہ جو بنیادِ اسلام ہے، ساری انسانیت کی راہنما ہے مسلمانوں کے لیے تمام معاشرتی حقوق اور سیاسی و عبادتی قوانین کا سرچشمہ ہے ایک ہی مرتبہ ساری کی ساری رسول اللہ پر نازل کیوں نہیں ہوگئی تاکہ لوگ ہمیشہ اسے شروع سے آخر تک پڑھ کر ان امور سے باخبر ہو جائیں ۔

لیکن — تھوڑا سا غور کیا جائے تو اس اعتراض کا کافی و وافی جواب مل جاتا ہے۔ کیونکہ:

اولاً: قرآن اگرچہ ایک کتاب ہے لیکن یہ انسانوں کی کسی تالیف کی مانند نہیں ہے کہ جو کسی ایک موضوع پر کتاب لکھنے بیٹھتے ہیں تو اسے پیش نظر رکھ کر اس کے ابواب کی تقسیم و تنظیم کرتے ہیں اور پھر اسے ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں۔ یہ تو ایسی کتاب ہے کہ جس کا پیغمبرِ اسلامؐ کے تئیس سالہ دورِ نبوت کے واقعات سے نہ ٹوٹنے والا تعلق ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ جو کتاب ۲۳ سالہ واقعات سے مربوط ہو اکٹھی ایک ہی روز میں نازل ہو جائے۔ کیا ۲۳ سال کے واقعات ایک دن میں جمع ہو سکتے ہیں؟

قرآنِ حکیم کے بہت سے حصے اسلامی غزوات سے مربوط ہیں، اس کا کچھ حصہ منافقین کی دسیسہ کاریوں سے متعلق ہے۔ اس کے کچھ مسائل ان وفود سے متعلق ہیں کہ جو مختلف قوموں کی طرف سے رسولِ اکرمؐ کے پاس آئے تھے اور آپؐ حکمِ الٰہی کے مطابق ان کے جواب کے لیے عملی اقدام کرتے تھے۔

کیا ممکن ہے کہ یہ سب امور پہلے ہی دن لکھ لیے جائیں؟

ثانیاً: قرآن صرف تعلیمی کتاب نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ ہر آیت کے نزول کے بعد اس کا اجراء ہو اور اس پر عملدرآمد ہو۔ لہٰذا سارا قرآن یکجا نازل ہوتا تو یکجا اس کا اجراء بھی ہونا چاہیے تھا جبکہ ہم جانتے ہیں کہ اس کا یکجا اور اکٹھا اجراء ایک امرِ محال تھا کیونکہ جو معاشرہ سرتاپا فاسد تھا ایک ہی دن میں اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک اَن پڑھ بچے کو ایک ہی دن میں پہلی کلاس سے ڈاکٹریٹ تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن تدریجاً نازل ہوا ہے تاکہ اس کا اجراء اچھے طریقے سے ہو سکے اور یہ پوری طرح معاشرے میں اپنا مقام بنا سکے، کسی تزلزل کا شکار نہ ہو اور معاشرہ اسے قبول و محفوظ رکھنے کے قابل ہو سکے۔

ثالثاً: خود رسول اللہؐ جو اس عظیم انقلاب کے رہبر تھے اگر سارے قرآن کے نافذ کرنے کیلئے تقسیم کرنا چاہتے تو اس کی نسبت تدریجی اجراء کا طریقہ ان کے لیے قوی تر تھا اور آمادگی پیدا کرنے کے لحاظ سے بہتر تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے تھے اور بے نظیر عقل و توانائی کے حامل تھے۔

تاہم زیادہ بہتر اور اکمل تر تدریجی قبولیت اور تدریجی اجراء ہی کی صورت تھی۔

رابعاً، تدریجی نزول کا مفہوم یہ ہے کہ مبداء وحی کے ساتھ پیغمبر کا ارتباط دائمی ہے جبکہ یکجا اور یک بار نزول ایک سے زیادہ مرتبہ سرچشمۂ وحی سے ارتباط کی ضمانت نہیں دیتا۔

سورہ فرقان کی آیہ ۳۲ میں ہے:

كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا

ہم نے قرآن کو تجھ پر اس طرح سے نازل کیا ہے کہ تیرا دل مضبوط ہو اور ہم نے تیرے لیے آہستہ آہستہ اور تدریجاً پڑھا ہے۔

یہ آیت تدریجی نزول کے تیسرے فلسفے کی طرف اشارہ کرتی ہے جبکہ ہماری زیر بحث آیت زیادہ تر دوسرے فلسفے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

بہرحال یہ تمام عوامل قرآن کے تدریجی نزول کی حکمت و فلسفہ کے لیے روشن دلیل ہیں۔

اگلی آیت نادان مخالفین کا غرور ختم کرنے کے لیے کہتی ہے: چاہے ایمان لاؤ یا نہ لاؤ جنہیں اس سے پہلے علم دیا گیا ہے ان کے سامنے جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ منہ کے بل خاک پر گر پڑتے ہیں اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں (قل اٰمنوا بہ اولا تؤمنوا ان الذین اوتوا العلم من قبلہ اذا یتلی علیھم یخرون للاذقان سجدًا)

چند قابل توجہ نکات

۱۔ "اٰمنوا بہ اولا تؤمنوا" کا تسلسل: عام طور پر مفسرین کا نظریہ ہے کہ "اٰمنوا بہ اولا تؤمنوا" کا ایک تسلسل ہے جو محذوف ہے اور کلام کے قرینے سے وہ واضح ہوتا ہے۔ مفسرین نے اسے کئی طرح سے ذکر کیا ہے،

بعض کہتے ہیں مراد یہ ہے کہ تم مانو یا نہ مانو اعجاز قرآن اور اس کا منزل من اللہ ہونا واضح ہے۔

بعض دیگر کہتے ہیں اس جملے کی تکمیل یہ ہے کہ تم مانو یا نہ مانو اس کا فائدہ یا نقصان تو تمہیں ہی پہنچے گا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ بعد والا جملہ پہلے جملے کی تکمیل کرتا ہو۔ اس کی نظیر اردو زبان میں بھی ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں:

تو میری بات مانے یا نہ مانے، جو اہل علم و دانش اور صاحب علم و فراست ہیں وہ مانتے ہیں۔

یہ جملہ اس امر کی طرف کنایہ ہے کہ تیرے نہ ماننے کی وجہ تیری عدم آگاہی اور بے علمی ہے اگر

تو صاحبِ علم و دانش ہوتا تو مان لیتا۔ دوسرے لفظوں میں :

اگر تو ایمان نہ لائے تو آگاہ اور دانشمند افراد ایمان لے آئیں گے۔

۲۔ "الذین اوتوا العلم من قبلہ" سے کون مراد ہیں ؟ اس سے مراد یہودی اور عیسائی علماء ہیں جنھوں نے قرآنی آیات سنیں اور تورات و انجیل کے مطابق علامات پائیں تو ایمان لے آئے اور حقیقی مومنین کی صف میں شامل ہو گئے اور علمائے اسلام میں سے شمار ہونے لگے۔

قرآن پاک کی کچھ دیگر آیات میں بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً :

لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ○

وہ سب برابر نہیں ہیں۔ اہلِ کتاب میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو (حق اور ایمان کے ساتھ) قیام کرتے ہیں اور رات کے وقت ہمیشہ آیاتِ خدا کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدے بجا لاتے ہیں۔ (آل عمران - ۱۱۳)

۳۔ "یخرّون" کا مفہوم : اس کا معنی ہے " وہ بے اختیار زمین پر گر پڑتے ہیں" یہ تعبیر "یسجدون" (وہ سجدہ کرتے ہیں) کی بجائے آئی ہے۔ یہاں اس کا استعمال ایک لطیف نکتے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ جن افراد کے دل بیدار و آگاہ ہوتے ہیں آیاتِ الٰہی سنتے ہی وہ خدائی باتوں کے ایسے شیفتہ ہوتے ہیں کہ دیوانہ وار بے اختیار سجدہ ریز ہو جاتے ہیں گویا دل و جان اس کی نذر کر دیتے ہیں۔[1]

۴۔ "اذقان" کا مطلب : "اذقان" "ذقن" کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے "ٹھوڑی" ہم جانتے ہیں کہ کوئی شخص بھی سجدہ کرتے وقت اپنی ٹھوڑی زمین پر نہیں رکھتا لیکن آیت کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ وہ بارگاہِ الٰہی میں پورا چہرہ زمین پر رکھ دیتے ہیں یہاں تک کہ ٹھوڑی جو اس سلسلے میں چہرے کا آخری حصہ ہو سکتا ہے وہ بھی زمین پر لگ جاتا ہے اور اس طرح وہ اس کی بارگاہ کی عظمت کا اظہار کرتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ سجدے میں عموماً انسان پہلے اپنی پیشانی خاک پر رکھتا

---

[1] راغب نے مفردات میں کہا ہے :

"یخرّون" دراصل "خریر" کے مادہ سے ہے کہ جو پانی یا اس جیسی چیز بلندی سے گر رہی ہو تو اس کی آواز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ سجدہ کرنے والوں کے لیے اس تعبیر کا استعمال اس چیز کی نشانی ہے کہ وہ اپنے رب کے حضور زمین پر اس حالم میں گرتے ہیں کہ ان کی تسبیح کی آواز بلند ہوتی ہے۔

ہے لیکن جو شخص مدہوشی کے عالم میں بے اختیار زمین پر گرتا ہے اس کی زمین پر پہلے ٹھوڑی لگتی ہے۔
یہ تعبیر آیت میں "یخرون" کے مفہوم کی تاکید کرتی ہے۔[1]

اگلی آیت میں ان کی اس گفتگو کا ذکر ہے جو وہ سجدہ ریز ہوتے ہوئے کرتے ہیں: وہ کہتے ہیں:
پاک ہے ہمارا رب، یقیناً ہمارے رب کے وعدے پورے ہو کے رہیں گے (ویقولون سبحان ربنا ان کان وعد ربنا لمفعولا)۔[2]

وہ اپنے ان الفاظ میں پروردگار کی ربوبیت، اس کی پاکیزہ صفات اور اس کے وعدوں کی سچائی کے بارے میں اپنے حقیقی ایمان اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ وہ گفتگو ہے جس میں توحید پر ایمان، حق تعالیٰ کی صفات اور اس کی عدالت سب کچھ موجود ہے۔ اس میں پیغمبر کی نبوت اور معاد کا عقیدہ بھی موجود ہے گویا انہوں نے اصول دین کو ایک ہی جملے میں جمع کر دیا ہے۔

ان آیاتِ الٰہی اور اس عاشقانہ سجدے کی تاثیر کا ذکر اگلی آیت میں بھی جاری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ پورے چہرے کے بل خاک پر گر پڑتے ہیں، ان کے اشک رواں ہوتے ہیں اور پروردگار کے حضور ان کے خشوع و خضوع میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے (ویخرّون للاذقان یبکون ویزیدھم خشوعًا)۔

"یخرّون للاذقان" کا تکرار تاکید کی دلیل بھی ہے اور ہمیشگی کی بھی۔ اسی طرح "یبکون" فعل مضارع کا استعمال عشق و مستی میں ان کے دائمی گریے کی دلیل ہے۔ نیز "یزیدھم خشوعًا" (ان کا خشوع بڑھتا ہے) میں فعل مضارع کا استعمال اس امر کی ایک اور دلیل ہے کہ ان کی حالت ایک سی نہیں رہتی بلکہ وہ ہمیشہ رشد و کمال کی بلندیوں کی طرف پیش قدمی کرتے رہتے ہیں اور ان کا خشوع و خضوع ہر لحہ بڑھتا رہتا ہے۔

خشوع ـ جسمانی و روحانی انکساری، ادب اور تواضع کی ایک کیفیت ہے جو کسی شخصیت یا حقیقت کے سامنے ہوتی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ تعلیمی و تربیتی پروگرام: زیر بحث آیات سے ایک اہم درس جو حاصل ہو رہا ہے یہ ہے کہ ثقافتی، تمدنی، فکری اور ہر قسم کے اجتماعی انقلاب کے لیے تربیتی پروگرام ضروری ہے کیونکہ اگر ایسا مرتب و منظم پروگرام نہ ہو اور پھر ہر مرحلے میں اس پر عملدرآمد نہ ہو تو شکست یقینی ہے۔ یہاں تک کہ قرآن مجید کیجا

---

[1] روح المعانی، ج ۱۵ ص ۱۷۵۔

[2] "ان کان وعد ربنا" میں "ان" شرطیہ نہیں بلکہ تاکید کے طور پر اور مثقلہ سے مخففہ ہے۔

اور یکبار رسول اللہؐ پر نازل نہیں ہوا اگرچہ علم خدا میں وہ یکجا ہی تھا اور رسولِ اکرمؐ کے سامنے شب قدر میں مجموعی صورت میں پیش ہوا تھا لیکن اس کا نزولِ اجرائی مختلف اوقات میں دقیق پروگرام کے تحت ۲۳ سال کی مدت میں مکمل ہوا۔

لہٰذا جب خدا اپنی بے پایاں قدرت و علم کے باوجود اس طرح کرتا ہے تو انسانوں کی ذمہ داری اس سے واضح ہو جاتی ہے۔

اصولی طور پر یہ ایک قانون و سنتِ الٰہی ہے کہ جو نہ فقط عالم تشریع میں بلکہ عالم تکوین میں بھی جاری و ساری ہے۔ کیا کبھی آپ نے سُنا ہے کہ کوئی بچہ ایک ہی رات میں ماں کے بطن سے پیدا ہو گیا ہو یا کوئی پھل درخت پر گھنٹے بھر میں پک کر بیٹھا ہو گیا ہو۔ لہٰذا یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ کسی معاشرے کی فکری، ثقافتی، تمدنی یا اقتصادی و سیاسی لحاظ سے رات بھر میں ساری اصلاح ہو جائے۔

اس بات سے یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ اگر ہم مختصر مدت میں اپنی مساعی کا کوئی نتیجہ نہ دیکھ پائیں تو ہمیں مایوس نہیں ہو جانا چاہیئے اور کوشش جاری رکھنا چاہیئے اور ہمیں اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہیئے کہ حقیقی اور مکمل کامیابیاں ہمیشہ طویل عرصے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہیں۔

۲۔ علم و ایمان کا ربط: مندرجہ بالا آیات سے جو دوسرا واضح سبق حاصل کیا جا سکتا ہے وہ ہے علم اور ایمان کا باہمی ربط۔ قرآن کہتا ہے:

> تم ان آیات پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ جو صاحبانِ علم ہیں وہ نہ صرف ان پر ایمان لاتے ہیں بلکہ عشقِ الٰہی اس طرح سے ان کے دل میں بھڑک رہا ہے کہ وہ بے اختیار اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ اشکوں کا ایک سیلاب ان کے رخساروں پر جاری ہو جاتا ہے اور ہر لحظہ ان کا خضوع و خشوع بڑھتا رہتا ہے اور ان کے دل میں ان آیات کا احترام فزوں تر ہوتا رہتا ہے۔

یعنی۔ یہ تو جاہل ہیں کہ جو حقائق کو دیکھتے ہیں تو کبھی ان کے سامنے سے بے اعتنائی سے گزر جاتے ہیں اور کبھی ان کا تمسخر اڑاتے ہیں اور ایسے افراد اگر کبھی ایمان کی طرف راغب بھی ہوں تو ان کا ایمان کمزور ناپائیدار ہوگا اور عشق، جذبہ اور حرارت سے خالی ہوگا۔

علاوہ ازیں یہ ان کے بیہودہ مفروضے کی پھر تردید ہے کہ جن کا خیال ہے دین انسان کی جہالت کی وجہ سے ہے۔ قرآن مجید اس دعویٰ کے برخلاف مختلف مواقع پر تاکید کرتا ہے کہ علم و ایمان ہر جگہ اکٹھے ہوتے ہیں اور گہرا مستحکم ایمان سایۂ علم کے بغیر ممکن نہیں اور علم بھی اعلیٰ تر اور بالاتر مراحل میں ایمان سے کمک حاصل کرتا ہے (غور کیجئے گا)۔

(۱۱۰) قُلِ ادْعُوا اللَّهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۚ اَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ○

(۱۱۱) وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ○ ع

ترجمہ

(۱۱۰) کہہ دو: اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو جسے بھی پکارو (اس کی پاک ذات ایک ہی ہے اور) اس کے اچھے اچھے نام ہیں اور اپنی نماز نہ زیادہ بلند پڑھ اور نہ بہت آہستہ بلکہ درمیانی (معتدل) راہ اختیار کر۔

(۱۱۱) اور کہہ دو: حمد وستائش اس اللہ کے لیے ہے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا ہے اور نہ جس کی حکومت میں کوئی شریک ہے اور نہ وہ کمزور وعاجز ہے کہ کوئی اس کا ولی وحامی ہے اور اس کی کبریائی بیان کرو، کمال درجے کی کبریائی۔

شانِ نزول

مفسرین نے زیرِ نظر پہلی آیت کی شانِ نزول کے بارے میں ابن عباس کے حوالے سے یوں نقل کیا ہے:

مکہ میں ایک رات پیغمبر اکرمؐ سجدے میں تھے۔ آپؐ خدا کو "یا رحمٰن" اور "یا رحیم" کہہ کر پکار رہے تھے کہ عذر تراش مشرکوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا: دیکھو!

یہ شخص انہیں تو سرزنش کرتا ہے کہ ہم کئی خدا کیوں مانتے ہیں لیکن خود دو خداؤں کی پرستش کرتا ہے حالانکہ اس کا خیال ہے کہ یہ موحد ہے اور اس کا ایک سے زیادہ معبود نہیں ۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا (کہ یہ متعدد نام ایک ہی ذات پاک کی خبر دیتے ہیں) [1]

تفسیر

آخری بہانے

گزشتہ آیات میں مشرکین کے کمزور اور بے بنیاد بہانوں کا ذکر تھا اور ان کا جواب دیا گیا تھا۔ زیرِ نظر آیات میں ان کے آخری بہانوں کا ذکر ہے۔ وہ کہتے تھے کہ پیغمبر، خدا کو مختلف ناموں سے کیوں پکارتے ہیں جبکہ یہ توحید کے مدعی ہیں۔ قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: کہہ دو: تم اسے "اللہ" کے نام سے پکارو یا "رحمٰن" کے نام سے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس کے کئی اچھے اچھے نام ہیں (قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن ایا ما تدعوا فلہ الاسماء الحسنیٰ)۔

دل کے یہ اندھے اپنی روزمرہ کی زندگی پر بھی نظر نہیں کرتے تھے۔ خود ان کے ہاں ایک شخص، ایک جگہ یا ایک چیز کے لیے کئی کئی نام ہوتے تھے اور یہ مختلف پہلوؤں کے حوالے سے رکھے جاتے تھے۔ تو کیا ان حالات میں باعثِ تعجب ہے کہ جس خدا کا وجود لامتناہی ہے، جو تمام کمالات، نعمات اور اچھائیوں کا سرچشمہ ہے، اس جہان کی ہر گردش جس کے ہاتھ میں ہے ۔ اس ذاتِ مقدس کے ہر کمال اور ہر کام کی مناسبت سے کوئی خاص نام نہ ہو۔

اصولی طور پر اللہ کو صرف ایک نام سے نہ پکارا جا سکتا ہے اور نہ پہچانا جا سکتا ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس کے نام اس کی صفات کی طرح لامتناہی ہوں تاکہ اس ذات کے ترجمان ہوں لیکن ہمارے الفاظ چونکہ ہماری ہر چیز کی طرح محدود ہیں ۔ لہٰذا ہمارے پاس اس کے نام بھی محدود ہی ہیں ۔ اس لیے اللہ کے بارے میں ہماری جتنی بھی معرفت ہو محدود ہے۔ یہاں تک کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی روح کی عظیم وسعت کے باوجود فرماتے ہیں:

ما عرفناک حق معرفتک

تیری معرفت کا جو حق ہے اتنا ہم تجھے پہچان نہیں پائے۔

---

[1] مجمع البیان، زیرِ نظر آیت کے ذیل میں۔

لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ ہماری جتنی عقل اور شعور ہے اتنا اسے نہ پہچانیں خصوصاً جبکہ وہ اپنی ذات کی معرفت کے لیے خود ہماری مدد بھی بہت کرتا ہے اور اپنی کتاب میں مختلف ناموں سے اپنا ذکر کرتا ہے اور اس کے اولیاء دین کے بیانات میں اس کے ایک ہزار کے قریب اسماً ہم تک پہنچے ہیں۔

واضح ہے کہ یہ سب "اسم" ہیں اور "اسم" کا ایک معنی علامت اور نشانی ہے لہٰذا یہ سب اس کی پاک ذات کی نشانیاں ہیں اور یہ سب خطوط ایک ہی نقطے تک جا پہنچتے ہیں اور اس سے اس کی ذات وصفات کی توحید و وحدت پر کوئی فرق نہیں آتا۔ ان اسماء میں سے بعض زیادہ اہمیت وعظمت کے حامل ہیں کیونکہ ان کے توسط سے ہمیں زیادہ معرفت و آگہی نصیب ہوتی ہے۔ ان اسماء کو قرآن حکیم اور اسلامی روایات میں "اسماء الحسنیٰ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک مشہور روایت میں ہے:

اللہ کے ننانوے نام ہیں جو شخص انہیں شمار کرے گا جنت میں داخل ہوگا۔

اسماء حسنیٰ کے مفہوم اور ان ننانوے ناموں کے بارے میں ہم چوتھی جلد میں سورہ اعراف کی آیہ ۱۸۰ کی تفسیر میں تفصیل گفتگو کر چکے ہیں۔ آیت یوں ہے:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا

اور اللہ کے اچھے اچھے نام ہیں تو اسے ان ناموں سے پکارا کرو۔

لیکن اہم بات یہ ہے کہ ہم سمجھیں کہ ان ناموں کو شمار کرنے کا یہ معنی نہیں کہ ان ناموں کو صرف زبان پر جاری کرلیں اور اللہ کو ان ناموں سے پکاریں تاکہ جنتی یا مستجاب الدعوۃ ہو جائیں۔ مقصد یہ ہے کہ ان اسماء کو عملی طور پر اپنایا جائے۔ عالم، رحمان، رحیم، جواد، کریم.... جیسے ناموں کا پَرتو اپنے وجود پر ڈالا جائے اور عملی زندگی میں انہیں اپنایا جائے تاکہ ہم جنتی بھی ہو جائیں اور ہماری دعا بھی بہرحال میں مستجاب ہو۔

مرحوم صدوق نے اپنی کتاب توحید میں ہشام بن حکم سے ایک حدیث نقل کی ہے۔ اس میں ہے:

ہشام کہتا ہے: میں نے امامؑ سے اللہ کے ناموں کے بارے میں پوچھا اور یہ بھی پوچھا کہ ان کی بنیاد کیا ہے۔ نیز میں نے کہا کہ "اللہ" کس سے مشتق ہے۔ تو امامؑ نے فرمایا:
اسے ہشام! یہ لفظ "الٰہ" سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے "تحیّر" اور "الٰہ" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کوئی "مألوہ" رکھتا ہو (وہ ذات کہ کوئی شخص جس کی ذات کی حقیقت اور کنہ کی شناخت کے لیے حیران و سرگرداں ہو)۔
لیکن اس بات کو جانو کہ اسم مسمّیٰ کا غیر ہے لہٰذا جو صرف نام کی پرستش کرتا ہے بغیر

مفہوم و مطلوب کے، وہ کافر ہے اور درحقیقت اس نے کسی چیز کی پرستش نہیں کی اور جو اسم اور مسمیٰ دونوں کی پرستش کرتا ہے وہ بھی کافر ہے کیونکہ وہ دو کی پرستش کرتا ہے لیکن جو صرف مسمیٰ کی عبادت کرتا ہے نہ کہ اسم کی (بلکہ اسم کو اس معنی تک پہنچنے کے لیے علامت سمجھے) تو یہی توحید کی حقیقت ہے۔

اسے ہشام! سمجھو۔

ہشام کہتا ہے: میں نے عرض کیا کہ کچھ سمجھا ہوں۔ میرے لیے کچھ وضاحت اور کیجئے۔

آپ نے فرمایا:

خدا کے بزرگ و برتر کے ننانوے نام ہیں۔ ہر اسم کا اگر ایک مسمیٰ ہو تو ننانوے خدا ہونے چاہئیں لیکن "اللہ" ایک نام ہے کہ جو ان صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور بہر حال اس کے تمام نام اس کی ذات کے غیر ہیں۔

اسے ہشام! روٹی نام ہے ایک چیز کا جسے کھایا جاتا ہے اور پانی نام ہے ایک چیز کا جسے پیا جاتا ہے اور لباس نام ہے ایک چیز کا جسے پہنا جاتا ہے اور آگ نام ہے اس چیز کا جو جلاتی ہے (لیکن یہ سب نام ہیں اور وہ چیز کہ جسے ہم کھاتے ہیں، پیتے ہیں، پہنتے ہیں اور جس کے جلانے سے ڈرتے ہیں وہ نام نہیں ہیں بلکہ عینیت خارجی رکھتے ہیں)[1]

مشرکین مکہ رسول اللہؐ پر ایک اعتراض اور کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ اپنی نماز بلند آواز سے پڑھتا ہے اور ہمیں بے آرام کرتا ہے، یہ کیسی عبادت ہے اور کیا طرزِ عمل ہے؟

قرآن رسول اللہؐ کو حکم دیتا ہے، اپنی نماز نہ زیادہ بلند آواز سے پڑھو اور نہ بہت آہستہ بلکہ درمیانی راہ اپناؤ (ولا تجهر بصلاتك ولا تخافت بها وابتغ بين ذٰلك سبيلاً)۔

لہٰذا مذکورہ بالا آیت فقہی اصطلاح کے مطابق جہریہ اور اخفاتیہ نمازوں سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کے پیش نظر بلند یا آہستہ پڑھنے میں افراط و تفریط کا مسئلہ ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ نہ زیادہ بلند پڑھو کہ شور معلوم ہو اور نہ اتنا آہستہ کہ صرف جنبشِ لب باقی رہ جائے اور کان تک آواز ہی نہ آئے۔

اکثر مفسرین نے آیت کی جو شانِ نزول ابن عباس سے نقل کی ہے وہ بھی اسی معنی کی مؤید ہے۔

نیز امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے مروی جو متعدد روایات طرق اہل بیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں وہ بھی اسی تفسیر کی طرف اشارہ کرتی ہیں[2]

---

[1] تفسیر المیزان، زیر بحث آیت کے ذیل میں، بحوالہ توحید صدوق۔

[2] تفسیر نور الثقلین، ج ۳ صفحہ ۲۲۳۔

مندرجہ بالا گفتگو کے پیش نظر اس آیت کے بارے میں جو دیگر تفاسیر بیان ہوئی ہیں وہ سب اصل مطلب سے دور معلوم ہوتی ہیں۔

البتہ یہاں حد اعتدال سے کیا مراد ہے اور جس جہر و اخفات سے منع کیا گیا ہے، وہ کیا ہے؟ اس سلسلے میں ظاہر یہ ہے کہ "جہر" شور مچانے کے معنی میں ہے اور "اخفات" اس قدر آہستہ پڑھنے کے معنی میں کہ انسان خود بھی نہ سن سکے۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

الجهر بها رفع الصوت، والتخافت بها مالم تسمع نفسك، واقرأ بين ذلك۔

"جہر" آواز زیادہ بلند کرنے کو کہتے ہیں اور "اخفات" یہ ہے کہ تم خود بھی نہ سن سکو۔ ان دو میں سے کسی کو انجام نہ دو بلکہ ان دونوں کے درمیان حد وسط اختیار کرو۔

رہا دن اور رات کی نمازوں میں جہر و اخفات کا مسئلہ، تو جیسے ہم سطور بالا میں اشارہ کر چکے ہیں یہ ایک الگ حکم ہے کہ اس کا مفہوم اور دلائل مختلف ہیں۔ ہمارے فقہاء (رضوان اللہ علیہم) نے ان کے مدارک کتاب الصلوٰۃ میں بیان کیے ہیں۔

جہر و اخفات میں اعتدال کے دو پہلو

جہر و اخفات میں اعتدال کا یہ اسلامی حکم ہمیں دو لحاظ سے متوجہ کرتا ہے:

پہلے اس نظر سے کہ ہم اپنی عبادات اس طرح سے انجام نہ دیں کہ دشمنوں کے ہاتھ بہانہ آجائے۔ وہ تمسخر اڑانے لگیں یا اعتراض کرنے لگیں۔ کیا ہی اچھا ہے کہ عبادت متانت، سکون اور ادب کے ساتھ ہو کہ جس پر نہ صرف اعتراض نہ کیا جا سکے بلکہ اپنے شکوہ، آداب اور عظمت کے لحاظ سے بھی نمونہ ہو۔

کچھ لوگ یہ کوشش کرتے ہیں کہ جب لوگ آرام کر رہے ہیں اپنے جلسوں میں ایسے لاؤڈ سپیکر لگائیں کہ جن کی آواز کان پھاڑنے والی ہو اور اس طرح اپنے جلسوں کے وجود کی خبر دیں۔ یہ لوگ اپنے خیال خام میں اس عمل کے ذریعے اسلام کی آواز دوسروں تک پہنچاتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف یہ اسلام کی آواز نہیں ہے بلکہ اسلام سے لوگوں کی دوری کا باعث ہے اور اس طرز عمل سے نتیجتاً دینی

۱۔ تفسیر نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۳۴۔

تبلیغات پر ضرب لگتی ہے۔

اس حکم کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ عبادت ہمارے دوسرے اعمال کے لیے نمونہ بن جائے۔ ہمارے تمام سماجی، سیاسی اور اقتصادی امور اسی آئینے میں انجام پائیں۔ ان امور میں ہمیں ہر طرح کے افراط و تفریط اور تندروی وسل انگاری سے بچنا چاہیئے اور "وابتغ بین ذٰلک سبیلًا" (درمیانی راہ اختیار کرو) کو اصول ہر کہیں کارفرما ہونا چاہیئے۔

اب ہم سورہ بنی اسرائیل کی آخری آیت پر پہنچتے ہیں۔ اس میں حمد کے ساتھ سورہ کا اختتام ہوتا ہے جیسے اس کی ذاتِ پاک کی تسبیح کے ساتھ اس سورہ کی ابتداء ہوئی تھی۔ درحقیقت یہ آخری آیت اس سورہ کے تمام توحیدی مباحث اور مفاہیم کا نتیجہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کہہ دو: حمد مخصوص ہے اُس خدا کے لیے جس کا کوئی بیٹا ہے نہ عالم ہستی کی حکومت ومالکیت میں جس کا کوئی شریک ہے اور نہ توانائی کے لیے اس کا کوئی سرپرست ہے (وقل الحمد للہ الذی لم یتخذ ولدًا ولم یکن لہ شریک فی الملک ولم یکن لہ ولی من الذل)۔ اور وہ ایسی صفات کا حامل خدا ہے کہ ہر لحاظ سے تمہاری فکر سے برتر و بالاتر ہے لہٰذا اس کی بڑائی اور کبریائی کو سمجھو اور اس کی لامتناہی عظمت سے آشنائی حاصل کرو (وکبرہ تکبیرًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ **تین صفات کا باہمی ربط:** زیرِ نظر آیت میں خدا کی تین قسم کی صفات کی طرف اشارہ ہوا ہے نیز آیت کے ذیل کی طرف توجہ کی جائے تو کُل چار صفات ہو جاتی ہیں:

پہلی صفت — یہ ہے کہ اُس کی کوئی اولاد نہیں — کیونکہ اولاد کا ہونا نیاز و احتیاج کی دلیل ہے جسمانی ہونے کی دلیل اور شبیہ و نظیر رکھنے کی دلیل ہے جبکہ اس کا جسم ہے نہ وہ احتیاج رکھتا ہے اور نہ شبیہ و نظیر۔

دوسری صفت — یہ ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں کیونکہ شریک کا وجود قدرت وحکومت کی محدودیت یا عجز و توانائی یا شبیہ و نظیر ہونے کی دلیل ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خدا ایسی سب صفات سے پاک ہے۔ اُس کی قدرت اس کی حکومت کی طرح غیر محدود ہے اور اس کی کوئی شبیہ و نظیر بھی نہیں ہے۔

تیسری صفت — یہ ہے کہ مشکلات اور ناتوانیوں کے لیے اس کا کوئی ولی نہیں کیونکہ اس خدائے عظیم و لامتناہی سے اس صفت کی نفی بھی واضح ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ آیت اللہ سے ہر قسم کے مددگار اور شبیہ کی نفی کرتی ہے چاہے وہ اس سے کم تر ہو مثلاً اولاد یا اس جیسا ہو مثلاً شریک یا اس سے بالاتر ہو مثلاً ولی۔

مرحوم طبرسی نے بعض مفسرین سے کہ جن کے نام انھوں نے نہیں لکھے، نقل کیا ہے کہ یہ آیت تین انحرافی گروہوں کے اعتقاد کی نفی کرتی ہے۔ پہلے عیسائی اور یہودی کہ جو خدا کے بیٹے کے قائل تھے۔ دوسرے مشرکین عرب جو اس کے لیے شریک خیال کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ حج کے وقت اپنے مراسم عبادت میں کہتے تھے:

لبیک لا شریک لک الا شریکا ھو لک

تیسرے ستارہ پرست اور مجوسی کہ جو خدا کے لیے ولی اور مددگار کے قائل تھے۔

۲۔ تکبیر کیا ہے؟ یہ جو قرآن نے یہاں رسول اکرمؐ کو بڑی تاکید سے حکم دیا ہے کہ خدا کی بڑائی شمار کرو۔ یقیناً اس کا مفہوم یہ ہے کہ پروردگار کی بزرگی اور بڑائی کا اعتقاد رکھا جائے نہ کہ صرف زبان سے "اللہ اکبر" کہا جائے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ خدا کی بزرگی کا اعتقاد رکھنے کا یہ معنی نہیں کہ دوسرے موجودات کے مقابلے میں اسے برتر و بالاتر سمجھا جائے بلکہ ایسا موازنہ اصلاً ہے ہی غلط۔ چاہیئے کہ ہم اسے کسی چیز کے موازنہ سے برتر سمجھیں جیسا کہ امام صادق علیہ السلام نے ایک مختصر اور معنی خیز حدیث میں ہمیں تعلیم دی ہے:

کسی نے آپؑ کے پاس کہا: اللہ اکبر

امامؑ نے فرمایا: اللہ کس چیز سے زیادہ بڑا ہے؟

اُس نے عرض کیا: ہر چیز سے۔

امامؑ نے فرمایا: یہ کہہ کر تُو نے اللہ کو محدود کر دیا (کیونکہ دیگر موجودات سے اس کا موازنہ کیا ہے اور ان سے برتر سمجھا ہے)۔

اُس نے عرض کی: پھر ہم کیا کہیں:

فرمایا: کہو: اللہ اکبر من ان یوصف

یعنی۔ خدا اس سے بڑا ہے کہ اُس کی توصیف کی جا سکے[1]

ای برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
واز آنچہ دیدہ ایم و نوشتیم و خواندہ ایم

---

[1] نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۳۹۔

مجلس تمام گشت و بہ آخر رسید عمر
ما ہمچناں در اوّل وصفت تو ماندہ ایم

اے ! خیال، قیاس، گمان اور وہم سے بالا !
اور اس سے بالا کہ جو ہم نے دیکھا، لکھا اور پڑھا ہے
مجلس تمام ہوگئی اور عمر آخر کو پہنچ گئی
لیکن ہم تیری پہلی صفت پر کھڑے ہیں ۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ ایک اور حدیث جو امام صادق علیہ السلام ہی سے نقل ہوئی ہے اس میں آپؑ نے فرمایا :

وکان ثم شئی فیکون اکبر منہ

کیا اصولی طور پر ذاتِ خدا کے مقابلے میں کوئی وجود ہے کہ جس سے وہ بڑا ہو ؟

اس صحابی نے عرض کیا : تو پھر ہم کیا کہیں ؟

فرمایا : کہو :۔ اکبر من ان یوصف

وہ اس سے برتر ہے کہ اس کی توصیف کی جاسکے ۔[1]

۳۔ ایک سوال کا جواب : یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے ۔ وہ یہ کہ زیرِ بحث آیات میں صفاتِ سلبیہ کے ساتھ خدا کی حمد کیوں آئی ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ حمد صفاتِ ثبوتیہ یعنی علم و قدرت وغیرہ کے ساتھ آنی چاہیئے ۔ ولد، شریک اور ولی کی نفی جیسی صفات کے ساتھ تسبیح مطابقت رکھتی ہے نہ کہ حمد ۔

اس سوال کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ صفاتِ ثبوتیہ اور صفاتِ سلبیہ کا مقام اگرچہ ایک دوسرے سے جُدا ہے اور صفاتِ ثبوتیہ حمد کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں اور صفاتِ سلبیہ تسبیح کے ساتھ لیکن حیثیت خارجی میں یہ ایک دوسرے کی لازم و ملزوم ہیں ۔ خدا سے جہل کی نفی اثباتِ علم کے ساتھ ہے جیسا کہ اس کی ذاتِ پاک کے لیے اثباتِ علم، جہل کی نفی کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔ لہٰذا کوئی مانع نہیں کہ کبھی لازم کو بیان کیا جائے اور کبھی ملزوم کو ۔ جیسا کہ اس سورہ کی ابتداء میں ایک اثباتی امر کیلئے تسبیح آئی ہے :

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا

منزہ ہے وہ خدا کہ جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کی طرف لے گیا

---

[1] نور الثقلین، ج ۳ صفحہ ۲۳۹ ۔

پروردگارا! ہمارے دل کو نورِ علم و ایمان سے سرشار کر دے تاکہ ہم تیری عظمت کے سامنے ہمیشہ جھکے رہیں، تیرے وعدوں پر ایمان رکھیں اور تیرے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کردیں، تیرے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں اور تیرے غیر کا سہارا نہ لیں۔

بار الٰہا! ہمیں توفیق دے کہ ہم زندگی بھر کبھی اعتدال سے باہر نہ نکلیں اور ہر قسم کی افراط و تفریط سے پرہیز کریں۔

خداوندا! ہم تیری حمد کرتے ہیں۔ تجھے یگانہ و یکتا سمجھتے ہیں تجھے برتر سمجھتے ہیں، اس سے برتر کہ تیری توصیف کی جا سکے۔ تو ہمیں بخش دے۔ ہمارے قدم اپنی راہ میں استوار کر اور داخلی و خارجی دشمنوں پر ہمیں کامیاب فرما اور ہماری کامیابیوں کو قیام مہدی موعود (ہماری جانیں ان پر فدا) کی آخری کامیابی کے ساتھ متصل کر دے اور اس تفسیر کی ایسی تکمیل کی توفیق دے کہ جس سے تو راضی و خوشنود ہو۔

سورہ بنی اسرائیل اختتام کو پہنچی

۱۷ محرم الحرام ۱۴۰۲ ہجری قمری
بمطابق
۹ آبان ماہ ۱۳۶۰ ہجری شمسی



ادارہ امامیہ قرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآن پاک (تفسیر نمونہ جلد ٦) کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا ہے میں تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی یا لفظی غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

حافظ محمد طفیل (شاملات الفاضل)

مدرس / منیجر

امامیہ قرأت کالج

اندرون موچی دروازہ - لاہور

اشاریہ

تفسیر نمونہ ــــــــــ جلد ۶

ترتیب و تزئین ــــــ سید شکیل حسین موسوی

ــــــ سید محمد حسین زیدی البا ھروی

مضامین:

اصول وعقائد

(توحید)

اسمائے باری تعالیٰ

عدل

نبوت

امامت

قیامت

جنت

جہنم

معجزہ

معراج

احکام

نماز

زکوٰۃ وانفاق

جہاد

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

دُعا

دیگر احکام

اخلاقیات

اخلاقِ حسنہ

اخلاقِ رذیلہ

اقوامِ سابقہ

اصحابِ ایکہ

اصحابِ حجر

اصحابِ سبت (بنی اسرائیل)

ظالم اقوام

قومِ ثمود

قومِ لوطؑ

قومِ نوحؑ

قومِ ہودؑ

کفار

دیگر اقوام

شخصیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام

آئن شٹائن

ابوجہل

ابوسفیان

ابولہب

ارمیا

حمزہؓ (سید الشہداء)

حضرت داؤد علیہ السلام

حضرت دانیال علیہ السلام

حضرت زکریا علیہ السلام

حضرت سلمانؓ فارسی

حضرت سلیمان علیہ السلام

شیطان

طرطوز یا طیطوس

عبداللہ ابنِ جدعان

عبداللہ ابنِ عباسؓ

عثمان بن مظعون

علی ابنِ ابراہیم

حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ (امیرالمومنین)

حضرت علیؑ بن الحسینؑ (امام چہارم)

حضرت علیؑ بن موسیٰ رضاؑ (امام ہشتم)

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضرت محمد باقر بن علیؑ (امام پنجم)

حضرت موسیٰؑ بن جعفرؑ صادق (امام ہفتم)

حضرت موسیٰؑ بن عمران

حضرت نوحؑ

ولید بن یزید بن عبد الملک اموی

حضرت ہودؑ

حضرت یحییٰؑ

علماء و دانشور

کتبِ آسمانی

انجیل

تورات

زبور

قرآن پاک

کتبِ تفسیر و تاریخ و سیر

لغاتِ قرآن

(ا)

(ج)

(ح)

(خ)

متفرق موضوعات

اپنا مکتب وضاحت سے بیان کرو

اجلِ مسمّٰی کیا ہے؟

اجنبی مہمان

اچھی اور بری سنت

امن اور رزقِ فراواں

انبیاء کی ذمہ داری

اندھی تقلید کی مذمت

انسان کے دستِ تسخیر میں سب چیزیں ہیں

انسان کی عظمت بہ نظرِ قرآن

اہلِ ذکر سے پوچھو

ایام اللہ کی یاد آوری

اے انسان میرے فرمان پر تمام موجودات تسلیم ہیں

ایک اور منحوس سازش

ایک دین اور ایک خدا

ایمان اور نورِ خدا کی نور سے تشبیہ

تقیہ اور اس کا فلسفہ

تکاملِ انواع

تکبر

تکبر کیا ہے؟

تمسخر اڑانے والے

تمہارا کام صرف دعوت الی الحق ہے

توبہ کی قبولیت اور مراحل

توحید کی معرفت میں رکاوٹ

توکل کی حقیقت و فلسفہ

تیز آندھی اور راکھ

تیز آندھی کے اثرات

دلیلِ تمانع

دوسروں کا بارِ گناہ اٹھانے والے

دوسروں کے وسائل پر نگاہ

دوگنا عذاب کیوں؟

ذوی القربیٰ

راہِ راست

راہ، نشانی اور رہبر

رزق کے اسباب، تنگی و وسعت

روایاتِ اسلامی میں شجرہ طیبہ و شجرہ خبیثہ

روحِ خدا اور سیاہ رنگ کیچڑ

رہبر کی انکساری

شرک

شفاء و رحمت

شکرانِ نعمت اور کفرانِ نعمت

شہد کی مکھی

شہوت و غرور کی مستی

شیطان

صبر کی تاکید اور اجر

صرف اللہ پر توکل کرو

صرف مترفین ہی کیوں؟

طالبانِ دُنیا

طبقاتی تفاوت

طرح طرح کے بہانے۔

ظالم

ظالموں کی کمزور سازشیں

ظُلم

ظلمتوں سے نُور کی طرف

عباد

عبادت اور تکامل وارتقاء

مقامات

کتب مصباح القرآن ٹرسٹ

تفسیر نمونہ 15 جلد مکمل سیٹ	7500/-
تفسیر پیام قرآن 10 جلد مکمل سیٹ	4000/-
میزان الحکمت 8 جلد مکمل سیٹ	4000/-
تفسیر موضوعی 12 جلد مکمل سیٹ	3000/-
انتخاب تفسیر نمونہ 5 جلد مکمل سیٹ	3000/-
تفسیر فصل الخطاب 3 جلد مکمل سیٹ	1200/-
اسوۃ الرسولؐ 3 جلد مکمل سیٹ	1800/-
معاد 3 جلد مکمل سیٹ	1200/-
عیون اخبار رضاؑ 2 جلد مکمل سیٹ	1200/-
الخصال 2 جلد مکمل سیٹ	1000/-
100 موضوع 500 داستان 3 جلد مکمل سیٹ	1500/-
آخری نجات دہندہ 3 جلد مکمل سیٹ	1000/-
احسن المقال 2 جلد مکمل سیٹ	1000/-
ادوار اجتہاد	500/-
دعا اور توبہ	500/-
قصص القرآن	500/-
تاریخ اسلام	500/-
اقوال علیؑ	500/-
صحیفہ کربلا	500/-
گوہر پارے	350/-
110 سوال وجواب	350/-
تفسیر آیت الکرسی	300/-
قرآن مجید (جوادی صاحب) 5 رنگی	1000/-
قرآن مجید (شیخ محسن علی نجفی بمع مقدمہ)	800/-
قرآن مجید (مولانا فرمان صاحب)	700/-
قرآن مجید (شیخ محسن علی نجفی، بغیر مقدمہ)	700/-

اجازت نامه

منجانب انصاریان پبلیکیشنز (قم) ایران

جناب آقای امین دام عزة العالی

با سلام و تحیات و خوشحالی از اینکه با کارهای خوب شما بیشتر اطلاع پیدا کردیم. از خداوند تبارک و تعالی توفیق و سعادت و سلامتی برای جنابعالی و دیگر دوستان آن مرکز محترم مسئلت می نمایم. چاپ کتابهای خوب انتشارات مصباح القرآن که لطف فرمودید انشاء الله در آینده که مشکلاتمان حل شده اقدام می کنیم. دعای خیر شما لازم است.

در مورد کتابهای انتشارات انصاریان هر کدام را که مؤسسه شما می خواهید در پاکستان به چاپ و توزیع آن اقدام کند بلا مانع است (چاپ شده یا چاپ نشده) و اگر فایلهای بعضی از آنها که موجود است بخواهید تا آنها را نیز تقدیم می نماییم. فقط سفارش حقیر این است که بعضی از این کتابها، تصحیح و ویرایش و نظر ثانی لازم دارد و اگر این کارها انجام شود توانایی مضاعف خواهد داشت و بعد نمونه هایی از کارهای انجام شده را برای ما بفرستید. برای چاپ کتابهای مصباح القرآن هر وقت لازم شد در خواست فایلهای آنها را از شما خواهیم نمود

با تشکر و ملتمس دعا

انتشارات انصاریان

اجازت نامہ

منجانب تنظیم المکاتب لکھنو انڈیا

Tanzeemul Makatib
Golaganj Lucknow - 18 (India)
Phone 91-522-2215115 Fax 2628923



تنظیم المکاتب
گولہ گنج لکھنو۔۱۸ ہند
فون: ۲۲۱۵۱۱۵ فیکس: ۲۶۲۸۹۲۳

Dated: 27 Feb 2012

To whom it may concern.

I do hereby authorize Misbah ul Quran Trust, Lahore, Pakistan to publish books of Tanzeemul Makatib, Lucknow as per list, in Pakistan in the larger interest of propagating teachings of the Prophet Mohammed and his holy infallible progeny. (SAWA).

Wassalam

Syed Safi Haider

Secretary